وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ

الدرة الناصحة في تفسير سورة الفاتحة

المعروف بـ

تفسیر سورۃ الفاتحہ

از

مفتی محمد معین الدین ناشر مصباحی

شیخ الحدیث دار العلوم بہار شاہ فیض آباد ایودھیا (یوپی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ

الدلائل الواضحة في تفسير سورة الفاتحة

المعروف بـ

تفسیر سورۃ الفاتحۃ

از

مفتی محمد معین الدین اشرفی مصباحی

شیخ الحدیث دار العلوم بہار شاہ فیض آباد، ایودھیا (یوپی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَقَدۡ آتَیۡنَاکَ سَبۡعاً مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡآنَ الۡعَظِیۡمَ

الاسرار الواضحة فی تفسیر سورة الفاتحة

المعروف

تفسیر سورة الفاتحة

از

محمد معین الدین اشرفی مصباحی (بھاگل پوری)

مفتی وشیخ الحدیث دار العلوم بہار شاہ فیض آباد، ایودھیا (یو۔پی)

۷۸۶/۹۲

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	**الاسرار الواضحۃ فی تفسیر سورۃ الفاتحۃ**
مؤلف	:	محمد معین الدین اشرفی مصباحی (9451872012)
کتابت	:	جناب حافظ ریاست علی
نظر ثانی/تصحیح	:	حضرت علامہ مولانا مفتی محمد قاسم صاحب اشرفی، مفتی وشیخ الحدیث، مدرسہ غوثیہ رؤفیہ، دھام نگر شریف، بھدرک اڑیسہ
پروف ریڈنگ	:	جناب حافظ ریاست علی صاحب
مطبع	:	
سن اشاعت	:	سنہ ۱۴۴۳ھ۔ سنہ ۲۰۲۲ء
تعداد	:	1100
قیمت	:	
ناشر	:	

{ملنے کے پتے}

(۱) دارالعلوم بہار شاہ، فیض آباد، ایودھیا (یو۔پی)

(۲) مکتبہ فیضان اشرفی خانقاہ اشرفیہ حسنیہ سرکار کلاں کچھوچھہ شریف، ضلع امبیڈکر نگر (یو۔پی)

(۳) مکتبہ دعوت اسلامی مسجد ٹاٹ شاہ کوٹھا پارچہ فیض آباد، ایودھیا (یو۔پی)

(4) مکتبہ اشرفیہ، مالیگاؤں، ناسک، مہاراسٹر

(5) جناب محمد فیاض اشرفی، ممبئ۔9987517752

(6) مکتبہ نعیمیہ مٹیا محل دہلی

اجمالی فہرست تفسیر سورۃ الفاتحہ

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	شرف انتساب	۶
۲	**کلمات تقدیم**	۷
۳	**کلمات دعا**	۲۷
۴	(۱) علامہ عبدالشکور صاحب قبلہ سابق شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۲۷
۵	(۲) صدر العلماء حضرت علامہ مولانا محمد احمد مصباحی ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۲۸
۶	**کلمات تبریک**	۲۹
۷	(۱) قائد ملت حضرت علامہ مولانا سید شاہ محمود اشرف اشرفی الجیلانی سجادہ نشین درگاہ کچھوچھہ شریف	۲۹
۸	(۲) شیخ طریقت حضرت علامہ مولانا سید جلال الدین اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھہ شریف، بانی مخدوم اشرف مشن۔	۳۲
۹	**کلمات تقریظ**	۳۶
۱۰	(۱) سراج الفقہاء حضرت علامہ مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب قبلہ رضوی شیخ الحدیث وصدر شعبہ افتاء جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۳۶
۱۱	(۲) حضرت علامہ مولانا مفتی محمد قاسم صاحب اشرفی مصباحی شیخ الحدیث وصدر شعبہ افتاء مدرسہ غوثیہ رؤفیہ اڑیسہ	۳۸
۱۲	(۳) حضرت علامہ مولانا مفتی محمد مجاہد حسین صاحب قبلہ رضوی الہ آباد	۴۰
۱۳	**کلمات تحسین**	۴۸
۱۴	(۱) حضرت علامہ ومولانا مفتی محمد بدر عالم صاحب مصباحی پرنسپل جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۴۸
۱۵	(۲) حضرت علامہ ومولانا محمد قمر عالم صاحب مصباحی اشرفی شیخ الحدیث دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی	۴۹
۱۶	(۳) حضرت علامہ ومولانا وصی احمد صاحب قبلہ قادری نائب سربراہ اعلیٰ دار العلوم بہار شاہ	۵۰
۱۷	تعارف تفسیر صاحب تفسیر	۵۱
۱۸	اظہار مسرت	۶۴
۱۹	منظوم ترجمانی سورہ سبع مثانی (مولانا محمد اظہار اشرفی)	۶۵
۲۰	خطبہ کتاب	۶۶
۲۱	قرآن حکیم علوم ومعارف اور اسرار معانی کا ناپیدا کنار سمندر	۶۷
۲۲	سورۃ الفاتحہ	۸۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۲۳	تراجم سورہ فاتحہ	۸۶
۲۴	ترجمہ سورہ فاتحہ بمطابق اقوال وافعال	۸۸
۲۵	اسمائے سورۃ الفاتحہ ووجوہ تسمیہ	۸۹
۲۶	فضائل سورۃ الفاتحہ	۹۶
۲۷	علوم سورۃ الفاتحہ	۱۰۲
۲۸	**باب اول: مباحث تعوذ**	۱۱۲
۲۹	**باب دوم: مباحث عقلیہ** (تعوذ کے ارکان خمسہ)	۱۲۱
۳۰	**باب سوم:** کلمہ تعوذ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم میں لطائف ونکات	۱۶۳
۳۱	**مباحث تسمیہ**	۱۷۴
۳۲	**باب اول:** تسمیہ کے مسائل مقدمہ کا بیان	۱۷۴
۳۳	**باب دوم: خط بسم اللہ کا بیان**	۱۸۰
۳۴	**باب سوم: مباحث اسم کا بیان**	۱۸۵
۳۵	**باب چہارم:** صفات حقیقیہ پر دلالت کرنے والے اسمائے مبارکہ	۲۰۰
۳۶	**باب پنجم:** صفات اضافیہ پر دلالت کرنے والے اسمائے مبارکہ	۲۲۳
۳۷	**باب ششم:** صفات سلبیہ کے اعتبار سے اسمائے الٰہیہ کا بیان	۲۲۷
۳۸	**باب ہفتم:** صفات حقیقیہ پر اضافیہ کے ساتھ دلالت کرنے والے اسماء	۲۳۰
۳۹	**باب ہشتم:** اسمائے الٰہیہ کے بقیہ مباحث	۲۴۸
۴۰	**باب نہم:** اسم ضلالت لفظ اللہ کی تفسیر	۲۵۹
۴۱	**باب دہم:** الرحمن الرحیم سے متعلق بحثیں	۲۷۶
۴۲	**باب یازدہم:** فضائل ونکات بسم اللہ الرحمن الرحیم	۲۸۰
۴۳	تسمیہ کے جزئیت وعدم جزئیت کا مسئلہ	۲۹۴
۴۴	**سورۃ الفاتحہ میں کلام ۔ باب اول:** اسمائے سورہ فاتحہ کے بیان میں	۳۰۹
۴۵	**باب دوم:** سورہ فاتحہ کے نزول وفضائل کا بیان	۳۰۹

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۴۶	**باب سوم:** سورہ فاتحہ کے اسرار عقلیہ کے بیان میں	۳۱۲
۴۷	**باب چہارم:** مسائل فقہیہ سورہ فاتحہ ۔ مسئلہ قرات خلف الامام	۳۱۷
۴۸	**باب پنجم:** تفسیر سورہ فاتحہ کے بیان میں	۳۳۴
۴۹	**مقدمہ:** تعارف سورہ، آیت، مکی مدنی	۳۳۴
۵۰	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ	۳۳۹
۵۱	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ	۳۵۸
۵۲	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	۳۷۲
۵۳	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ	۳۸۳
۵۴	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** اِيَّاكَ نَعْبُدُ	۳۹۸
۵۵	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ (غیر اللہ سے استعانت کا مسئلہ)	۴۲۴
۵۶	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ	۴۳۹
۵۷	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	۴۵۶
۵۸	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ	۴۶۶
۵۹	سورہ فاتحہ کی مجموعی تفسیر	۴۸۰
۶۰	نماز عارفین کی معراج ہے	۵۰۱
۶۱	نماز میں روحانی معراج، نماز میں جسمانی معراج	۵۰۳
۶۲	**آمین کا بیان**	۵۲۹
۶۳	خاتمہ در بیان عملیات وازالہ شبہات	۵۴۰
۶۴	**باب اول:** عملیات فاتحہ، **باب دوم:** ازالہ شبہات	۵۴۰
۶۵	دعائے اختتام	۵۴۸
۶۶	مجلس اشاعت	۵۴۹
۶۷	تفصیلی فہرست	۵۵۲

شرف انتساب

والدین کریمین، اساتذۂ بررہ، اساطین امت، مشائخ طریقت بالخصوص غوث العالم، مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی، حضرت امام رازی، قاضی بیضاوی، صاحب کنز الایمان اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مجدد دین وملت امام احمد رضا خان بریلوی وصاحب خزائن العرفان صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی ،محدث اعظم ہند کچھوچھوی اوران تمام مفسرین قرآن حکیم کے نام جنہوں نے قرآن حکیم کی ترجمانی ،معانی و مطالب کے بیان، رموز واسرار کے اظہار، نکات ولطائف اور حقائق ودقائق کے استخراج میں، اس کی متنوع تفسیر اور تبلیغ وارشاد میں اپنی عمر عزیز کا لمحہ لمحہ صرف فرمادیا۔

اور

قطب ربانی شہباز لامکانی حضرت مولانا **سید شہباز محمد** بھاگل پوری قدس سرہٗ النورانی

اور

عالم ربانی واعظ لاثانی حضرت مولانا **سید احمد اشرف** اشرفی الجیلانی کچھوچھوی قدس سرہٗ النورانی

کے نام جنکی ولایت وبزرگی کے برکات وتبلیغ وارشاد کے اثرات سے آج بھی

بھاگل پور واطراف واکناف کا چپہ چپہ معمور ومنور ہے۔

بتوسط

آل رسول، گل گلزار اشرفیت قائد ملت حضرت مولانا سید شاہ **محمد محمود اشرف** اشرفی الجیلانی

سجادہ نشین آستانہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف

گر قبول افتد زہے عز وشرف

محمد معین الدین اشرفی مصباحی

۷۸۶/۹۲

پیش لفظ

کلمات تشکر واعتذار

اللہ رب العلمین کا لاکھ لاکھ شکر واحسان اور اس کی بے انتہا حمد وثنا ہے کہ اس کریم رب نے مجھ ناتواں کو اپنی کتاب عظیم فرقان حمید کی عظیم وجلیل سورہ مبارکہ، سورہ فاتحہ کی ،اجلۂ کتب تفاسیر کے حوالے سے اردو زبان میں ترجمانی ،نکات آفرینی اور لطائف بیانی کی توفیق رفیق مرحمت فرمائی پھر لاکھوں درود وسلام کے گل بوٹے نذر ہیں اس رؤف رحیم رسول مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جنکے مشکوٰۃ نبوت سے نکلے ہوئے انوار علوم سے نہ یہ کہ صرف آپ کے صحابہ کے قلوب واذہان روشن ہوئے بلکہ آج تک اور صبح قیامت تک علماے ربانیین کے سینے منور ومجلیٰ ہوتے رہیں گے۔ پھر رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے تمام آل واصحاب پر خوب خوب درود وسلام کا ہدیہ پیش ہے جن کی شبانہ روز کی پیہم کوششوں سے یہ دین متین من وعن ہم تک پہنچا جنہوں نے علوم مصطفوی کے چراغ کی شعاؤں سے پوری دنیا کو روشن کر دیا، امت مسلمہ کا ہر فرد ان نفوس قدسیہ کے احسانات سے گراں بار ہے علما کی زبانیں، اہل قلم کی تحریریں، خطیبوں کے خطبات، ان حضرات کی تعریف وتوصیف سے آباد ہیں تاہم کما حقہ اسلامیان عالم پر جو، ان کے احسنات ہیں کا حق ادا نہیں ہوسکتا ۔بس ہم اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف اور آپ کے صحابہ واہل بیت کی مدح کرنے میں عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب اور ان کے آل واصحاب پر خوب خوب درود وسلام نازل فرمائے۔

رب علیم وقدیر کی حمد وثنا اور اس کے پیارے نبی اور آپ کے سارے آل واصحاب پر نذرانہ درود وسلام پیش کرنے کے بعد ہم صمیم قلب کے ساتھ اپنے ان تمام بزرگوں کی بارگاہ میں کلمات تشکر وامتنان اور ہدیہ دعاے سحر گاہی پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جن کا اس ناچیز کی تعلیم وتربیت میں کسی نہ کسی طرح حصہ رہا ہے۔ بالخصوص ہمارے والدین کریمین (غفرلھما اللہ تعالیٰ) ہمارے برادران گرامی جناب محمد شمشیر علی صاحب مرحوم، جناب محمد میکش اشرفی اور جناب محمد شوکت علی اشرفی صاحبان، مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم ماچھی پور بھاگل پور اور الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ یوپی کے ہمارے سارے اساتذۂ کرام اور کچھوچھہ مقدسہ کے مشائخ طریقت سب مستحق شکر وامتنان ہیں جنہوں نے ہماری جسمانی نشوونما کے ساتھ علمی وروحانی ترتیب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا میں نے اپنے ان

سارے محسنین اورکرم فرماؤں کا ذکرخیراپنی معرکۃ الآراءتصنیف اشرف النعوت شرح مسلم الثبوت میں کردیاہے حاجت اعادہ نہیں،البتہ،محسن اعظم بھاگلپور،عالم ربانی واعظ لاثانی ،ناصردین متین ،علم نبوی کے امین ،مشرف بدستارفضیلت بدست نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،یعنی حضرت مولانااحمداشرف اشرفی الجیلانی قدس سرہ النورانی،اورآپ کے برادر اصغرتاج الاصفیا،کشف وکرامات کے شہنشاہ حضرت مولانا پیرسید مصطفے اشرف اشرفی الجیلانی قدس سرہ النورانی کا ذکرجمیل ضرورکرونگا کیوں کہ ان دونوں بزرگوں کی دینی خدمات اور فیوض وبرکات سے شیوخ جونپوری بھاگل پوراورشیوخ جونپوری سہرسہ کا بچہ بچہ،آشنااورفیضیاب ہے چنانچہ آج ہماری قوم کی رگ وپے میں جوسنیت کی لہریں موجزن ہیں اوراولیاے کرام،بزرگان دین اوراہلبیت اطہارکی محبت سرایت کئے ہوئی ہے سب انھیں دونوں بزرگوں کے تبلیغی دورے اورمساعی جمیلہ کی مرہون منت ہیں,میری والدہ محترمہ مرحومہ بتایا کرتی تھیں کہ تمھارا نام محمد معین الدین ،حضرت تاج الاصفیا پیرمصطفے میاں علیہ الرحمہ ہی نے رکھا ہےاورنام رکھنے کے بعدفرمایا تھا کہ معین الدین !تم نے میرے بھانجے عالم باعمل فاضل اجل مولانا سیدمعین الدین اشرف کا نام لے لیا،،ناچیزراقم الحروف بطورتحدیث نعمت کہتاہے کہ میں ہمیشہ اس نام کی برکت محسوس کرتاہوں بلکہ دوسرے احباب کہتے ہیں کہ آپ پرمخدوم کچھوچھہ اوروہاں کے مشائخ کا بڑافیضان جاری ہےاورکیوں نہ ہوکہ نام رکھنے والے بھی اللہ کے ایسے مقدس ولی جن کے کشف وکرامات کے واقعات آج بھی زبان زدعوام وخواص ہیں اورجن کے نام پرنام رکھاوہ بھی ایسے ولی مکتوم کہ ان کانام آج بھی مشائخ کچھوچھہ مقدسہ بڑی عقیدت واحترام سے لیتے ہیں "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء "۔مولاے کریم ہمارے مشائخ کے درجات میں بلندیاں عطافرماےاوران کے فیوض وبرکات کوعام وتام فرمائے۔آمین۔پھران دونوں بزرگوں کے نبائرکرام یعنی مسندنشین جادۂ اشرف السمنانی،قائدملت،سربراہ اعلی جامع اشرف،حضرت مولانا سیدشاہ محمود اشرف اشرفی الجیلانی،خانقاہ اشرفیہ سرکارکلاں کچھوچھہ شریف اورگل گلزاراشرفیت،شیخ طریقت جانشین حضور اشرف الاولیا،سربراہ اعلی مخدوم اشرف مشن ،حضرت مولانا سیدجلال الدین اشرف اشرفی الجیلانی عرف قادری میاں مدظلہ العالی کچھوچھہ شریف کی بارگاہ سیادت میں ہدیہ تشکراورنذرانہ امتنان پیش کرتاہوں کہ آپ حضرات ناچیز سے بے پناہ محبت فرماتے ،نوازش وعنایات کرتے رہتے ہیں کتاب ہذا کا علم ہونے کے بعد خوشیوں کا اظہارفرمایا،دعائیں دیں اورکلمات تبریک وتحسین لکھ کرایسا کرم فرمایا کہ کتاب مزید معتبر،مستنداورمتبرک ہوگئی،عوام اہلسنت پرعموماًاورروابستگان سلسلہ اشرفیہ پرخصوصاًان کاظل کرم قائم رہے۔رہے میرے اساتذہ کرام توان

میں جو رب کو پیارے ہو چکے ہیں بندہ ان کی مغفرت اور ترقی درجات کی دعا کرتا ہے بالخصوص حضرت مولانا مفتی معراج القادری صاحب استاذ ومفتی الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور وقاضی شرع فیض آباد وضلع ایودھیا کے لئے صمیم قلب سے دعا گو ہیں کہ رب غفور رحیم حضرت کی مغفرت فرمائے پیش لفظ لکھنے کے دوران ہی مختصر علالت کے بعد حضرت وصال فرما گئے ،حضرت مفتی صاحب کے وصال سے علمی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا، وہ ہوا ہی ،ایودھیا وقرب وجوار کے اضلاع میں رہنے والے مسلمانوں کے عائلی مسائل کے تصفیہ اور شرعی حل پر زبردست اثر انداز ہوا کہ آپ صدر الشریعہ دارالقضاء دارالعلوم بہار شاہ سے مسلمانوں کے بہت سے مسائل اور مقدمات کا شرعی فیصلہ فرماتے تھے مگر رب تعالیٰ کی قضاوقدر پر رضا ہی ہمارا ایمان ہے دعا ہے کہ مولائے کریم حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی مغفرت فرمائے اور صدر الشریعہ دارالقضاء میں کوئی نعم البدل فیصل مقرر فرمائے ۔آمین،اور ہمارے اساتذہ میں جو باحیات ہیں ان کے لئے صحت وسلامتی ،عمر کی درازگی اور دین ودنیا کی سعادت مندی کے حصول کی دعا کرتا ہے۔ بالخصوص استاذ زمن حضرت علامہ مولانا عبد الشکور صاحب قبلہ سابق شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور جنھوں نے اپنی ضعف ونقاہت ،کمزوری، بیماری اور بوڑھاپا میں مبتلا ہوتے ہوئے دل سے دعائیں دیں اور خوشی کا اظہار فرمایا،استاذی الکریم صدر العلماء حضرت علامہ مولانا محمد احمد مصباحی،سابق پرنسپل صاحب ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کی بارگاہ علم و ادب میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے کہ آپ نے خط کے ذریعہ اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور کتاب ہذا کے نام کی تائید و توثیق فرمائی اور اپنے دعائیہ کلمات سے نوازا۔اور پھر استاذی الکریم سراج الفقہاء،محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مولانا مفتی نظام الدین صاحب رضوی (سابق پرنسپل) شیخ الحدیث وصدر شعبہ افتاء الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کی خدمت میں ہدیہ امتنان پیش ہے کہ آپ نے باالمشافہ کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے کا راستہ بتایا، زبانی مشورہ دیا اور تحریری طور پر قابل لحاظ امور کی طرف توجہ دلائی پھر کتاب کے مسودہ سے چند صفحات کو دیکھ کر اس پر شاندار تقریظ رقم فرمایا صمیم قلب سے دعا ہے کہ رب کریم وحفیظ ان سبھوں کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے اور حاسدین کے شر سے محفوظ رکھے آمین۔اپنے اساتذہ کی بارگاہ میں نذرانہ شکر وامتنان پیش کرنے کے بعد میں اپنے سے بہت سبنیر ان مصباحی برادران کی خدمت میں ہدیہ شکر وسپاس پیش کرتا ہوں جنھوں نے نہ یہ کہ اس کتاب کی تالیف پر مجھے صرف مبارک بادیاں پیش فرمائیں بلکہ کتاب کی بہت سی بحثوں پر طائرانہ نگاہ ڈالکر تقریظ جمیل اور قیمتی تاثرات قلمبند فرمائے،ان میں حضرت علامہ مولانا مفتی محمد قاسم اشرفی مصباحی،شیخ الحدیث وصدر شعبہ افتا مدرسہ غوثیہ رؤفیہ،دھام نگر شریف، بھدرک اڑیسہ،اور حضرت

علامہ مولانا مفتی محمد مجاہد حسین رضوی صاحب صدر شعبہ افتا دار العلوم غریب نواز الہ آباد، یوپی، حضرت علامہ مولانا مفتی بدر عالم صاحب مصباحی پرنسپل الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور اور حضرت علامہ مولانا قمر عالم صاحب اشرفی مصباحی شیخ الحدیث دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی، بستی، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، راقم الحروف اپنے اکابر علما کا احسان مند ہے اور دعا گو ہے کہ مولائے کریم ان حضرات کا سایہ تادیر قائم رکھے اور ان کے دینی وعلمی فیضان کو عام وتام فرمائے، ان میں اول الذکر یعنی اپنی قوم شیوخ جونپوری، ضلع سہرسہ بہار کے قابل قدر، عظیم المرتبت سپوت، برادر دینی وملی حضرت علامہ ومولانا مفتی محمد قاسم صاحب اشرفی مصباحی کی بارگاہ علم وادب میں مزید صمیم قلب کے ساتھ ہدیہ تشکر وامتنان پیش کرتا ہوں کہ آپ نے جناب حافظ محمد اشرف صاحب (اشرفی بابا) ابراہیم پور بھاگل پور کی زبانی تعارف کے بعد کتاب ہذا کا مسودہ از خود طلب فرمایا اور از ابتدا تا انتہا نظر ثانی فرمائی بلکہ عمیق نگاہ اور تنقیدی نظر سے مطالعہ فرمایا اور بہت سے مقامات سے لفظی، ادبی اور معنوی اصلاحات فرمائی اور اپنے قیمتی تاثرات لکھ کر کتاب کی قدر ومنزلت میں اضافہ فرمایا حالانکہ آپ سخت جسمانی امراض میں مبتلا ہیں رب کریم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ مولائے کریم انھیں شفائے کاملہ عاجلہ عطا فرمائے، میں سمجھتا ہوں کہ کتاب ہذا پر نظر ثانی کے لیے حضرت مفتی صاحب کا انتخاب، رب تعالیٰ کی طرف سے انتظام تھا کہ آپ نے سنتے ہی از خود ویسے ہی مسودہ طلب فرمایا، جس طرح حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب علیہ الرحمہ نے اشرف النعوت شرح مسلم الثبوت کا مسودہ از خود طلب فرما کر نظر ثانی فرمائی تھی اور تقریظ جمیل رقم فرمایا تھا جس کی وجہ سے شرح باوزن اور مستند ہوگئی مولائے کریم شیخین کریمین کو بہترین اجر عطا فرمائے آمین۔

اب ہم اپنے ان احباب کی بارگاہ میں ہدیہ تشکر وامتنان پیش کرتے ہیں جنہوں نے شہر فیض آباد کی مختلف چھوٹی بڑی مسجدوں میں درس قرآن ودرس حدیث کا ہفتہ واری سلسلہ شروع کرایا چونکہ یہ کتاب درس قرآن وحدیث ہی کا فیضان اور اسی کا ثمرہ ونتیجہ ہے اس لئے ان احباب کی بارگاہ میں ہدیہ تشکر پیش کرنا ضروری ہے جن مسجدوں میں درس قرآن و درس حدیث کا سلسلہ قائم ہوا اور تاوقت تحریر جاری ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) جامع مسجد حسنو کٹرہ (۲) یک منارہ مسجد وزیر گنج (۳) مرکزی جامع مسجد ٹاٹ شاہ چوک
(۴) دائحوری مسجد پرانی سبزی منڈی (۵) بلال مسجد سبھاش نگر (۶) قادری مسجد بقرہ منڈی نیاواں
(۷) مدینہ مسجد بچھڑا سلطانپور

(۱) جامع مسجد حسنو کٹرہ: جامع مسجد حسنو کٹرہ میں درس حدیث کے لئے سب سے پہلے جناب صوفی عبدالواحد صاحب مبلغ دعوت اسلامی اور جناب محمد فرید صاحب ڈلی والے نے تحریک کی اور مجھ سے گذارش کی میں نے رب تعالیٰ کی توفیق وتائید سے بلا تامل ان کے گذارشات کو قبول کر کے جمعرات بعد نماز عشاء درس حدیث شروع کر دیا، اہل محلہ بلکہ دوسرے محلہ والوں نے بھی اس میں بڑی دلچسپی لی۔ اس درس کو کامیاب بنانے میں صوفی عبدالواحد صاحب، محمد فرید صاحب اس وقت کے امام مسجد جناب قاری شعبان قادری صاحب استاذ دارالعلوم بہار شاہ، جناب ڈاکٹر محمد شریف خان صاحب، جناب ماسٹر شکیل خان، جناب محمد سہیل عرف پپو نیشنل ایئر کنڈیشن، جناب محمد شکیل صاحب خادم مسجد وغیرہم نے بڑی کوششیں کیں۔ چنانچہ قاری شعبان قادری صاحب نے شروع میں اہل محلہ کو درس حدیث میں شریک ہونے کی ترغیب دی، جناب ڈاکٹر محمد شریف خانصاحب، سہیل صاحب اور ماسٹر شکیل خانصاحب وغیرہم نے مستقل طور پر نہ یہ کہ صرف شیرنی کا انتظام کیا بلکہ ڈاکٹر محمد شریف خان صاحب چند احباب کے تعاون سے ہر ہفتہ نذر و نیاز بھی پیش کرتے رہے۔ اور جناب سہیل عرف پپو صاحب اور ان کے برادران موقع بہ موقع شیرنی وغیرہ کا انتظام کرنے کے ساتھ، مستقل طور پر میرے عشائیہ کا انتظام کرتے کئی سالوں تک بڑی خوشی اور محبت کے ساتھ پر تکلف دعوت کھلاتے رہے اور اب ان دنوں محمد شکیل صاحب خادم وممبر مسجد ہذا اور جناب سہیل عرف پپو صاحب درس حدیث کا انتظام کرنے میں پیش پیش ہیں اللہ تعالیٰ ان حضرات کی خدمتوں کو قبول فرمائے اور دارین کی سعادتوں سے بہرہ مند فرمائے۔ غرضیکہ یہ درس بڑا ہی بافیض، بابرکت اور کامیاب رہا۔

حسنو کٹرہ چوراہا پر محرم الحرام شریف کا ۱۲ روزہ ذکر شہداء کربلا کا جلسہ بھی اسی درس کا نتیجہ ہے۔ اس جلسہ سے پہلے جامع مسجد حسنو کٹرہ، مسجد گورہ پٹی، کھیت والی مسجد اور دلی دروازہ کی مسجد میں دس روزہ میلاد شریف اور ذکر شہدائے کربلا کا انعقاد ہوتا تھا جس میں چند نمازی حضرات شریک ہوتے میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ پروگرام حسنو کٹرہ چوراہا پر کیا جائے تو مزید نفع بخش ہوگا پس میں نے اس سلسلہ میں یہاں کے نوجوانوں سے بات کیا اور ان کو اس کی اہمیت و افادیت بتائی اور ترغیب دلاتا رہا وہ حضرات تیار ہوئے اور آج یہ پروگرام حضرت مولانا حافظ فیصل ہاشمی بن مولانا مشتاق احمد صاحب حبیبی، نائب امام مسجد ٹاٹ شاہ کی قیادت میں الحمدللہ حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

(۲) یک منارہ مسجد وزیر گنج: میں روز جمعہ مبارکہ بعد نماز عشاء قرآن حکیم کا درس ہوتا ہے۔ یہ درس جناب محترم الحاج قاری عبدالوحید صاحب امام یک منارہ مسجد و پرنسپل دارالعلوم نیازیہ قادریہ پرانی سبزی منڈی کی

کوششوں سے تقریبا دس سال پیشتر شروع ہوا تھا جو کامیابی کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ جناب قاری صاحب نے اس درس قرآن کو کامیاب اور نفع بخش بنانے میں بڑی کوشش فرمائی اس زمانہ میں جب میرے پاس کہیں آنے جانے کے لئے کوئی سادھن نہیں تھا حضرت قاری صاحب خود ہر جمعہ کو مجھے لینے آتے اور درس کے بعد گھر چھوڑتے اور مصافحہ بھی فرماتے اگر کسی مصروفیت میں رہے تو مسجد سے متعلق کسی نوجوان جیسے محمد دانش وغیرہ کو لانے لیجانے اور گھر چھوڑنے کی ذمہ داری سونپ دیتے۔ اس طرح آج تک یہ درس جاری ہے اب دسواں پارہ شروع ہونے والا تھا کہ کرونا وائرس عالمی وبائی بیماری کی وجہ سے مسجد میں نمازیوں کا اکٹھا ہونا ممنوع ہوگیا اس لئے کئی مہینوں سے درس کا سلسلہ موقوف ہے اللہ تعالیٰ اپنی مسجدوں کو آباد فرمادے آمین۔ ابھی دو سال پہلے جشن درس قرآن کا شاندار پروگرام کیا جس میں نذرانہ اور تحفہ سے بھی نوازا اس کار خیر میں قاری صاحب کے ساتھ ان کے دیگر احباب بالخصوص جناب نواب خانصاحب، عبدالقدیر صاحب، محمد نعیم صاحب، محمد دانش، نور محمد صاحب، حاجی شاہ نور اور حاجی محمد خورشید وغیرہم انتظامیہ مسجد شریک رہتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان حضرات کی خدمتوں کو قبول فرمائے۔ آمین

(۳) جامع مسجد ٹاٹ شاہ : شہر فیض آباد کی یہ مرکزی مسجد ہے پورے شہر اور قرب و جوار کے اہل محبت مسلمان اس مسجد کو بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، شہر اور قرب و جوار کے سنی مسلمان روزہ رمضان اور عید و بقرعید وغیرہ تہوار یہاں کے اعلان کے بعد ہی کرتے ہیں ارباب حکومت اور پرشاشن میں بھی اس کی ایک الگ اہمیت ہے۔ مسجد کی خلوص و محبت کے ساتھ جو کوئی خدمت کرتا ہے وہ فیض پاتا ہے ان وجہوں اور دیگر وجوہات کے سبب یہاں کی تولیت و رکنیت کے حصول کے لئے بہت سے لوگ کوشاں رہتے ہیں آئے دن انتظامیہ کمیٹی کی نامزدگی اور تولیت و رکنیت کے تعین کے سلسلہ میں بڑا انتشار رہتا ہے البتہ جن کے حق میں ڈگری ہوتی ہے وہ کمیٹی انتظامیہ کے طور پر بحال ہوجاتی ہے، آج سے تقریبا آٹھ سال پیشتر یہی رسہ کشی کا دور تھا کہ کچھ احباب نے میری مرضی اور علم و ارادہ کے بغیر مجھے عہدۂ صدارت پر نامزد کردیا اور یہ کمیٹی بحال ہوگئی، آج میں اپنے رب علیم و خبیر اور شہید و بصیر کو گواہ بنا کر اس حقیقت سے آگاہ کردیتا ہوں کہ میں نے کبھی انتظامیہ میں شمولیت کی خواہش و کوشش نہیں کی، نہ میں اپنے کو اس کا اہل سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے صدارت کے عہدہ پر نامزد کیا وہ بھلے ہی مجھے اہل سمجھتے ہوں یہ انکا اپنا حسن ظن تھا۔ رہا میں، تو میں ہمیشہ بیزار رہا پھر کم از کم ہم جیسے لوگوں کو تو قطعاً زیب نہیں دیتا کہ کسی اچھے بھلے پڑھے لکھے اور صاحب ثروت اور مخیر شخص کو ہٹا کر خود اس پر قبضہ جمالیں کہ یہ طریقۂ کار جہاں عوام الناس کے نزدیک غلط اور برا ہے وہیں شرعاً بھی

مذموم ہے۔

خیراب مجھے اس الجھن سے نجات مل گئی ہے۔البتہ درس حدیث صحیح البخاری کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔درس حدیث کے آغاز کے لئے جناب محمد صابر صاحب سابق متولی ٹاٹ شاہ اور اکبر ازہری،محمد اشتیاق عرف نمو،محمد احمد برکاتی وغیرہم نے بار بار اصرار کیا کچھ اندیشے کی وجہ سے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا لیکن ان حضرات کا اصرار بڑھتا رہا تب میں نے اس وقت کے امام حضرت مولانا قاری قطب الدین صاحب قبلہ جن کا ابھی چند روز پیشتر ۲۷/جولائی ۲۰۲۰ء کو انتقال ہوا اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار اقدس میں جگہ عطا فرمائے،سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب کیا آپ نے انتظامیہ کی طرف سے بے اطمینانی ظاہر کیا چونکہ جو حضرات درس شروع کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے ان میں کوئی اس وقت انتظامیہ میں شامل نہیں تھے۔پھر میں نے اپنے دارالعلوم کے خزانچی اور انجمن تبلیغ اہل سنت کے اہم رکن بلکہ بانی ونائب سکریٹری جناب حاجی دبیر خانصاحب سے مشورہ کیا انہوں نے کہا کہ درس حدیث دین کا کام ہے اس میں انتظامیہ کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے آپ درس شروع کیجئے۔غرض مرکزی جامع مسجد ٹاٹ شاہ میں بروز یکشنبہ بعد نماز عشاء درس صحیح البخاری کا باضابطہ آغاز ہوا جو آج تک مسلسل جاری ہے کتاب الایمان،کتاب الصلوٰۃ،کتاب الزکوٰۃ،کتاب الصوم،کتاب الحج،کتاب البیع والاجارہ اور شفعہ،حوالہ اور کفالہ کی حدیثوں کا بالترتیب درس ہو چکا ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ مولائے کریم اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بخاری کی تکمیل کی توفیق ارزانی نصیب فرمائے۔آمین

آغاز درس:۔مسجد ٹاٹ شاہ میں درس بخاری کا آغاز الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ کے شیخ الحدیث استاذ زمن جامع معقولات ومنقولات حضرت علامہ عبدالشکور صاحب قبلہ مصباحیؔ کے زبان فیض ترجمان سے ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ہوا۔حضرت علامہ عبدالشکور صاحب قبلہ دارالعلوم بہار شاہ قندھاری بازار میں فضیلت کے طلبہ کو صحیح البخاری شریف کا پہلا سبق پڑھانے تشریف لائے تھے دن میں دارالعلوم کے طلبہ کو پڑھایا اور رات میں ٹاٹ شاہ مسجد میں عوام وخواص اور علماء کی موجودگی میں صحیح البخاری کی حدیث کا درس دیا۔اس درس کو کامیاب بنانے میں جناب محمد صابر ومحمد اشتیاق عرف نمو،حاجی اکبر وغیرہم حضرات نے بڑی کوششیں کیں،شہر کے ہر ہر محلہ سے لوگوں کو جوڑا چنانچہ شہر کے اکثر محلہ سے لوگ درس میں شامل ہونے لگے۔اور فضائل ومسائل کی احادیث سن کر قلوب واذہان کو منور کرنے لگے۔ان لوگوں نے اس میں شرکاء کے لئے بعد درس شیرنی کا بھی اہتمام کیا اس کے علاوہ آٹھ دس افراد پر مشتمل سامعین کے لئے چائے ناشتے کا بھی میرے ساتھ انتظام کیا۔اس خدمت کو جناب محمد اکبر صاحب ازہری سالوں سال سے انجام دے

رہے ہیں اور بہت مرتبہ جناب حاجی محمد وسیم صاحب بے بی شو نے بھی اس سعادت میں حصہ لیا۔

جشن صحیح البخاری کا روح پرور منظر:۔ ۱۳؍جنوری ۲۰۱۳ء کے ماہ رجب المرجب شب معراج شریف کے پرنور موقع پر منتظمین درس نے ایک عظیم الشان جشن صحیح البخاری کا انعقاد کیا۔جس میں خصوصی خطاب فرمانے کے لئے استاذی الکریم ممتاز الفقہاء محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب قادری گھوسی تشریف لائے ،شہر اور قرب وجوار کے عوام وخواص ، علماوعمائدین نے اس تقریب سعید میں شرکت فرمائی حضرت علامہ نے بخاری وصحیح البخاری کی عظمت وجلالت ، درس کی اہمیت وافادیت ،معراج شریف کا نورانی منظر اور نماز کی فرضیت پر بھرپور روشنی ڈالی، بیان ایسا مدلل اور مؤثر تھا کہ سامعین کی زبان سے بے ساختہ کلمات تسبیح وتکبیر بلند ہونے لگے۔اس تقریر دلپذیر سے لوگ خوب محظوظ ہوئے اور اپنے قلوب واذہان کو منور ومجلی کیا پھر صلوۃ وسلام قل وفاتحہ اور حضرت علامہ کی دعاؤں پر اس جلسہ کا اختتام ہوا۔بعد سلام شرکاء کے لئے لنگر رسول کا اہتمام تھا سبھوں نے خوب سیر ہوکر لنگر تناول کیا۔اور علماء کے لئے خصوصی دعوت کا اہتمام تھا منتظمین درس نے سارے علماء کی بھرپور ضیافت کی اور نذرانہ کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔اس موقع پر منتظمین درس نے مجھ ناچیز کی زبردست حوصلہ افزائی کی وہ یہ کہ چند رفقاء ومحبین کی مدد واعانت سے ان حضرات نے نئی اکٹیوا گاڑی خرید کر حضرت علامہ کے دست مبارک سے اس کی کنجی عطا کر کے اعزاز بخشا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صمیم قلب سے دعا ہے کہ مولائے کریم انہیں اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے احادیث بخاری کے برکات اور دارین کی سعادتوں سے مالا مال فرمائے ۔اس بزم نور کے سجانے رچانے میں جو حضرات پیش پیش تھے ان میں چند حضرات کے نام یہ ہیں۔جناب محمد صابر صاحب ،محمد اشتیاق عرف نمو صاحب ، حاجی محمد اکبر ازہری ، حاجی محمد مصباح الدین شہاب بوٹ ہاؤس ، حاجی محمد وسیم مینس ٹیلر ، حاجی سلیم حبیبی دلہن ایمپورین ، جمال احمد ، حاجی گلزار احمد ، شہاب خان ، سراج جویلرس ، محمد طفیل ڈالر ، محمد احمد برکاتی ، محمد قمر سیسہ والے ، محمد علیم الدین ، محمد ندیم خاں اور حاجی عبدالوحید مرحوم وغیرہم۔یہ کوئی پہلا اور آخری موقع نہیں تھا جس میں ایسا عالیشان پروگرام منعقد ہوا بلکہ یہ حضرات سال کے اکثر وبیشتر ایام میں خلفاء راشدین ، اور بزرگان دین کے اعراس کے مواقع پر نذر ونیاز اور قل وفاتحہ کی تقریبات اور مجلسوں کا انعقاد بڑی محبت اور عقیدت و احترام سے کرتے ہیں جن بزرگوں کی بارگاہ میں عقیدت ومحبت کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے ان میں حضرات خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین ، شہدائے کربلا ، حضور محبوب سبحانی پیران پیر دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ ، سلطان الہند عطاء رسول حضرت خواجہ غریب نواز ، اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مجدد دین وملت امام احمد رضا فاضل بریلوی ،

حضور مفتی اعظم ہند، حضرت صدر الشریعہ مصنف بہار شریعت، جلالۃ العلم حضور حافظ ملت اور مجاہد ملت حضرت سید حبیب الرحمن رئیس اڑیسہ علیہم الرحمہ وغیرہم مقتدائے اہل سنت کے اسماء مبارکہ شامل ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان بزرگوں کے اعراس اور قل و فاتحہ کا نذرانہ صرف اسی مسجد ٹاٹ شاہ میں پیش کیا جاتا ہے بلکہ الحمد للہ شہر کی بہت سی مسجدوں میں حضرات خلفائے راشدین اور بزرگان دین کے ایام کے مواقع پر قل و فاتحہ اور نذر و نیاز کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں جن میں بلال مسجد سبھاش نگر، جامع مسجد حسنو کٹرہ، مسجد پالکی خانہ، کھیت والی مسجد حسنو کٹرہ، مسجد گوراپٹی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ منتظمین درس مسجد ٹاٹ شاہ نے جشن صحیح البخاری کے پرنور موقع پر جس طرح میری عزت افزائی کی اور تحفہ و تحائف سے نوازا اس میں میری کوئی خصوصیت نہیں بلکہ یہ حضرات مسجد ٹاٹ شاہ میں خدمت کرنے والے علماء اور ائمہ کی موقع بہ موقع ایسی خدمتیں کرتے رہتے ہیں چنانچہ میرے بعد مسجد ٹاٹ شاہ کے سابق نائب امام حضرت مولانا قاری ضمیر صاحب کو بھی ان حضرات نے عمرہ اور زیارت حرمین شریفین سے مشرف کرایا۔ ابھی چند سال پیشتر ۵ ردسمبر ۲۰۱۴ء میں سابق امام وخطیب حضرت قاری قطب الدین قبلہ علیہ الرحمہ جب اپنی کبرسنی اور مرض ونقاہت کے باعث مسجد سے مستعفی ہوکر جانے لگے تو ان کے ۳۵ رسال خدمات کے اعتراف میں شاندار پروگرام منعقد ہوا جس میں شہر کے عوام، علماء اور معززین شریک ہوئے اور ان کی خدمات کو سراہا گیا اور بہت سے ضرورت کے سامان تحفے وتحائف اور نذور کے ساتھ ان کو رخصت کیا غرضیکہ اس شہر کے اکثر سنی مسلمان مخیر حضرات سب قابل تعریف اور مستحق مبارکباد ہیں کہ وہ اپنے علماء وائمہ کی دینی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان کی خدمت وعزت کرتے ہیں مولائے کریم انہیں ان کی خدمتوں کا بدلہ دنیا وآخرت میں عطا فرمائے۔ آمین

(۴) دائحوری مسجد محلہ پرانی سبزی منڈی: شہر فیض آباد کی قدیم مسجد ہے اس مسجد میں بھی جناب محمد عمران خانصاحب اور محمد منور صاحبان نے درس قرآن دینے کے لئے عرض کیا، اپنی مصروفیات کے باوجود میں انکار نہ کرسکا اور بروز پنجشنبہ بعد نماز عصر درس قرآن حکیم کا آغاز ہوا، اس درس میں جناب محمد عمران خانصاحب اور ان کے احباب نے محلہ کے لوگوں کو شریک ہونے کی ترغیب دی، بہت سے نوجوان اور شیوخ حضرات برابر اس درس میں شریک ہوتے رہے۔ خصوصیت کے ساتھ محمد عمران خان، محمد کاشف خان صاحبان برابر نہ یہ کہ شریک ہوتے بلکہ لوگوں کو اکٹھا کرتے اور پابندی کے ساتھ مجھے گھر سے لیجانے اور پہنچانے کا فریضہ ادا کرتے یہ درس پابندی کے ساتھ ہوتا رہا اور آج تک جاری ہے مگر پنجشنبہ بعد عصر کی بجائے اب چہار شنبہ کو بعد نماز عشاء ہوتا ہے چونکہ پنجشنبہ

(جمعرات) کو بعد نماز عشاء جامع مسجد حسنو کڑہ میں بھی درس حدیث دینا ہوتا ہے پھر کبھی بعد مغرب مسجد بلال میں درس قرآن دینے کی ضرورت پڑ جاتی تھی اس طرح کبھی کبھی ایک دن میں تین تین مقامات پر عصر، مغرب، عشاء لگا تار درس ہوجاتا، اس طرح مصروفیت اور محنت زیادہ پڑ جاتی جس سے مجھے پریشانی ہونے لگی اس لئے دائحوری مسجد کے درس کا دن پنجشنبہ بعد عصر کے بجائے چہارشنبہ بعد نماز عشاء کردیا چونکہ یہ دن درس کی مصروفیت سے خالی تھا۔لیکن دن و وقت کی تبدیلی کی وجہ سے نقصان یہ ہوا کہ تاجر پیشہ دکاندار کچھ حضرات درس سے غائب ہوگئے ان لوگوں نے عذر یہ بتایا کہ روز بدھ بوقت عشاء دکانیں بند کرنا پڑتی ہے اس لئے موقع نہیں مل پاتا ہے اور جمعرات کو دکان بند رہتی ہے اس لئے ہم بآسانی اس میں شریک ہوجایا کرتے تھے ایسے حضرات سے ہم گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ درس میں شرکت کی غرض سے اگر آپ اپنے کاروبار کو آدھ گھنٹہ پہلے بند کردیتے ہیں تو اس سے آپ کا کچھ مالی خسارہ ہوسکتا ہے لیکن درس قرآن و درس حدیث میں شرکت کرنے کے سبب جو آپ کو منافعہ ہوگا اس کی برکتوں کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے چنانچہ صحیح مسلم شریف کی وہ حدیث آپ بارہا سننے کی سعادت حاصل کرچکے ہوں گے۔جس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو طلب علم کے لئے کسی راستہ پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیتا ہے اور جب کچھ لوگ اللہ کے کسی گھر میں جمع ہوکر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں پڑھتے پڑھاتے ہیں تو ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے، رحمت الٰہیہ انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ اپنے قرب خاص کے فرشتوں سے اس کا تذکرہ فرماتا ہے اور جس کے عمل نے اسے پیچھے کردیا تو اس کا نسب اسے آگے نہیں کرسکتا۔اس حدیث کو امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔اور درس حدیث کے متعلق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی سماعت کرلیجئے۔آپ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ اس شخص کو تروتازہ اور شادآباد رکھے جس نے میری حدیث کو سنا، اسے یاد کیا اور محفوظ رکھا اور پھر اسے آگے بیان کیا کہ بسا اوقات اہل علم فقیہ نہیں ہوتے اور بسا اوقات فقیہ اپنے سے زیادہ فقیہ تک بات کو پہنچادیتا ہے۔(الخ) اس کو ترمذی، بیہقی وغیرہما نے روایت کیا ہے۔کیا صرف یہی دونوں حدیثیں ہم مسلمانوں کی ترغیب کے لئے کافی نہیں ہیں کہ ہم چند منٹوں کے لئے اپنے کاروبار اور دکان اور دنیاوی مشاغل کو چھوڑ کر درس قرآن وحدیث کی مبارک محفل میں شریک ہوکر دائمی برکتیں حاصل کریں مگر ایسے لوگوں سے کار مستحبات میں شمولیت کی امید کہاں سے کی جاسکتی ہے جو نماز جیسی اہم عبادت فریضہ الٰہیہ کے ترک کے عادی ہوں۔مولائے کریم مسلمانوں کو فہم مستقیم اور توفیق رفیق عطا فرمائے۔آمین

اس وقت حضرت حافظ کریم الحق صاحب پیش امام تھے آپ درس سے بہت خوش تھے آپ نے اس مسجد میں تقریباً ۶۵ سال امامت فرما کر ریکارڈ قائم کیا آپ کی خدمات کے اعتراف میں اہل محلہ نے آپ کو حج بیت اللہ سے مشرف کرایا اب کبرسنی کے باعث مستعفی ہوکر آرام کررہے ہیں ان کی جگہ جناب حافظ وقاری عبدالقیوم خان صاحب پیش امام ہیں آپ نوجواں سال بڑے متحرک فعال امام ہیں درس کی تحریک وتبلیغ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اس کے علاوہ محرم الحرام میں ذکر شہدائے کربلا ۱۰/روزہ، عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر بارہ روزہ اور گیارہویں شریف کے موقع پر گیارہ روزہ پروگرام بھی پابندی سے منعقد کرتے ہیں۔ انھی کے مسلسل اصرار اور تحریک پر اب ہر ماہ کی پہلی چہارشنبہ کی شب کو درس حدیث شریف کا بھی پروگرام ۴، ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ سے شروع ہو چکا ہے، یہ سارے دینی پروگرام امام مسجد عبدالقیوم صاحب اور مؤذن ببلو صاحب کی محنتوں سے انجام پاتے ہیں مولائے کریم ان حضرات کی خدمتوں کو قبول فرمائے آمین۔

(۵) بلال مسجد سبھاش نگر: شہر کی بڑی اور مشہور مسجدوں میں سے یہ دوسرے نمبر کی مسجد ہے اس مسجد کی جدید تعمیر وتوسیع جناب حاجی محمد قاسم صاحب وارا کین کی زیر نگرانی ہوئی ہے جناب حاجی قاسم نے اس کی تعمیر وتوسیع کے لئے کئی بار ممبئی تک سفر کیا بڑی محنت کی اور اس کو عالیشان مسجد بنانے میں اہم کردار ادا کیا، آج شہر فیض آباد کی مسجدوں میں جو قرآن وحدیث کے درسوں کا سلسلہ جاری ہے یہ حاجی صاحب کی ہی ترغیب کا نتیجہ ہے چنانچہ آپ نے بتایا کہ جب میں ۱۹۷۹ء میں حج بیت اللہ کے لئے سمندری جہاز کے ذریعہ حرمین شریفین گیا تھا تو وہاں حرم شریف میں ایک حاجی صاحب نے درمیان گفتگو مجھ سے تاکیداً کہا کہ مسجدوں میں درس قرآن وحدیث شروع کرائیے اس لئے کہ مسلمان کو اگر قرآن وحدیث کا ترجمہ اور معنی مطلب معلوم نہ ہو تو افسوسناک بات ہے ان کی یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی اور حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد میں نے شہر کی مختلف مساجد کے ائمہ کرام سے اس سلسلہ میں بات چیت کیا ذہنی طور پر ان حضرات کو جب تیار نہیں دیکھا تو ان سے گذارش کیا کہ کم از کم ضروری مسائل ہی سے متعلق کسی فقہی کتاب کا روزانہ درس دیجئے تاکہ عوام کو ضروری مسائل معلوم ہوسکیں اس کے لئے میں نے ان کو ایک ایک کتاب نظام شریعت حوالہ کیا کہ اس کی روشنی میں آپ لوگوں کو مسائل بتائیں وہ حضرات لیکر تو گئے لیکن کتاب طاق نسیان پر دھری کی دھری رہ گئی پھر میں نے اپنی مسجد بلال میں درس قرآن کرانے کا حتمی فیصلہ کیا اور اس کے لئے اس وقت دارالعلوم بہارشاہ قندھاری بازار کے ایک باصلاحیت مدرس حضرت مولانا مفتی محمد عزیر صاحب پورنوی سے بات چیت کیا وہ درس

دینے کے لئے تیار ہو گئے پس آغاز درس کی تاریخ کا اعلان ہوا مقررہ تاریخ پر شہر بھر کے علماء وائمہ اور عوام کی کثیر تعداد شریک ہوئی مگر نہ جانے کیا ہوا کہ عین موقع پر مولانا مذکور درس دینے سے منکر ہو گئے اچانک ان کے انکار کر دینے سے ہم لوگوں کو زبردست صدمہ ہوا اور سخت تکلیف ہوئی مگر اس مجلس میں تشریف فرما حضرت مولانا قاری قطب الدین صاحب امام مرکزی جامع مسجد ٹاٹ شاہ نے عزت بچائی اور درس قرآن کا آغاز فرمایا اس درس میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ، تفسیر اور فضائل ومسائل بیان فرمائے۔آپ چونکہ مسجد ٹاٹ شاہ کے امام تھے امامت کے فرائض کے علاوہ آپ کی بہت سی مصروفیات تھیں جن کی وجہ سے آپ پابندی کے ساتھ مسجد بلال میں درس نہیں دے سکتے تھے اس لئے حضرت مولانا محمد مشتاق صاحب حبیبی سے درس قرآن دینے کی گذارش کی گئی آپ نے ہماری گذارش کو قبول فرمایا اور ۱۹۸۴ء سے پابندی سے درس قرآن دینے لگے آپ کا طریقہ درس بہت آسان، قابل فہم اور مؤثر تھا شہر کے بہت سارے محلوں سے لوگ درس میں شریک ہوتے اور اس کے فیوض و برکات حاصل کرتے۔حضرت مولانا حبیبی نے بڑی محنت اور تسلسل کے ساتھ درس دیا جس کا ثمرہ یہ ہوا کہ چند سالوں میں پورا قرآن حکیم مع ترجمہ وتفسیر اختتام پذیر ہو گیا۔ختم قرآن حکیم کے پرنور موقع پر جشن ختم قرآن کا جلسہ بڑی شان وشوکت اور تزک واحتشام کے ساتھ منعقد ہوا جس میں عظمت قرآن پر حضرت علامہ عبید اللہ خان اعظمی کا زبردست خطاب ہوا اور مولانا حبیبی کی خدمات کو سراہا گیا۔اور عملی طور پر منتظمین وشرکاء درس مسجد بلال نے حضرت مولانا حبیبی صاحب کو مع ان کی اہلیہ، اہل خیر حضرات کے تعاون سے حج بیت اللہ کے لئے ۲۰۰۱ء میں روانہ کیا۔مولانا نے پھر از سر نو درس قرآن شروع فرمایا اس کا آغاز حضرت مولانا ظہیر الدین خاں صاحب قبلہ فیض آبادی بمبئی کے زبان فیض ترجمان سے ہوا ابھی نصف قرآن حکیم کا درس ہوا تھا کہ حضرت مولانا حبیبی صاحب ۱۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء میں انتقال فرما گئے ان کے بعد لوگوں کی فرمائش پر حضرت مولانا محمد ایوب صاحب رضوی سابق پرنسپل الجامعۃ الاسلامیہ رونا ہی نے مسجد بلال میں قرآن کا درس شروع کیا، آپ رونا ہی سے آکر ہر جمعرات کو بعد نماز مغرب پابندی کے ساتھ درس قرآن حکیم دیتے ہیں۔اب تک قرآن حکیم مکمل ہو جاتا مگر کرونا وائرس کیوجہ سے تقریبا پانچ ماہ سے مسجدوں میں جانا قانونا ممنوع ہے اس لئے درس بھی موقوف ہے مختصر یہ کہ درس قرآن بلال مسجد سبھاش نگر میں لمبے عرصہ سے ہوتا آرہا ہے البتہ درس حدیث نہ ہوتا تھا اس کے لئے حاجی صاحب نے مجھ سے کہا میں ان کی فرمائش کو نہیں ٹال سکتا تھا اس لئے حامی بھر لی اور بلال مسجد میں بروز دوشنبہ مبارکہ بعد نماز عشاء حدیث کے درس کی ذمہ داری قبول کر لی۔الحمد للہ درس حدیث شروع ہوا اور تا ہنوز جاری ہے جس میں ایمان وعقائد،

طہارت ونماز کا بیان مکمل ہو چکا ہے اور زکوٰۃ وصدقات کا بیان جاری تھا کہ لاک ڈاؤن کا گورنمنٹی آرڈر آ گیا۔ حاجی صاحب ان کے بھائی ،لڑکے ، بھتیجے بالخصوص ماسٹر توصیف صاحب،محمد شہنشاہ اور اس مسجد کے امام جناب قاری معروف صاحب وغیرہ سب درس کو کامیاب بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔لوگوں کو درس میں شریک ہونے کی دعوت و ترغیب دیتے رہتے ہیں پھر درس کے بعد شیرنی تقسیم ہوتی ہے اس کا انتظام جناب محمد سراج صاحب راعینی بیج والے کرتے ہیں اور درس قرآن وحدیث کے لئے ناشتہ اور چائے نوشی کا اہتمام بھی ہوتا ہے اور چونکہ میرا درس حدیث کا پروگرام بعد نماز عشاء ہوتا ہے اس لئے حاجی صاحب میرے لئے پرتکلف دعوت طعام کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔درس قرآن وحدیث کے علاوہ محرم الحرام کے عشرہ اولیٰ میں ذکر شہدائے کربلا کا دس روزہ پروگرام، ربیع الاول شریف میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گیارہ روزہ پروگرام اور پھر آخری دن لنگر رسول کا اہتمام ہوتا ہے۔اس کے علاوہ خلفاے راشدین، ازواج مطہرات، امہات المومنین، اولیاے کرام وبزرگان دین کے ایام واعراس کے مواقع پر بھی ان کی یاد میں محافل ایصال ثواب منعقد ہوتی ہیں۔ان سارے پروگرام کا انتظام وانصرام اور محافل کے اخراجات جناب ماسٹر محمد توصیف صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ انجمن عاشقان رسول سبھاش نگر کے بینر تلے کرتے ہیں مولائے کریم ان سب کو ان کی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔آمین

(۶) قادری مسجد نیاواں: اس مسجد میں بروز منگل بعد نماز عشاء حدیث شریف کا درس تقریبا آٹھ سال سے جاری ہے۔اس درس کے لئے محلہ نیاواں کے احباب بالخصوص محمد افضال قریشی، حاجی محمد امین خان اور عبدالجبار قریشی وغیرہ نے عرض کیا۔ان لوگوں کی گذارشات کو بھی میں رد نہ کرسکا بالآخر ۲؍فروری ۲۰۱۴ء میں، بکرا منڈی قادری مسجد محلہ نیاواں میں باضابطہ درس کا آغاز ہوا امام مسجد قاری صلاح الدین، جناب حاجی امین خانصاحب اور محمد افضال صاحبان نے بہت کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ درس میں شریک ہوکر اس کے فیوض وبرکات سے مالا مال ہوں۔مگر لوگ توجہ نہیں دیتے اولاً تو نماز باجماعت میں شرکت سے دور رہتے ہیں اور جو جماعت میں شریک بھی ہوتے ہیں ان میں اکثر درس کی اہمیت نہیں سمجھتے اس لئے نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے وہ حضرات تازیانہ عبرت ہیں جو کاروباری اور تاجر پیشہ ہونے کے باوجود، نہ یہ کہ صرف اپنے محلہ کے درس میں شامل ہوتے ہیں بلکہ ہر ہر مسجد کے درس میں شریک ہونا ضروری اور بڑی سعادت سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ مولائے کریم ان کی شرکت وحاضری کو قبول فرمائے اور درس قرآن وحدیث کے فیوض وبرکات سے دارین میں مالا

مال فرمائے۔اہل محلہ کی عدم دلچسپی کو دیکھ کر درس بند دینے کا ارادہ کیا مگر چند احباب کے اصرار پر تا ہنوز جاری ہے گو کہ چند ہی حضرات اس سے مستفید ہوتے ہیں بہر حال جو حضرات شریک درس ہوتے ہیں وہ قابل مبارکباد اور مستحق اجر و ثواب ہیں بالخصوص منتظمین درس جناب قاری صلاح الدین صاحب امام مسجد، افضال قریشی، حاجی امین خاں اور عبدالجبار قریشی وغیرہم خصوصی دعاء کے مستحق ہیں کہ ایسی بے حسی کے ماحول میں نہ یہ کہ صرف درس جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ اہل محلہ کی امداد و معاونت سے محرم الحرام میں ذکر شہدائے کربلا کا دس روزہ پروگرام اور ربیع النور شریف میں عید میلاد النبی کا ۱۲ روزہ محفل میلاد بڑی محبت و محنت سے کیا کرتے ہیں علاوہ ازیں ہر سال پابندی کے ساتھ جشن درس حدیث کا خصوصی پروگرام کرتے ہیں جس میں خصوصی انتظام کے ساتھ کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور پیش کرتے ہیں۔اللہ رب العلمین ان سب کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنی شان کریمی کے مطابق اجر جزیل عطا فرمائے۔آمین

(۷) مدینہ مسجد بچھڑا سلطانپور: یہ محلہ قلب شہر سے تقریباً دو کلومیٹر دوری پر جانب شرق واقع ہے، ضرورت مند کے علاوہ روزانہ ہر آدمی شہر نہیں آسکتا پھر ہر آدمی کے پاس ذرائع بھی نہیں ہوتے، علاوہ ازیں بوڑھے ضعیف کمزور اور بیمار کہاں نہیں پائے جاتے حالانکہ ایسے ہی بے دست و پا شیوخ وضعفاء مرد وزن، دینی باتیں بزرگوں کے واقعات اور سیرت طیبہ کے دلکش روایات سننے کے خواہاں ورشوقین ہوتے ہیں، ایسے ہی لوگوں تک دینی و علمی معلومات بہم پہنچانے کے لئے جناب محمد کلام صاحب نے اپنے محلہ بچھڑا سلطانپور کی مدینہ مسجد میں بھی درس کے لئے عرض کیا، مدرسہ میں تدریسی خدمات، کار افتاء کی مصروفیت، بلا ناغہ روزانہ ایک ایک مسجد میں درس کی مشغولیت و دیگر مصروفیات کے سبب میرے پاس مطلقاً وقت نہیں تھا کہ میں حامی بھرتا مگر کلام صاحب کا اصرار اور جناب صابر صاحب سابق متولی مسجد ٹاٹ شاہ کی سفارش و تائید کے سبب ہاں کہنا پڑا پس بروز جمعرات بعد نماز مغرب بچھڑا سلطانپور مدینہ مسجد میں بھی درس حدیث کا آغاز ہوا۔اور الحمد للہ یہ درس بھی چل رہا ہے۔اس درس کے خصوصی منتظمین میں جناب محمد کلام و محمد امین صاحبان ہیں بروز درس، اعلان کرتے ہیں لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں شیرنی کا بھی انتظام کرتے ہیں اور پر تکلف ناشتہ و چائے نوشی بھی کراتے ہیں کبھی مصافحہ بھی کر لیتے ہیں مولائے کریم ان حضرات کی بھی خدمتوں کو قبول کا شرف عطا فرمائے۔اور دارین کے حسنات و برکات سے مالا مال فرمائے آمین۔واضح رہے کہ یہ شہر کی سات مسجدوں میں درس قرآن و حدیث ہونے کا بیان تھا جو خود مجھ سے متعلق ہے ورنہ الحمد للہ حقیقت یہ ہے کہ شہر کے بہت سے علمائے اہل سنت اور ائمہ مساجد مختلف مساجد میں درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور اصلاح و تبلیغ دین کا کام اپنے اپنے طور

پر کررہے ہیں مولیٰ تعالیٰ سب کی خدمات کو شرف قبول عطا فرمائے آمین

واضح رہے کہ چند مسجدوں میں درس قرآن وحدیث کا حال میں نے اسلئے بیان کردیا تاکہ آئندہ نسلیں، متولیان مساجد اور یہاں کے ائمہ وعلما ہم لوگوں کے بعد بھی یہ مبارک سلسلہ جاری رکھیں اور فقیر سراپا تقصیر کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

اس مقام پر اگر ہم اشرفی مسجد وخانقاہ اشرفیہ مالیگاؤں مہاراشٹر کے درس قرآن کا ذکر نہ کریں تو بات نامکمل ہوگی اور ناسپاسی بھی کہی جائے گی اس لئے ذیل میں چند جملے وہاں کے درس کے بارے میں سپرد قلم کررہے ہیں۔

اشرفی مسجد مالیگاؤں: شہر مالیگاؤں مسلمانوں کا اکثریتی آبادی والا علاقہ ہے۔ یہاں بہت سے اسلامی فرقے اور ہر مشرب ومسلک کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اہل سنت وجماعت کے حلقوں میں اشرفیوں کا ایک بہت بڑا حلقہ موجود ہے۔ جہاں اشرفی مسجد اور خانقاہ اشرفیہ، اور مدرسہ اشرفیہ سب موجود ہیں اشرفی برادران طریقت مالیگاؤں نے مجھے درجنوں سے زائد بار مدعو کیا، جب موقع رہا میں ضرور پہنچا، کبھی جلسہ عید میلاد النبی میں کبھی ذکر شہدائے کربلا، کبھی افتتاح صحیح البخاری کے لئے کبھی مدرسہ اور مسابقہ حفظ حدیث میں شرکاء طلبہ کے امتحانات کے لئے متعدد بار جانا ہوا، اسی طرح کسی دینی اجلاس میں شرکت کی غرض سے ۲۰۱۰ء میں وہاں جانا ہوا تھا الاشرف اکیڈمی مالیگاؤں کے برادران طریقت نے دوران گفتگو خواہش ظاہر کیا کہ ہم لوگ اپنی مسجد میں ہفتہ وار درس قرآن کرانا چاہتے ہیں میں نے اس کی تائید کی اور مزید اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور فیض آباد میں درس قرآن وحدیث دیئے جانے کا بھی ذکر کیا، پس ان حضرات نے اشرفی مسجد مالیگاؤں میں درس کرانے کا مکمل فیصلہ کرلیا اور اتنے جذباتی ہوگئے کہ اسی رات افتتاح درس کا پروگرام بنالیا اور مجھ سے عرض کیا کہ آج آپ افتتاح کردیجئے اور ہم لوگ اپنے کسی عالم کو درس کے لئے مقرر کردیں گے۔ ان حضرات کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے قرآن کی عظمت وبرکت، اس کے مقام ومرتبہ تدوین قرآن اور درس قرآن کی اہمیت وافادیت کے عنوان پر ایک تقریر کرکے افتتاح کردیا۔ درس قرآن کا یہ افتتاحی پروگرام بہت شاندار اور کامیاب ہوا شہر مالیگاؤں کے مختلف محلوں سے کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے مجھے تو صرف افتتاح کے لئے کہا گیا تھا سو وہ میں نے بفضلہ تعالیٰ کردیا مگر بعد ختم پروگرام الاشرف اکیڈمی کے ارکان اور دوسرے احباب نے مجھ سے گذارش کیا کہ جس انداز میں اس کا افتتاح ہوا ہے اسی انداز میں اس کا درس بھی ہونا چاہئے لہٰذا ہم ارکان اور عوام کی خواہش ہے کہ کم از کم مہینہ میں ایکبار آکر آپ درس دے دیں مہربانی ہوگی ان حضرات کے

زبردست اصرار کرنے پر میں نے ان کی بھی گذارش کو قبول کرلیا اور تقریبا دو سال ہر ہر مہینہ اور کبھی دوسرے مہینہ پر فیض آباد سے جا کر درس دینا شروع کیا جمعرات کے دن ساکیت ایکسپریس فیض آباد سے جاتا اور جمعہ کی عصر تک وہاں پہنچتا، بعد نماز عشاء درس قرآن دیتا پھر عشائیہ تناول کر کے اسی شب رخت سفر باندھ لیتا ہفتہ کا پورا دن سفر میں رہتا شب یکشنبہ کے پچھلے پہر فیض آباد پہنچتا اور یکشنبہ کو مدرسہ میں حاضری ہوتی یہ سلسلہ تقریبا دو سال چلا اس طرح رب کریم کے فضل وکرم سے سورہ فاتحہ کا درس اختتام کو پہنچا ان حضرات نے چونکہ اس میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا کثیر تعداد میں لوگ شریک ہونے لگے اس لئے میں بھی اس کی تفصیل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا پس میں اس میں سورہ فاتحہ کے فضائل و برکات، اس کے اسماء مبارکہ اور اس کی وجوہ تسمیہ، اس کے مسائل واحکام، اس کی تفسیر، اس کے ضمن میں لطائف واسرار، عقائد وایمانیات واقعات وحکایات اور عقائد واحکام میں اختلافات ائمہ وغیرہ معلومات کو سامعین کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا، الحمدللہ یہ کوشش کامیاب ہوئی، زیر نظر کتاب ''تفسیر سورہ فاتحہ'' اسی سفر کا نتیجہ وثمرہ ہے چونکہ سفر میں تفسیر کی ایک دو کتاب بالخصوص تفسیر رازی ساتھ رہتی پورے سفر میں زیر مطالعہ رہتی اور اسی کی روشنی میں درس ہوتا، پھر رب تعالیٰ کی توفیق وتائید سے ان سب کو صفحۂ قرطاس پر جمع کرنے کا جذبہ وداعیہ پیدا ہوا رفتہ رفتہ مواد اکٹھا کرتا رہا جس میں کئی سال لگ گئے یہاں تک کہ کتاب منصۂ شہود پر آ گئی، اس لئے ہم الاشرف اکیڈمی کے ارکان اور شرکاء بالخصوص حافظ ضیاء الرحمن اشرفی مولانا رمضان قدیری، حافظ سفیان اشرفی، محمد ساجد اسماعیلی اشرفی، محمد ابراہیم اشرفی، محمد ساجد اشرفی سابق لائبریرین جامع اشرف حافظ ساجد اشرفی اور عزیزم مولانا عارف اشرفی وغیرہم بہت بہت شکر وامتنان اور دعاء کے مستحق ہیں کہ ان حضرات نے مسلسل دو سال تک نہ یہ کہ اخراجات سفر برداشت کئے بلکہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے ہمت افزائی کی اور میری کتاب دس بیبیوں اور سیدہ کی کہانی طباعت کرا کر مفت تقسیم کرائی ہم ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعاء گو ہیں کہ مولائے کریم ان سب کو دارین کی سعادتیں وبرکتیں عطا فرمائے آمین۔

کتابت، طباعت: اس راہ کا ہر مسافر بخوبی جانتا ہے کہ کتاب کی تصنیف وتالیف اور ترتیب کے بعد اس کی کتابت وطباعت کے مراحل نہایت دشوار گذار اور صبر آزما ہوتے ہیں سب سے بڑا مسئلہ کتابت وطباعت کے اخراجات کا ہوتا ہے ہم جیسے لوگ ذاتی طور پر اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے البتہ کوئی تنظیم کوئی انجمن، اہل خانقاہ ادارہ وارا کین مدرسہ یا کوئی صاحب ثروت مخیر ودیندار شخص کا اشتراکی تعاون ہوجاتا ہے تو کتابت وطباعت کے

مراحل بآسانی طے ہوجاتے ہیں۔الحمدللہ میں نے اس سلسلہ میں جس کسی سے بھی بات کی سبھوں نے نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کے چھپوانے کی ذمہ داری لے لی اس سلسلہ میں ہماری مرکز عقیدت کے سجادہ نشین مخدوم گرامی وقار قائد ملت شیخ طریقت حضرت علامہ مولانا شاہ سید **محمود اشرف اشرفی الجیلانی** اور ان کے برادر عزیز اشرف ملت حضرت **سید اشرف اشرفی الجیلانی** صدر علماء ومشائخ بورڈ کا بے حد ممنون و متشکر ہوں کہ آپ حضرات نے فرمادیا ہے کہ آپ جو کچھ لکھیں چھپوانے کی فکر چنداں نہ کریں چھپوانے کی میری ذمہ داری ہے چنانچہ اس سے پہلے بھی مسلم الثبوت کی شرح اشرف النعوت کو حضرت اشرف ملت نے اپنی طرف سے چھپوا کر خوبصورت ٹائیٹل پیج کے ساتھ شائع کیا تھا جو علماء کے مابین مقبول ہوکر داد تحسین حاصل کرچکی ہے، اس کتاب کو بھی حضرت قائد ملت نے نہ یہ کہ چھپوانے کا اشاریہ عطا فرمایا بلکہ کلمات تبریک لکھ کر کتاب کو مزید بابرکت بنادیا اور ناچیز کو سند اعتبار عطا فرمادیا، مگر یہاں فیض آباد کے احباب کو جب معلوم ہوا تو ان حضرات نے اس کو چھپوانے کی پیشکش کی اس سلسلہ میں ان میں سب سے پیشتر جناب محمد صابر صاحب سابق متولی ٹاٹ شاہ نے ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار گھر آکر مسودہ طلب کیا کہ آپ دیجئے میں اس کی کتابت کرادوں اور پھر ہم لوگ ہی اس کی طباعت کرائیں گے مگر میں اس کی کتابت اپنی نگرانی میں کرانا چاہتا تھا تاکہ جہاں کہیں کم وبیش، حشو وزوائد اور حذف واضافہ کی ضرورت پڑے بروقت اس کی تہذیب واصلاح کرلی جائے اس لئے ان کا بے حد ممنون ہوں کہ سب سے پہلے موصوف ہی اس کی کتابت وطباعت کے لئے آمادہ ہوئے پس میں نے اس کی کتابت کے لئے اپنے دارالعلوم کے شعبہ کمپیوٹر کے مدرس جناب حافظ ریاست علی صاحب کا انتخاب کیا حافظ صاحب حافظ قرآن ہونے کے ساتھ درجہ حفظ وقرأت سے فارغ ہیں اور کمپیوٹر سے کتابت کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں انہوں نے بڑی محنت ومشقت اور عرق ریزی کے ساتھ اس کی کتابت کی ان کے پاس کام کی مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ تقریبا دوسال لگ گئے بہرحال ان کی محنت سے کتاب مرحلہ کتابت سے گذر کر طباعت کے منزل میں آگئی ہم ان کو ان کی محنتوں کا کماحقہ اجر نہیں دے سکتے البتہ ان کے شکر گذار ہیں اور دعاء گو ہیں کہ مولائے کریم ان کو ان کی خدمتوں کا بہترین اجر عطا فرمائے۔آمین

اب میں اپنے مدرسہ دارالعلوم بہارشاہ کے خازن الحاج محمد دبیر خان صاحب کے خلف اکبر جناب محمد ندیم خانصاحب کا اور صدر مدرسہ جناب آفاق خان صاحب کے صاحب زادہ جناب محمد کاشف صاحب کا اور ان کے دوست جناب محمد عمران خان صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کتابت کے اخراجات برداشت کئے اور اول الذکر نے طباعت میں بھی تعاون کیا، کرایا اور بار بار جلد از جلد کتاب کو منظر عام پر لانے کا تقاضہ کرتے

رہے۔ساتھ ہی فیض آباد کے ان تمام احباب اور مخیر حضرات اور بیرون فیض کے ان تمام اشرفی برادران طریقت کا صمیم قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کی طباعت واشاعت میں بڑھ چڑھکر حصہ لیا، رب کریم ان سب کو، ان کے والدین اور اہل وعیال کو انکی دینی خدمات اور نیک خواہشات وجذبات کا خوب خوب اجر وثواب عطا فرمائے۔

آخر میں، میں اپنے مدرسہ کے منیجر جناب الحاج ڈاکٹر محمد قمر ماہری حبیبی صاحب اور جملہ ارکان جناب مسلم شاہ صاحب سرپرست، حضرت مولانا وصی احمد صاحب نائب سرپرست وسابق شیخ الحدیث دارالعلوم ہذا، محمد آفاق خانصاحب صدر، جناب ڈاکٹر شریف صاحب نائب ناظم، محمد لئیق صاحب نائب صدر، ایڈوکیٹ محمد عتیق خانصاحب، ایڈوکیٹ محمد نفیس خانصاحب، محمد قمر الدین صاحب، محمد ضمیر خانصاحب، محمد سلیم صاحب اور ماسٹر جمال خان وغیرہم کی خدمت میں ہدیہ تشکر وامتنان پیش کرتا ہوں کہ ان حضرات نے مجھے شہر کی مختلف مساجد میں اور یہاں تک کہ مالیگاؤں میں آزادی کے ساتھ درس دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں اراکین میں سے کبھی کسی نے بھی مجھے کبھی تکلیف دہ اور ناگواری کے کلمات نہیں کہے اور نہ اس سے روکنے کی کوشش کی بلکہ ہمیشہ ہمت افزائی اور مدح سرائی کرتے رہے ان میں جناب ماسٹر جمال احمد خان صاحب رکن دارالعلوم ھذا ومتولی مرکزی جامع مسجد ٹاٹ شاہ مزید شکر کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس کتاب کی طباعت میں بھی خوب تعاون کیا، رب العٰلمین سب کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے اور دین ودنیا کے حسنات و برکات سے مالا مال فرمائے اور جو گذر چکے ان کی مغفرت فرمائے۔آمین

ہمارے دارالعلوم کے سارے مدرسین وملازمین کا بھی مجھ پر حق عائد ہوتا ہے کہ میں انکا ذکر خیر کروں اور ان حضرات کی بارگاہ میں بھی ہدیہ تشکر کے کلمات پیش کروں کہ انہوں نے اپنے نیک اور مفید مشوروں سے نوازا ہمت افزائی فرماتے رہے لہٰذا میں نہایت ہی صمیم قلب کے ساتھ حضرت علامہ مولانا انوار احمد نعیمی پرنسپل دارالعلوم ہذا، حضرت علامہ مولانا وصی احمد قادری سابق انچارج پرنسپل وشیخ الحدیث دارالعلوم ہذا، حضرت علامہ سراج الدین احمد نظامی، حضرت علامہ مفتی شمس القمر صاحب فیضی، حضرت علامہ مفتی رفیع الزماں صاحب مصباحی، حضرت قاری عظیم اللہ صاحب جناب ماسٹر انوار صاحب وغیرہم سب کا شکر ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مولائے کریم دارالعلوم کے سارے سابق ولاحق اساتذہ، مدرسین وملازمین کی عمر، علم، عمل اور اقبال میں زیادتی وبلندی عطا فرمائے خصوصیت کے ساتھ پرنسپل ادارہ حضرت مولانا انوار احمد نعیمی کا شکر گذار رہوں کہ آپ نے اپنی ضعف ونقاہت کے باوجود میرے تعارفی کلمات ازخود تحریر فرمائے یہ آپ کی خوردنوازی اور میری ہمت افزائی کا سامان ہے ورنہ حقیقت کیا ہے من آنم کہ من دانم مولائے کریم حضرت کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور صحت وسلامتی کے ساتھ رکھے۔آمین پرنسپل کے ساتھ اگر سابق انچارج پرنسپل وشیخ الحدیث

اور نائب سربراہ اعلی دارالعلوم ہذا یعنی حضرت مولانا وصی احمد صاحب کا ذکر نہ کروں تو بڑی ناشکری ہوگی کیوں کہ حضرت نے اپنے انچارجنگ کے عہد میں مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی چنانچہ بڑی آزادی کے ساتھ میں نے مساجد میں درس قرآن ودرس حدیث دیا، دینی پروگرام اور سالانہ جلسے میں شرکت کیا لیکن کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ محبت سے پیش آئے، غائبانہ تعریفی کلمات سے نوازتے رہے، اس حقیر سراپا تقصیر کے لئے حضرت کے دل میں جو محبت کارفرما ہے اس کا بخوبی اندازہ آپ کے اس تاثراتی کلمات تحسین ہوگا جس کی کاپی کتاب ہذا کے ساتھ منسلک ہے حضرت کی اس کرم نوازی کا ہم شکریہ نہیں ادا کر سکتے، ہم تہہ دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ رکھے اور دارالعلوم بہار شاہ پر آپ کا سایہ تادیر قائم رہے آمین۔

بڑی ناشکری اور ناسپاسی ہوگی اگر ہم اس موقع پر جناب بھائی محمد عرفان بن محمد کمال مرحوم بالک رام کالونی، کی درس حدیث و درس قرآن کے سلسلے میں خدمات کا ذکر نہ کریں۔ جناب محمد عرفان صاحب نے دو چار دن نہیں بلکہ دسیوں سال سے روزانہ بلا ناغہ سردی، گرمی، برسات ہر موسم میں مجھے اپنی گاڑی پر بٹھا کر درس دینے کے لئے گھر سے لے جاتے اور گھر پہنچاتے، بلکہ شہر کے باہر دوسرے اضلاع، گونڈہ، بستی، امبیڈکر نگر خاص ایودھیا اور سلطانپور وغیرہ میں سینکڑوں بار میرے ساتھ پروگرام میں گئے آئے، یہ سارا کام انہوں نے خوشدلی سے، فی سبیل اللہ کیا جب کہ درس و تدریس ہو یا دینی پروگرام ہر جگہ میں خود جا سکتا تھا کہ میرے پاس خود بھی آمدورفت کی سہولت میسر ہے ہے مگر درس کے لئے وہ مجھے اپنی گاڑی پر لے جاتے ہیں حالانکہ اس خدمت کی وجہ سے انہیں ان کے اپنے بیگانے کا تختۂ مشق اور ہدف ملامت بننا پڑا لوگوں نے انہیں ڈرائیور کے غیر مہذب لقب سے بھی نوازا لیکن وہ اپنی خدمت سے باز نہ آئے لہٰذا میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ ان کا شکر گذار ہوں اور غائبانہ دعا کرتا ہوں کہ رب کریم ان کو، ان کے اہل وعیال کو، ان کی خدمتوں کا دارین میں بہترین جزا عطا فرمائے۔ آمین

میں نے اپنی یادداشت پر اعتماد کر کے جا بجا منتظمین درس اور اس کتاب کی کتابت و اشاعت میں دامے درمے قدمے سخنے حصہ لینے والے احباب کا نام کتاب کے آخر میں ذکر کر کے ہدیہ تشکر و دعا پیش کیا ہے ان حضرات میں جن کا نام لکھنے میں چھوٹ گیا ہے ہم ان سے معذرت کرتے ہیں اور ان کے لئے اور تمام شرکائے درس کے لئے بھی دعا کرتے ہیں کہ اے خالق ارض وسماوات سب کو دارین کی سعادتوں سے مالا مال فرما۔ آمین

آخر میں اس کتاب کے قارئین سے گذارش کرتے ہیں کہ مجھ ناچیز سراپا تقصیر کے حق میں آپ دل سے دعا کریں کہ مولائے کریم اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میری اس خدمت کو قبول فرمالے اور میرے، میرے والدین اہل وعیال احباب واقربا میرے مشائخ واساتذہ اور اس کے قارئین ومعاونین سب کے لئے نجات کا ذریعہ بنائے۔

بالخصوص حضرات علماء ذوی الاحترام کی بارگاہ علم وادب میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ اپنی خصوصی دعامیں یادرکھیں اور عرض ہے کہ میں نے چند تفاسیر بالخصوص تفسیر رازی وبیضاوی کے حوالے سے سورہ فاتحہ کے معانی ومطالب اور نکات و لطائف بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔رازی کا مزاج اور بیضاوی کا انداز اہل علم کو معلوم ہے کہ ان کے کلام میں فلسفیانہ موشگافیاں اور منطقیانہ چیستاں کی بھرمار ہوتی ہیں اس لئے اس تفسیر میں کہیں قدامت کے جاہ وجلال کا احساس ہوگا تو کہیں جدیدیت کے حسن وجمال سے لذت آشنائی ہوگی،کہیں قرآن کی آیات اور صاحب قرآن کے ارشادات سن کر قلوب واذہان منور ومجلی ہونگے تو کہیں دور وتسلسل کی تقریر سے آپ کا ذہن مکدر ہو جائیگا اس لئے قبل از وقت مجھے معاف کردیجئے اور یقین کیجئے کہ علم دین کی باتوں کے سمجھنے کی کوشش میں جو تنگدلی پیدا ہوتی ہے اس پر بھی اجر وثواب ملتا ہے۔یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ میری کتاب کی عمارت تفسیر کبیر کی اساس پر قائم ہے اس لئے مسائل اور نکات ولطائف ذکر کرنے کے بعد کوئی حوالہ نہیں پیش کیا ہے البتہ دوسری کتابوں سے جو کچھ اخذ کیا ہے اس کتاب کا نام ذکر کردیا ہے تاکہ قارئین کا اعتماد بحال رہے تاہم تعیین صفحات کا التزام نہیں کیا ہے۔اسی طرح تعوذ وتسمیہ اور سورہ فاتحہ کے فضائل وبرکات بیان کرنے میں جو احادیث واخبار ذکر کی گئی ہیں ان میں سے کچھ روایتوں کے سلسلے میں اسناد ومتون کے اعتبار سے،اپنے بیگانے کو ضعاف ہونے کا شکوہ ہوسکتا ہے،مگر یہ امر بھی مسلم ہے کہ باب فضائل میں ضعاف معتبر ہیں اس لئے حضرات مفسرین نے بھی ایسی روایتوں کے ذکر کرنے سے احتراز نہیں فرمائے ہیں پس ان کی متابعت میں میں نے بھی ان روایتوں کو انھیں کی کتابوں سے نقل کرلیا ہے تاکہ عوام مسلمین کے لئے ترغیب کا سامان فراہم ہوجائے،مختصر یہ کہ اللہ رب العلمین کی کتاب قرآن حکیم کی خدمت کے حوالے سے میری یہ معمولی کوشش آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے میری کوشش کہاں تک کامیاب ہے اس کا فیصلہ آپ پر ہے کمال صحت کے التزام کے باوجود خطاونسیان کا سرزد ہوجانا بشری تقاضا ہے جن صاحبان علم کو جہاں کہیں کوئی لفظی،معنوی اور علمی وادبی خامی نظر آئے وہ میری فہم ناقص کا قصور سمجھیں حضرات مفسرین کرام کا دامن اس سے پاک ہے آپ بذات خود اغلاط کی اصلاح کرلیں اور مجھے بھی مطلع فرمادیں قبول حق و صواب میں آپ مجھے سنجیدہ پائیں گے۔

فقط والسلام

محتاج دعا۔۔۔ابوالحسنات محمد معین الدین اشرفی مصباحی

۸/ جمادی الاولی ۱۴۴۳ھ

دعائیہ کلمات

بزبان فیض ترجمان

استاذ زمن حضرت علامہ مولانا **عبدالشکور** صاحب قبلہ مصباحی

سابق شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا محمد معین الدین اشرفی بھاگلپوری صاحب نے آج تبلیغ کے سلسلہ میں جو کچھ بیان فرمایا ہے اور سورہ فاتحہ کی جو تفسیریں بیان فرمائی ہیں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ قبول فرمالے اور مسلمانوں کے لئے راہ ہدایت عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین

تاریخ 3 جولائی 2021

حال واردالہ آباد (یو۔پی)

دعائیہ کلمات

صدر العلماء حضرت علامہ مولانا محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

مبسملاً و حامداً و مصلیاً و مسلماً

یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ عزیز گرامی مولانا معین الدین اشرفی مصباحی نے سورہ فاتحہ کی مبسوط تفسیر لکھنے کا عزم بالجزم کررکھا ہے اور اکثر کام پورا کرچکے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے۔ اور خدمت قرآن کی برکتوں سے نوازے۔ کتاب کو قبول خاص سے سرفراز فرمائے اور مقبول انام بنائے۔ وما ذالک علیہ بعزیز۔

محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات

الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ (یو۔پی)

المجمع الاسلامی

۲۲ر محرم الحرام ۱۴۴۳ھ

یکم ستمبر ۲۰۲۱ء

کلمات تبریک

سفیر امن ومحبت، مبلغ اسلام قائد ملت مولانا سید محمود اشرف اشرفی جیلانی سجادہ نشین آستانہ عالیہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمام تعریفیں ثابت ہیں اللہ عزوجل کے لئے جس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے مسلمانوں کو قرآن پاک کی عظیم نعمت عطا فرمائی۔ کروڑوں صلوٰۃ وسلام نازل ہو اللہ کے پیارے محبوب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جن کے وسیلے سے گم گشتگان راہ حق کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی معرفت حاصل ہوئی۔ اہل ایمان جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں قیامت تک ہونے والے تمام واقعات واشیا کا ذکر کردیا گیا ہے۔ لیکن قرآن پاک سمجھنا ہر کس ناکس کا کام نہیں بغیر تفسیر کے قرآن پاک سمجھنے سے انسان کی عقل قاصر ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: قرآن پاک میں تمام علوم موجود ہیں لیکن لوگوں کی عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ آپ فرماتے ہیں اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہوجائے تو میں اسے قرآن پاک سے نکال لوں گا۔ ایک یہودی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا اے علی! آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں تمام علوم موجود ہیں، آپ باب مدینۃ العلم کہلاتے ہیں، آپ بتائیے کہ آپ کی کثیف داڑھی اور میری خفیف داڑھی کا ذکر قرآن پاک میں ہے یا نہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یقینا ہے، سنو! قرآن حکیم میں ارشاد ہے "وَالۡبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخۡرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذۡنِ رَبِّہٖ ۚ وَ الَّذِیۡ خَبُثَ لَا یَخۡرُجُ اِلَّا نَکِدًا" (الاعراف/58) یعنی جو اچھی زمین ہے اس کا سبزہ اللہ کے حکم سے نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر تھوڑا بمشکل، تو اے یہودی! جو اچھی زمین ہے وہ میری داڑھی ہے اور جو خراب زمین ہے وہ تمھاری داڑھی ہے، یہودی لاجواب ہوگیا۔

''مَافَرَّطۡنَا فِی الۡکِتَابِ مِنۡ شَیۡءٍ'' کی تفسیر کے تحت روح المعانی میں حضرت شیخ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے: ایک مرتبہ آپ اپنے گوش پر سے اچانک گر پڑے، آپ کے قدم میں موچ آگئی لوگ آپ کو اٹھانے لگے تو آپ نے منع کردیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد آپ نے اٹھانے کی اجازت عطا فرمادی، آپ سے

اس بارے میں پوچھا گیا کہ پہلے تو آپ نے منع کر دیا پھر اجازت دے دی ایسا کیوں؟ آپ نے جواب دیا میں نے قرآن مجید کی جانب رجوع کیا کہ دیکھوں میرے گرنے اور اٹھانے کا ذکر قرآن پاک میں ہے یا نہیں؟ تو میں نے اسے سورہ فاتحہ میں پالیا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''علم لدنی'' کے باب میں لکھتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے، اگر مجھے موقع دیا جاتا تو میں بسم اللہ کی با سے ستر اونٹوں کو بھر دیتا ہے۔

زیر نظر کتاب ''تفسیر سورۃ الفاتحۃ المعروف الاسرار الواضحۃ فی تفسیر سورۃ الفاتحۃ'' حضرت مفتی محمد معین الدین اشرفی مصباحی بھاگلپوری کی ایک نایاب اور عمدہ تالیف ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے سورہ فاتحہ کی تفسیر تقریباً ۵۶۰ صفحات میں کی ہے، جس سے آپ کے علمی مقام و مرتبہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے عام طور سے لوگ کسی بھی سورہ وغیرہ کا ترجمہ صرف کسی ایک ترجمہ قرآن سے لکھ دیتے ہیں لیکن مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ موصوف نے سورہ فاتحہ کا ترجمہ کرنے میں تین مشہور و معروف ترجمہ قرآن سے استفادہ کیا ہے (۱) تارک السلطنت حضرت سید مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کا فارسی ترجمہ قرآن (۲) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کا ترجمہ قرآن کنزالایمان (۳) حضور محدث اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ قرآن معارف القرآن اسی سے اس کتاب کی امتیازی شان نمایاں ہوجاتی ہے۔

موصوف نے کتاب ہذا میں دیگر کتب تفاسیر کے ساتھ ساتھ خصوصیت کے ساتھ امام فخر الدین رازی کی ''التفسیر الکبیر'' المعروف بہ تفسیر رازی کے حوالے سے سورہ فاتحہ کے تراجم، معانی و مطالب فضائل و برکات اس کے اسمائے مبارکہ اور اس کی وجوہ تسمیہ اس کے احکام و مسائل اور باریک نکات اور تعوذ و تسمیہ کے احکام کو نہایت حسین پیرائے میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی سے آپ کی علمی ذہانت، کتب بینی، کثرت مطالعہ اور علم تفسیر سے آپ کا خاص لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ موصوف نے ماضی میں بھی دوران تدریس بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں درجنوں مقالے لکھے، آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات اور مقالوں کی تعداد درجنوں کو پہنچتی ہے۔ جن میں ''**اشرف النعوت**، **شرح مسلم الثبوت**''

جو مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب ہے۔ ''اعلیٰ حضرت اشرفی میاں ارباب علم ومعرفت کی نظر میں اور دس بیویوں مع سیدہ کی کہانی'' منظر عام پر چھپ کر آ چکی ہیں، یہ کتابیں عوام میں بہت مقبول ہوئیں آپ کی تصنیفات میں خصوصیت کے ساتھ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف ''شرح مسلم الثبوت'' علما کے مابین کافی مقبول رہی اور اس کتاب نے خوب داد و تحسین حاصل کیا۔ ہمیشہ سے ہی کچھوچھہ شریف خانوادہ اشرفیہ حسنیہ سرکار کلاں سے آپ کا کافی گہرا تعلق رہا ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے تدریسی سلسلہ کا آغاز جامع اشرف کچھوچھہ شریف ہی سے کیا جامع اشرف میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی کی ذمہ داری بھی آپ نے بحسن وخوبی سرانجام دی۔ فی الحال دارالعلوم بہار شاہ فیض آباد، اجودھیا (یو۔پی) میں آپ دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔لیکن اس کے باوجود جامع اشرف سے آپ کا قلبی لگاؤ اس طرح ہے کہ مخدوم پاک اور عرس سرکار کلاں رحمۃ اللہ علیہ میں ہمیشہ شرکت فرماتے ہیں۔مسابقہ حفظ احادیث میں بحیثیت جج اور ہر سال جامع اشرف میں سالانہ امتحان کے لئے آپ کو مدعو کیا جاتا ہے۔

مولیٰ تعالیٰ سے دعا ہے موصوف کی اس تالیف کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اس کتاب کو آخرت میں باعث نجات بنائے، موصوف کے علم وعمل میں بے پناہ میں برکتیں عطا فرمائے، طالبان علوم نبویہ اور عوام الناس ہمیشہ آپ کی ذات سے فائدہ حاصل کرتے رہیں۔آمین بجاہ سید المرسلین۔

فقط دعا گو

فقیر اشرفی وگدائے جیلانی

سید محمود اشرف اشرفی جیلانی

سجادہ نشین آستانہ عالیہ اشرفیہ حسنیہ کچھوچھہ شریف

۱۲/ذی الحجہ، ۱۴۴۲، ۲۳/جولائی ۲۰۲۱ء

کلمات تبریک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ حمداً کثیراً و نصلی علی حبیبہ محمدٍ دائماً

سورۂ فاتحہ جملہ علوم و ہدایت، معانی و مطالب اور اسرار و رموز کا خزانہ ہے۔ قرآن مجید کے تفصیلی اصول وضوابط، مطالب و مقاصد کا اجمال ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ رب تبارک وتعالیٰ نے آسمان سے ایک سو چار کتابیں اور صحیفے نازل کئے مگر سو کتابوں کے علوم چار میں رکھے یعنی توریت، انجیل اور زبور پھر ان تین کے علوم قرآن پاک میں رکھے، پھر قرآن پاک کے اصول مفصل (سورہ حجرات تا ناس) میں رکھے، پھر مفصل کے علوم سورۂ فاتحہ میں رکھے گئے لہٰذا جس نے سورۂ فاتحہ سیکھ لی اس نے گویا ساری آسمانی کتابیں سیکھ لیں اور جس نے سورہ فاتحہ پڑھ لی اس نے تمام آسمانی کتابیں پڑھ لیں۔

تفسیر روح البیان میں ہے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا! اگر یہ سورت توریت میں ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم یہودیت کی طرف مائل نہ ہوتی، اگر انجیل میں ہوتی تو عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نصرانی نہ ہوتی اور اگر زبور میں ہوتی تو داؤد علیہ السلام کی قوم کے چہرے مسخ نہ ہوتے، جس نے اسے پڑھا اللہ تعالیٰ اتنا اجر وثواب عطا فرمائے گا جتنا پورا قرآن پڑھنے اور تمام مؤمنین ومؤمنات پر خیرات کرنے پر عطا فرماتا ہے۔ سورہ فاتحہ کی ایک امتیازی شان یہ بھی ہے کہ اس سورت کے نزول کے وقت سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے، اس تعلق سے تفسیر روح البیان میں ہے کہ جس وقت یہ سورت نازل ہوئی اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے آئے تھے۔

یہ سورت فضائل و برکات اور خصائص کا خزانہ بھی ہے، اس کی تلاوت کی برکت سے چالیس سال کے عذاب اٹھا لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجنے کا ارادہ فرماتا ہے مگر جب اس قوم کے بچے ''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ'' پڑھتے ہیں تو اس

قوم سے چالیس سال تک عذاب اٹھالیا جاتا ہے۔سورہ فاتحہ کی فضیلت وعظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ''وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ''یعنی اے نبی! ہم نے آپ کو ایک ایسی سورت دی ہے جس میں سات آیات ہیں (جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) اور جو عظمت وثواب کی بڑائی کے لحاظ سے پورے قرآن شریف کے مساوی ہے، چنانچہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ''تفسیر کبیر'' میں فرماتے ہیں کہ یہ وہ سورت مقدسہ ہے جس سے دس ہزار مسائل شرعیہ مستنبط ہوتے ہیں۔

بخاری شریف جلد ثانی، کتاب فضائل القرآن، باب فاتحۃ الکتاب ص:۷۴۹ میں یہ حدیث پاک موجود ہے۔ حضرت ابوسعید ابن معلیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے بلایا لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔(جب نماز سے فارغ ہوکر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو) میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں نماز پڑھ رہا تھا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا! کیا اللہ رب العزت نے یہ نہیں فرمایا! ''اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ''یعنی اللہ ورسول جب بلائیں تو حاضر ہوجاؤ۔ پھر فرمایا: کیا تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن عظیم کی سب سے عظیم سورت نہ سکھاؤں؟ پھر آپ ﷺ تعالیٰ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا (شاید ذوق طلب اور اشتیاق کامل پیدا کرنے کی خاطر آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کی اور وہ عظیم سورت نہ بتائی) پھر جب ہم نے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ نے فرمایا تھا کہ ضرور میں تمہیں قرآن کریم کی سب سے عظمت والی سورت سکھاؤں گا۔تو ارشاد فرمایا: وہ سورہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ''یہی ''سبع مثانی'' اور ''قرآن عظیم'' ہے جو مجھے عطا کی گئی ہے۔

سورہ فاتحہ کو ''سبع مثانی'' کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ عظیم سورت ہے جسے نماز کی ہر رکعت میں دہرایا جاتا ہے، اس سورت کی تلاوت ہر نماز میں ہر نمازی پر حقیقتاً یا حکماً واجب ہے کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوگی جیسا کہ آقا کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب ''یعنی سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔

مسلم شریف میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا اور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں سلام پیش کرکے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ کو ان دونور کی بشارت ہو جو آپ کے علاوہ

کسی اور نبی کو نہیں عطا کئے گئے اور وہ دو نور یہ ہیں (۱) سورہ فاتحہ (۲) سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں وہ سارے اسرار و رموز، فضائل و کمالات اور نکات و درایات اجمالاً موجود ہیں جو پورے قرآن کریم میں تفصیلاً موجود ہیں (اللہ اعلم وعلمہ اتم)

محب صادق، برادر طریقت حضرت مولانا مفتی محمد معین الدین اشرفی مصباحی زید مجدہ کی کتاب مستطاب تفسیر سورہ فاتحہ المعروف بہ **الاسرار الواضحۃ فی تفسیر سورۃ الفاتحۃ** کا مسودہ نظر نواز ہوا، عدیم الفرصتی کی بنیاد پر مکمل مسودے کے مطالعہ سے قاصر رہا، لیکن چیدہ چیدہ عناوین کے اعتبار سے مطالعہ کا موقع میسر آیا۔

سورہ فاتحہ کے تعلق سے جو مواد عزیز مفتی صاحب نے یکجا فرمایا ہے لائق تحسین ہے۔ اسلوب بیان میں سلاست و روانی ہے جو قاری کے ذہن پر بوجھ نہیں بنتا آسانی سے ذہن و دل پر اترتا چلا جاتا ہے جب کہ اس میں بیان کردہ نکات و درایات سے علما و طلبا بھی محظوظ و مستفیض ہو سکتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ موصوف نے عقیدۂ اہل سنت و جماعت کی بھی بہترین نشان دہی فرمائی ہے۔

مفتی صاحب کا خانوادہ اشرفیہ سے نسلاً بعد نسل علمی و روحانی تعلق رہا ہے۔ گو کہ مفتی صاحب کا آبائی وطن بھاگلپور بہار میں ہے، لیکن ان کا شمار شیوخ جون پور میں ہوتا ہے، ان کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ شاہ جہاں بادشاہ کے زمانے میں اس وقت کے موجودہ سجادہ نشین حضرت سید شاہ راجو رحمۃ اللہ کی بارگاہ میں بادشاہ وقت نے جاگیر پیش کی جسے حضرت نے لینے سے انکار کر دیا، مگر اس وقت حضرات شیوخ جونپور کی سفارش پر سہرسہ و بھاگلپور کی جاگیر کو قبول کر لیا گیا اور اسے انہیں مریدین و معتقدین کی طرف حضرت نے لوٹا دیا جب اس جاگیر پر آباد ہونے کا موقع آیا تو حضرات شیوخ جونپور جو وابستگاں سلسلہ اشرفیہ تھے عرض گذار ہوئے کہ جو ہماری نسبت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ نسلوں میں منقطع ہو جائے لہٰذا آپ اپنے شہزادے کو ہمارے ہمراہ کر دیں تا کہ یہ تعلق صبح قیامت تک باقی رہے، حضرت سید شاہ راجو سجادہ نشیں رحمۃ اللہ علیہ نے مریدین کی اس عرضی کو قبول فرما کر اپنے بیٹے سید دیوان صادق رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے ہمراہ کر دیا، الحمد للہ آج تک یہ نسبت اشرفیہ باقی ہے۔

اس خانوادے میں ہر دور میں علما فضلا رہے اور علم دین کے فروغ میں ہمیشہ کوشاں رہے حتی کہ ایک دور ایسا بھی آیا

کہ جب بدعقیدگی کی چنگاری جگہ جگہ پھوٹنے لگی جس سے قوم وملت میں بڑا انتشار ہورہا تھا، یہ وہ دور تھا کہ جب حق و صداقت کا قلم اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے اٹھایا اور علم روحانیت اعلیٰ حضرت اشرفی میاں نے اٹھایا اور تحفظ اہل سنت و جماعت میں بریلی و کچھوچھہ لگ گئے۔اس دور میں اپنے رشتوں کی بھی پرواہ نہ کر کے شہزادہ ہم شبیہ غوث الثقلین، خلف اکبر، سلطان الواعظین حضرت مولانا سید احمد اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے قیادت فرما کر باطل کا دنداں شکن جواب دیا۔

خانوادہ اشرفیہ ہی کے ایک شخص مولوی غنیمت حسین جن کے ذہن میں اشرف علی تھانوی وقاسم نانوتوی کا فتور داخل ہوگیا تھا، جس کی صفائی کے لئے سلطان الواعظیم نے مناظرے فرمائے جس میں حضرات شیوخ نے سلطان الواعظین حضرت مولانا سید احمد اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی حقانیت کا ساتھ دیا اور پرچم حق کو آج تک بلند کر رکھا ہے۔

اسی خانوادے کے ایک فرد فرید حضرت مولانا مفتی محمد معین الدین اشرفی مصباحی زیدہ مجدہ ہیں علمی حلقے میں جنہیں خوب جانا پہچانا جاتا ہے۔دعا گو ہوں کہ مولیٰ کریم اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل موصوف کی عمر میں خوب خوب برکت عطا فرمائے، ان سے دین کا بہتر سے بہتر کام لے اور ان کی کتاب تفسیر سورہ فاتحہ المعروف بہ ''**الاسرار الواضحة فی تفسیر سورة الفاتحة**'' کو قبول تام فرمائے اور مقبول رسول انام فرمائے۔آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

از: فقیر سید جلال الدین اشرف اشرفی جیلانی

کلمات تقریظ

از: سراج الفقہا محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مولانا مفتی محمد نظام الدین رضوی صاحب قبلہ
شیخ الحدیث وصدر شعبۂ افتاء الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ

قرآن مجید علوم ومعارف کا گنجینہ اور اسرار الٰہیہ کا خزینہ ہے یہ کتاب مبین حیرت انگیز نکات وحکم کا لہر مارتا ہوا سمندر ہے جس کی تہہ میں موجود آبدار موتیوں کو گنا نہیں جاسکتا یہ علم وادب کا بے مثل شاہکار اور فکر وتدبر کی کہکشاؤں سے سجا ہوا ایسا آسمان ہے جس کے چمکدار تاروں کو شمار نہیں کیا جاسکتا اس میں فصاحت وبلاغت کا وہ رنگ جو کہیں اور نہیں، اس میں اعجاز کا وہ کمال ہے جو کسی اور کلام میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا قرآن مجید کلام اللہ ہے جس کے مثل لانا طاقت بشری سے باہر ہے وہ کیا ہے جو قرآن میں نہیں ہے مبدأ ومعاد بھی ہے حقائق کا جہان بھی، وعدہ وعید بھی ہے، انذار وتبشیر بھی ہے، تعلیم وتلقین بھی ہے ترغیب ترہیب بھی، وعظ ونصیحت بھی ہے اور انسانی نفسیات کی گرہ کشا حقیقت بھی، اخبار ماضیہ بھی ہیں اور احوال آتیہ بھی ہیں یہاں علوم وفنون اور اسرار وحقائق کا ایسا آبشار پھوٹتا ہے جس کی مترنم بوندوں سے زندگی اور بندگی کا ہر جوہر نمو پاتا ہے۔

قرآن عظیم اترتا رہا اور زبان مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم بعینہ پورا کلام گروہ صحابہ کو سناتی رہی اور اس کی حفاظت وکتابت کا بھی انتظام ہوتا رہا، جہاں ضرورت پیش آتی زبان رسالت سے آیت قرآنی کی تشریح وتفسیر وتوضیح بھی ہوتی جس کے گراں قدر نمونے کتب احادیث وتفسیر میں موجود ہیں اور علمی دنیا بچشم بینا ان حقائق ودقائق کا مشاہدہ ومعائنہ کرتی ہے یہ سلسلہ عہد رسالت سے تاحال جاری وساری ہے تفسیر قرآن پر بیش بہا کتابیں مفسرین نے لکھیں اور آثار واحادیث کی روشنی میں مراد الٰہی کی تعیین ہوتی رہی، قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سب سے چھوٹی سورہ کوثر اور بڑی سورہ بقرہ ہے مصحف میں سورہ فاتحہ سے کلام ربانی کا آغاز ہوتا ہے جس میں کل سات آیتیں ہیں اور پورے قرآن کی تفسیر کا اجمال اس کے اندر جگمگا رہا ہے اس کے بے شمار نام ہیں، سورۃ فاتحۃ الکتاب، شافیہ، کافیہ، وافیہ، شفا، اساس، صلوٰۃ، دعا، سبع مثانی، مسئلہ، کنز، شکر، تعلیم المسئلہ، ام الکتاب وغیرہ وغیرہ مکمل تفسیر قرآن کے ساتھ خاص سورہ فاتحہ کی تفسیر پر بھی مستقل کتابیں لکھی گئیں جن میں اس جامع سورہ کی تشریح وتوضیح پر مفصل کلام کیا گیا۔

زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ سے مربوط ہے جسے مولانا مفتی محمد معین الدین اشرفی مصباحی (استاذ ومفتی دار العلوم بہار شاہ فیض آباد، اجودھیا (یو۔پی) نے ''**الاسرار الواضحۃ فی تفسیر سورۃ الفاتحۃ**'' کے نام سے تحریر کیا ہے چند مقامات

سے دیکھنے پر یہ اندازہ ہوا کہ مؤلف موصوف نے تفسیر کے ضمن میں مسائل ومباحث اور علوم قدیمہ وجدیدہ کے بہت سے ابواب پر بحث کی ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں بحثوں میں قدامت اور دقت کا احساس ہوتا ہے چونکہ انہوں نے تقریباً چوتھائی حصہ ہی ہمیں ارسال کیا ہے جس میں مقدمہ، مباحث تعوذ اور تسمیہ کی ابتدائی بحثیں شامل ہیں اتنا حصہ ہی کافی مبسوط ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پوری کتاب کتنی بسیط اور تفصیلی ہے۔ اگر مسائل ومباحث اور آسان زبان وبیان میں یہاں تحریر کئے جاتے تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس تفسیر پر کام کرنے کے لئے انہوں نے مختلف زایوں سے تفسیری مباحث اور علوم قرآن کا مطالعہ کیا ہے اللہ عز وجل ان کی یہ کاوش اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور دارین میں اس کا بہتر اجر عطا فرمائے۔ آمین

محمد نظام الدین رضوی

شیخ الحدیث وصدر شعبۂ افتاء

الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ

۲۵ رمحرم الحرام ۱۴۴۳ھ مطابق ۵ رستمبر ۲۰۲۱ء

کلمات تقریظ

از: حضرت علامہ مولانا مفتی محمد قاسم صاحب اشرفی مصباحی
صدر دارالافتاء وشیخ الحدیث مدرسہ غوثیہ رؤفیہ دھام نگر شریف بھدرک اڑیسہ

زیر نظر کتاب "الاسرار الواضحہ فی تفسیر سورۃ الفاتحہ" از ابتدا تا انتہا راقم الحروف کی نظر سے گذری صاحب کتاب حضرت علامہ مفتی محمد معین الدین اشرفی مصباحی بھاگلپوری نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں جن علوم ومعارف، اسرار ورموز اور فضائل ومسائل کو قلمبند فرمایا ہے ان سے علامہ موصوف کی بے پناہ خداداد علمی لیاقت وصلاحیت اور فنی مہارت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ کوزے میں سمندر کو سمو دینے کی مثال اس کتاب پر صادق آتی ہے۔ شروع کتاب میں علامہ موصوف کے چند فتاوے کی جھلکیاں پرنسپل دارالعلوم بہار شاہ فیض آباد حضرت مولانا انوار احمد نعیمی صاحب نے سپرد قرطاس کی ہیں ان فتاویٰ کے طرز تحریر اور انداز استدلال سے بھی صاحب کتاب کی جلالت شان علمی نمایاں طور پر معلوم ہوجاتی ہے بلاشبہ صاحب کتاب ایک کہنہ مشق مفتی، مدرس، خطیب اور مصنف ہیں۔ مباحث کتاب سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ موصوف کی علمی نظر بے پناہ وسعت کی حامل ہے۔ بغیر وسعت مطالعہ واستقصائے تام کے ایسی تصنیف کا منصۂ شہود پر آجانا ہرگز ممکن نہیں۔ اثنائے مباحث می سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف مسلکی تعصب کا جہاں رنگ نظر آیا وہ علامہ موصوف نے حضرت امام رازی جیسی شخصیت کو بھی نہیں چھوڑا بلکہ امام اعظم کے ایک متبع صادق کی حیثیت سے آئینہ پر ڈالے ہوئے گرد وغبار کو دور کر کے صاف شفاف بنا کر پیش کیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

زیر نظر کتاب پر تبصرہ کے لئے مبسوط مضمون چاہئے کتاب یوں بھی کافی ضخیم ہے قارئین کو خود اندازہ ہوجائے گا کہ کتاب اور صاحب کتاب کو کس لقب وخطاب سے نوازہ جائے کتاب میں آیات قرآنیہ کو رسم عثمانی میں لکھنے کا انتظام کیا گیا ہے نیز احادیث نبویہ کو عربی رسم الخط میں لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے کتاب کافی مزین ومنور ہوگئی ہے۔

جونپوری برادری کا ادنیٰ خادم راقم الحروف صمیم قلب سے صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ علامہ موصوف کی تصنیف اشرف النعوت شرح مسلم الثبوت کی طرح اس کتاب کو بھی مقبول عوام وخواص بنائے۔ اور

علامہ موصوف کی اس دینی کاوش کو قبول فرما کر علامہ کے لئے ذخیرہ حسنات بنائے ۔آمین بجاہ سید المرسلین علیہ وعلیہم الصلوۃ والتسلیم۔

گدائے اشرفی

محمد قاسم اشرفی مصباحی سہرساوی

یکم جولائی ۲۰۲۱ء خادم الافتاء والحدیث

مدرسہ غوثیہ رؤفیہ دھام نگر شریف بھدرک اڑیسہ

تقریظِ جمیل

قرآنِ حکیم اپنے وقتِ نزول سے مراحل تدوین وتفسیر تک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنی نوع انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے اللہ کی طرف سے کم وبیش ایک لاکھ یا دولاکھ چوبیس ہزار انبیاے کرام کی بعثت ہوئی، ان انبیاے کرام میں سے تین سوتیرہ وہ رسولان عظام ہیں جن پر چار کتابیں اور سو صحیفے نازل فرمائے گئے۔تمام نبیوں اور رسولوں میں ہمارے رسول آخری رسول ہیں اوران پر نازل ہونے والی کتاب قرآن کریم آخری آسمانی کتاب ہے۔

سیدنا آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام سے لے کر ہمارے پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیا ورُسُل اللہ کی جانب سے صرف اور صرف ایک دین لے کر آئے، جس دین کا نام ہے، ارشاد ربانی ہے" إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ " دین تو اللہ کے نزدیک فقط اسلام ہے۔" الْإِسْلَامُ" کی تفسیر کرتے ہوئے صاحبِ جلالین تحریر فرماتے ہیں "أَيِ الشَّرْعُ الْمَبْعُوث بِهِ الرُّسُل الْمَبْنِيُّ عَلَى التَّوْحِيْد" اسلام یعنی توحید پر مبنی وہ شریعت جس کے ساتھ رسولان عظام مبعوث ہوئے۔

دینِ اسلام کے سوا کوئی بھی دین اللہ کی بارگاہ میں ہرگز مقبول نہیں ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے" وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ واسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس کی جانب سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

قرآن کریم میں اللہ نے جس لفظ سے اپنا پہلا تعارف کرایا ہے وہ لفظ ہے" رَبّ" اللہ فرماتا ہے" الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ساری کی ساری خوبیاں اللہ کے لیے خاص ہیں۔کون اللہ؟" رَبّ الْعَالَمِين" سارے جہان کا رب، اور رب کہتے کسے ہیں؟ ناصرالدین قاضی عبداللہ ابن عمر بیضاوی لکھتے ہیں "الرَّبُّ في الأَصْلِ مَصْدَرٌ بِمَعنى التَربية وَهي تَبْليغ الشيْءِ إلى كَمَالِه شَيْئاً فَشيئاً" رب دراصل تربیت کے معنے میں مصدر ہے، شئ کو بہ تدریج، آہستہ آہستہ کمال کی منزل تک پہنچادینا جس کا مفہوم ہے، لیکن چوں کہ اللہ اپنے ہر وصف کی طرح اس وصف میں بھی اتنا کامل ہے کہ گویا وہ تربیت تمام ہے، اس لیے یہ کہنے کی بجائے کہ وہ سارے جہان کا مربی ہے کہہ دیا گیا کہ وہ سارے جہان کا رب ہے، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی عدل وانصاف کے وصف میں اگر انتہائی کامل ہو تو اسے عادل کہنے کی بجائے عدل کہہ دیا جاتا ہے۔

اپنے بندوں کے لیے اللہ کا پسندیدہ دین" اسلام" جب دنیا میں آیا تو بھلے وہ اپنے عہد کے اعتبار سے کامل تھا لیکن اللہ نے رب ہونے کی حیثیت سے اسے بھی یکبارگی کمال کی اس آخری منزل پر نہیں پہنچایا کہ اب اس کے بعد بنی نوع انسان کو نہ کسی نئے نبی کی ضرورت باقی رہے نہ کسی نئی آسمانی کتاب کی بلکہ یکے بعدے دیگرے انبیاے کرام وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے، اللہ کی جانب سے کتابیں اترتی رہیں، صحائف اترتے رہے اور نبیوں اور ان پر نازل کردہ کتابوں کے ذریعے اللہ کا پسندیدہ دین دینِ اسلام آہستہ آہستہ کامل سے کامل تر کی طرف گامزن رہا اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ہمارے اور آپ کے پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی ،لگا تار تیئیس سال تک اللہ کے پیارے پیغمبر اپنے رب کے پسندیدہ دین کی تبلیغ واشاعت میں لگے رہے، پھر ایک مقدس دن آیا جمعہ کا، مبارک تاریخ آئی ۹ ذوالحجہ سنہ ۱۰ ھ کی، حجۃ الوداع کے موقعے پر عرفات کے میدان میں وقوف عرفہ کے دوران اللہ نے اپنے پیغمبر پر یہ آیت نازل فرمائی اور یہ اعلان عام فرمادیا کہ "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا" آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کردیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری فرمادی اور تمھارے لیے بہ بطور دین اسلام کو پسند کرلیا۔

چوں کہ اللہ کو اپنے محبوب کے ہاتھوں اپنا پسندیدہ دین تکمیل کی اس آخری منزل پر پہنچانا تھا کہ اس کے بعد انسانی برادری کو کسی نئے نبی اور نئی آسمانی کتاب کی ضرورت ہی نہ بچے، اس لیے اس نے پیشگی اعلان کردیا کہ" مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ" محمد ﷺ تمھارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سارے نبیوں میں آخری نبی ہیں۔

جب اللہ نے اپنے محبوب کے ذریعے دین کو کمال کی منزل تک پہنچادیا تو اب کسی نئے نبی کی بعثت کی، کوئی نیا دین بھیجنے کی اور کوئی نئی کتاب اتارنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اب قیامت تک ہمارے نبی کی نبوت ورسالت بھی چلے گی، ان کا لایا ہوا دین بھی چلے گا اور ان پر نازل شدہ کتاب بھی دنیا میں باقی رہے گی، اور اسی لیے اپنی نازل کردہ تمام کتابوں اور صحیفوں میں اللہ نے کسی کتاب اور کسی صحیفے کی حفاظت کا ذمہ اپنے کرم پر نہیں لیا اور اس لیے نہیں لیا کہ ان کتابوں اور ان صحائف کو ہمیشہ رہنا ہی نہیں تھا، مگر قرآن کی حفاظت کا ذمہ اپنے کرم پر لے لیا اور اس لیے لے لیا کہ اسے قیامت تک جوں کا توں باقی رکھنا تھا، وہ فرماتا ہے" إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" بے شک یہ قرآن ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

کیسا شاندار انتظام فرمایا اللہ نے قرآن کریم کی حفاظت کا، کہ اسے سابقہ آسمانی کتابوں کی طرح یک بارگی اپنے پیغمبر پر نہیں اتارا کہ اس کا حفظ وضبط امت پر دشوار ہوجائے بلکہ حسب حکمت ومصلحت تھوڑا تھوڑا کر کے بہ تدریج اتارا تا کہ امت پر اس کا حفظ وضبط آسان سے آسان تر ہوجائے۔

حضرت جبریل امین قرآن کریم کی آیتیں لے کر اترتے، بارگاہِ رسول میں آ کر ان کی تلاوت کرتے، ابھی ان کی تلاوت ختم بھی نہیں ہونے پاتی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلدی جلدی آیتیں دہرانے لگتے اور ایسا اس لیے کرتے کہ آیات الٰہیہ کا کوئی حصہ ان سے چھوٹنے نہ پائے اور پوری کی پوری وحی من وعن یاد ہوجائے، اللہ نے جب اپنے محبوب کی یہ بے چینی اور مشقت دیکھی تو آیت اتار دی" لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَه اے میرے محبوب! آپ یاد کر لینے کی عجلت میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت مت دیجیے، ہم نے اپنے ذمۂ کرم پر یہ بات لے لی ہے کہ قرآن آپ کے سینے میں ہم محفوظ کر دیں گے اور ہم آپ کی زبانِ مبارک پر اسے جاری بھی کروادیں گے۔

سینۂ رسول میں قرآن کو محفوظ کرنے اور زبان رسول پر اسے جاری کروانے کی ذمے داری اللہ نے اپنے کرم پر لے لی، قرآن اترتا جاتا سینۂ رسول میں محفوظ ہوتا جاتا، اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مقرر کردہ کاتبین وحی میں سے کسی کو طلب فرماتے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پڑھتے کاتب وحی اسے قلم بند کر لیتے، پیغمبر ہدایت دیتے کہ یہ فلاں سورت میں، فلاں آیت سے پہلے اور فلاں آیت کے بعد لکھ دینا، کاتب وحی کتابت سے فارغ ہوتے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم دیتے کہ جو لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ، کاتب وحی پڑھ کر سناتے، اگر کوئی کمی ہوتی تو درست کروادیتے ورنہ صاد کر دیتے۔ پھر فرمان خداوندی "يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ" کے مطابق پیغمبر اپنی منصبی ذمے داری بہ حسن وخوبی نبھاتے ہوئے اصحاب کے درمیان نازل شدہ آیات کی تلاوت کرتے، ان کے حفظ وضبط کی طرف رغبت دلاتے، جس کے نتیجے میں جیسے جیسے قرآن اترتا جاتا اصحاب رسول کی ایک بڑی تعداد اس کی حافظ ہوتی چلی جاتی اور اس طرح قرآن کریم اپنے نزول کے اختتام تک سفینوں کے ساتھ ساتھ سینوں میں بھی محفوظ ہوتا رہا۔

عہدِ صدیقی تک پورا قرآن کریم حفاظ کے سینوں میں تو اکٹھا رہا، منتشر طور پر پتھروں کی سلوں پر، اونٹ کی پاک اور چوڑی ہڈیوں پر، پاک چمڑوں پر، درخت کے چوڑے پتوں پر، کوئی سورت کسی صحابی کے گھر کوئی سورت کسی دوسرے صحابی کے گھر تحریری شکل میں بھی موجود تو رہا لیکن اسے ایک صحیفے اور کتاب کے اندر یکجائی نہیں ملی۔

عہدِ خلافت صدیقی میں جب نبوت کے جھوٹے دعوے دار مسیلمہ کذاب کے خلاف مسلمانوں نے سیدنا خالد ابن ولید کی قیادت میں فوج کشی کی اور گھماسان کی جنگ کے بعد بالآخر مسلمانوں کو فتح ملی، اپنے کثیر پیروکاروں سمیت نبوت کا جھوٹا دعوے دار مارا گیا لیکن مسلمانوں کو اس فتح کی بھاری جانی قیمت بھی چکانی پڑی، بڑی تعداد میں مسلمان شہید ہوئے اور شہید ہونے والوں میں بعض روایتوں کے مطابق سات سو تعداد ان حضرات کی تھی جو پورے قرآن کریم کے حافظ تھے۔

جنگ سے واپسی پر سیدنا فاروق اعظم نے سیدنا صدیق اکبر سے گزارش کی کہ حضور! اگر اسلامی جنگوں میں قرآن کے حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو خطرہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا بڑا حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے، اس لیے میری یہ رائے ہے کہ آپ منتشر طور پر موجود قرآن کریم کو یکجا فرمادیں، شروع میں تو سیدنا صدیق اکبر نے سیدنا فاروق اعظم سے کئی بار یہ سوال کیا کہ "كَيْفَ أَفْعَلُ شَيْئًا لم يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللهِ صلى الله تعَالىٰ عليه سلمؐ وہ کام کیسے کروں گا جسے اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں کیا ہے؟ لیکن جب ہر بار سیدنا فاروق اعظم نے انھیں یہی ایک جواب دیا کہ "هُوَ وَاللَّهِ خَيْرٌ" کہ حضور قسم ہے اللہ کی یہ کام بہت اچھا ہے تب سیدنا صدیق اکبر ارشاد فرماتے ہیں کہ "حَتَّى شرَحَ اللَّهُ لِذَلِكَ صَدْرِي وَرَأَيْتُ الَّذِي رَأَى عُمَرُ" یہاں تک کہ اللہ نے اس کام کے لیے میرا سینہ بھی کھول دیا اور میری بھی وہی رائے بن گئی جو حضرتِ عمر کی تھی۔ پھر دونوں نے متفقہ طور پر یہ اہم ذمے داری سیدنا زید ابن ثابت کو سونپنی چاہی تو بعینہ کئی بار وہی سوال شیخین سے انھوں نے کیا کہ" كَيْفَ تَفْعَلانِ شَيْئًا لم يَفْعَلْهُ النَّبِيُّ صلى الله تعَالىٰ عليه وسلم آپ حضرات وہ کام کیسے کریں ے جسے نبی ﷺ نے نہیں کیا؟ اب انھیں ہر بار وہی جواب سیدنا صدیق اکبر دینے لگے جو فاروق اعظم انھیں پہلے دے چکے تھے کہ "هُوَ وَاللَّهِ خَيْرٌ" اخیر میں وہ بھی کہتے ہیں کہ " حَتَّى شرَحَ اللَّهُ صَدْرِي لِلَّذِي شرَحَ اللَّهُ لَهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ یہاں تک کہ اللہ نے جس کام کے لیے ابوبکر وعمر کا سینہ کھول دیا تھا میرا بھی سینہ کھول دیا، انھوں نے مختلف صحابہ کے پاس سے قرآن کریم کی مختلف سورتیں یا آیتیں لے لے کر ہر سورت کو ایک الگ صحیفے میں اکٹھا کر دیا۔

یہ تمام صحیفے سیدنا صدیق اکبر کی حیات ظاہری تک انھی کے پاس رہے، ان کے وصال کے بعد سیدنا فاروق اعظم کے پاس آئے اور ان کی شہادت کے بعد ان کی شہزادی، ام المؤمنین سیدہ حفصہ کے پاس رہے۔

روزِ اول سے اللہ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اس نے جب بھی کسی قوم میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو نبی کا قبیلہ اس قوم کے

تمام قبیلوں سے بہتر اور نبی کا خاندان اس قوم کے تمام خاندانوں سے برتر ہوا کرتا تھا۔ ہمارے پیغمبر تو جملہ اقوام عالم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس لیے عادت الٰہیہ کے مطابق انھیں عجم کی بجائے عرب میں، عرب کے دیگر قبائل کی بجائے قبیلۂ قریش میں اور قبیلۂ قریش کے دیگر خاندانوں کی بجائے خاندان بنو ہاشم میں مبعوث کیا گیا اور "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ" کے مطابق قرآن کریم بھی قبیلۂ قریش کی لغت کے مطابق اتارا گیا اگرچہ قبیلۂ قریش کے علاوہ شیخ محقق عبدالحق دہلوی کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق قبیلۂ طے، قبیلۂ ہوازن، اہل یمن، قبیلۂ ثقیف، قبیلۂ ہذیل اور قبیلۂ بنو تمیم کی زبانیں بھی فصیح مانی جاتی تھیں لیکن مختلف قبائل کے درمیان بعض الفاظ کے تلفظ میں، ان کے حرکات میں، ان کے حروف میں اور اعراب میں کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا تھا اور ان کے لیے یک بارگی اپنی پرانی عادت اور پیدائشی لغت ترک کر کے قبیلۂ قریش کی لغت سے صد فی صد موافقت دشوار گزار امر تھی، اس بات کا احساس جب اللہ کے رسول ﷺ کو ہوا تو انھوں نے اس تعلق سے امت پر بار بار آسانی پیدا کرنے کی درخواست کی اور نتیجتاً اللہ نے یکے بعد دیگرے عرب کے سات معروف و ممتاز قبائل کو اپنی اپنی لغت میں قرآن کریم پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں" أَقْرَأَنِي جِبرِيلُ عَلَى حَرْفٍ فَرَاجَعْتُهُ فَلَمْ أَزَلْ أَسْتَزِيدُهُ وَيَزِيدُنِي حَتَّى انْتَهَى إِلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ مجھے حضرت جبریل عزوجل تعالیٰ نے ایک لغت کے مطابق قرآن پڑھایا تو میں نے ان سے لغات میں اضافے کی بات کی اور لگاتار کرتا رہا اور وہ لگاتار اضافہ بھی کرتے رہے یہاں تک کہ سات لغات تک پہنچ گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک موقعے پر ارشاد فرمایا" إِنَّ الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَؤُا مِنْهُ مَا تَيَسَّرَ یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا ہے ان میں تمھیں جو آسان لگے وہ پڑھو۔

عہدِ رسالت مآب ﷺ سے ہی اسلام کا جو دائرہ یوماً فیوماً بڑھتا جا رہا تھا وہ عہدِ عثمانی تک پہنچتے پہنچتے دنیا کی ایک بڑی آبادی کو محیط ہو گیا۔ مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے صحابۂ کرام نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی رخصت کے مطابق مختلف خطوں میں اپنی اپنی لغت میں لوگوں کو قرآن پڑھانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف اساتذہ سے الگ الگ لغت میں قرآن پڑھنے والے لوگ باہم دست بگریباں ہونے لگے، آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی اور ایک دوسرے کو غلط ٹھہرانے لگے، امیر المؤمنین سیدنا عثمانِ غنی کو جب اس سنگین صورت حال کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گئے، انھوں نے فوراً سرکردہ اصحاب کو بلا کر مشورہ طلب کیا، امیر المؤمنین سیدنا علی ابن ابی طالب اور دیگر اکابر صحابہ نے اپنی رائے پیش کی کہ قرآن پڑھنے کے تعلق سے، ابتدائے اسلام میں دی ہوئی رخصت اگر یوں ہی برقرار رکھی گئی تو امت کا شیرازہ

منتشر ہوجائے گا، شدید اختلافات رونما ہوجائیں گے اس لیے اب وقت اور حالات کا یہ جبری تقاضہ ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو قرآن کریم کی اس لغت پر اکٹھا کر دیا جائے جس پر اس کا نزول ہوا ہے اور باقی تمام لغات سے انھیں باز رکھا جائے، اس رائے پر جملہ صحابۂ کرام متفق ہو گئے اور پھر ام المؤمنین سیدہ حفصہ کے پاس محفوظ مصاحفِ صدیقی اس وعدے کے ساتھ منگوائے گئے کہ نقل کے بعد انھیں واپس کر دیا جائے گا۔

جب صحائفِ صدیقی آ گئے تب سیدنا عثمان غنی نے سیدنا زید ابن ثابت انصاری، سیدنا عبداللہ ابن زبیر، یدنا سعید ابن العاص اور سیدنا عبدالرحمٰن ابن حارث کو صحائفِ صدیقی سے نقل قرآن کا حکم دیا اور آخر الذکر تینوں قرشی حضرات کو سیدنا زید ابن ثابت انصاری سے اختلافِ لغت کی صورت میں لغت قریش کے مطابق تحریر کرنے کی یہ کہہ کر خصوصی ہدایت کی کہ قرآن لغت قریش کے مطابق اترا ہے۔

اور اس طرح عہدِ صدیقی میں متعدد صحائف میں موجود قرآن کریم عہدِ عثمانی میں لغتِ قریش کے مطابق ایک صحیفے کے اندر اکٹھا ہو گیا اور اسی کے مطابق سات نسخے تیار کروا کے ایک نسخہ مدینۂ منورہ میں رکھا گیا، ایک مکۂ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ میں بھیج دیا گیا اور ہدایت کر دی گئی کہ اسی نسخے کے مطابق لوگ قرآن کریم پڑھا کریں اور اپنی اپنی لغت کے مطابق جنھوں نے اور قرآن کریم قلم بند کر رکھے ہیں دفع فتنہ کے لیے انھیں تلف کر دیا جائے۔

نقل کے بعد حسبِ وعدہ پھر صحائف صدیقی ام المؤمنین سیدہ حفصہ کو واپس کر دیے گئے اور وہ سارے صحائف عہدِ امیر المؤمنین سیدنا عثمان غنی پھر عہدِ امیر المؤمنین سیدنا علی ابن ابی طالب پھر عہدِ امیر المؤمنین سیدنا امام حسن اور پھر عہدِ امیر المؤمنین سیدنا امیر معاویہ میں بھی جوں کے توں ام المؤمنین سیدہ حفصہ کے پاس موجود رہے، ان کے وصال کے بعد مروان ابن الحکم نے انھیں منگا کر چاک کر ڈالے۔

آج پوری دنیا میں اسی مصحف عثمانی کی نقل بلا کم و کاست اور من وعن موجود ہے، اس میں کسی طرح کی کوئی کمی اور زیادتی نہ تو اب تک ہو سکی ہے اور نہ ہی صبح قیامت تک ہو سکے گی۔

یہ تو رہی بات نظم قرآنی کے کَمَا اُنْزِلَ صد فی صد محفوظ ہونے کی، اب آیئے معانی قرآن کے اس بحر ناپیدا کنار کی طرف جو اللہ نے نظم قرآنی میں موج زن فرما دیے ہیں۔

اللہ ارشاد فرماتا ہے" وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ "اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا، یہ قرآن ہر

چیز کا روشن بیان ہے، سرکار اعلیٰ حضرت عرض گزار ہیں ۔

ان پر کتاب اتری بَیَاناً لِکُلِّ شَیٍٔ

تفصیل جس میں مَاعَبَر ومَاغَبَرُ کی ہے

اللہ نے جس طرح نظم قرآنی کی حفاظت کا ذمہ اپنے کرم پر لیا ہے، جس طرح "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ارشاد فرما کر مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینۂ بے کینہ میں قرآن کریم کو محفوظ کر دینے اور اسے زبان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جاری کروا دینے کا ذمہ اپنے کرم پر لیا ہے اسی طرح اس نے آپ پر قرآن کریم کے مفاہیم اور اس کے اسرار و رموز کے اظہار کا ذمہ بھی اپنے کرم پر لے لیا ہے، ارشاد ربانی ہے "ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" پھر بے شک اس کی باریکیاں آپ پر ظاہر کر دینا بھی ہمارے ذمے ہے۔

جس ذاتِ گرامی پر "تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ" کی شان والی کتاب کے اسرار و رموز کھول دیے گئے ہوں اگر لوح و قلم کے جملہ علوم اس کے علوم کا ایک حصہ قرار پائیں تو مقام حیرت کیا ہے؟ امام بوصیری علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے ۔

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِکَ الدُّنْیَا وَضَرَّتَهَا

وَمِنْ عُلُوْمِکَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

اللہ کے مقدس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ نے قرآن کریم کے جو اسرار و رموز ظاہر فرمائے تھے وہ اسرار و رموز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب پر ان کے ظرف کے مطابق ظاہر فرمانے لگے جس کی بنیاد پر صحابۂ کرام مفسر قرآن بن گئے، جن میں سیدنا صدیق اکبر سیدنا فاروق اعظم سیدنا عثمان غنی سیدنا علی ابن ابی طالب سیدنا عبداللہ ابن عباس سیدنا عبداللہ ابن مسعود سیدنا زید ابن ثابت سیدنا ابوموسیٰ اشعری سیدنا عبداللہ ابن زبیر کو امتیازی شان حاصل ہے۔

صحابۂ کرام نے تعلیم و تفسیر قرآن کے لیے باضابطہ حلقۂ درس بنائے اور ان کے شاگردوں میں ایک سے ایک مفسر پیدا ہوئے۔

عہد صحابہ میں تفسیر کی کوئی کتاب باضابطہ نہیں لکھی گئی البتہ عہدِ تابعین سے تفسیر کی کتابوں کی تصنیف کا آغاز ہوا اور تیسری صدی ہجری سے تفسیر کی کتابوں کی جو تصنیف شروع ہوئی تو تا حال اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کی صحیح تعداد کیا ہے۔

چودہ سو سال سے قرآنی اسرار و رموز کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگا کر ہزاروں ہزار مفسرین مفاہیم قرآن کے

گہر ہائے نایاب نکال کر دنیا کے سامنے پیش کرتے چلے جارہے ہیں اور خزانہ ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

زیر نظر تصنیف بھی قرآن کریم کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے متعلق ہے۔ سورۂ فاتحہ قرآن کریم کی وہ جامع ترین اور اساسی سورت ہے جس پر عقائد و اعمال سے متعلق جملہ مضامین قرآنی کی عمارت کھڑی ہے اور اسی لیے امیر المؤمنین سیدنا علی ابن ابی طالب کا فرمان ہے کہ اگر میں چاہتا تو صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کو بوجھل کر دیتا، کیسے بوجھل کر دیتا؟ تفسیر کی کتابوں میں اس کی توجیہ موجود ہے جس کی قدرے تفصیل آپ زیر نظر تصنیف میں پڑھیں گے۔

اس کے مصنف از ہر ہند الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے ایک ممتاز اور ذی استعداد فاضل دیدہ ور مفتی اور مقبول عام ومخلص خطیب حضرت علامہ مفتی محمد معین الدین اشرفی زید مجدہم استاذ دار العلوم بہار شاہ شہر فیض آباد ہیں، جنھیں قرآن کریم اور شرح قرآن کریم یعنی حدیثِ رسول سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے، یہی وجہ ہے کہ ہفتے کی سات راتوں میں ان کی کوئی ایسی رات نہیں گزرتی جس میں موصوف کسی نہ کسی مسجد میں درس قرآن یا درس حدیث نہ دیتے ہوں۔ سالہا سال سے مسلسل دیے جانے والے موصوف کے اسی درس قرآن وحدیث کے نتیجے میں پانچ سو صفحات پر مشتمل فقط سورۂ فاتحہ کی یہ تفسیر منظر عام پر آرہی ہے۔

موصوف نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ از خود نہ کر کے بہ یک وقت تین بزرگوں کے ترجمے سے قارئین کو مستفیض ہونے کا موقع عطا کیا ہے۔

پہلا فارسی ترجمہ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور زمانہ بزرگ اور سلسلۂ اشرفیہ کے بانی غوث العالم مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفیٰ ۸۰۸ھ کا اشرف البیان ہے۔ دوسرا اردو ترجمہ مجدد دین وملت، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفیٰ ۱۳۴۰ھ کا کنز الایمان ہے۔ تیسرا اردو ترجمہ ابو المحامد، محدثِ اعظم ہند سید محمد اشرفی جیلانی متوفیٰ ۱۳۸۱ھ کا معارف القرآن ہے۔ ترجمے کے بعد موصوف نے ۵۱ ذیلی عناوین قائم کر کے ہر عنوان پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، جو یقیناً قارئین کی معلومات میں خاطر خواہ اضافے کا سبب بنے گی۔

اللہ موصوف کی اس قابل قدر قلمی خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول بخشے اور انھیں دارین میں اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

محمد مجاہد حسین رضوی مصباحی

استاذ وصدر دار الافتا دار العلوم غریب نواز الہ آباد

۲۷ ذوالحجہ ۱۴۴۲ھ مطابق ۷ اگست ۲۰۲۱ء شنبہ

کلمات تحسین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ :نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

از: حضرت علامہ مولانا مفتی بدر عالم صاحب مصباحی صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

حدیث شریف میں ہے خیر کم من تعلم القرآن و علمہ قرآن کریم سیکھنے سکھانے والا تم میں سب سے افضل انسان ہے۔ قرآنی رموز و اسرار کو حتی الامکان جاننے کے لئے تفسیر قرآن کریم کے علوم سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید کی تفاسیر میں بزبان عربی مختلف کتابیں معرض وجود میں آئیں، انہیں کتب تفاسیر میں علامہ بیضاوی علیہ الرحمہ ربہ القوی کی کتاب مستطاب کو غیر معمولی شرف قبول حاصل ہوا۔ مدارس اسلامیہ کے مروجہ نصاب میں یہ کتاب منتھی طلبہ کو عرصہ دراز سے پڑھائی جاتی ہے اس کتاب کی تشریح و تسہیل کی ضرورت محسوس ہوئی تشریح و تسہیل کا کام علمی استعداد اور دقت نظر وسعت فکر کا طالب ہے، مجھے بڑی مسرت محسوس ہوئی کہ اس کار اہم کے لئے عالمگیر شہرت کے حامل ادارہ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور ضلع اعظم گڑھ یوپی کے ایک ہونہار فرزند مولانا مفتی محمد معین الدین الاشرفی المصباحی، تیار ہوئے اور پوری توجہ سے شوق و ذوق کے ساتھ لگ گئے اور ام الکتاب سورہ فاتحہ کی توضیح و تشریح پر مشتمل ایک خوبصورت علمی گلدستہ تیار کر دیا، جو ہدیہ ناظرین ہو کر اہل علم کے لئے زیب نگاہ ثابت ہوگا۔

مولانا محمد معین الدین الاشرفی المصباحی، صوبہ بہار کی مردم خیز سرزمین بھاگلپور سے تعلق رکھتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی سے نہایت باذوق محنتی طالب علم کی حیثیت سے جامعہ اشرفیہ میں ہمیشہ نمایاں کامیابی سے ہم کنار ہوتے رہے۔ اور جامعہ سے فضیلت و تحقیق فی الفقہ والافتاء کے بعد ملک کی مشہور درسگاہ جامع اشرف کچھوچھہ مقدسہ میں درس نظامی کے مدرس منتخب ہوئے پھر کچھ دنوں بعد فیض آباد کی معروف درسگاہ دار العلوم بہار شاہ کے مدرس مفتی و شیخ الحدیث کے عظیم منصب پر فائز ہوئے اور شہر فیض آباد کے عوام و خواص میں علمی وقار کے ساتھ معتمد و مقبول ہیں دعا ہے کہ مولیٰ کریم حضرت مولانا کی علمی کاوش کو شرف قبول بخشے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔

بدر عالم مصباحی

صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارکپور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

از: حضرت علامہ مولانا قمر عالم قادری اشرفی صاحب شیخ الحدیث دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی، بستی

محب گرام حضرت مفتی محمد معین الدین اشرفی بھاگلپوری صاحب جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے قابل قدر فرزند ہیں۔ آپ کا تعلق ایک ایسی آبادی سے ہے جہاں کے باشندوں کو خانوادۂ اشرفیہ خصوصاً سرکار مخدوم پاک علیہ الرحمۃ والرضوان سے بڑی گہری عقیدت اور وابستگی ہے۔

مفتی صاحب کو علم فقہ، علم حدیث اور علم تفسیر سے اچھا خاصا شغف ہے۔ آپ دار العلوم بہار شاہ فیض آباد میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی کے منصب پر فائز ہیں اور شہر کی مختلف مساجد میں درس تفسیر و درس حدیث کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ آپ کے اس درس کا غلغلہ شہر فیض آباد میں پایا جاتا ہے۔ آپ جامع اشرف کچھوچھہ شریف میں بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دے کر خانوادۂ اشرفیہ کے علما و مشائخ میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

آپ نے تفسیر کی مستند و معتبر کتابوں کی مدد سے آسان انداز میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی ہے جو ہر خاص و عام کے لئے مفید اور نفع بخش ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مفتی صاحب نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے اس کام کو انجام دیا ہے اور کئی کتب تفاسیر کا مطالعہ کر کے سب کا نچوڑ اور عطر مجموعہ پیش کیا ہے۔ قبل ازیں آپ نے اصول فقہ کی معرکہ آرا مشہور کتاب مسلم الثبوت کی ایک عمدہ شرح لکھی تھی جسے علمی دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ میری دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ اس تفسیر کو قبول انام کا شرف عطا فرمائے اور مفتی صاحب کے علم و عمل اور فیض میں برکت عطا فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

محمد قمر عالم قادری

دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی (یو۔پی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حامداً و مصلیاو مسلما

حضرت مفتی محمد معین الدین صاحب قبلہ اشرفی مصباحی زید مجدہ، عصر حاضر میں نوجوان طبقہ علما میں ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ہیں، لائق فائق مدرس اور دلنواز، مقبول عام خطیب، بالغ نظر محقق اور قلم کار بھی ہیں، جہاں گفتگو میں حلاوت وذکاوت، لہجے میں شرافت و لطافت ہے وہیں آپ کی ذات میں جاذبیت و مقناطیسیت بھی ہے ایسے خوش خصال اور عالی ظرف کہ اختلاف رائے رکھنے والوں کی تلخ نوائی کا جواب بھی کبھی جارحیت وسطحیت سے نہیں دیتے۔ آپ کی تحریر میں شستگی، شگفتگی، لطافت وظرافت اور پیچیدہ وادق علمی مسائل کی تسہیل وتفہیم نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی تالیف لطیف ''تفسیر سورۂ فاتحہ'' پیش کی جاسکتی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ آپ کی اس تصنیف کو قبول عام و تام بنائے۔ آپ کو صحت وعافیت، سکون قلبی وذہنی سے نوازے، لمحہ بہ لمحہ بلندیٔ درجات، عمل پیہم، علم نافع عطا فرمائے، آپ پر بے شمار فیوض و برکات سماوی وغیبی کی موسلا دھار بارش ہو جنکے چند قطرے مجھ نادار ومفلس کو بھی میسر ہو جائیں آمین بجاہ طٰہٰ ویٰسین وصلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وصحبہ وجنودہ اجمعین۔

وصی احمد قادری عزیزی غفرلہ القوی

(نائب سربراہ اعلیٰ)

دارالعلوم بہارشاہ، فیض آباد، اجودھیا (یو۔پی)

۷ ربیع النور ۱۴۴۳ھ (م) ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۱ء

تعارف تفسیر وصاحب تفسیر

یہ کتاب سورہ فاتحہ شریف کی تفسیر اور اس کے اسرار ورموز اور نکات ولطائف کے بیان پر مشتمل ہے۔اس لئے ذیل میں مختصراً تفسیر کا تعارف اور اس کے مراتب کا بیان مذکور ہے۔''لفظ تفسیر فسر'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کھولنا۔ محاورے میں تفسیر یہ ہے کہ کلام کرنے والے کا مقصد اس طرح بیان کرنا جس میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔مفسرین کی اصطلاح میں تفسیر یہ ہے کہ قرآن پاک کے وہ احوال بیان کرنا جس میں عقل کو دخل نہ ہو بلکہ نقل کی ضرورت ہو جیسے آیات کا شان نزول اور ان کا ناسخ ومنسوخ ہونا وغیرہ اس لئے تفسیر بالرای حرام ہے حدیث شریف میں آیا ہے جو شخص قرآن میں اپنی رائی سے کچھ کہے اور ٹھیک بھی کہہ جائے جب بھی خطا کار ہے۔

مراتب تفسیر: اول: تفسیر القرآن بالقرآن: یہ سب سے مقدم ہے۔

دوم: تفسیر القرآن بالحدیث۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صاحب قرآن ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت والی کتاب قرآن حکیم کو آپ ہی پر نازل فرمایا اور آپ کو اس کا واضح بیان سکھایا اس لئے حضور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر نہایت اصح اور اعلیٰ ہے۔

سوم: قرآن کی تفسیر صحابہ کرام بالخصوص خلفاء راشدین اور فقہاء صحابہ کرام کے اقوال سے کرنا۔

چہارم: قرآن کی تفسیر تابعین یا تبع تابعین کے اقوال سے کرنا۔

اس تفسیر میں آپ کو جابجا قرآن کی آیات سے استشہاد و استدلال کی کثرت ،احادیث مبارکہ کا ذخیرہ، فقہاے صحابہ کے ارشادات اور تابعین و تبع تابعین کے اقوال و حکایات کا ایک جہاں آباد ملے گا۔جس سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ حضرت مفتی صاحب دیگر اوصاف کے حامل ہوتے ہوئے ایک بلند پایہ،قرآن کے مزاج شناس مفسر ہیں۔ذیل میں ہم ان کا کچھ تعارفی خاکہ پیش کررہے ہیں۔

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد معین الدین صاحب اشرفی مصباحیؔ مفتی وشیخ الحدیث دارالعلوم بہارشاہ فیض آباد کے اجداد کرام شیراز ہند جونپور کے رہنے والے تھے۔آپ کے اجداد بادشاہ ابراہیم شاہ سلجوقی کے دور میں اپنے مرشد برحق برگزیدۂ حضرت ذوالجلال، پرورش یافتہ بہ نور وصال، عارف بعلوم معنوی وصوری قطب ولایت حضرت سید شاہ ''دیوان صادق اشرف'' علیہ الرحمہ والرضوان کچھوچھوی کے ہمراہ بھاگلپور تشریف لائے جہاں ان کی بڑی قدر ومنزلت ہوئی آج بھی شیوخ جونپور کا خاندان باوقار نظروں سے دیکھا جاتا ہے خانوادہ اشرفیہ کچھوچھہ اور تاریخ جونپور میں شیوخ

جونپوری بھاگلپور کا جا بجا ذکر ملتا ہے ہر دور میں اس خاندان کا نام روشن کرنے والے افراد جلوہ گر ہوتے رہے ہیں ماضی قریب میں امام معقولات ومنقولات، معدن جود وکرم، جمال اہل تحقیق، سحبان منطق حضرت علامہ مفتی محمد سلیمان صاحب قبلہ اشرفی بھاگلپوری سابق مدرس الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ آسمان علم وفضل پر نیر تاباں بن کر چمکے جن سے جناب مفتی صاحب کو صہری قرابت حاصل ہے۔ جناب مفتی صاحب کی تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۷۲ء ہے ابتدائی تعلیم وتربیت آپ کے والد بزرگوار نے بڑی شفقت اور دلسوزی سے کی بچپن ہی سے آپ غیر معمولی ذہانت و فراست کے مالک تھے اپنی علمی زندگی کا آغاز باضابطہ طور پر مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم ماچھی پور بھاگل پور سے کیا یہاں پر آپ نے از ابتداء تا فوقانیہ تعلیم پورے انہماک کے ساتھ حاصل کی پھر اپنی علمی پیاس کو بجھانے کے لئے عالم اسلام کی مشہور دینی درسگاہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کا سفر ۱۹۸۶ء میں کیا اور بڑی محنت اور کمال جانفشانی کے ساتھ یہاں علم حاصل کیا پس ۱۹۹۲ء میں فضیلت اور ۱۹۹۵ء میں تحقیق فی الفقہ کی دستار وسند حاصل فرمائی۔

اساتذہ کرام: بڑے بڑے فضلاے زمانہ، علماے یگانہ اور اساتذہ بررہ سے آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے آپ کے اساتذہ میں مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم ماچھی پور اور الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے اساتذہ کی طویل فہرست ہے خصوصیت کے ساتھ پیر روشن ضمیر مخدوم المشائخ سرکار کلاں قدس سرہٗ جن سے صحیح البخاری کی ابتدائی وانتہائی حدیث کا درس لیا اور سند حدیث حاصل کی نیز فتاویٰ کی اصلاح کرائی، شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق صاحب امجدی سے بھی ابتدائی وانتہائی حدیث کا درس لیا اور اجازت حدیث عطا فرمائی نیز متواتر دو سال درجۂ تحقیق فی الفقہ میں رسم مفتی سیکھ کر فتویٰ نویسی میں مہارت حاصل کی، محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب قادری، استاذ زمن حضرت علامہ عبدالشکور صاحب، صدر العلماء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی، پروفیسر معقولات حضرت علامہ محمد نصیر الدین صاحب محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مفتی نظام الدین صاحب قبلہ وغیرہم اساتذہ اشرفیہ مبارکپور اور حضرت علامہ فیض الرحمن صاحب قبلہ اشرفی، حضرت علامہ ممتاز احمد صاحب قبلہ اشرفی اور حضرت علامہ نور الحسن صاحب قبلہ اشرفی وغیرہم اساتذہ مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم ماچھی پور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جن سے آپ نے متوسطات ودرجات علیا کی کتابیں پڑھی ہیں۔

درس وتدریس: تعلیم سے فراغت پاتے ہی آپ نے جامع اشرف درگاہ کچھوچھہ شریف سے درس وتدریس کا سلسلہ شیخ اعظم حضور سید اظہار اشرف صاحب قبلہ بانی جامع اشرف اور قائد ملت حضرت مولانا سید محمود اشرف اشرفی

الجیلانی ناظم اعلیٰ جامع اشرف کے حکم پر شروع فرمایا، حضرت ناظم اعلیٰ جامع اشرف نے اول دن سے درجات علیا کی منتہی کتابیں ملاحسن، شرح عقائد، حمداللہ اور مسلم الثبوت جیسی معرکۃ الاراء کتب زیر درس رکھ دی آپ نے بکمال حسن و خوبی احسن طریقے اور عمدہ انداز میں پڑھایا آپ سے طلباء بہت خوش اور مطمئن رہتے سینکڑوں آپ کے تلامذہ فارغ ہوکر ملک کے طول وعرض میں خدمات دینیہ میں مصروف ہیں، بلکہ جامع اشرف میں موجودہ وقت میں نصف درجن اساتذہ وہ ہیں جن کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

فتویٰ نویسی: اسلام میں مفتی کا مقام واضح ہے کہ سب سے پہلے سید المرسلین حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلالہ کے بارے میں فتویٰ ارشاد فرمایا جس کا ذکر قرآن حکیم میں ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق میں مفتی اعظم واول ہیں پھر خلفاء راشدین فقہاے صحابہ، ائمہ دین ومجتہدین کرام بالخصوص ائمہ اربعہ مفتیان اسلام کہلائے درحقیقت یہی حضرات مفتی تھے رہے آج تو صرف ان کے اقوال کے ناقل ہیں مگر یہ بھی اتنا مشکل کام ہے کہ ہرایرے غیرے، اس وادی میں قدم نہیں رکھ سکتا یہ اور بات ہے کہ آج ہر مسجد کا امام مفتی بن بیٹھا ہے گو کہ ایک فتویٰ بھی نہ لکھا ہو اللہ تعالیٰ ہم سب کو نامناسب اور غیر موضوع القاب کے استعمال سے بچائے مگر حضرت مفتی صاحب نے باضابطہ طور پر درجہ تحقیق فی الفقہ میں پڑھائی جانے والی کتابیں الجامعۃ الاشرفیہ کے اکابر اساتذہ اور مفتیان کرام سے پڑھی اور حضرت شارح بخاری نائب مفتی اعظم ہند حضرت علامہ ومولانا مفتی الحاج محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمۃ والرضوان کی زیر نگرانی متواتر دو سال تک فتویٰ نویسی کی مشق فرمائی جہاں آپ نے بہت سارے فتاوے تحریر فرمائے جن پر حضور شارح بخاری علیہ الرحمہ کی تصدیق موجود ہے۔ پھر فراغت حاصل کرنے کے بعد جب آپ جامع اشرف درگاہ کچھوچھہ شریف بحیثیت مدرس تشریف لائے تو وہاں بھی دارالافتاء کا بارگراں اٹھایا اور ہزاروں فتاوے صادر فرمائے جن میں بہت سارے فتاوے پر حضور مخدوم المشائخ سرکار کلاں علیہ الرحمہ کی تصدیق ثبت ہے۔

۱۹/اگست ۲۰۰۲ء میں جناب ڈاکٹر محمد قمر ماہری حبیبی منیجر دارالعلوم بہارشاہ کی دعوت پر بحیثیت مدرس عالیہ فیض آباد تشریف لائے تو یہاں بھی باضابطہ طور پر منصب افتاء پر مقرر کئے گئے اور ہزاروں فتاوے رقم فرمائے، دارالعلوم بہارشاہ میں شیخ الحدیث کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ بروقت بدیعی دارالافتاء اور صدر الشریعہ دارالقضاء کی ذمہ داریاں نبھارہے ہیں مذکورہ تینوں اداروں میں جو فتاوے آپ نے لکھے ہیں دارالعلوم ان کی اشاعت کا عزم کررہا ہے فتاوے کی اشاعت کے بعد اہل علم آپ کے علمی اور فقہی مقام ومرتبہ کا اندازہ کرسکیں گے ماہنامہ حضوری میں آج سے

کئی سال پیشتر آپ کے کچھ فتاوے شائع ہوئے تھے ہم ذیل میں ان کے کچھ فتاوے لکھ دے رہے ہیں تا کہ عوام کو فائدہ پہنچے۔

(۱) فتویٰ: مسئلہ مسؤلہ: از یک خاتون مسلمہ قندھاری بازار فیض آباد

میرے پاس ایک مصحف شریف ہے اس کے اوراق بہت پرانے ایسے بوسیدہ ہو چکے ہیں کہ پڑھنے میں نہیں آتے ۔اب مزید اس کو گھر میں رکھنا مناسب نہیں کہ اندیشہ بے حرمتی ہے اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مصحف کو ہم کہاں رکھیں یا کیا کریں یا جلا دیں بعض لوگ اسے کنوئیں یا دریا میں ڈالنے کو کہتے ہیں کیا صحیح ہے۔ بینوا وتوجروا

الجواب : بعون الملک الوهاب

اس مصحف شریف کو جزدان میں قرینے سے رکھ کر کسی ایسی جگہ دفن کر دیں جہاں اس کے اکھاڑے جانے کا اندیشہ نہ رہے دفن کرنے میں اس بات کا خیال رہے کہ لحد بنائی جائے چونکہ صندوقچی قبر بنانے میں مصحف پر مٹی ڈالنے میں اس کی تحقیر ہوگی ہاں اگر صندوقچی بنا کر اس میں مصحف رکھ دیں پھر اس پر چھت ڈال کر مٹی ڈالیں تو مضائقہ نہیں یا جزدان میں لپیٹ کر کسی ایسی جگہ رکھوا دیں جہاں اس پر نجاست پڑنے یا اس کی تحقیر ہونے کا اندیشہ نہ رہے جیسے مسجد وغیرہ، ایسی جگہ ہرگز نہ ڈالیں جس میں کسی طرح بھی اس پر نجاست پڑنے یا اس کی تحقیر ہونے کا اندیشہ باقی رہے پس اس لئے کنوئیں میں نہ ڈالیں کہ کنوئیں میں ڈالنے میں اس کی تحقیر ہے یا دریا برد نہ کریں کہ دریا میں نجاست سے ملوث ہونے کا قوی اندیشہ ہے اسی طرح اس کو جلانا بھی سخت ممنوع ہے۔ فتاویٰ ہندیہ کتاب الکراہیت میں ہے۔ ”**المصحف اذا صار خلقا لا یقرء منه ویخاف ان یضیع یجعل فی خرقة طاهرة ویدفن ودفنه اولی عن وضعه موضعا یخاف ان یقع علیه النجاسة او نحو ذالک ویلحد له لانه لو شق ودفن یحتاج الی اهالة التراب علیه وفی ذالک نوع تحقیر الا اذا جعل فوقه سقف بحیث لا یصل التراب الیه فهو حسن ایضا کذا فی الغرائب۔ المصحف اذا صار خلقا وتعذرت القراءة منه لا یحرق بالنار اشار الشبانی الی هذا**“۔ وهو تعالیٰ اعلم۔

۲۲/ جمادیا لآخرہ ۲۴ھ۔ ۲۳/ اگست ۲۰۰۳ء

فتویٰ (۲) مسئلہ مسؤلہ: از عبدالقادر فیض آباد

نماز میں امام نے ایک سجدہ بھول کر ترک کر دیا سلام پھیرتے وقت یا بعد میں یاد آیا تو اب اس کا کیا حکم ہے نماز ہوگی یا نہیں سجدہ سہو واجب ہے کہ نہیں۔ وغیرہ۔

الجواب: بعون الملک الوھاب

نماز میں دونوں سجدے مستقل رکن ہیں فتاویٰ ہندیہ میں ہے۔ ''**السجود الثانی فرض کالاول باجماع الامۃ کذافی الزاھدی**'' اور رکن کے ترک سے نماز نہیں ہوگی اگر اس رکن متروک کی قضا ممکن ہو تو فبھا ورنہ نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ سجدہ سہو سے فوت شدہ رکن کی تلافی نہیں ہوسکتی جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ ''**وفی الولوالجیۃ الاصل فی ھذا ان المتروک ثلاثۃ انواع فرض وسنۃ وواجبۃ ففی الاول ان امکنہ التدارک بالقضاء یقضی والا فسدت صلاتہ**'' یعنی اصل یہ ہے کہ نماز میں جو باتیں چھوٹ جاتی ہیں تین قسم کی ہوتی ہیں فرض، سنت اور واجب۔ فرض چھوٹنے کا حکم یہ ہے کہ اگر قضا کے ذریعہ اس کا تدارک ہوسکے تو کرلے ورنہ نماز فاسد ہوجائے گی۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

فتویٰ (۳) مسئلہ مسؤلہ: از محمد نورالحق، متعلم دارالعلوم بہارشاہ، ساکن کشن گنج

بھیگے ہوئے کتے نے بدن جھاڑا اس کا پانی آدمی کے بدن پر پہنچا یا آدمی کے کپڑے پر لگا تو آدمی یا کپڑے کا کیا حکم ہے؟ پاک ہے یا ناپاک ہے۔

الجواب: بعون الملک الوھاب

بھیگے کتے کے پانی کا حکم جاننے کے لئے کتا کا حکم جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ کتا نجس العین ہے یا نہیں اس بارے میں فقہائے احناف مختلف نظر آتے ہیں فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ کتا نجس العین ہے اس لئے اس کے بدن کا پانی بھی ناپاک ہے۔ اگر ایک درہم سے زیادہ کپڑے یا بدن میں لگ گیا تو بغیر پاک کئے ہوئے نماز نہ ہوگی۔ فتاویٰ قاضی خاں کے الفاظ یہ ہیں ''**او وقع فیھا کلب او خنزیر مات او لم یمت اصاب الماء فم الواقع او لم یصب اما الخنزیر فلان عینہ نجس والکلب کذالک ولھذا لو ابتل الکلب فانتفض فاصاب ثوبا اکثر من قدر الدرھم افسدہ لان ماواہ النجاسات**'' فتاویٰ قاضی خاں (ج:۱ ص:۹) اس کے برخلاف اکثر علماء کا مذہب مختار یہ ہے کہ کتا نجس العین نہیں ہے لہٰذا اگر کتا پانی میں گرا اور اس کا منھ پانی سے نہیں چھوا ہے تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ ''**والصحیح ان الکلب لیس بنجس العین فلا یفسد الماء مالم یدخل فاہ کذا فی التبیین۔ مراقی الفلاح علی نور الایضاح میں ھے وتنزح بموت الکلب قید بموتہ فیھا لانہ غیر نجس العین علی الصحیح فاذا لم یمت وخرج حیا ولم یصل فمہ الماء لا ینجس**'' (ص:۲۱) یہ قول حضرت امام الائمہ

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ جب کہ قاضی خاں کا فتویٰ قول صاحبین پر ہے مگر صحیح راجح اور مفتیٰ بہ قول حضرت امام کا ہے۔ کہ کتا نجس العین نہیں ہے اس لئے اس کا چھینٹا کیا خود کتا پانی میں گر گیا اور اس کا منھ پانی تک نہیں پہنچا تو پانی ناپاک نہ ہوگا۔ زیر قول مراقی الفلاح "**لانه غیر نجس العین**" طحطاوی میں ہے۔ "**وھو قول الامام رضی اللّٰه عنه وعندھما نجس العین کالخنزیر والفتویٰ علی قول الامام**"۔ واللہ تعالیٰ اعلم

فتویٰ(4): مسئلہ مسؤلہ: از عبدالحق خان صاحب حسنو کٹرہ فیض آباد نائب صدر دارالعلوم ہذا۔

نماز جنازہ ہو رہی ہے امام نے تین تکبیریں کہہ دی ہیں اب کوئی مسلمان پہنچا تو وہ اب کیا کرے نماز جنازہ میں شامل ہو یا نہیں۔ اگر شامل ہونے کا حکم ہے تو نماز کیسے پڑھے؟۔

الجواب : بعون الملک الوھاب

صورت مسؤلہ میں مذہب امام اعظم یہ ہے کہ امام نے ایک یا دو یا تین خواہ چاروں تکبیریں کہہ دی ہوں پھر بھی بعد کو آنے والا شخص جنازہ کی نماز میں شامل ہوگا اگر امام نے اس وقت تک سلام نہ پھیرا ہو۔ پس اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے پہلے کوئی شخص داخل ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ امام کے ساتھ جتنی تکبیریں پائے کہہ لے پھر بعد کو جنازہ اٹھانے سے پہلے پہلے بقیہ چھوٹی ہوئی پہلی تکبیریں بغیر دعا کے کہہ ڈالے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ "**واذا جاء رجل فقد کبر الامام التکبیرة الاولیٰ ولم یکن حاضرا انتظره حتی یکبر الثانیة فیکبر معه فاذا فرغ الامام کبر المسبوق التکبیرة التی فاتته قبل أن ترفع الجنازة وھذا قول ابی حنیفة ومحمد رحمھما اللّٰه تعالیٰ وکذا ان جاء فقد کبر الامام تکبیرتین او ثلاثا کذافی السراج الوھاج۔ وان جاء رجل وقد کبر الامام اربعا ولم یسلم لا یدخل معه فی روایة عن ابی حنیفة والاصح انه یدخل وعلیه الفتویٰ کذافی المضمرات ثم یکبر ثلاثا قبل ان ترفع الجنازة متتابعا لا دعاء فیھا کذا فی الخلاصة و قاضی خاں**"۔

فتویٰ(5): مسئلہ مسؤلہ: از محمد اسلم بیلرزسی نزیل طائف، سعودیہ

۱۔ نماز کے لئے جب اقامت کہی جاتی ہے تو مقتدیوں کو کس وقت کھڑا ہونا چاہئے۔ اقامت کے شروع میں یا حی علی الصلوٰۃ کے وقت۔

۲۔ گمراہ فرقے جیسے، وہابی، نیچری، شیعہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔؟

۳۔مسلک اعلیٰ حضرت کیا ہے اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔؟

الجواب : بعون الملک الوھاب

۱۔اقامت کہنے والا جب حی علی الصلوٰۃ کہنا شروع کرے تو اس وقت امام وقوم سب لوگ کھڑے ہوجائیں یہی مسنون ہے حضرات صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین سے منقول ہے۔اور فقہائے حنفیہ کا معمول بہ یہی ہے۔جو کتب حنفیہ میں مذکور ومسطور ہے۔حضرت امام محمد شیبانی شاگرد رشید حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی مشہور ومعروف حدیث کی کتاب مؤطا امام محمد میں ہے۔

"عن مالک ابن ابی عامر الانصاری ان عثمان بن عفان کان یقول فی خطبته اذا قامت الصلوٰۃ فاعدلوا الصفوف وحاذوا بالمناکب فان اعتدال الصفوف من تمام الصلوٰۃ" اس حدیث سے مسئلہ استنباط فرماتے ہوئے حضرت امام محمد فرماتے ہیں۔"ینبغی للقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح ان یقوموا فیصفوا ویسووا الصفوف ویحاذوا بین المناکب فاذا اقام المؤذن الصلوٰۃ کبر الامام وھو قول ابی حنیفۃ" (ص:۸۷۔۸۶) فقہ حنفی کی مشہور کتاب شرح وقایہ میں ہے۔"ویقوم الامام والقوم عند حی علی الصلوٰۃ ویشرع عند قد قامت الصلوٰۃ" (ص۱۵۷،ج:۱) فتاوی ہندیہ۔معروف بہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔"اذا دخل الرجل عند الاقامۃ یکرہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قوله حی علی الفلاح کذا فی المضمرات۔ان کان المؤذن غیر الامام وکان القوم مع الامام فی المسجد فانه یقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حی علی الفلاح عندعلمائنا الثلاثۃ وھو الصحیح"۔(ص:۵۷،ج:۱) مندرجہ بالا فقہی اقتباسات ان کتابوں سے ماخوذ ہیں جو عالم اسلام میں بڑی عبقری اور مستند مانی جاتی ہیں سنی، وہابی، دیوبندی مکتبہ فکر کے مدرسوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔ان سب میں تصریح ہے کہ امام ومقتدی سب حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں گے مگر اس کے باوجود وہابیوں کا عمل اس کے بالکل برخلاف ہے کہ وہ شروع اقامت میں ہی کھڑے ہوجاتے ہیں اور آج یہ ان کا شعار اور علامت بن چکی ہے۔اس لئے خوب خیال رہے کہ حی علی الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا ہی سنت اور معیار سنیت ہے اور ابتداء اقامت میں کھڑا ہونا خلاف سنت، کراہت، بدعت اور شعار وہابیت ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم

۲: گمراہ فرقے جیسے وہابی، نیچری وغیرہ کے بہت عقیدے گمرہی اور کفریہ ہیں مثلاً وہابیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کو علم غیب نہیں تھا اگر دو چار تھا بھی تو اس میں حضور کی کیا تخصیص ایسا علم تو زید وعمر بلکہ بچہ اور جانور کو بھی حاصل ہے۔ ان کے پیشوا مولوی اشرفعلی تھانوی نے اپنی کتاب حفظ الایمان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کل علم غیب کا انکار کرتے ہوئے بعض علوم غیبیہ کا اقرار کیا بھی تو ان بعض کو بچوں، پاگلوں اور جانوروں کے علم کے برابر ٹھہرا دیا۔ ملاحظہ ہو

''اس میں حضور کی کیا تخصیص ہے ایسا علم تو زید وعمر بلکہ ہر صبی ومجنون بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لئے بھی حاصل ہے''۔ (حفظ الایمان)

اس طرح کے خرافات سے ان گمراہوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں اس لئے ان کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز وگناہ ہے اگر کسی نے غلطی سے پڑھ لی تو پھر سے پڑھے ورنہ گنہگار ہوگا حدیث شریف میں ایسے ہی گمراہوں کے بارے میں ارشاد ہوا ''ولا تصلوا معھم وان مرضوا فلا تعودوھم الی آخرہ''۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۳۔ مسلک اعلیٰ حضرت بعینہٖ مسلک امام اعظم ہے۔ مسلک امام اعظم کے جو عقائد ونظریات اور احکام ومسائل کتب مذہب میں مسطور ومنقول ہیں ان پر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمہ سختی سے عمل پیرا تھے اور اس کی خوب تعبیر وتشریح فرمائی اور ہمیشہ اپنے آپ کو حنفی کہلاتے رہے مگر جب ہندوستان میں فتنہ وہابیت کا ظہور ہوا تو اہل سنت کے علماء نے بڑی شدومد کے ساتھ ان کے فتنے کو دبایا ان میں اعلیٰ حضرت خصوصیت کے ساتھ پیش پیش تھے اور ان کا ایسا رد بلیغ فرمایا کہ وہابیوں کے دانت کھٹے ہوگئے پورے عالم اسلام میں ان کو سر چھپانے کی جگہ نہ رہی حتی کہ علماے حرمین طیبین نے بھی ان کے کفری عقائد ونظریات کے باعث انہیں کافر ومرتد قرار دیا وہابیوں کو جب عرب وعجم ہر جگہ ہزیمت ورسوائی کا منھ دیکھنا پڑا تو انہوں نے اہل سنت خصوصاً اعلیٰ حضرت کو بدنام کرنے کے لئے یہ اختراع کیا کہ احمد رضا خان بریلوی نے ایک نئے مسلک کی بنا ڈالی ہے۔ جو مسلک، چار مسالک مشہورہ معروفہ کے بالمقابل پانچواں مسلک ہے۔ پھر وہابیوں کو منھ چڑھانے کے لئے اور سنیت کو وہابیت سے ممتاز کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت کے عقیدت مندوں نے بھی مسلک اعلیٰ حضرت کا استعمال شروع کر دیا کیونکہ وہابی، دیوبندی بھی اپنے آپ کو سنی حنفی کہلاتے ہیں۔ غرض مسلک اعلیٰ حضرت کا استعمال یہاں معنی معروف اصطلاحی میں نہیں ہے۔ بلکہ لغوی معنی (روش، طریقہ) میں ہے۔ جس کا استعمال جائز ودرست ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

تصنیفات: دوران درس وتدریس بیشمار مصروفیات کے باوجود آپ نے موقع نکال کر بہت سی کتابیں تصنیف

فرمائیں، درجنوں مقالے لکھے الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے فقہی سیمینار میں درجہ تخصص فی الفقہ میں پڑھنے کے وقت سے ہی شرکت کررہے ہیں اور اس میں مقالے بھی پیش کرتے ہیں آپ کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصنیفات اور مقالے کی تعداد درجنوں کو پہنچتی ہے ان میں اشرف النعوت شرح مسلم الثبوت، اعلیٰحضرت اشرفی ارباب علم ومعرفت کی نظر میں، دس بیبیوں کی کہانی، سیدہ کی کہانی، اربعین اشرفیہ، جواب اولی الامر کون، جامع اشرف وبانی جامع اشرف، حیات النبی اور تفسیر ہذا ''الاسرار الواضحہ فی تفسیر سورۃ الفاتحہ'' وغیرہا ہیں ان میں 'اشرف النعوت شرح مسلم الثبوت، اعلیٰحضرت اشرفی ارباب علم ومعرفت کی نظر میں اور دس بیبیوں کی مع سیدہ کی کہانی' چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں اور عوام وخواص سے داد تحسین حاصل کرچکی ہیں۔آپ کی تصنیفات میں خصوصیت کے ساتھ شرح مسلم الثبوت کو علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی ہے کہ اس شرح پر حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ پورنوی اور استاذ زمن حضرت علامہ عبدالشکور صاحب قبلہ شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ وغیرہما کی تقریظات نے اس کتاب کی عظمت میں چار چاند لگادیا ہے۔اور یہ تفسیر آپ کے ہاتھوں میں ہے مفتی صاحب اپنی محنت میں کہاں تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ پر ہے۔

تبلیغی خدمات: حضرات علمائے کرام،اس خیرامت کے نقیب ہیں تبلیغ کرنا علمائے ربانیین اور فقرائے عارفین پر فرض ہے جو علما مجسمہ ادب اور عشق نبوی سے سرشار ہوتے ہیں وہی حضرات تبلیغ دین میں مصروف رہتے ہیں حضرت مفتی صاحب کی حیات کے شب وروز دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مبلغ اسلام بھی ہیں آپ نے اپنی تحریر وتقریر اور درس وتدریس کے ذریعے تبلیغ کا کام خوب کیا اور کررہے ہیں۔آپ کی تبلیغ کا محور وہی تین اصول ہیں جو آیت قرآنیہ سے ظاہر ہیں یعنی خیر کی دعوت دینا بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا آپ نے دکھ اٹھائے صدمے جھیلے لیکن دعوت کے عظیم مشن کو کامیابی کے ساتھ جاری وساری رکھا، آپ کی دعوت سے سینکڑوں نمازی بن گئے گناہوں سے توبہ کیا چونکہ آپ علوم قرآن وحدیث اور علم فقہ پر خود شدت کے ساتھ عمل پیرا ہیں اس لئے بہت سے بے راہ روؤں کو احکام شریعت پر عمل پیرا بنادیا۔آپ کی تبلیغ کا دائرہ صرف فیض آباد ہی نہیں بلکہ ملک کے مختلف صوبوں میں ہے اکثر وبیشتر جاکر آپ نے تقریر وخطابات کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح فرمائی مسلسل دوسال تک مالیگاؤں مہاراشٹر کا طویل سفر کرکے آپ نے وہاں کی اشرفی مسجد میں ماہانہ درس قرآن دیا ہے جس کے اثرات وبرکات آج بھی وہاں محسوس کئے جاسکتے ہیں آپ نے بہت سارے مدارس کے نصاب ونظامہائے تعلیم وتدریس اور امتحانات کے اصول وضوابط مقرر فرمائے جس کی وجہ سے وہ مدارس تعلیمی اعتبار سے بلند مقام پر پہنچے ہوئے ہیں اسی طرح آپ نے

بہت ساری مساجد کی بھی تاسیس فرمائی اوراس کا افتتاح بھی کیا بروقت مسجد "**مسعود غازی**"محلہ علی گڑھ پرانی پولس چوکی کشمیری محلہ فیض آباد یوپی کی تاسیس آپ کے ہاتھوں عمل میں آئی اوراس کی تعمیرات کا کام بھی آپ کی زیر نگرانی ہورہا ہے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیکر ثواب دارین حاصل کریں۔

مساجد میں درس قرآن و حدیث : دارالعلوم میں طالبان علوم اسلامیہ کو درس دینے کے ساتھ ساتھ آپ نے عوام مسلمین کی تعلیم واصلاح کے لئے بھی مختلف مساجد میں درس قرآن وحدیث کی بساط بچھارکھی ہے چنانچہ شہر فیض آباد کی چھوٹی بڑی سات مسجدوں میں آپ عوام مسلمین کو درس قرآن وحدیث دینے کی سعادت حاصل کرتے ہیں،شہر کی مرکزی جامع مسجد ٹاٹ شاہ میں درس صحیح البخاری اور بلال مسجد سبھاش نگر، جامع مسجد حسنو کٹرہ، مدینہ مسجد بچھڑا سلطانپور، قادری مسجد نیاواں میں حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کا درس دیتے ہیں اور یک منارہ مسجد وزیر گنج اور دائحوری مسجد محلہ پرانی سبزی منڈی میں درس قرآن دیتے ہیں لوگ ذوق وشوق کے ساتھ آپ کے درسوں میں شرکت کرتے ہیں اورعلوم قرآن واحادیث کے معانی وبرکات سے مستفید ہوتے ہیں جس کا خاصہ اثر عوام الناس میں پایا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ حضرت مفتی صاحب بلند پایہ شیخ الحدیث اور بصیرت افروز مفسر ہیں حدیث دانی میں مہارت وصلاحیت اورقرآن کی تفسیر بیانی میں آپ کی جلالت علمی کا ان لوگوں کو بخوبی اندازہ ہے جو آپ کے حلقہ درس میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل کرچکے ہیں چنانچہ جو طالبان علوم قرآن اور تشنگان علم حدیث برابر آپ کے حلقہ درس میں شریک ہوتے ہیں ان کو قرآن کے بہت سے رموز واسرار ومعانی ومطالب پر آگاہی ہوچکی ہے اور ایمان وعقائد اور مسائل وفضائل کی سینکڑوں حدیثیں ذہن نشین ہوگئیں ہیں غرضیکہ اس اشرفی مصباحی چمنستان کے سرسبز وشاداب پھول کی علمی خوشبوؤں سے ہزاروں ہزار کے قلوب والباب معطر ہورہے ہیں۔دعا ہے کہ آپ کے علمی وفنی فیوض وبرکات اسی طرح ہمیشہ جاری رہیں۔

بیعت و خلافت : ہر زمانہ میں علماے اسلام اور بزرگان دین نے علوم ظاہری سے مزین وآراستہ ہونے کے بعد علوم باطنی وروحانی کی طرف توجہ فرمائی ہے کیونکہ روحانی تربیت اور بزرگوں کی بارگاہ میں جبیں سائی کے بغیر کوئی علم نفع بخش،فیض رساں اور بابرکت نہیں ہوتا بزرگوں کی صحبت سے دور نفور رہنے والا عالم شجر بے ثمر کی طرح ہوتا ہے۔اس لئے علماے ربانیین اور برزرگان دین کی متابعت کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے بھی علوم ظاہری کی حصولیابی

کے بعد، روحانی تعلیم کی طرف توجہ فرمائی اور دلوں کے سرور، بواطن کے نور حضور مخدوم المشائخ سیدنا شاہ سید مختار اشرف سجادہ نشین آستانہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ عرف سرکار کلاں علیہ الرحمہ سے روحانی تربیت حاصل کی ہے، حضور سرکار کلاں سلسلہ اشرفیہ چشتیہ حسنیہ کے بہت ہی مشہور ہر دلعزیز اور نورانی صورت بزرگ گذرے ہیں ان سے آپ کو شرف بیعت حاصل ہے حضرت نے آپ کو دست بدست بیعت فرمائی ہے صحیح البخاری شریف کی اول و آخر حدیث باضابطہ پڑھا کر سند حدیث عطا فرمائی ہے۔ نیز تمام اوراد و ظائف خاندانی بالخصوص دلائل الخیرات شریف کی تحریری اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔ پھر حضرت کے خلف اکبر شیخ اعظم حضرت علامہ سید محمد اظہار اشرف اشرفی الجیلانی سجادہ نشین آستانہ اشرفیہ سے جملہ اعمال و وظائف سلسلہ خصوصاً دعاے حیدری کی اجازت اور سند خلافت سلسلہ اشرفیہ چشتیہ قادریہ منوریہ معمریہ مع دلق و تاج و دستار حاصل ہے۔

سلسلہ قادریہ منوریہ کا رنگ: سلسلہ قادریہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سلسلہ جس پر اپنا رنگ جماتا ہے اس کے اندر شان عظیم پیدا فرما دیتا ہے کمالات بزرگ اور کرامات کثیرہ کا حامل و جامع بنا دیتا ہے اور اس کو نفس قاطع عطا فرماتا ہے۔ تمام خلقت بالاتفاق اس کے کمالات و فضائل کی قائل ہو جاتی ہے۔

قادری نسبت ہے محبوبی سرشت　　عاشق و معشوق ہیں پیران چشت
ہیں یہ گلزار نبوت کی بہار　　رنگ و بو ان کا ہے محبوبی بکار

غوث اعظم کی غلامی کا حضور
ہے ہمارے واسطے جام سرور

حضرت مفتی صاحب کو شیخ اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان سے سلسلہ قادریہ منوریہ اشرفیہ کی اجازت و خلافت حاصل ہے شیخ اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان آپ کے مرشد اجازت ہیں۔ یہ سلسلہ سلسلۃ الذہب کہلاتا ہے جو قطب ربانی اعلیٰ حضرت اشرفی میاں قدس سرہ سے، صرف پانچ واسطوں سے حضور غوث اعظم محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

غوثی و قطبی وابدالی کا نور
اس طریقے میں رہے گا بالضرور

سلسلہ چشتیہ اشرفیہ کا رنگ: سلسلہ چشتیہ کے مشائخ عظام صاحب ریاضت و مجاہدات اور صاحب ذوق سماع ہوتے ہیں اور اہل سماع کو دوست رکھتے ہیں مشائخ کا عرس کرتے ہیں فقراء کو امراء پر فوقیت دیتے

ہیں اور شہر و گاؤں میں رہائش رکھتے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ تواضع سے پیش آتے ہیں اور مریدین کی تربیت میں عالی ہمت اور شان عظیم رکھتے ہیں چنانچہ حضور سیدنا خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ والرضوان انیس الارواح میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے سلسلے میں ایک روز و شب کا مجاہدہ ہے اور زیادہ ذوق و مشاہدہ ہے لطائف اشرفی میں ہے کہ جو شخص خاندان قدیم اور سلسلہ کریم اہل چشت کی محبت اور موافقت کا دعویٰ کرتا ہے اس کے اندر یہ دو وصف ہونے ضروری ہیں۔

اول ترک و ایثار
دوم عشق و انکسار

جس شخص کے اندر یہ دو وصف نہیں ہیں اس کو چشتیہ کے مذہب سے کوئی حظ اور بہشیوں کے مشرب سے کوئی حصہ نہیں ملتا ہے۔

یہ چمن ہے سیر گاہ کا ملاں — یہ چمن ہے جلوہ گاہ و اصلاں
شاہ اجمیری جہاں کے بادشاہ — رہنما ئے راہ صاف الااللہ
حضرت خواجہ معین الدین سے — فقر کے واقف ہوئے آئین سے

صدر جنت چشتیو ں کی شان ہے
باغ رضواں چشتیوں کی آن ہے

حضرت مفتی صاحب کو سلسلہ چشتیہ اشرفیہ کی اجازت و خلافت اپنے مرشد اجازت سے حاصل ہے آپ کے اندر سلسلے کی خوبو پائی جاتی ہے۔

سلسلہ اشرفیہ کا رنگ: حضور سیدنا مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی سامانی نوربخشی علیہ الرحمۃ والرضوان جس جلالت شان کے مالک ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہے سارے جہاں میں ان کی عظمت و سیادت کا ڈنکا بج رہا ہے اسلام کی تبلیغ و اشاعت، جلال کبریائی کے ظہور اور کفر و الحاد کی قوتوں کے ساتھ تصادم کی ایک عظیم الشان تاریخ حضور سیدنا مخدوم پاک علیہ الرحمۃ والرضوان سے وابستہ ہے۔ کشور ہند کے چپے چپے پر حضور سیدنا مخدوم پاک کا فیضان آسمان کے بادل کی طرح برستا رہتا ہے اور آج بھی برس رہا ہے۔ سلسلہ اشرفیہ کی برکتوں سے بیشمار انسان کفر و شرک کی ظلمتوں سے نکل کر اسلام و ایمان کے اجالے میں آگئے اور ہزاروں سعادت نصیب، پاک طینت افراد خدا رسی کی دولت لازوال سے

سرفراز ہوئے ہیں۔ بیشمار طالبوں اور شیدائیوں کو یہ منصب عطا ہوا کہ دل پر ہاتھ رکھ دیا تو صاحب دل بنا دیا آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو روحوں کو عشق و مستی کے کیف میں شرابور کر دیا جو سران کے قدموں سے ہو گئے انہیں کشور ولایت کا تاجدار بنا دیا اور ہاتھ پکڑ لیا تو جلالت کبریائی کی دہلیز پر لا کر کھڑا کر دیا۔

حضور سیدنا مخدوم پاک کے گہوارۂ قدس سے جو چشمہ جاری ہوا وہ آگے چل کر کئی سمتوں میں پھیل گیا اس نور کا جسے بھی امین بنایا گیا اس کی ذات سے لاکھوں لاکھ چراغ جلے اور ہر چراغ کی روشنی مختلف سمتوں اور جہتوں میں پھیلتی چلی گئی اس طرح سلسلہ اشرفیہ کا روحانی و عرفانی فیض کشور ہند کی حدود کو توڑ کر آگے بڑھا اور روئے زمین کے مختلف حصوں اور ملکوں میں پھیل گیا۔

مختصر یہ کہ مفتی صاحب کو سلسلہ عالیہ قادریہ منوریہ اور سلسلہ عالیہ چشتیہ اشرفیہ کے فیوض و برکات سے بہت فیض پہنچا ہے ان کی علمی و عملی زندگی میں اسکا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ مولائے کریم تفسیر سورہ فاتحہ کو قبول فرما کر قبولیت عامہ عطا فرمائے اس کے مؤلف کی عمر اور علم و عمل میں برکتیں عطا فرمائے آمین، بجاہ سید المرسلین صلیٰ اللہ علیہ وسلم۔

فقط والسلام

(مولانا) انوار احمد نعیمی

پرنسپل دار العلوم بہار شاہ، فیض آباد

۹۲/۷۸۶

اظہار مسرت

گلشن کا رنگ اور نکھرتا چلا گیا
اے موسمِ بہار تجھے جب سے ملے ہیں ہم

ہم اس بات پر بہت نازاں اور شاداں ہیں کہ ہمارے ادارہ دارالعلوم بہار شاہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد معین الدین اشرفی مصباحی صاحب بہت لائق و فائق استاذ ہیں۔ آپ نے اس سے پہلے بھی درس نظامی میں درجہ فضیلت و تخصص کے طلباء کو پڑھائی جانے والی ایک نایاب کتاب مسلم الثبوت کی شرح ''**اشرف النعوت شرح مسلم الثبوت**'' لکھی تھی جسے تمامی عالم دین نے بہت سراہا تھا اب آپ نے تفسیر سورہ فاتحہ کے نام سے ایک ضخیم اور عظیم الشان کتاب بڑی کاوشوں سے تحریر فرمایا ہے۔ جسے دیکھ کر اور پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی اس تحریر کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور تحریر و تقریر میں مزید اضافہ فرمائے۔ اس کے صدقہ و طفیل ان کی ہماری اور جملہ اراکین اور معاونین کی نجات فرمائے۔ آمین

فقط والسلام

خادم ادارہ ہذا

ڈاکٹر محمد قمر ماہری حبیبی

۲۴/ اگست، ۲۰۲۰ء

منظوم ترجمانی سورہ سبع مثانی

(حمد باری تعالیٰ)

میرے رب، اللہ کل حمد و ثنا تیرے لئے
تو ہے ازلی اور ابدی ، ہے بقا تیرے لئے
ذات ہے بے عیب تیری،تو ہے رحمن و رحیم
ہے نہ کوئی ابتداوانتہا تیرے لئے
ہے میرا ایمان تو مالک ہے روز حشر کا
بندگی میں زندگی گزرے خدا تیرے لئے
ہر گھڑی ہر کام میں درکار تیری ہی مدد
ہر قدم ہر سانس ہرلمحہ میرا تیرے لئے
راستہ ان کا چلا جن پر تیرا انعام ہے
زندگی گزری ہے جن کی با خدا تیرے لئے
ان کی راہوں سے بچا یارب کہ جو گمراہ ہیں
ہے غضب جن پر نہ دل جن کا جھکا تیرے لئے
بس یہی ہے اک تمنا اشرفی اظہار کی
ہو سدا ورد زباں حق کی صدا تیرے لئے

نتیجۂ فکر
مولانا محمد اظہار اشرفی
کچھوچھہ شریف، امبیڈکر نگر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلحمدُلِلّٰہِ الَّذِیۡ وَفَّقَنَا لِاَ دَاءِ اَفۡضَلِ الطّاعَاتِ وَوَفَّقَنَا عَلٰی کَیۡفِیَّۃِ اِکۡتِسَابِ اَکۡمَلِ السَّعَادَاتِ وَھَدَانَا اِلٰی قَوۡلِنَا اَعُوۡذُ بِا للّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ مِنۡ کُلِّ المعَاصِی وَالمنۡکَرَاتِ (بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ) نَشۡرَعُ فِی اَدَاءِ کُلِّ الخیرٰاتِ وَالمامُوۡرَاتِ (اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ) الَّذِیۡ لَہٗ مَافِی الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتِ (رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ) بِحَسۡبِ کُلِّ الذَّ وَاتِ وَالصِّفَاتِ (اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ) عَلٰی اَصۡحَابِ الحاجَاتِ وَاَرۡبَابِ الضَّرُوۡرَاتِ (مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ) فِی اِیۡصَالِ الۡاَبۡرَارِ اِلَی الدَّرَجَاتِ وَاِدۡخَالِ الۡفُجَّارِ فِی الدَرَکَاتِ (اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ) فِی الۡقِیَامِ بِاَدَاءِ جملَۃِ التَّکۡلِیۡفَاتِ (اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ) بِحَسۡبِ کُلِّ اَنۡوَاعِ الۡھِدَایَاتِ (صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ) فِی کُلِّ الحالَاتِ وَالۡمَقَامَاتِ (غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ) مِنۡ اَھۡلِ الجھَالَاتِ وَالضَّلَالَاتِ۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ نَا وَمَو لَانَا محمَّدٍ المویَّدِ بِاَ فۡضَلِ المعۡجِزَاتِ وَالۡاٰیَاتِ وَ عَلٰی آلِہٖ وَصَحۡبِہٖ بِحَسۡبِ تَعَاقُبِ الۡاٰیَاتِ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا۔

امابعد!

یہ مختصر رسالہ ہے جو قرآن حکیم کی سب سے عظیم اور سب سے بابرکت سورہ مبارکہ سورہ فاتحہ کی تفسیر وترجمانی کے بیان پر مشتمل ہے جس میں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے علوم واسرار کا بحرنا پیدا کنار موجزن فرمادیا ہے ہم اللہ عظمت و جلالت والے رب کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرتے ہیں کہ مولیٰ تعالیٰ ہمارے اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچادے کہ کم ازکم ایک سورہ پاک کی ہی تفسیر کرنے کی توفیق ارزانی فرمادے اور دارین کے انعام واکرام اور اس کی سعادتوں کا مستحق بنادے بیشک وہی ذات کریم سب سے بہتر توفیق دینے والی اور مددگار ہے اور طالبین کے مرادوں کو پورا کرنے والی ہے۔ پس اپنے آقا ومولیٰ رحمت دوعالم نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے واسطہ پاک سے ایک بار پھر اپنے رب کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کرتے ہیں کہ مولیٰ ہمارے اس ارادہ کو کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

قرآن حکیم علوم ومعارف اور اسرار ومعانی کا ناپیدا کنار سمندر

ان پر کتاب اتری بیاناً لکل شی
تفصیل جس میں ماعبر وما غبر کی ہے

(اعلیٰ حضرت)

قرآن حکیم، خالق کائنات، اللہ رب العلمین کا ازلی قدیم کلام ہے جس کو اس نے اپنے حبیب مکرم حضور سرور دو جہاں نبی کون ومکان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے، جس طرح اللہ رب العلمین بے مثل و بے مثال ہے اسی طرح اس کا کلام بھی بے مثل و بے مثال ہے، چنانچہ چودہ سو برس سے آج تک کوئی بڑے سے بڑا عقلمند، قادر الکلام، فصیح اللسان زبان دان شخص اس کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کے مثل بھی لانے کی جرأت نہ کر سکا اور جس کسی نے شبانہ روز اس راہ میں کوششیں کیں کہ کسی طرح قرآن کے مثل کوئی کلام مرتب کرے وہ ذلیل ورسوا ہوئے اور بالآخر حیرت واستعجاب کے عالم میں انہیں کہنا پڑا کہ یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

سارے جہاں کے عجمیوں کی بات تو چھوڑیئے خود اہل عرب جنہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا اور زبان دانی پر بڑا غرور و گھمنڈ تھا جب ان کے بڑے بڑے فصحاء اور ماہر بلیغوں نے کلام ربانی کی چند آیتوں کو سنا تو ان کی گردنیں کلام الٰہی کی فصاحت کے سامنے جھک گئیں حواس باختہ ہوگئے اور اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پڑھتے ہیں وہ انسانی دسترس سے خارج اور مافوق الفطرت کلام ہے۔

مولانا پیر کرم شاہ ازہری لکھتے ہیں:۔

''وہ لوگ جو اسلام دشمنی میں اندھے ہوگئے تھے وہ بھی اپنے دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے تھے کہ یہ کلام کسی انسان کا گڑھا ہوا نہیں ہے بلکہ خداوند رحمن کا کلام ہے جس کا وہ کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

ہم ذیل میں ان کی مشہور زمانہ تاریخ، سیرت الرسول سے چند روایات نقل کر رہے ہیں جن سے اس بات کا خوب اندازہ ہوگا کہ اعدائے دین کے اذہان وقلوب پر قرآن حکیم کی عظمت وفصاحت اور ہیئت وجلالت کسی قدر غالب تھی ،مولانا لکھتے ہیں۔

''قرآن کریم کی دوسری امتیازی شان جس نے اس کو بے نظیر اور بے مثال بنا دیا ہے اور

میدان فصاحت کے شہسواروں کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم اگرچہ اسی عربی زبان میں ہے جس زبان کے یہ لوگ ماہر شمار کئے جاتے تھے لیکن ان کی تمام اصناف کلام میں سے کسی کے ساتھ اس کی دور کی بھی مماثلت نہ تھی۔ ان کا کلام نثر میں بھی تھا اور نظم میں بھی تھا۔ لیکن قرآن کریم کی سورتوں کو نہ نظم کہا جا سکتا ہے نہ نثر۔ انہیں چیزوں کو دیکھ کر اہل عرب کی عقلیں حیران و ششدر ہوگئی تھیں اور ان پر قرآن کریم کی ایک ہیبت و دہشت طاری ہوگئی تھی۔ انہیں یہ ہمت نہ رہی کہ وہ اس کلام بلاغت نظام کا مقابلہ کرنے کا خیال تک بھی دل میں لے آئیں۔ سو جن بدنصیبوں نے اس اکھاڑہ میں اترنے کی سعی مذموم کی ان کو قرآن کریم کی فصاحت نے یوں زمین پر پٹخا کہ پھر اٹھنے کی ان میں سکت نہ رہی''۔

(۱) ''جن لوگوں نے قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کا عزم کیا ان میں سے اندلس کا ایک مشہور حکیم اور ادیب تھا، جس کا نام یحی بن حکیم تھا جو اپنے زمانے میں سارے اندلس میں اپنا کوئی مثل نہیں پاتا تھا۔ ایک سو تیس سال کی عمر پائی اور اس کی وفات دو صد پچپن ہجری میں ہوئی۔ اس نے سورہ اخلاص جیسی ایک سورت لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اس پر کلام الٰہی کی ایسی ہیبت اور ایسا رعب طاری ہوا کہ اس نے اس مقابلہ کے میدان سے ہٹ جانے میں ہی اپنی سلامتی سمجھی آخر کار اس کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ وہ کلام ہے کہ کوئی شخص اس جیسا کلام پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اپنے گناہ عظیم سے صدق دل سے توبہ کی اور ساری عمر قرآن کریم کی رفعتوں اور عظمتوں کے سامنے سرافگندہ رہا۔

(۲) المقنع، نامی ایک شخص جو اپنے زمانے میں عربی زبان کے فصحاء و بلغاء کا سرتاج تصور کیا جاتا تھا، اس کا زمانہ تابعین کا زمانہ تھا، اس نے ارادہ کیا کہ قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک سورت لکھے گا۔ چنانچہ اس نے کئی ماہ اس مقصد کے لئے شبانہ روز محنت کی اور جب اس نے اپنے خیال کے مطابق ایک سورت کا مسودہ مرتب کر لیا تو اتفاق سے اس کا گزر ایک مکتب سے ہوا جہاں بچے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جب وہ اس مکتب کے پاس سے گزرا تو اس نے سنا ایک معصوم بچہ یہ آیت تلاوت کر رہا ہے۔ 'وَ قِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا

لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ(ھود/44) اور حکم دیا گیا اے زمین نگل لے اپنے پانی کو، اے آسمان تھم جا اور اتر گیا پانی اور حکم الٰہی نافذ ہوگیا اور ٹھہر گئی کشتی جودی پہاڑ پر اور کہا گیا ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لئے۔

المقنع نے اچانک جب یہ آیت سنی تو دہشت کے باعث اس پر لرزہ طاری ہوگیا اور کہنے لگا ۔"اشھد ان ھذا ما ھو من کلام البشر و ان ھذا لا یعارض "میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ وہیں سے وہ اپنے گھر لوٹ آیا جو کچھ اس نے لکھا تھا اسے مٹا دیا اور جس کاغذ پر لکھا تھا اس کو ریزہ ریزہ کر دیا"۔

(۳) امام بیہقی اپنی دلائل النبوۃ میں لکھتے ہیں:۔ ولید بن مغیرہ، جو فصاحت و بلاغت میں قریش کا سردار تھا، ایک روز رحمت عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہوا اور عرض کی کہ آپ کچھ پڑھ کر سنایئے تا کہ میں اس میں غور و فکر کر سکوں۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ 'اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النحل/90) بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو (ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرو) اور اچھا سلوک کرو رشتہ داروں کے ساتھ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے اور برے کاموں سے اور سرکشی سے۔ اللہ تعالیٰ نصیحت کرتا ہے تمہیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔ یہ سن کر ولید پر سناٹا طاری ہوگیا اور عرض کی دوبارہ پڑھئے حضور نے اس آیت کو دوبارہ تلاوت فرمایا وہ کہنے لگا۔"واللہ ان لہ لحلاوۃ و ان علیہ لطلاوۃ و ان اعلاہ لمثمر و ان اسفلہ لمغدق و ما یقول ھذا بشر"۔ خدا کی قسم! اس میں تو مٹھاس ہے، اس کے ظاہر پر چمک ہے اس کا اوپر والا حصہ پھلوں سے لدا ہے اور نیچے والا شاداب ہے اور کوئی انسان ایسا قول نہیں کہہ سکتا۔

پھر وہ لوٹ کر اپنی قوم کے پاس آیا اور ان کو کہا خدا کی قسم! تم میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو اشعار کے بارے میں مجھ سے زیادہ عالم ہو یا جنات کے اقوال کے بارے میں مجھ سے زیادہ باخبر ہو اللہ کی قسم! جو وہ فرماتے ہیں کوئی قول اس کے مشابہ نہیں۔ خدا کی قسم اس کا قول بڑا شیریں ہے اور اس کا ظاہر چمکدار ہے اس کا اوپر والا حصہ پھلوں سے لدا ہے اور نچلا حصہ شاداب ہے پھر وہ اپنی قوم کو کہنے لگا۔"انہ لیعلو و لا یعلی علیہ و انہ لیحطم ما تحتہ" یہ ہمیشہ سربلند رہے گا۔ اس پر کوئی بلند نہیں ہوسکتا اور جو اس کے نیچے آئے وہ اسے پیس کر رکھ دے گا۔

(۴) عمرو بن جموح : ابونعیم ابن اسحاق کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں۔ انصار کے خاندانوں سے ایک

خاندان کا کا نام بنوسلیم تھا۔ جب اس خاندان کے بہت سے نوجوان مشرف باسلام ہوگئے تو عمرو بن جموح جو اس خاندان کا سردار تھا، اس نے اپنے بیٹے معاذ کو کہا یہ شخص جو کلام سناتا ہے، جو تم نے سنا ہے، مجھے بھی سناؤ۔ معاذ اپنے باپ سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا۔ انہوں نے سورہ فاتحہ کی ابتدائی آیات "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ سے لیکر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ "تک سنائیں۔ عمرو فرط مسرت سے اپنے بیٹے کو کہنے لگا یہ کلام کتنا خوبصورت ہے، کتنا جمیلَ ہے، کیا ان کا سارا کلام اسی طرح ہے؟ معاذ نے کہا "یا ابت و احسن من ذٰلک" ابا جان ان کا دوسر کلام اس سے بھی زیادہ حسین وجمیل ہے۔

(۵) عتبہ بن ربیعہ: امام بغوی نے باسناد ثعلبی حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ جماعت قریش نے جس میں ابوجہل وغیرہ سردار بھی تھے یہ تجویز کیا کہ کوئی ایسا شخص جو شعر، کہانت میں ماہر ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا جائے چنانچہ عتبہ بن ربیعہ کا انتخاب ہوا۔ (خزائن العرفان)

وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا، عرض کرنے لگا اے میرے بھائی کے بیٹے! اگر آپ مال کے طلبگار ہیں تو ہم مال و دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لاکر ڈالدیں گے۔ اگر آپ فرمانروا بننے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم بصد مسرت آپ کو اپنا فرماں روا تسلیم کرتے ہیں۔ اگر آپ کو جنات کا اثر ہے جس کی وجہ سے آپ اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے ہیں، جس نے سارے شہر اور ساری قوم کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے تو ہم آپ کا علاج کرانے کے لئے اپنی دولت پانی کی طرح بہادیں گے۔ جب عتبہ اپنی گفتگو ختم کر چکا۔ تو ھادی انس وجاں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسمع منی" عتبہ اب میری بات سنو۔ پھر حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ حم سجدہ کی ابتدائی تیرہ آیات تلاوت فرمائی۔

حضور یہ آیات بینات تلاوت فرماتے رہے وہ مجسم حیرت بنا ہوا ان آیات کو خاموشی سے سنتا رہا جب حضور نے اس سے اگلی آیت تلاوت فرمائی جس میں عاد وثمود پر نزول عذاب کا ذکر تھا تو اسے یارائے ضبط نہ رہا اس نے اپنا ہاتھ حضور کے منہ مبارک پر رکھ دیا اور بڑے عجز والحاح سے کہنے لگا ہمارے لئے بددعاء نہ فرمایئے کیونکہ اسے یقین تھا کہ جو بات زبان مصطفی سے نکلتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے وہاں سے اٹھ کر قریش کے پاس آیا قریش نے پوچھا سناؤ کیا کر آئے ہو اس نے کہا "واللہ لقد سمعت قولا ماسمعت بمثله قط واللہ ماھو بالشعر ولا بالسحر ولا الکھانة واللہ لیکونن لقوله سمعت بناء"۔ بخدا میں نے ایسا قول سنا ہے جس کی مثل آج تک کوئی قول نہیں سنا، نہ وہ شعر ہے نہ وہ سحر ہے اور نہ وہ کہانت ہے بخدا اس کلام کا زبردست نتیجہ ظاہر ہوگا۔ (السیرۃ النبویہ۔ خزائن۔ ضیاء النبی)

مندرجہ بالا واقعات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب قرآن حکیم کے ظاہری الفاظ وعبارات کی جلالت خسروی کا یہ عالم ہے کہ جس کی فصاحت کی ہیبت وجلال سے بڑے بڑے فصحا و بلغا خوف زدہ ہو گئے تو پھر قرآن حکیم کے معانی ومطالب، علوم ومعارف، رموز واسرار، ضروب وامثال اور حقائق ولطائف کا کوئی کیونکر ادراک اور تصور کرسکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ خالق کائنات کا کلام علوم ومعارف کا سرچشمۂ اسرار ومعانی کا خزانہ، اور حقائق ولطائف کا ناپیدا کنار سمندر ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ''١ ؕ مَا فَرَّطۡنَا فِي الۡكِتٰبِ مِنۡ شَيۡءٍ'' (النحل/ 38) یعنی ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا (الانعام: ۳۸)، اور ارشاد ہے '' وَ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ'' (**النحل/89**)۔ یعنی اور ہم نے تم پر یہ قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔ (النحل: ۸۹) ان دونوں آیات میں واضح ارشاد ہے کہ قرآن حکیم عجائب اور علوم ومعارف کا غیر محدود اور غیر متناہی سمندر ہے۔ حضرات مفسرین کرام نے آیات متلوہ کی تفسیر میں بہت کچھ تحریر فرمایا ہے۔ ہم علامہ افتخار احمد صاحب کی کتاب فضائل قرآن اور دیگر کتب تفسیر سے چند اقتباسات ذکر کررہے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ قرآن حکیم علوم ومعارف کا غیر متناہی خزانہ اور اسرار ومعانی کا ناپیدا کنار سمندر ہے۔

(۱) ابن جریر اور ابن ابو حاتم نے اپنی اپنی تفسیروں میں حضرت سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب ہر چیز کے واضح بیان کی شکل میں نازل فرمائی۔ اور ہمیں بعض انہیں چیزوں کا علم ہوا جو قرآن میں بیان کی گئی پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''وَ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ''، سنن سعید ابن منصور، مصنف ابن ابی شیبہ، زوائد کتاب الزہد از عبداللہ بن امام احمد فضائل قرآن ابن ضریس، کتاب ابن نصر مروزی، معجم کبیر طبرانی اور شعب الایمان بیہقی میں آپ ہی سے روایت ہے فرمایا۔ جو علم چاہتا ہے وہ قرآن کے معانی پر غور کرے اس لئے کہ اس میں اولین وآخرین کا علم ہے۔

(۲) حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے فرمایا اگر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر سے چاہتا تو ستر اونٹوں کو بوجھل کر دیتا، امام سیوطی اس کی توجیہہ فرماتے ہیں وہ اس طرح کہ الحمد للہ رب العلمین کی تفسیر میں معنی حمد، اسم جلالت ''اللہ'' کے متعلقات اور اس کے شایان شان مفاہیم بیان کرنے کی ضرورت ہوگی پھر عالم اور اس کی کیفیت، اس کی تمام اقسام اور شمار کے ساتھ اس کی تفصیلات آئیں گی، عالم کل ایک ہزار ہیں، چار سو خشکی پر اور چھ سو سمندر میں، اس طرح ان سب

کے بیان کی ضرورت ہوگی، اسی طرح فاتحہ اور اس کے اجزاء کا ذکر کر کے ان کی تفصیلات کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے ارشاد کا یہی مفہوم ہے۔ گویا ان کی تفسیر فاتحہ ہوتی تو ان تفصیلات کو حاوی ہوتی اور اس طرح ستر اونٹوں کا بوجھ تیار ہوجاتا۔ امام رازی نے بھی مفاتیح الغیب کے شروع میں انہیں تفصیلات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم نے علوم سورہ فاتحہ کے ذیل میں اس کی تفصیلات بیان کر دی ہے۔ (اشرفی)

قرآن حکیم کے علوم و معارف پر مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نگاہ کس قدر گہری تھی ذیل کے دو واقعات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

☆ ایک یہودی نے کہا اے علی! تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن میں جمیع علوم ہیں اور تم باب مدینۃ العلم ہو تو بتاؤ قرآن میں تمہاری گھنی داڑھی اور میری ہلکی داڑھی کا بھی ذکر ہے؟ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ نے فرمایا بیشک ہے سنو قرآن میں ہے۔ وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا یعنی جو اچھی زمین ہے اس کا سبزہ اللہ کے حکم سے خوب نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں سے نہیں نکلتا مگر تھوڑا بمشکل۔ (الاعراف/58)

تو اے یہودی! وہ اچھی پاکیزہ زمین میری ٹھوڑی ہے جس سے داڑھی کے خوب گھنے بال اگے ہیں اور خراب و پلید زمین تمہاری ٹھوڑی ہے جس سے کوئی اگتا ہے تو بمشکل۔

☆ نزہۃ المجالس میں حضرت مولائے کائنات سے ایک ایمان افروز واقعہ مذکور ہے کہ آپ کے زمانہ اقدس میں دو عورتوں نے بچے جنے۔ رات اندھیری تھی ایک عورت کو لڑکا اور دوسری کو لڑکی ہوئی دونوں عورتوں میں جھگڑا رونما ہو گیا ہر ایک عورت دعویدار تھی کہ لڑکا میں نے جنا ہے میں لڑکا کی ماں ہوں آخر کار دونوں عورتیں حضرت مولائے کائنات کی بارگاہ میں لائی گئیں آپ نے مقدمہ کی سماعت کے بعد فرمایا۔ ”فأمر کل واحدۃ ان تحلب لبنها شیئا ثم وزن اللبنین فرجح احدهما فحکم بصاحبۃ الراجح بالصبی فقیل من این اخذت هذا قال من قوله تعالیٰ للذکر مثل حظ الانثین“ یعنی تم دونوں عورتو تھوڑا تھوڑا دودھ چھاتیوں سے نکال کر دو برتنوں میں رکھو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا آپ نے دونوں دودھ کو تولا تو ایک وزنی ہو گیا آپ نے فرمایا جس عورت کا دودھ وزنی ہے لڑکا اسی کا ہے یہ فیصلہ سن کر لوگوں نے دریافت کیا حضور اس مسئلہ کا ماخذ کیا ہے آپ نے فرمایا قرآن کی آیت لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ یعنی اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ خدا نے مرد کو ہر چیز میں فضیلت دی ہے حتی کہ غذا میں بھی پس میں نے اس حقیقت کے پیش نظر سوچا کہ لڑکا کی ماں کا دودھ لڑکی کی ماں کے بہ نسبت ضرور وزنی ہوگا۔

بعض ارباب علم ودانش کی تقریر اور تحریر پڑھنے سے معلوم ہوا ہے کہ ابھی چند سال پیشتر بعینہ یہی واقعہ امریکہ ہاسپیٹل میں رونما ہوا تھا کہ دو عورتوں نے بچے جنے تھے جن میں ایک کا لڑکا دوسرے کی لڑکی تھی مگر دونوں میں ہر ایک لڑکا کی دعویدار ہوگئی ڈاکٹروں کی لابی اس تنازعہ کے حل کے لئے سر جوڑ کر بیٹھی مگر وہ اس کا حل مہینوں میں نہ ڈھونڈ سکے اور اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے ایک مسلم ڈاکٹر کی طرف طنزیہ کہا کہ تم مسلموں کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے تو آخر بتاؤ کہ اس مسئلہ کا حل کس آیت میں ہے مسلم ڈاکٹر نے ان سے چند یوم کی مہلت لی اور علماے اسلام خصوصاً علماے ازہر سے رابطہ قائم کیا اور یہودیوں کے چیلنج کو رکھتے ہوئے صورت مسؤلہ کا حل دریافت کیا علماے ازہر نے انہیں وہی جواب مرحمت فرمایا جو حضرت مولاے کائنات علی مرتضیٰ مشکلکشا رضی اللہ تعالی عنہ نے مسئلہ کا حل وماخذ بیان فرمایا تھا مسلم ڈاکٹر نے جب یہودی ڈاکٹروں کے سامنے قرآن کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل پیش کیا تو سب انگشت بدنداں رہ گئے اور بیک زبان قرآن واسلام کی حقانیت کے معترف ہوگئے بلکہ کلام الٰہی کے حیرت انگیز اعجاز بیان کو دیکھ کر مستشرقین کا ایک طبقہ حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔

(۳) امام ابن حجر مکی نے ''شرح ہمزیہ'' میں تحریر فرمایا۔ وہ علوم ومعارف جو قرآن سے نکلتے ہیں ان کی حد وانتہا نہیں اسی لئے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے روایت ہے اگر میں سورہ والضحیٰ کی تفسیر سے ایک اونٹ کو بوجھل کرنا چاہتا تو یقینا کر دیتا۔

(۴) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔

جمیع العلم فی القرآن لکن۔ تقاصر عنه افهام الرجال

قرآن میں تمام علوم ہیں۔ لیکن لوگوں کی سمجھ کی ان تک رسائی نہیں۔

(۵) ابوالفضل مرسی اپنی تفسیر میں آپ ہی کا ایک اور ارشاد نقل کرتے ہیں۔

لو ضاع لی عقال بعیر لوجدته فی کتاب الله

اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہوجائے تو میں اسے کتاب اللہ میں پالونگا۔

(۶) علامہ بوصیری نے نظم فرمایا۔

لها معان کموج البحر فی مدد ۔ وفوق جوهره فی الحسن والقیم

آیات کے معانی اپنی کثرت وفراوانی میں سمندر کی موجوں کی طرح ہیں اور حسن و قیمت میں سمندر کی موتیوں سے اونچے ہیں۔

فما تعد و لا تحصیٰ عجائبها ۔ و لا تسام علی الاکثار بالسام

ان کے عجائب کا نہ شمار ہے نہ حد وحصر ہے۔اسے بار بار پڑھنے کے باوجود اس سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔

(۷) علامہ جلال الدین سیوطی ''الاتقان'' میں لکھتے ہیں۔

علوم قرآن اور وہ علوم جو اس سے نکلے ہیں وہ ناپیدا کنار سمندر کی طرح ہیں۔اسی لئے حضرت عمر نے فرمایا۔

''حسبنا کتاب اللہ'' ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔

(۸) علامہ بجیوری نے قصیدہ بردہ کی شرح میں فرمایا۔ ہر آیت کے ساٹھ ہزار مطالب ہیں اور اس کے مفاہیم جو ابھی رہ گئے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔

(۹) علی خواص قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے سورہ فاتحہ کے معانی پر مطلع فرمایا تو اس سے میرے لئے ایک لاکھ چالیس ہزار نوسو نو علوم ظاہر ہو گئے۔

(۱۰) علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں۔''امام غزالی نے اپنی کتاب کے علم لدنی کی بحث میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کا یہ ارشاد ذکر کیا ہے۔اگر مجھے موقع دیا جاتا تو میں بسم اللہ کی ''با'' سے ستر اونٹوں کو بھر دیتا''۔

(۱۱) ابن سراقہ نے کتاب الاعجاز میں امام ابوبکر ابن مجاہد سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا ''ما من شیٔ فی العالم الا ھو فی کتاب اللہ تعالیٰ'' دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ کی کتاب میں موجود نہ ہو۔

(۱۲) ''طبقات کبریٰ'' میں سید ابراہیم دسوتی قدس سرہٗ کے حالات میں مرقوم ہے کہ وہ (ابراہیم دسوتی) فرماتے تھے اگر حق تعالیٰ تمہارے دلوں کے قفل کھول دے تو تم قرآن کے عجائب، حکمتیں معانی اور اس کے علوم سے واقف ہو جاؤ۔اور اس کے علاوہ کسی اور پر غور فکر کرنے سے بے نیاز ہو جاؤ اس لئے کہ صفحۂ وجود پر جو کچھ ہے وہ سب اس میں لکھا ہوا ہے۔

(۱۳) علامہ جلال الدین سیوطی قاضی ابوبکر ابن العربی کا قول نقل کرتے ہیں، انہوں نے ''قانون التاویل'' میں تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کے علوم (۷۷۴۵۰) ستتر ہزار چار سو پچاس ہیں۔(فضائل قرآن، صفحہ ۱۱ تا ۱۴)

ردالمحتار میں علامہ شامی نے حضرت امام سیوطی کی کتاب الاتقان کے حوالے سے کہا ہے ''فقد ذکر السیوطی فی الاتقان ان القرآن فی اللوح المحفوظ، کل حرف منه بمنزلة جبل قاف، و کل آیة تحتها من

التفاسیر ما لا یعلمه الا الله تعالیٰ" (ص ۱۴۰ ر ج ۱) یعنی قرآن حکیم لوح محفوظ میں ہے اس کا ہر ہر حرف جبل قاف کے منزلہ میں ہے اور ہر آیت کی اتنی زیادہ تفسیریں ہیں جن کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے

(۱۴) حضرت شیخ ابن العربی کا ایک واقعہ روح المعانی میں زیر آیت 'مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (**الانعام** 38) مذکور ہے کہ حضرت شیخ ایک مرتبہ اپنے دراز گوش پر سوار تھے کہ گر گئے۔ اس سے آپ کے قدم میں موچ آ گئی۔ لوگ آپ کو اٹھانے لگے تو آپ نے لوگوں کو اٹھانے سے منع کر دیا مگر پھر تھوڑی دیر بعد لوگوں کو اٹھانے کی اجازت دے دی ان سے اس بارے میں پوچھا گیا کہ پہلے منع کیوں کر دیا اور پھر اٹھانے کی کیوں اجازت دے دی؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کتاب اللہ کی طرف مراجعت کی کہ دیکھیں میرے گرنے اور اٹھانے کا ذکر کہیں قرآن میں ہے یا نہیں پس میں نے پایا کہ اس حادثہ کا ذکر سورہ فاتحہ میں مذکور ہے۔ "**فوجدت خبر هذه الحادثة قد ذكر في الفاتحة**"۔

صاحب روح المعانی کہتے ہیں کہ یہ ایسا واقعہ ہے جہاں تک ہم جیسوں کی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی اسی طرح سورہ فاتحہ ہی سے بعض مفسرین کرام نے سلاطین آل عثمان کے اسماء، ان کے احوال اور ان کی مدت سلطنت رانی کا زمانہ کا استخراج کیا ہے۔ "**ومثله استخراج بعضهم من الفاتحة ايضا اسماء سلاطين آل عثمان و احوالهم و مدة سلطنتهم الى ماشاء الله تعالىٰ من الزمان**" (۱۳۷ / ج: ۴)

(۱۵) تفسیر آلوسی میں زیر آیت 'مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (**الانعام** 38) ہے۔

"**والمراد من الكتاب القرآن واختاره البلخي وجماعة فانه ذكر فيه جميع ما يحتاج اليه من امر الدين والدنيا بل وغير ذالك اما مفصلا واما مجملا**" (صفحہ ۱۳۷ / ج: ۴) یعنی آیت میں کتاب سے قرآن حکیم مراد ہے اور یہ امام بلخی اور مفسرین کی ایک جماعت کا پسندیدہ ہے۔ کیونکہ اس میں دین و دنیا کی تمام وہ باتیں مذکور ہیں جس کی طرف انسان ضرورتمند ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں تفصیلی و اجمالی طور پر مذکور ہیں۔ اسی میں ہے قرآن کے علوم و معارف اور عجائب و معانی کے سلسلہ میں یہ چند علمائے مفسرین کے ارشادات تھے اب قرآن کی عظمتوں کا بیان خود اس زبان فیض ترجمان مصطفی سے سنئے جس ذات کریم پر قرآن حکیم نازل ہوا۔

"واخرج ابو الشيخ فى كتاب العظمة عن ابى هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله سبحانه وتعالىٰ لو اغفل شيئا لاغفل الذرة والخردلة والبعوضة" (ایضاً)

(۱) ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں اگر کوئی چیز چھوڑتا،تو ذرہ، رائی کا دانہ اور مچھر و مکھی کا ذکر چھوڑتا لیکن جب ایسی حقیر چیزیں نہ چھوٹی تو کوئی بھی چیز نہ چھوٹی۔

(۲) یہ حدیث حضرت مولائے کائنات علی مرتضیٰ مشکل کشا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کو امام ترمذی و دارمی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔مشکوٰۃ المصابیح باب فضائل القرآن میں ہے۔"قال کتاب اللہ فیہ نبأ ما قبلکم و خبر ما بعدکم و حکمہ ما بینکم و ھو الفصل لیس بالھزل"(الخ)۔

یعنی اللہ کی کتاب میں پہلے زمانے کی خبریں بھی ہیں اور آنے والے زمانے کی پیشگوئیاں بھی اور حال کے لئے مکمل رہنمائی بھی، یہ ایک فیصلہ کن، سنجیدہ اور باوقار کتاب ہے مذاق نہیں ہے۔جو جابر اور مغرور اسے نظر انداز کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا اور جو اس سے ہٹ کر کہیں اور رشد و ہدایت چاہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ صراط مستقیم سے ہٹا دیتا ہے۔یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی اور دانشمندانہ پند و نصیحت ہے، یہی وہ سیدھا راستہ ہے جس کے سبب خواہشات کو غلط رخوں پر لگنے سے بچایا جاسکتا ہے، نہ یہ کتاب اپنی انتہائی فصاحت و بلاغت اور اعجاز کے باعث دوسرے کسی کلام سے گھل مل سکتی ہے اور نہ اس سے علماء آسودہ ہو سکتے ہیں (خواہ اس کا اور اس کے علوم کا کتنا ہی مطالعہ کر ڈالیں، اس پر ہزاروں جلدیں لکھ ڈالیں مگر اس سے آسودگی ممکن نہیں) اور بار بار پڑھنے اور بے شمار مرتبہ سننے سے اس میں پرانا پن اور کہنگی نہیں آسکتی اور اس کے عجائب و معارف و معانی ختم نہیں ہو سکتے "و لا یشبع منہ العلماء و لا یخلق عن کثرۃ الرد و لا ینقضی عجائبہ" یہ وہ قرآن ہے کہ جب اسے جنوں نے سنا تو وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے یقیناً ہم نے ایک عجیب قرآن سنا جو رشد و صلاح کی راہبری کرتا ہے اس لئے ہم تو ایمان لائے۔جو قرآن کے مطابق کہے گا وہ سچ کہے گا اور جو اس پر عمل کرے گا اجر و ثواب پائے گا۔اور جو اس سے فیصلہ کرے گا وہ انصاف کا فیصلہ کرے گا اور جو قرآن کی طرف بلائے گا وہ سیدھے راستے کی راہنمائی کریگا۔

(۳) ایک اور حدیث قدسی ملاحظہ کیجئے:۔اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتا ہے۔"انی منزل علیک توراۃ حدیثۃ تفتح بھا اعینا عمیاء و اذانا صما و قلوبا خلفا فیھا ینابیع العلم و فھم الحکمۃ و ربیع القلوب"۔(شفاء صفحہ ۳۹۳/ ج:۱)

یعنی میں آپ پر ایک تورات نازل کرنے والا ہوں اس کے ذریعہ آپ اندھی آنکھوں کو بینا کر دیں گے اور بہرے

کانوں کوشنوا کردیں گے۔اورغفلت کی غلافوں میں لپٹے ہوئے دلوں کو بیدار کردیں گے۔اس کتاب میں علم کے چشمے ابل رہے ہیں۔اور یہ حکمت کا مفہوم بتاتی ہے اسکی وجہ سے دلوں کی بہار ہے۔

ان احادیث مبارکہ سے بہت روشن اور واضح ہے کہ اللہ رب العلمین کے کلام قرآن حکیم، میں علوم ومعارف کے چشمے ابل رہے ہیں اور معانی وحکم کا دریا موجزن ہے علماء ومحققین اسے ہزاروں بار پڑھیں اس سے سیراب وآسودہ نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ حضرات علمائے فحول نے اسے جب جب پڑھا نئے نئے علوم وفنون کے سوتے پھوٹتے ملے ہزاروں ہزار تفسیریں اور سینکڑوں علوم وفنون پر مشتمل کتابیں لکھنے کے بعد بھی آسودہ نہ ہوئے بلکہ عاجز ودرماندہ ہوکر کہہ اٹھے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْتَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا، تم فرمادو اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لئے سیاہی ہوتو ضرور سمندر ختم ہوجائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔اگرچہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لے آئیں۔(سورہ کہف:۱۰۹)

چنانچہ آپ اگر تفسیر کی دنیا کی تھوڑی ہی سیر کرلیں اور علوم قرآن کی چند کتابوں کا مطالعہ کرلیں تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اساطین امت نے علوم قرآن، اور تفاسیر قرآن سے لاکھوں صفحات بھر دیئے ہیں، فضائل قرآن میں حضرت مولانا افتخار احمد مصباحی نے ان چند مفسرین کرام کے نام شمار کرائے ہیں جنہوں نے علوم قرآن کے دریا بہا دیئے ہیں آپ نے لکھا ہے۔

''علمائے امت نے تفسیر قرآن سے لاکھوں صفحات بھر دیئے۔ایسے مفسرین بھی گذرے ہیں جنہوں نے قرآن حکیم کی تفسیر ہزار ہزار جلدوں میں لکھیں۔

(۱) ابوعبداللہ علاء الدین محمد بن عبدالرحمن معروف بہ علاء زاہد متوفی ۱۲/جمادی الآخرہ کی تفسیر ایک ہزار سے زائد جلدوں میں ہے۔اور ایسے مفسرین کا تو شمار ہی نہیں جنہوں نے تیس تیس جلدوں پر مشتمل تفسیریں لکھیں۔(۲) تفسیر طبری تیس جلدیں۔(۳) تفسیر کبیر از امام رازی متوفی ۶۰۶ھ تیس جلدیں۔(۴) تفسیر ابوالمظفر شمس الدین یوسف بن فرغلی بن عبداللہ بغدادی متوفی ۶۵۴ھ کی تفسیر قرآن، جیسی ایک سوبیس جلدوں کو حاوی ہے۔(۵) امام حجۃ الاسلام کی یاقوت التاویل چالیس جلدوں میں ہے۔(۶) تفسیر ابن نقیب کی سوجلدیں ہیں۔(۷) تفسیر اوفوی ایک سوبیس جلدوں پر مشتمل ہے۔(۸) ابوبکر بن عبداللہ کی تفسیر جوصرف سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی ابتدائی پچاس آیتوں کی تفسیر ہے یہ ایک سو چالیس جلدوں میں ہے۔(۹) اور امام ابوالحسن اشعری کی تفسیر چھ سوجلدوں پر مشتمل ہے یہ تفسیر امام جلال الدین سیوطی کے زمانہ تک مصر کے خزانہ میں موجود تھی۔(صفحہ ۱۴۔۱۵)

کتب تفاسیر کے جلدوں کی کثرت اور ضخامت سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم علوم و معارف اور لطائف وحکم کا ٹھاٹھیں مارتا ناپیدا کنار سمندر ہے۔جن علوم کی کھوج سائنس نے آج کی ہے قرآن حکیم نے اس کی طرف چودہ سوسال پیشتر راہنمائی فرمادی ہے۔چنانچہ قرآن حکیم کی آیات بینات میں ایسے ایسے علوم ومعارف جمع کردیئے گئے ہیں کہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے کسی عالم، کسی حکیم، کسی سائنسداں اور کسی فلسفی کو ان کی ہوا تک نہ لگی تھی، سائنسی تحقیقات وانکشافات کا کارواں چودہ صدیاں رواں دواں رہنے کے بعد آج بمشکل ان قرآنی علوم ومعارف کو سمجھنے کے قابل ہوا ہے۔سیرت الرسول میں مولانا پیر کرم شاہ صاحب ازہری نے موجودہ دور کے چند سائنسی تحقیقات و انکشافات کے نمونے ذکر کرنے کے بعد قرآن حکیم کی ان آیتوں کو پیش کیا ہے جن میں آج کے سائنسی علوم کی طرف چودہ سوسال پیشتر راہنمائی کردی گئی ہے۔ہم ان کی کتاب سے صرف دو اقتباس پیش کرتے ہیں۔

سورہ الذاریات کی یہ آیت ایک حقیقت کا انکشاف کررہی ہے جس پر عقل انسانی اس وقت تک آگاہ نہیں ہوسکی تھی۔ فرمایا"وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ(49) ہرایک چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔اس انکشاف کو مزید واضح فرمانے کے لئے سورہ یٰسین کی یہ آیت نازل ہوئی۔سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔، ہرعیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا، جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان کے نفسوں کو بھی۔اوران چیزوں کو بھی جن کو وہ ابھی تک نہیں جانتے۔(36)

اس آیت میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہر چیز، اس کا تعلق عالم نباتات سے ہو یا جمادات سے یا کسی دوسری نوع سے ہو جس کے بارے میں ہماری معلومات ناتمام ہیں، ان مختلف انواع تخلیق کے بارے میں فیصلہ کن انداز میں فرمادیا کہ انہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا گیا۔چنانچہ آج سائنسدان اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز جاندار ہو یا غیر جاندار جوڑا جوڑا پیدا کی گئی ہے۔نیز سائنس دان اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کائنات کا نقطۂ آغاز ذرہ (Atom) ہے اور یہ ذرہ دو برقی لہروں سے عبارت ہے۔ان میں سے ایک پازیٹو (مذکر) ہے اور ایک نیگیٹیو (مؤنث) ہے۔اور جب اس کائنات کی پہلی جزء زوجین سے مرکب ہے تو اس کائنات کی باقی اشیاء کا بھی جوڑا جوڑا ہونا آسانی سے سمجھ آسکتا ہے ۔جس کتاب مقدس نے اس حقیقت کو چودہ سوسال قبل منکشف کیا تھا جب کہ کسی کو اس پر آگاہی نہ تھی، تو کیا یہ اس بات کی روشن دلیل نہیں ہے کہ اس قرآن کو نازل کرنے والی وہی ذات ہے جو اس سارے عالم کا خالق ہے۔"یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ

مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۔ ے لوگو! اگر تمہیں کوئی شک ہو روز محشر جی اٹھنے میں، تو ذرا تم اس امر میں غور وفکر کرو کہ ہم نے ہی تم کو پیدا کیا تھا مٹی سے پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کے ٹکڑے سے۔ بعض کی تخلیق مکمل ہوتی ہے اور بعض کی تخلیق نامکمل۔ تاکہ ہم ظاہر فرمائیں تمہارے لئے (اپنی قدرت کا کمال)۔ اور ہم قرار بخشتے ہیں رحموں میں جسے ہم چاہتے ہیں ایک مقررہ میعاد تک پھر ہم نکالتے ہیں تمہیں بچہ بنا کر۔ پھر اس لئے کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو (الحج/5)

پھر سورۃ المرسلات میں اس مفہوم کو یوں بیان کیا ہے۔

''اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۔ (المرسلات/21)

کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں فرمایا پھر ہم نے رکھ دیا اسے ایک محفوظ جگہ (رحم مادر) میں ایک معین مدت تک پھر ہم نے ایک اندازہ ٹھہرایا پس ہم کتنے بہتر اندازہ ٹھہرانے والے۔ تخلیق انسانی کے مختلف مدارج کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی اس آیت طیبہ کا بدقت نظر مطالعہ فرمائیے۔

''وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون/13+14)

بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں پھر ہم نے بنا دیا نطفہ کو خون، لوتھڑا پھر ہم نے بنا دیا اس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی، پھر ہم نے پیدا کر دیں اس بوٹی سے ہڈیاں۔ پھر ہم نے پہنا دیا ہڈیوں کو گوشت (کا لباس) پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا پس بڑا بابرکت ہے اللہ تعالیٰ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

اس آیت کی تشریح کے لئے ہم تفسیر ضیاء القرآن کا ایک اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

مٹی کے خمیر سے جو جوہر نکلا اس سے آدم علیہ السلام کا جسم پاک تیار ہوا۔ پھر آپ سے جو انسانی نسل چلی اس کے لئے نطفہ اصل قرار پایا۔ جو ان غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے جو زمین سے اگتی ہیں۔ اس لئے جنس انسانی کی تخلیق کے متعلق

یہ فرمایا کہ اسے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ مختلف تبدیلیاں جو شکم مادر میں تدریجاً رونما ہوتی ہیں ان سے کسی حد تک عرب کے بادیہ نشیں بھی باخبر تھے لیکن علم وانکشاف کا سلسلہ جوں جوں بڑھ رہا ہے ان تطورات (تغیرات) کے پردوں میں قدرت کے موقلم کی اعجاز آفرینیاں اور نقش آرائیاں، جو آج تک نگاہوں سے اوجھل تھیں، نمایاں ہو کر اللہ تعالیٰ کے علم اور حکمت کی ناقابل تردید گواہی دے رہی ہیں۔ پانی کی وہ بوند رحم مادر میں قرار پکڑنے کے بعد مختلف تطورات اور تغیرات کے مرحلوں سے گزرتی ہے جن کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے لیکن ابھی تک انسان اور دیگر حیونات کے جنین یکساں قسم کے تھے۔ جو تبدیلیاں یکے بعد دیگرے انسانی نطفہ میں یہاں وقوع پذیر ہوئی ہیں بعینہ یہی تبدیلیاں دیگر حیوانات کے نطفوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن ایک منزل پر پہنچ کر یکا یک مصور فطرت نے اپنے موقلم سے کوئی ایسی رنگ آمیزی کر دی کہ اسے دیگر حیوانی جنینوں سے بالکل ممتاز کر کے رکھ دیا۔ پہلے وہ بے جان تھا، اب اس میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لیکن انسانی جنین میں روح حیوانی کی آفرینش سے حیات انسانی کا آغاز نہیں ہوا بلکہ نفس ناطقہ نے اسے بالکل ایک جدید قسم کی مخلوق کا روپ بخش دیا ہے۔ عقل وفہم کی قوتیں، غور وفکر کی صلاحیتیں، تسخیر کائنات کے حوصلے اور حکمرانی کی امنگیں سب کچھ اس عمدگی سے یہاں یکجا کر دیا گیا ہے جسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے اور یہ راز میں سمجھ نہیں آ سکتا کہ ابتدائی مرحلوں میں بالکل یکساں ہونے کے باوجود کس طرح ایک کا رخ ایک طرف اور دوسرے کا رخ ایک بالکل نئی منزل کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ پھر اس منزل کو پا لینے کے لئے جن قابلیتوں، صلاحیتوں، اعضاء اور وسائل کی ضرورت تھی وہ سب مہیا کر دیئے گئے۔ ان حقائق کو دیکھ کر زبان بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ' ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (المومنون / 13+14) امام رازی لکھتے ہیں "ای خلقاً مبا ینا للخلق الاول مباینة ما ابعدها" یہ دوسری تخلیق پہلی تخلیق سے بالکل مختلف اور بہت مختلف ہوتی ہے پھر امام رازی آگے لکھتے ہیں۔ "واودع باطنه وظاہرہ بل کل عضو من اعضاءہ وکل جزء من اجزائه عجائب فطرة وغرائب حکمة لا یحیط بها وصف الواصفین" پھر انسانی جنین کے باطن اور ظاہر میں بلکہ اس کے اعضاء میں سے تمام اعضاء میں فطرت کے ایسے عجائبات اور حکمت کے ایسے نوادرات رکھ دیئے ہیں کہ کوئی وصف کرنے والا اس کے وصف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس آیت کے آخر میں 'اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ' کا لفظ توجہ طلب ہے۔ ظاہر الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیدا کرنے والے تو بہت سے ہیں البتہ سب سے بہتر پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے حالانکہ صرف وہی خالق ہے۔ اور تخلیق کائنات میں کوئی اس کا حصہ دار نہیں اور کسی کو حصہ دار بنانا توحید کے قطعاً منافی ہے۔ علمائے کرام

نے اس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا ہے کہ خلق کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، کسی چیز کو کسی موجود مادے اور سابقہ نمونے کے بغیر پیدا کرنا، ''ابداع الشئ من غیر اصل و لا اقتداء'' (مفردات) اس معنی کے لحاظ سے یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو کسی میں نہیں پائی جاسکتی۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ سابقہ مادہ سے کسی چیز کو کسی موجود نمونہ کے مطابق بنالینا یہ اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں میں بھی پایا جاسکتا ہے اس آیت میں یہ لفظ اپنے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں ہم مصر کے ایک نابغۂ روزگار عالم سعید حوی کی تصنیف ''الرسول'' سے ان کی تحقیقات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور ان کی عبارت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ آپ اگر توجہ سے اس فاضل عالم کا یہ اقتباس پڑھیں گے تو آپ کے ایمان اور یقین میں مزید اضافہ ہوگا۔ موصوف سورۃ العلق کی اس آیت ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مرد کے مادۂ تولید میں جو جرثومہ ہے اور عورت کے مادہ تولید میں جو بویضہ ہے ان کا باہم ملاپ اس نالی میں ہوتا ہے جو رحم اور مبیض کو آپس میں ملاتی ہے۔ وہاں انسانی حمل کا پہلا خلیہ معرض وجود میں آتا ہے۔ یہ خلیہ اگرچہ مقدار میں بہت چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن پورا انسان اپنے جملہ عناصر اور خصوصیات کے ساتھ اس ایک خلیہ میں سمویا ہوا ہوتا ہے۔ پھر یہ خلیہ وہاں سے رحم کی طرف سفر شروع کرتا ہے اور تقریباً ایک ہفتہ میں وہ اپنی منزل (رحم) تک پہنچتا ہے۔ اس سفر میں بہت سے خلیات اس کے ساتھ مل جاتے ہیں اور وہ ایک گچھا کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہ گچھا رحم کی دیوار کے ساتھ چمٹ جاتا ہے اور اس کو بعض جراثیم کھانا شروع کردیتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک باریک سا نقطہ رہ جاتا ہے۔ ماں کا خون اسے خوراک پہنچاتا ہے اور قرآن کریم نے جنین کی اس حالت کو ''علقہ'' کہا ہے۔ جس کا معنی ہے لٹکا ہوا، آویختہ، اس سے بہتر اس کی اور کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی۔ پھر یہ علقہ نمو پذیر ہوتا ہے (بڑھنے لگتا ہے) اور اس کے خلیات مختلف ہوتے ہیں۔ بغیر کسی ترتیب کے وہ گول شکل اختیار کرلیتا ہے۔ چند ہفتے اسی حالت میں رہتا ہے اس کے وسط میں ایک چھوٹا سا تالاب نما گڑھا ہوتا ہے اور وہ اس خون سے غذا حاصل کرتا ہے اور وہ گوشت کے ایک چبائے ہوئے ٹکڑے کی شکل اختیار کرلیتا ہے اگرچہ اس کی لمبائی صرف چند ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس مرحلہ کے بعد اس میں نرم اور شفاف ہڈیاں ابھرنے لگتی ہیں۔ اس علقہ میں جتنے خلیات ہوتے ہیں وہ سرگرم عمل ہوجاتے ہیں اور ایک ایسا اعصاب کا جال بننے لگتے ہیں جو ہڈیوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اور پھر ان ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنادیا جاتا ہے۔ انسان اس انکشاف کو دیکھ کر حیران ومبہوت ہوجاتا ہے کہ اس مضغہ میں سب سے پہلے ہڈیاں نمودار ہوتی ہیں اور اس کے بعد

گوشت کی چادر ظاہر ہوتی ہے جس سے ان ہڈیوں کے ڈھانچے کو لباس پہنایا جاتا ہے۔ یہ حقیقت جس تک آج علم انسانی کی رسائی ہوئی ہے، اسے چودہ صدیاں پیشتر اس آیت قرآنی نے منکشف کر دی تھی۔ اس حقیقت تک علم تشریح الابدان کے علما بصد مشکل اب پہنچے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔ ''فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا'' مضغہ سے ہم ہڈیاں پیدا کرتے ہیں اور ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں۔ اب یہاں ہم آپ کی توجہ ایک خاص بات کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں جسے قرآن کریم نے ان کلمات طیبات سے بیان کیا ہے۔ ''ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۔ پھر روح پھونک کر ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا ہے۔

یہاں تک انسانی اور حیوانی جنین میں بالکل یکسانیت پائی جاتی ہے۔ وہی مادہ منویہ کا اختلاط، وہی ان کا رحم کی طرف سفر، پھر رحم میں پہنچ کر ان کا رحم کی دیوار سے چمٹ جانا، پھر اس خلیہ کے ساتھ بہت سے خلیوں کا جمع ہو جانا، پھر ان خلیوں میں ہڈیوں کا نمودار ہونا اور اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو گوشت کا لباس پہنانا، یہاں تک انسانی اور حیوانی جنین میں بالکل یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن اس موقع پر ایک حیران کن تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ جب حمل کا دوسرا مہینہ اختتام پذیر ہونے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا خصوصی لطف و کرم اس جنین پر ہوتا ہے جسے آگے چل کر انسانیت کی خلعت فاخرہ پہننی ہے۔ اس وقت اس انسانی جنین میں بالکل مختلف قسم کی خصوصیات نمودار ہونے لگتی ہیں۔ اس منزل پر یکا یک مصور فطرت اپنے قلم سے اس جنین میں ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے جو اسے دیگر حیوانی جنینوں سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے۔ پہلے وہ بے جان تھا اب زندگی کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگتی ہے۔ عقل و فہم کی قوتیں، غور و فکر کی صلاحیتیں، تسخیر کائنات کے حوصلے اور حکمرانی کی امنگیں سب کچھ اس میں اس عمدگی سے یکجا کر دیئے جاتے ہیں جسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتدائی مرحلوں میں بالکل یکساں ہونے کے باوجود کس طرح حیوانی جنین کا رخ ایک طرف اور انسانی جنین کا رخ دوسری طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ پھر اس منزل کو پا لینے کے لئے جن قابلیتیوں، صلاحیتوں اور اعضاء وسائل کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مہیا کر دیئے جاتے ہیں تو زبان بے ساختہ پکارنے لگتی ہے ''فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ'' شکم مادر میں وہ تنہا خلیہ جو رحم کی دیوار کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، جو حیران کن تغیرات اس میں رونما پذیر ہوتے ہیں، عام طور پر ہم اس کی طرف کم توجہ دیتے ہیں لیکن یہ خصوصیتیں آہستہ آہستہ نمو پذیر ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں اور صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ پس وہی

باریک نقطہ ایک انسانی بچہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جو خوبیاں اور کمالات اللہ تعالیٰ نے اس میں ودیعت کئے تھے آہستہ آہستہ وہ ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں۔

یہ حیران کن تغیرات بڑے اہم نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ اس رحم میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں جس کو قرآن کریم نے "فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ" کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ یعنی ایک ایسی قرارگاہ جو بڑی پختہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ علم تشریح الابدان کے ماہر جب رحم کے بارے میں غور کرتے ہیں تو حیران ہوجاتے ہیں کہ کس طرح اسے پیٹ کے نچلے حصہ میں رکھا گیا ہے اور پھر اسے مختلف رگ وریشوں سے شکم کے مختلف حصوں کے ساتھ پیوستہ کر دیا ہے کہ وہ نہ الٹ جائے اور نہ کسی ایک طرف جھک جائے۔ جیسے جیسے جنین بڑھتا رہتا ہے اسی کے مطابق رحم پھیلتا جاتا ہے اور جب بچہ پیدا ہوجاتا ہے تو پھر وہ پھیلا ہوا رحم سکڑنے لگتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد وہ اپنی اصل طبعی حالت پر لوٹ آتا ہے۔ جو شخص اس ایک جرثومہ کے محیر العقول اور نازک ترین تغیرات کا ملاحظہ کرتا ہے تو اس وقت اسے اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ آتا ہے۔ 'ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (ضیاء النبی: ۵۷)

مختصر یہ کہ جو شخص بھی خلوص نیت سے آیات قرآنی میں غور وخوض کرتا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کلام الٰہی کے ہر کلمہ میں علم وحکمت کے دریا موجزن ہیں، علوم ومعارف کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہیں اور الفاظ کی تعداد کم ہے لیکن معانی کی بیکرانی حیرت انگیز ہے اس کی عبارت لطائف وحکم سے لبریز ہے، اس میں بیک وقت اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لئے ایسے اثر انگیز ارشادات ہیں جن سے ایک دانشمند آدمی کو ادنی سرتابی کی بھی مجال نہیں رہتی، اس میں حلال وحرام کے بے مثال ضابطے موجود ہیں، محاسن اخلاق کو اپنانے کی ترغیب ہے برے کاموں سے دور رہنے کی تلقین ہے۔ انسانی زندگی کو نفع بخش اور فیض رساں بنانے کے لئے ہر انسان کے دل میں فضیلت کرامت کے اعلیٰ وارفع درجات پر فائز ہونے والے کا جو شوق ہے اس مرکب شوق کو تازیانہ لگانے کے لئے اس میں اعمال صالحہ کی محبت اور اعمال سیئہ کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے مختلف قسم کے اوامر ونواہی، پند ونصائح اور عبرت پذیری کے لئے گذشتہ اقوام کے عبرت آموز واقعات اس دلنشیں اور دلپذیر انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ ان آیات کے مطالعہ کے بعد کسی اور ناصح ومشفق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ جامعیت، یہ وسعت، یہ اثر انگیزی، یہ دلنشینی، یہ تنوع تمام کی تمام خوبیاں اس صحیفہ مقدسہ میں یکجا کر کر دی گئیں ہیں۔

چند کتابوں کے حوالے سے قرآن حکیم کی جامعیت ومعنویت اور فصاحت و بلاغت کا یہ مختصر تعارف تھا اب

ورق الٹیے اور خاص سورہ فاتحہ کے فضائل وکمالات ،علوم ومعارف ،اور اسرار ومعانی کے بیان سے اپنے دیدہ ودل کو منور ومجلیٰ کیجئے۔

ابوالحسنات محمد معین الدین اشرفی مصباحی
شیخ الحدیث ومفتی
دارالعلوم بہار شاہ فیض آباد
موبائل نمبر:9451872012

☆☆☆☆

☆☆☆☆

سورۃ الفاتحۃ مکیۃ وھی سبع آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۞

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۞

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۞

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۞

اٰیاتھا ۷ سورۃ الفاتحۃ مکیۃ رکوعھا ۱

تراجم سورہ فاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائ بخشندہ مہربان۔۔۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (٦) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

راہ آنانکہ انعام کردی برایشاں بجز آنانکہ خشم گرفتہ شد بآنہاں

---(مخدوم اشرف)

راستہ ان کا جن پر تونے احسان کیا، نہ ان کا جن پر غضب ہوا

---(اعلیٰ حضرت امام احمد رضا)

راستہ ان کا کہ انعام فرمایا تونے، نہ ان کا کہ غضب فرمایا گیا جن پر

---(محدث اعظم ہند)

وَلَا الضَّآلِّيْنَ(٧)

وبجز گمراہاں---(مخدوم اشرف)

اور نہ بہکے ہوؤں کا---(اعلیٰ حضرت امام احمد رضا)

اور نہ گمراہوں کا---(محدث اعظم ہند)

☆☆☆☆

☆☆

ترجمہ سورہ فاتحہ

بمطابق اقوال وافعال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ (معبود حقیقی) کے نام سے ابتدا جو بے انتہا مہربان بڑا رحم فرمانے والا

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ

تمام تعریفیں ملک/ خاص ہیں اللہ (معبود حقیقی) کے لئے جو مربی سارے جہاں والوں کا، بے انتہا مہربان بڑا رحم فرمانے والا قیامت کے دن کا مالک/ بادشاہ

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ

ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں/ کریں/ کر رہے ہیں/ کریں گے، اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں/ چاہیں/ چاہ رہے ہیں/ چاہیں گے، ہم سب کو صراط مستقیم پر قائم رکھ/ سیدھا راستہ دکھا/ چلا

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ

ان حضرات کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا

وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ

اور نہ بہکے ہوؤں کا

اسمائے سورہ فاتحہ مع وجوہ تسمیہ

سورۂ فاتحہ قرآن حکیم کی سورتوں میں ایک بہت ہی عظیم سورۂ مبارکہ ہے فاتحہ کے علاوہ اس کے بہت سے اسمائے مبارکہ ہیں۔امام رازی نے تفسیر کبیر میں تقریباً بارہ اور امام سیوطی نے اتقان میں تقریباً پچیس نام شمار کرائے ہیں۔ذیل میں سورۂ فاتحہ کے دیگر اسمائے مبارکہ وجوہ تسمیہ کے ساتھ مذکور ہیں۔

۱۔ **فاتحۃ الکتاب** :ان دونوں ناموں کی وجہ بہت واضح ہے کہ اس سے قرآن،تعلیم اور نماز کا آغاز

۲۔ **فاتحۃ القرآن** :اوران کی شروعات ہوتی ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر اچھے امور جن کا آغاز حمد الٰہی سے ہوتا ہے وہ تمامیت کو پہنچتے ہیں اور جس شاندار کام پر حمد الٰہی نہیں کیا جاتا وہ ناقص رہ جاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔کل امرٍ ذی بال لم یبدأ بحمد اللہ فھو ابتر۔

۳۔ **سورۂ حمد** : اس کا سبب یہ ہے کہ اسکا پہلا لفظ کلمہ حمد ہے۔

۴۔ **سورۂ حمد اولیٰ** : یہ سورہ،حمد کی پہلی سورہ ہے۔

۵۔ **سورۂ حمد قصریٰ** : حمد کی یہ مختصر سورہ ہے۔

۶۔ **ام القرآن** : سورۂ فاتحہ کے اسماء میں ام القرآن اور ام الکتاب بھی دو اہم نام ہیں ان دونوں ناموں

۷۔ **ام الکتاب**: کی مختلف وجہیں ہیں۔

(۱) ام کے معنی اصل کے آتے ہیں ام شئ اصل شئ کو کہتے ہیں گویا کہ سورۂ فاتحہ میں اصل احکام موجود ہیں چونکہ پورے قرآن میں مقصود بالذات اور اصل الاصول چار باتوں کو ثابت کرنا ہے (۱)مسائل الٰہیات (۲)عقیدۂ حشر ونشر یا قیامت کی تعلیم (۳)نبوت کے احکام ومسائل (۴)قضاء وقدر کا بیان

آیات "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے عقائد الوہیت کی طرف اشارہ ہے۔مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ احوال قیامت اور روز جزا کی طرف اشارہ ہے۔اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ سے جبر وقدر کے بطلان کی طرف اشارہ ہے۔نیز اس طرف کہ سب چیزیں اللہ کے قضاء وقدر سے ہوتی ہیں۔اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ سے آخر تک قضاء وقدر،نبوت وغیرہا سے متعلق باتوں کی طرف اشارہ ہے۔غرض کہ یہ چاروں اصول عقائد جن کو بار بار قرآن میں بیان کیا گیا ہے وہ سب سورۂ فاتحہ میں موجود ہیں اس لئے اس سورہ کو ام الکتاب اور ام القرآن کہتے ہیں۔

(۲) ام القرآن وام الکتاب نام رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تمام آسمانی کتابوں کے مقاصد ونتائج تین ہیں۔

۱۔ زبان سے اللہ عزوجل کی ثنا۔

۲۔ خدمت واطاعت میں مصروفیت۔

۳۔ مشاہدات ومکاشفات کی طلب ودرخواست۔

یہ تینوں امور الحمد شریف میں بدرجۂ اتم موجود ہیں چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے یَوْمِ الدِّیْنِ تک اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کا بیان ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں خدمت واطاعت میں مصروفیت کا ذکر ہے۔اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ سے آخر تک میں مشاہدات ومکاشفات اور ہدایت کے انواع واقسام کی طلب اور درخواست موجود ہے۔

(۳) ام القرآن اور ام الکتاب ہونے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جملہ علوم کا مقصد اصلی وقار ربوبیت کی معرفت اور ذلت عبودیت کی شناخت وآشنائی ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں یہ باتیں بھی موجود ہیں چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ سے "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ تک آیات میں اس بات کا پورا ثبوت ہے کہ دنیا وآخرت کے تمام حالات وکیفیات پر اللہ تعالیٰ کو قدرت کاملہ حاصل ہے وہ جب چاہے جو چاہے جسے چاہے جیسے چاہے کرسکتا ہے، اس کے برعکس عبودیت کی ذلت اور بندوں کے احتیاج الی الغیر کی طرف بھی اس میں بھرپور روشنی ہے۔

(۴) ام القرآن نام رکھنے کا چوتھا سبب یہ ہے کہ ام کا ایک معنی لشکر کے جھنڈا کے ہیں قیس بن حظیم شاعر نے کہا، نَصَبْنَا اُمَّنَا حتّٰی ابْذعرَّوا ای عنی ہم نے اپنا جھنڈا گاڑ دیا یہاں تک کہ وہ یعنی دشمن بکھر گئے پس اس کا نام ام القرآن اس لئے رکھا کہ یہ سورہ اہل ایمان کی پناہ گاہ اور ان کا علامتی نشان ہے جس طرح جھنڈا لشکر کی پناہ گاہ اور نشان ہوتا ہے۔

(۸) **سبع مثانی** : قرآن حکیم میں اللہ عزشانہ کا ارشاد ہے وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ،ہم نے آپ کو مثانی کی سات آیتیں دیں (سورۃ الحجر، آیت 87)۔اس لئے اس سورہ کو سبع مثانی بھی کہتے ہیں کہ قرآن نے اسے مثانی فرمایا۔سبع مثانی کہنے کی کئی وجہیں ہیں (۱) اس سورہ کے دو حصے ہیں ایک میں اللہ تعالیٰ کی حمد وتعریف اور دوسرے میں اس کی عطا ونوازش کا بیان ہے۔(۲) نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے اس لئے اسے سبع مثانی کہتے ہیں۔(۳) مثانی اس لئے بھی کہتے ہیں کہ یہ تمام آسمانی کتابوں سے الگ اور ممتاز ہے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس سورہ کی مثال تورات، انجیل، زبور اور فرقان (خود قرآن) میں نازل نہ ہوئی اور یہ سورہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔(۴) اس کو سبع مثانی اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں سات آیتیں ہیں اور ہر آیت کی تلاوت قرآن کے ساتویں حصہ کے برابر ہے گویا جس نے

سورہ فاتحہ پڑھ لی اس کو اللہ تعالیٰ پورا قرآن پڑھنے کا ثواب عطا فرمائے گا۔(۵) اس سورہ مبارکہ میں سات آیتیں ہیں اور جہنم کے دروازے بھی سات ہیں اس لئے جس شخص نے اس کو پڑھنے کے لئے اپنی زبان کھولی اس کے لئے جہنم کے ساتوں دروازے بند کر دیئے جائیں گے اس کی دلیل یہ روایت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ میں آپ کی امت کے سلسلہ میں عذاب سے ڈرتا تھا لیکن جب سورہ فاتحہ نازل ہوئی تو میں مطمئن اور بے خوف ہو گیا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کیونکر انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (سورۂ حجر ع ۳ پ ۱۴ آیت ۴۴) **ترجمہ:** اور بیشک جہنم ان سب کا وعدہ ہے، اس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ کے لئے ان میں سے ایک حصہ بٹا ہوا ہے۔

اور سورہ فاتحہ میں بھی آیتیں سات ہیں اس لئے جو کوئی انہیں پڑھ لے گا اس کے لئے ہر آیت جہنم کے ایک دروازہ کا ڈھکن ہوگی اس طرح آپ کی امت اس سے بچ کر گذر جائیگی۔

(۵) اس کو مثانی کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ نماز میں پڑھی جاتی ہے پھر کسی دوسری سورہ سے ملادی جاتی ہے۔

(۶) اور اس لئے بھی کہ یہ اللہ عزوجل کی حمد وثنا پر مشتمل ہے۔

(۷) آٹھویں وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اس سورۂ پاک کو دوبارہ نازل کیا۔

(۹) قرآن عظیم : اس سورہ کی عظمت وجلالت کی وجہ سے اس کو قرآن عظیم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ مسند احمد کی روایت میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ ام القرآن ہے سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔ اسی طرح صحیح البخاری میں حضرت ابوسعید بن معلیٰ سے روایت ہے کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلایا میں نے جواب نہ دیا پھر میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا، فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ ورسول جب تمہیں بلائیں تو فوراً جواب دو، پھر فرمایا کیا میں تمہیں تمہارے مسجد سے جانے سے پہلے قرآن کریم کی عظیم الشان سورہ نہ بتاؤں، پھر حضور نے میرا ہاتھ پکڑا جب باہر نکلنے لگے تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ آپ نے فرمایا تھا کہ میں تم کو قرآن کی عظیم الشان سورہ بتاؤنگا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''الحمد لله رب العٰلمين هی السبع المثانی والقرآن العظيم الذی اوتيته ''یعنی وہ الحمدللہ رب العٰلمین، یہ تو وہ سات مکرر آیتیں ہیں اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا ہوئیں۔ غرض کہ سورہ فاتحہ کا نام قرآن عظیم، حدیث صحیح بخاری سے ثابت ہے جو تسمیۃ الجزء باسم الکل کے قبیل سے ہے۔

(۱۰) وافیہ: حضرت سفیان بن عیینہ اس سورہ کا یہی نام لیتے تھے، حضرت ثعلبی نے فرمایا ہے کہ اس کی تشریح یہ ہے کہ اس سورہ میں نصف نصف کرنے کی گنجائش نہیں ہے قرآن کی کسی بھی بڑی سورہ کا نصف حصہ کسی رکعت میں پڑھا جائے اور دوسرا نصف دوسری رکعت میں پڑھا جائے تو یہ جائز ہے لیکن اس سورہ میں اس طرح نصف نصف کرنا روا نہیں گویا جب بھی یہ سورہ پڑھی جائے گی پوری ہی پڑھی جائے گی۔

(۱۱) کافیہ: اس کا نام کافیہ اس لئے رکھا کہ یہ سورہ بذات خود کافی ہوجاتی ہے کسی دوسری سورہ کی اسے احتیاج نہیں اور اس کے علاوہ کسی اور سورہ میں یہ بات نہیں، محمود بن ربیع نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ''ام القرآن'' یعنی سورہ فاتحہ اور سورتوں کا بدل ہے اور اس کے علاوہ دوسری سورتیں اس کا بدل نہیں ہوسکتیں۔

(۱۲) **اساس:** اس سورہ کے سورۂ اساس نام ہونے کی تین وجہیں ہیں۔

(۱) یہ قرآن کی پہلی سورہ ہے اس طرح یہ اساس (بنیاد) کی طرح ہے۔

(۲) یہ بلند اور عظیم ترین مقاصد پر مشتمل ہے اسی کو اساس کہتے ہیں۔

(۳) ایمان کے بعد سب سے اہم عبادت نماز ہے اور یہ سورہ ضروریات ایمان پر بھی مشتمل ہے اور اس کے بغیر نماز بھی مکمل نہیں ہوسکتی گویا یہ سورہ ایمان اور عمل نماز کے لئے اساس ہوگئی۔

اساس: تفسیر طبری میں ہے۔ ایک شخص نے حضرت امام شعبی سے وجع خاصرہ یعنی پہلو میں درد ہونے کی شکایت کی تو امام شعبی نے اس سے فرمایا کہ اساس قرآن یعنی سورہ فاتحہ کو لازم کرلو کیونکہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر چیز کی اساس ہے اور دنیا کی اساس مکہ ہے اس لئے کہ دنیا وہیں سے (دحیت) پھیلائی گئی ہے۔ اور ساتواں آسمانوں کی اساس ''عربیا'' یعنی ساتوں آسمان ہے اور زمین کی اساس ''عجیبا'' یعنی زمین کا ساتواں نچلا طبقہ ہے۔ اور جنتوں کی اساس، جنت عدن ہے اس لئے کہ وہی جنتوں کا پیندا ہے جس پر ساری جنتوں کی عمارت کھڑی ہے اور سارے درکات نار (جہنم) کی اساس، وادی جہنم ہے جو جہنم کی ساتویں نچلی وادی ہے جس پر جہنم کے سارے درکات قائم ہیں اور ساری خلق کی اساس آدم ہیں، انبیا کی اساس نوح ہیں، بنی اسرائیل کی اساس یعقوب ہیں، تمام کتب سماویہ کی اساس قرآن ہے اور قرآن کی اساس سورہ فاتحہ ہے اور سورہ فاتحہ کی اساس بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ہے لہٰذا جب تم بیمار و علیل ہوجاؤ تو سورہ فاتحہ کو لازم کرلو شفا مل جائے گی۔

اس مقام پر ناچیز راقم السطور کہتا ہے کہ جب زمین و آسمان، جنت و جہنم، انسان، انبیا، کتب سماویہ وغیرہ سب کی کوئی نہ کوئی اساس اور اصل ہے تو ظاہر ہے کہ ان سارے آساس اور اصول کی بھی کوئی ایک اساس اور اصل ضرور ہوگی جس پر ساری بنیادیں قائم ہونگی تو یقین کر لیجئے کہ تمام اصولوں کی اصل، تمام آساس کی اساس، مبانی کے مبنی اور مصادر کے مرجع ہمارے آپ کے اور ساری کائنات کے رسول، رحمۃ للعلمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کریم ہے جیسا کہ "اول ما خلق اللہ نوری کل الخلائق من نوری" اور "لو لاک لما خلقت الافلاک" جیسی احادیث کریمہ سے ظاہر ہے۔ اعلیٰ حضرت محدث بریلوی نے اپنے نعتیہ کلام میں کہا:

یہی ہے اصل عالم مادۂ ایجاد خلقت کا
یہاں وحدت میں برپا ہے عجب ہنگامہ کثرت کا
ہوتے کہاں خلیل و بنا کعبہ و منی
لولاک والے صاحبی سب تیرے گھر کی ہے

(۱۳) **سورہ شفا:** حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۴) **سورہ شافیہ:** نے ارشاد فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب ہر زہر کا علاج ہے کسی صحابی کا ایک مرگی زدہ شخص کے پاس سے گذر ہوا انہوں نے اس کے کان میں سورۂ فاتحہ پڑھ دی بس وہ شفایاب ہوگیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو حضور نے فرمایا یہ سورہ ام القرآن ہے اور ہر مرض کی دوا ہے۔

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امراض دو طرح کے ہیں روحانی اور جسمانی اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر و نفاق کو مرض بتایا ارشاد ہے ۔ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ ان کے دلوں میں مرض (کفر) ہے (البقرہ، آیت 10) اور یہ سورہ اصول و فروع اور مکا شفات پر مشتمل ہے اس لئے ان جگہوں میں شفایابی کا سامان و ذریعہ ہے۔

ابن قانع نے "معجم الصحابہ" میں رجاء غنوی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مخلوق کی حمد و مدح سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس سے خود اپنی حمد و مدح فرمائی اس سے تم شفا حاصل کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیا ہے حضور نے فرمایا "الحمد للہ" اور "قل ھو اللہ احد" ہے جسے یہ قرآن شفا نہ دے پھر اللہ تعالیٰ اسے شفا نہ بخشے۔

(۱۵) **صلوۃ:** حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے حدیث قدسی میں ہے ''قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی نصفین ''یعنی سورۂ فاتحہ کو

(۱۶) **سورہ صلوۃ:** میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے صلوٰۃ سے مراد یہی سورہ ہے اور اس وجہ سے بھی اس سورہ کو صلوٰۃ اور سورۂ صلوٰۃ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ کے معنی نماز کے ہیں اور یہ سورہ نماز کا واجبی حصہ ہے۔

(۱۷) **سورۂ مسئلہ:** حدیث قدسی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ رب العزت جل جلالہ سے روایت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'' جسے میرے ذکر کی مشغولیت کے سبب مجھ سے سوال کرنے کا موقع نہ مل سکا اس کو میں نے اس سے کہیں زیادہ عطا کیا ہے جو میں مانگنے والوں کو عطا کرتا ہوں۔

اس سورۂ میں کسی عادی چیز کا سوال تو نہیں ہے لیکن ایک عظیم مراد کا سوال ضرور ہے اور وہ ہے ہدایت کا سوال، جو مقاصد دین میں نہایت اہم اور کامل ترین مقصد ہے اور ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ' کے سوال نے یہ بھی واضح کر دیا کہ معرفت راہ منزل اور معرفت الٰہی کی جنت آسائش وخلد کی جنت سے بہتر ہے اسی لئے تو بات اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ، یعنی (ہمیں سیدھی راہ پر چلا) پر ختم ہوئی اور یوں نہ فرمایا'' وارزقنا الجنة''ہمیں جنت عطا فرما۔

(۱۸) **سورہ شکر:** اسے سورۂ شکر بھی کہنے کی وجہ ظاہر ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان اور اس کے رزق ورحم کی حمد وثنا ہے اور یہی محسن کی شکر گذاری ہے۔

(۱۹) **سورہ دعا:** اس سورہ کو سورۂ دعا بھی کہتے ہیں کہ اس میں ہدایت واستعانت کی دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۲۰) **سورۂ کنز:** کنز خزانہ کو کہتے ہیں اس کو کنز اس لئے کہتے ہیں کہ یہ سورۂ مبارکہ علوم ومعارف، رموز و اسرار اور احکام ومسائل کا خزانہ ہے یا اس لئے کہ یہ کنز عرش یعنی خزانہ عرش سے نازل کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے سورۂ فاتحہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ سورۂ فاتحہ خزانہ عرش کے نیچے سے نازل ہوئی ہے۔

(۲۱) **سورۂ راقیہ:** جس سے شفا کے لئے پھونکا جائے اس کی وجہ یہ روایت ہے جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے ایک سفر میں ایک جگہ پڑاؤ کیا ہمارے پاس ایک لڑکی آئی اس نے کہا ہمارے قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے آپ میں کوئی جھاڑ پھونک جانتا ہے چنانچہ ہم میں سے ایک شخص گیا اور سورہ فاتحہ پڑھ کر اسے پھونکا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔

(۲۲) **سورۂ مناجات:** اس لئے کہ بندہ اس کے ذریعہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔

(۲۳) **سورۂ تفویض:** تفویض کے معنی سپرد کرنے کے ہیں بندۂ مومن جب کہتا ہے "ایاک نعبد وایاک نستعین" تو گویا وہ اپنی ذات کو اپنے خالق کے حوالہ کر دیتا ہے اس لئے اسے سورۂ تفویض کہتے ہیں۔

(۲۴) **سورۂ نور: اس کی** وجہ اظہر ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ سرچشمۂ نور وہدایت ہے۔

(۲۵) **سورۂ تعلیم المسئلہ:** اس سورہ مبارکہ کا ایک نام سورہ تعلیم المسئلہ بھی ہے یعنی ایسی سورہ جس میں سوال ودعا اور مانگنے کا طریقہ اور اس کے آداب بتائے گئے ہیں وہ اس طرح کہ جس سے مانگا جائے پہلے اس کی خوب حمد وثناء کر کے اس کی شان رحیمی اور کرم نوازی کو بیان کرے تاکہ مسؤل عنہ سائل سے خوش اور راضی ہو جائے اور مانگنے کے سوا عطا کرے۔ جیسا کہ اس سورہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اس کی ربوبیت، رحیمی وکریمی اور روز جزاء میں اس کی بادشاہت کا ذکر ہے پھر "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے صراط مستقیم کا سوال ہے۔ الاتقان میں ہے "سور تعلیم المسئلۃ قال المرسی لان فیھا آداب السوال لانھا بدئت بالثناء قبلہ" چنانچہ دنیا میں بھی یہ عرف رائج ہے کہ جب کوئی منگتا کسی دروازہ پر دست سوال دراز کرتا ہے تو پہلے اہل خانہ اور اس کے اہل وعیال کی خوب تعریف کرتا ہے اور اس کو دعائیں دیتا ہے تاکہ اہل خانہ خوش ہو کر سائل کی مراد پوری کر دے پس اہل خانہ سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں۔ خالی ہاتھ محروم واپس نہیں کرتے، جب دنیا کے لوگوں کی تعریف وتوصیف کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے خالی ہاتھ لوٹا یا نہیں جاتا تو اگر اخلاص کے ساتھ بندہ اللہ رب العلمین کی حمد وثناء اس کی ربوبیت عامہ، اس کی بادشاہی کا وظیفہ پنج ساعت کرتا رہے تو کیا وہ محروم ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں اس کا تو ارشاد ہے "ولعبدی ما سال" میرا بندہ جو مانگے گا اسے عطا کرونگا نیز اس میں اس بات کی بھی تعلیم ہے کہ در کی عظمت وبلندی کے اعتبار سے سوال کرنا چاہئے۔ اگر کسی دنیادار سے سوال کرے تو متاع دنیا کا سوال کرے لیکن اگر خالق کائنات کی درگاہ قدس وجلال میں دست سوال دراز کرے تو دنیا کی متاع کے سوا صراط مستقیم پر ثابت قدمی اور وراثت جنت کا سوال کرے۔

فضائل سورۂ فاتحہ

"سورۂ فاتحہ کے فضائل میں بے شمار احادیث واخبار وارد ہیں ان میں سے چند روایتیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں"

1:۔ حضرت ابوسعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی میں نے جواب نہ دیا پھر نماز پوری کرنے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور (معذرت کے ساتھ) عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز میں مشغول تھا حضور نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ "(الانفال، 24) جب تمہیں اللہ ورسول بلائیں تو حاضر ہوجاؤ اور اطاعت کرو پھر حضور نے فرمایا اس سے پہلے کہ تم مسجد سے نکلو کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے عظیم سورہ نہ بتادوں پھر حضور نے میرا ہاتھ پکڑا جب میں نے مسجد سے نکلنا چاہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ نے فرمایا تھا کہ تمہیں قرآن کی سب سے عظیم سورہ بتاؤں گا حضور نے فرمایا یہ ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دی گئی۔ اے (بخاری، ابوداؤد وغیرہ۔ ج ۲)

فائدہ: حدیث پاک سے یہ ظاہر ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر حاضر ہونے اور تعمیل حکم سے نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں حدیث میں اس کی دلیل کہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اثناء نماز میں لبیک کہنے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی جس طرح نماز میں آپ سے یوں خطاب کیا جاتا ہے "السلام علیک أیها النبی ورحمة الله وبرکاته" (اے نبی آپ کو سلام) اس سے نماز باطل نہیں ہوتی اسی طرح آپ کی اطاعت سے نماز نہیں جاتی۔ حضرت علامہ ملا علی قاری رقمطراز ہیں کہ حدیث سے بالکل واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مطلقاً لبیک کہنا اور حکم کی تعمیل کرنا واجب ہے جیسا کہ اطلاق سے سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابی بن کعب کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا اے ابی اس وقت حضرت ابی نماز میں مشغول تھے حضور کو جواب نہ دیا اور نماز نہ توڑی نماز ہلکی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگئے سلام عرض کیا حضور نے جواب مرحمت فرمانے کے بعد پوچھا میں نے تمہیں آواز دی تھی تو تم نے تعمیل کیوں نہ کی۔ حضرت ابی نے (معذرت کے ساتھ) عرض کیا یا رسول اللہ میں نماز میں تھا حضور نے فرمایا کیا تمہارے پیش نظر یہ آیت کریمہ نہیں تھی "اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ اللہ اور رسول کے بلانے پر حاضر ہوجاؤ جب رسول تمہیں اس چیز کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے۔

انہوں نے کہا ہاں ضرور یہ آیت کریمہ میرے علم میں تھی اب انشاء اللہ ایسا نہ کرونگا (آئندہ جب بھی بلائیں میں حاضر ہونگا خواہ نماز ہی میں کیوں نہ رہوں)۔

حضور نے فرمایا کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ تمھیں ایک ایسی سورہ بتاؤں جس طرح نہ تورات میں نازل ہوئی نہ انجیل میں نہ زبور میں اور نہ ہی فرقان میں، حضرت ابی نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ، حضور نے فرمایا تم نماز کیسے پڑھتے ہوانہوں نے سورہ فاتحہ پڑھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل، زبور اور فرقان میں اس جیسی کوئی سورہ نازل نہیں فرمائی اس میں مثانی کی سات آیتیں ہیں اور یہ سورہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دی گئی۔

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا آپ کے پہلو ہی میں ایک شخص اترا اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے افضل سورہ نہ بتادوں اس شخص نے کہا کیوں نہیں حضور نے فرمایا یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبداللہ بن جابر کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے بہتر سورہ نہ بتادوں یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے جابر کیا میں تجھے قرآن میں نازل شدہ سب سے اچھی سورہ نہ بتادوں، یہ سورہ فاتحہ ہے یہ ہر مرض کے لئے شفا بخش ہے۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ان سے سورہ فاتحہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ مجھ سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا سورۂ فاتحہ خزانۂ عرش کے نیچے سے نازل ہوئی ہے۔

اسی طرح ابن ضریس نے فضائل قرآن میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا اور بتایا بھی کہ اے حبیب! میں نے تمہیں سورہ فاتحہ مرحمت کی یہ میرے عرش کے خزانوں سے ہے میں نے اسے اپنے اور تمہارے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔

۷۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قوم کے اوپر یقینی وقطعی طور پر عذاب بھیجنے والا ہوتا ہے کہ اتنے میں اس قوم کا کوئی بچہ کسی مکتب میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھ دیتا ہے تو اس کی وجہ سے ان کے اوپر سے اللہ تعالیٰ چالیس سال کا عذاب ٹال دیتا ہے۔

۸۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے میں نے سورۂ فاتحہ اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے میرا بندہ جو مانگے گا اسے دیا جائیگا۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس سورہ کا نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے چنانچہ جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری حمد بیان کی پھر جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناء کی پھر جب وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری عظمت و بزرگی و کبریائی بیان کی، پھر جب وہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْن، کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے لئے نصف نصف ہے (عبادت خدائے پاک کی ہے اور استعانت وطلب بندے کا مطلوب ومقصود ہے) میرا بندہ جو مانگے گا اسے عطا کیا جائے ، پھر جب بندہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ، الخ، کہتا ہے تو اللہ عز شانہ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ سب کچھ ہے جسے وہ مانگے۔

۹۔ حضرت امام حسن یا امام حسین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار آسمانی کتابیں نازل فرمائیں پھر سو کتابوں کے علوم ان چار کتابوں تورات، انجیل، زبور اور قرآن میں رکھے پھر ان چاروں کے علوم قرآن کریم میں رکھے پھر قرآنی علوم مفصل کی سورتوں میں رکھے پھر مفصل کے علوم سورہ فاتحہ میں رکھے، اس لئے جس نے فاتحہ کی تفسیر جان لی اس نے گویا اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی سبھی آسمانی کتابوں کی تفسیر جان لی اور جس نے اس کی تلاوت کی اس نے گویا تورات، انجیل، زبور اور قرآن کی تلاوت کی ۲۔

۱۰۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر سورہ فاتحہ تورات میں ہوتی تو قوم موسیٰ یہودی نہ ہوتی اور اگر یہ انجیل میں ہوتی تو قوم عیسیٰ نصرانی نہ ہوتی اور اگر زبور میں ہوتی تو قوم داؤد پر عذاب نہ آتا جو مسلمان بھی اسے پڑھیگا اسے اللہ تعالیٰ گویا اتنا دیگا جیسے اس نے پورا قرآن پڑھا ہو۔ جیسے اس نے ہر مومن مرد وعورت کو صدقہ دیا ہو۔

۱۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے یکا یک انہوں نے اپنے اوپر ایک آواز سنی اپنا سر اٹھایا اور فرمایا آسمان کا یہ دروازہ آج سے پہلے کبھی نہ کھلا تھا اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا حضرت جبرئیل نے فرمایا یہ فرشتہ اب سے پہلے کبھی نہ اترا تھا پھر اس نے سلام پیش کرنے کے بعد عرض کیا آپ کو دو ایسے نوروں کی بشارت ہے جو آپ سے پہلے کسی اور نبی کو نہ دیئے گئے تھے ایک تو سورہ فاتحہ

اور دوسرے سورہ بقرہ کی آخری آیتیں (امن الرسول سے آخر تک) اس کا جو حرف بھی آپ پڑھیں گے وہ عطا کیا جائے گا اس کی دعائیں یقیناً مقبول ہونگی۔

۱۲۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سورہ فاتحہ وہاں کافی ہوجاتی ہے جہاں قرآن کا کوئی اور حصہ کافی نہ ہوسکے اگر ترازو کے ایک پلڑے میں سورہ فاتحہ رکھی جائے اور دوسرے پلڑے میں قرآن رکھا جائے تو سورہ فاتحہ (بلا فاتحہ) قرآن کے مقابلہ میں سات گنا وزن وفضیلت والی ہوگی۔ ایک دوسری روایت میں ہے سورہ فاتحہ دوسری سورہ کا بدل وعوض ہوسکتی ہے مگر کوئی اور سورہ اس کا بدل نہیں ہوسکتی۔

۱۳۔ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سورہ فاتحہ زہر قاتل کا علاج ہے دوسری روایت میں ہے سورہ فاتحہ ہر مرض کی دوا ہے۔

۱۴۔ حضرت عمران بن حسین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس نے کسی گھر میں سورہ فاتحہ اور آیت الکرسی پڑھ لی تو اس گھر والوں کو اس دن کسی انسان یا جن کی نظر نہ لگے گی۔

۱۵۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل تھا وہ فرماتے ہیں مدینہ کے ایک راستہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے نماز تہجد میں سورہ فاتحہ پڑھتے سنا حضور اٹھے اور آخر فاتحہ تک متوجہ ہوکر سنا پھر ارشاد فرمایا روئے زمین پر اس جیسی کوئی اور سورہ نہیں۔

۱۶۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تیس سواروں کے دستے میں (ایک مہم کے لئے) بھیجا ہم نے عرب کی ایک قوم میں منزل کی ہم نے ان سے چاہا کہ وہ ہماری مہمان نوازی کریں انہوں نے اس سے انکار کردیا، ان کے سردار کو بچھو نے ڈنک مار دیا لوگ ہمارے پاس آئے اور انہوں نے پوچھا کیا تم میں کوئی بچھو کا ڈنک مارا جھاڑ سکتا ہے میں نے کہا ہاں میں ہی ہوں مگر یہ کام یونہی نہ کرونگا بلکہ تمہیں کچھ دینا ہوگا انہوں نے کہا ہم آپ لوگوں کو تیس بکریاں دیں گے۔ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ میں نے اس ڈسے ہوئے حصہ پر سات بار سورہ فاتحہ پڑھ دی اور وہ ٹھیک ہوگیا ہم نے جب بکریاں لے لیں ہمارے دل میں اس سے خدشہ گذرا (کہ یہ جائز بھی ہے یا نہیں) اس لئے تصرف کرنے سے ہم نے توقف کیا جب ہم نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے حضور سے ہم نے اس کا ذکر کیا حضور نے فرمایا کیا تمہیں خبر نہیں یہ جھاڑ پھونک ہے اپنے ساتھ میرا حصہ بھی لگاؤ۔

استخراج مسئلہ: اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ بچھو وغیرہ موذی جانور کے ڈنک کا علاج ہے۔ نیز سورہ قرآن سے علاج کرنا طریق صحابہ ہے پھر اس پر عوض لینا بھی درست ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے اپنا حصہ مقرر کرنے کا حکم دیکر جہاں ان صحابہ کے دلوں کے خدشہ کو دور فرمایا وہیں جواز اجرت پر مہر تصدیق بھی ثبت فرمادی یہی وجہ ہے کہ حضرات ائمہ کرام کے نزدیک بھی جھاڑ پھونک کی اجرت بقصد علاج جائز ہے۔

(۱۷) دوسری روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرات صحابہ کی ایک جماعت ایک گھاٹ سے گذری وہاں ایک شخص تھا جسے بچھو نے ڈنک مار دیا تھا گھاٹ والوں میں سے ایک آدمی ان کے پاس آیا اس نے کہا آپ لوگوں میں کوئی آدمی جھاڑ پھونک جانتا ہے اس گھاٹ پر بچھو یا سانپ کا ڈسا ایک آدمی ہے ان حضرات میں سے ایک آدمی گئے اور بکریوں کے عوض انہوں نے فاتحہ پڑھی وہ آدمی ٹھیک ہوگیا وہ صاحب بکریاں لیکر اپنے ساتھیوں میں آئے ان حضرات نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تم نے اللہ کی کتاب کی اجرت اور عوض لے لیا وہ حضرات مدینہ پہنچے انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے اللہ کی کتاب پر اجرت لی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جن جن چیزوں میں تم نے اجرت دی ہے ان میں کتاب اللہ کا حق سب سے زیادہ ہے۔

(۱۸) حضرت خارجہ بن صلت تمیمی رضی اللہ عنہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے چچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے پھر آپ کے پاس سے واپس آرہے تھے کہ انکا گذر ایسے لوگوں کے یہاں سے ہوا جن کے پاس ایک دیوانہ لوہے میں جکڑا ہوا تھا اس کے اہل خانہ نے کہا کیا تمہارے پاس اس کا کوئی علاج ہے اس لئے کہ آپ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہترین چیز لیکر آئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں میں نے تین دن ان پر سورہ فاتحہ پڑھی صبح وشام دوبارہ پڑھتا اپنا تھوک جمع کرتا پھر تھوکتا اس عمل سے وہ ٹھیک ہوگیا ان لوگوں نے مجھے سو بکریاں دیں میں نے اس کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ تو وہ ہیں جو غلط اور باطل جھاڑ پھونک سے کھاتے ہیں لیکن تم نے تو حق جھاڑ پھونک سے کھایا اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

(۱۹) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم نے سونے کے لئے اپنا پہلو بستر پر رکھا اور سورہ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھ لیا تو پھر موت کے علاوہ ہر چیز سے تم کو امان مل گئی۔

(۲۰) حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابلیس چار بار پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ جب وہ مردود بارگاہ ہوا جب زمین پر پھینکا گیا، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور جب سورہ فاتحہ نازل ہوئی۔ ابن ضریس

نے فضائل القرآن میں، حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نازل ہوئی ابلیس کو بہت شاق گذرا اور زار زار رویا خوب خوب چیخا، ابن ضریس ہی سے عبدالعزیز بن ربیع نے نقل کیا ہے جب فاتحہ کتاب نازل ہوئی ابلیس اس دن کی طرح زار زار رویا جس دن اسے ملعون کیا گیا۔

(۲۱) ابوالشیخ نے ''الثواب'' میں حضرت عطا سے روایت کیا انہوں نے فرمایا کہ جب تمہیں کوئی ضرورت ہو تو سورہ فاتحہ پڑھو اور مکمل پڑھو انشاء اللہ ضرورت پوری ہوگی۔

(۲۲) حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا سورہ فاتحہ شروع ہوتے وقت جو حاضر ہوا گویا راہ خدا کی ایک فتح میں حاضر ہوا اور جو اس کے ختم کئے جانے تک موجود رہا گویا وہ مال غنیمت تقسیم کئے جانے تک موجود رہا۔

(۲۳) مروی ہے کہ جب اس سورہ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں لائے تو اس وقت سات ہزار فرشتے تھے۔

(۲۴) نیز مروی ہے کہ شام سے ایک قافلہ ابوجہل کے لئے بہت سا مال لے کر آیا، یہ قافلہ سات گروہ پر مشتمل تھا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اس قافلہ کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اکثر صحابہ غریب تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر صحابہ کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احساس فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کو نازل کیا اور فرمایا ''وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' ابوجہل کے ہر قافلہ کے عوض آپ کو فاتحہ عطا فرمائی۔ پس باوجود آپ کے اس بڑے عطیہ کے، ابوجہل آپ کے عطیہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تو آپ بھی اس کی دنیائے کمینہ کو نظر انداز فرمائیے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو دیکھی جو کہ صرف صحابہ کے لئے تھی نہ کہ اپنے لئے تو ارشاد فرمایا اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! غم نہ کھائیے اس سورہ کی برکت و نفع، مال کے نفع سے بہت زائد ہے۔ پس آپ اپنے صحابہ کے لئے اپنے بازو بچھا دیجئے کیونکہ آپ کا تواضع کرنا ان کے لئے ان کی آرزو پوری ہوجانے سے بہت مرغوب ہے۔ (روح البیان)

(۲۵) حکم بن عمیر سے مروی ہے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل تھی، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' کہا تو تحقیق کہ تم نے اللہ کا شکر ادا کرلیا پس وہ تمہیں بڑھا کر دیگا۔ (طبری)

۹۲/۷۸۶

علوم سورہ فاتحہ کا اجمالی بیان

بیشک سورہ فاتحہ قرآن حکیم کی ایسی باعظمت سورہ مبارکہ ہے جس کی مثال کسی بھی آسمانی کتابوں میں نہیں ملتی خالق کائنات نے اس سورہ مبارکہ میں علوم وفنون، رموز واسرار، لطائف وحکم اور نکات وحقائق کا ایک ناپیدا کنار سمندر رواں فرمادیا ہے علمائے مفسرین نے علوم واسرار کے اس بحر ذخار سے ہزارہا موتیاں نکالے ہیں جو تفسیر قرآن اور علوم قرآن کی مبسوط کتابوں میں آب زر سے مکتوب ہیں۔صرف (اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم) کی طرف جب ہم دقت نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تعوذ کے اس چند لفظ میں مالک ارض وسماء نے ہزارہا فوائد ودیعت فرمادی ہے۔ چونکہ اسکا معنی ہے کہ اے اللہ! ہم شیطان رجیم سے تیری پناہ مانگتے ہیں ظاہر ہے کہ شیطان مردود سے خدا کی پناہ مانگنا تمام منہیات ومحظورات سے بچنے کیلئے ہے اور منہیات ومحظورات یا تو از قبیل اعتقادیات ہوں گے یا از قبیل عملیات ہونگے۔اگر اعتقادات کے متعلق ہیں تو اس کے بارے میں خبر مشہور وارد ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" ستفترق امتی علیٰ ثلاث و سبعین فرقة کلهم فی النار الا فرقة واحدة" یعنی میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی سب جہنم میں ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے۔ یہ حدیث پاک دلالت کررہی ہے کہ تہتر فرقوں میں سے بہتر فرقے عقائد فاسدہ اور مذاہب باطلہ پر ہونگے، پھر ان فرقوں میں سے ہر ایک کی ضلالت و گمرہی اور ان کی بدعقیدگی کسی ایک مسئلہ سے متعلق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اس کے احکام وافعال اور اسماء، مسائل جبر وقدر، عقائد تعدیل وتجویر، مدار ثواب وعقاب ومبداء ومعاد، وعد ووعید، اور اسماء، احکام اور امامت وغیرہا سے متعلق ہزارہا ہزار مسائل وعقائد سے متعلق ہیں۔ پس جب ہم ان بہتر گمراہ فرقوں کے مذکورہ تمام عقائد ومسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو ان بہتروں کے جملہ عقائد فاسدہ اور احکام باطلہ کی تفصیل بڑے ضخیم دفتر کو پہنچتی ہے جو سب امت مسلمہ کے باطل اور گمراہ فرقوں میں پائی جانے والی گمراہیوں کے انواع واقسام ہیں۔علاوہ ازیں یہ بھی مشہور ہے کہ اس امت سے خارج گمراہ اور باطل فرقوں کی تعداد سات سو کے قریب ہے پس جب اس امت سے خارج فرقوں کے ضلالات وظلمات کے اقسام وانواع کو، اس امت میں موجود فرقوں کی ضلالات کے ساتھ جو الہیات اور ذات وصفات کے متعلق عقائد واحکام ہیں ان سب کو ضم کردیا جائے تو ان سب کا یہ مجموعہ ضلالات وگمراہی کا ایک بڑا پہاڑ بنکر کھڑا ہوجائے گا مگر ایک بندہ کے لفظ "اعوذ باللہ" کہنے نے ان سب انواع واقسام کی گمرہی ہزارہا ہزار ضلالات اور

فاسد عقائد کے کوہ گراں کو یک لخت خس وخاشاک کی طرح بہالے گیا۔ چنانچہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کسی شئ سے استعاذہ یا برائی وگناہ سے خدا کی پناہ طلبی اسی وقت ممکن ہے جب اس شئ مستعاذ منہ یا اس گناہ کی معرفت اور اسکا علم بھی ہو۔ حاصل یہ کہ بندۂ مومن کا اعوذ باللہ کہنا ہزار ہا ہزار مسائل یقینیہ اعتقادیہ پر مشتمل ہے جب اعتقادیات ونظریات کی اتنی بھاری مقدار ہے تو ان گمراہ فرقوں کے عملیات فاسدہ وفرعیات باطلہ کا کوئی کیوں کر اندازہ کرسکتا ہے خیال رہے کہ اعمال باطلہ ہر اس عمل کو کہیں گے جس کے سلسلہ میں نہی وارد ہوئی ہے اب خواہ یہ نہی قرآن حکیم یا اخبار متواترہ میں وارد ہو یا اخبار آحاد وقیاسات صحیحہ سے ممانعت ثابت ہو خواہ اجماع امت نے بالاتفاق کسی عمل پر ممانعت کا حکم لگا دیا ہو گویا کہ اصول اربعہ قرآن حدیث اجماع اور قیاس سے ثابت شدہ منہیات کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے مگر ہمارا "**اعوذ باللہ**" کہنا ہزاروں ہزار اعمال فاسدہ، وعقائد باطلہ کو نہ یہ کہ صرف شامل ہے بلکہ ان سب گمراہ فرقوں کے فاسد عقائد و نظریات اور ہمارے تمام فاسد وکاسد نظریات ومعمولات سے استعاذہ کا حکم بھی ہے۔ غرضیکہ ان سب سے یہ امر اظہر من الشّمس ہوتا ہے کہ صرف کلمہ "**اعوذ باللہ**" لاکھوں عقائد باطلہ ومسائل فاسدہ پر اور ان سے استعاذہ پر مشتمل ہے۔

اسی طرح رب تعالیٰ کا ارشاد 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' بھی ہزار ہا ہزار مسائل وفوائد پر مشتمل ہے چنانچہ اس کے لئے صرف دو نوع کی بحث ہی دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں علوم ومسائل کے کتنے ان گنت اشارے ہیں۔

پہلی بحث: مابین العلماء مشہور ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کے ایک ہزار ایک اسمائے مبارکہ مقدسہ مطہرہ ہیں جو قرآن وحدیث میں صراحتاً وضمناً جا بجا موجود ہیں۔ ان اسماء مقدسہ الٰہیہ میں سے ہر ایک سے بحث کرنا نہایت ہی باعظمت اور معرکۃ الآراء مسئلہ ہے پھر کسی اسم الٰہی کا علم بغیر علم مسمیٰ کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ پس ان مسمیات کے ثبوت سے بحث کرنا، اور ان دلائل سے بحث کرنا جو ان مسمیات کے ثبوت پر دلالت کرتے ہیں اور پھر ان شبہات اور ان کے جوابوں سے بحث کرنا جو ان اسماء ومسمیات کی نفی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ایک عظیم دفتر چاہتا ہے غرض ان ساری بحثوں کی تعداد کا مجموعہ ہزار ہا ہزار مسائل سے زیادہ ہے۔

دوسری بحث: بسم اللہ الرحمن الرحیم کی "با" سے متعلق ہے وہ یہ کہ "با" الصاق کے لئے ہے اور فعل سے متعلق ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے "بسم اللہ اشرع فی اداء الطاعات" اور جب تقدیر عبارت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ "بسم اللہ اشرع" الخ کا معنی کامل طور پر اس وقت تک مفہوم نہیں ہوسکتا جب تک کہ طاعات

کی تمام قسموں پر آگاہی نہ ہوجائے اور طاعات کی جملہ اقسام میں عقائد حقہ اوران کے دلائل و براہین اور اعمال صالحہ مع دلائل و بینات سب شامل ہیں نیز عقائد حقہ اور اعمال صالحہ پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات وشبہات اور پھران کے جوابات مندرج ہوں گے اگران سب طاعات کی تفصیل کی جائے تو لاکھوں کی تعداد سے زائد مسائل منقح ہوجائیں گے۔

نکتہ: یہاں یہ نکتہ ذہن نشیں رہے کہ ''اعوذ باللہ'' سے عقائد باطلہ اور اعمال سیئہ کی نفی کی طرف اشارہ ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ''بسم اللہ'' سے تمام اعتقادات حقہ اور عملیات صالحہ کی طرف اشارہ ہے اور جب ایسا ہے تو بسم اللہ کا مفہوم کامل طور پر نہیں معلوم ہوسکتا جب تک کہ تمام عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کا علم نہ حاصل ہو چونکہ علم موقوف کے لئے موقوف علیہ کے علم کا ضروری ہونا ایک ایسا امر ہے جس پر عقل صحیح اور حق صریح شاہد ہے۔

جب تعوذ وتسمیہ میں مخفی معلومات ومسائل اس قدر ہیں کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تو پھر الحمد للہ میں کتنے مسائل واحکام اور فوائد ومعلومات کے خزانے پوشیدہ ہوں گے اندازہ کیا جاسکتا ہے پس ارشاد باری تعالیٰ ''الحمد للہ'' میں بھی ہزاروں علوم سمائے ہیں۔ وہ اس طرح کہ حمد ہوتی ہے نعمت پر بھی، اور نعمت پر حمد ممکن نہیں جب تک کہ ان نعمتوں کا تصور اور اس کی معرفت حاصل نہ ہو اور نعمت الہیہ اتنی ہیں کہ طاقت بشریہ وملکیہ کے شمار سے باہر ہیں کوئی اس کی نعمتوں کو شمار کرہی نہیں سکتا جیسا کہ اللہ عز شانہ کا ارشاد ہے وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (نحل ۱۸) یعنی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو تم اسے شمار نہیں کرسکتے۔

ایک ہی مثال کو دیکھیں تو اس کی نعمتوں کا اندازہ ہوگا وہ مثال خود انسان عاقل کی ذات ہے وہ اپنی ذات میں غور و خوض کرتا ہے تو پاتا ہے کہ خود اس کی ذات دو جز، نفس اور بدن سے مرکب ہے اور ان دو جزؤں میں بدن فضیلت و منفعت کے اعتبار سے بہ نسبت نفس کے اقل وادون ہے۔ اور بدن کے بارے میں اصحاب تشریح نے تقریبا ان پانچ ہزار مصالح ومنافع کا ذکر کیا جنکو اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے بدن انسانی کی تخلیق میں مدبر فرمایا ہے چنانچہ کتب تشریح میں مذکورہ منافع ومصالح بدن پر جو آگاہ ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ مصالح بدن کے بارے میں اسکو جو معلومات ہیں وہ ان مصالح سے بہت کم ہیں جو اب تک اس کو معلوم نہیں ہیں یا جو مصالح ومنافع کتب تشریح میں مذکور نہیں ہیں کہ جو مذکور ومعلوم ہیں اس کی حیثیت بحر محیط کے ایک قطرہ کی سی ہے پس اس وقت یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ صرف ایک مثال بدن انسانی کی تخلیق میں اللہ رحمن ورحیم کی حکمت کے اقسام دسیوں ہزار بلکہ زائد مسائل پر مشتمل ہیں۔

ان تمام مسائل کے ساتھ، عرش وکرسی، آسمان وزمین کے طبقات افلاک ونجوم، اجرام نیرات، ثوابت وسیارات کی

تخلیقات میں نیز ان میں سے ہر ایک کو مخصوص مقدار اور مخصوص وغیر مخصوص رنگوں کے ساتھ تخصیص فرمانے اور مزین و آراستہ کرنے میں اللہ عز شانہ تعالیٰ کی حکمتوں کے سارے آثار کو مجتمع کر دیا جائے علاوہ ازیں تمام جمادات، نباتات اور حیوانات کے اجناس و انواع اور ان کے اصول و فروع کی تخلیق میں اور ان سب کے اصناف و احوال اور سب کے متمیز آثار کی پیدائش میں رب تعالیٰ کی بے پایاں قدرت اور حیرت انگیز حکمتوں کے مسائل کو اکٹھا کر دیا جائے تو ان سب مسائل کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے اور یہ معلوم ہے کہ اللہ عز شانہ نے مخلوقات میں سے اکثر کو انسان اشرف المخلوقات کی منفعت کے لئے پیدا فرمایا ہے چنانچہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ ۱۳) اور تمہارے لئے کام میں لگائے جو کچھ آسمان میں ہیں اور جو کچھ زمین میں اپنے حکم سے بیشک اس میں نشانیاں ہیں سوچنے والوں کے لئے۔

پس اس وقت یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ آیت کریمہ الحمدللہ، ہزاروں ہزار مسائل پر مشتمل ہے اب ذیل میں ارشاد باری تعالیٰ ''رب العٰلمین'' کے معانی کا جلوہ ملاحظہ کیجئے کہ خالق کائنات کے اس نظم مبارک میں علوم و معانی کا کیسا عمیق اور ناپیدا کنار سمندر موجزن ہے۔ (رب العٰلمین) ابتدائی عربی گرامر پڑھنے والے طلبہ بھی جانتے ہیں کہ نحوی اعتبار سے لفظ ''رب'' مضاف ہے اور ''عالمین'' مضاف الیہ ہے اور یہ بھی معلوم کہ جب شی کی اضافت کسی دوسری شی کی طرف ہوتی ہے تو اس اضافت کا کامل علم اسی وقت ممکن اور صحیح ہو سکتا ہے جبکہ متضایفین میں سے ہر ایک کا علم ہو بغیر متضایفین کے علم کے اضافت کی معرفت ممتنع ہوتی ہے اس لئے اللہ عز شانہ کے رب العٰلمین ہونے کا علم اسی وقت ہو سکتا ہے جب رب العٰلمین کی معرفت حاصل ہو جائے پس اس کے لئے پہلے ''عالمین'' کو جاننا ہوگا کہ یہ عالم کی جمع ہے اور عالم نام ہے ہر اس شئی کا جو موجود ہو سوائے اللہ کے، اور اس موجودات کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) متحیزات، (۲) مفارقات (۳) صفات

پھر متحیزات دو قسموں میں منحصر ہیں (۱) بسائط، (۲) مرکبات

پھر بسائط میں افلاک، کواکب اور امہات آتے ہیں اور مرکبات موالید ثلٰثہ (حیوانات، نباتات و جمادات) کہلاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ جسم انہیں تین قسموں پر منحصر نہیں ہے چونکہ جسم کی تین ہی قسم ہونے پر کوئی مستحکم دلیل قائم نہیں چنانچہ یہ بات دلیل سے ثابت ہے کہ اس عالم رنگ و بو سے خارج خلاء کا ایک غیر متناہی سلسلہ ہے نیز یہ بھی قطعی و یقینی ہے کہ اللہ عز شانہ تمام ممکنات پر قادر ہے اس لئے وہ اس عالم کے علاوہ لاکھوں لاکھ ایسا ہی

عالم بلکہ اس سے بھی زیادہ عظیم وجسیم اور حسین ومستحکم پیدا فرمادینے پر قادر ہے جن سب میں اسی عالم کی طرح عرش وکرسی کا جلوہ کہکشاں کا جمال ستاروں کی انجمن اور نجوم وثوابت کی تزئین کاری سبھی بدرجہ اتم ہوں آسمان کے تمام طبقات، زمین کے درجات اور شمس وقمر کی تابانی ودرخشانی، ضوباری اور ضیاء باشی، سبھی ہوں، شرعاً اس میں کوئی استحالہ نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالیشان ہے اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خلق السمٰوتِ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْیَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ۚ وَ هُوَالْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (یٰس ۸۱) اور کیا وہ جس نے آسمان اور زمین بنائے ان جیسے اور نہیں بنا سکتا! کیوں نہیں اور وہی بڑا پیدا کرنے والا سب کچھ جانتا۔ رہے فلاسفہ کے خیالات کہ عالم صرف ایک ہی ہے تو اس کی دلیلیں نہایت ضعیف اور کمزور ہیں جن کی بنیاد مقدمات واہیہ پر قائم ہیں۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے عربی شاعر ابو العلاء المعری نے کہا ہے۔

یا ایھا الناس کم للہ من فلک ۔ تجری النجوم بہ والشمس والقمر

ھین علی اللہ ما ضینا و غابرنا ۔ فمالنا فی نوا حی غیرہ خطر

اور یہ بات اہل علم وتحقیق پر پوشیدہ نہیں کہ صرف متحیزات کی جو قسمیں بیان ہوئی ہیں ان کی تفصیلات لاکھوں لاکھ مسائل میں ہوسکتی ہیں۔ بلکہ انسان ان تمام تفاصیل سے صرف نظر کرکے چاہے کہ اس کا علم پہاڑوں کے بطن میں قسم قسم کے عجیب وغریب موجود معدنیات، فلزات، رنگ برنگ کے پتھر، انواع واقسام کے کبریت زرنیخ اور نمکوں کا احاطہ کرے، یونہی نباتات کے مختلف احوال اور اس کے ازہار واوراق اور انوار وثمار کا جائزہ لے، نیز تمام قسموں کے حیوانات میں تمام بہائم وحوش اور طیور وحشرات الارض کی تمام اجناس وانواع پھر ان کے سارے افراد اور اس کی تخلیقات کے عجائبات کو جاننا چاہے تو اس کی عمر تو تمام ہوجائے گی مگر ان کے حقائق وعجائبات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (لقمان ۲۷) اور اگر زمین میں جتنے پیڑ ہیں سب قلمیں ہوجائیں اور سمندر اس کی سیاہی ہو اس کے پیچھے سات سمندر اور تو، اللہ کی باتیں ختم نہ ہونگی بیشک اللہ عزت وحکمت والا ہے۔ یہ سب کے سب اللہ عز شانہ تعالیٰ کے ارشاد "رب العٰلمین" میں داخل ہیں۔

رہا ارشاد باری تعالیٰ 'الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ' تو جان لو کہ اس میں بھی سابقہ آیات کی طرح ہزار ہا ہزار مسائل مضمر ہیں۔ وہ اس طرح کہ رحمت، آفات کی تمام قسموں سے چھٹکارا دلانے اور ضرورتمندوں تک خیرات وبھلائیاں پہنچانے

کا نام ہے اور آفات کی تمام قسموں سے چھٹکارا دلانے کی صورتوں کا علم جبھی ہوسکتا ہے کہ تمام آفات کو جان لے اور آفات کی تعداد اس کثرت سے ہے کہ ان سب کو جاننا ممکن نہیں تھوڑا بہت جو جاننا چاہے اسے علم طب کی کتابوں کو پڑھنا چاہئے تا کہ اس کی عقل قسم قسم کی ان بیماریوں کو جان سکے جو اجزاء و اعضاء میں پیدا ہو سکتے ہیں پھر یہ بھی غور کرے کہ اللہ رحمن و رحیم نے عقل انسانی کی معدنیات اور نباتات و حیوانات میں سے قسم قسم کی غذاؤں اور دواؤں کی طرف کیسے راہنمائی فرمائی جب بندہ صرف اس بات کی تمام سمتوں میں غور کرتا ہے تو پاتا ہے کہ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں چنانچہ یہ حکایت بیان کی گئی ہے کہ حکیم جالینوس نے جب اپنی کتاب ''منافع اعضاء العین'' تصنیف کی تو انہوں نے کہا کہ آنکھ کے دو جوف دار پٹھے جو ایک دوسرے سے ایک جگہ پر جب ملتے ہیں تو ان دونوں کا ایک ملتقٰی پر ملنے میں خالق کائنات کی جو حکمتیں مضمر ہیں ان کو میں نے بیان کرنے میں لوگوں پر بخل سے کام لیا ہے۔ پس میں نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ آسمان سے اترا ہے اور اس نے کہا اے جالینوس! تیرے رب کا فرمان ہے کہ میری حکمتوں کے بیان کرنے میں میرے بندوں پر تو نے بخل کیوں کیا پس میں بیدار ہوا اور اس بارے میں ایک مبسوط کتاب تصنیف کی۔

نیز اس نے یہ بھی کہا کہ میری طحال (تلی) موٹی ہوگئی تھی میں نے اپنے علم کے مطابق ہر طرح سے اسکا علاج کیا لیکن فائدہ نہ ہوا پس میں نے ہیکل میں ایک فرشتہ کو دیکھا کہ وہ آسمان سے اترا ہے اس نے حکم دیا کہ خنصر اور بنصر کے درمیان کی جو رگ ہے اس کی فصد کرا لو غرض کہ طب کے علامات و اسباب اور معالجات و ادویات سب الہامات الہیہ سے ہیں لہٰذا جو کوئی ان جیسی بحثوں پر مطلع ہوتا ہے وہ یقین سے کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس کے بندوں پر حد و شمار سے باہر ہیں۔

رہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' پس اس میں بھی علوم و مسائل کا دریا رواں ہے ۔یقین کیجئے کہ انسان اس دنیا میں مسافر کی طرح ہے، اور اس کا سال فرسخ کی طرح ہے، اس کے مہینے میلوں کی طرح ہیں، اس کی سانس نقش قدم کی طرح ہے اور اس کا مقصد عالم آخر کی طرف پہنچنا ہے تا کہ وہ وہاں کی باقیات صالحات سے لطف اندوز ہو سکے۔ جب آدمی آسمان و زمین کی بادشاہت میں قسم قسم کے عجائبات کا اس کے راستہ میں مشاہدہ کرتا ہے تو اس کو غور کرنا چاہئے کہ عالم آخرت کے احوال کے عجائبات کا بہجت و دلکشی اور سرور و شادمانی میں کیسا حسین و جمیل منظر ہوگا۔ اس تمہیدی گفتگو کے بعد یہ جان لیجئے کہ ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' میں معاد اور حشر و نشر کے تمام مسائل کی طرف اشارہ ہے۔ اور مسائل معاد یا احکام حشر و نشر دو طرح کے ہیں بعض عقلیہ محضہ ہیں اور بعض سمعیہ ہیں۔ رہے عقلیہ تو جیسے ہمارا قول کہ اس عالم کی

تخریب واعدام ممکن ہے پھر باردگر اسکا اعادہ بھی ممکن ہے اسی طرح انسان کے مرنے کے بعد اس کا بھی اعادہ ممکن ہے اس طرح بحث قیامت کا یہ باب اسی وقت تام ہوسکتا ہے جب جوہر نفس کی حقیقت، اس کے احوال وصفات کی کیفیات، بدن کے بعد اس کے بقا کی کیفیت، اس کی سعادت وشقاوت کی کیفیت اور اس کے اعادہ پر اللہ عز شانہ کی قدرت کو بیان کیا جائے غرض کہ یہ بحث اس وقت تک تام نہیں ہوسکتی جب تک کم ازکم پانچ سو دقیق عقلی مسائل نہ بیان کئے جائیں۔

رہے سمعیہ مسائل تو وہ تین قسموں پر ہیں ایک وہ احوال جو قبل وقوع قیامت پائے جائیں گے اور وہ علامات ہیں جن میں بعض صغیرہ اور بعض کبیرہ ہیں اور وہ دس علامات ہیں جو اپنی جگہ میں مذکور ہیں۔ دوسرے وہ احوال جو قیام قیامت کے وقت پائے جائیں گے اور وہ صور پھونکنے کی کیفیت، خلائق کی موت، آسمانوں اور ستاروں وغیرہا کی تخریب اور تمام روحانیین وجسمانیین کی موت وغیرہ ہیں۔ تیسرے وہ احوال ہیں جو قیام قیامت کے بعد پائے جائیں گے۔ اہل قیامت کے احوال کی اور تفصیلات ہیں جو بیشمار ہیں جن میں مخلوق کے وقوف کی کیفیت اور ان احوال کی کیفیت ہے جن کا مخلوقات مشاہدہ کریں گے، نیز ملائکہ وانبیا علیہم السلام کا بارگاہ رب العلی میں حضور کی کیفیت، حساب و کتاب کی کیفیت، وزن اعمال کی کیفیت، نیک گروہ کے جنت میں جانے کی کیفیت اور بدبخت گروہ کے جہنم میں جانے کی حالت پھر جنتیوں کی صفت حسن کی کیفیت اور جہنمیوں کی حالت بد کی کیفیت، پھر ان کلمات کی شرح جنکا وہ تکلم کریں گے، اور وہ اعمال جو وہ روز قیامت کریں گے اس طرح عقلی ونقلی تمام مسائل قیامت کی تعداد ہزاروں کی شرح کو پہنچ جاتی ہیں جب کہ یہ سارے مسائل صرف ارشاد باری تعالیٰ "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں داخل ہیں۔

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" گذشتہ تمام آیات سورہ فاتحہ کی طرح یہ آیت مبارکہ بھی علوم ومسائل کے ایسے دریائے غیر محیط پر مشتمل ہے جس تک عقول وافکار کی رسائی دشوار ہے۔ بایں طور کہ یہ آیت عبادت الٰہیہ سے متعلق ہے اور عبادت، آمر کے فعل مامور بہ کو بطور تعظیم بجالانے کو کہتے ہیں جب عبادت آمر کے کمال تعظیم بجالانے کا نام ہے تو یہ سب سے پہلے دلیل سے اس کا ثبوت چاہتا ہے کہ اس عالم کے لئے ایک معبود ہے جو قادر ہے مقدورات غیر متناہیہ پر، عالم ہے معلومات غیر متناہیہ کا جو تمام حاجات سے بے نیاز ہے اور اسی معبود علیم وقدیر احد وصمد نے اپنے بندوں کو بعض چیزوں کے کرنے کا اور بعض چیزوں کے نہ کرنے کا حکم دیا ہے پس بیشک تمام مخلوقات پر اس کی اطاعت اور اس کے تکالیف کی فرماں برداری لازم ہے مگر تکالیف الٰہیہ کی بجا آوری ممکن ہی نہیں جب تک کہ ان تکالیف کی تمام قسموں کی تفصیل اور ان تمام اوامر ونواہی کے انواع واقسام کا مکمل واضح بیان نہ ہوجائے چنانچہ اہل اسلام نے مسائل دینیہ میں

باب فقہیات کے بیان میں جو مبسوط کتابیں تصنیف فرمائی ہیں وہ سب تکالیف الہیہ پر مشتمل ہیں پھر اس میں اس شریعت کے تکالیف جس طرح داخل ہیں اسی طرح اس میں وہ تکالیف بھی داخل ہیں جو انبیاے سابقین پر ان کی شریعتوں میں منجانب اللہ نازل ہوئے بلکہ اس میں وہ تمام تکالیف بھی داخل ہیں جن کا اللہ عزشانہ نے اپنے ملائکہ کو ان کی پیدائش کے وقت سے لیکر آخر تک عبادات وریاضات اور اطاعت اوامر میں مشغول رہنے کا مکلف بنایا ہے۔ علاوہ ازیں تکالیف دوطرح کے ہیں ایک وہ جنکا تعلق اعمال جوارح سے ہے جن کے بیان سے فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں دوسرے وہ تکالیف جن کا تعلق اعمال قلب سے ہے یہ اول سے زیادہ اہم بزرگ و برتر ہے جس پر مختلف مذاہب وادیان اور مختلف ملت وامت کے اعتبار سے اخلاقیات وسیاسیات کی کتابیں مشتمل ہیں جب انسان ان تمام مسائل و علوم کے مجموعہ مباحث کا احاطہ کرے اور سمجھے کہ وہ سب ارشاد باری تعالیٰ ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' کے تحت داخل ہے تو وہ شک نہیں کرسکتا کہ یہ آیت علوم ومسائل کے دریاے ناپیدا کنار پر مشتمل ہے

اب ذیل میں ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کے علوم کی جلوہ سامانیاں دیکھیں۔

ارشاد ہے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' یہ ظاہر ہے کہ اس میں طلب ہدایت مقصود ہے اور ہدایت کی تحصیل کے دوطریقے ہیں ایک دلیل وحجت سے معرفت الہ کا طلب کرنا، دوسرا تصفیہ باطن اور ریاضت ومجاہدہ شاقہ کے ذریعہ معرفت کا حصول اول یعنی دلیل وحجت کے ذریعہ معرفت کا حصول تو یاد رہے کہ رب تعالیٰ کے وجود اس کی وحدانیت اور ربوبیت پر دلالت کرنے والی دلیلیں بے شمار غیر متناہی ہیں کہ عالم علوی اور عالم سفلی کے ذرات میں سے کوئی ایسا ذرہ نہیں مگر یہ کہ وہ اس کی کمال الوہیت، عزت وجلالت اور صمدیت پر روشن دلیل ہے کسی شاعر نے کہا۔

وفی کل شئی لہ آیۃٌ ۔تدل علی انہ واحدٌ:

اس کی تقریر اس طرح کی جاتی ہے: کہ اجسام عالم سب ماہیت وجسمیت میں متساوی ہیں البتہ صفات کے اعتبار سے مختلف اور متمایز ہیں اور صفات وہ الوان وامکنہ اور ان کے احوال ہوتے ہیں اور یہ متحقق ہے کہ ہر جسم کا ایک خاص صفت کے ساتھ مختص ہونا جسمیت یا لوازم جسمیت کی وجہ سے نہیں ہوسکتا ورنہ ہر جسم کا متساوی ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے اس لئے واجب وضروری ہے کہ جسم کو کسی نہ کسی صفت کے ساتھ مخصوص فرمانے والا کوئی مخصص ومدبر موجود ہو پھر یہ مخصص ومدبر از قبیل جسم نہیں ہوسکتا ورنہ وہ کسی نہ کسی صفت کے ساتھ مختص ہوگا تو کلام پھر اس مخصص کی جسم وجسمانیت پر جاری ہوگا اس لئے وہ مخصص جسم نہیں ہوسکتا بلکہ غیر جسم ہوگا یہی ہمارا مطلوب ہے۔ پھر اس مخصص ومدبر کا حی وقادر اور

عالم ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر حی و عالم وقادر نہ ہو بلکہ اس کی تاثیر تمام اجسام پر فیض وطبع کی وجہ سے ہوتو پھر وہی الزام آئے گا کہ تمام اجسام متساوی ہوجائیں گے اور تمام اجسام کا متساوی ہونا باطل اس لئے اس کا حی و عالم وقادر ہونا ثابت ہوا۔ اور یہی مطلوب ہے پس ظاہر ہوگیا کہ آسمان وزمین کا ہر ذرہ، اللہ قادر علیم وحکیم کے وجود، الوہیت، علم وقدرت پر شاہد وصادق، مخبر، ناطق اور بین دلیل ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ امام ضیاء الدین عمر، والد گرامی حضرت امام رازی فرماتے تھے کہ ہر جوہر فرد میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت اور رحمت پر دلالت کرنے والی ان گنت دلیلیں موجود ہیں وہ اس طرح کہ ہر جوہر فرد اس کا وقوع علی سبیل البدلیت غیر متناہی حیزوں میں ممکن ہے نیز اس کا صفات غیر متناہیہ سے متصف ہونا بھی ممکن ہے اور جب اس جوہر فرد کا احیاز غیر متناہیہ میں واقع ہونا اور احوال وصفات غیر متناہیہ سے متصف ہونا ممکن ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقوع واتصاف میں ضرور ایک صانع قادر حکیم وعلیم کے وجود کی طرف محتاج ہوگا غرض عالمین میں سے جب صرف ایک جوہر فرد سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک صانع حکیم علیم وقدیر معبود ہے تو عالم کے ذرات غیر متناہیہ کا کیا کہنا، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی الوہیت وحدانیت اور قدرت وحکمت کی بزبان حال وقال ہر لمحہ تسبیح پڑھ رہا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (الاسرا/44)

رہی دوسری صورت یعنی ہدایت کا حصول بطریق ریاضت وتصفیہ باطن پس وہ تو ایک ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں جو سالک وسائر الی اللہ کا ایک خاص منہج ومعین مشرب ہے جیسا کہ ارشاد ہے ''لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا'' (البقرۃ/148) ان سرار ومعارف پر عقلیں آگاہ نہیں، ان انوار کے میدانوں میں افہام واذہان کا گذر نہیں صرف عارفین محققین اصحاب قوت قدسیہ کی ہی وہاں تک رسائی ہوسکتی ہے چنانچہ وہ حضرات نفوس قدسیہ اس میں ایسی عمیق بحثوں اور دقیق اسرار ورموز کا جلوہ ملاحظہ فرماتے ہیں جن پر نا بالغان معرفت کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اب اس سورہ مبارکہ کی آخری آیت پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالیں کہ اس میں بھی علوم وادراکات اور مسائل واحکام کے کیسے کیسے جواہر پارے مخفی ہیں۔ وہ آیت مبارکہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' ہے۔

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کے راستہ کو اختیار کرنے کی ہدایت ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام واکرام ہوا ہے اور ان لوگوں کے راستہ سے دور ونفور رہنے کی ہدایت ہے جن پر غضب الٰہی نازل ہوا یا وہ جادۂ مستقیم سے بہکے ہوئے ہیں اور انعام سے مراد ایمان ہے اب ایمان کیا ہے؟ اس کے مدارج ومراتب کتنے ہیں؟ ایمان کے کس معیار پر وعدہ انعام ہے وغیرہ ابحاث ایمانیات کی تفصیل، نیز کن لوگوں پر انعام کا فیضان برسا ان میں حضرات انبیاء کرام علیہم

السلام ،صدیقین اور شہداء وصالحین کی خوش بخت جماعتیں ہیں پھر ان انبیائے کرام کا تعارف تبلیغ کی راہ میں ان کی جہد بلیغ ،صبر آزماں مشقتیں ،اعدائے دین کی طرف سے نا قابل برداشت اذیتیں اس پر ان کی تحمل مزاجی اور استقلال و جوانمردی کی تفصیلات ، بعدہ خالق کائنات کی ان پر نوازشات اور فیضان وانعامات کی بارشوں کا بیان ، پھر صدیقین ، شہداء وصالحین میں سے ہر ایک کا تعارف ،ان کے مراتب ودرجات ومصداق اور احکام ومسائل کا تفصیلی بیان ، پھر ان کے برخلاف جن پر اللہ قہار و جبار کا غضب نازل ہوا اور جو راہ مستقیم سے بہکے ہوئے ہیں وہ کون لوگ ہیں ان کی تفصیلات کیا ہیں ان پر غضب الٰہی کیوں نازل ہوا پھر وہ کیا غضب تھا جو ان پر نازل ہوا تھا ،اور ان قوموں کی ضلالت و گمراہی کے اسباب کیا تھے وغیرہا تفصیلات کے لئے ایک عظیم دفتر چاہئے غرضیکہ یہ سورہ مبارکہ علوم وفنون کا دریائے ناپیدا کنار ہے۔اسرار الٰہیہ کا خزانہ ،حکمتوں کا گنجینہ ہے اس لئے مولا علی مشکل کشا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں سورہ فاتحہ کی تفسیر کرنا چاہوں تو اس کی تفسیر سے ستر اونٹ بوجھل ہو جائیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات حضرت امام رازی نے مفاتیح الغیب کے مقدمہ میں بیان فرمایا ہے اور حضرت علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی باب مدینۃ العلم حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ارشاد کی توجیہہ امام رازی کی توجیہہ کے قریب قریب پیش کی ہے ۔ وہ اس طرح کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' کی تفسیر میں معنی حمد، اسم جلالت ''اللہ'' کے متعلقات ،اور اس کے شایان شان مفاہیم بیان کرنے کی ضرورت ہوگی ، پھر عالم اور اس کی کیفیت ،اس کے تمام اقسام اور شمار کے ساتھ اس کی تفصیلات آئیں گی ، عالم کل ایک ہزار ہیں ، چار سو خشکی پر اور چھ سو سمندر میں ،اس طرح ان سب کے بیان کی ضرورت ہوگی ۔اسی طرح فاتحہ کے اور اجزاء کا ذکر کر کے ان کی تفصیلات کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ارشاد کا یہی مفہوم ہے گویا ان کی تفسیر فاتحہ ہوتی تو ان تفصیلات کو حاوی ہوتی اور اس طرح ستر اونٹوں کا بوجھ ہو جاتا۔

اسی طرح حضرت سید علی خواص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سورہ فاتحہ کے معانی پر مطلع فرمایا تو اس سے میرے لئے ایک لاکھ چالیس ہزار نو سو نو علوم ظاہر ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سورہ پاک کے فیوض و برکات سے مالا مال فرمائے۔آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

★★★★

مباحث تعوذ

{باب اول}

مسئلہ اول: اس میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول اکثر علما قرا اور فقہا کا ہے ان سبھی حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ تعوذ پڑھنے کا محل قرأت فاتحہ سے پہلے ہے۔

دوسرا قول حضرت امام نخعی وغیرہ علما کا ہے کہ تعوذ کا محل سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہے یہی قول داؤد اصفہانی کا ہے اور حضرت محمد ابن سیرین سے بھی ایک روایت یہی ہے ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ جب پوری سورہ فاتحہ پڑھ لے اور آمین کہہ لے تب اعوذ باللہ کہے۔

دلیل قول دوم:۔ ان حضرات نے اپنے نظریہ کے اثبات میں اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد " فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ "(النحل ۹۸) کو پیش کیا ان کا طریق استدلال اس طرح ہے کہ اس آیت مبارکہ میں قرأت قرآن کو بطور شرط ذکر کیا ہے اور استعاذہ کو بطور جزا ذکر کیا گیا اور جزا شرط سے مؤخر ہوتی ہے اس لئے استعاذہ قرأت قرآن کے بعد کیا جائے گا چنانچہ استعاذہ کا بعد قرأت ہونا عقل کے بھی موافق ہے اس لئے کہ جو قرآن حکیم کی تلاوت کرتا ہے وہ عظیم ثواب کا مستحق ہوتا ہے پس اگر کوئی تلاوت قرآن حکیم کرے اور اس عظیم طاعت کی ادائیگی میں عجب و ریا داخل ہوجائے تو اس کا سارا ثواب رائیگاں ہوجاتا ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ثلاث مهلكات" یعنی تین ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں ان میں سے ایک "اعجاب المرء بنفسه" ہے یعنی آدمی کا اپنے کو اچھا سمجھنا (خود پسندی) ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے شیطان سے استعاذہ کا حکم دیا تاکہ قرأت قرآن کے بعد، شیطان قاری کو کسی ایسے عمل پر برانگیختہ نہ کرے جس سے اس کی طاعت اور اس کا ثواب رائیگاں ہوجائے۔

لہٰذا اس توضیح کی وجہ سے ان لوگوں نے کہا کہ آیت کریمہ (فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ) کا معنی یہ نہیں ہے کہ جب تم قرأت قرآن کا ارادہ کرو تب استعاذہ کرو جیسا کہ اللہ عز شانہ کے قول (اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ) (المائدہ/6) میں ہے کیونکہ اس آیت کا معنی یہ ہے جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو دھوؤ۔ لیکن استعاذہ کی جگہ میں یہ معنی نہیں ہوسکتا کہ جب تم قرأت کا ارادہ کرو تب استعاذہ کرو کیونکہ موضع دلیل میں ظاہری معنی ترک ہوجانے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ہر جگہ بلا دلیل معنی ظاہر کو ترک کردیا جائے۔

دلیل قول اول:۔اس کے برخلاف جمہور علما کا قول یہ ہے کہ استعاذہ قبل قرأت فاتحہ کرے جیسا کہ حدیث شریف میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

"أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین افتتح الصلوٰۃ قال اللہ اکبر کبیراً ثلاث مرات، والحمد للہ کثیراً ثلاث مرات وسبحان اللہ بکرۃ واصیلا ثلاث مراتٍ ثم قال اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم من همزہ ونفخہ ونفثہ"۔

اس حدیث کا مفاد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شروع قرأت میں "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھا کرتے تھے۔اسی حدیث کی بناء پر علماے جمہور نے کہا کہ آیت مبارکہ (فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ) گرچہ قبل قرأت اور بعد قرأت دونوں جگہوں پر استعاذہ کے لئے محتمل ہے لیکن قبل قرأت، ارادہ قرأت کے وقت استعاذہ پر محمول کرنا ارجح بلکہ واجب ہے تاکہ آیت مبارکہ اور حدیث مذکور کے درمیان مطابقت ہوسکے۔نیز اس قول کی عقل بھی تائید کرتی ہے وہ اس طرح کہ استعاذہ سے مقصود بوقت قرأت شیطان کے وساوس کا دفع کرنا ہے قرآن حکیم میں ہے" وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ" اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر کبھی یہ واقعہ گذرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا تو مٹا دیتا ہے اللہ اس شیطان کے ڈالے ہوئے کو۔(الحج ۵۲) یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ قرأت شروع کرنے سے پہلے استعاذہ کرے تاکہ شیطانی وساوس سے محفوظ رہ سکے۔بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں " فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ "کا معنی "اذا اردت القرأۃ" ہے یعنی جب تم تلاوت کا ارادہ کرو تو پھر اعوذ باللہ پڑھو گویا آیت موؤل ہے اور یہ تاویل عام مشہور ہے اس تاویل کو حقیقت عرفیہ کا قائم مقام کہتے ہیں۔

تیسرا قول: باب استعاذہ کے بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ بمقتضاے خبر شروع قرأت کے پہلے استعاذہ ضروری ہے اور بمقتضاے قرآن، قرأت کے بعد بھی استعاذہ ضروری ہے۔

مسئلہ دوم: حضرت عطاء نے فرمایا کہ ہر قرأت کے لئے استعاذہ واجب ہے خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں۔

ابن سیرین کا قول یہ ہے کہ پوری زندگی میں صرف ایکبار تعوذ واجب ہے پس اگر کسی نے زندگی میں ایکبار کہہ لیا تو اسقاط وجوب کے لئے اس کو کافی ہوجائے گا۔جمہور کا مسلک یہ ہے کہ وہ واجب نہیں ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک اعرابی کو نماز کے تمام مسائل واحکام سکھائے تو تعوذ نہیں سکھایا۔

اعتراض: یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ اعرابی کو مسائل نماز کی تعلیم والی خبر، واجبات صلوٰۃ پر مشتمل نہیں تھی کہ اس سے استدلال کیا جائے کہ تعوذ واجب نہیں ہے کیوں کہ تعوذ کا عدم ذکر عدم وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔

وجوب تعوذ کے دلائل: حضرت عطا نے استعاذہ کے واجب ہونے پر پہلی دلیل دیتے ہوئے کہا۔ (۱) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مواظبت فرمائی ہے اس لئے استعاذہ واجب رہے گا چونکہ اللہ عز شانہ کا ارشاد ہے "وَاتَّبِعُوْہُ" (الاعراف ۱۸۵)

(۲) **دوسری دلیل:** اللہ تعالیٰ کا قول "فاستعذ" امر ہے اور امر وجوب کے لئے ہے اس لئے استعاذہ واجب ہے اور پھر استعاذہ کے وجوب کا قول ہر قرأت میں کرنا ضروری ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ) اس میں استعاذہ کا حکم وصف قرأت کے بعد ہوا ہے اور جو حکم کسی وصف مناسب کے بعد ہوتا ہے وہ وصف اس حکم کی علت قرار پاتا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ قرأت استعاذہ کی علت ہے لہذا جب جب قرأت ہوگی استعاذہ کا حکم واجب ہوگا چنانچہ اصول فقہ کا یہ قاعدہ "لان الحکم یتکرر لاجل تکرر العلۃ" بہت مشہور قاعدہ ہے۔

(۳) **تیسری دلیل:** اللہ تعالیٰ نے استعاذہ کا حکم شیطان رجیم کے شر کے دفع کے لئے دیا ہے جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ (فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ) اس کی طرف مشعر ہے اور شر شیطان کا دفع کرنا واجب، اور اس واجب کا دفعیہ استعاذہ ہی سے ہوسکتا ہے اس لئے استعاذہ واجب ہوگا کہ جس چیز پر واجب کی تکمیل کا انحصار ہوتا ہے وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔

(۴) **چوتھی دلیل:** طریقہ احتیاط استعاذہ کو واجب کرتا ہے۔ اس لئے وہ قرأت میں احتیاطاً واجب ہے۔

مسئلہ سوم: تعوذ اکثر علما کے نزدیک قرأت سے پہلے مستحب ہے۔ حضرت امام مالک کے نزدیک مکتوبہ نماز میں تعوذ نہیں ہے البتہ شہر رمضان کے قیام میں تعوذ پڑھا جائے گا۔ اکثر علما کی دلیل آیت متلوہ اور وہ خبر ہے جو حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور دونوں نص یعنی آیت وخبر سے وجوب کا ثبوت ہوتا ہے کم از کم ندب و استحباب کا ثبوت بہر حال ہوتا ہے۔

مسئلہ چہارم: حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الام" میں کہا کہ مروی ہے کہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے قرأت کیا تو تعوذ کو آہستہ پڑھا اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے تعوذ کو جہر سے پڑھا۔ ان دونوں روایتوں کی وجہ سے امام شافعی نے فرمایا کہ تعوذ کو سر و جہر دونوں طریقے سے پڑھنا جائز ہے۔ اور ''الاملاء'' میں یہ کہا کہ تعوذ کو جہر سے پڑھے گا اور اگر آہستہ پڑھا تو بھی مضر نہیں۔ امام رازی نے اس مقام پر کہا ہے کہ استعاذہ، بعد افتتاح نماز اور قبل فاتحہ پڑھا جاتا ہے۔ پس اگر استعاذہ کو ماقبل سے ملحق کر دیں تو اسرار لازم ہے۔ اور اگر اس کو فاتحہ سے ملحق کر دیں تو جہر لازم ہے مگر یہ کہ استعاذہ کو افتتاح سے مشابہت تامہ حاصل ہے کہ حضرات فقہا کے نزدیک دونوں نافلہ ہے نیز جہر کیفیت وجودیہ ہے اور اخفا اس کیفیت کے عدم سے عبارت ہے اور اصل عدمی ہونا ہے اس لئے جہر کے بہ نسبت اخفا تعوذ میں اصل ہے یہی قول حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

مسئلہ پنجم: اللہ تعالیٰ کا ارشاد سورہ نحل میں یوں ہے۔ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ''(آیت:۹۸) یعنی تو جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو شیطان مردود سے۔ سورہ اعراف میں ہے '' وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔(آیت:۲۰۰) اور سورہ حم سجدہ میں بھی یہی آیت ہے لیکن اس میں اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ہے (آیت:۳۶) دونوں کا مفہوم یہ ہے اے سننے والے اگر تجھے شیطان کا کوئی کونچا (تکلیف) پہنچے تو اللہ کی پناہ مانگ بیشک وہی سنتا جانتا ہے۔ اور سورہ انفال میں ہے وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (آیت ۶۱) یعنی اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو بیشک وہی ہے سنتا جانتا۔ ان آیات کے پیش نظر حضرات فقہائے کرام کے مابین الفاظ تعوذ میں اختلاف پایا جاتا ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہما کے نزدیک ''اعوذ با لله'' کہنا واجب ہے اس لئے کہ یہ الفاظ نظم قرآن (فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) کے موافق ہے نیز حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے بھی اسکو تائید حاصل ہوتی ہے۔ حضرت امام احمد نے کہا کہ اولیٰ یہ ہے کہ ''اعوذ با لله من الشيطان الرجيم انه هو السميع العليم'' پڑھے تاکہ دونوں آیتوں پر عمل ہو جائے۔ اور بعض اصحاب شافعی نے فرمایا کہ اولیٰ یہ ہے کہ اعوذ با لله السميع العليم من الشيطان الرجيم پڑھے تاکہ دونوں آیات کے درمیان جمع کیا جا سکے۔ بیہقی نے کتاب السنن میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات میں قیام فرماتے تو تین مرتبہ تکبیر کہتے اور پھر فرماتے۔ اعوذ با لله السميع

العلیم من الشیطان الرجیم۔ امام ثوری اور امام اوزاعی نے فرمایا کہ اولیٰ یہ ہے کہ یہ کہے ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم انہ ھو السمیع العلیم'' ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ سب سے پہلے حضرت جبریل نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو چیز وحی کیا وہ یہ ہے۔ ''قل یا محمد: استعیذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم، ثم قال: بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرأ باسم ربک الذی خلق۔''

خلاصہ کلام یہ کہ استعاذہ شروع قرأت میں بہر حال ضروری ہے کہ استعاذہ قلوب کو ہر اس چیز سے پاک وصاف کر دیتا ہے جو ذکر الٰہی میں استغراق سے مانع ہے اور تسمیہ ہیبت جلال الٰہی کی طرف قلوب کو پھیرتا ہے۔

مسئلہ ششم: نماز میں تعوذ، نماز کی وجہ سے ہے یا قرأت قرآن کی وجہ سے اس میں بھی فقہا کا اختلاف ہے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد کا قول اس بارے میں یہ ہے کہ تعوذ قرأت کی وجہ سے ہے لیکن امام ابو یوسف کے نزدیک تعوذ نماز کی وجہ سے ہے حضرات شیخین کے اختلاف کی وجہ سے دو مسئلے جدید اس اصل پر متفرع ہوتے ہیں۔

مسئلہ ۱: یہ ہے کہ کیا مقتدی امام کے پیچھے تعوذ پڑھے گا یا نہیں، مذہب امام اعظم ابوحنیفہ وامام محمد کے مطابق ظاہر ہے کہ مقتدی تعوذ نہیں کہے گا اس لئے کہ تعوذ قرأت کی وجہ سے لازم ہے اور مقتدی پر قرأت لازم نہیں اس لئے تعوذ بھی لازم نہ ہوگا اور امام ابو یوسف کے نزدیک مقتدی پر بھی تعوذ لازم ہے امام ابو یوسف کی دلیل یہ ہے کہ تعوذ اگر قرأت کی وجہ سے لازم ہوتا تو تکرار قرأت کی وجہ سے تعوذ کو بھی مکرر ہونا چاہئے۔ مگر ایسا نہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے تعوذ صلوٰۃ کی وجہ سے لازم ہے قرأت کی وجہ سے نہیں، اور جب نماز کی وجہ سے تعوذ ہے تو مقتدی پر بھی تعوذ لازم ہوگا کہ وہ نماز میں شامل ہے۔

مسئلہ ۲: یہ ہے کہ عیدین کی نماز میں بعد ثنا تعوذ کو تکبیرات عیدین سے پہلے کہے گا یا بعد میں، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رضی اللہ عنہما کے نزدیک بعد ثنا تکبیرات عیدین کہے پھر تعوذ پڑھ کر قرأت کرے گا لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بعد ثنا اور تکبیرات عیدین سے پہلے تعوذ کہے گا۔

مسئلہ ہفتم: یہ کہ قرآن حکیم کی قرأت ترتیل کے ساتھ مسنون ہے اللہ عز شانہ کا ارشاد ہے ''وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (المزمل/73) اور ترتیل، حروف وکلمات قرآن کو بہت صاف صاف اور واضح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کو کہتے ہیں چونکہ ترتیل کا فائدہ یہ ہے کہ قاری خود بھی اس کے معانی کو سمجھ سکے گا اور سامعین بھی اس کے معانی

سے محظوظ ہوسکیں گے لیکن جب عجلت ممکنہ کے ساتھ قرأت ہوگی تو قاری اور سامع کچھ بھی اس کے معانی سمجھ نہیں پائیں گے اس لئے قرأت میں ترتیل مسنون ہے چنانچہ ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صاحب قرآن سے کہا جائے گا" اقرأ وارق ورتل کما کنت ترتل فی الدنیا" ابوسلیمان خطابی نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے "أن عدد آی القرآن علی عدد درج الجنة ، یقال للقاری اقرأ وارق فی الدرج علیٰ عدد ماکنت تقرأ من القرآن فمن استوفی قرأة جمیع ای القرآن استولیٰ علیٰ اقصی الجنة۔"

یعنی بیشک آیات قرآنیہ کی تعداد جنت کے درجوں کے برابر ہے قاری قرآن سے کہا جائے گا کہ پڑھو اور درجوں پر ترقی کرو اتنی تعداد کے برابر جو قرآن تم دنیا میں پڑھتے تھے پس جو شخص کہ تمام آیات قرآنیہ پڑھ لے گا وہ جنت کے تمام درجوں میں اعلیٰ درجہ کا مالک ہوگا۔

مسئلہ ہشتم: جس طرح ترتیل مسنون ہے اسی طرح تجوید بھی مسنون ہے، تجوید: قرآن حکیم عمدگی کے ساتھ پڑھنے کو کہتے ہیں۔ ابوداؤد نے براأ ابن عازب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "زینوا القرآن باصواتکم"

مسئلہ نہم: شوافع کا مختار مذہب یہ ہے کہ ضاد کی ظاء سے مشابہت نماز کو باطل نہیں کرتی وجہ یہ ہے کہ ضاد وظاء کے درمیان مشابہت تام پائی جاتی ہے اور امتیاز دونوں کے درمیان دشوار ہے۔ اس لئے دونوں کے درمیان فرق کی تکلیف ساقط ہوجائے گی۔ ضاء وظاء کے درمیان مشابہت چند طرح سے ہے۔ اول یہ کہ دونوں کے حروف، حروف مجہورہ میں سے ہیں، دوم یہ کہ وہ دونوں حروف حروف رخوہ سے بھی ہیں، سوم یہ کہ وہ دونوں حروف مطبقہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ چہارم یہ کہ ظاء کا مخرج گرچہ طرف لسان اور ثنایا علیا کے اطراف کے درمیان ہے اور ضاد کا مخرج ابتداء حافہ لسان اور اس کے قریب کا داڑھ ہے مگر یہ کہ ضاد میں صفت رخاوت کی وجہ سے انبساط پایا جاتا ہے اسی وجہ سے اس کا مخرج ظاء کے مخرج کے قریب ہے۔ پنجم یہ کہ حرف ضاد کا نطق عرب کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "انا افصح من نطق بالضاد" غرضیکہ مذکورہ وجوہ سے بہت ظاہر ہے کہ ضاد اور ظا کے درمیان اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ دونوں کے درمیان فرق بہت دشوار ہے۔ پس جب یہ بات متحقق ہے تو پھر یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان دونوں حرفوں کے درمیان فرق معتبر نہیں ہے کیونکہ اگر معتبر ہوتا تو زبان اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ازمنہ صحابہ میں ضرور

اس بارے میں سوال ہوا ہوتا خصوصاً جب دائرہ اسلام میں عجمی لوگ داخل ہورہے تھے تو اس وقت تو اس کا سوال ناگزیر تھا لیکن اس مسئلہ سے متعلق صحابہ اور تابعین سے کوئی سوال منقول نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دوحرفوں کے درمیان فرق محل تکلیف سے خارج ہے۔

ضاد وظا سے متعلق مندرجہ بالا حکم حضرات شوافع کا مذہب مختار ہے۔مگر ہمارے امام، امام اعظم ابوحنیفہ اور ائمہ احناف کا مذہب مختار درج ذیل ہے۔جس کو اعلیٰ حضرت مجدد ملت امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ نے اپنے فتاویٰ میں بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔اس سلسلہ میں آپ کے فتاویٰ کے علاوہ آپ کے رسائل بھی ہیں جو علم تجوید وقرأت اور مخارج حروف وصفات کے بیان بالخصوص ''ضاد وظا کے تفصیلی احکام پر مشتمل ہیں۔ضاد وظا کے درمیان مشابہت کے سوال کے جواب میں فرمایا۔

''ض وظ'' کا قدرے مشتبہ الصوت ہونا یقینی ہے یہاں تک کہ تمیز دشوار مگر نہ یہ ''ظ'' جو عامہ عوام نکالتے ہیں یہ ذمفخم ہے ظ جب اپنے مخرج سے صحیح طور پر برعایت استعلاء واطباق لسان ادا کی جائے گی ضرور مشابہ الصوت بض ہوگی یہاں تک کہ اگر استطالہ واقع ہوض ہوجائے، ذوادنہ مستحسن ہے نہ مستہجن بلکہ محض غلط، اسی طرح دواد اور صحیح ظواد بھی نہیں فقہاے کرام سب کا ایک حکم دیتے ہیں کہ بحالت فساد معنی نماز فاسد جیسے مغظوب، مغدوب اور بحالت صحت معنی صحیح جیسے ظالین دوالین کمافی الغنیۃ وغیرھا۔(فتاویٰ رضویہ ج:۳،صفحہ:۱۰۲)

ایک دوسری جگہ ارقام فرماتے ہیں۔''پھر ایسی حالت میں عندالانصاف اشتراک صفات خواہ اشتباہ اصوات کسی کی تخصیص نہیں ہوسکتی جو براہ عجز اختیاری نہیں اور غیر اختیاری پر حکم جاری نہیں ''کَمَا قَدَّمْنَا فی جَعلِ الاتراک الحاء خاء'' اس تحقیق اینق سے واضح ہوا کہ یہ طائفہ جدیدہ جس نے قصداً ''ظاد'' پڑھنا ٹھہرالیا ان کی نماز تو باجماع ائمہ متقدمین و اتفاق اقوال مذکورہ متأخرین کبھی ''وَ لَا الضَّآلِّیْنَ'' تک نہ پہنچنے پاتی، پہلے ہی رکعت میں ''مغضوب'' کی جگہ ''مغظوب'' پڑھا اور نماز رخصت ہوئی اب افعال بے معنی کئے جاؤ۔اسی طرح کوئی جاہل حرف منزل ضاد کا قصد نہ کرے بلکہ عمداً اس کو دال خواہ کوئی حرف پڑھنا ٹھہرالے اس کی نماز بھی ''مغدوب'' سے آگے نہ چلے گی، تعلم مخرج وطریق ادا، وقصد صحیح بقدر قدرت ہر شخص پر لازم، جو کچھ ادا ہوا فتویٰ تیسیر صحت پر حاکم بالجملہ عمداً ''ظاو'' یا ''دواد'' دونوں حرام، جو قصد کرے کہ بجائے ض، ظا یا دال پڑھیگا ان کی نماز کبھی تام فاتحہ تک بھی نہ پہنچے گی ''مغدوب'' ''مغظوب'' کہتے ہی بلاشبہ فاسد وباطل ہوجائے گی، اور جو حرف منزل ہی کا قصد رکھتا اور اسی کو ادا کرنا

چاہتا ہے پھر اگر ایسی جگہ غلطی پڑے جس سے معنی نہ بدلے تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر معنی بدل گئے تو دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ شخص ادائے حروف پر قادر تھا براہ لغزش زبان یا جہلاً یا سہواً زبان سے نکل گیا تو ہمارے مذہب سیدنا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ومحرر مذہب سیدنا امام محمد رضی اللہ عنہ کے نزدیک نماز مطلقاً فاسد اور اگر یہ بدلا ہوا کلمہ قرآن مجید میں نہیں تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اتفاق ہو کر اجماع ائمہ متقدمین کہ نماز باطل ہے اور متأخرین کے اقوال کثیرہ و مضطرب ہیں۔(صفحہ:۱۱۸ / ج:۳)

نماز میں ضاد کو مشتبہ بظا پڑھنے کے سوال کے جواب میں آپ کا یہ فتویٰ نہایت ہی مختصر مگر بہت جامع اور واضح خلاصہ بحث اور عوام مسلمین کے لئے اس پر عمل آسان ہے۔فرماتے ہیں

''یہ حرف دشوار ترین حرف ہے اور اس کی ادا خصوصا عجم پر کہ ان کی زبان کا حرف نہیں سخت مشکل مسلمانوں پر لازم کہ اس کا مخرج صحیح ادا کرنا سیکھیں اور کوشش کریں کہ ٹھیک ادا ہو اپنی طرف سے نہ ضاد کا قصد کریں نہ دواد کا کہ دونوں محض غلط ہیں اور اس نے حسب وسع وطاقت جہد کیا اور حرف صحیح ادا کرنے کا قصد کیا پھر کچھ نکلے اس پر مواخذہ نہیں ''لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا''، خصوصاً ظا سے اس حرف کا جدا کرنا تو سخت مشکل ہے پھر ایسی جگہ ان سخت حکموں کی گنجائش نہیں، تکفیر ایک امر عظیم ہے۔''لا یخرج الانسان من الاسلام الا جحود ما ادخلہ فیہ'' اور جمہور متأخرین کے نزدیک فساد نماز کا بھی حکم نہیں ردالمختار ''ان کان الخطا ابدال حرف بحرف فان امکن الفصل بینھما بلا کلفۃ کالصاد مع الطا فاتفقوا علیٰ انہ مفسد وان لم یمکن الا بمشقۃ کالظاء مع الضاد فاکثرھم علی عدم الفساد لعموم البلوی اھ ملخصاً وفی الدر المختار الا ما یشق تمیزہ کالضاد والظاء فاکثرھم لم یفسدھا'' اور ائمہ متقدمین بھی علی الاطلاق حکم فساد نہیں دیتے لطف یہ ہے کہ وہ جہال جن سے سہل حرف بھی ٹھیک ادا نہیں ہوتے ضاد اور دواد پر کٹے مرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم اہل اسلام کو نیک توفیق عطا فرمائے ہاں اگر کوئی معاند بد باطن بقصد تغیر کلام اللہ وتبدیل وحی منزل من اللہ اس حرف خواہ کسی حرف کو بدلے گا تو وہ بیشک اپنے اس قصد خبیث کے سبب حکم کفر کا مستحق ہوگا اس میں ظاد، ودواد وسین وصاد سب برابر ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم (ایضاً)

مسئلہ دھم: حضرات فقہا وقرا کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ لام مغلظہ، لغات فصیحہ سے ہے یا نہیں، لغات فصیحہ سے ثبوت کی تقدیر پر ان حضرات کا اتفاق ہے کہ لام کے مکسورہ ہونیکی صورت میں اس کا مغلظہ پڑھنا درست نہیں کیونکہ کسرہ سے منتقل ہو کر لام مغلظہ کا تلفظ کرنا زبان پر ثقیل ہے لہذا اس کا اس لغت سے نفی ہی واجب ہے۔

مسئلہ یازدھم: اکثر علما کا اتفاق ہے کہ قرأت مشہورہ نقل متواتر کے ساتھ منقول ہے۔مگر اس میں اشکال ہے چنانچہ اس پر یہ کلام کیا جاسکتا ہے کہ قرأت مشہورہ یا تو نقل متواتر سے منقول ہے یا منقول نہیں ہے۔اول یعنی تواتر سے منقول ہونے کی صورت میں یہ لازم ہوگا کہ تمام قرأت مشہورہ جو تواتر سے منقول ہیں ان قراءتوں کے درمیان اللہ عز شانہ نے مکلفین کو اختیار دیا ہے اور تمام قرائتوں کے درمیان مساوات کا حکم ہے کہ مکلف جس کو چاہے اختیار کرے لیکن اس وقت بعض قرأت مشہورہ کو بعض پر ترجیح دینا تواتر سے ثابت شدہ حکم کے خلاف ہوگا اور تواتر سے ثابت شدہ قرأت کے خلاف ترجیح دینا تکفیر نہیں تو کم از کم موجب تفسیق ضرور ہے اس لئے جو حضرات تمام قرأت مشہورہ میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں وہ فاسق ٹھہریں گے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام قرا حضرات کوئی نہ کوئی خاص قرأت لئے بیٹھے ہیں اور اسی قرأت کی لوگوں کو ترغیب بھی دیتے ہیں بلکہ دوسری قرأت اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔رہی دوسری صورت کہ یہ قرأت تواتر سے منقول نہیں ہیں بلکہ بطریق آحاد منقول ہیں تو اس صورت میں قرآن جزم ویقین اور قطعیت کے دائرہ سے خارج ہوجائے گا کہ جو چیزیں خبر آحاد سے ہوتی ہیں قطعیت کا فائدہ نہیں دیتیں جب کہ یہ بالاجماع باطل ہے۔

جواب: ایسے شبہ کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بعض قرأت متواتراً منقول ہے اور اس میں امت مسلمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں چنانچہ سبھی حضرات کے نزدیک یہ قرأتیں جائز ہیں اگرچہ بعض باب آحاد سے ہیں لیکن بعض کا آحاد سے ہونا مجموع قرآن کی قطعیت کے خروج کو مستلزم نہیں۔(واللہ تعالیٰ اعلم)

مسئلہ دوازدھم: تفسیر رازی میں یہ مسئلہ،مسئلہ خامسہ کے بیان میں درج ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الام میں فرمایا: کہ کہا گیا ہے تعوذ ہر رکعت میں کرے گا۔مگر میرا قول یہ ہے کہ تعوذ صرف رکعت اولیٰ میں کرے گا۔چونکہ ارشاد باری تعالیٰ (فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ) میں کلمہ اذا عموم کا فائدہ نہیں دیتا۔اور جو لوگ ہر رکعت میں تعوذ کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حکم کا ترتب وصف مناسب کے ساتھ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ وصف مناسب اس حکم کی علت ہے تو اس سے لازم کہ جب علت مکرر ہوگی تو حکم بھی مکرر ہوگا۔

{باب دوم}

بیان مباحث عقلیہ در بارۂ تعوذ

تعوذ کے پانچ اہم ارکان (خمسہ) کا بیان

(۱) الاستعاذة (۲) المستعيذ (۳) المستعاذ به (۴) المستعاذ منه

(۵) الشئ الذی لاجله تحصل الاستعاذة

رکن اول: استعاذہ کے بیان میں۔اس میں چند مسائل ہیں۔

مسئلہ اول: ''اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم'' کی تفسیر کے بیان میں۔

لفظ ''**اعوذ**'' متکلم کا صیغہ فعل مضارع معروف ہے۔عوذ سے مشتق ہے۔اور عوذ کے دو معنی ہیں ایک معنی التجاء کرنا اور پناہ لینا ہے اور دوسرا معنی التصاق یعنی ملنا ہے۔کہا جاتا ہے۔ **اطیب اللحم عوذہ** یعنی گوشت کا جو حصہ ہڈی سے لگا ہوا ہے وہ پاکیزہ گوشت ہے۔ پہلے معنی کی بناء پر **اعوذ** کا معنی ہوگا **التجی الی رحمة اللہ تعالیٰ و عصمته** یعنی پناہ لیتا ہوں اللہ تعالیٰ کی رحمت وعصمت کی۔یا اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں۔اور دوسرے معنی کے مطابق **اعوذ** کا معنی ہوگا۔''التصق نفسی بفضل اللہ و رحمته''یعنی اپنے نفس کو فضل الٰہی اور رحمت خداوندی سے ملاتا ہوں۔

باللہ: لفظ اللہ اسم جلالت کی تفسیر وتفصیل بسم اللہ کی بحث میں انشاء اللہ آئے گی۔

الشیطن: لفظ شیطان کے بارے میں لغتاً دو قول ہے، پہلا یہ کہ شیطان شطن سے بنا ہے اور شطن کے معنی دور ہونا کے ہے کہا جاتا ہے ''**شطن دارک**''تمہارا گھر دور ہوگیا۔اسی وجہ سے ہر کسی جن وانس اور حیوان کو شیطان کہتے ہیں کہ وہ رشاد وسداد سے دور ہوگیا اور چونکہ ابلیس بھی مقرب بارگاہ الٰہی ہو کر وہاں سے دور ہوگیا اس لئے اس کو شیطان کہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (انعام ۱۱۲) مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک دفعہ خچر پر سوار ہوئے۔خچر اچھلنے کودنے لگا آپ نے اسکو مارا تو اور اچھلنے لگا۔بالآخر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس شریر خچر سے یہ کہتے ہوئے اتر گئے۔وَمَا حملتمونی الا علیٰ شیطان،تم لوگوں نے مجھے شیطان پر سوار کر دیا۔آیت متلوہ اور روایت مذکورہ کا مفاد یہ ہے کہ لغوی معنی میں شیطان، انسان وحیون پر بھی بولا جاسکتا ہے۔لفظ شیطان کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ وہ شیط سے بنا ہے۔جس کے معنی باطل ہونا اور ہلاک ہونا ہے۔

چونکہ ابلیس بھی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہوااور سارے اعمال اس کے باطل ہوگئے اس لئے اسکوشیطان کہتے ہیں۔

رجیم: رجم سے ماخوذ ہے مرجوم کے معنی میں ہے۔ اورلغت میں رجم کے کئی معانی ہیں۔ نکالنا، پھینک کر مارنا اورلعنت یعنی دور کرنا یہاں تینوں معانی مراد ہوسکتے ہیں پہلے معنی کی تقدیر پر یہ معنی ہوگا کہ شیطان چونکہ پہلے حضرات ملائکہ کے ساتھ رہتا تھا حضرت آدم علیہ السلام کوسجدہ کرنے سے انکار کرنے کی وجہ سے مقام قدس سے باہر نکالا گیا ارشاد باری ہے ''فاخرج منها'' اس لئے اسے رجیم کہا جاتا ہے۔ دوسرے معنی کی بنابر یہ توجیہ ہوگی کہ اب بھی شیطان جب کبھی آسمان پر جانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے ٹوٹا تارہ شہاب سے پھینک کر مارا جاتا ہے۔ بایں وجہ اسکو رجیم یعنی مرجوم کہتے ہیں۔ تیسرے معنی کے مطابق رجیم کا معنی ملعون ہوگا چونکہ اس لعین پر ہمیشہ حق تعالیٰ، فرشتوں اور انسانوں کی طرف سے لعنت ہوتی رہتی ہے، رب تعالیٰ فرماتا ہے ان علیک اللعنة الی یوم الدین۔

مسئلہ دوم: (ماہیت استعاذہ): کمال استعاذہ کیلئے تین باتیں ضروری ہیں۔ ایک علم، دوسرا حال، تیسرا عمل، علم سے مراد یہ ہے کہ بندہ اس بات کو جانے کہ وہ تمام منافع دینیہ ودینویہ کے حصول سے اور تمام دینی ودینوی مضرتوں کے دفع سے عاجز ہے اور یہ جانے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی تمام منافع دینیہ، دنیویہ کے ایجاد پر اور تمام مضرتوں کے دفع پر قادر ہے جب بندہ کو اپنی عاجزی ودرماندگی کا علم اور رب کی قدرت کاملہ کا علم ویقین ہوجاتا ہے تو اس کے دل میں انکسار و تواضع اور تضرع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ پس جب بندہ اعتقاد ویقین کی اس منزل پر ہوتا ہے تو لازمی طور پر ایک صفت اس کے قلب میں اور دوسری صفت اس کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ اس وقت بندہ قلبی طور پر یہ یقین کرلیتا ہے کہ خالق کائنات ہی اس کو تمام آفات ارضی وبلیات سماوی سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور دینی ودنیاوی تمام خیرات وحسنات سے صرف وہی نواز سکتا ہے چنانچہ وہ بزبان قال اپنے مولیٰ کریم سے حصول منافع ودفع مضرات کا طالب ہوتا ہے اور یہی طلب استعاذہ ہے جس کو بندہ اپنے قول ''اعوذ باللہ'' سے تعبیر کرتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ کمال استعاذہ کے لئے بندوں کو علم باللہ اور علم بنفسہ یعنی بندہ کو اپنی ذات وحیثیت کا علم ہونا بھی ضروری ہے، علم باللہ کا معنی یہ ہے کہ بندہ کو اس کا علم یقینی حاصل رہے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ تمام معلومات کا جاننے والا ہے کیونکہ اگر اس کے علم میں یہ نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے اور اس کے تمام احوال کا جاننے والا ہے تو اس صورت میں استعاذہ عبث ہوگا ظاہر ہے کہ جو اس کے احوال کا عالم نہ ہوگا اس کی پناہ فضول ہے اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ بندہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ جمیع ممکنات پر قادر ہے کیوں کہ اس کی قدرت کا علم اگر بندہ کو نہ ہو تو بندہ اپنی مرادا

ورمطلوب حاصل کرنے کی جستجونہیں کریگا نیز یہ بھی لازم ہے کہ بندہ یہ عقیدہ رکھے کہ مولیٰ کریم جواد مطلق ہے کہ اگر اس پر بخل کا جواز ہوتو استعاذہ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اس کے ساتھ یہ بھی جانے کہ اللہ کے سوا کوئی اس کے مقاصد کی تکمیل نہیں کرسکتا اس لئے کہ اگر یہ تصور ہو کہ غیر اللہ بھی اس کی مدد کرسکتا ہے تو بندہ کو اللہ کی استعاذہ کی رغبت قوی نہ ہوگی رب تعالیٰ کی طرف رغبت قوی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ توحید مطلق کا عقیدہ رکھے، اور توحید مطلق سے مراد یہ ہے کہ بندہ یہ اعتقاد جازم رکھے کہ ساری کائنات کا مدبر صرف ایک ہے نیز یہ بھی بروقت بندہ کے ذہن نشین رہے کہ وہ تمام تر امور کی انجام دہی میں غیر مستقل ہے کیونکہ بندہ اگر خود مستقل ہوجائے تو اس کو غیر کی طرف استعاذہ کی ضرورت نہ رہے گی مختصر یہ کہ بندہ جب تک رب تعالیٰ کی عزت وجلالت، اور غلبہ وکبریائی کو اور اپنی عاجزی ودرماندگی اور بیکسی و بے چارگی کو ذہن ودماغ میں نہ بسائے گا وہ ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' کا تکلم صحیح طور پر نہ کرسکے گا۔

یہاں پر بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ استعاذہ کے موقع پر رب تعالیٰ کی قدرت وعلم کا تفصیلی علم ضروری نہیں ہے بلکہ اجمالی عقیدہ کافی ہے مگر یہ ضعیف ہے چونکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے اَبْ (چچا) آزر کو اس کے باطل معبود کی تنقیص کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔ ''لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (مریم ۴۲) یعنی اے میرے باپ کیوں ایسوں کو پوجتا ہے جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ کچھ تیرے کام آئے۔ آیت متلوہ کا مطلب ظاہر ہے کہ معبود کے لئے سمیع وبصیر اور غنی ہونا لازم ہے پس اس تقدیر پر کہ اگر الٰہ جمیع معلومات کا عالم نہ ہو اور جملہ مقدورات پر قادر نہ ہو تو حضرت خلیل اللہ کا آزر کے تراشیدہ بت (معبود باطل) کی تنقیص صحیح نہ ہوگی۔ یہ نظر یہ حضرت امام رازی کا ہے۔ مگر ناچیز راقم الحروف کے نزدیک عوام مسلمین کی خیر خواہی کے مدنظر پہلا نظریہ راجح ہے چونکہ جو بھی تعوذ پڑھتا ہے اس کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ شیطان کے شر سے بچے رہنے کی نیت ہوتی ہے اللہ عزشانہ کی قدرت کاملہ اور اس کے علم بے پایاں کا ذہن میں تصور نہیں ہوتا گو کہ ہر مسلمان کے لئے ایسا عقیدہ رکھنا ضروری ہے مگر تعوذ کے وقت قدرت کاملہ کے علم تفصیلی کی شرط تکلیف مالا یطاق نہیں تو شاق ضرور ہے جب ایمان کے معتبر ہونے کے لئے علم اجمالی کافی ہے تو تعوذ کے وقت کیونکر کافی نہ ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے باندی کو آزاد کرنا چاہا اور اس کا مومنہ وکافرہ ہونا ظاہر نہ تھا تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علم عقیدۂ اجمالی پر اکتفا فرمایا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ تعوذ کے وقت بندہ کو کم ازکم رب تعالیٰ کی قدرت و کبریائی اور عظمت و بڑائی کے علم اجمالی کا خیال ہونا چاہئے۔ نیز اپنی عاجزی و درماندگی اور بے کسی ومحتاجگی کا یقین بھی رہے تاکہ وہ سمجھے کہ وہ اپنی ذات سے متعلق تمام امور ومعاملات کو کامل طور پر بذات خود پورا نہیں کرسکتا پھر اگر مان لے کہ کیفیت وکمیت کے لحاظ سے وہ ساری مصلحتوں کو جان بھی لے تو وہ یقین کرے کہ مصالح واسباب نہ ہونے کے وقت اس کا حاصل کرنا اور ہوجانے کے بعد ان مصالح واسباب کو باقی رکھنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت واختیار سے ہے۔ پس جب بندہ کے ذہن ودماغ اور قلب وجگر میں مذکورہ دونوں باتیں رچ بس جاتی ہیں تو بندہ کے دل میں ایک حالت پیدا ہوتی ہے جس کو انکسار وخضوع کہتے ہیں اس وقت اس کے دل میں طلب کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے اور یکلخت اس کی زبان پر ''**اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم**'' جاری ہوجاتا ہے رہی یہ بات کہ بندہ دنیا وآخرت کے مصالح واسباب کے حصول میں عاجز ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان سے دو باتیں صادر ہوتی ہیں عمل اور علم، اور دونوں میں انسان مکمل طور پر عاجز ہے۔ چنانچہ تحصیل علم میں استعاذہ باللہ کی کس قدر شدید حاجت ہے ذیل کے مسطورہ دلائل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دلیل اول: بہت سے دانشور اور محققین کو دیکھا گیا ہے کہ تاحیات ایک شبہ میں الجھے رہے اور اس کے صحیح جواب کا عرفان نہیں ہوسکا اور اس پر طرہ یہ کہ وہ اس پر اڑے بھی رہے اور اس کو علم یقینی اور روشن دلیل سمجھتے رہے لیکن جب ان کی عمریں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آئے تو وہ گذشتہ محققین کی غلطیوں سے آگاہ ہوئے اور لوگوں کے سامنے ان کے قول کے فساد و بطلان کو بھی ظاہر کردیا۔ جب بعض لوگوں میں غلطی اور خطا کا امکان ہی نہیں بلکہ وقوع ثابت ہے تو سب لوگوں میں احتمال خطا ممکن ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ارباب علم ودانش کے درمیان ادیان ومذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا لیکن یہ مشاہدہ ہے کہ اس میں زبردست اختلاف ہے۔ تو اگر اللہ عزشانہ کا فضل وکرم اور اس کی رشد و ہدایت نہ ہوتی تو کون ہے جو اپنے سفینہ فکر کو ضلالت وگمرہی کے موجوں اور ظلمات کے بھنور سے پار نکال لے جاتا۔

دلیل دوم: اس عالم رنگ وبو میں ہر شخص دین حق کا متلاشی ہے اور خواہاں ہے کہ وہ اعتقاد صحیح کے ساتھ مذہب حق کا پابند رہے چنانچہ کوئی بھی جان بوجھ کر اپنے لئے جہالت وضلالت اور کفر وشرک کی راہ پر چلنے کے لئے راضی نہیں ہوسکتا اگر دین حق کا حصول آدمی کی سعی اور کوشش کا نتیجہ ہوتی تو ہر آدمی حق وصداقت کا علمبردار اور دین حق کا پیروکار ہوتا مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اہل حق کی تعداد باطل پرستوں کے مقابل اتنی قلیل ہے جیسے کالے بیل کے جلد پر کہیں ایک سفید بال اگ آیا ہو اس سے ظاہر ہے کہ ظلمات وضلالات سے خلاصی خالق ارض وسموٰت کی توفیق وتائید کے بغیر ممکن نہیں

چنانچہ اللہ عز شانہ نے اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا ''وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ '' (المومنون:۹۷) اور تم عرض کرو کہ اے میرے رب تیری پناہ شیاطین کے وسوسوں سے۔اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہے کہ استعاذہ مطلق ہے کسی مخصوص حالت سے مقید نہیں جس کا مفاد یہ ہے کہ بندہ عقائد وعلوم کی تحصیل میں پناہ رب ذوالجلال کا محتاج ہے۔

اسی طرح اعمال ظاہرہ کی بجا آوری وحصول میں بھی بندہ مکمل محتاج اور پورے طور پر عاجز ہے اعمال ظاہرہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے کرنے سے بندہ کو ذاتی منفعت ہوتی ہے اور مضرت دفع بھی ہوتی ہے۔اس دعویٰ پر کہ بندہ اعمال ظاہرہ میں بھی عاجز ہے متعدد دلیلیں موجود ہیں۔

پہلی دلیل: ارباب کشف اور اصحاب بصیرت کا کہنا ہے کہ انسانی بدن، جہنم کے مشابہ ہے اور دروازہ جہنم پر انیس فرشتے (زبانیہ) مقرر ہیں تو اس بدن پر بھی انیس پہریدار زبانیہ کی طرح موجود ہیں اور وہ یہ ہیں پانچ حواس ظاہرہ، پانچ حواس باطنہ، سات قوت طبعیہ اور ایک شہوت اور ایک غضب۔ یہ کل انیس زبانیہ بدنیہ ہیں جن میں سے ہر ایک گرچہ جنس کے اعتبار سے ایک ہے مگر تشخص وتعدد کے اعتبار سے ہر ایک کی لاتعداد صورتیں ہوتی ہیں بطور مثال ایک قوت باصرہ ہی کو لے لیجئے کہ جن اشیاء کا قوت باصرہ ادراک کرتی ہے وہ غیر متناہی ہیں اور ان امور غیر متناہیہ کے ادارک سے قلب میں ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے اس اثر کا نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ قلب عالم روحانیات کی بلندی سے عالم جسمانیات کی پستی کی طرف آجاتا ہے۔اور جب اس طرح قلب مادی علائق وعوائق کے درمیان محصور ہوجاتا ہے تو ان ظلمات وتاریکیوں سے خلاصی اگر ممکن ہے تو صرف اللہ عز شانہ کے فضل وکرم اور اس کی اعانت ومدد ہی سے ممکن ہے الغرض بندہ کے نقصانات اور اس کی عاجزی ودرماندگی کی کوئی انتہا نہیں اور رب تعالیٰ کی رحمت وقدرت اور اس کی حکمت کی انتہا نہیں۔اس لئے استعاذہ باللہ تمام اوقات میں واجب ولازم ہے۔اسی سبب سے ہر قول وعمل کے آغاز میں اور ہر تلفظ وکلمات کے شروع میں ہم پر ضروری ہے کہ ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ''کہتے رہیں۔

دوسری دلیل: اس حیات مستعار میں انسان کو دو قسم کی لذتیں حاصل ہوتی ہیں۔ایک لذات حسیہ، دوسری لذات خیالیہ۔اور وہ لذت ریاست وسرداری ہے۔اور ان دونوں قسم کی لذتوں کا انسان کو شعور وادراک نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ دونوں قسموں کی تحصیل کے لئے مشق وممارست نہ کرے۔ پھر جب انسان ان لذتوں سے مشق وممارست کرتا ہے، ان لذتوں سے آشنا ہوتا ہے اور لذت حاصل کرتا ہے تو ان میں اس کی رغبت ودلچسپی بڑھ جاتی ہے اب رفتہ رفتہ دن بدن اس کی

رغبت ودلچسپی ادنیٰ لذت سے، اعلیٰ سے اعلیٰ لذتوں کے حصول کی طرف ترقی کرتی رہتی ہے۔غرضیکہ انسان جس قدر مطالب ومقاصد حاصل کرتا ہے اسی قدر اس کی حرص وہوس اور شہوت ورغبت بھی ترقی پذیر ہوتی ہے گویا کہ جس طرح مرتبہ کمالات کی کوئی انتہاء نہیں اسی طرح مرتبہ حرص وہوس کی بھی کوئی انتہا نہیں تو جس طرح کمالات کے تمام مراتب کی تحصیل ممکن نہیں اس طرح قلب سے شوق وحرص ودیگر امراض قلب کا ازالہ ممکن نہیں کہ انسان اس کے علاج پر قادر نہیں اس لئے بندہ پر واجب ہے کہ رحیم وکریم اور ناصر ومددگار حقیقی کی طرف رجوع کرے تو یہ کہے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

تیسری دلیل: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہ'' سے جیسے عیاں ہے کہ بندہ اور اس کے سارے امور کی پناہ گاہ درگاہ رب العزت ہے اور اس کا حل باب کریم ہی سے ہوسکتا ہے، اسی طرح دوسری آیات ، جیسے 'اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن''اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ، ''اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ ۠ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ؕ وَ الْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْن " کا مفاد بھی یہی ہے کہ ہر چیز میں بندہ کو جوار الٰہی کی پناہ ڈھونڈنا چاہئے نیز بعض کتب الٰہیہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ قسم ہے میری عزت وجلال کی کہ میں اس بندہ کے امید کی رسی کو کاٹ دیتا ہوں جو نا امیدی کے وقت میرے غیر سے امیدوار ہوتا ہے۔اور میں ایسے شخص کو لوگوں کے سامنے ذلت و رسوائی کا لباس پہنا دونگا اور میرے قرب سے محروم ہوگا میرے وصال سے دور رہے گا اور میں اسے حیرت زدہ فکرمند کردونگا جو شدائد میں میرے غیر سے مدد چاہے گا جب کہ شدائد میرے ہی قبضہ وقدرت میں ہیں اور میں ہی حی قیوم ہوں پس جو میرے غیر کا امیدوار ہے اور دروازہ غیر پر دستک دیتا ہے حالانکہ سارے خزانے کی کنجیاں میرے ہی قبضے میں ہیں تو وہ خزانے ایسے کے لئے مقفل ہونگے لیکن جو مجھے پکارتا ہے اس کے لئے ہر وقت میری رحمت کے دروازے کھلے ہیں۔

مسئلہ سوم: تعوذ کی بحث میں یہ اعتراض نہایت اہم اور معرکۃ الآراء ہے جو معتزلہ کی طرف سے جبریہ پر وارد کیا جاتا ہے وہ کہتے ہیں کہ مذہب جبریہ پر استعاذہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے جب کہ استعاذہ کا حکم قرآن حکیم سے ثابت ہے تو لازماً جبریہ کا مذہب چند وجوہ سے باطل ہے۔

اول: ارشاد باری تعالیٰ ''اَعُوْذُ بِاللّٰہ'' میں اعتراف ہے کہ بندہ اس استعاذہ کا فاعل ہے کیونکہ اگر اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہو تو بندے کا استعاذہ کا فاعل ہونا ممتنع ہوجائے گا کہ تحصیل حاصل محال ہے۔نیز جب اللہ عزشانہ نے اس فعل کو بندہ میں پیدا کردیا تو اس کا دفع محال ہے اور اگر نہ پیدا کرے تو حصول محال ہے غرض اس سے واضح ہے کہ بندہ اپنے

افعال کا خالق ہے۔

دوم: استعاذہ اس وقت درست ہوگا جب اللہ عز شانہ مستعاذ منہ (جس چیز سے پناہ مانگی جائے) کا خالق نہ ہو لیکن جب اللہ عز شانہ کو ان امور مستعاذ منہ کا خالق مانا جاے گا تو ان امور سے اللہ کی پناہ مانگنا محال ہوجائے گا کیونکہ اس تقدیر پر لازم آئے گا کہ بندہ اللہ کی، اللہ ہی سے ان امور میں پناہ مانگ رہا ہے جس کا فاعل اللہ ہے اور یہ بداہۃً باطل ہے۔

سوم: معاصی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ معاصی سے راضی نہیں ہے۔ پس اگر معاصی اللہ تعالیٰ کی تخلیق، اس کے قضاوقدر اور حکم سے ہو تو لازم ہے کہ بندہ اس سے راضی رہے چونکہ بالاجماع ثابت ہے کہ بندہ کو قضاء الٰہی پر راضی رہنا واجب ہے۔ اس لئے یہ مانے بغیر چارۂ کار نہیں کہ معاصی کا خالق خود بندہ ہی ہوتا ہے۔

چہارم: شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلبی معقول ومناسب اس وقت ہوگی جب وسوسہ شیطان کا فعل ہو لیکن اگر اس کو اللہ تعالیٰ کا فعل قرار دیا جائے تو وسوسہ کے وجود میں شیطان کا بالکلیہ دخل نہ رہے گا، پس جب شیطان کا دخل ہی نہیں تو پھر شر شیطان سے کیونکر استعاذہ صحیح ہے۔ بلکہ اس تقدیر پر تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے شر سے پناہ مانگا جارہا ہے اس لئے کہ فعل الٰہی ماننے کی صورت میں تمام شر بھی اسی کی طرف منسوب ہورہے ہیں۔

پنجم: اس تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ افعال کا خالق ہے۔ شیطان کہہ سکتا ہے کہ مولیٰ تو مخلوقات کا معبود ہے میری طرف سے تیرے بندوں کے سینوں میں جو وسوسہ ہوتا ہے اس کو تو جانتا ہے تیری قدرت کی مخالفت کرنے پر مجھے کوئی قدرت نہیں اور تو ہی میرے اوپر حاکم ہے تیرے حکم کے خلاف مجھے بھی قدرت نہیں ہے تیرے ہی حکم سے میں وسوسہ ڈالتا ہوں ان بندوں کے قلوب میں جو وسوسہ پیدا ہوتا ہے اس میں میرا کوئی دخل نہیں پھر تو نے یہ فرمایا (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا)، (يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ)، (وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ) پس ان اعذار ظاہرہ اور اسباب قویہ کے ہوتے ہوئے تیری حکمت ورحمت میں کیونکر ممکن ہے کہ تو مجھے مذموم وملعون گردے جب کہ تو ہی سارے افعال کا خالق ہے۔

ششم: شیطان یہ بھی کہہ سکتا ہے مولیٰ تو نے مجھے مردود وملعون کردیا، یا تو اس سبب سے کہ مجھ سے ایک جرم صادر ہوا ہے یا بغیر صدور جرم کے، اگر مجھ سے جرم صادر ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جبر باطل ہے اور اگر جرم صادر نہیں ہوا اس کے باوجود تو نے مجھے ملعون کردیا تو یہ محض ظلم ہے۔ حالانکہ تیرا ارشاد ہے (وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ) تو پھر

تیری ذات سے یہ کیونکر ممکن ہے۔غرض شیطان کے اس معارضہ سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ کو افعال کا خالق کہا جائے۔

مذکورہ بیان میں گرچہ قدریہ معتزلہ نے بظاہر مذہب جبر کو رد کیا ہے مگر اس پردہ میں انہوں نے اہل سنت و جماعت کے عقیدہ حقہ پر شب خون مارا ہے۔اس بارے میں اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ بندہ رب کی طرح اپنے افعال کا خالق نہیں ہے جیسا کہ قدریہ ومعتزلہ کہتے ہیں اور نہ ہی پتھر کی طرح مجبور محض ہے جیسا کہ جبریہ کا عقیدہ ہے بلکہ ان دونوں کے بین بین اہل سنت کا مذہب ہے کہ بندہ مجبور وخالق نہیں بلکہ کاسب ہے۔اس لئے اہل سنت و جماعت نے بڑی سختی کے ساتھ جبر وقدر دونوں کا رد کیا ہے۔تعوذ سے چونکہ قدریہ نے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے پس اہل سنت نے یہاں صرف انہیں کا رد کیا ہے۔ذیل میں قدریہ کے سوالات کا جواب ملاحظہ کیجئے اہل سنت نے ان کے اشکالات کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو شبہات تم نے ہم پر عائد کیا ہے بعینہ وہی شبہات تم پر بھی دو طریقے سے عائد ہوتے ہیں۔

طریق اول: تمہارے مذہب کے مطابق بندہ کو جو قدرت حاصل ہے ہم اس قدرت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ قدرت فعل کے دونوں طرف میں سے کسی ایک طرف کی معین و مددگار ہے یا معاً فعل کے دونوں طرف کی صالح ہے پہلی صورت کہ طرفین میں سے صرف ایک طرف میں قدرت ثابت ہونے کی تقدیر پر،طرف آخر میں جبر لازم آئے گا۔رہی دوسری صورت کہ قدرت معا طرفین کی صالح ہے پس اس صورت میں طرفین میں سے ایک طرف کو راجح ہونے کیلئے دوسری طرف پر سوال ہوگا کہ طرفین میں سے طرف واحد کا رجحان مرجح پر موقوف ہے یا نہیں اگر مرجح پر موقوف ہے تو ہم اس مرجح پر کلام کریں گے کہ اس مرجح کا فاعل بندہ ہے یا اللہ تعالیٰ ہے اگر بندہ ہے تو پھر سرے سے گفتگو جاری ہوگی اور تسلسل لازم آئے گا اور اگر اللہ تعالیٰ اس کا فاعل ہے تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ اس مرجح کو وجود دیگا تو وہ فعل واجب الوقوع ہوجائے گا اور اگر اللہ تعالیٰ اس کو وجود نہیں دیگا تو فعل ممتنع الوقوع ہوگا اس وقت تم پر وہ سارے ایرادات لازم آئینگے جو تم نے جبر کے خلاف وارد کئے ہیں،لیکن دوسری صورت کہ طرفین میں سے ایک طرف کسی مرجح پر موقوف نہیں ہے پس یہ بھی دو وجہوں سے باطل ہے۔وجہ اول یہ کہ اگر یہ جائز ہوجائے تو ممکن کے دونوں طرف میں سے ایک طرف کو دوسرے پر مرجح کی بنیاد پر ترجیح دینے کا استدلال باطل ہوجائے گا۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اس تقدیر پر وہ رجحان علی سبیل الاتفاق واقع ہوگا اور بندہ سے صادر نہ ہوگا غرضیکہ ان تمام صورتوں میں جبر محض عود

کرتا ہے اور تمام تر وہ سب ایرادات وارد ہوتے ہیں جو قدریہ نے ہم پر لازم کیا ہے۔

طریق دوم: تم قدریہ نے تسلیم کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جمیع معلومات کا عالم ہے اور یہ بھی متحقق کہ شئ کا وقوع باری تعالیٰ کے علم کے خلاف، متقاضی ہے کہ اس کا علم جہل سے تبدیل ہوجائے اور وہ محال ہے اور مفضی الی المحال محال ہے، لہذا قضاء وقدر کے بارے میں جو تم نے سوال قائم کیا ہے بعینہ وہ سوالات تم پر قائم ہوں گے۔

کلام اھلسنت: قدریہ کے خیالی نظریہ فاسدہ کا رد کرتے ہوتے اہل سنت کہتے ہیں کہ "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" سے مقصود یا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان کو عمل وسوسہ سے نہی وتحذیر کے ذریعہ روکے یا قہر وجبر کے طریقے سے روک دے۔ اگر اول صورت مراد ہو تو اللہ عز شانہ نے شیطان کو زجر وتوبیخ سے ضرور روکا ہے۔ اور جب روک چکا ہے تو پھر سے اسے روکنے کا مطالبہ کرنا محال ہوگا اس لئے کہ تحصیل حاصل محال ہے اور اگر دوسری صورت مراد ہے تو وہ جائز نہیں ہے کیونکہ قہر وجبر سے روکنا جبر کو مستلزم ہے جب کہ ثابت ہے کہ شیطان مکلف ہے اور جبر واجبار تکلیف کے منافی ہے۔

وجہ دوم: ہم پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی حالت کے صلاح کا ارادہ کرتا ہے یا نہیں؟ اگر حق اول ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے اصلاح حال کا ارادہ کرتا ہے تو اس وقت شیطان حال عبد کے بگاڑنے کی توقع کریگا یا نہیں؟ اگر اس وقت شیطان حال عبد کے افساد کی توقع رکھے گا تو یہ کیونکر ممکن ہے جب کہ اللہ اصلاح حال کا ارادہ کر چکا ہے، پھر اس کو پیدا ہی کیوں کیا اور بندہ کے اوپر اس کو مسلط ہی کیوں کیا۔ اور اگر شیطان سے بندہ کے افساد حال کی توقع ہی نہ ہو تو پھر کیا ضرورت ہے بندہ کو شیطان سے استعاذہ کی اور اگر اللہ بندہ کے حال کی اصلاح کا ارادہ نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے استعاذہ کے ذریعے شر شیطان سے بچنے کا فائدہ کیسے ہوسکتا ہے؟

وجہ سوم: شیطان فعل شر پر یا تو مجبور ہے یا تو فعل شر وخیر دونوں پر بیک وقت قادر ہے اگر اول ہے یعنی شیطان فعل شر پر مجبور ہو تو یہ مذہب قدریہ کے خلاف ہے چنانچہ ان کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صلاح وخیر ہی کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہو یعنی شیطان فعل خیر وشر دونوں پر قادر ہو تو اس وقت فعل خیر کو فعل شر پر ترجیح دینے کے لئے کسی نہ کسی مرجح کی ضرورت ہوگی اور وہ مرجح ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا پس جب وہ مرجح اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے تو استعاذہ سے کیا حاصل!

وجہ چہارم: فرض کر لیجئے کہ بشر شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے سبب سے معاصی میں گرفتار ہوا تو پھر شیطان کیسے

معاصی میں مبتلا ہوا اگر یہ کہیں کہ شیطان معاصی میں دوسرے شیطان کی وجہ سے گرفتار ہوا تو یہ تسلسل کو مستلزم ہے۔ اور اگر یہ کہیں کہ شیطان معاصی میں کسی دوسرے شیطان کی وجہ سے نہ گرفتار ہوا تو سوال ہوگا کہ آخر انسان کے ساتھ یہ کیوں نہیں ممکن ہے اور اگر ممکن ہے تو اس تقدیر پر شیطان سے استعاذہ میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو بشر پر تو مسلط کیا ہے لیکن شیطان پر کسی دوسرے شیطان کو مسلط نہیں کیا ہے تو یہ نہایت ہی افسوس ناک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر تو شیطان کو مسلط کر دے اور شیطان پر کسی دوسرے کو مسلط نہ کرے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر نہایت ہی مہربان ہے۔

وجہ پنجم: فعل مستعاذ منہ اگر معلوم الوقوع ہے تو وہ واجب الوقوع ہے اور جب واجب الوقوع ہوگا تو استعاذہ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اگر غیر معلوم الوقوع ہے تو ممتنع الوقوع ہوگا اس صورت میں بھی استعاذہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا ۔حاصل یہ کہ فریقین کے مناظرہ سے کوئی تعوذ کی حقیقت تک رسائی نہیں حاصل کرسکتا البتہ وہ بندہ جس پر یہ منکشف ہوجائے کہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے اور صرف اسی کی پناہ لی جاسکتی ہے جیسا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں ایک فیصلہ کن حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اللھم انی اعوذ برضاک من سخطک، واعوذ بعفوک من غضبک واعوذ بک منک لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔ یعنی اے اللہ میں تیری رضا کی بدولت تیری ناراضگی سے اور تیری معافی کی بدولت تیری عقوبت سے اور تیری ذات کے بالمقابل تیری پناہ چاہتا ہوں۔ میں تیری تعریف کی طاقت نہیں رکھتا تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف کی ہے۔

رکن دوم: (المستعاذ به) یعنی جس لفظ یا جن کلمات سے استعاذہ کیا جائے واضح رہے کہ کلمات استعاذہ قرآن وحدیث میں دو طریقے پر وارد ہیں۔ ایک یہ کہ "اعوذ بالله" کہے۔ دوسرا یہ کہ "اعوذ بکلمات الله" کہا جائے۔ طریق اول کی کامل تفسیر "لفظ الله" کی مکمل تفسیر معلوم کرنے کے بعد ہی ہوسکتی ہے اور اس کی مکمل تفسیر "بسم الله" کی تفسیر سے معلوم ہوگی۔ البتہ دوسرا طریقہ یعنی "اعوذ بکلمات الله التامات" تو اس کا مختصر مفہوم ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

پس خیال رہے کہ "کلمات الله" سے مراد اللہ تعالیٰ کا قول "اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ" (النحل، آیت: ۴۰) یعنی جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں ہوجا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ اور مراد ارشاد "کن" سے ممکنات میں اس کی قدرت کا نفاذ، اور کائنات میں اس کی مشیت کا جریان ہے اس

طور پر کہ اس کی قدرت ومشیت میں کسی مانع وعارض کو دخل نہیں اس لئے کوئی شک نہیں کہ استعاذہ باللہ، اسی لئے ضروری ہے کہ اللہ قدرت قاہرہ اور مشیت نافذہ سے موصوف ہے۔ نیز جسمانیات، اسکا حدوث علی سبیل الحرکۃ ہوتا ہے اور قوت سے فعل کی طرف اس کا خروج رفتہ رفتہ ہوتا ہے اس کے برخلاف روحانیت کا خروج وحصول قوت سے فعل کی طرف دفعتاً ہوتا ہے پس جب واقعہ یہ ہے تو روحانیت کا حدوث اس حرف کے مشابہ ہوگیا جو آن غیر منقسم میں موجود ہوتا ہے لہذا اسی مناسبت کی وجہ سے رب قدیر کی قدرت کے نفاذ کو ''کلمہ'' سے موسوم کیا گیا۔ نیز علم معقولات میں یہ ثابت ہے کہ عالم ارواح، عالم اجسام پر حاکم ہے چنانچہ عالم ارواح عالم اجسام کے امور کے لئے مدبرات ہیں جیسا کہ اللہ عزشانہ کا ارشاد ہے۔ ''فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (النازعات/۵) یعنی (فرشتے) پھر کام کی تدبیریں کریں۔ گویا ''اعوذ بکلمات اللہ التامات'' سے ارواح عالیہ مقدسہ طاہرہ طیبہ کی پناہ لینا ہے ارواح خبیثہ ظلمانیہ مکدرہ کے شرور کے دفع کرنے میں، حاصل یہ کہ ''کلمات اللہ التامات'' سے مراد، ارواح عالیہ طاہرہ ہیں۔

ایک دقیق نکتہ: اس مقام پر ایک لطیف نکتہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قول ''اعوذ بکلمات اللہ التامات'' سے تعوذ کرنا اس وقت کے لئے ہے جب بندہ کی نگاہ قدرے غیر اللہ کی طرف ملتفت ہو لیکن جب بندہ توحید کے عمیق ترین سمندر میں غوطہ زن ہوجائے اور حقائق کی گہرائی تک رسائی حاصل کرلے اور اس طرح ہوجائے کہ وہ وجود میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ دیکھے تو اس وقت بندہ کلمات اللہ کا استعاذہ نہ کرے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا استعاذہ کرے اور اسی کی پناہ لے اور صرف اور صرف اسی پر توکل واعتماد کرے تو یقیناً اس وقت اس کی زبان سے ''اعوذ باللہ، یا اعوذ من اللہ باللہ'' نکلے گا جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اعوذ بک منک'' بلکہ اس طرح تعوذ کرنے میں بھی بندہ کا قلب غیر کی جانب مائل نظر آتا ہے کیونکہ استعاذہ یا تو کسی شئی کی طلب کے لئے کرے گا یا کسی شئی سے دور بھاگنے کے لئے کریگا۔ بہر دو تقدیر غیر اللہ کی طرف اشتغال پایا جاتا ہے، لیکن جب بندہ اس مقام سے بھی ترقی کرکے بلند مقام پر پہنچتا ہے اور اپنے نفس کو فنا کردیتا ہے بلکہ خود کو فناء کرکے لاشئی کی منزل میں کرلیتا ہے تو وہ اس وقت قول ''اعوذ باللہ'' کے مقام سے ترقی کرکے قول ''بسم اللہ'' کے بحر نورانیت میں ڈوب جاتا ہے جیسا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ''اعوذ بک منک'' فرمایا تو اس مقام سے ترقی کرکے ارشاد فرمایا ''انت کما اثنیت علی نفسک''۔

رکن سوم: (المستعیذ) پناہ لینے والا۔ ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' میں بندہ کو گویا یہ حکم

ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ عز شانہ کی پناہ لیتا رہے کیوں کہ یہ حکم کسی شخص معین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ علی سبیل العموم ہے چنانچہ حضرات انبیاے کرام علیہم السلام اور اکابر اولیاے کرام سے بھی تعوذ منقول ہے جس کا مفاد یہ کہ ہر بندہ پر استعاذہ لازم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تعوذ کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے۔ ''قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ'' اے میرے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ (ھود: ۴۸) اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو خلعت عطا فرمائی ایک سلامتی کی دوسری برکتوں کی ارشاد باری تعالیٰ ہے ''قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ'' فرمایا گیا اے نوح! کشتی سے اتر ہماری طرف سے سلام اور برکتوں کے ساتھ (ھود: ۴۸) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا سے دشواری کا سامنا کرنا پڑا تو فرمایا ''قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَاىَ'' کہا اللہ کی پناہ، وہ عزیز تو میرا پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔ (یوسف: ۲۳) اس پر اللہ رب کریم نے آپ کو بھی دو خلعتیں عطا فرمائیں، صَرف سو، اور صَرف فحشا، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَ الۡفَحۡشَآءَ'' ہم نے یونہی کیا کہ اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں (آیت: ۲۴) دوسرے مقام پر آپ نے اس وقت معاذ اللہ کا ورد کیا جب آپ کے بھائی نبیامین کے بورا میں کاسہ پڑا ملا، بنیامین کے دوسرے بھائیوں نے عرض کیا آپ ہم میں سے کسی بھی ایک کو ان کے بدلے رکھ لیں مگر بنیامین کو چھوڑ دیں تو آپ نے فرمایا ''قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنۡ نَّاۡخُذَ اِلَّا مَنۡ وَّجَدۡنَا مَتَاعَنَا عِنۡدَهٗۤ'' خدا کی پناہ کہ ہم لیں مگر اسی کو جس کے پاس ہمارا مال ملا۔ (یوسف ۷۹) اس کا صلہ اللہ عز شانہ نے آپ کو یہ دیا کہ آپ کو والدین کا مسجود بنا دیا چنانچہ ارشاد الٰہیہ ہے۔ 'وَ رَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ'' اور اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدے میں گرے (یوسف ۱۰۰) یونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا تو قوم نے کہا تھا' قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ'' یعنی بنی اسرائیل بولے کیا آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں (البقرۃ ۶۸) خالق کائنات نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دو خلعتوں سے نوازا ایک ازالۂ تہمت، دوسری احیاء قتیل کا معجزہ۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے ''فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ وَ يُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ'' تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا سے مارو اللہ یونہی مردے جلائیگا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو۔ (البقرۃ 73) نیز جب قوم نے آپ کو قتل کی دھمکی دے کر خوف زدہ کر دیا تو

آپ نے اپنے رب کی پناہ لی اور فرمایا "وَ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ اَنۡ تَرۡجُمُوۡنِ" اور میں پناہ لیتا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔ (الدخان ۲۰) دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہے "وَ قَالَ مُوۡسٰۤی اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ اور موسیٰ نے کہا میں تمہارے اور اپنے رب کی پناہ لیتا ہوں ہر متکبر سے جو کہ حساب کے دن پر یقین نہیں لاتا۔ (غافر ۲۷) اللہ رحیم وکریم نے آپ کی حفاظت فرمائی اور آپ کے دشمنوں کو ہلاک وبرباد اور غرقاب کیا اور ان کے گھر زر زمین سب کا مالک آپ کی قوم بنی اسرائیل کو بنا دیا۔ والدۂ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم، کی والدہ حضرت حنہ نے حضرت مریم کی پیدائش کے موقع پر فرمایا تھا "اِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ" اور میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں راندے ہوئے شیطان سے۔ (ال عمران ۳۶) اس پر اللہ پاک نے آپ کو خلعت وقبول کی نعمت سے مالا مال فرمایا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ 'فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّ اَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا' تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے اچھا پروان چڑھایا (ال عمران ۳۷) اسی طرح حضرت مریم نے خلوت میں حضرت جبریل کو دیکھا کہ ایک خوبصورت بشر کی شکل میں میری طرف آرہے ہیں تو عرض کیا "قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡکَ اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا" بولی میں تجھ سے رحمن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے خدا کا ڈر ہے۔ (مریم ۱۸) اس تعوذ پر اللہ نے آپ کو دو عظیم نعمتیں عطا فرمائیں۔ ایک بے باپ کے ایسا لڑکا جو کلمۃ اللہ، روح اللہ کے لقب سے ملقب ہو کر اولوالعزم رسولوں سے ہوئے، دوسری نعمت یہ کہ اس بچہ نے آپ کی ذات سے تہمت ورسوائی کو دفع کر کے آپ کی طہارت و پاکدامنی کی گواہی دی چنانچہ قرآن حکیم میں ہے "قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا" (مریم ۳۰) بچہ نے فرمایا میں ہوں اللہ کا بندہ، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے غیب کی خبریں بتانے والا (نبی) کیا۔ اسی طرح خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے کئی بار استعاذہ کا حکم دیا۔ سورہ مومنون میں ہے۔ "وَ قُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ وَ اَعُوۡذُ بِکَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ" (المومنون ۹۷) اور تم عرض کرو کہ اے میرے رب تیری پناہ شیاطین کے وسوسوں سے اور اے میرے رب تیری پناہ کہ وہ میرے پاس آئیں۔ اور سورہ معوذتین یعنی 'قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ وقُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ" میں دفع شر جن وانس کے لئے بہت واضح انداز میں تعوذ کا حکم وارد ہے پھر سورہ اعراف میں اس طرح ہے۔ 'خُذِ الۡعَفۡوَ وَ اۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِیۡنَ وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ اے محبوب! معاف کرنا اختیار کرو اور بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے منہ پھیر لو اور اے سننے والے اگر شیطان تجھے کوئی کونچا دے تو اللہ کی پناہ مانگ بیشک وہی سنتا جانتا ہے۔ (اعراف:۲۰۰)۔الغرض قرآن حکیم کی بہت سی آیتیں شاہد ہیں کہ اللہ عزشانہ نے حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کو استعاذہ کا حکم دیا ان نفوس قدسیہ نے شیاطین جن وانس کے شر سے حفاظت کے لئے ہمیشہ استعاذہ فرمایا۔

احادیث استعاذہ: آیات قرآنیہ کے علاوہ احادیث پاک میں بھی تعوذ کے فضائل وفوائد بکثرت بیان ہوئے ہیں۔

حدیث نمبر ۱: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو شخص حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھگڑ پڑے اور اس میں وہ دونوں کچھ زیادہ ہی بگڑ گئے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ایک ایسے کلمہ کا علم ہے کہ اگر دونوں جھگڑنے والے کہہ لیں تو دونوں سے جھگڑا ختم ہوجائے وہ کلمہ اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ہے۔

توضیح حدیث: بچند وجوہ، عقلی اعتبار سے بھی یہ ثابت ومقرر ہے کہ غیظ وغضب کے وقت بندہ اس کلمہ کا ورد کرلے گا تو اس کا غیض وغضب جاتا رہے گا۔

وجہ اول: چونکہ انسان کو اتنا سا تو علم ہے کہ اس کو عالم کے مصالح اور مفاسد کا بہت کم علم ہے پھر اس قلیل علم کی معرفت بھی اسکو بذریعہ عقل ہی ہوسکتی ہے کہ عقل حصول علم کا سب سے قوی سبب ہے اور یہ بھی مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے کہ غضب کے وقت آدمی کی عقل جاتی رہتی ہے پس اس وقت آدمی جو کرتا ہے یا جو بولتا ہے اس کا قول وعمل اچھا نہیں ہوتا۔لیکن جب اس آدمی کے دل میں یہ معنی (تعوذ) مستحضر ہوگا تو یہ معنی افعال شنیعہ اور اقوال قبیحہ کے اقدام کرنے سے نہ یہ کہ صرف روکے گا بلکہ خیرات وبرکات کے حصول کے لئے اور آفات وبلیات کے دفع کے لئے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کریگا اس وقت یقینا آدمی (اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم) کہے گا۔

وجہ دوم: انسان بوقت مخاصمت قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ہی حق پر ہوں اور میرا مد مقابل باطل پر ہے جب بندہ کو اتنی بات کا علم وعقیدہ ہوگا تو وہ اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے گا اور اس بات کا یقین کرے گا کہ اگر حق میری طرف ہے تو اللہ یقینا میرے حق میں فیصلہ فرمائے گا اور اس کا مقابل نامراد رہے گا اور اگر اس کا مقابل حق پر ہے تو اللہ کے سپرد کرنے سے اس پر ظلم کرنے سے بچا رہے گا الغرض "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" کہنے ہی

میں بہرصورت عافیت ہے۔

وجہ سوم: انسان غضبناک ہوکر اپنے مقابل پر ظلم وزیادتی اس وقت کرتا ہے جب اسکو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقابل سے قوت وغلبہ میں زیادہ ہے اور قوت وغلبہ کی وجہ سے اپنے مقابل پر غالب آجائے گا لیکن جب اس کے ذہن میں یہ بات رہے گی کہ خالق کائنات مجھ سے کہیں زیادہ باقوت، صاحب قدرت اور قہر وغلبہ والا ہے اس کے باوجود میں نے بار بار اس کے احکام کی نافرمانی کی ہے لیکن وہ رحیم وکریم رب اپنے فضل وکرم سے میری نافرمانیوں کو تجاوز فرماتا رہا ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ میں بھی اپنے مقابل سے تجاوز کرجاؤں اور یہ داعیہ اس کے ذہن میں اسی وقت پیدا ہوگا جب یہ معنی اس کے ذہن میں ہوگا اس طرح وہ منازعت وخصومت کو ترک کردیگا اور کہے گا "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" واضح رہے یہ معانی آیت مبارکہ "اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ" یعنی بیشک وہ جو ڈر والے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے ہوشیار ہوجاتے ہیں اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ (الاعراف ۲۰۱) سے ماخوذ ہیں آیت متلوہ کا مفہوم بہت واضح ہے وہ یہ کہ بندہ ان اسرار ومعانی کا ادراک کریگا تو اسے رشد وہدایت کا راستہ صاف دکھائی دے گا اس طرح وہ نزاع ودفاع سب کو ترک کرکے قضاے مولیٰ پر راضی رہے گا۔

حدیث نمبر ۲: حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص تین مرتبہ صبح میں "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھے اور سورہ حشر کی آخری تین آیتوں کی تلاوت کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتوں کو مقرر فرمادے گا جو شام تک اس کے لئے دعاے رحمت ومغفرت کرتے رہیں گے اسی طرح جو شام میں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کیلئے ستر ہزار فرشتوں کو مقرر فرمائے گا جو صبح تک اس کے لئے رحمت ومغفرت کی دعا کرتے رہیں گے اور پھر اگر اسکو اسی دن موت آگئی تو درجہ شہادت پائے گا۔

عقلی طور پر اس کی تقریر یہ کی جاسکتی ہے کہ قول "اعوذ باللہ" میں اپنے نفس کی کمال عاجزی وغایت درجہ درماندگی کا اظہار ومشاہدہ ہے اور سورہ حشر کی آخری تینوں آیات میں رب تعالیٰ کے کمال وجلال اور اس کی عظمت وجبروت کا اظہار ومشاہدہ ہوتا ہے۔ اور بندہ مقام عبودیت پر جب اپنی عاجزی وخاکساری اور رب تعالیٰ کی قدرت وکبریائی اور اس کے جلال وکمال کا مشاہدہ کرلیتا ہے تو اسکا حال ومقام بلند ہوجاتا ہے۔

حدیث نمبر ۳: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ روایت کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دن میں دس مرتبہ استعاذہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مقرر فرماتا ہے جو اس سے شیطان کو دفع کرتا رہتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جب بندہ "اعوذ باللہ" کہتا ہے اور اس کو معنی استعاذہ کی معرفت ہوجاتی ہے تو اسکو اپنی قدرت واختیار کا فقدان اور علم وادراک کا نقصان سمجھ میں آجاتا ہے اور جب انسان کو اپنی کمی کا احساس ہوجاتا ہے تو وہ نفس امارہ کے بہکاوے میں نہیں آسکتا اس طرح وہ ایسے اعمال کے کرنے پر اقدام نہیں کریگا جس کی طرف اس کا نفس دعوت دیتا ہے اور چونکہ شیطان اکبر اس کا نفس امارہ ہے پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کلمہ کا ورد انسان سے شیطان کو دفع کردیتا ہے۔

حدیث نمبر ۴: حضرت خولہ بنت حکیم سے مروی ہے وہ روایت کرتی ہیں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی منزل یا مقام پر اترا اور پھر کہا "اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق" تو اس کو کوئی چیز نقصان نہیں دے سکتی یہاں تک کہ وہ اس گھر سے یا اس مقام سے چلا جائے۔

اس کی وجہ وہ ہے جو علوم عقلیہ میں ثابت ہے کہ نفوس قدسیہ روحانیہ کی کثرت، اشخاص جسمانیہ مادیہ کی کثرت سے زیادہ ہے چنانچہ تمام آسمان ارواح طاہرہ سے بھرے ہیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔ "أطت السماء، و حق لها أن تئط، مافيها موضع قدم الا و فيه ملک قائم او قاعد" یعنی آسمان چرچرایا اور اسے چرچرانا حق ہے، اس میں کوئی ایسی جگہ باقی نہیں جس میں ملک مکرم بیٹھے اور کھڑے نہ ہوں اسی طرح زمین و ساری فضا ارواح سے بھری پڑی ہیں ان میں بعض روحیں پاکیزہ، طاہرہ روشن اور سعید ہیں جبکہ بعض روحیں خبیث، نجس نقصان دہ اور شریر ہیں۔ پس جب بندہ "اعوذ بکلمات اللہ التامات" کہتا ہے تو گویا اس نے ارواح جسمانیہ خبیثہ کے شر سے ارواح طاہرہ کی پناہ لی ہے علاوہ ازیں تفسیر سابق میں یہ بات گذر چکی ہے کہ کلمات اللہ یہ اس کے ارشاد "کن" سے عبارت ہے اور وہ قدرت الٰہیہ نافذہ کا نام ہے اور یہ ظاہر کہ جو قدرت الٰہیہ کی پناہ کا طلبگار ہوگا اس کو کوئی چیز نقصان نہیں دے سکتی۔

حدیث نمبر ۵: حضرت عمرو بن شعیب سے مروی ہے وہ روایت کرتے ہیں اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی تم میں سے حالت نیند میں خوف زدہ ہوجاتا ہو تو وہ یہ کہے

"اعوذ بکلمات اللہ التامة من غضبه وعقابه و شر عباده ومن شر همزات الشياطين وأن يحضرون"۔ تو بیشک اس کو کوئی چیز نقصان نہیں دے سکتی۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان کلمات کو اپنے بالغ غلاموں کو سکھا دیتے تھے اور جو نابالغ ہوتا تو اس کے گلے میں اس کی تعویذ بنا کر لٹکا دیتے تھے۔

حدیث نمبر ۶: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے لئے تعویذ کرتے تھے تو فرماتے "اعیذ کما بکلمات اللہ التامة من کل شیطان وھامة'

حدیث نمبر ۷: مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم امر استعاذہ کو بہت عظیم سمجھتے تھے یہاں تک کہ آپ نے جب ایک خاتون سے عقد نکاح کیا اور اس کے ساتھ خلوت ہوئی تو اس خاتون نے کہا "اعوذ باللہ منک" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عذت بمعاذ فالحقی باھلک" یعنی تو نے معاذ کی پناہ مانگی ہے پس تو اپنے اہل کے ساتھ رہ۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تعوذ واستعاذہ کی کس قدر اہمیت ہے اسی لئے تو اپنے اس قائل کو نہ دیکھا بلکہ قول کو دیکھا واقعی جس کا قلب نور الٰہی سے منور رہتا ہے اس کی نگاہ قائل کی طرف نہیں ہوتی بلکہ قول کی طرف ہوتی ہے چنانچہ جب عورت صاحبہ نے کلمہ "اعوذ باللہ" کہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک اس کلمہ کی طرف مشغول ہو گیا اور پھر یہ نہ دیکھا کہ وہ خاتون اس کلمہ کو ارادہ سے کہہ رہی ہے یا بغیر ارادہ کہہ رہی ہے۔

حدیث نمبر ۸: حضرت حسن سے مروی ہے کہ ایک شخص اپنے غلام کو مار رہا تھا تو وہ غلام کہنے لگا "اعوذ باللہ" (مگر وہ مارنے سے باز نہیں آیا) اسی اثنا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو اس غلام نے حضور کو دیکھ کر کہا "اعوذ برسول اللہ" اب اس شخص نے مارنا چھوڑ دیا تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی پناہ لینے والا زیادہ حقدار ہے کہ اس کو معاف کیا جائے اس شخص نے کہا یا رسول اللہ میں گواہ بناتا ہوں کہ میرا غلام رضائے الٰہی کے لئے آزاد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم یہ نہ کہتے تو وہ تم کو جہنم کے گڑھوں میں ڈھکیل دیتا

حدیث نمبر ۹: سوید نے کہا کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منبر پر فرماتے ہوئے سنا

ہے ”اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم “اور فرماتے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ”اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم “ کہتے ہوئے سنا ہے اس لئے میں زندگی بھر اس کو پڑھنا چھوڑ نہیں سکتا۔

حدیث نمبر ۱۰: حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بہت مشہور ہے ”اعوذ برضاک من سخطک، واعوذ بعفوک من غضبک واعوذبک منک “اے اللہ تیری ناراضگی سے تیری رضا کی پناہ لیتا ہوں اور تیرے غضب سے تیرے عفو کی پناہ لیتا ہوں اور تیری طرف سے آنے والی مصیبتوں سے تیری پناہ لیتا ہوں۔

رکن چہارم :(مستعاذ منہ کا بیان) یعنی وہ چیز جس سے پناہ مانگی جائے اور جس سے پناہ مانگی جاتی ہے وہ شیطان ہے اور استعاذہ سے مقصود شیطان کے شر کا دفع کرنا ہے اور شیطان کا شر وسوسہ کے ذریعہ یا غیر وسوسہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ “یعنی وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب (شیطان) نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو۔ (البقرہ ۲۷۵) واضح رہے کہ اس باب میں علوم عقلیہ اور علم مکاشفہ سے متعلق کچھ دقیق مسائل کا بیان ضروری ہے اس لئے چند مسائل ذیل میں مذکور ہیں۔

مسئلہ اول: جن وشیطان کے وجود میں عقلاء کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے جن وشیاطین کے وجود سے انکار کیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہاں جن وشیاطین کی حقیقت وماہیت اور وجود پر کچھ بحث کر لی جائے۔ بر مذہب صحیح جن وشیطان، خالق کائنات کی ایک ناری مخلوق ہے مگر وہ اشخاص جسمانیہ مادیہ کی طرح نہیں کہ وہ انسان وبہائم کی طرح آئیں جائیں اور محسوس ومبصر ہو سکیں بلکہ وہ جسم ناری لطیف مخلوق ہے۔ اور اس میں دو قول محصل ہے۔

پہلا قول: جن وشیطان کے بارے میں پہلا قول یہ ہے کہ وہ اجسام ہوائیہ ہے جو مختلف شکلوں سے متشکل ہونے پر قادر ہے اسکو عقل وفہم بھی ہے اور مشکل ترین اعمال وافعال بجالانے پر قدرت بھی ہے۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ وہ موجودات غیر متحیزہ سے عبارت ہے یعنی وہ ایسے وجود کا نام ہے جو اپنے وجود میں کسی حیز کا محتاج نہیں اور نہ ہی اس میں حال ہے۔ بلکہ وہ موجودات مجردہ عن الجسم ہے پھر یہ موجودات کبھی ایسے بلند پاکیزہ ہوتے ہیں جو تدبیر اجسام سے مکمل پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ ایسی ذات مقدسہ ممیزہ کو ملائکہ مقربین سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”ط وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ “اور اس کے پاس والے اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ تھکیں۔ (الانبیاء ۱۹)

ان میں کئی مراتب ہیں (**مرتبہ اولی**): فرشتوں کا وہ افضل واشرف طبقہ جو عرش اعظم اٹھائے ہوتے ہیں یہ حاملین عرش کا وہ نورانی گروہ ہے جس کے بارے میں اللہ عزشانہ کا ارشاد ہے۔ 'وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ' اور اس دن تمہارے رب کا عرش اپنے اوپر آٹھ فرشتے اٹھائیں گے۔ (الحاقۃ ۱۷) (دوسرا مرتبہ) حافین عرش کا ہے فرشتوں کا وہ نورانی طبقہ جو عرش اعظم کو گھیرے ہوئے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ" اور تم فرشتوں کو دیکھو گے عرش کے آس پاس حلقہ کئے (الزمر ۷۵۔ (تیسرا مرتبہ) ان فرشتوں کا ہے جو ملائکہ کرسی کہلاتے ہیں، (چوتھا مرتبہ) ان فرشتوں کا ہے جو تمام آسمانوں کے طبقہ میں درجہ بدرجہ موجود ہیں۔ (پانچواں مرتبہ) کرۂ اثیر وارض کے ملائکہ کا ہے۔ (چھٹا مرتبہ) کرۂ ہوا کے فرشتوں کا ہے (ساتواں مرتبہ) کرۂ زمہریریہ کے ملائکہ کا ہے، (آٹھواں مرتبہ) ان فرشتوں کا ہے جو سمندروں پر مامور ہیں۔ (نوواں مرتبہ) ان فرشتوں کا ہے جو پہاڑوں پر مقرر ہیں اور (دسواں مرتبہ) ان فرشتوں کا ہے جو اس عالم رنگ وبو میں موجود اجسام حیوانات ونباتات میں تصرف کرنے والے ہیں۔

اس تمہید کے بعد ذہن نشین رہے کہ یہ ارواح دونوں قول مذکور کی تقدیر پر کبھی بہت پاکیزہ، نیک بخت اور سعید ہوتے ہیں انہیں صالحین کہا جاتا ہے۔ اور کبھی نہایت گندہ گدلا، بدبخت اور شقی ہوتے ہیں جن کو شیاطین کہتے ہیں وہ مادہ پرست نابالغان معرفت لوگ جو روحانیت سے کافی دور ہیں وہ یہی نہیں سمجھ سکے اور جن وشیاطین کے وجود سے یکسر انکار کر بیٹھے اس پر انہوں نے بہت دلیلیں پیش کی ہیں جن کی حیثیت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے ذیل میں منکرین کے دلائل اور اسکا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

دلیل اول: اگر شیطان موجود ہو تو وہ کثیف ہوگا یا لطیف ہوگا اور شیطان کا جسم کثیف یا جسم لطیف کے ساتھ موجود ہونا دونوں باطل ہے اس کا جسم کثیف ہونا اس لئے باطل ہے کہ اگر اس کا جسم کثیف ہو تو ضروری تھا کہ ہر سلیم العقل لوگ اس کو دیکھتے کیونکہ اگر یہ جائز ہو جائے کہ ہماری نگاہ کے سامنے مادی وکثیف اجسام موجود ہوں اور ہم اسکو نہیں دیکھ سکتے تو یہ بھی جائز ہوگا کہ ہماری نگاہوں کے سامنے بلند وبالا پہاڑ، روشن وتاباں چاند وسورج، جھلملاتے ستارے اور رعد وبرق موجود ہوں اور ہم اسکو نہ دیکھ سکیں۔ ظاہر ہے کہ اسکو کوئی سلیم العقل آدمی صحیح نہیں قرار دے سکتا۔ لہذا ماننا پڑیگا کہ جن وشیطان اگر جسم کثیف کے ساتھ موجود ہوتے تو ضرور دیکھے جاتے۔ اسی طرح اس کا جسم لطیف بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر لطیف ہوتا تو سخت آندھی اور تیز ہوائیں چلتے وقت اس کو ریزہ ریزہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جانا چاہئے۔ نیز لازم آئے گا کہ اعمال

شاقہ کے بجالانے پر کوئی قدرت وطاقت نہ ہوحالانکہ اہل سنت وجماعت اس کے لئے طاقت وقدرت مانتے اور جانتے ہیں۔

دلیل دوم: یہ اشخاص جنیہ اگر موجود ہوں، اس عالم کون میں حاضر ہوں، انسانوں کے ساتھ اس کا اختلاط ہوتو ظاہر وغالب یہ کہ جنوں کا انسانوں کے ساتھ وصل طول مخالطت ومصاحبت کے سبب، بطور دوستی ومحبت ہوگا یا بطور دشمنی وعداوت ہوگا اگر جن وانس کے درمیان صداقت ودوستی ہوتو ظاہر کہ لازماً اس سے منافع کا ظہور ہوگا اور اگر دوستی نہ ہو بلکہ دشمنی وعداوت ہوتو لازماً اس سے مضرت ونقصان لاحق ہوگا۔ حالانکہ ہم کو دوستی ودشمنی میں سے کسی کے بھی اثرات دیکھنے کو نہیں ملتے چنانچہ جو لوگ زندگی بھر اس راہ کے مسافر ہوتے ہیں اور جنوں کو قبضہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں جب وہ اکاذیب سے توبہ کرتے ہیں تو برملا کہتے ہیں کہ ہم نے کبھی جنوں کا کوئی اثر نہیں دیکھا یہ سب محض زبانی دعویٰ اور ڈھونگ تھا۔

دلیل سوم: اشیاء کی معرفت کا ذریعہ یا تو حس ہے یا خبر یا پھر دلیل، حواس کو ان اشیاء کی معرفت میں کوئی دخل نہیں کیونکہ جن اشیاء کی حقائق کے وجود وعدم کا مسئلہ ہم میں زیر بحث ہے ان اشیاء کا وجود یا تو صورت سے مفہوم ہوتا ہے یا اسکی صوت وآواز سے اور دونوں میں سے کسی کا ہم ادراک نہیں کرتے چنانچہ نہ ہی ہم کو اس کی صورت نظر آتی ہے اور نہ ہی آواز سننے کو ملتی ہے۔ تو پھر کس طرح اس کے احساس کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ اور جو لوگ جنوں کو دیکھنے یا ان کی آوازوں کو سننے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک گروہ ان مجانین کا ہے جو فساد مزاج وخرابی عقل کے باعث خیالات واوہام کو اشیاء خیال کر بیٹھتے ہیں اور پھر وہ اس گمان میں محو ہوتے ہیں کہ انہوں نے جنوں کو دیکھا ہے دوسرا گروہ کذابوں کا ہے جنکی باتیں سرتاپا اکاذیب پر مشتمل ہوتی ہیں پس اوہام وخیالات اور اکاذیب کی بنیاد پر کیونکر جن وشیاطین کا وجود تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

منکرین کا جواب: (رد) منکرین جن، کی پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ تم نے جن کے وجود کے انکار پر جو دلیل دی ہے اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن کے لئے جسم ہونا ممتنع ہے لیکن امتناع جسمیت سے نفس وجود کا ممتنع ہونا لازم نہیں آتا اس لئے ممکن ہے کہ جن جوہر مجرد عن الجسمیہ ہو اس مقام پر یہ جاننا ضروری ہے کہ جو لوگ جن کو جوہر مجرد عن الجسمیہ مانتے ہیں اس میں کئی گروہ ہیں۔

پہلا گروہ: یہ کہتا ہے کہ نفوس ناطقہ بشریہ جب ابدان سے مجرد ہوکر پایا جاتا ہے تو ان میں سعید وشقی اور خیر وشریر ہر دو

ہوتے ہیں پس ان میں جو اخیار ہیں وہ ملائکہ ارضیہ ہیں اور جو اشرار واشقیا ہیں وہ شیطان ارضی ہوتے ہیں۔

دوسرا گروہ: اس کا قائل ہے کہ جن وشیاطین جو ہر مجرد ہے یعنی جسم وعلائق جسم سے مجرد ہوتے ہیں پس وہ نفس ناطقہ بشریہ کی جنس کے مخالف ہے البتہ اس کی بہت سی نوعیں ہیں گروہ طاہرہ نورانیہ ہوں تو وہی ملائکہ ارضیہ ہوتے ہیں اور انہیں کو صالحین جن کہتے ہیں اور اگر خبیثہ شریرہ ہوں تو شیطان موذی ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ: سفلی ارواح کے وجود کا انکار کرتے ہیں البتہ ارواح مجردہ فلکیہ کو ثابت مانتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ وہ ارواح عالیہ قاہرہ قویہ ہیں اور وہ جواہر و ماہیات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں پس جس طرح ارواح بشریہ میں سے ہر ایک کے لئے ایک خاص بدن ہوتا ہے ایسے ہی ارواح فلکیہ میں سے ہر ایک کیلئے ایک بدن خاص ہوتا ہے۔ اور وہ بدن فلک معین ہوتا ہے جس طرح روح بشری کا تعلق اولاً قلب سے ہوتا ہے اور قلب کے توسط سے اس روح کا اثر سارے بدن کو پہنچتا ہے اسی طرح فلکی روح کا معاملہ ہے کہ اس کا تعلق اولاً کواکب سے ہوتا ہے پھر اس کے توسط سے اس روح کا اثر اس فلک کے جملہ متعلقات عالم کی طرف ہوتا ہے اور جس طرح بشری قلب ودماغ میں ارواح لطیفہ پیدا ہوتی ہیں اور یہی ارواح بدن کے تمام اعضا شرایین واعصاب میں پہنچتے ہیں جس سے قوت حیات، قوت حس و حرکت بدن کے سارے اعضاء میں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جرم کواکب سے خطوط شعاعیہ نکلتے ہیں جو اطراف عالم سے ملتے ہیں پھر اس خطوط شعاعیہ کے توسط سے کواکب کی تاثیری قوت اجزاء عالم میں اثر انداز ہوجاتی ہے جس طرح قلب ودماغ سے نکلے ہوئے ارواح فائضہ اجزاء بدن میں اثر انداز ہوتے ہیں جس سے بدن کے ہر ہر جز میں مختلف قوتیں جیسے قوت غاذیہ، قوت نامیہ، قوت مولدہ اور قوت حساسہ وغیرہ پیدا ہوتی ہیں تو گویا ان قوتوں کی حیثیت بدن کے جوہر نفس مدبرہ کے لئے نتائج واولاد یا ثمرات وغایات کی ہوتی ہیں بعینہ اسی طرح کواکب سے نکلے خطوط شعاعیہ کے ذریعے اجزاء عالم میں نفس مخصوصہ پیدا ہوتے ہیں جیسے نفس زید، نفس عمرو وغیرہ اور یہ نفوس کی حیثیت، نفوس فلکیہ کی اولاد کی سی ہوتی ہے، اور جب یہ متحقق ہے کہ نفوس فلکیہ اپنے جواہر و ماہیات کے اعتبار سے مختلف ہیں تو ظاہر ہے کہ نفوس فلکیہ سے پیدا شدہ ثمرات بھی مختلف ہونگے اس لئے نفس فلک زحل سے پیدا شدہ ثمرات الگ ہوں گے اور نفس فلک مشتری سے پیدا شدہ ثمرات ونتائج الگ ہوں گے جب افلاک کی ماہیت وحقیقت کے اختلاف کا یہ حال ہے تو مثلاً وہ نفوس جو روح زحل کی طرف منسوب ہیں وہ سب ایک دوسرے کے ہم جنس اور مشترک ہوں گے اسی طرح وہ نفوس جو روح مشتری کی طرف منسوب ہیں وہ سب ایک دوسرے کے ہم جنس اور مشترک ہوں گے مگر روح زحل کی

طرف منسوب نفوس بہر حال روح مشتری کی طرف منسوب نفوس سے طبع و ماہیت میں مختلف ہوں گے۔

مندرجہ بالا تمہید و تفصیل کے بعد فلاسفہ نے یہ کہا کہ علت معلول سے اقوی ہوتی ہے اور نفوس بشریہ میں ہر ایک کے لئے ایک طبیعت خاصہ ہوتی ہے جو ارواح فلکیہ کی معلول ہوتی ہے۔ گویا ارواح فلکیہ کی طبیعت، علت ہوتی ہے اور علت اقوی ہوتی ہے پس ارواح فلکیہ کی طبیعت، ارواح بشریہ کی طبیعت کی بہ نسبت اقوی و اعلیٰ ہوگی کہ علت ہے۔ الغرض ارواح فلکیہ کی حیثیت، ارواح بشریہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے، مشفق باپ اور مہربان سلطان کی طرح ہے۔ اسی لئے ارواح فلکیہ، ارواح بشریہ کی، اولاد کی طرح خدمت کرتی اور اس کے مصالح پر اس کی معین و مددگار رہوتی ہیں۔ چنانچہ کبھی نیند میں اور کبھی بیداری میں بصورت خواب و بصورت الہام اس پر فیضان کرتی ہیں پھر جب نفوس بشریہ کو اس خاصہ کے جنس سے قوت قویہ حاصل ہوتی ہے اور روح فلکی سے اس کا اتصال قوی اور مضبوط تر ہوتا ہے تو اس سے عجیب و غریب حرکات اور خارق عادات افعال سرزد ہونے لگتے ہیں یہی جن و شیاطین کی اصل ہے۔ غرض اس مذہب کے نظریہ کے مطابق جن و شیطان کا وجود تو ہے مگر وہ جسم و جسمانیت کے قبیل سے نہیں مانتے ہیں بلکہ مجردات سے مانتے ہیں۔ فلاسفہ نے مذہب مذکور پر زبردست طعن کیا ہے انکا خیال ہے کہ مجرد پر جزئیات کا ادراک ممتنع ہے۔ اور مجردات کا افعال جزئیہ کا فاعل ہونا ممتنع ہے یعنی مجردات کاسب و مکتسب نہیں ہو سکتے۔

بطلان قول فلاسفہ: فلاسفہ کا اعتراض دو وجہوں سے قابل اعتنا نہیں ہے۔

وجہ اول: ہم شخص معین پر حکم لگا سکتے ہیں انسان ہونے کا اور فرس نہ ہونے کا پس جو چیز حکم لگا رہی ہے وہ شئ واحد، مدرک ہے کلی کی اور وہ نفس ہے۔ غرض جزئی کا ادراک نفس کرتا ہے۔

وجہ دوم: اگر تسلیم کر لیں کہ نفس مجردہ ابتداءً جزئیات کے ادراک پر قادر نہیں ہے لیکن اس میں کوئی نزاع نہیں ہے کہ نفس آلات جسمانیہ کے توسط سے جزئیات کا ادراک کر سکتا ہے تو پھر ایسا کیوں نہیں ممکن ہے کہ جواہر مجردہ جس کو ہم جن و شیاطین کا نام دیتے ہیں وہ کرہ اثیر و زمہریر سے آلات جسمانیہ ہوں اور پھر وہ ان آلات جسمانیہ کے توسط سے جزئیات کے ادراک پر اور ابدان میں تصرف کرنے پر قادر ہو۔

لیکن وہ لوگ جن کا نظریہ یہ ہے کہ جن، اجسام ہوائیہ یا ناریہ سے ہے انکا کہنا یہ ہے کہ جسمیت اور مقدار میں سارے اجسام برابر ہیں اور جسمیت و مقداریت اعراض ہیں پس اجسام ان اعراض کے قبول کرنے میں برابر ہونگے۔ اور اشیاء اگرچہ ماہیت میں مختلف ہوں لیکن پھر بھی عوارض میں مشترک ہو سکتی ہیں تو کیوں نہیں ممکن ہے کہ اجسام اپنی

ذوات مخصوصہ اور ماہیت متعینہ کے اعتبار سے مختلف ہوں اور جسمیت ومقداریت کے قبول کرنے میں مشترک ہوں۔ جب یہ ثابت شدہ امر ہے تو کیوں نہیں ممکن ہے کہ اجسام کے انواع میں سے بعض جسم لطیف، نفوذ کرنے والی، اپنی ذوات کے اعتبار سے حی اور اعمال شاقہ کے بجالانے پر قادر ہو اور تفرق وتجزی کو نہ قبول کرنے والی ہو۔ اور جب ایسا ہے تو وہ اجسام اپنی ذوات کو مختلف اشکال سے متشکل کرنے پر قادر بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر ان اجسام کو ریاح عاصفہ توڑ سکتی ہے نہ اجسام کثیفہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے جیسا کہ فلاسفہ نے کہا کہ جو آگ صاعقہ سے جدا ہوتی ہے وہ آن لطیف میں احجار وحدید کے باطن میں نفوذ کر جاتی ہے اور پھر دوسری جانب سے نکل کر گذر جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ''جن'' بھی انسانوں کے باطن میں نفوذ کرنے اور اس میں تصرف کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور وہ اجل معین اور وقت معلوم تک باحیات، اور فساد سے محفوظ ومامون بھی رہ سکتے ہیں۔

مسئلہ دوم: آیات قرآنیہ اور اخبار نبویہ کثیر تعداد میں، جن وشیاطین کے وجود اور اس کے تصرفات پر دلالت کرتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ 'وَاِذْصَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَ لَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ، قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الاحقاف:۲۹) اور جب کہ ہم نے تمہاری طرف کتنے جن پھیرے کان لگا کر قرآن سنتے پھر جب وہاں حاضر ہوئے آپس میں بولے خاموش رہو پھر جب پڑھنا ہو چکا اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے پلٹے بولے اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب سنی کہ موسیٰ کے بعد اتاری گئی اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتی، حق اور سیدھی راہ دکھاتی۔ یہ آیت مبارکہ جنوں کے وجود پر صریح اور بہت ہی واضح نص ہے۔ اور اس پر بھی کہ انہوں نے قرآن کو سنا نیز یہ کہ انہوں نے اپنی قوم کو ڈرایا۔ دوسری آیت مبارکہ ہے ''وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ''اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانہ میں۔ (البقرۃ:۱۰۲) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قصہ سلیمان علیہ السلام میں 'يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ''(سباء:۱۳) یعنی اس کے لئے بنائے جو وہ چاہتا اونچے اونچے محل اور تصویریں اور بڑے حوضوں کے برابر لگن اور لنگر دار دیگیں، اے داؤد والو شکر کرو۔

سورہ ص میں ہے۔ ''اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ وَ الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ۔ اور، دیو بس

میں کر دیئے ہر معمار اور غوطہ خور، اور دوسرے اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے۔ (آیت ۳۷) سورہ سبا میں مزید ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ 'وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ مِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ یعنی اور سلیمان کے بس میں ہوا کر دی اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ اور شام کی منزل ایک مہینے کی راہ اور ہم نے اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہایا اور جنوں میں سے وہ جو اس کے آگے کام کرتے ہیں اس کے رب کے حکم سے' (آیت ۱۲) سورہ رحمن میں ہے۔ 'وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ'۔ اور جن کو پیدا فرمایا آگ کے لوکے سے (آیت:۵) ''یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ''۔ اے جن وانس کے گروہ اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ جہاں نکل کر جاؤ گے اسی کی سلطنت ہے۔ (آیت ۳۳) سورہ صافات میں ہے ''اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ''۔ اور بیشک ہم نے نیچے کے آسمان کو تاروں کے سنگھار سے آراستہ کیا اور نگاہ رکھنے کو ہر شیطان سرکش سے۔ (آیت:۶) جنوں کے خلق و وجود کی یہ قطعی آیت بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔ ارشاد باری عزوجل ہے ''وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ''۔ یعنی میں نے جن اور آدمی اتنے ہی اس لئے بنائے کہ میری بندگی کریں۔ (الذاریات :۵۶) اس لئے جنوں کے وجود سے انکار نہیں کرے گا مگر بہت بڑا کافر شرکس ہٹ دھرم۔

اسی طرح احادیث میں بھی اس کے بیشمار شواہد موجود ہیں۔ ذیل کے سطور میں چند احادیث مذکور ہیں۔

خبر اول: حضرت امام مالک نے موطاً میں تخریج کیا۔ صیفی ابن افلح سے وہ ابوسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ سے کہ وہ یعنی ابوسائب حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو دیکھا وہ نماز میں مشغول ہیں۔ ابوسائب کہتے ہیں کہ میں ان کے نماز سے فارغ ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا، ابوسائب کہتے ہیں ان کے گھر میں انکے تخت کے نیچے میں نے کسی چیز کے حرکت کرنے کی آواز سنی دیکھا تو وہ ایک سانپ تھا میں اس کو مارنے کے لئے کھڑا ہو گیا مگر ابوسعید نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر جب وہ نماز سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے گھر کے ایک کمرہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا اسے دیکھ رہے ہو میں نے کہا ہاں تب حضرت ابوسعید خدری نے کہا کہ اس گھر میں ایک جوان تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی پس انہوں نے اپنی بیوی کو دیکھا کہ وہ لوگوں کے سامنے کھڑی ہے اس کو بڑی غیرت آئی چنانچہ وہ غیرت کے سبب نیزہ لیکر

بڑھا کہ بیوی کو نیزہ مار دے بیوی نے کہا جلدی نہ کرو گھر میں داخل ہو اور دیکھو کہ تمہارے گھر میں کیا ہے؟ وہ نوجوان گھر میں داخل ہوا تو کیا دیکھا کہ اس کے بستر پر ایک سانپ لپٹا ہوا بیٹھا ہے اس نوجوان نے سانپ کو نیزہ مارا سانپ نیزہ میں تڑپتا رہا مگر جوان مر کر گر گیا حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ہم نہیں بتا سکتے کہ سانپ اور نوجوان میں سے کون پہلے مرا، نوجوان یا سانپ۔ پھر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ میں جن ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اس لئے تم میں سے جس کسی کو ایسا سابقہ پڑے اس کو تین دنوں تک کے لئے مہلت دے دو اگر اس کے بعد بھی ظاہر ہو تو اسے قتل کر دو کہ وہ شیطان ہے۔

خبر دوم: روایت کیا امام مالک نے موطأ میں یحیٰ بن سعید سے انہوں نے کہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں سیر کرائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جن دیو کو دیکھا کہ وہ آگ کا شعلہ لئے کھڑا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کیا میں آپ کو اچھے کلمات نہ بتادوں کہ جب آپ ان کلمات کو کہیں گے تو اس کا شعلہ بجھ جائے گا اور وہ زمین پر دھڑام سے گر یگا۔ حضرت جبرئیل نے رفع شر جن کے لئے جو کلمات ارشاد فرمائے وہ یہ ہیں "اعوذ بوجه الله الكريم، وبكلماته التامات التى لا يجاوزهن بر ولا فاجر من شر ما ينزل من السماء، ومن شر ما يعرج فيها، ومن شر مانزل الى الارض، ومن شر ما يخرج منها، ومن شر فتن الليل والنهار، ومن شر طوارق الليل والنهار الا طارقا يطرق يا رحمن"۔

خبر سوم: حضرت امام مالک ہی نے روایت کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نیند میں ڈر جاتا ہوں تو سرکار نے ارشاد فرمایا کہ تم یہ دعا پڑھ لیا کرو۔ "اعوذ بكلمات الله التامات من غضبه وعقابه وشر عباده ومن همزات الشياطين وأن يحضرون"۔

خبر چہارم: یہ حدیث بہت مشہور ہے بلکہ حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے بہت سے محدثین وفقہاء نے اسکو قبول کیا یہ حدیث لیلۃ الجن ہے۔ جس رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم قوم جن کی طرف تشریف لے گئے آپ نے ان کے سامنے قرآن حکیم کی تلاوت فرمائی اور ان کو اسلام کی طرف بلایا۔ انہوں نے قرآن کو سنا اور اسلام قبول کیا۔ ابوداؤد ترمذی ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ محدثین نے مختلف الفاظ وعبارات کے ساتھ حدیث لیلۃ الجن کی تخریج کی ہے۔ تفصیل فتح القدیر وغیرہا میں ہے۔ عنایہ میں ہے ابورافع اور ابن المعتمر سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات خطبہ ارشاد فرمایا پھر ارشاد فرمایا میرے ساتھ وہ شخص کھڑا ہو جائے جس کے دل میں ذرہ

برابر کبر نہ ہو یہ سن کر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ساتھ لیا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ معظّمہ کی آبادی سے باہر آ گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اردگرد ایک خط کھینچ دیا اور ارشاد فرمایا کہ اس دائرہ سے باہر نہ نکلنا ورنہ قیامت تک تم ہمیں نہ پاسکو گے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کی طرف ان کو ایمان کی دعوت دینے اور انکے سامنے قرآن حکیم پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے (آپ دعوت وتبلیغ میں جنوں کے پاس مشغول رہے) یہاں تک کہ فجر نمودار ہو گیا پھر بعد طلوع فجر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ کیا پانی بچا ہے جس سے میں وضو کروں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا نہیں البتہ مشکیزہ میں نبیذ تمر موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تمرۃ طیبۃ و ماء طھور"۔ یعنی کھجور بھی طیب ہے اور پانی بھی خوب پاک کرنے والا ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیذ تمر لیکر وضو فرمایا اور فجر کی نماز پڑھی۔ اور ابو حفص بن شاہین کی روایت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے کہ میں لیلۃ الجن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا چنانچہ انہوں نے قوم زط کو دیکھا تو کہا یہ قوم زطی، جنوں سے ملتی جلتی قوم ہے جیسا کہ میں نے لیلۃ الجن میں دیکھا ہے۔ (اسی حدیث کے پیش نظر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پانی نہ ہونے کی صورت میں نبیذ تمر سے وضو جائز ہے، جب کہ دوسرے ائمہ کے نزدیک نبیذ تمر سے وضو جائز نہیں ہے۔ اسی ایک بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امام، حدیث رسول ﷺ پر کس قدر عمل پیرا تھے، چنانچہ آپ نے فرمایا "اذا صح الحدیث فھو مذھبی"

خبر پنجم: روایت کیا قاضی ابوبکر نے ہدایہ میں کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے رب تعالیٰ سے عرض کیا کہ مولیٰ مجھے دکھا کہ شیطان انسان کے کس جگہ پر بیٹھتا ہے رب تعالیٰ نے دکھایا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ شیطان کا سر سانپ کے سر کی طرح ہے وہ انسان کے قلب پر اپنے سر کو رکھے رہتا ہے جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ ہٹ جاتا ہے اور جب ذکر نہیں کرتا ہے تو نقطہ قلب پر سر رکھے رہتا ہے۔ (معاذ اللہ)

خبر ششم: یہ حدیث بھی زبان علماء پر مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک شیطان ابن آدم کی رگوں میں دوڑتا ہے نیز فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر شیطان اس کا قرین ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ بھی نہیں فرمایا نہیں میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور وہ مسلمان ہو گیا۔

خبر ہفتم: حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس شخص کا واقعہ بہت مشہور ہوا جس کو جن نے اچک لیا

تھا۔اس حدیث کو امام عبدالرزاق، دارقطنی اور امام مالک وغیرہم محدثین نے روایت کیا ہے،عنایہ میں عبدالرحمن ابن لیلی سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے اس مفقود سے ملاقات کی ہے جس کو جن اچک لے کر چلے گئے تھے۔انہوں نے اپنا پورا واقعہ بیان کیا کہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ خزیر کھا کر باہر نکلا تھا کہ مجھے جن کی ایک جماعت نے اچک لیا میں انکے درمیان ایک زمانہ ٹھہرا پھر انہوں نے مجھے چھوڑنے کا خیال ظاہر کیا چنانچہ وہ مجھے لیکر مدینہ کے قریب آ گئے اور پوچھا کیا تم خلیل کو جانتے ہو میں نے کہا ہاں پس انہوں نے میرا راستہ چھوڑ دیا اس طرح میں مدینہ آیا۔لیکن حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے چار سال کے بعد میری بیوی کو مجھ سے جدا کر دیا تھا اور وہ عدت گزار کر دوسری شادی کر چکی تھی۔
(الیٰ آخر الحدیث)

خبر ہشتم: بہجۃ الاسرار نہایت معتبر و مستند کتاب ہے جس میں حضور محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ النورانی کے اوصاف و کمالات اور محاسن و کرامات کو مستند انداز میں پیش کیا ہے۔اس کتاب کے مصنف حضرت امام ابوالحسن شطنوفی رحمۃ اللہ علیہ نے سند متصل کے ساتھ روایت کیا کہ ابوسعید عبداللہ بن احمد بن علی بن محمد بغدادی ازجی نے بغداد میں ۵۵۴ھ میں کہا میری بیٹی جس کا نام فاطمہ تھا ہماری چھت پر چڑھی ۵۳۰ھ میں۔جسکو کوئی اٹھا کر لے گیا وہ باکرہ (کنواری تھی) اس کا سن ۱۶ سال کا تھا تب میں شیخ محی الدین عبدالقادر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے اس کا ذکر آپ سے کیا آپ نے فرمایا کہ آج کی رات تم کرخ کی جنگل میں چلے جاؤ پانچویں ٹیلے کے پاس جا کر بیٹھو زمین پر اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچ لو اور خط کھینچنے کے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ لینا پھر جب تھوڑی رات آ جائے گی تو تمہارے پاس جنوں کا گروہ آئے گا جنکی صورتیں مختلف ہونگی تم ان سے مت ڈرنا،اور جب صبح ہو جائے گی تو اس وقت انکا بادشاہ تمہارے پاس ایک لشکر کے ساتھ آئے گا تم سے تمہارا مطلب پوچھے گا تم انہیں کہہ دینا کہ مجھ کو عبدالقادر نے تمہاری طرف بھیجا ہے اور اس سے اپنی لڑکی کا حال بیان کرنا،تب میں گیا اور جو کچھ مجھے آپ نے حکم دیا تھا اس کے موافق عمل کیا، مجھ پر ڈراؤنی شکل والی صورتیں گذریں لیکن کسی کو مجال نہ تھی کہ اس دائرہ کے قریب آئے جس میں کہ میں تھا اور رات بھر گروہ در گروہ آتے رہے حتی کہ انکا بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا اس کے سامنے ایک گروہ تھا وہ آ کر دائرہ کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے انسان تمہاری کیا حاجت ہے میں نے کہا کہ مجھ کو شیخ عبدالقادر نے تمہاری طرف بھیجا ہے۔تب وہ گھوڑے پر سے اتر پڑا اور زمین پر بوسہ دیا اور دائرہ سے باہر بیٹھ گیا اس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے اور کہا تمہارا کیا معاملہ ہے تب میں نے اپنی لڑکی کا حال بیان کیا اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا یہ کام کس نے کیا ہے انہوں نے اس کے حال

سے لاعلمی ظاہر کیا پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک جن کو پکڑ لائے جس کے ساتھ وہ لڑکی تھی اور کہا کہ یہ چین کا جن ہے اس سے پوچھا گیا کہ تم کو کس چیز نے اس امر پر برانگیختہ کیا کہ قطب کی رکاب کے نیچے چوری کرتا ہے اس نے کہا میں نے اس کو دیکھا اور اس کی محبت میرے دل میں آئی، بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی گردن اڑادی جائے اور مجھ کو میری بیٹی میرے حوالے کی میں نے اس سے کہا کہ میں نے آج رات سا معاملہ کبھی نہیں دیکھا تم شیخ عبدالقادر کی اس قدر فرماں برداری کرتے ہو اس نے کہا ہاں بیشک وہ اپنے گھر بیٹھے ہمارے جنوں کو دیکھتے ہیں حالانکہ دور کے رہنے والے ہوتے ہیں وہ دیکھتے ہی اپنے مکانوں کی طرف آپ کی ہیبت کیوجہ سے بھاگ جاتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ جب کسی قطب کو مقرر کرتا ہے تو اس کو جن وانس پر غلبہ دیتا ہے۔(صفحہ ۲۱۰۔۲۱۱)

خبر نہم: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اموال کی حفاظت ونگرانی کے لئے مامور فرمایا تھا رات میں دیکھا کہ ایک شخص آیا اور بورے میں لپا لپ بھرنے لگا حضرت ابوہریرہ نے اسے پکڑ لیا اور عرض کیا تمہیں سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے جاؤنگا وہ شخص اپنی غربت و افلاس کی دہائی دینے لگا اس لئے حضرت ابوہریرہ نے اسے آزاد کردیا جب بارگاہ رسالت میں پہنچے حضور نے فرمایا ابوہریرہ! رات والے قیدی کا کیا حال ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے پورا واقعہ بیان کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آج رات وہ پھر آئے گا چنانچہ پھر آیا اور مال بھرنے لگا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے پھر پکڑ لیا پہلے کی طرح منت وسماجت کرنے لگا آپ کو اس پر ترس آیا آپ نے چھوڑ دیا پھر بارگاہ رسالت میں پہنچے سرکار نے پوچھا ابوہریرہ رات والے قیدی کا کیا ہوا حضرت ابوہریرہ نے سارا واقعہ بیان کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آج رات وہ پھر آئے گا۔ چنانچہ واقعتا پھر وہ رات میں آگیا اور بوری بھرنے لگا حضرت ابوہریرہ نے پھر پکڑا اور فرمایا آج تو تم کو نہیں چھوڑ سکتا آج تم کو سرکار اقدس کی بارگاہ میں ضرور لے جاؤں گا اس نے کہا آج چھوڑ دیجئے میں آپ کو ایک ایسی دعاء بتاتا ہوں کہ اگر آپ اسے رات میں پڑھ لیا کریں گے تو رات بھر شیطان سے محفوظ رہیں گے وہ ہے آیت الکرسی، حضرت ابوہریرہ نے اسے چھوڑ دیا پھر بارگاہ رسالت میں پہنچے حضور نے پوچھا ابوہریرہ رات والے قیدی کا کیا واقعہ ہوا آپ نے پورا واقعہ بتایا حضور نے فرمایا جو بات اس نے شیطان کے شر سے بچنے کی بتائی ہے وہ صحیح ہے لیکن وہ شیطان تھا۔

خبر دہم: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر نکلے تو وہاں ابلیس ملعون کھڑا تھا۔ آپ نے فرمایا، اے کم بخت! کیا چیز تجھے مسجد کے قریب لائی ہے، اس نے عرض کی، حضور

! مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تجھے میرے ہاں کیوں بھیجا، شیطان نے عرض کی، تا کہ آپ مجھ سے اپنے حسب منشا کچھ پوچھیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ پہلے آپ نے اس سے نماز کے متعلق پوچھا، فرمایا کہ اے ملعون! میری امت کو نماز باجماعت سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی، حضور! جس وقت آپ کا کوئی امتی نماز باجماعت کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو مجھے تپ محرقہ گھیر لیتا ہے۔ جب تک وہ واپس نہیں ہوتا میں اس مرض میں مبتلا رہتا ہوں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ تو ان کو علم و دعا سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی، اس لئے کہ ان کی دعا سے اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس وقت شفا ہوتی ہے جب وہ فراغت پاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، ان کو قرآن پڑھنے سے کیوں روکتا ہے؟ عرض کی، قرأت سے میں قلعی کی طرح (آگ میں) پگھلتا رہتا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا، ان کو جہاد سے کیوں روکتا ہے جب کہ وہ جہاد کے لئے نکلنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ عرض کی، جب وہ جہاد کے لئے نکلتے ہیں تو اس وقت میرے قدموں میں زنجیر ڈالے جاتے ہیں یہاں تک کہ واپس لوٹیں، اسی طرح جب وہ حج کو جاتے ہیں تو ان کی واپسی تک میرے گلے میں طوق اور پاؤں میں زنجیر ڈالے جاتے ہیں اسی طرح جب وہ صدقہ کا ارادہ کرتے ہیں تو میرے سر پر کلہاڑے چلتے ہیں جو مجھے ایسے کاٹتے ہیں جیسے لکڑیوں کو کاٹا جاتا ہے۔ (روح البیان)

خبر یازدھم: مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ النورانی کچھوچھہ شریف اکبر پور، فیض آباد یوپی کا آستانہ مبارکہ جن و شیاطین کے جلنے مرنے کا آج بھی مرگھٹ ہے آستانہ مخدومی پر بزرگوں کے تصرفات کے منکرین یا پھر جن و شیاطین کے وجود کے منکرین کی تعداد کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ آئے دن ہزاروں جنات و شیاطین وہاں جلتے ہیں اور لوگ انکے اثرات سے شفا پاتے ہیں، جس کسی کو آستانہ اشرف کے تصرفات میں شک ہو وہ کبھی بھی جا کر اس حقیقت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ شیخ المشائخ قطب ربانی اعلیٰ حضرت ابو احمد سید شاہ علی حسین قدس سرہٗ عرف اشرفی میاں علیہ الرحمہ نے اپنی تصنیف صحائف اشرفی میں آستانہ مخدوم اشرف پر جلنے والے بہت سے جنات و شیاطین کا چشم دید واقعہ رقم فرمایا ہے۔ بطور استشہاد صرف ایک واقعہ نذر قارئین کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ''جس زمانہ میں فقیر اشرفی جامع رسالہ ہذا دہلی میں بکار طبع لطائف اشرفی مقیم تھا۔ کانپور میں ایک ہندو لڑکی پر آسیبی اثر ہو گیا تھا وہ ہندو حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی سے تعویذ لیا اور بہار شریف میں جناب حضور شاہ امین احمد صاحب سجادہ نشین سے بھی تعویذ لایا۔ اور اکثر دہلی، لکھنؤ وغیرہا جہاں کسی بزرگ کو سنا وہیں سے کچھ نہ کچھ دعا یا تعویذ لا کر استعمال کیا مگر کچھ سود مند نہ ہوا۔ آسیب کی یہ کیفیت تھی کہ لڑکی کے سامنے مجسم بشکل انسان آ کر بیٹھ جاتا اور تفریح و مذاق کی باتیں کرتا، گھر والے

بھی اس آسیب کی آواز سنتے مگر صورت نہ دیکھتے جب گنڈہ اور تعویذ دفع آسیب کے لئے گھر والے کرنے لگتے پھر تو عجیب عجیب طرح کے کرشمے وہ آسیب دکھلانے لگتا۔ لکڑی کے باکس میں کپڑے مقفل رکھے ہیں سارے کپڑے جل کر خاک ہوجاتے مگر بکس میں دھبہ بھی نہ لگتا، کبھی کوٹھے پر سے پھول کی تھالی یا اور کوئی برتن زمین پر گراتا برتن ٹوٹ جاتے، کبھی رات کو لڑکی کے پاس مجسم آدمی کی صورت میں بیٹھ کر مذاق کی باتیں کرتا اگر کسی وقت لڑکی کو نیند کا غلبہ ہوتا اور اونگھ پڑتی فی الفور ایک دھول مارتا وہ لڑکی رونے لگتی۔ گھر والے اس آسیب سے کہتے کہ کیوں مارتا ہے وہ جواب دیتا کہ کیوں سوتی ہے۔ ایک دن اس کے بھائی نے کہا کہ بڑے مانکپور میں فلاں بزرگ عامل رہتے ہیں ان کے پاس میں لڑکی کو لے جاؤں گا اس وقت تیرا بس نہ چلے گا جواب دیتا وہ میرے مقابل کا نہیں ان سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ اس طرح بنارس، فتح پور، ہسوا، مرزا پور، الہ آباد وغیرہ کے چند بزرگوں کے نام لئے۔ اس آسیب نے جواب دیا وہ میرے مقابل کے نہیں ہیں۔ جب یہ کہا میں کچھوچھہ شریف لے جاؤں گا اسکا جواب اس نے نہ دیا اور چپکا ہورہا۔ گھر والوں کو یقین ہوا کہ کچھوچھہ شریف کے نام پر اس نے سکوت کیا، جواب نہیں دیا۔ غالباً درگاہ کچھوچھہ شریف میں جاکر یہ آسیب دفع ہوگا چنانچہ کانپور سے لکھنؤ فیض آباد ہوتے ہوئے اسٹیشن اکبر پور پر لڑکی کے ورثا اس کے ہمراہ اترے۔ جس یکہ پر اس لڑکی کو سوار کرکے درگاہ شریف لائے وہ یکہ بان نقل کرتا تھا کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میرے یکہ کے پیچھے پیچھے کوئی غزلیں گاتا ہوا دوڑا چلا آتا ہے۔ جب درگاہ شریف میں پہنچے ایک عجیب وغریب تماشہ تھا دیکھا سینکڑوں آدمیوں کا مجمع تھا جس کا جو جی چاہتا اس آسیب سے سوال کرتا اور وہ جواب دیتا مگر جواب دینے والا نظر نہیں آتا تھا اور نہ کبھی اس لڑکی کے سر پر مسلط ہوکر بولتا وہ لڑکی اس کو دیکھتی بھی تھی دوسرے لوگ صرف آواز سنتے تھے۔ میرے برادر معظم حضرت شاہ علی اشرف صاحب حسنی اشرفی نے مذاقاً اس آسیب سے سوال کیا کہ میں کیونکر یقین کروں کہ تو آسیب ہے اگر میں تجھ سے کسی چیز کی فرمائش کروں اور تو منگا دے تو مجھ کو یقین تیرے وجود کا ہوجائے گا اس نے کہا یہ قفل سامنے پڑا ہے اگر کہئے تو اٹھا کر آپ کے منھ پر ماروں چوٹ بھی لگے اور میرے وجود کا یقین بھی ہوجائے گا اور دور کی فرمائش نہ کیجئے گا کہ میں یہاں مقید ہوچکا ہوں کہیں جانہیں سکتا میرے برادر معظم نے کہا اچھا کوئی ہلکی سی چیز میرے اوپر ڈالدے کہ چوٹ نہ لگے اس نے کہا کہ املی کے درخت کے اوپر دیکھئے انہوں نے جیسے ہی گردن اٹھائی درخت پر سے ایک مٹی کا ڈھیلا ناک کے سامنے گرا پوچھا یہ تازی مٹی کھدی ہوئی کہاں سے لایا اس نے کہا سرائے کے پچھواڑے کھیت میں ہل چلتا تھا میں ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا۔

میرے فرزند مولوی حاجی سید احمد اشرف (مرحوم) اور برادر زادہ مولوی جعفر صاحب مرحوم دونوں مجھ سے ناقل تھے کہ ہم دونوں نے جا کر بچشم خود دیکھا کہ جس کا جو جی چاہتا اس آسیب سے سوال کرتا اور وہ آسیب آنکھوں سے غائب جواب دیتا، چنانچہ حضرت مخدومی معظمی پیر مطلق مرشد برحق حاجی الحرمین سید ابو محمد اشرف حسین زاد اللہ فیضانہ بھی اس واقعہ عجیبہ کی خبر سنکر تشریف لے گئے آپ نے اس آسیب سے پوچھا تو یہاں کیونکر آیا اس نے مسخرہ پن سے کہا کہ کیا پوچھتے ہو اے حجرت!

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

آپ نے فرمایا کہو تو سہی کیا واقعہ گذرا، اس نے کہا بہت پیروں اور فقیروں کے پاس سے اس لڑکی کے گھر والے گنڈہ، تعویذ لائے جب کچھ مجھ پر اثر نہ ہوا تو میرے سامنے دو چار بزرگوں کا نام لینا شروع کیا کہ فلاں بزرگ کے پاس تجھ کو لے جائیں گے میں نے انکار کیا غرض جہاں جہاں کا نام لیا میں انکار کرتا گیا جب کچھوچھہ شریف کا نام لیا میں چپکا ہو گیا اور یہاں کی ہیبت وجلالت نے میرے دل پر اثر دکھلایا میرا سکوت کرنا میرے حق میں برا ہوا جو اس لڑکی کو یہاں لیکر حاضر ہو گئے خلاصہ یہ کہ ایک ہفتہ تک یہی تماشہ رہا اور دور دور سے آدمی آتے اور اس شیطان سے ہمکلام ہوتے ساتویں روز یہ کیفیت ہوئی کہ ساری رات ہائے ہائے کر کے رونے کی آواز آتی تھی۔ رونے والا نظر نہیں آتا تھا تمام مسافر رات بھر سرائے میں نہ سوئے طلوع صبح صادق کے وقت اس لڑکی نے دیکھا کہ وہ آسیب چلاتا ہوا اور روتا ہوا اس صورت سے لڑکی کے سامنے آیا کہ اس کی کمر میں رسی بندھی ہے اور دو آدمی پکڑے ہوئے ہیں اس آسیب نے لڑکی سے کہا تم اپنے گھر جاؤ اور ہم تو یہیں کے ہوئے چنانچہ اس لڑکی کے ورثاء خوش خوش درگاہ میں نذر و نیاز کر کے فقیر، فقراء خادموں کو خیرات کر کے اپنے وطن کو چلے گئے۔ تحائف اشرفی (صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۲)

فائدہ: روضۃ الاخیار امام غزالی میں ہے کہ شیطان مذکر بھی ہے مؤنث بھی، بچہ بھی جنتے ہیں مگر مرتے نہیں بلکہ ہمیشہ رہیں گے (تانفخ صور) اور جنات مذکر بھی ہیں اور مؤنث بھی۔ یہ بھی بچہ جنتے ہیں مگر ان پر موت آتی ہے۔ اور فرشتے نہ مذکر ہیں نہ مؤنث، نہ بچے جنتے ہیں نہ کھاتے پیتے ہیں۔ اس سے جنات کی حقیقت اور ان کا وجود ثابت ہوا۔ اور جنات کے وجود کا سوائے فلسفیوں کی چھوٹی سی جماعت کے بعض جاہل افراد یا بعض اطباء امثالہا (یعنی ان جیسے اور) کے اور کسی نے انکار نہیں کیا۔ (روح البیان)

دوازدھم: محی السنہ امام غزالی قدس سرہٗ (آپ ثقلین (جن وانس) کے مفتی اعظم تھے) نے ایک دن جنات سے

دنیا کے کارناموں کے متعلق پوچھا انہوں نے عرض کی کہ زمخشری ایک کتاب تفسیر لکھ رہا ہے جواب تک نصف تحریر کر چکا ہے۔آپ نے فرمایا وہی تحریر کردہ کتاب (تفسیر) لے آؤ۔جب جنات تفسیر لے آئے آپ نے اس کو نقل کر کے واپس کر دیا۔ایک روز مخشری کو امام غزالی قدس سرہٗ کے حضور میں حاضری کا شرف ملا تو آپ نے وہی تفسیر زمخشری کو دکھلائی زمخشری دیکھ کر متعجب ہوا اور عرض کی کہ اگر کہوں کہ یہ میری تفسیر کی نقل ہے تو بھی بے جا ہے کیونکہ وہ تو میں نے ایسی جگہ چھپائی ہوئی ہے کہ بجز میرے کسی اور کو علم ہی نہیں ، اگر کہوں کہ یہ وہی تفسیر ہے تو پھر یہاں کیسے آئی !اگر کہوں کسی دوسرے کی ہے تو بھی عقل نہیں مانتی کیونکہ اس کے الفاظ و معانی اور وضع و ترتیب بعینہ میری کتاب جیسی ہے تو دو مصنفوں کا ایک ہی طرح کے الفاظ و معانی وضع و ترتیب پر غائبانہ متفق ہو جانا محال ہے۔امام غزالی نے فرمایا کہ یہ کتاب تیری تفسیر کی نقل ہے، ہم کو جنات کے ذریعہ پہنچی ہے۔زمخشری قبل ازیں جنات کے وجود کے قائل نہیں تھے۔اس حیرت انگیز کرشمہ کو دیکھ کر اسی وقت جنات کے وجود کے قائل ہو گئے۔اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جنات کو علم غیب حاصل ہے۔ مولا عزوجل بھی فرماتا ہے 'فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ' (سبا/۱۴) یعنی جب سلیمان علیہ السلام زمین پر آئے جنوں کی حقیقت کھل گئی (یعنی وہ غیب نہیں جانتے) اگر غیب جانتے ہوتے تو اس خواری کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔

ف: پھر ان کی حقیقت ان لوگوں کے نزدیک (جو جنات کو مجردات نہیں مانتے یہ ہے) جنات ہوائی اجسام ہیں۔بعض کہتے ہیں یہ ناری اجسام ہیں۔یہ مختلف شکلوں میں متشکل ہونے پر قادر ہوتے ہیں مثلاً سانپ، بچھو، کتے، اونٹ، گائے، بکری، گھوڑے، خچر، گدھے، انسان کی شکل اختیار کرنا بھی ان کے اختیار میں ہے۔ان میں عقل بھی ہے اور فہم بھی۔اور بہت بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے محل اور تصویریں اور بڑے حوضوں کے برابر لگن اور لنگر دار دیگیں تیار کرتے تھے۔اور وہ لوگ جو ان کے مجردات کے قائل ہیں تو وہ ان کی دو قسمیں مانتے ہیں۔

(۱) **ارضیہ سفلیہ**

(۲) **عالیہ**

ارضیہ سفلیہ: یہ اس لئے کہ مجردات یعنی وہ موجودات جو نہ متحیز ہیں اور نہ کسی متحیز میں حلول کرنے والے ہیں۔

عالیہ: ان میں بعض وہ عالی ہیں جو اجسام کی تدبیر سے مقدس و منزہ ہیں اور وہ ملائکہ مقربین ہیں جنہیں

مشائین حضرات عقول سے تعبیر کرتے ہیں اور اشراقین صاحبان ان کا انوار عالیہ قاہرہ نام رکھتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو جسم کی تدبیر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو مشائین نفوسِ سماویہ اور اشراقین انوار مدبرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان سب سے برگزیدہ حاملینِ عرش ہیں جو اس وقت چار ہیں اور قیامت میں آٹھ ہو جائیں گے۔ ان کے بعد وہ جو عرش کے اردگرد کھڑے ہیں۔ پھر کرسی والوں کا درجہ پھر ساتویں آسمان والوں کا، اسی طرح درجہ بدرجہ آسمانوں کے ملائکہ کا، آسمانوں کے ملائکہ میں سب سے اہم درجہ ساتویں آسمان والوں کا، اسی طرح اول تک پھر کرۂ اثیر اور اس ہوا والوں کا، جو نسیم کی طبع رکھتی ہے۔ پھر کرۂ زمہریر والوں کا، پھر پہاڑوں والوں کا، پھر ارواح سفلیہ والوں کا، جو نباتات اور حیوانات کے اجسام میں تصرف کرنے والے ہیں۔ اور یہی پچھلے بعض تو نورانی شکل کے ہوتے ہیں اور نہایت درجہ کے صالح ہوتے ہیں جن کو جناتِ صالحین کہا جاتا ہے اور بعض کالے رنگ اور شریر قسم کے ہوتے ہیں اور شیطان اسی پچھلی قسم سے ہیں۔ (روح البیان)

مذکورہ بالا تمام اخبار و آثار اور روایات و قصص سے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ جنات و شیاطین کا نہ یہ کہ صرف وجود ہے بلکہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اس مخلوق کو محیر العقول طاقت اور تصرفات کی قوت عطا فرمائی ہے۔ اس پر سینکڑوں احادیث و اخبار اور قصص و واقعات مزید شاہد و ناطق ہیں۔

مسئلہ سوم: جن کے مادہ تخلیق کے بیان میں۔ جن ایک ناری مخلوق ہے اس کی دلیل قرآن حکیم کی آیات مبارکہ ہیں اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ''اور جن کو اس سے پہلے بنایا ہے دھوئیں کی آگ سے۔ (الحجر ۲۷) اللہ عز شانہ تعالیٰ، ابلیس ملعون کی حکایت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ ''خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ''تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا (الاعراف ۱۲)۔ سورہ رحمن میں ہے ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ''اس نے آدمی کو بنایا بجتی مٹی سے جیسے ٹھیکری اور جن کو پیدا فرمایا آگ کے لوکے (لپیٹ) سے (آیت ۱۴، ۱۵)۔ اس طرح بہت سی آیات سے ظاہر ہے کہ جن ایک آتشی مخلوق ہے اور حیات کا وجود آگ میں ممتنع نہیں ہے چنانچہ اطبا کہتے ہیں کہ نفس و جان کا تعلق اول قلب و روح سے ہے اور وہ انتہا درجے کے گرم اور سخین ہوتے ہیں، حکیم جالینوس اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں میں نے ایک مرتبہ ایک بندر کے شکم کو چاک کیا اور میں نے اس کے پیٹ میں اپنا ہاتھ ڈالا پھر اس کے دل میں اپنی انگلی داخل کر دی تو پایا کہ وہ بے انتہا گرم ہوا جا رہا ہے اس

لئے اطبا کہتے ہیں زندگی بغیر حرارت غریزیہ کے باقی نہیں رہتی جب حرات غریزیہ ختم ہوجاتی ہے تبھی موت واقع ہوتی ہے روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ مرنے کے بعد میت کا بدن ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔علاوہ ازیں کرہ ناریہ، روحانیات یعنی ملائکہ سے مملوو پر ہیں جن سب کا حاصل یہ ہے کہ آگ میں رب تعالیٰ کی قدرت سے حیات وزندگی کا قیام ممکن ہے جیسا کہ پانی میں انگنت مخلوق کی حیات ثابت وواقع ہے۔اس لئے جن اگر ناری مخلوق ہوتو مستبعد نہیں۔

مسئلہ چھارم: (جن کی وجہ تسمیہ کے بیان میں)۔اس میں دوقول ہے پہلاقول یہ ہے کہ جن کے لغوی معنی چھپے ہونے پوشیدہ رہنے کے آتا ہے۔اسی سے جنت بفتح الجیم اور جنت بضم الجیم آتا ہے کہ جنت کی زمین اس کے باغات سے ڈھکی رہتی ہے اور جنت انسان کے لئے ڈھال بنکر اس کو چھپا دیتی ہے۔اسی سے مجنون ہے کہ اس کی عقل پر پردہ پڑا رہتا ہے۔اور جنین ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچہ کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ شکم میں چھپا رہتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً" (المنافقون ۲) پس جن بھی انسان کی نگاہ سے چھپا رہتا ہے اس لئے اسے جن کہتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ابتدائے امر میں یہی جنات لوگ جنت کے خازن تھے اس لئے ان کو جن کہا گیا مگر پہلا قول زیادہ قوی ہے

مسئلہ پنجم: (گروہ مکلفین کے بیان میں)۔مکلفین جو احکام الہیہ کے مامور ومکلف ہیں ان کے چار گروہ ہیں۔ملائکہ، انسان، جنات، شیاطین۔جنات وشیاطین کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ دو الگ الگ جنس ہیں یا ایک ہی جنس ہیں۔بعض حضرات کہتے ہیں کہ شیاطین ایک الگ جنس ہے اور جن علیحدہ جنس ہیں جس طرح انسان وفرس میں سے دونوں علیحدہ علیحدہ جنس ہیں اور بعض حضرات کا اس کے برعکس نظریہ ہے۔جنوں میں جو ابرار واخیار ہیں وہ جن کہلاتے ہیں اور جو اشرار وبدکار ہیں وہ شیاطین کہے جاتے ہیں۔

مسئلہ ششم: (جنوں کے تصرفات کے بیان میں)۔جنوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ظاہر وباطن میں تصرف کرنے کی قدرت عطا کی ہے۔گذشتہ واقعات سے اس دعویٰ پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔اعادہ کی حاجت نہیں معتزلہ اس سے انکار کرتے ہیں۔اہل سنت کے نزدیک ان کے تصرفات ثابت ہیں انہوں نے چند وجوہ سے اپنے دعویٰ پر دلیل دیا ہے۔

اول: جن اگر عبارت ہے ایسے موجود کا جو جسم وجسمانیات سے نہ ہوتو اس وقت اس کے باطن میں تصرف کرنے کا

مطلب یہ ہے کہ وہ باطن میں تصرف کرنے پر قادر ہے اور یہ محال نہیں۔ اور اگر جن ایک حیوان ہوائی لطیف کا نام ہے تو بھی باطن میں تصرف کرنا ممتنع نہیں ہے جیسا کہ نفس وغیرہ کا تصرف ممتنع نہیں ہے۔

دوم: ارشاد باری تعالیٰ ہے اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ المسِ' یعنی سود خور روز قیامت اسی طرح گُتے جھگتے ہوں گے جیسے شیطان زدہ آدمی کھڑا ہوتا ہے۔(البقرہ275)

سوم: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔"ان الشیطان لیجری من ابن آدم مجری الدم"

معتزلہ نے بھی چند وجوہ سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے۔

اول: اللہ عز شانہ تعالیٰ، ابلیس ملعون کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔"وماکَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ "یعنی شیطان کہے گا اور میرا تم پر کچھ قابو نہ تھا مگر یہی کہ میں نے تم کو بلایا تو تم نے میری مان لی (۲۲ ابراہیم) اس آیت میں صراحت ہے کہ بشر پر شیطان کو قدرت نہیں ہے صرف وسوسہ اور برے اعمال کی طرف دعوت دینے کی قدرت ہے اور بس۔

دوم: یہ امر متحقق ہے کہ حضرات انبیاے کرام علیہم السلام اور حضرات بزرگان دین وعلماے راسخین لوگوں کو شیطان کی دعوتوں سے دور ونفور رہنے اور اس پر لعنت بھیجنے کی دعوت دیتے ہیں۔ پس جب واقعہ یہ ہے تو شیطان اور ان نفوس قدسیہ کے درمیان عداوت ودشمنی سب سے سخت ہونی چاہئے اور شیطان ان سبھوں کا سب سے بڑا دشمن ہوگا۔ اگر شیطان کو انسان کے باطن میں نفوذ کی قدرت اور بلا ومصیبت میں مبتلا کرنے کی طاقت ہوتی تو جنکو وہ اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں ان کو ہر ایک کی بہ نسبت زیادہ نقصان پہنچاتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان ان میں سے کسی کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتا تو ماننا پڑے گا کہ شیطان کو تصرف کی قدرت نہیں ہے۔

جواب(۱): معتزلہ کی دلیل کا جواب بہت واضح ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو آیت پیش کی ہے اس سے اہل سنت ہی کا موقف ثابت ہوتا ہے کیونکہ آیت متلوہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ شیطان کو باطل کی طرف بلانے کی طاقت ہے۔ یہی ہمارا موقف ہے۔

جواب(۲): یہ کہنا کہ حضرات انبیا واولیا اور بزرگان دین کے ساتھ شیطان کو زیادہ دشمنی ہوتی ہے اور ان کو وہ ایذا نہیں پہنچا سکتے اس لئے تصرفات کی طاقت نہیں، صحیح نہیں۔ چونکہ حضرات انبیاے کرام علیہم السلام خصوصاً اور اولیا واہل

ایمان عموماً سے شیطان کو سخت دشمنی ہوتی ہے۔ اور وہ ان کو سخت نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اور ظالم نے نقصان بھی پہنچایا۔ ملاحظہ ہو حضرت آدم وحوا علیہم السلام کو شیطان نے کس قدر لغزش دی یہاں تک کہ آپ دونوں کو جنت سے باہر آنا ہو گیا۔ جنتی تخت وتاج بلکہ لباس تک اتر گئے۔ اور تین سو برس تک مسلسل زمین پر گریہ وزاری کرتے رہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ ہوئی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی سوچا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیں تاکہ آپ پر معاذ اللہ جنون طاری ہو جائے مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھا چنانچہ فوراً جبرئیل امین کو بھیجا کہ شیطان کو مار بھگاؤ، حضرت جبرئیل آئے اور اسے ایک لات ماراوہ عدن میں جا کر گرا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ "فرکض برجلہ ووقع بعدن"۔

روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایکبار آیا تاکہ حالت نماز میں آپ پر وسوسہ کا جال پھینکے گا آپنے پکڑ لیا اور فرمایا اگر بھائی سلیمان علیہ السلام کی قسم کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں باندھ دیتا کل مدینہ کے بچے تم سے کھیلتے بڑی منت وسماجت اور معذرت کرنے لگا تب آپنے چھوڑا۔ اسی طرح حضرات اولیاے کرام اور بزرگان دین کو سخت نقصان پہنچانے کی کوشش کی مگر فضل خداوندی سے وہ حضرات اس کے شر سے محفوظ رہے۔ اس ضمن میں محبوب سبحانی حضور غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ النورانی کا واقعہ مجاہدہ بہت مشہور ہے۔

بہجۃ الاسرار میں ہے شیخ عارف ابومحمد عثمان صریفینی نے صریفین میں کہا کہ میں نے شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ رات دن میں جنگل میں رہا کرتا تھا اور بغداد کی طرف نہیں آتا تھا، شیطان میرے پاس صفیں باندھ کر پیدل سوار آیا کرتے تھے ان کے پاس طرح طرح کے ہتھیار ہوتے تھے بڑی بڑی شکلیں ہوتی تھیں مجھ سے لڑتے تھے اور مجھ کو آگ کا شہاب مارا کرتے تھے سو میں اپنے دل میں ایسی ثابت قدمی پایا کرتا تھا جس کی تعبیر نہیں ہو سکتی اور اپنے باطن سے یہ آواز سنتا تھا جو مجھے کہتی تھی اے عبدالقادر! تو ان کی طرف کھڑا ہو جا کیونکہ ہم نے تم کو ثابت قدم بنایا ہے اور تم کو مدد دی ہے۔ پھر میں ان کے پیچھے دوڑتا تو وہ سب میرے دائیں بائیں بھاگ جاتے اور جہاں سے آتے تھے وہیں چلے جاتے تھے۔ ان میں سے شیطان اکیلا (بھی) میرے پاس آتا اور مجھ سے کہتا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تمہارے ساتھ ایسا ایسا کروں گا مجھے بہت ہی ڈراتا تھا تب میں اسکو ایک طمانچہ مارتا تو وہ مجھ سے بھاگ جاتا پھر میں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" پڑھتا تو وہ چلا جاتا جس کو میں دیکھ لیتا۔

ایک دفعہ میرے پاس بری شکل میں آیا اور اس کی بدبو تھی کہنے لگا کہ میں ابلیس ہوں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں

کہ تمہاری خدمت کروں کیونکہ تم نے مجھے اور میرے پیروؤں کو تھکا دیا ہے میں نے اس سے کہا کہ چلا جا اس نے انکار کیا تب اس کے پاس اوپر سے ایک ہاتھ آیا اور اس کے دماغ پر مارا پھر وہ زمین میں غوطہ مار گیا پھر دوبارہ میرے پاس آیا اور اس کے ہاتھ میں آگ کا شہاب تھا مجھ سے لڑتا تھا تب میرے پاس ایک مرد آیا جس کا منھ بندھا ہوا تھا سفید گھوڑے پر سوار تھا مجھے اس نے تلوار دی تب ابلیس الٹے پاؤں بھاگا۔ پھر میں نے اسکو تیسری دفعہ دیکھا کہ وہ مجھ سے دور ہی ہے اور رو رہا ہے مٹی اپنے سر پر ڈال رہا ہے اور کہتا ہے اے عبدالقادر بیشک تم سے ناامید ہو گیا ہوں میں نے کہا دور ہو اے ملعون کیونکہ میں ہمیشہ تم سے ڈرتا ہوں اس نے کہا یہ بات اور بھی مجھ پر بہت سخت ہے اور پھر اس نے میرے گرداگرد بہت سے جال، پھندے، حیلے ظاہر کئے میں نے کہا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا یہ دنیا کے جال ہیں جن سے ہم تم جیسوں کا شکار کیا کرتے ہیں تب میں نے ایک سال تک ان کے بارے میں توجہ کی یہاں تک کہ وہ سب کے سب ٹوٹ گئے ۔(صفحہ ۱۵۱۔۱۵۲)

ان سب تفاصیل سے روشن اور ظاہر ہے کہ شیطان انبیاو اولیا کو نقصان پہنچانے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر انہیں تائید الٰہی حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کو اس کے شر و فساد سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔

مسئلہ ہفتم: (جنوں کے خورد و نوش کے بیان میں)۔ سابق میں گذرا کہ مکلفین کی چار قسمیں ہیں ملائکہ، جن، شیاطین اور انسان۔ ان میں سے ملائکہ وہ قدسی نوری مخلوق ہیں جو خورد و نوش اور مناکحت سے معصوم ہیں شب و روز وہ تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے ہیں اور حکم الٰہی سے ایک آن کے لئے بھی منھ نہیں موڑتے ہیں۔ ان کے علاوہ تینوں قسم کے مکلفین سب کھاتے پیتے ہیں جنوں کے بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوبر اور ہڈی سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے اور وجہ ممانعت بھی بیان فرمادی۔ ''انہ زاد اخوانکم من الجن'' اسی طرح ان میں مناکحت اور توالد و تناسل بھی ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

''اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ'' بھلا کیا اسے اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو (الکہف ۵۰)

مسئلہ ہشتم: (کیفیت وسوسہ کا بیان)۔ شیطان انسان کے باطن میں وسوسہ ڈالتا ہے قرآن حکیم میں ہے

(قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ ،اٰلٰهِ النَّاسِ، مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسَ، الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ، مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ) اس لئے علمائے اہل حق فرماتے ہیں کہ شیطان انسان کے باطن میں غوطہ لگاتا ہے اور وہ اپنے سر کو انسان کے مرکز دل پر رکھ کر اس کو طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے۔ جیسا کہ

حدیث شریف مس ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''ان الشیطان لیجری من ابن ادم مجری الدم ألا فضیقوا مجاریہ بالجوع ''یعنی شیطان انسان کے رگوں میں دوڑتا ہے اس لئے سن لو کہ اس کے دوڑنے کی جگہ کو بھوک یعنی روزے کے ذریعہ تنگ کردو۔ اور ارشاد نبوی ہے ''لو لا أن الشیاطین یحومون علیٰ قلوب بنی آدم لنظروا الی ملکوت السموت'' اگر ایسا نہ ہوتا کہ شیطان انسان کے دلوں پر بسیرا کئے رہتا ہے تو انسان ملکوت السمٰوت کا مشاہدہ کرلیتا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاے کرام علیہم السلام اور اولوالعزم اولیاے کرام جو شیطانی وساوس سے محفوظ و مامون رہتے ہیں ان نفوس قدسیہ پر شیطان کا داؤ نہیں چل پاتا وہ یقینا بیٹھے بیٹھے ملکوت السمٰوت کا مشاہدہ کرلیتے ہیں، جدالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ '' وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی (الخ انعام: ۷۵) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کا پوچھنا ہی کیا ارشاد نبوی ہے۔ ''انی لانظر من مقامی ھذا الکوثر'' بلکہ حضور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان سے آپ کے صحابہ کو اور آپ کی امت کے جلیل القدر اولیاے کرام کو یہ مقام حاصل ہے۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی سے نہاوند میں جنگ کی کیفیات کا مشاہدہ فرمالیا۔ حضور محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ النورانی کا ارشاد ہے میں اپنی آنکھ کی پتلیوں سے لوح محفوظ دیکھ لیتا ہوں۔ حضور خواجہ خواجگان عطاے رسول خواجہ معین الدین چشتی سنجری قدس سرہٗ النورانی کی بیعت وارادت کا تفصیلی واقعہ بہت سی کتابوں میں مذکور ہے۔ آپ اپنے پیر روشن ضمیر قطب الارشاد، مرکز راہ ہدایت حضرت عثمان ہارونی قدس سرہٗ کی بارگاہ میں پہنچے تو پیر نے اولاً آنکھیں بند کرکے ساتوں آسمان، تحت الثریٰ، بلکہ حجاب عظمت پھر ثانیاً اپنی دو انگلیوں کے درمیان ہیز دہ ہزار عالم کا مشاہدہ کرادیا۔

مندرجہ بالا حقائق کے خلاف بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ احادیث اس بارے میں جو وارد ہیں سب مؤول ہیں۔ اس کے ظاہری معانی پر محمول کرنا ممتنع ہے انہوں نے چند وجہوں سے اپنے نظریہ پر استدلال کیا ہے۔

اول: انسان کے باطن میں شیاطین کا نفوذ محال ہے کیونکہ اس تقدیر پر مجاری انسان یعنی نسوں کا جسم کی طرح پھیلنا بڑھنا اور موٹا ہونا لازم آئے گا یا نہیں تو ان اجسام کا تداخل لازم آئے گا اور دونوں صورتیں محال ہیں۔

دوم: پہلے گذرا کہ اہل حق بالخصوص حضرات انبیاے کرام علیہم السلام اور اولیاے عظام اور شیطانوں کے درمیان

سخت عداوت اور انتہا درجہ تک دشمنی رہتی ہے پس اگر شیطان باطن میں نفوذ پر قادر ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان مقدس ہستیوں کو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

سوم: شیطان کے بارے میں قرآن سے ثابت ہے کہ وہ ناری مخلوق ہے۔ پس اگر وہ انسان کے بدن میں داخل ہوگا تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ انسان کے بدن میں آگ داخل ہوئی پھر تو انسان کے بدنوں کو جل جانا چاہئے مگر جلتا نہیں تو ماننا پڑے گا کہ نفس میں شیطان کا نفوذ نہیں ہوتا۔

جوابات: (اول) اس تقدیر پر کہ ''جن'' نفوس مجردہ کا نام ہے یا ضوء و ہوا کی طرح وہ اجسام لطیفہ ہیں منکرین کا سوال سرے سے ختم ہو جاتا ہے کیونکہ بہر دو تقدیر باطن میں نفوذ ممتنع نہیں ہے۔

دوم: یہ تسلیم ہے کہ انبیاو اولیا کے ساتھ شیاطین کو سخت عداوت ہوتی ہے مگر اللہ عزشانہ اور اس کے فرشتے شیطانوں کے شر کو ان سے دفع کرتے ہیں انہیں تائید الٰہی حاصل ہوتی ہے اور فرشتے ان کی حفاظت پر مامور ہوتے ہیں اس لئے شیطان ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

سوم: خالق کائنات کی قدرت وسیع ہے جس طرح اس نے نار نمرود کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے لئے گلزار بنا دیا چنانچہ ارشاد فرمایا ''**قلنا یا نار کونی بردا وسلاماً علیٰ ابراھیم**'' (الانبیاء ۶۹) اسی طرح ممکن ہے کہ شیطان انسان کے باطن میں نفوذ کرے اور نار وحار ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس کو بارد وسلامتی والا بنا دے تو مضائقہ نہیں۔

مسئلہ نہم: (حقیقت وسوسہ کا بیان)۔ حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں فرمایا کہ قلب اس قبہ کی طرح ہے جس میں چند دروازے ہوں ہر دروازہ سے اس میں روشنی، دھوپ اور ہوا داخل ہوتی ہو، یا قلب (ہدف) نشانہ گاہ کی طرح ہے جہاں پر ہر چہار جانب سے تیر انداز تیر سے نشانہ لگا رہے ہوں، یا قلب اس آئینہ کی طرح ہے جس میں اشخاص کی صورتیں منعکس ہوتی ہیں جس سے یکے بعد دیگرے صورت دکھتی ہیں۔ یا قلب اس حوض کی طرح ہے جس میں مختلف نہروں سے مختلف قسم کے پانی بہہ کر گرتے ہیں۔ اس تمثیل کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ قلب میں جو مختلف قسم کے آثار یکے بعد دیگرے داخل ہوتے ہیں تو داخل ہونے کی جگہ یا تو حواس ظاہرہ سمع، بصر وغیرہا ہیں یا حواس باطنہ خیال متصرفہ، شہوت وغیرہا ہیں۔ خواہ اس کے حصول کا ذریعہ جو بھی ہو جب حواس کے ذریعہ کسی شی کا ادراک ہوتا ہے تو اس کا اثر دل پر پڑتا ہے اسی طرح جب شہوت وغضب برانگیختہ ہوتے ہیں تو شہوت وغضب کے آثار بھی قلب میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اگر انسان حواس ظاہرہ سے ادراک کرنا بند کر دے تو خیالات جو نفس میں موجود ہیں پھر بھی باقی

رہتے ہیں۔اور یہی خیال ایک شئ سے دوسری شئ کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔اور خیال کے انتقال کے اعتبار سے قلب بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔اس لحاظ سے قلب ہمیشہ تغیر پذیر اور ان اسباب کے اثر سے متاثر رہتا ہے۔یاد رہے قلب میں حاصل ہونے والے آثار میں مخصوص اثر کو خواطر کہتے ہیں۔اور خواطر سے مراد جس میں افکار واذکار یعنی ادراکات وعلوم عارض ہوتے ہیں پھر علوم وادراکات کا حصول خواہ بطور تجدد ہو خواہ بطور تذکر ہو دونوں ہی طرح سے قلب میں اس کا حصول ہوتا ہے۔خواطر سے تعبیر اس لئے کرتے ہیں کہ جن علوم و ادرکات سے قلب غافل ہوتا ہے تو خاطر ہی اس کا محرک ہوتا ہے پس خواطر اصل میں ارادوں کا محرک ہے اور ارادے اعضا کے محرک ہوتے ہیں پھر خواطر جو ارادے کی محرک ہے وہ دو جہت میں بٹ جاتی ہے۔ایک خواطر محرکہ جو منقسم ہوتی ہے دواعی شر کی طرف جو عاقبت وآخرت کے لئے ضرر رساں ہوتے ہیں دوسرے وہ خواطر محرکہ جو منقسم ہوتی ہے دواعی خیر کی طرف جو عاقبت وآخرت کے لئے نفع بخش اور سودمند ہوتے ہیں۔غرض وہ دونوں دو متضاد خاطر ہیں۔اسی لئے ان دونوں کو دو الگ الگ ناموں سے موسوم کرتے ہیں جو دواعی خیر ہے اس کو خاطر محمود کہتے ہیں جس کو الہام کہا جاتا ہے اور جو دواعی شر ہے اس کو خاطر مذموم کہتے ہیں جس کو وسوسہ کہا جاتا ہے۔پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ خواطر احوال حادثہ ہیں تو اس کیلئے کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوگا اور تسلسل محال ہے تو لازماً ہر ایک کی انتہاء واجب الوجود ہی کی طرف ہوگی۔کلام غزالی کی مزید تحقیق اور نافین جن وشیاطین کے شبہات اور ان کے جوابات اسی مقام پر تفسیر رازی میں مذکور ہیں۔

مسئلہ دھم: فرقہ ثنویہ کا عقیدہ یہ ہے کہ عالم کے دو اِلہ ہیں۔ایک اِلہ خیر جس کے عساکر وافواج، ملائکہ ہوتے ہیں اور دوسرا اِلہ شر جس کے افواج شیاطین ہوتے ہیں اور یہ دونوں ہمیشہ عالم کی ہر طرح کی چیز کے بارے میں تنازع کرتے ہیں اس لئے ان دونوں میں سے ہر ایک کا اس سے تعلق ہے۔پس وہ خواطر جو اعمال خیر کی طرف دواعی ہیں وہ خواطر عساکر الٰہی کی طرف سے حاصل ہوتے ہیں۔اور جو خواطر اعمال شر کی طرف دواعی ہیں وہ عساکر شیطان کی طرف سے پائے جاتے ہیں۔ثنویہ کا یہ عقیدہ عقلاً ونقلاً بداھتاً باطل وفاسد ہے۔

مسئلہ یازدھم: شیطان کے لئے کچھ لوگ مافوق الفطرت قوت ثابت کرتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مارنے ،زندہ کرنے اجسام کے پیدا کرنے اور اشخاص کی صورت اصلیہ اور خلقت اولیہ کے تغیر وتبدیلی پر قدرت رکھتے ہیں۔اس کے برعکس کچھ لوگ شیطان سے ایسی قوت وطاقت کا سرے سے انکار کرتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ شیطان کو ان احوال

میں سے کسی پر قدرت حاصل نہیں۔

اس مسئلہ میں مذہب اسلم یہ ہے کہ ایجاد وتکوین اور احداث وخلق پر قدرت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اس کے علاوہ جس کو جو حاصل ہے سب اسی کے عطا کرنے سے ہے اس لئے جن وشیاطین خواہ انسان کیلئے عطائی قدرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ معتزلہ کے یہاں یہ تسلیم شدہ ہے کہ انسان کو بعض حوادث کی ایجاد پر قدرت ہے لہذا ان کو بہر حال یہ ثابت کرنا ہوگا کہ شیاطین کو اجسام وحیات کے خلق پر قدرت نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی دلیل میں کہا ہے۔ شیطان ایک جسم ہے۔ اور ہر جسم قادر بالقدرۃ ہے اور قدرت ایجاد اجسام کی صالح نہیں ہوتی۔ لہٰذا شیاطین ایجاد اجسام پر قادر نہیں ہیں۔

معتزلہ کی اس دلیل پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیوں نہیں ایسا ہوسکتا ہے کہ شیطان کو ہماری قدرت حاصلہ کے بالمقابل ایک ایسی قدرت ہو جو خلق اجسام پر قادر ہو چونکہ بروقت کسی شی کے عدم وجود سے اس کے وجود کا محال ہونا لازم نہیں آتا۔

مسئلہ دوازدھم: مباحث جن کے بیان میں یہ مسئلہ بھی نہایت ہی معرکۃ الآراء ہے کہ جنوں کو مستقبل کے آمدہ واقعات وحالات کا علم ہے یا نہیں کچھ لوگ اس کے لئے ایسے امور غیبیہ کے علم کا انکار کرتے ہیں چنانچہ وہ اپنے دعویٰ میں قرآن حکیم سے استدلال کرتے ہیں کہ جنات حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں تھے اور ایک مدت تک وہ ان کے قبضہ میں رہے حالانکہ ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے وصال کا علم نہ ہوسکا، اس کے برخلاف ایک قول یہ ہے کہ جنات کو غیب کا علم ہے۔ پھر ان میں یہ اختلاف ہے کہ ان میں بعض ایسے ہیں جو آسمان پر یا اس سے قریب چڑھ کر زبان ملائکہ سے غیب کی خبر سنکر غیب جانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی غیب دانی کا دوسرا طریقہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ غرض جو بھی طریقہ ہو یہ امر متحقق ہے کہ انسان جنات، بلکہ حیوان جس کسی کو چاہے اللہ تعالیٰ امور غیبیہ پر مطلع فرما سکتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی، ہدہد اور شہد کی مکھیوں کے لئے الہامی علوم کا ثبوت قرآن حکیم سے ثابت ہے۔

رکن پنجم: استعاذہ کے بحثوں میں یہ پانچواں رکن ان مطالب کے بیان میں ہے جن کی وجہ سے استعاذہ کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ انسان کی حاجتیں بے شمار ہیں پس کوئی ایسی بھلائی نہیں جس کی تحصیل کی طرف وہ محتاج نہ ہو، اسی طرح کوئی شر نہیں جس کے دفع وازالہ کی طرف وہ محتاج نہ ہو جب واقعہ یہ ہے تو قول "اعوذ باللہ" تمام تر روحانی وجسمانی شر کے دفع وازالہ کو شامل ہے اور روحانی وجسمانی شرور بے حساب ہیں سب کا استقصا اور اعداد وشمار ممکن نہیں البتہ یہ سمجھنا

چاہئے کہ شر، اعتقادات کے قبیل سے ہے جن کا تعلق قلوب سے ہے یا ان اعمال کے باب سے ہے جن کا تعلق ابدان سے ہے۔ قسم اول میں تمام عقائد باطلہ داخل ہیں۔ خیال رہے کہ معلومات کی قسمیں غیر متناہی ہیں ان میں سے ہر ایک کے بارے میں ممکن ہے کہ اعتقاد صحیح و درست رکھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ غلط اور فاسد اعتقاد رکھے۔ اس میں عالم میں پائے جانے والے تمام فرقہ ضالہ شامل ہیں اور وہ صرف اس امت میں بہتر فرقے ہیں۔ اور سات سو یا زیادہ ایسے گمراہ فرقے ہیں جو اس امت کے ماسوا ہیں پس جب بندہ "**اعوذ باللہ**" کہتا ہے تو وہ عالم کے تمام فرق ضالہ کے باطل عقائد سے خدا کی پناہ چاہتا ہے۔

اعمال بدنیہ سے جس شر کا تعلق ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو دینی مضرتوں کیلئے ہے۔ دوسرا وہ جو دنیاوی مضرتوں کے لیے ہے۔ دینی مضرتین وہ کہلاتی ہیں جن سے اللہ عز شانہ نے احکام تکلیفیہ میں منع فرمایا ہے۔ اور دنیاوی مضرتیں تمام طرح کے آلام، امراض و اسقام، حرق و غرق، فقر و فاقہ کشی اور لونجا پن و اندھا پن سب کو شامل ہیں۔ پس بندہ جب تعوذ کہتا ہے تو دینی و دنیاوی تمام قسموں کی مضرتوں سے رب کریم کی پناہی کا طلبگار ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ کلمہ "**اعوذ باللہ**" تین قسموں کو شامل ہے ان میں سے ہر ایک غیر متناہی ہیں ان میں کا اول جہل ہے، گذرا کہ عقائد و معلومات کی قسمیں غیر متناہی ہیں تو ظاہر ہے کہ جہالات کے اقسام بھی غیر متناہی ہونگے بندہ تعوذ میں ان تمام سے تعوذ کرتا ہے اس میں کفار و بدعتی مذاہب داخل ہیں ان میں سے دوسرا فسق ہے۔ تکالیف کے انواع بہت کثیر ہیں جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن بندہ جب تعوذ کرتا ہے تو تمام تکالیف کے فسق سے پناہ مانگتا ہے۔ ان میں کا تیسرا مکروہات و آفات ہے اور اس کے بھی اقسام و انواع بے شمار ہیں۔ پس "**اعوذ باللہ**" کہنے سے تمام مکروہات و آفات و بلیات سے بھی رب کی پناہی ہوجاتی ہے جب تعوذ کا یہ مقام ہے تو بندہ پر لازم ہے کہ جب وہ کہے تو تینوں اجناس کا تصور اور اس کا خیال اپنے دل میں جمائے رکھے اور یہ سمجھے کہ مخلوقات میں سے کوئی ان اجناس میں سے کسی کے دفع کرنے پر قادر نہیں ہے اگر کوئی ذات قادر ہے تو وہ ذات واجب الوجود اللہ تعالیٰ کی ہے جو غیر متناہی مقدورات کے دفع پر قادر ہے۔ جب بندہ اس کا تصور کریگا تو طبیعت و عقل اس ذات پاک کی پناہ لینے پر ابھارے گی جو غیر متناہی آفات کے دفع پر قادر ہے اسوقت بندہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

(اعوذ باللہ القادر علی کل المقدورات من جمیع اقسام الآفات و البلیات)

★★★

باب سوم

کلمہ ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' کے لطائف ونکات کا بیان

نکتہ (۱): قول ''اعوذ باللہ'' میں خلق سے خالق کی طرف اور ممکن سے واجب کی طرف عروج ہوتا ہے چونکہ اول امر میں اس کی معرفت کا سوائے اس کے کوئی ذریعہ نہیں کہ بندہ استدلال کرے کہ مخلوق، خالق کائنات غنی وقادر کی طرف محتاج ہے۔ پس اس کا ''اعوذ'' کہنا حاجت تامہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اگر اس کی طرف احتیاج نہ رکھتا تو اس کی پناہ کیوں لیتا۔ اور پھر اس کا ''باللہ'' کہنا اس کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ غنی تام ہے چونکہ اللہ نام ہی ہے اس ذات واجب الوجود کا جو تمام صفات وکمالات کا جامع ہو۔ جس کا صریح مدلول یہ ہے کہ رب تعالیٰ ہر عیب ونقص، عجز و کذب، جہل وغیرہ شائبہ امکانات سے پاک ومنزہ ہے جس کا لازمی معنی ہے کہ وہ غنی بالذات اور قادر بالذات ہے۔ غرض بندہ جب ''اعوذ'' کہتا ہے تو وہ بذات خود اقرار کرتا ہے کہ میں محتاج وفقیر ہوں۔ پھر جب ''باللہ'' کہتا ہے تو وہ دو باتوں کا اقرار کرتا ہے۔ ایک یہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ تمام بھلائیوں کے عطا کرنے اور تمام آفات وبلیات کے دفع کرنے پر قادر ہے، دوسرا یہ کہ اس کے علاوہ کوئی اس صفت سے موصوف نہیں ہے اور جب کوئی اس صفت سے موصوف نہیں تو لازمی طور پر اس کے سوا نہ کوئی بلیات وآفات کو دفع کرسکتا ہے نہ ہی خیرات عطا کرسکتا ہے بندہ جب اس حالت کا تصور کرلیتا ہے تو وہ اپنی ذات اور ساری مخلوقات سے راہ فرار اختیار کرکے رب کی پناہ لیتا ہے اور وہ رب تعالیٰ کے ارشاد ''ففروا الی اللہ'' کے اسرار اور راز سربستہ سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ یہ حالت اسکو ''اعوذ'' میں پیدا ہوتی ہے پھر جب بارگاہ حق تک اس کی رسائی ہوتی ہے اور وہ نور جلال حق میں مستغرق ہوتا ہے تو اس کے ارشاد ''قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ'' (انعام: آیت ۹۱) کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے پس اس وقت اس کی زبان سے ''اعوذ باللہ'' جاری ہوتا ہے۔

نکتہ (۲): ''اعوذ باللہ'' کہنے میں اپنے نفس کی عاجزی، درماندگی کا اقرار اور رب تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے پھر اس میں دلیل ہے کہ بندہ کو بارگاہ الٰہی کا قرب ووصال اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ بندہ کو اپنی عاجزی، کمزوری کا اعتراف ہو چنانچہ کلمات نبویہ میں بھی اسی طرف اشارہ ہے مشہور حدیث ہے۔ ''من عرف نفسه فقد عرف ربه'' اس حدیث پاک کا مفہوم یہی ہے کہ جس بندہ کو اپنی ضعف وکمزوری اور قصور وکوتاہی کی معرفت ہوجاتی

ہے تو اس کو اسکی معرفت حاصل ہوجاتی ہے کہ بیشک اس کا رب وہ ہے جو ہر مقدور پر قادر ہے۔ اسی طرح جس کو اپنی جہالت و نادانی کی معرفت ہوجاتی ہے اس کو اپنے رب کے علم وفضل اور عدل کا علم ہوجاتا ہے اور جس کو اپنے نفس کے اختلال حال کی معرفت ہوجاتی ہے اس کو اپنے رب کے فضل وکمال اور جلال کا علم ہوجاتا ہے۔

نکتہ(۳): یادرہے کہ طاعات پر اقدام، شیطان سے فرار کے بعد ہی ممکن ہے۔ اور شیطان سے فرار کا راستہ، استعاذہ ہے۔ مگر اس میں تسلسل لازم آتا ہے کیونکہ استعاذہ باللہ بھی طاعت کے انواع میں سے ایک نوع ہے۔ تو استعاذہ سے پہلے ایک استعاذہ چاہئے پھر یہ استعاذہ بھی چونکہ طاعت ہے اس لئے اس سے پہلے بھی استعاذہ چاہئے۔ اسی طرح زمانہ ماضیہ میں قول استعاذہ تسلسل کو مستلزم ہے۔ اب اگر تسلسل کو محال سمجھ کر استعاذہ کو محال سمجھ لیا جائے تو شیطان سے فرار کا راستہ بند ہوجائے گا مگر جب اللہ عز شانہ نے شیطان سے فرار کا راستہ تعوذ کو قرار دیا اور یہ غیر متناہی تعوذ لانے کا متقاضی ہے جو بندہ کے بس میں نہیں ہے۔ البتہ بندہ کو جب اس حالت کی معرفت ہوجاتی ہے تو بالتحقیق وہ اپنی عاجزی کا اعتراف اور کوتاہی کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ طاعت کی ادائیگی میں اس کی مدد فرماتا ہے اور کار طاعات میں لگنے کا اس کو علم دے دیتا ہے کہ ایک مرتبہ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" کہہ لو تو گویا تم نے غیر متناہی مرتبہ استعاذہ کرلیا۔

نکتہ(۴): یوں تو مقام امور طاعات میں استعاذہ مستحب ہے لیکن بالخصوص قراءت قرآن کے آغاز میں استعاذہ بحکم قرآن نہایت ہی ضروری ہے چونکہ قرأت قرآن میں شیطان کچھ زیادہ ہی وسوسہ ڈالتا ہے اور قاری قرآن کو طرح طرح بہکانے کی کوشش کرتا ہے اس لئے کہ جو شخص قرآن کی قراءت کرتا ہے اور اس سے عبادت الٰہیہ کا قصد کرتا ہے اس کے وعدہ وعید میں غور وفکر کرتا ہے اور اس کے آیات وبینات میں تفکر کرتا ہے تو اس طرح اس کو طاعات کی بجا آوری میں رغبت بڑھ جاتی ہے۔ اور محرمات سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے انہیں وجہوں سے قرأت قرآن، امور طاعات میں نہایت ہی عظیم اور بزرگ ہے اور جب قرأت قرآن اتنا اہم ہے تو ظاہر ہے کہ شیطان اس سے روکنے کی بھی بلیغ کوشش کرتا ہے اس لئے شر شیطان سے بچنے کے لئے بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ محتاج ہوجاتا ہے اسی لئے قرأت قرآن کے ساتھ استعاذہ کو مخصوص فرمایا گیا ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا "فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" (النحل: آیت ۹۸)

نکتہ(۵): شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ چنانچہ اللہ عز شانہ تعالیٰ فرماتا ہے "اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا" بیشک شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو۔ اور اللہ رحمن انسان کا مولی وآقا، اس کا

خالق و مالک اور اس (فاطر:) اور اس کی تمام مہمات کا پورا کرنے والا ہے اس کے باوجود جب بندہ طاعات و عبادات کے کاموں کو شروع کرنے لگتا ہے تو اپنے ازلی دشمن شیطان سے خوف زدہ رہتا ہے پس بندہ اپنے مالک کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لئے کوشاں رہتا ہے تاکہ مالک اسکو شیطان کی زحمتوں سے بچائے رکھے پھر جب بندہ کو بارگاہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور وہ طرح طرح اس کی بہجت و کرامت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اپنے دشمن کو بھول کر بالکلیہ طاعت حبیب میں لگ جاتا ہے۔ اس وقت بندہ کو دو مقام حاصل ہوتا ہے۔ ایک مقام فرار ہے اور وہ اسکا "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" کہنا ہے۔ اور دوسرا ملک جبار کی بارگاہ قدس میں مقام استقرار ہے اور یہ مقام اس کو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے حاصل ہوتا ہے۔

نکتہ (۶): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" یعنی اسے پاک ہی لوگ چھوئیں (الواقعہ ۷۹) خیال رہے کہ دل جب غیر اللہ سے متعلق ہوجائے اور زبان پر غیر اللہ کا ذکر آجائے تو قلب و زبان دونوں ملوث ہوجاتے ہیں اب ذکر الٰہی کے لئے اس کو پاک کرنا ضروری ہے۔ پس جب بندہ "اعوذ باللہ" کہتا ہے تو اس کے قلب و زبان کی طہارت ہوجاتی ہے اور اس وقت بندہ حقیقی نماز یعنی ذکر الٰہی کے لائق ہوجاتا ہے تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہتا ہے۔

نکتہ (۷): صوفیا فرماتے ہیں کہ انسان کے دو طرح کے دشمن ہیں ایک ظاہری دشمن، دوسرا باطنی دشمن اور انسان کو دونوں سے جنگ کا حکم ہے چنانچہ اللہ عز شانہ نے ظاہر دشمن کے بارے میں فرمایا "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" (التوبۃ ۲۹) اسی طرح دشمن باطن کے بارے میں ارشاد ہے "اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا" (فاطر) جب بندہ اپنے دونوں ظاہر و باطن دشمن سے جنگ کرتا ہے تو اللہ ملک العلام اپنے بندہ کی امداد فرماتا ہے۔ چنانچہ بندہ جب اپنے ظاہر دشمن سے جنگ پر آمادہ ہوتا ہے تو اس وقت اللہ عز شانہ فرماتا ہے "يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ" تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔ (آل عمران ۱۲۵) اور جب اپنے دشمن باطن سے آمادہ جنگ رہتا ہے تو اللہ رحمن فرماتا ہے "اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا" (الاسراء ۶۵) ان دونوں دشمنوں سے بندۂ مومن کو مقابلہ کرنا چاہئے مگر دشمن ظاہر کے بالمقابل دشمن باطن سے مقابلہ کرنے میں زیادہ زور صرف کرنے کی ضرورت ہے اس لئے دشمن ظاہر کے بالمقابل دشمن باطن سے محاربہ کرنا کئی وجہوں سے افضل و برتر ہے۔

(۱) ظاہر دشمن جب بندہ مومن پر موقع پالیتا ہے تو اس کی جان و مال اور اس کی دنیا تباہ کر دیتا ہے۔لیکن دشمن باطن کو جب موقع ملتا ہے تو بندۂ مومن کی دولت ایمان ویقین کو غارت کر دیتا ہے۔

(۲) ظاہر دشمن بندۂ مومن پر جب غالب آجاتا ہے اور مومن مغلوب ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ظالم غالب کو عذاب اور مومن مغلوب کو اجر وثواب عطا فرماتا ہے۔اس کے برخلاف دشمن باطن (شیطان) مومن پر غالب آجائے اور مومن اس دشمن سے مغلوب ہوجائے تو اس کو ثواب نہیں بلکہ عذاب دیا جاتا ہے۔

(۳) جس بندۂ مومن کو ظاہر دشمن قتل کر دیتا ہے تو وہ شہید ہوجاتا ہے مگر جس کو عدو باطن قتل کر دے تو محروم ومردود ہوجاتا ہے۔ان وجہوں سے عدو باطن سے احتراز بہ نسبت عدو ظاہر کے زیادہ ضروری ہے اس لئے اگر بندہ چاہتا ہے کہ عدو باطن سے بچتا رہے تو قلب وزبان سے "**اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم**" کہتا رہے۔ہمیشہ رب تعالیٰ کی پناہ میں رہے گا اور دشمن باطن شیطان سے بچا رہے گا۔

نکتہ (۸): اس نیلگوں آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ نے نہ جانے کیسے کیسے رنگین، خوشنما جاذب نظر اور دلکش مناظر پیدا کئے ہیں اس کا کسی کو صحیح اندازہ نہیں۔جنت نشان لہلہاتے گھنے باغات، سرسبز شاداب کھیتیاں، دلکش مہکتے پھول، آبشار کے نغمے، بہتی ندیاں، خوبصورت جھیلیں، ٹھنڈے شیریں چشمے، بلند وبالا پہاڑ، آباد شہریں، فلک بوس عمارتیں اور خوبصورت و پاکیزہ آبادیاں ایک سے ایک حسین وخوبصورت مقامات ودلکش مناظر سب خلاق عالم کے مظاہر ہیں جو اس کی الوہیت اور قدرت کاملہ کی روشن نشانیاں ہیں۔مگر ان سب پر بہار مقامات، دلکش مناظر، پاکیزہ وادیوں اور خوشنما گلستانوں میں سب سے زیادہ جو چیز پاکیزہ، دلکش، خوشبودار اور صاف شفاف آئینہ کی طرح بلکہ اس سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے مومن کا قلب چنانچہ مومن کا قلب تمام مقامات سے افضل، برتر اور پاکیزہ ہے آئینہ کی طرح صاف اور پاکیزگی میں اس سے بھی اعلیٰ ہے کیونکہ آئینہ میں حجاب پڑ جانے کے بعد اس میں کوئی چیز دیکھی نہیں جاسکتی لیکن مومن کا قلب ایسا روشن ہوتا ہے کہ اس کے قلب پر ساتوں آسماں، بلکہ عرش وکرسی آڑے نہیں آتے وہ اپنے قلب کے نور سے ساتوں آسمان، عرش وکرسی کا یکلخت مشاہدہ کر لیتا ہے۔محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ النورانی فرماتے ہیں میں اپنی آنکھوں کی پتلیوں سے لوح محفوظ دیکھتا ہوں، میرا مرید مشرق میں ہو اور میں مغرب میں رہوں تو میں اسے دیکھ لیتا ہوں اور اس کا ستر کھلا ہو تو میں ڈھانک دیتا ہوں ایسا کیوں نہ ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔[۱] اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ "اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور نیک کام جسے وہ بلند کرتا ہے۔(فاطر ۱۰) غرض قلب

ان حجابات مادیہ کے باوجود جلال ربوبیت کا مطالعہ اور صفات صمدیت کا مشاہدہ کر لیتا ہے اس لئے اہل تصوف کے دیوان میں یہ امر متحقق ہے کہ قلب مومن تمام مقامات سے اعلیٰ وارفع اور روشن ومنور ہے۔اس دعویٰ پر ارشادات نبویہ دلالت کرتی ہیں۔

حدیث اول: مازال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی کنت سمعه الذی یسمع به ویده التی یبطش بها (الخ) میرا ابندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ میں اسکا کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، میں اس کی زبان ہوجاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور اس کی نگاہ ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔(الخ) یعنی اس کا پکڑنا، بولنا، دیکھنا سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے ہاتھ قدرت الہیہ کا مظہر ہوجاتا ہے۔اس کی نگاہ سے حجابات ایسے دور ہوجاتے ہیں کہ وہ دور ونزدیک کو آن کی آن میں مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح دور ونزدیک سے وہ یکساں سننے لگتا ہے اور جو بولتا ہے خدائے تعالیٰ اس کو تقدیر بنادیتا ہے۔بندہ کے اعضاء میں حیرت انگیز تبدیلی اس کے قلب صافی کا آئینہ دار ہے چنانچہ بندہ اپنے آپ کو یاد الٰہی میں ایسا فنا کر دیتا ہے کہ اس کے قلب پر انوار الٰہی کی تجلی کا نزول ہونے لگتا ہے پھر قلب منور کے اثرات کا ظہور بندہ کے اعضاء پر ہونے لگتا ہے پس اس کا دیکھنا سننا بولنا پکڑنا سب خدا کی طرف منسوب ہوجاتا ہے۔

حدیث دوم: حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "القبر روضة من ریاض الجنة" اس حدیث کا مفہوم ظاہر ہے کہ قبر جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے مگر قبر کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ ایک سخت تنگ، تاریک ڈراؤنا اور وحشتناک مقام ہے اس کے باوجود قبر کو رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی کیاری فرمایا پس اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندہ کی قبر ہے وہ جنت کی کیاری ہے کہ وہ قبر اس کی رہائش گاہ اور آرامگاہ ہے چونکہ اس قبر میں ایسے قلب والا بندہ آرام فرما ہے جنکا قلب معرفت الہیہ کا گنجینہ ہے بلکہ اس کا قلب عرش الٰہی ہے۔بہت مشہور ارشاد ہے۔"قلب المومن عرش الله" اس لئے واجب وضروری ہے کہ قلب سارے مقامات ومکانات سے افضل ہو، قلب کے افضل البقاع ہونے پر صوفیا کے نزدیک طویل کلام ہے۔ ذیل میں صرف دو وجہیں ذکر کی جاتی ہیں

(۱) نیک صالح بندہ کو گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرا بندہ! تمہارا قلب میرا باغ ہے اور میری جنت تمہارا باغ ہے پس جب تک تم میرے باغ میں بخل نہیں کروگے بلکہ میری معرفت کے پانی سے اس کو سیراب کرتے رہوگے تو میں بھی

اپنے باغ سے تم پر بخل نہیں کرونگا بلکہ انعامات کی بارش اور جنت النعیم کا عطیہ عطا کردونگا مگر شرط یہی ہے کہ تم میرے باغ یعنی اپنے قلب کو ہرا بھرا صاف شفاف آئینہ رکھو۔

(۲) باغ جنت میں نیک بندہ کے نزول کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے ’’فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ‘‘ (القمر:۵۵) اس آیت پاک میں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے ’’عِنْدَ مَلِيْكٍ‘‘ نہیں فرمایا بلکہ ’’مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ‘‘ ارشاد فرمایا، گویا اللہ ملک الوہاب اشارہ فرمانا چاہتا ہے کہ اس دن ملک مقتدر میں ہونگا اور میرے صالح اور نیک بندے ملوک ہوں گے جو میرے تحت قدرت ہوں گے چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ جب اس کی صفت رحمانیت اور شان کریمی کی جلوہ گری ہوگی تو اپنے خاص بندوں کو دنیا کی سلطنت سے زیادہ وسیع بادشاہت کا مقام جنت میں عطا فرمائے گا۔ گویا اللہ عزشانہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! بیشک میں نے اپنی جنت تمہارے لئے بنائی ہے اور تم نے اپنی جنت (قلب) کو میرے لئے تعمیر کی ہے لیکن تو نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، کیا تم نے میری جنت اب تک دیکھی ہے اور کیا تم اس میں داخل ہوئے ہو! بندہ کہتا ہے نہیں اے میرے رب، اللہ رب کریم فرماتا ہے اور کیا میں تیری جنت میں داخل ہوا اس وقت بندہ کہتا ہے ہاں اے میرے پروردگار پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے بندو! جب تم جنت میں داخل ہونے لگو اور تمہارے داخلہ کا وقت قریب ہو تو تمہارے لئے میں نے شیطان کو اپنی جنت سے مار بھگایا چنانچہ میں نے اس سے کہہ دیا ’’اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا‘‘ یہاں سے نکل جا رد کیا گیا راندہ ہوا (الاعراف / 18) پس میں نے جنت میں تمہارے دخول سے پہلے ہی اپنی جنت کو شیطان سے خالی کرالیا اور تمہارے دشمن کو ہمیشہ کے لئے تم سے دور کردیا لیکن اے میرے بندو تم ہو کہ تمہاری جنت (قلب) جو میرا جلوہ گاہ ہے، میں میرے ستروں سال رہنے کے باوجود تم میرے دشمن شیطان کو نہیں بھگایا اس وقت عاجز وضعیف بندہ جواب دیتا ہے کہ اے پروردگار میں ضعیف وناتواں ہوں میں شیطان جیسے دشمن کو تمہاری جنت (یعنی اپنے قلب سے نکالنے پر قادر نہیں ہوں تو قادر مطلق ہے جس طرح تو نے میری جنت سے شیطان کو نکال بھگا دیا اسی طرح تو اپنی جنت یعنی میرے قلب) سے بھی شیطان مردود کو نکال بھگا۔ تب اللہ عزشانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عاجز بندہ جب قادر مطلق، بادشاہ قاہر کی پناہ میں آجاتا ہے تو خود ایسا طاقتور ہوجاتا ہے کہ شیطان کو اپنے قلب کی جنت سے نکالنے پر قادر ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حضور محبوب سبحانی کا واقعہ تفصیل سے گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے کہ آپ نے شیطان کو ناکوں چنے چبوادیئے۔ لہذا اگر بندہ چاہتا ہے کہ رب کریم کی پناہ اور حمایت میں پوری طرح داخل ہوجائے تو اس کو چاہئے کہ کلمہ ’’اعوذ باللہ من الشیطن

الرجیم'' کووظیفہ ہرساعت بنالے۔

نکتہ(۹): گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! تم میں انصاف نہیں ہے تم جانتے ہو کہ تمہارے اور شیطان کے درمیان تکرار وتکدر کیوں ہے؟ شیطان فرشتوں کی طرح میری عبادت کرتا تھا اور ظاہر میں میری الوہیت کا اقراری تھا لیکن حقیقت میں اس کو مجھ سے دشمنی اور عداوت تھی چونکہ جب ہم نے تمہارے باپ آدم کے لئے سجدہ کرنے کا اس کو حکم دیا تھا تو از راہ تکبر سجدہ سے انکاری ہوگیا۔تو میں نے اس کو اپنی بارگاہ سے مردود کردیا وہ تمہارے باپ کا ازلی دشمن ہوگیا اور میری عبادت سے بھی متنفر ہوگیا پھر جب سے تم پیدا ہوئے اور اب ستر برس کے ہوگئے ہو وہ تم سے نفرت کرتا رہا ہے اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو حالانکہ ہر کار خیر میں وہ تمہاری مخالفت کرتا ہے اور تم ہو کہ ہر مراد میں اس کی موافقت کرتے ہو لہذا اس مذموم حرکت اور ناپسندیدہ طریقہ کو چھوڑ دو اور کھل کر اس کی دشمنی کرو یہ اس وقت ہوگا جب تم ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ''کا وظیفہ کرنے لگو!

نکتہ(۱۰): اے انسان تم اپنے باپ آدم علیہ السلام کے واقعہ پر غور کرو کہ شیطان نے ان سے قسم کھا کر کہا تھا ''اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ''(اعراف:۲۱) کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے پھر قسم کھانے کے باوجود انجام یہ ہوا کہ ان کو جنت سے نکلوالنے کی سازش رچی اور بالآخر لغزش دیکر جنت سے باہر آنے پر مجبور کردیا اے آدم کی اولاد تمہارے حق میں شیطان نے یہ قسم کھائی ہے کہ ہم ان سب کو پیس ڈالیں گے اور ضلالت وگمراہی کی بھٹی میں پھینک دیں گے قرآن حکیم میں اس کے اس قسم کا بھی ذکر موجود ہے ۔ ''قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ''بولا تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کردونگا مگر ان میں جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔(سورہ،ص/83) لہٰذا اے انسان غور کر کہ تمہارے باپ آدم جنت میں تھے اور شیطان نے ان کے ساتھ خیر خواہی کی قسم کھائی تھی اس پر ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو لغزش دے دی نتیجتاً انکو جنت سے زمین پر آنا پڑا تو تمہارے ساتھ وہ شیطان کیسا برتاؤ کرے گا جب کہ تم پہلے ہی سے جنت سے باہر ہو اور تمہارے بہکانے اور گمراہ کرنے کی شیطان قسم کھا چکا ہے۔اس لئے شیطان کے مکر وفریب اور اس کی ضلالت وگمرہی کے جال میں پھنسنے سے بچنا چاہتے ہو تو میری پناہ میں آجاؤ اور کہو ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ''۔

نکتہ(۱۱): ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ''میں صرف اسماے جلالت میں سے نظم ''اللہ'' ذکر کیا اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا اسم مبارک نہیں ذکر کیا وجہ یہ ہے کہ تمام اسماوصفات الٰہیہ کی بہ نسبت اسم اللہ میں معاصی سے

زجروتوبیخ کا انداز زیادہ بلیغ اور کامل تر ہے۔ کیونکہ الہ وہ ہے جو مستحق عبادت ہے۔ اور مستحق عبادت وہی ہوسکتا ہے جو قادر علیم اور حکیم ہو۔ پس جو "اعوذ باللہ" کہتا ہے تو گویا وہ "اعوذ بالقادر العلیم الحکیم" کہتا ہے۔ اور یہ تینوں اوصاف زبروتوبیخ کرنے کے لئے نہایت ہی اعلیٰ وافضل ہیں یہ اس طرح کہ چور بادشاہ کی قدرت کو جانتا ہے لیکن پھر بھی کبھی اس کے مال کو چرالیتا ہے چونکہ چور جانتا ہے کہ میں جس کے مال کی چوری کررہا ہوں وہ بادشاہ ضرور ہے اور قادر بھی ہے مگر وہ غیر عالم ہے میری چوری کا اس کو علم نہیں ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ صرف قدرت زجروتوبیخ کے لئے کافی نہیں بلکہ قدرت کے ساتھ اس کا علم بھی ضروری ہے بلکہ صرف علم وقدرت بھی بسا اوقات زجر کے لئے کافی نہیں ہوتے چنانچہ بادشاہ قادر عالم بہت مرتبہ امر منکر کو دیکھتا ہے لیکن اس سے منع نہیں کرتا غرض اس کا حاضر رہنا زجر کے لئے مانع نہ ہوا لیکن جب قدرت، علم اور قبائح سے روکنے کی حکمت بالغہ سب موجود ہوں تو توبیخ بلیغ اور زجر کامل ہوتی ہے پس جب بندہ نے "اعوذ باللہ" کہا تو گویا اسنے یہ کہا "اعوذ بالقادر العلیم الحکیم الذی لا یرضیٰ بشیٔ من المنکرات"۔ اس وقت زجر تام ہوتا ہے۔

نکتہ (۱۲): بندہ مومن، جب "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" کہتا ہے تو اس کی واضح دلالت اس پر ہوتی ہے کہ بندہ شیطان کی مجاورت ومصاحبت سے راضی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان خدائے تعالیٰ کا نافرمان ہو چکا ہے اور اس کی نافرمانی اس مسلمان کو فی الحقیقت نقصان نہیں دے سکتی لیکن پھر بھی بندہ اس کی مجاورت سے راضی نہیں پس جب نافرمان کی صحبت سے راضی نہیں تو اس سے زیادہ بہتر ہے کہ بندہ از خود خدائے تعالیٰ کی نفس نافرمانی سے بچتا رہے۔

نکتہ (۱۳): "الشیطان" اسم ہے اور "الرجیم" صفت ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف اسم (نام) پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اسکی صفت رجیم کو بھی ذکر فرمایا وجہ یہ ہے گویا اللہ عزشانہ تعالیٰ بندہ سے فرماتا ہے کہ بیشک یہ شیطان ہزاروں سال میری عبادت میں لگا رہا کیا تم نے سنا کہ اس نے مجھے کبھی نقصان پہنچایا ہو یا کوئی ایسا کام کیا ہو جو میرے لئے نقصان کا باعث ہو لیکن پھر بھی ہم نے اس کو اپنی بارگاہ سے مردود کردیا اور اس کو رحمت سے دور کردیا لیکن تم ہو کہ اگر شیطان تمہارے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی بیٹھ جائے تو تمہارے لئے دائمی جہنم میں جانے کا راستہ ہموار کردے تو پھر کیوں نہیں تم اس کو اپنے سے بھگانے دور کرنے کی کوشش کرتے ہو اگر چاہتے ہو کہ شیطان تم سے دور رہے اور تم شیطان تم سے دور رہے تو کہا کرو "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

نکتہ (۱۴): بیان تعوذ میں کسی ذہن پر یہ شبہ گذر سکتا ہے کہ یہاں "اعوذ باللہ" کی بجائے "اعوذ بالملئکۃ" کہا جاتا تو بہتر تھا چونکہ بہت سے ملائکہ مقربین کو حق سبحانہ تعالیٰ نے شیطان کو دفع کرنے پر مامور فرمایا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ کا ذکر ہوتا تو کافی تھا پھر اس نافرمان کتا کے بالمقابل اسم جلالت باری تعالیٰ کو کیوں ذکر کیا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اے بندۂ خدا! شیطان تمہیں دیکھتا ہے لیکن تم اس کو نہیں دیکھ سکتے قرآن حکیم میں ارشاد ہے "اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ "(الاعراف ۲۷) جب حال یہ ہے کہ وہ تم کو دیکھتا ہے اور تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ اپنے مکر وفریب کی جال تم پر پھینک دیتا ہے اور تم کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ تم اس ذات کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو جو ذات کہ شیطان کو تو دیکھتا ہے لیکن شیطان اس ذات کو کبھی نہ دیکھ سکے وہ ذات وحدہٗ لاشریک کی ہے اس لئے صرف اسی کی پناہ لو اور کہو "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم"۔

نکتہ (۱۵): "الشیطان" پر الف لام تعریف جنس کے لئے ہے اس لئے کہ شیاطین بہت ہیں۔ ان میں بعض مرئی ہے اور بعض غیر مرئی۔ مرئی شیطانوں کی قوت وطاقت بہ نسبت غیر مرئی شیطان کے کہیں زیادہ ہوتی ہے چنانچہ بعض واعظین نے اپنے جلسہ میں مندرجہ ذیل حکایت بیان کی۔

حکایت: کہ آدمی جب صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے پاس ستر شیطان آتے ہیں اور اس کے دونوں ہاتھ دونوں پیر اور قلب سے متعلق ہوجاتے ہیں اس طرح وہ سارے شیطان اس کو صدقہ کرنے سے روک دیتے ہیں جب مجلس میں بیٹھے لوگوں نے سنا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا میں ان ستروں شیطانوں سے جنگ کرونگا یہ کہہ کر مسجد سے نکلا اپنے گھر آیا اور اپنے دامن میں گیہوں بھر لیا صدقہ کرنے کی نیت سے نکلنا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی اچھل پڑی اور جھگڑنے لگی یہاں تک کہ نوبت مار پیٹ کی آگئی چنانچہ وہ شخص اپنی بیوی کی جنگ وجدال سے عاجز آکر گیہوں کو صدقہ کرنے سے باز آگیا پھر ناکام مسجد کی طرف لوٹ گیا۔ حضرت واعظ صاحب نے پوچھا کہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے کہا میں ستروں شیطانوں کو شکست دے دیا تھا مگر ان شیطانوں کی ماں نے مجھے شکست دیا۔

یہ بیان اس تقدیر پر تھا کہ الف لام جنس کا ہے تعریف کے لئے لایا گیا ہے۔ لیکن اگر الف لام عہد کا مانیں تو یہ بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ تمام معاصی وبرائیاں شیطان کی رضا سے ہوتے ہیں اور جو فاعل کا حکم ہوتا ہے وہ حکم اس سے راضی رہنے والے کا بھی ہوتا ہے جیسے مسئلہ شرعیہ قرأت خلف الامام کے بیان میں ہے کہ ساکت وسامع کا حکم قاری

وامام کا حکم ہے ارشاد نبوی ہے "قرأۃ الامام قرأۃ له"۔

نکت ۵ (۱۶): "الشیطان" شطن سے ماخوذ ومشتق ہے اور شطن کے معنی دور ہونا کے آتا ہے۔ اس کا نام شیطان اس لئے پڑا کہ وہ رحمت الہیہ سے دور ہوگیا ہے اس کے برخلاف جو مطیع ہے وہ رحمت الہیہ سے قریب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِب" (العلق ۱۹) بلکہ مطیع وفرماں بردار بندہ سے خود خدائے تعالیٰ قریب ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ" (البقرہ:۱۸۶) یعنی اے حبیب میرے بارے میں میرے بندے آپ سے پوچھیں تو آپ بتادیجئے کہ بیشک میں تم سے قریب ہوں۔

شیطان کی صفت رجیم ذکر کی گئی ہے جو مرجوم یعنی مرمیٰ کے معنی میں ہے معنی یہ ہے کہ شیطان وہ ہے جس پر لعنت و شقاوت کا تیر برسایا گیا ہے اس کے برخلاف بندۂ مومن وہ ہے جو سعادت ونیک بختی کی رسی کے ذریعہ بارگاہ خدا تک پہنچا ہوا ہے چنانچہ مولائے کریم کا ارشاد ہے "وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى" اور پرہیز گاری کا کلمہ ان پر لازم فرمایا (الفتح ۲۶) دونوں متلوہ آیتوں سے ظاہر کہ شیطان رحمت الہیہ سے جہاں بہت دور ہے وہیں بندۂ مومن بارگاہ الٰہی سے بہت قریب ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی خبر دے دی ہے کہ جس شیطان کو اس نے اپنی رحمت سے دور کردیا ہے پھر کبھی اس کو رحمت کے قریب نہ کریگا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً" تو تم ہرگز اللہ کے دستور کو بدلتا نہ پاؤ گے، اور ہرگز اللہ کے قانون کو ٹلتا نہ پاؤ گے (فاطر: ۴۳) پس اے بندۂ مومن! تم اس بات کا یقین کرلو کہ جب اللہ رحمن ورحیم نے تمہیں اپنی رحمت سے قریب کرلیا ہے تو پھر وہ کریم رب تم کو اپنی رحمت سے دور نہیں کریگا

نکتہ (۱۷): حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا کہ تلاوت قرآن سے پیشتر "تعوذ" پڑھنا ضروری ہے لیکن اس کے علاوہ جتنی طاعتیں ہیں ان میں تعوذ کچھ ضروری نہیں فقط تلاوت قرآن حکیم میں ضروری ہے چونکہ بندہ کی زبان کذب، غیبت اور چغلی وغیرہ برائیوں سے ناپاک ہوجاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے قاری قرآن کو حکم دیا کہ اب تعوذ سے اپنی نجس زبان ودہن کو دھولو تاکہ زبان طاہر سے اس طاہر کلام کو پڑھ سکو جو طیب وطاہر پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

نکتہ (۱۸) "اعوذباللہ من الشیطن الرجیم" میں شیطان رجیم کہا گیا اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" میں "الرحمن الرحیم" کہا گویا اشارہ ہے کہ شیطان رجیم ہے اور اللہ رحمن ورحیم ہے اس لئے تم شیطان

رجیم سے دور ہو جاؤ تا کہ رحمن رحیم کے قریب ہو سکو گے۔

نکتہ (۱۹): اے بندۂ خدا! شیطان تیرا دشمن ہے ارشاد الٰہی ہے "اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌ مُّبِیْنٌ" (یوسف) لیکن تم اپنے دشمن سے غافل بھی ہو اور اس سے غائب بھی ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ" بیشک وہ اور اس کا کنبہ تمھیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم انھیں نہیں دیکھتے (الاعراف ۲۷) لیکن تم پریشان نہ ہو اگرچہ تمہارا دشمن غائب ہے مگر تمہارا حبیب غالب ہے ارشاد فرماتا ہے۔ "وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ" اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے مگر اکثر آدمی نہیں جانتے (یوسف ۲۱) پس جب تمہارا غائب دشمن تم پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرے تو حبیب غالب کی پناہ لو اور کہو "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم"۔

نکتہ (۲۰): قرأت وتلاوت قرآن افضل طاعات سے ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس میں تعوذ پڑھنے کا حکم ہے۔ اس میں جہاں خدائے تعالیٰ کی پناہی کی طلب ہے وہیں شیطان کو ملعون و مردود کہنا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ شیطان کو ملعون و مردود کہنا گالی سے بھی سخت تر ہے، مگر طاعت و قربت میں ایسے سخت الفاظ کا استعمال یہ بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ جو خدائے تعالیٰ کا نافرمان اور انبیائے کرام کا گستاخ ہو چکا اسے طاعت و قربت میں بھی ملعون و مردود کہنا بلفظ دیگر گالی دینا جائز ہے۔ "ھو تعالیٰ اعلم بمرادہ و اسرارہ، علمہ اتم و احکم"۔

★★★

مباحث تسمیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم فرمانے والا)

تعلق: تسمیہ کا تعوذ سے کئی طرح تعلق ہے ایک یہ کہ تعوذ میں ماسوئ اللہ سے علیحدگی ہوتی ہے اور تسمیہ میں اللہ جل شانہ کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اور ماسوئ اللہ سے علیحدگی کو توجہ الی اللہ پر تقدم ہے دوسرے یہ کہ ''اعوذ باللہ'' میں تمام قسم کے برے اعمال، باطل عقیدے اور فاسد خیالات وغیرہا سے پرہیز اور بیزاری ہے اور ''بسم اللہ'' میں تمام اچھے عقائد و اعمال، عمدہ خیالات بلکہ تمام حسنات کو رب تعالیٰ سے حاصل کرنا ہے گویا تعوذ پرہیز ہے اور تسمیہ علاج ہے اور یہ معلوم ہے کہ پرہیز، علاج پر مقدم ہوتا ہے اس لئے تعوذ کو تسمیہ پر مقدم فرمایا گیا ہے۔

{باب اول}

اس باب میں تسمیہ کے ان مسائل کا بیان ہے جو بطور مقدمات مذکور ہیں۔ اس میں چند مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے۔

مسئلہ اول: ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کی ''با'' کے بیان میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی ''با'' کے بارے میں علمائے مفسرین کے بہت اقوال ہیں۔ ظاہر قول یہ ہے کہ ''با'' ایک ''مضمر'' سے متعلق ہے۔ اب یہ مضمر چاہے اسم ہوگا یا فعل ہوگا پھر دونوں تقدیر پر لفظ با مقدم ہوگا یا مؤخر ہوگا اس طرح ''با'' کا متعلق چار قسموں میں منحصر ہوتا ہے۔

اول: با کا متعلق ''با'' سے مقدم ہو اور فعل ہو۔ جیسے ابدأ بسم اللہ

دوم: با کا متعلق ''با'' سے مقدم ہو اور اسم ہو۔ جیسے ابتداء الکلام بسم اللہ

سوم: با کا متعلق ''با'' سے مؤخر ہو اور فعل ہو۔ جیسے بسم اللہ ابدأ

چہارم: با کا متعلق ''با'' سے مؤخر ہو اور اسم ہو۔ جیسے بسم اللہ ابتدائی

اب اس مقام پر یہ جاننا بھی خالی از فائدہ نہیں ہے کہ با کے متعلق کی تقدیم بہتر ہے یا تاخیر افضل ہے۔ یاد رہے کہ قرآن حکیم میں دونوں طرح سے وارد ہے، ارشاد باری تعالیٰ ''بسم اللہ مجرھا و مرساھا'' میں متعلق مؤخر ہے اور بسم اللہ مقدم ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ''اقرأ باسم ربک'' میں متعلق مقدم ہے اور باسم ربک مؤخر ہے بعض مفسرین

کے نزدیک بسم اللہ، کی تقدیم اس کے متعلق پر کئی وجوہ سے اولیٰ ہے۔

اول: اللہ تعالیٰ قدیم واجب لذاتہ ہے پس اس کا وجود ذاتی سب پر مقدم ہے اور جو سابق بالذات ہے وہ سبقت ذکر کا بھی مستحق ہے۔

دوم: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ" (الحدید: ۳) اور ارشاد ہے "لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ" (الروم: ۴) اس لئے بسم اللہ کا اپنے متعلق سے مقدم ہونا قرآنی آیات کا تقاضا بھی ہے۔

سوم: تقدیم فی الذکر کی تعظیم زیادہ کی جاتی ہے کہ مقدم ہونا معظم ہونے کی دلیل کہلاتی ہے۔

چہارم: "ایاک نعبد، میں فعل نعبد، اسم سے متاخر ہے تو عقل و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ "بسم اللہ" میں بھی فعل مضمر مؤخر ہی ہو، تقدیر عبارت ہوگی "بسم اللہ أبتدأ"۔

پنجم: امام رازی نے تفسیر کبیر میں اپنے والد شیخ ضیاء الدین عمر سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ ابوسعید بن ابوالخیر میہنی، استاذ ابوالقاسم قشیری کے پاس موجود تھے تو استاذ قشیری نے کہا کہ محققین کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی چیز ایسی نہ دیکھی مگر یہ کہ اس کے بعد اللہ دیکھا اس پر شیخ ابوسعید بن ابوالخیر میہنی نے کہا یہ محققین نہیں بلکہ مریدین کا مقام ہے محققین کا مقام تو یہ ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھیں تو پہلے اللہ کو دیکھیں پھر اس شئ کو دیکھیں۔

ان دونوں بزرگوں کے قول کا مطلب یہ کہ کبھی انتقال مخلوق سے خالق کی طرف ہوتا ہے اور کبھی نزول خالق سے مخلوق کی طرف ہوتا ہے اور یہ دونوں اقوال، احوال و اشخاص کے اعتبار سے درست ہیں۔ فرق دونوں اقوال میں یہ ہے کہ مخلوق سے خالق کی طرف انتقال والی صورت میں **برھان اِنّیّ** کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور خالق سے مخلوق کی طرف نزول والی صورت میں **برھان لمی** کی طرف اشارہ ہے اور یہ معلوم کہ **برھان لمی** بہ نسبت **برھان انی** کے افضل و اشرف ہے۔ پس جنہوں نے بسم اللہ میں پہلے فعل کو مضمر مانا ہے گویا وہ اپنے فعل کو دیکھ کر اسم الٰہی سے وجوب استعانت کی رویت کی طرف منتقل ہوئے ہیں اور جنہوں نے پہلے بسم اللہ کہا پھر بعد میں کوئی فعل مقدر مانا گویا انہوں نے استعانت باللہ کے وجوب کو پہلے دیکھا پھر اس سے اپنے نفس کے احوال کی طرف نزول کیا چنانچہ ارشاد ہے۔ "**لکل فیما یعشقون مذاھب**۔

مسئلہ دوم: "بسم اللہ" میں مقدر خواہ مقدم ہو یا مؤخر دونوں جائز ہے اختلاف اولیت میں ہے اس مقام پر یہاں ایک دوسرا اختلاف ہے کہ مقدر اسم ہے یا فعل ہے کچھ لوگ اسم کو مقدر ماننا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں جب کہ دوسرے

لوگ فعل کو مقدر ماننا بہتر جانتے ہیں۔ شیخ ابوبکر رازی نے کہا کہ تلاوت قرآن کا طرز دلالت کرتا ہے کہ اس مقام پر مضمر فعل ہے۔ اور وہ فعل امر ہے۔ چنانچہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے۔ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنِ ، تقدیر کلام ہے "قولوا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنِ" اسی طرح "بسم الله "میں تقدیر کلام "قولوا بسم اللہ" ہے۔ یہی مذہب قاضی بیضاوی کا ہے مگر وہ فعل امر "قولوا" یا فعل مضارع "ابدأ" کو مقدر ماننے کے حق میں نہیں ہیں بلکہ فعل قرأت میں اقرأ کو مقدر مؤخر ماننا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں ذیل میں تفسیر البیضاوی کے حلاوہ سے ہم ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

"والباء متعلمة بمحذ وف تقديره بسم الله اقرأ لان الذى يتلوه مقرو كذالک يضمر كل فاعل مايجعل التسمية مبدأ له وذالک اولىٰ أن يضمر ا بدأ لعدم مايطابقه و مايدل عليه او ابتدائى لزيادة اضمار فيه"۔

خلاصہ: یعنی بسم الله میں با حرف جار کا متعلق محذوف ہے اب اس کی دوصورت ہے یا تو فعل مقدر ہوگا یا اسم مقدر ہوگا پھر فعل کی دو قسمیں ہیں ایک فعل عام، دوسرا فعل خاص بعض مفسرین جیسے امام رازی وغیرہ نے فعل عام ابدأ کو مقدر مانا ہے جیسا کہ گذرا، فعل عام والوں کی دلیل یہ ہے کہ ابدأ افعال عامہ میں سے ہے اور اکثر ظرف مستقر کا متعلق افعال عامہ میں سے مانا جاتا ہے لہذا یہاں بھی ظرف مستقر ابدأ ہی مقدر مانا جائے گا ان حضرات کی دوسری دلیل ارشاد رسول ہے چنانچہ حدیث میں ہے "كل امر ذى بال لم يبدا" پس ابدأ مقدر ماننا حدیث مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہے۔ بعض لوگوں نے أبدأ فعل کی بجائے اسم ابتدائی، مقدر مانا ہے چونکہ یہ جملہ اسمیہ ہے اور جملہ اسمیہ ثبوت و دوام کا افادہ کرتا ہے یہی مذہب حضرت فخر الدین رازی کا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ نحات کوفہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت فخر الدین رازی نے تقدیر اسم کی اولیت بیان کرتے ہوئے کہا۔

"اضمار الاسم اولىٰ لأنا اذا قلنا تقدير الكلام بسم الله ابتداء كل شئ كان هذا اخباراً عن كونه مبدأ فى ذاته لجميع الحوادث و خالقا لجميع الكائنات" یعنی اسم کا مضمر ماننا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ جب ہم کہتے ہیں "بسم الله ابتداء كل شئ" تو اس کا مفہوم جہاں یہ ہوتا ہے کہ بسم اللہ پڑھنے والا اسم الٰہی سے استعانت و برکت حاصل کرنا چاہتا ہے وہیں اس میں وہ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ تمام امور و حوادث کا مبدأ اور کل کائنات کا خالق ہے۔ خواہ کوئی کہنے والا اس کو کہے خواہ نہ کہے یا کوئی ذکر کرنے والا اس کا ذکر کرے یا نہ کرے بہر حال وہ

اپنی ذات کے اعتبار سے کل شئ کا مبدأ ہے ظاہر ہے کہ بسم اللہ میں برکت واستعانت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا اظہار اولی وافضل ہے۔لیکن قاضی بیضاوی فعل خاص جیسے اقرأ کو مقدر مانتے ہیں اور قرینہ یہ ہے کہ تسمیہ کے بعد جو فعل ہے وہ از قبیل مقرو ومتلو ہے بلکہ انہوں نے اس مقام پر ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ ہر کام کرنے والے شخص کو چاہئے کہ جس کام کو تسمیہ سے شروع کرے اس کام پر دلالت کرنے والے لفظ سے ایک فعل مشتق مان کر بسم اللہ کو اس کے متعلق کردے، بخلاف ابدأ کے، کیونکہ کوئی فعل حقیقی نہیں پایا جارہا ہے جو فعل ابدأ پر دلالت کرے، اسی طرح ابتدائی مقدر ماننا بھی اولیت کے خلاف ہے کہ "**ابتدائی**" مقدر ماننے کی صورت میں حذف زیادہ ماننا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ "**ابتدائی**" باعتبار ترکیب نحوی مبتدأ موخر ہوگا پھر "**بسم اللہ**" کو "**حاصل**" یا "**کائن**" یا "**ثابت**" کے متعلق مان کر خبر بنائیں گے، ایک لفظ تو "**ابتدائی**" مقدر مانا ہی تھا پھر "**کائن**" یا "**ثابت**" کو بھی مقدر ماننا پڑا اس طرح اس میں زیادتی حذف ہے بخلاف **اقرأ** کے کہ اس میں زیادتی اضمار کی ضرورت نہیں اور یہ مسلم ہے کہ قلت حذف، کثرت حذف سے اولیٰ ہے لہٰذا "**اقرأ**" کو مقدر ماننا، **ابتدائی** کے مقدر ماننے سے زیادہ بہتر ہے۔رہا **ابدأ** مقدر ماننے والے کی دلیلوں کا جواب، تو ان کی پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کہ جہاں بھی ظرف مستقر ہو اس کا متعلق فعل عام ہوگا بلکہ یہ قاعدہ اس موقع کے لئے ہے جہاں کہ خصوصی قرینہ موجود نہ ہو لہٰذا فعل خاص جیسے اقرا مقدر ماننا صحیح ودرست ہوگا۔رہی دوسری دلیل جو ارشاد نبوی سے مستفاد ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فرمان مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم "**لم یبدأ**" سے **اثبات فی الابتدأ** مراد ہے **تلفظ بلفظ ابدأ** مراد نہیں ہے۔

مسئلہ سوم: (بیان قراءت): اس میں قرأت کی بحثیں طویل ہیں، کچھ ضروری باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔خیال رہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "میں صرف بسم پر وقف ناقص وقبیح ہے، اور بسم اللہ، یا بسم اللہ الرحمن پر وقف صحیح کافی ہے، اور کلمہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ " پر وقف، وقف تام ہے، وقف کی مذکورہ تین صورتیں ہیں ایک صورت میں ناجائز وممنوع ہے، دوسری صورت جواز کی ہے، اور تیسری صورت اولیت کی ہے وقف کے لئے یہ قاعدہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہر وہ کلام جو مفہوم نہ ہو ایسی جگہ وقف ناقص ہے اور ہر وہ کلام جس کا معنی بنفسہ مفہوم ہو مگر اس کلام کا مابعد بھی اس سے متعلق ہو ایسی جگہ وقف کافی ہے اور جو کلام تام ہو اور اس کا مابعد ماقبل سے منقطع ہو اس جگہ وقف تام کہلاتا ہے۔

مسئلہ چہارم: بسم اللہ اور ایسے ہی الحمد للہ میں تمام قراء کا اتفاق ہے کہ "لُ" کو پُر پڑھنا منع ہے

وجہ منع یہ ہے کہ ''ل'' سے ماقبل کسرہ ہے اور کسرہ سے لام مفخم کی طرف انتقال ثقیل ہے۔ چونکہ کسرہ پستی کو واجب کرتا ہے اور لام مفخمہ، حروف مستعلیہ میں سے ہے جو بلندی کا متقاضی ہے اور پستی سے بلندی کی طرف انتقال ثقیل ہوتا ہے البتہ لام مرفوع ہو یا منصوب ہو تو لام کو پر اور مغلظ پڑھنا مستحسن ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ، ''اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ'' اور ''قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ''۔ ''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ'' وغیرہا آیات میں لام وغیرہا حروف کو جہاں مفخم پڑھا جاتا ہے اس تفخیم سے مقصود دو امر ہے۔ ایک یہ کہ نظم اللہ اور لفظ لات کے درمیان باعتبار تلفظ فرق کرنا مقصود ہے دوسرا یہ کہ تفخیم تعظیم کی طرف مشعر ہے کہ یہ لفظ زیادتی تعظیم کا مستحق ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ لام رقیق کو طرف زبان سے ادا کیا جاتا ہے اس کے برعکس لام مفخم کو پورے زبان سے ادا کیا جاتا ہے پس پوری زبان سے ادا کرنے میں عمل زیادہ ہے بہ نسبت طرف زبان سے ادا کے اور جس حرف کی ادائیگی میں پورے زبان کو دخل ہو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب بھی زیادہ ہوگا چنانچہ تورات میں آیا ہے ''اجب ربک بکل قلبک'' اے موسیٰ پورے دل سے اپنے رب کو یاد کرو، اسی طرح یہاں انسان گویا پوری زبان سے اپنے رب کو یاد کر رہا ہے اور زبان دل کا ترجمان ہوتا ہے تو گویا بندہ نے اپنے پورے دل سے خدا کو یاد کیا ہے اس طرح زبان وقلب دونوں بندہ کا ذاکر ہو جاتا ہے اسی لئے مفخم کمال تعظیم کی طرف مشعر ہے۔

مسئلہ پنجم: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں ''نظم اسم جلالت'' ''اللہ'' مشدد ہے ادغام کیوجہ سے چونکہ یہاں دو لام ہے پہلا، لام تعریف ساکنہ ہے اور دوسرا لام اصلی متحرکہ ہے اور علم صرف کا یہ مشہور قاعدہ ہے کہ جب دو حرف ایک طرح کے جمع ہوں اور ان میں سے اول حرف ساکن ہو اور دوسرا متحرک تو ساکن کو متحرک میں ضرورۃ ادغام کر دیا جائے گا خواہ دونوں ایک کلمہ میں ہو یا دونوں دو کلموں میں ہو، دو کلموں کی مثال قرآنی آیات ''فما ربحت تجارتهم، وما بكم من نعمة، مالهم من الله'' اور ایک کلمہ میں ادغام کی مثال اسم جلالت ہے۔

نکتہ: اصحاف کشف وارباب مجاہدات نے اس مقام پر ایک دقیق نکتہ بیان کیا ہے نکتہ یہ ہے نظم ''اللہ'' میں دو لام ہے لام اول تعریف کا ہے اور لام دوم لام اصلی ہے اور دونوں کے اجتماع ہونے کی وجہ سے جب اول کو دوم میں ادغام کیا گیا تو لام معرفہ ساقط ہو جاتا ہے اور نظم اللہ کا لام اصلی صرف باقی رہ جاتا ہے گویا اس میں تنبیہ ہے اس بات کی طرف کہ جب ذات معروف کے نام کی طرف لام معرفہ لگایا گیا تو وہ لام معرفہ ساقط اور فنا ہو کر رہ گیا اور صرف وہ لام جو معروف ازلی تھا وہی باقی رہا، بغیر زیادتی ونقصان کے۔ یہاں لفظ ''اللہ'' کے تلفظ میں اس طرف دھیان رہے کہ اس کے الف کو حذف

کر کے اللہ بغیر کھڑا زبر پڑھنا جائز نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ضرورت شعری کی وجہ سے وقف کے وقت، حذف الف کی اجازت ہوسکتی ہے۔ اور اگر کسی نے حلف کے وقت بلّہ کہہ دیا یا ذبح کرنے کے وقت اور نماز پڑھنے کے وقت اللہ اکبر بغیر الف کہا تو اس کا حلف، ذبیحہ اور اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں، اس میں فقہا کا اختلاف ہے جنہوں نے تلفظ کا اعتبار کیا ہے ان کے نزدیک مذکورہ امور صحیح نہ ہوں گے اور جنہوں نے معانی اور فاعل کی نیت کا لحاظ کیا ہے ان کے نزدیک یہ امور صحیح ہوں گے۔

مسئلہ ششم: ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم'' راے مشدد ہے کیونکہ لام تعریف کو را میں ادغام کر دیا گیا ہے چنانچہ تمام قراء کا اتفاق ہے کہ لام تعریف کو را میں ادغام کرنا ضروری ہے اس کے علاوہ تیرہ حروف اور ہیں جس کے ساتھ لام تعریف کا ادغام کیا جاتا ہے وہ حروف یہ ہیں۔

الصّاد، الضّاد، السّین، الشّین، الدّال، الذّال، الرّا، الزاء، الطّاء، والظّاء، التّاء، الثّاء، والنُّون،

جیسے ارشاد باری تعالی میں ہے: اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِاللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْن (التوبۃ ۱۱۲)

ان حروف کے ساتھ لام تعریف کے ادغام کے جواز کی علت قرب مخرج ہے چونکہ لام اور یہ سارے حروف کا مخرج طرف لسان یا اس کے قریب قریب ہے اس لئے ادغام عمدہ ہے اس کے برخلاف مذکورہ تیرہ حروف کے علاوہ میں لام تعریف کا ادغام باتفاق قرا منع ہے جیسے ''العابدون، الحامدون الآمرون با لمعروف'' میں لام کا اظہار لازم ہے اور عدم جواز ادغام کی علت، بُعد مخرج ہے چونکہ جب حرف اول کا مخرج حرف ثانی کے مخرج سے بعید ہے تو ان دونوں کا دفعتاً نطق ثقیل ہوگا پس ان دونوں حرفوں کو ایک کو دوسرے سے ممتاز کر کے پڑھنا ضروری ہے بخلاف ان دو حرفوں کے جنکا مخرج قریب قریب ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان تمیز دشوار ہے اس لئے ادغام ضروری ہوا۔

مسئلہ ہفتم: ''الرحمن الرحیم'' میں باتفاق قراء، امالہ جائز نہیں ہے، البتہ امالہ کے جواز میں نحویوں کے دو اقوال ہیں۔ اول قول غالباً سیبویہ کا ہے جو امالہ کے جواز کے قائل ہیں، جواز کی علت بعد الف، نون مکسور کا ہونا

ہے دوسرا قول جو زیادہ ظاہر ہے یہی ہے کہ وہ نحویوں کے نزدیک جائز نہیں ہے۔اسی طرح الرحمن الرحیم کے اعراب میں کسرہ کے علاوہ، رفع ونصف دونوں اعراب نحوی اعتبار سے جائز ہے مگر "الرحمن الرحیم" کا مکسور ہونا اظہر ہے کہ دونوں کہ دونوں مجرور اول کی صفت ہیں۔اورنحوی اعتبار سے رفع ونصب اس طور پر ہوگا کہ "هو" اور "اعنی" مقدر ہوگا تقدیر کلام یہ ہوگا بسم الله هو الرحمنُ الرحیمُ ، بسم الله اعنی الرحمنَ الرحیمَ۔

{باب دوم}

(خط بسم الله، کے بیان میں)

اس باب میں چند مسائل ہیں

مسئلہ اول: بسم الله کی "با" کو عام طور پر طویل لکھا جاتا ہے جب کہ دوسرے مقامات جیسے باللہ وغیرہا میں طویل با لکھنا معروف نہیں ہے، طویل لکھنے کی دو وجہ ہے۔پہلی وجہ تو وہی مشہور معروف ہے کہ جب با کے بعد اسم کے الف اصلیہ کو حذف کر دیا گیا تو با کو طویل کر دیا گیا تا کہ الف محذوفہ پر دلالت کرے لیکن جہاں اسم کے الف کو نہیں حذف کرتے ہیں وہاں "با" کو اصلی حالت میں یعنی صغیر لکھتے ہیں جیسے قرآن ہی میں ہے "اقرأ باسم ربک" دوسری وجہ وہ ہے جو امام قتیبی نے کہا ہے کہ "با" طویل اس لئے کر دیتے ہیں کہ جب قاری قرآن مصحف شریف کھولکر کتاب اللہ شروع کریں تو حرف معظم سے اس کا آغاز کریں چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اپنے کاتب سے فرمایا کرتے تھے۔

طولوا الباء، واظهروا السين، ودوروا الميم تعظيماً لكتاب الله۔

یعنی "با" لمبی کرو، "سین" کو ظاہر کر کے لکھو اور "میم" کو مدور کر کے لکھو، کتاب اللہ کی تعظیم کے لئے۔

نکتہ: ارباب کشف نے با کی طوالت کے ذیل میں ایک شاندار نکتہ بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ "با" خط کے اعتبار سے حرف منخفض کہلاتا ہے یعنی جھکا کر یوں "ب" لکھا جاتا ہے مگر پستہ قد لکھا جانے والا جب لفظ اللہ سے مل گیا تو وہ طویل القامت بلند وبالا اور صاحب عظمت ورفعت ہو گیا پس جب پست حرف کے اتصال کی بلندی کا یہ عالم ہے تو امید ہے کہ جس بندۂ مومن کا قلب اللہ عزوجل سے متصل ہو جائے گا وہ بھی دین ودنیا میں بلند وبالا، باوقار اور باعزت ہو جائے گا۔

بسم اللہ کی "با" کے سلسلہ میں تفسیر روح البیان میں ہے۔مفسرین فرماتے ہیں کہ جمیع علوم بسم اللہ کی با میں امانت

رکھے گئے ہیں۔ گویا بسم اللہ شریف کا اصل معنی یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو کچھ تھا مجھ سے تھا اور جو کچھ ہوگا مجھ سے ہوگا اور تمام عالم کا ہونا میرے توسط سے ہے اور میرے سوا کسی دوسرے کا وجود نہیں اگر ہے تو مجازی واسمی۔ یہی مطلب ہے صوفیاء کرام کے اس قول کا جو فرماتے ہیں میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ نہ ہو۔

حدیث شریف: اور یہی مقصد ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث شریف کا فرماتے ہیں: ''دہر کو گالی مت دو، کیونکہ دہر تو اللہ تعالیٰ ہے''۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی ابتدا میں جمیع حروف میں سے با کو اختیار فرمایا، الف کو اختیار نہیں فرمایا ہے بلکہ بسم اللہ شریف میں تو الف کو حذف کر کے با کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے؟

جواب: اس میں دس حکمتیں ہیں:

۱۔ الف میں بلندی، تکبر، تطاول اور با میں عجز، تواضع، انکساری ہے۔ پس بمطابق قاعدہ ''من تواضع للہ رفعہ اللہ'' با الف سے رتبہ میں بڑھ گئی۔

۲۔ با، الصاق کے لئے آتی ہے (جس کا معنی ملنا ملانا ہے) بخلاف اکثر حروف، بالخصوص الف کے کہ وہ حرف قطع سے ہے (جس کا معنی جدائی ہے)۔

۳۔ با، ہمیشہ مکسور پڑھی جاتی ہے جب کہ اس کے ظاہر و باطن میں عجز و انکساری پائی جاتی ہے۔ پس اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عندیت یعنی قرب کا درجہ نصیب ہوا۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں ان قلوب کے قریب ہوں جو میری خاطر ہمیشہ عجز و انکساری میں رہتے ہیں۔

۴۔ با، میں بظاہر عجز و انکسار، مگر بباطن اس میں بلندی درجات وعلو ہمت ہے اور یہ صفات صدیقین کے ہیں۔ یہ صفات الف میں نہیں ہیں۔ بلندی درجہ تو یہ کہ اس میں نقطہ ہے اور الف میں نہیں۔ اور بلندی ہمت یہ کہ اس کو بہت سے نقطے پیش کئے گئے تو اس نے سوائے ایک کے باقی کو قبول نہیں فرمایا تا کہ اس کا حال اس عاشق صادق جیسا ہو جائے جو صرف ایک محبوب کی طلب رکھتا ہے۔

۵۔ با، میں قربت حق کی طلب صادق ہے کیونکہ جب اسے نقطہ ملا تو نقطہ کو اپنے قدموں میں پھینک دیا اور نقطہ ملنے سے نازاں بھی نہیں ہوئی۔ جیم اور یا میں یہ بات نہیں اس لئے ان کے نقطے ان کے نیچے نہیں بلکہ باعتبار وضع حروف کے وسط میں ہیں۔ ان کو دوسرے حروف سے ملانے سے ان کے نقطے نیچے ہو جاتے ہیں مگر اس وقت نقطوں کا نیچے ہونا اس

لئے ہے کہ جیم کو خا، سے اور یا، کو تا، سے مشابہت نہ ہو جائے بخلاف با کے کہ اس کا نقطہ ہمیشہ اس کے نیچے ہوتا ہے خواہ وہ تنہا ہو یا کسی دوسرے حرف سے ملی ہوئی ہو۔

۶۔ الف حرف علت ہے بخلاف با، کے۔

۷۔ با، باعتبار معنی حرف تام اور متبوع ہے اگر چہ باعتبار ظاہر کے تابع ہو کر آئی ہے (یعنی حروف کی وضع کے وقت الف کے بعد میں واقع ہوئی ہے۔ اور معنی کے لحاظ سے الف با کے تابع ہوا کرتا ہے بخلاف با، کے کہ وہ الف کی تابع ہو کر نہیں آتی اور جو چیز معنوی اعتبار سے متبوع ہو وہ اقوی ہوتی ہے۔

۸۔ با، حرف عامل اور متصرف اپنے غیر میں ہے۔ اسی وجہ سے یہ صاحب قدرت ہے بدیں وجہ ابتدا کے لائق ہوئی بخلاف الف کے کہ وہ عامل نہیں۔

۹۔ با، اپنے نفسی صفات کے اعتبار سے حرف کامل ہے بایں طور کہ الصاق واستعانت واضافت کے لئے آتی ہے۔ دوسری بات اس میں یہ ہے کہ اپنے غیر کو مکمل کرتی ہے۔ یعنی اپنے مدخول کو مجرور کرتی ہے اور اسے مکسور بمعنی متواضع بناتی ہے۔ ایسا متواضع کہ اپنے صفات اس میں پہنچاتی ہے۔ اسے یہی بلند درجہ اور قدرت حاصل ہے کہ اپنے غیر میں توحید و ارشاد کی تکمیل کراتی ہے۔ اسی تقریر کے موافق سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ میں وہ نقطہ ہوں جو با کے نیچے ہے۔ پس با، کو ارشاد و دلالۃ علی التوحید کا مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔

۱۰۔ با، حرفِ شفوی ہے۔ اس کے پڑھنے سے جتنے ہونٹ کھلتے ہیں کسی دوسرے حرف شفوی میں نہیں کھلتے یہی وجہ ہے کہ انسان نے عالم ارواح میں ''الست بربکم'' کے جواب میں ''بلیٰ'' بولتے وقت پہلے با سے اپنا منہ کھولا تھا۔ پس یہی پہلا حرف ہے جو انسان نے بولا اور اسی سے اپنا منہ کھولا (یہ خصوصیات باء کی ہیں) اسی وجہ سے حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ اس کو باقی حروف سے چن لے۔ لہٰذا تمام حروف سے اس کو چنا اور اس کی قدر و منزلت تمام حروف سے بلند فرمائی اور اس کے برہان کو ظاہر کیا اور اس کو کلام و کتاب و خطاب کا مفتح و مبدا بنایا۔ (کذا فی التاویلات النجمیہ)

مسئلہ دوم: بسم اللہ میں ''الف'' اسم کو حذف کر دیا گیا ہے لیکن ''اقرأ باسم ربک'' میں الف محذوف نہیں ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں اول یہ کہ بسم اللہ کا ورد بندہ مومن اکثر اعمال کے لئے اکثر اوقات میں کرتا ہے پس تخفیف کی وجہ سے بسم اللہ کے الف کو حذف کر دیا بخلاف دوسری جگہوں کے، کہ اس کا ذکر کم ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے جس کو خلیل نحوی نے کہا کہ بسم اللہ کے الف کو حذف کیا گیا ہے چونکہ اس کو داخل اس لئے کیا گیا تھا کہ سین ساکنہ کا

ابتداءً پڑھنا محال تھا لیکن جب اس پر با داخل کر دی گی تو الف مخذوفہ کی بدل ہوگئی اس لئے الف کو ساقط کر دیا لیکن ارشاد باری تعالیٰ "اقرا باسم ربک" میں الف کو نہیں ساقط کیا گیا ہے کیونکہ اس جگہ "با" الف کا بدل نہیں ہے مگر "بسم اللہ" میں با الف کا بدل ہو کر استعمال ہوئی ہے۔ "با" کہاں بدل ہے اور کہاں بدل نہیں بنتی ہے اس کے لئے ایک ضابطہ ذہن نشین رکھنا چاہئے۔ وہ ضابطہ یہ ہے کہ جملہ سے "با" کو حذف کر کے دیکھنا چاہئے کہ "با" کے حذف کے بعد اگر معنی صحیح ہو اور تلفظ بھی صحیح ہو جاتا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ "با" الف کا بدل نہیں ہے جیسے "اقرأ باسم ربک" میں جب ہم با کو حذف کر دیتے ہیں تو اصل عبارت "اقرا اسم ربك" باقی رہ جاتی ہے۔ جس کا معنی بھی صحیح ہے اور تلفظ بھی صحیح ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر حذف کے بعد معنی صحیح نہ ہو سکے اور تلفظ بھی دشوار ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ "با" الف کا بدل ہے۔ جیسے "بسم اللہ" میں اگر ہم "با" کو حذف کر دیتے ہیں تو سمَ اللہ، باقی رہ جاتا ہے نہ اس کا معنی درست ہے اور نہ ہی ابتدا بسکون کے سبب اس کا پڑھنا ممکن ہے۔

مسئلہ سوم: اسم جلالت "اللہ" میں بھی دو لام ہے اور الذی میں بھی دو لام ہے مگر جب اللہ کو لکھتے ہیں تو دونوں لام کا اظہار کر کے لکھتے ہیں اور الذی میں صرف ایک لام ہی پر اکتفا کرتے ہیں جب کہ دونوں کلمے تلفظ کے اعتبار سے زبان پر جاری ہونے اور لزوم تعریف کے اعتبار سے برابر ہیں۔ یاد رہے کہ دونوں میں کئی اعتبار سے فرق ہے اول وجہ یہ ہے کہ نظم اللہ اسم معرب ہے اسم معرب کی طرح اس میں عمل تصرف جاری ہوتا ہے اس لئے اس کی کتابت کو اصل کے مطابق باقی رکھی گئی اس کے برعکس تمہارا قول "الذی" مبنی ہے اور وہ ناقص ہے چنانچہ وہ بغیر اپنے صلہ کے کسی معنی کا فائدہ نہیں دیتا غرض کہ الذی کی حیثیت جزو کلمہ کی ہے اور یہ معلوم کہ جزء کلمہ مبنی ہے اسی وجہ سے "الذی" کے لکھنے میں نقصان داخل کر دیا بایں طور کہ ایک لام کی کمی کر دی۔ مگر جب "اللذان" تثنیہ لکھا جاتا ہے تو دونوں لام ذکر کرتے ہیں اس لئے کہ تثنیہ نے اس کو مشابہت حروف سے باہر نکال دیا چونکہ حرف تثنیہ نہیں ہوتا۔ وجہ دوم یہ ہے کہ اگر اللہ کو ایک لام سے لکھا جائے تو لفظ الہ سے التباس پیدا ہو جائے گا اور الذی میں اس طرح کا کوئی التباس نہیں ہے۔

مسئلہ چہارم: اسم جلالت نظم "اللہ" کا ذکر کرتے وقت جس طرح اس کا تلفظ تفخیم کے ساتھ اور پُر کر کے پڑھا جاتا ہے اسی طرح واجب ہے کہ لفظ اللہ کو لکھتے وقت اس کے خط کو تفخیم کے ساتھ لکھا جائے تا کہ نقوش کے اعتبار سے بھی اس کی عظمت کا اظہار ہو مگر الذی لکھنے میں تفخیم ضروری نہیں ہے چونکہ اس کا معنی تفخیم کے ساتھ ادا نہیں کیا جاتا لفظ "اللہ" میں ھاء سے پہلی والی الف کو عربی خط میں لکھنا، اہل عرب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے چونکہ جو حروف صورتاً مشابہ ہوتے ہیں

ان حروف کا کتابت میں اجتماع فن خطاطی میں ناپسندیدہ ہے جس طرح بوقت قراءت حروف متماثلہ کا اجتماع قرا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ بوقت کتابت ''الرحمن'' میں نون سے پیشتر الف کا حذف بطور تخفیف جائز ہے تاہم الف کے ساتھ لکھنا بہرحال مستحسن ہے مگر الرحیم کی ی کا حذف کسی طرح جائز نہیں چونکہ کلمہ رحمن سے الف کا حذف کلمہ میں کوئی خلل نہیں ڈالتا نہ ہی کسی سے التباس پیدا ہوتا ہے مگر رحیم سے یا کا حذف جہاں کلمہ میں خلل پیدا کرتا ہے وہیں ایک نامناسب لفظ رِحم سے التباس بھی ہوجاتا ہے۔

مسئلہ پنجم: علمائے مفسرین نے کہا ہے کہ ''لفظ اللہ اصل میں الالہ ہے اور الالہ میں چھ حروف ہیں جب الالہ کو لفظ اللہ سے بدلا تو صرف چار حروف رہ جاتے ہیں، ہمزہ، دو لام، اور ھاء، ہمزہ کا مخرج اقصی حلق، یعنی حلق کا آخری حصہ ہے۔ لام کا مخرج طرف لسان (زبان کا کنارہ) ہے اور ھاء کا مخرج بھی اقصی حلق ہے، اس میں ایک عجیب حالت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ ان حروف کے تلفظ کا مبدأ (شروعات) آخری حلق سے ہوا ہے پھر رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے کنارۂ زبان تک پہنچتا ہے پھر کنارۂ زبان سے داخل حلق کی طرف ''**اللہ**'' کی ھا کا تلفظ کرنے کے لئے عود کیا جاتا ہے جو محل روح ہے اسی طرح بندہ اپنی ابتدائی حالت جو اس کی اجنبیت و جہالت کی حالت ہے سے آغاز کرتا ہے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے مقام عبودت میں پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ وسعت و طاقت کے آخری زینہ پر پہنچتا ہے اور عالم انوار و مکاشفات میں داخل ہوجاتا ہے تو پھر رفتہ رفتہ رجوع کرتے کرتے، توحید کے سمندر میں غرق ہو کر فنا ہوجاتا ہے۔

★★★

★★

باب سوم

مباحث اسم کے بیان میں
(مباحث اسم کی دو نوعیں ہیں)

نوع اول : اسم کے متعلق نقلی بحثیں۔

نوع دوم : اسم کے متعلق عقلی بحثیں۔

نوع اول میں چند قسم کے مسائل پر بحث کی جاتی ہے

مسئلہ اول: لغت اسم کے بیان میں۔

اس لفظ اسم کے بارے میں مشہور دو لغت ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں **ھذا اسمہٗ، و سمُّہ، قال باسم الذی فی کل سورۃ سمّہٗ۔**

اس کے علاوہ دو غیر مشہور لغت ہونے کا بھی قول کیا گیا ہے **سِم و سُمَّ**۔ امام کسائی نے کہا کہ اہل عرب "**اسم**" کو کبھی بکسر الف پڑھتے ہیں اور کبھی الف کے ضمہ کے ساتھ "**اُسم**" پڑھتے ہیں۔ پس جب الف کو چھوڑ دیں تو جو لوگ اسم کی الف کے مکسورہ ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک بغیر الف کے "**سِمٌ**" ہوگا اور جن کی لغت میں اسم کی الف مضمومہ ہے ان کے یہاں "**سُمٌ**" ہوگا۔ امام ثعلب نے کہا کہ جن کے نزدیک اسم کی اصل "**سما، یسمی**" ہے ان کے نزدیک اسم وسم صحیح ہے اور جن کے نزدیک اس کی اصل **سما یسمو** ہے انہوں نے **أسم و سم** کو درست کہا ہے۔ مبرد نے کہا کہ میں نے اہل عرب کو **اِسمہ، أسمُہٗ، وسِمُّہ، سُمُہ اور سمائ** سب کہتے ہوئے سنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ **اسم، وسم، سِمٌ، سُمٌ** کے درمیان اہل عرب کے یہاں بول چال میں کوئی اختلاف نہیں ہے چاروں طرز پر استعمال کرتے ہیں۔

مسئلہ دوم: قاضی بیضاوی نے تفسیر البیضاوی میں لفظ اسم کے بارے میں بصری اور کوفی کا مذہب ان کے دلائل اور پھر اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ عبارت یہ ہے "**و الاسم عند البصرین من الاسماء التی حذفت اعجاز ھا لکثرۃ استعمالھا و بنیت او ائلھا علی السکون فادخل علیھا مبتدأبھا ھمزۃ الوصل (الخ)**

خلاصہ یہ کہ لفظ اسم کے بارے میں بصریین اور کوفیین کا اختلاف ہے بصریین کا نظریہ ہے کہ اسم سمو سے مشتق ہے اور یہ ناقص ہے لیکن بصریین میں بھی کچھ حضرات اسم کو ناقص واوی سے اور کچھ لوگ ناقص یائی سے مانتے ہیں وجہ اختلاف یہ ہے کہ اس کا ماضی سموت واو کے ساتھ اور سمیتُ یا کے ساتھ بھی آتا ہے۔ جیسے علوت اور علیتُ ،اس میں تعلیل یہ ہوئی کہ سمو کثرت استعمال اور تعاقب حرکات کی وجہ سے خفت کا مقتضی ہے اور خفت ابتداء میں اور آخر میں ہوتی ہے لہذا آخر سے تو واو کو حذف کر دیا اور اول کو ساکن کر دیا کیونکہ اگر اول کو بھی حذف کر دیا جائے تو یک حرفی باقی رہ جائے گا اور کلمہ کے لئے کم از کم دو حرف کا ہونا ضروری ہے، اس لئے اول کو حذف نہیں کیا بلکہ ساکن کر دیا اور عرب والوں کا طریقہ ہے کہ وہ ابتداء متحرک کے ساتھ کرتے ہیں سکون کے ساتھ نہیں اس لئے شروع میں ہمزۂ وصل کو زیادہ کر دیا تو اسم ہو گیا چونکہ اہل عرب ابتداء بسکون نہیں کرتے ہیں۔ سمو سے مشتق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اسم کی جمع اسماء، جمع الجمع اسامی، تصغیر سمی اور فعل مجہول سمیت آتا ہے۔ اگر وسم سے آتا تو اس کی جمع اوسام، جمع الجمع اواسم تصغیر وسیم اور فعل مجہول وسمت آنا چاہئے۔ مگر یہ سب نہیں آتے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسم سمو سے بنا ہے وسم سے نہیں۔

اس کے برخلاف اسم، کوفیین کے نزدیک سمۃٌ سے مشتق ہے۔ جس کی اصل وسم ہے واؤ کو حذف کر کے ہمزہ وصل اس کے عوض میں لے آئے تا کہ اعلال کم ہو کہ اس صورت میں واؤ کو حذف کر کے صرف ہمزہ لانا پڑیگا مگر بصریوں کی رو سے پہلی صورت میں آخر سے واؤ کو حذف کیا جائے گا اور پھر اول کو ساکن کیا جائے گا پھر اس کے بعد ہمزہ داخل ہوگا جس میں کثرت تعلیل ہے اور قلت تعلیل اولیٰ ہے کثرت تعلیل سے لہذا وسم سے ماخوذ ماننا اولیٰ ہے۔ اس صورت میں وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ وسم کے معنی علامت کے آتے ہیں اور اسم بھی اپنے مسمیٰ کیلئے علامت ہوتا ہے۔

عقلی بحث: (مسئلہ اول) اسم و مسمیٰ کے بیان میں ہے۔ حشویہ، کرامیہ اور اشعریہ کہتے ہیں اسم مسمیٰ کا عین یعنی نام اور ذات دونوں نفس شئی ہیں، معتزلہ کا نظریہ ہے کہ اسم، مسمیٰ کا تو غیر ہوتا ہے لیکن تسمیہ کا عین ہوتا ہے۔ مذہب مختار یہ ہے کہ اسم، مسمیٰ اور تسمیہ دونوں کا غیر ہوتا ہے تینوں مذاہب کے دلائل سے پہلے یہ جاننا بطور تمہید ضروری ہے کہ اسم کیا ہے اور مسمیٰ کسے کہتے ہیں؟ تا کہ اسم اور مسمیٰ کی عینیت اور غیریت کا مفہوم واضح ہو جائے۔ اس لئے یہ ذہن نشین رہے کہ اسم سے مراد اگر وہ لفظ ہو جو اصوات مقطعہ اور حروف مؤلفہ سے مرکب ہو اور مسمی سے اس کے ذوات اور وہ حقائق واقعیہ مراد ہوں تو شک نہیں بلکہ یہ امر بدیہی ہے کہ اسم مسمیٰ کا غیر ہے۔ ہاں البتہ اگر اسم سے صوت وحرف سے مرکب لفظ نہ مراد ہو بلکہ بعینہ ذات شئی مراد ہو جیسے کہیں "**الاسم هو المسمیٰ**" جس کا معنی یہی ہوتا ہے کہ

ذات شئ نفس شئ ہوتی ہے اس تقدیر پر بھی ظاہر و بدیہی یہی ہے کہ اسم مسمیٰ کا عین ہے غرض اسم و مسمیٰ کی بحث، اختلاف لفظی کی حد سے تجاوز نہیں کرتی اس لئے اس میں بحث بیکار ہے۔

مسئلہ دوم: اسم، مسمیٰ کا غیر ہوتا ہے۔ اس پر کئی دلیلیں ہیں۔

(۱): پہلی دلیل یہ ہے کہ اسم کبھی موجود ہوتا ہے لیکن مسمیٰ معدوم ہوتا ہے جیسے کبھی بچہ کی پیدائش سے پہلے والدین نام تجویز کر لیتے ہیں یا آدمی مرجاتا ہے اور اس کا نام باقی رہتا ہے۔ پس بیشک قول "**المعدوم منفی**" کا معنی یہی ہے کہ ایسا سلب جس کا وجود نہیں چنانچہ الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ مگر ان الفاظ سے موسوم ذات و مسمیات معدوم ہوتے ہیں اسی طرح کبھی ذات موجود ہوتی ہے مگر اس کا اسم نہیں ہوتا بعد ثبوت اس کے نام کی وضع ہوتی ہے جیسے پہلے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے بعد میں اس کے والدین اس کا نام وضع کرتے ہیں اور جیسے وہ تمام حقائق جن کے لئے لوگوں نے معین اسماء مقرر کر لئے ہیں غرض ان دونوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے بغیر پایا جانا واضح اور روشن دلیل ہے کہ اسم اور مسمیٰ کے درمیان مغایرت ہوتی ہے۔

(۲): دوسری دلیل یہ کہ ایک ذات کے لئے کئی کئی نام ہوتے ہیں مثلاً ایک آدمی رمضان شریف میں جمعرات کو پیدا ہوا تو رمضان شریف کی مناسب سے اس کا نام رمضانی ہوگیا، جمعرات کی مناسبت سے اس کا نام جمعراتی پڑ گیا اور پھر عقیقہ کا نام مثلاً محمد رکھا اور پکارنے کے لئے زید نام مقرر ہوا آدمی کی ذات ایک ہی ہے مگر نام چار چار ہو گئے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کئی کئی لوگوں کے ایک ہی نام ہوتے ہیں چنانچہ ایک ایک گاؤں میں ایک نام کے کئی حضرات موجود ہیں دنیائے صحابہ میں عمرو ، عمر نام کے کئی کئی حضرات گذرے ہیں پس اس کا واضح مطلب یہی نکلتا ہے کہ اسم و مسمیٰ کے درمیان مغایرت ہوتی ہے۔

(۳): تیسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اسم کا مسمیٰ کے لئے اسم ہونا یا مسمیٰ کا کسی اسم سے موسوم ہونا از قبیل باب اضافت ہے جیسے مالکیت و مملوکیت اور یہ معلوم کہ دو مضاف میں سے ایک دوسرے کے مغائر ہوتا ہے۔

(۴): چوتھی دلیل یہ کہ اسم، ان اصوات مقطعہ کو کہتے ہیں جو مسمیات کی تعریف کے لئے وضع کی جاتی ہیں اور یہ معلوم کہ اصوات (آوازیں غیر مسلسل) اعراض ہیں اور اعراض باقی نہیں رہتے جب کہ مسمی اور ذات باقی رہتی ہے بلکہ مسمیٰ تو وہ بھی ہے جو واجب الوجود ہے۔

(۵): پانچویں دلیل یہ کہ جب ہم آگ یا برف وغیرہ کسی کا اپنی زبان سے تلفظ کرتے ہیں تو یہ الفاظ و نام

زبان پر موجود ہوتے ہیں اگر اسم مسمیٰ کا عین ہوتا تو آگ و برف کا تلفظ کے ساتھ وجود ہونا چاہئے اور تلفظ کے وقت منہ اور زبان کو جلنا یا ٹھٹھرنا چاہئے حالانکہ تلفظ کے وقت حرارت و برودت کا وجود نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی عاقل اس کا قائل ہے۔

(۶): چھٹی دلیل یہ کہ قرآن حکیم میں اللہ عز شانہ کا ارشاد ہے "وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا" اور اللہ ہی کے ہیں بہت اچھے نام تو اسے ان سے پکارو۔ (الاعراف: ۱۸۰) اور ارشاد نبوی ہے کہ بیشک اللہ عز شانہ کے لئے ننانوے اسماء ہیں پس یہاں اسماء کثیر ہیں مگر ذات واحد ہے اور وہ اللہ عز شانہ تعالیٰ ہے۔

(۷): ساتویں دلیل یہ کہ ارشاد باری تعالیٰ "بسم الله" اور ایسے ہی "تبارک اسم ربک" میں اسم اللہ اور رب کی طرف مضاف ہے اور اللہ و رب مضاف الیہ واقع ہے اور یہ معلوم کہ مضاف و مضاف الیہ میں مغایرت ہوتی ہے ورنہ "اضافة الشی الی نفسه" لازم آئے گی جو محال ہے۔

(۸): آٹھویں دلیل یہ کہ درج ذیل جملوں کے درمیان بداہتاً فرق کا ادراک ہوتا ہے چنانچہ (اسمُ اللہ، اسم الاسم، اللہ اللہ) جیسے جملوں میں ہر ذی ہوش فرق کرتا ہے پس یہ دلیل ہے کہ اسم، مسمیٰ کا غیر ہے۔

(۹): نویں دلیل یہ کہ اسماء یا ناموں کو عربی و فارسی زبانوں سے متصف کرنا معروف ہے جیسے لفظ اللہ کو ذات باری تعالیٰ کا عربی نام اور خدا کو فارسی نام کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ نام عربیت و فارسیت وغیرہا زبان سے متصف ہوسکتا ہے مگر مسمیٰ ذات باری، عربیت و فارسیت سے منزہ و پاک ہے۔

(۱۰): دسویں دلیل یہ کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا" اس آیت میں حکم ربانی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے مبارکہ سے پکارو پس اسم آلۂ دعاء ہے اور جس کو پکارا جارہا ہے وہ ذات مدعو اللہ تعالیٰ ہے اور ذات مدعو اور آلۂ دعاء کے درمیان فرق ظاہر ہے **تلک عشرة کاملة**۔

اسم کو مسمیٰ کا عین ماننے والوں کے دلائل: انہوں نے نص قرآن اور حکم شرع سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے۔

نص قرآنی: "تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ" ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ تیرے رب کا نام برکت والا ہے۔ ظاہر ہے کہ بابرکت اور بلند و بالا نام نہیں بلکہ ذات ہوتی ہے چونکہ نام تو حرف و صوت سے مرکب ملفوظ ہوتا ہے اور ذات ہی باقی ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ اسم سے مسمیٰ ہی مراد ہے۔ اسی طرح حکم شرعی ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کے بارے میں کہا۔ **زینب طالق**، زینب کو طلاق ہے اس جملہ میں زینب اسکی بیوی کا نام اور اسم ہے جس پر اس نے طلاق واقع

کیا ہے۔ اگر اسم، مسمیٰ کا غیر ہوتا تو ذات زینب پر طلاق واقع نہ ہوتی بلکہ نام زینب پر واقع ہوتی اور آپ کے بقول نام، ذات کا غیر ہے تو **زینب طالق**، والے جملہ میں ذات زینب پر نہیں بلکہ غیر پر طلاق واقع ہوتی حالانکہ یہ مزاج شرع کے خلاف ہے۔

جواب: یہ ہے کہ اسماے الٰہیہ کا تلفظ کرنا اگر چہ حرف وصوت ہے مگر وہ بھی واجب التعظیم ہے کیونکہ ہم پر واجب ہے کہ جو الفاظ ذات وصفات الٰہیہ کے تعارف کے لئے موضوع ہیں ان کے لئے بھی نقائص وعیوب اور آفات وسوء ادبی سے منزہ ہونے کا عقیدہ ایسا ہی رکھیں جیسا کہ ذات باری تعالیٰ کے لئے تمام عیوب ونقائص اور شائبہ امکانات سے منزہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اس لئے وہ اسماء گرچہ ذات کا غیر ہیں لیکن عبث نہیں ہیں بلکہ سراپا یمن وبرکات اور رحمتوں کا سرچشمہ و ذریعہ ہیں۔ چنانچہ ارشاد رب العلمین ہے "تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ" (سورہ رحمن:۷۸) اسی طرح حکم شرع جزئیہ فقہیہ جو پیش کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ "**زینب طالق**" کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جس کو اس لفظ زینب سے تعبیر کیا گیا ہے اس پر طلاق ہے اسی وجہ سے ذات زینب پر ہی طلاق واقع ہوگی غیر پر نہیں۔

مسئلہ سوم: مسمیٰ کی طرح تسمیہ بھی ہمارے نزدیک اسم کے علاوہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ذات معین کے تعارف کے لئے لفظ معین کو متعین کرنے کا نام تسمیہ ہے اور تعین کا معنی واضع کا قصد اور اس کا ارادہ ہے۔ رہا اسم تو وہ اس لفظ معین کا نام ہے جس کو ذات کے لئے مخصوص کیا ہے اور ارادہ ومراد میں فرق ظاہر ہے۔

مسئلہ چہارم: الفاظ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک الفاظ مستقلہ دوسرے الفاظ حرفیہ غیر مستقلہ، الفاظ مستقلہ وہ الفاظ کہلاتے ہیں جو اپنے معانی پر بالذات دلالت کرتے ہیں اس کے برعکس الفاظ حرفیہ غیر مستقلہ وہ الفاظ کہلاتے ہیں جو بعض لفظ کو دوسرے کے ساتھ جوڑنے اور ربط پیدا کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسماء وافعال کی وضع، حروف کی وضع پر سابق ہے کہ حروف کی حیثیت واسطہ وآلہ کی ہے۔ رہے اسماء وافعال کی وضع تو ان میں اسماء کو افعال پر سبقت اور تقدم حاصل ہے۔ اس کی چند وجہیں ہیں۔

(۱): اسم وہ لفظ کہلاتا ہے جو ماہیت پر دلالت کرے اور فعل وہ لفظ ہے جو زمان معین میں اشیاء میں سے کسی شئ کی ماہیت کے حصول پر دلالت کرے گویا اسم مفرد ہے اور فعل معنی اور زمانہ سے مرکب کا نام ہے اور مفرد، مرکب پر ذات و مرتبہ دونوں اعتبار سے سابق اور مقدم ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسم، فعل پر ذکر ولفظ دونوں اعتبار سے سابق و مقدم ہو۔

(۲): اسم کے تقدم کی دوسری وجہ یہ ہے کہ فعل کا تلفظ بغیر کسی فاعل کی طرف نسبت کئے ممکن نہیں مگر جو لفظ فاعل پر دلالت کرتا ہے اس کا تلفظ کسی فعل کی طرف نسبت کئے بغیر بھی ممکن ہے اس اعتبار سے فاعل فعل سے غنی اور بے نیاز رہتا ہے لیکن فعل ہمیشہ فاعل کا محتاج رہتا ہے پس ظاہر ہے کہ جو غنی ہے وہ محتاج پر بلحاظ رتبہ مقدم ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ ذکر میں بھی وہ مقدم ہو۔

(۳): اسم کی ترکیب اسم کے ساتھ مفید ہوتی ہے چنانچہ وہ جملہ مبتدا و خبر سے مرکب ہو کر جملہ مفیدہ اسمیہ کہلاتا ہے لیکن فعل کی ترکیب فعل کے ساتھ تو وہ بالکل مفید نہیں ہوتی جب تک کہ فعل کے ساتھ اسم نہ ہو اس سے بھی ظاہر ہے کہ باعتبار رتبہ، اسم فعل پر مقدم ہے اس لئے اس کا تقدم فعل پر وضع کے اعتبار سے بھی ہوگا۔

مسئلہ پنجم: اسم دو طرح کا ہوتا ہے ایک اسم ماہیت من حیث ھِیَ ھِیَ، دوسرا اسم مشتق، اسم ماہیت وہ اسم کہلاتا ہے جو محض شئ اور ذات پر دلالت کرے اور اسم مشتق وہ اسم ہے جو ذات مع الوصف پر دلالت کرے جیسے عالم و قادر وغیرہ۔ دونوں قسموں میں اسم ماہیت کو باعتبار رتبہ اسم مشتق پر سبقت حاصل ہے۔ کیونکہ ماہیات مفردات ہیں اور مشتقات مرکبات ہیں۔ اور مفرد کو مرکب پر تقدم حاصل ہے۔ اس کے برعکس اسماء صفاتیہ کو اسماء ذاتیہ پر بطور مرتبہ تقدم حاصل ہے کیونکہ ذات کو صفات کے واسطہ ہی سے ہم جانتے ہیں پس اسماء صفات کی حیثیت معرف الشئ کی ہوئی اور معرف الشئ شئ پر مقدم ہوتا ہے پس جو معرفت میں سابق ہے اسکو ذکر میں بھی سابق ہونا چاہئے۔

مسئلہ ششم: مسمیات اور ذوات پر جو اسماء واقع ہوتے ہیں وہ نو طرح کے ہوتے ہیں۔

اول: وہ اسم جو واقع ہو ذات پر، اس کی بہت مثالیں ہیں جیسے لفظ زید و لفظ بکر وغیرہ کا اطلاق اس کی ذات پر۔

دوم: وہ اسم جو واقع ہو شئ پر اس شئ کی ذات کے اجزاء میں سے کسی جز کے اعتبار سے جیسے ہم دیوار کو کہیں کہ وہ جسم اور جوہر ہے اور جیسے ہم چینی، پانی، دودھ اور چائے پتی کے مجموعہ کو چائے کہتے ہیں تو ان کے مجموعہ کو چائے کا نام دینا اس کے ایک جز کے اعتبار سے ہے۔

سوم: وہ اسم جو واقع ہو شئ پر ذات کے ساتھ صفت حقیقیہ کے اعتبار سے جیسے ہم کسی کالی شی کو اسود اور سفید چیز کو ابیض کہتے ہیں۔ اور گرم شئ کو حار اور ٹھنڈی چیز کو بارد کہہ دیتے ہیں کہ یہ سواد و بیاض اور حرارت و برودت اس شئ کی صفت حقیقیہ ہیں جو ذات کے ساتھ ہیں ذات کے علاوہ کسی دوسری اشیاء خارجیہ سے وہ متعلق نہیں ہوتے۔

چہارم: وہ اسم جو واقع ہو شئ پر اس کے صرف صفت اضافیہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے جیسے ہم کسی شئ کے

بارے میں کہتے ہیں کہ وہ شئ معلوم ہے۔ وہ چیز مفہوم ہے وہ مذکور ہے وہ مالک ہے اور وہ مملوک ہے وغیرہ۔

پنجم: وہ اسم جو واقع ہو شئ پر اس کی حالت سلبیہ کے اعتبار سے جیسے ہم کہیں کہ وہ اندھا ہے وہ فقیر ہے وغیرہ۔

ششم: وہ اسم جو واقع ہو شئ پر اس کی صفت حقیقیہ کے اعتبار سے صفت اضافیہ کے ساتھ ساتھ جیسے ہم کہیں شئ کو کہ وہ عالم ہے۔ قادر ہے چونکہ علم جمہور کے نزدیک ایسی صفت حقیقیہ ہے جس کی اضافت معلومات کی طرف ہوتی ہے اسی طرح قدرت بھی ایسی صفت ہے جس کی اضافت مقدورات کی طرف ہوتی ہے۔

ہفتم: وہ اسم جو واقع ہو شئ پر اس کی ایسی صفت حقیقیہ کے لحاظ سے جس میں اس کی صفت سلبیہ بھی ملحوظ ہو جیسے ہم کہیں وہ قادر ہے کسی شئ سے عاجز نہیں ہے۔ وہ عالم ہے کسی شئ سے جاہل نہیں ہے۔

ہشتم: وہ اسم جو واقع ہو شئ پر اس کی ایسی صفت اضافیہ کے اعتبار سے جس میں صفت سلبیہ بھی ملحوظ ہو جیسے لفظ اول کہ اول کہتے ہیں اس دو چیزوں کے مجموعہ کو جس میں کا ایک دوسرے سے سابق ہے پس اس میں اول اضافیہ ہے اور دوسرا سلبیہ ہے وہ یہ ہے کہ اس پر اس کا غیر سابق نہیں ہے۔ اس کی دوسری مثال ''قیوم'' ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جو بذات خود قائم ہو اور غیر کو قائم رکھنے والا ہو پس اس کے قائم بذاتہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے قیام میں غیر کا محتاج نہیں ہے اور غیر کو قائم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ غیر اپنے قیام میں اس کا محتاج ہے۔ اول سلب ہے اور ثانی اضافت ہے۔

نہم: وہ اسم ہے جو واقع ہو شئ پر اس کی صفت حقیقیہ، اضافیہ اور سلبیہ تینوں کے مجموعے کے اعتبار سے اسم کی تقسیم کے بیان میں بس یہی مندرجہ بالا قسموں کا بیان ہوتا ہے اب خواہ وہ اسم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہو یا اس کے علاوہ اس کے محدثات میں سے کسی کا ہو چونکہ اس کے علاوہ اور کوئی اسم کی قسم کا وجود معلوم و متحقق نہیں ہے۔

مسئلہ ہفتم: اس بیان میں ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی ذات مخصوصہ کے اعتبار سے کوئی اسم ہے یا نہیں۔ اس بحث کو سمجھنے کے لئے مباحث الہیہ کے متعلق بطور تمہید چند مقدمات پیش ہیں۔

مقدمہ اولیٰ: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا غیر ہے اپنی ذات مخصوصہ کے اعتبار سے نہ کہ صفت کے لحاظ سے اس کی دلیل یہ ہے کہ بیشک اس کی ذات **من حیث ھی ھی** قطع نظر اس کی تمام صفات کے اگر مخلوقات کے مخالف ہے تو یہی ہمارا مقصود ہے اور اگر اس کی ذات تمام ذوات کے مساوی ہو جائے تو اب ضروری ہے کہ اس کی ذات، دیگر تمام اشیاء کی ذوات کے ایک صفت زائدہ سے مخالف ہوگی۔ پس اس کی ذات کا اس صفت زائدہ کے ساتھ مختص ہونا اگر کسی امر

کے بغیر ہوا ہے تو اس وقت جائز کا رجحان بغیر کسی مرجح کے لازم آئے گا اور اگر اس کی ذات کا اختصاص اس صفت زائدہ کے ساتھ کسی امر آخر کی وجہ سے ہو تو کلام امر آخر میں جاری ہوگا کہ وہ امر آخر کیا ہے ذات کا مساوی ہے یا مخالف، مساوی ہے تو دور اور مخالف ہے تو تسلسل لازم آئے گا یہ دونوں محال ہیں۔

مقدمہ ثانیہ: اللہ تعالیٰ جسم و جوہر نہیں ہے کیونکہ جسمیت و جوہریت کا سلب مفہوم سلبی ہے۔ اور اس کی ذات مخصوصہ امر واقعی وجودی واجبی ہے اور سلب و ثبوت کے درمیان فرق واضح ہے نیز اس کی ذات مخصوصہ، نفس قادریت و عالمیت سے عبارت نہیں ہے چونکہ قادریت و عالمیت کا مفہوم، مفہوم اضافی رکھتا ہے اور اس کی ذات ذات قائم بنفسہا ہے اور معبود قائم بالذات کے درمیان اور اعتبارات نسبیہ و اضافیہ کے درمیان فرق واضح ہے۔

متکلمین کے نزدیک جسم و جوہر نہ ہونے کی دلیل بہت مشہور ہے کہ جسم متکلمین و فلاسفہ دونوں کے نزدیک مرکب کا نام ہے اور ترکیب میں احتیاج ہے اور احتیاج ملازم امکان ہے جو واجب لذاتہ کے منافی ہے نیز ترکیب بھی واحد حقیقی کے خلاف ہے اس لئے وہ جسم نہیں ہوسکتا اسی طرح جوہر بھی نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جوہر "جزء الذی لایتجزی" کا نام ہے اور یہ متحیز اور جزو جسم ہوتا ہے اور اللہ ان دونوں سے پاک ہے البتہ فرق ضالہ مضلہ میں نصاریٰ اور مجسمہ باری تعالیٰ کی جسمیت اور جوہریت کے قائل ہیں چنانچہ مجسمہ کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ تمام اجسام کی طرح ایک جسم ہے جو سریر عرش پر جلوہ فگن ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں وہ ایسا جوہر ہے جو اجزاء ثلٰثہ، رب، ابن، روح القدس کی طرف منقسم ہے معاذ اللہ من ھفوات تخرج من افواھھم۔

مقدمہ ثالثہ: اس کی ذات مخصوصہ کے عدم معرفت کے بیان میں، یاد رہے کہ کئی وجوہ سے بندوں کو اس کی ذات مخصوصہ کی معرفت نہیں ہوسکتی۔

(۱): ہم جب اپنے عقول و وجدانیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معرفت ذات باری تعالیٰ کے تعلق سے چار امور میں سے کوئی ایک امر عقلوں میں پاتے ہیں۔ ایک اس کے موجود ہونے کا علم۔ دوسرا اس کے وجود کے دوام کا علم، تیسرا اس کے صفات جلال کا علم، یہ اعتبارات سلبیہ کہے جاتے ہیں اور چوتھا اس کے صفات اکرام کا علم جس کو اعتبارات اضافیہ کہتے ہیں جب کہ تحقیق سے ثابت ہے کہ اس کی ذات مخصوصہ مذکورہ چاروں اعتبارات میں سے ہر ایک کے مغائر ہے چنانچہ ثابت ہے کہ اس کی حقیقت اس کے وجود کا غیر ہے اور جب حقیقت وجود کا غیر ہوئی تو دوام وجود کا بھی غیر ہوگی نیز یہ بھی ثابت شدہ امر ہے کہ اس کی حقیقت غیر سلبی و غیر اضافی ہے۔ پس اگر مخلوق کو حقیقت الٰہیہ کا ادراک ہوتا تو اس کے لئے یہی چاروں

ذرائع ہو سکتے تھے مگر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ چاروں ذرائع حقیقت کے مغائر ہیں تو ثابت ہو گیا کہ بشر کو اس کی حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا۔

(۲): دلیل استقراء تام سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کسی امر کے تصور کے لئے صرف اور صرف چار طریقے ہیں

اول: وہ اشیاء جس کا ہم حواس پنجگانہ میں سے کسی ایک سے ادراک کرتے ہیں۔

دوم: وہ احوال جس کا ہم اپنے ابدان کے احوال سے ادراک کرتے ہیں جیسے الم، لذت، جوع، عطش اور فرح وغم وغیرہ۔

سوم: وہ احوال جن کا ہم اپنی عقلوں سے ادارک کرتے ہیں جیسے وجود، عدم، وحدت و کثرت اور وجوب وامکان کی حقیقت کا علم۔

چھارم: وہ احوال جس کا عقل وخیال ادراک کرتا ہے مذکورہ تینوں احوال سے غرض یہی وہ اشیاء ہیں جنکا ہم من حیث ھی ھی تصور وادراک کر سکتے ہیں۔ اور اللہ سبحانہ کی ذات ان مذکورہ اشیاء کے مغائر ہے تو ثابت ہو گیا کہ حقیقت الہیہ ادراک بشر سے خارج ہے۔

مقدمہ رابعہ: اس کے بیان میں کہ جب اسکا ادراک بشر کے لئے غیر ممکن ہے تو کیا اس کا تعقل کسی کو کسی طرح ممکن ہے یا نہیں۔ اس کا بیان یہ ہے کہ یہ بحثیں نہایت ہی دشوار ہیں اس بحثوں کے شافی وکافی فہم کے لئے عقل قاصر اور عاجز ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ مخلوقات کی عقلیں اور علم وعرفان متناہی ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ غیر متناہی ہے اور متناہی کا غیر متناہی تک وصول محال ہے۔ نیز تمام اشیاء میں اعظم اللہ سبحانہ تعالیٰ ہے اس طرح اس کا علم بھی تمام علوم سے اعظم ہے اور اعظم اشیاء کا علم، اعظم علوم سے ممکن ہے اس طرح اللہ سبحانہ تعالیٰ کی کامل معرفت خود اللہ سبحانہ تعالیٰ کو ہی ہے۔

مقدمہ خامسہ: اشیاء کی معرفت کی قسموں کے بیان میں۔ معرفت دو طرح کی ہوتی ہے (معرفت عرضیہ و معرفت ذاتیہ) **معرفت عرضیہ:** اعراض کے توسط سے شئ کا علم ہونا جیسے جب ہم نے دیکھا کسی عمارت کو تو اس سے جان لیا کہ اس کا کوئی بانی ہے مگر اس بانی کی حقیقت و ماہیت کا علم، تو اس عمارت سے کسی طرح بھی اس کی حقیقت کا پتہ لگانا ممکن نہیں۔

معرفت ذاتیہ: نفس شئ کے علم کو کہتے ہیں جیسے کہ ہم کسی خاص رنگ کو اپنی نگاہ سے دیکھ کر پہچان لیتے ہیں یا ہم

حرارت کو لمس سے اور صوت و آواز کو سماعت سے پہچان لیتے ہیں تو گویا ہم اس کی حقیقت ہی سے آگاہ ہوتے ہیں کیونکہ حرارت و برودت کی حقیقت ہی یہی کیفیت ممسوسہ ہے اور اسی طرح سواد و بیاض رنگ کی حقیقت ہی یہ کیفیت مرئیہ ہے۔

معرفت ذاتیہ و عرضیہ کی تعریف و مثال جان لینے سے اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہو جاتا ہے کہ اللہ عز شانہ کی معرفت عرضیہ ممکن ہے کہ ساری کائنات و مخلوقات ایک خالق و محدث کی طرف محتاج ہے پس جیسے ہم نے مکان سے عرضی طور پر بانی مکان کو سمجھا اسی طرح عالم و محدثات سے ہم صانع عالم اور خالق کائنات اور محدث امور کو سمجھ سکتے ہیں۔

مسئلہ ہشتم: اللہ سبحانہ تعالیٰ کے لئے ذات مخصوصہ کے اعتبار سے کسی خاص اسم کے بیان میں ہے متقدمین فلاسفہ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کی حقیقت خاصہ کے اعتبار سے کوئی اسم پاک مذکور نہیں ہے وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ نام کے وضع سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذکر سے مسمی و ذات کی طرف اشارہ کیا جا سکے پس اگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی ذات مخصوصہ کے اعتبار سے کوئی نام ہو تو اس اسم سے مقصود یہی ہوگا کہ اس نام کے ذریعہ مسمی کو یعنی ذات الٰہیہ کو جانے جب کہ یہ ثابت ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اس کی ذات مخصوصہ کو نہیں جان سکتا ہے۔ ورنہ پھر ان اسماء کے وضع سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے یہ لازماً تسلیم کرنا ہوگا کہ ایسے اسماء موجود نہیں ہیں۔ البتہ اس کی معرفت کے لوازم موجود ہیں وہ یہ کہ وہ ازلی قدیم اور واجب الوجود ہے جو عدم کو قبول نہیں کر سکتا نظریہ فلاسفہ کے برعکس بعض اہل علم کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ اپنے بعض مقرب بندہ کو یہ سعادت ارزانی فرما دے کہ ان کو اپنی ذات مخصوصہ کی معرفت کرا دے چنانچہ قرآن حکیم میں ہے "لاتدرکہ الابصار"۔ مگر اس کے باوجود اس ذات باری تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم جناب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج عطا فرما کر اپنے دیدار پر انوار سے مشرف فرمایا اگر وہ اپنے حبیب مکرم کو اپنی حقیقت کی معرفت کا علم دے دے تو بعید نہیں لہذا اس لحاظ سے حقیقت مخصوصہ کے لئے اسم کی وضع محال و ممتنع نہ ہوگی۔

مسئلہ نہم: ذات باری تعالیٰ کی حقیقت مخصوصہ کے لئے جب اسم کی وضع ممکن ہے تو اسکا اسم تمام اسماء سے اعظم ہوگا اور اسم پاک کا ذکر بھی تمام اذکار سے افضل و اشرف ہوگا چونکہ علم کی عظمت کا ظہور، معلوم سے اور ذکر کی فضیلت کا ظہور مذکور سے وابستہ ہے معلوم سب سے معظم ہے تو اس کا علم بھی سب سے باعظمت ہوگا اور مذکور سب سے افضل ہے تو اس کا ذکر بھی تمام اذکار سے افضل ہوگا پس جب اللہ تعالیٰ کی ذات تمام معلومات و مذکورات میں اشرف و اعظم ہے تو اس کا علم بھی تمام علوم سے اشرف اور اس کا ذکر بھی تمام اذکار سے افضل ہوگا۔ لہٰذا وہ اسم شریف تمام اسماء

میں اشرف ہوگا چنانچہ یہی مراد ہے اس کلام سے جو صوفیہ اور بزرگان دین کی زبانوں پر رائج ہے کہ وہ اللہ کا اسم اعظم ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسم اعظم پر جس ملک مقرب یا نبی مرسل کو اطلاع ہو جائے اور اس کے معنی کی تجلی کا فیضان ان پر ہو جائے تو عالم جسمانیت و عالم روحانیت کا ذرہ ذرہ اس کا فرماں بردار ہو جاتا ہے۔

مسئلہ دھم: (اسم اعظم کے بیان میں) اسم اعظم شریف جو برکات الہیہ کا گنجینہ اور رحمتوں کا سرچشمہ ہے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

پہلا قول:۔ بعض علما کا قول یہ ہے کہ اسم اعظم ارشاد باری تعالیٰ "ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ" ہے۔ (الرحمن ۲۷) اور حدیث شریف میں وارد ہے "ألظوا بیاذا الجلال و الاکرام" اس پر امام رازی نے کہا کہ یہ قول میرے نزدیک ضعیف ہے اس لئے کہ جلال سے اشارہ ہے صفات سلبیہ کی طرف اور اکرام سے صفات اضافیہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ اس کی حقیقت مخصوصہ، سلوب و اضافات کے مغائر ہے۔

دوسرا قول:۔ یہ ہے کہ اسم اعظم وہ "الحی القیوم" ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب سے بڑی باعظمت آیت کونسی ہے ابی بن کعب کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ و رسول جانیں، پھر فرمایا اے ابا المنذر کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس کتاب اللہ کی کونسی شاندار آیت ہے کہتے ہیں میں نے عرض کیا "اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم" تو آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور ارشاد فرمایا "لیھنک العلم أبا المنذر" اے ابا المنذر تمہیں علم مبارک ہو امام رازی کے نزدیک یہ قول بھی ضعیف ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "الحی ھو الدراک الفعال" یعنی حی وہ بہت جاننے والے کرنے والے کا نام ہے اس اسم شریف میں کثرت عظمت کا اظہار نہیں کہ وہ صفت ہے اور قیوم قیام میں مبالغہ ہے اس کا معنی 'قائم بنفسہ و مقوم الغیرہ" ہے یعنی جو خود قائم ہو اور دوسرے کو قائم کرنے والا ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے بھی یہ دونوں اسم مبارک، اسم اعظم نہیں ہو سکتے کیونکہ قائم بنفسہ ہونا مفہوم سلبی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ غیر سے بے نیاز ہے اور مقوم لغیرہ صفت اضافیہ ہے غرض لفظ قیوم سلب و اضافت کے مجموعہ پر دلالت کرتا ہے۔

تیسرا قول:۔ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسمائے پاک سب مقدس باعظمت ہیں اس لئے ان اسماء میں سے کسی ایک کو اعظم کہنا اور باقی اسمائے مبارکہ کو عظیم کہنا نقصان کا متقاضی ہے جب کہ اللہ عز شانہ کی ذات، وصفات و اسماء سب نقص سے منزہ ہیں۔ یہ قول بظاہر بہت خوب ہے مگر تفسیر رازی نے اس کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسماء

کی نوقسمیں ہوتی ہیں (جس کی تفصیل ہم نے ابھی سابق میں بیان کردی ہے) اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ جو اسم ذات مخصوصہ پر دلالت کرے اس اسم کا تمام اسماء سے افضل واشرف ہونا واجب ہے۔اس لئے کسی اسم کا اعظم ہونا اور بقیہ اسماء کا مقدس وعظیم ہونا علامت نقص نہیں۔

چوتھا قول:۔ یہ ہے کہ اسم اعظم وہ لفظ ''اللہ'' ہے چنانچہ اس پر دلیل قائم ہوگی انشاء اللہ کہ یہ اسم پاک، حق سبحانہ تعالیٰ کے حق میں اسم اعظم کے قائم مقام ہے۔جو اسم علم ہوگا وہ اس کی ذات مخصوصہ پر دلالت کرے گا۔

اسم اعظم وکلمات اجابت میں اعلیٰ حضرت اوران کے والد کے ارشادات

اعلیٰحضرت امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کے والد محترم حضرت رئیس المتکلمین مولانا نقی علی خاں علیہ الرحمۃ والرضوان نے اپنی تصنیف احسن الوعاء لآداب الدعاء، میں فصل پنجم کے تحت اسم اعظم وکلمات اجابت کے سلسلہ میں نو بشارتیں ذکر کی ہے اس پر اعلیٰحضرت علیہ الرحمۃ والرضوان نے گیارہ بشارتوں کا اضافہ فرمایا ہے۔ہم ذیل میں اسے پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں تاکہ قارئین اسم اعظم کے مزید حسنات وبرکات سے منتفع ہوسکیں۔

قال الرضا: یہاں بیش بشارتیں ہیں نو حضرت مصنف علام قدس سرہٗ نے ذکر فرمائیں اور گیارہ فقیر سگ کوئے قادری غفر اللہ تعالیٰ نے بڑھائیں

بشارت (۱): حدیث میں آیۃ کریمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کی نسبت فرمایا ۔یہ اسمِ اعظم ہے جو اس کے ساتھ دعاء کرے۔قبول ہو علماء فرماتے ہیں آیۃ کریمہ قبول دعا خصوصاً دفع بلا میں اثر تمام رکھتی ہے۔

قال الرضا:۔سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے۔رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم نہ بتادوں کہ جب وہ اس سے پکارا جائے اجابت کرے اور جب اس سے سوال کیا جائے عطا فرمائے۔ وہ وہ دعاء ہے جو یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تین تاریخوں میں کی تھی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کسی نے عرض کی یارسول اللہ! یہ خاص یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے تھا۔یا سب مسلمانوں کے لئے ہے فرمایا مگر تو نے خدا تعالیٰ کا ارشاد نہ سنا کہ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ۔یعنی پس ہم نے یونس کی دعاء قبول فرمائی اور اسے غم سے نجات دی۔اور یوں ہی نجات دیں گے ایمان والوں کو۔رواہ احمد والترمذی والنسائی والحاکم مطولا واللفظ لہ والبیھقی والضیاء فی المختارۃ۔

بشارت(۲): سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کہتے سنا اللھم انی اسئلک بانی اشھد انک انت اللہ لا الہ الا انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد ارشاد فرمایا قسم خدا کی تو نے اللہ تعالیٰ سے وہ اسم اعظم لے کر سوال کیا کہ جب اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اور جب اس سے دعاء کی جاتی ہے قبول فرماتا ہے۔

قال الرضا: ۔ رواہ احمد وابن ابی شیبۃ وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم ۔ امام ابوالحسن علی مقدسی وامام عبدالعظیم منذری وامام بن حجر عسقلانی وغیرہم ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس حدیث کی اسناد میں کوئی طعن نہیں اور در بارہ اسم اعظم یہ سب احادیث سے جید وصحیح تر ہے۔

بشارت(۳): ایک حدیث میں آیا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۔ اور الٓمّٓ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۬ؕ

قال الرضا: رواہ ابن ابی شیبۃ وابو داؤد والترمذی وابن ماجۃ عن اسماء بنت یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہا

بشارت(۴): بعض علما، بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، يَاذَا الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۔ کو اسم اعظم کہتے ہیں۔

قال الرضا: ۔ سری بن یحیٰ قدس سرہٗ بعض اولیاء سے راوی میں دعاء کرتا تھا اللہ تعالیٰ سے کہ مجھے اسم اعظم دکھادے مجھے آسمان میں ایک ستارہ نظر پڑا جس پر لکھا تھا يَابَدِيْعَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ،يَاذَا الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ

بشارت(۵): بعض علما نے، یا اللہُ ، یا رحمنُ ، یا رحیمُ کو اسم اعظم کہا۔

بشارت(۶): حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زید بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یوں دعا کرتے سنا "اللھم انی اسئلک بان لک الحمد لا الہ الا انت وحدک لاشریک لک یا حنان یا منان یا بدیع السموت والارض یاذاالجلال والاکرام یاحی یاقیوم "فرمایا۔ یہ اللہ کا وہ اسم اعظم ہے کہ جب اس سے پکارا جائے اجابت کرے اور جب مانگا جائے عطا فرمائے اخرجہ احمد وابن ابی شیبۃ والاربعۃ وابن حبان والحاکم عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

بشارت(۷): حدیث میں ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یوں دعاء کی " اللھم انی ادعوک اللہ

وادعوک الرحمن وادعوک البر الرحیم وادعوک باسمائک الحسنی کلها ما غلمتُ منها ومالم اعلم ان تغفرلی وترحمنی نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ان میں اسم اعظم ہے۔رواہ ابن ماجۃ

بشارت(۸): ابودرداء وابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں اسم اعظم رب رب ہے رواہ الحاکم حدیث میں آیا نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب بندہ یارب یارب کہتا ہے رب عزوجل فرماتا ہے لبیک اے میرے بندے مانگ کہ تجھے دیا جائے۔رواہ ابن ابی الدنیا عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

بشارت(۹): حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ اسم اعظم ،اَللّٰہُ ،اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ہے۔

بشارت(۱۰): ابوامامہ باہلی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد قاسم بن عبدالرحمن شامی کہتے ہیں اسم اعظم ، "اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" ہے۔

بشارت(۱۱): امام قاضی عیاض نے بعض علماء سے نقل فرمایا اسم اعظم "کلمہ توحید" ہے۔

بشارت(۱۲): امام فخرالدین رازی وبعض صوفیائے کرام نے کلمہ "ھو" کو اسم اعظم بتایا۔

بشارت(۱۳): جمہور علما فرماتے ہیں کہ اللہ اسم اعظم ہے کذا اعزاہ الیھم القاری۔حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔شرط یہ ہے کہ تو اللہ کہے اور اس وقت تیرے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہ ہو۔

بشارت(۱۴): بعض علما نے بِسْمِ اللّٰہِ شریف کو اسم اعظم کہا۔حضور غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول کہ بِسْمِ اللّٰہِ،زبان عارف سے ایسی ہے جیسے "کُنْ" کلام خالق سے۔

بشارت(۱۵): رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں جوان پانچ کلموں سے ندا کرے اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگے اللہ عزوجل عطا فرمائے۔ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شی قدیر، لا الہ الا اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

بشارت(۱۶): اوپر گذرا کہ جو شخص یَا اَرْحَمَ الرَّاحمین، تین بار کہے فرشتہ کہتا ہے مانگ کہ ارحم الراحمین نے تیری طرف توجہ فرمائی۔

بشارت(۱۷): پانچ بار "یَا رَبَّنَا" کہنے کا فضل امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے گذرا۔

بشارت(۱۸): یہی خاصیت اسمائے حسنیٰ کی ہے قال الرضا۔

بشارت(۱۹): نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص کو "یا ذاالجلال والاکرام" کہتے سنا فرمایا مانگ کہ تیری دعاء قبول ہوئی۔

بشارت(۲۰): ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں ہے حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جبرائیل میرے پاس کچھ دعائیں لائے اور عرض کی جب حضور کو کوئی حاجت پیش آئے انہیں پڑھ کر دعا مانگئے۔ "یَا بَدِیْعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَا ذَاالجلالِ وَالاِکْرَام، یَا صریخَ المستَصرِخِین، یَا غیَاثَ المستَغِیثِین، یَا کَاشِفَ السُّوْءِ یَا اَرْحَمَ الرَّاحمین، یَا مجیبَ دَعْوۃِ المُضْطَرِّینَ، یَا اِلٰہَ العٰلَمِین بِکَ اُنْزِلَ حَاجَتِی وَاَنْتَ اَعْلَمُ بِھَا فَاقْضِھَا۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا
ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست — ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کو تاہ نیست

مسئلہ یازدھم: مسمیٰ پر اسم کی دلالت کے بیان میں۔ واضح رہے کہ مسمی پر اسم کی دلالت کئی طرح ہوتی ہے اسم کی دلالت مسمیٰ پر ماہیت مسمیٰ کے اعتبار سے، اسم کی دلالت مسمیٰ پر ماہیت مسمیٰ کے جز کے اعتبار سے، اور اسم کی دلالت مسمیٰ پر اس کے لوازم کے اعتبار سے، تینوں قسموں کی مثالیں کتب منطق میں موجود ہیں یہاں اتنا سمجھنا چاہئے کہ وہ اسم جو مسمیٰ پر ماہیت مسمیٰ کے جز کے اعتبار سے دلالت کرے ایسی دلالت ذات باری تعالیٰ کی شان میں محال ہے۔ چونکہ یہ دلالت اس چیز میں متصور ہوسکتی ہے جس کی ماہیت چند اجزاء سے مرکب ہوتی ہے اور باری کے لئے اجزاء اور ترکیب محال ہے کیونکہ ہر مرکب اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور اجزاء مرکب کا غیر ہوتا ہے پس ہر مرکب غیر کا محتاج ہوا اور جو محتاج ہوگا وہ ممکن لذاتہ ہوگا لہذا جو ذات ممکن لذاتہ نہ ہو بلکہ واجب بالذات ہو اس کا مرکب ہونا محال ہے اس لئے جزء ماہیت کے اعتبار سے ذات پر اس اسم کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆

☆☆

باب چھارم

صفات حقیقیہ پر دلالت کرنے والے اسمائے مبارکہ
(یہ بحث تین قسموں پر مشتمل ہے)

قسم اول: ان اسمائے مبارکہ کے بیان میں ہے جو وجود پر دلالت کرتے ہیں۔اس میں چند مسائل مذکور ہیں

مسئلہ اول: اکثر اہل حق علمائے مفسرین کا اتفاق ہے کہ ''الشئ'' کے اسم سے تسمیہ باری تعالیٰ جائز ہے۔البتہ جہم بن صفوان بانی فرقہ جہمیہ سے منقول ہے کہ یہ تسمیہ جائز نہیں ہے ذیل میں جمہور علماء کی دلیلیں ذکر کی جاتی ہیں۔

دلیل اول: قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے 'قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ' (الانعام ۱۹) چنانچہ آیت متلوہ میں واضح دلیل ہے کہ تسمیہ باری تعالیٰ، اسم شئ سے جائز ہے۔البتہ یہاں یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ تمہاری ذکر کردہ آیت میں اگر ''قُلِ اللّٰهُ'' پر وقف ہوتا ہوتو تسمیہ شئ کے اطلاق کا جواز ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں بلکہ ''قُلِ اللّٰهُ'' کے بعد متصلا مذکور ہے ''شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ''یعنی پورا کلام ''قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ''مذکور ہے مستقل عبارت ہے جس کا ماقبل سے کوئی تعلق نہیں پس اس سے لازم وثابت نہیں کہ شئ سے تسمیہ الٰہی جائز ہو۔

جواب: جواب یہ ہے کہ جب ارشاد ہوا ''اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً'' پھر ارشاد ہوا ''قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ، یہ جملہ جواب کے قائم مقام ہے چنانچہ پہلے بذریعہ اَیُّ استفسار ہوا بعدہ خود باری تعالیٰ نے ''قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ'' سے اس کا جواب مرحمت فرمایا اس لئے لازماً تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ جملہ مستقلہ نہیں ہے بلکہ اپنے ماسبق سے متعلق ہے لہٰذا تسمیہ شئ سے جائز ہوگا۔

دلیل دوم: قرآن حکیم میں دوسری جگہ ارشاد ہے '' كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص ۸۸) آیت مبارکہ میں وجہ سے ذات مراد ہے اگر اس کی ذات پر شئ کا اطلاق درست نہ ہوتا تو وجہ کا استثنا كُلُّ شَیْءٍ سے درست ہی نہ ہوگا۔

دلیل سوم: عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی خبر میں ہے۔''کان اللہ ولم یکن شیء غیرہ'' اس حدیث سے ثابت کہ اسم شئ، سے تسمیہ جائز ہے۔

دلیل چھارم: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "مامن شیء اغیر من اللہ عز و جل"۔

دلیل پنجم: شئ نام ہے اس چیز کا جس کو جانا جائے اور اس کے بارے میں خبر دی جائے اس مفہوم کا شئ پر اطلاق ذات باری تعالیٰ پر اطلاق کے منافی نہیں ہے اس لئے شئ سے تسمیہ جائز ہے۔

اب ذیل میں جہم بن صفوان کی دلیلیں مذکور ہیں جس کا نظریہ ہے کہ رب تعالیٰ پر شئ کا اطلاق درست نہیں ہے۔

دلیل اول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" (الرعد ۲۵) اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے "وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر" (المائدۃ ۱۲۰) متلوہ دونوں آیتوں میں بہت ظاہر ہے کہ کل شئ باری تعالیٰ کی مخلوق اور اس کا مقدور ہے اور یہ قطعی ویقینی کہ باری تعالیٰ مخلوق ومقدور نہیں بلکہ خالق وقادر ہے پس لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ذات شئ نہیں ہے یہاں یہ نہ کہا جائے کہ ارشاد باری تعالیٰ "اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ یاوَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر" ایسا عام ہے جس پر تخصیص داخل ہے یعنی جو شئ مخلوق ومقدور باری تعالیٰ ہے وہ عام ہے اور جو شئ ذات باری تعالیٰ ہے وہ اس عام سے مخصوص ہے۔ یہاں تخصیص کا یہ شبہ وارد نہ ہوگا کیونکہ تخصیص اصل کے خلاف ہے لفظی دلیلوں کے اثبات میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے علاوہ ازیں تخصیص کے جواز کے لئے ایک قاعدہ مقرر ہے وہ یہ ہے کہ اہل عرف اکثر کو کل کے قائم مقام کرتے ہیں اسی سبب سے اہل عرف نے عمومیات میں تخصیص کے دخول کو جائز قرار دیا ہے مگر اکثر کو کل کے قائم مقام اس صورت میں کیا جاتا ہے جہاں حکم سے خارج ہونے والا حقیر اور قلیل المقدار ہو پس وہ قلیل وحقیر کا وجود گویا عدم اور نہ موجود ہونے کی منزل میں ہوتا ہے اس لئے باقی کو کل کے قائم مقام کر دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ تخصیص اسی صورت میں جائز ہے جو حقیر اور ساقط الاعتبار ہوتا ہے لیکن جس تقدیر پر ہماری بحث ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ شئ کا مسمیٰ ہو تو اس صورت میں اس کی تخصیص کسی طرح روا نہیں چونکہ تمام اشیاء میں اعظم اور اجل اللہ تعالیٰ ہے لہذا اس کی تخصیص نہ ہوگی کہ تخصیص شئ حقیر کی ہوتی ہے اعظم واجل شئ کی نہیں۔

دلیل دوم: ارشاد باری تعالیٰ ہے 'لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَالسَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" (الشوریٰ:۱۱) اس آیت میں اللہ عز شانہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس کی مثل کا مثل کوئی شئ نہیں ہوسکتی چونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شئ اپنی ذات ونفس کے مثل کے لئے مثل ہے اور اس آیت سے ثابت کہ اللہ کے مثل کے مثل کوئی شئ نہیں ہے پس نتیجتاً ثابت کہ اللہ تعالیٰ مسمیٰ شئ کا غیر ہے اگر کوئی کہے کہ کاف زائدہ ہے اس لئے اس کے مثل کا مثل نہیں ہوسکتا، اس کا

جواب یہ ہے کہ اس حرف کو زائدہ ماننے کی صورت میں کلام الٰہی کے حرف کا لغو و باطل ہونا لازم آئے گا اور اس کے کسی حرف کا باطل ہونا محال لہذا زائد ہونا بھی محال ہے اس لئے آیت کا معنی یہی ہوگا کہ اس کی مثل ذات کے مثل کوئی شئ نہیں تو ذات الٰہی شئ نہیں۔

دلیل سوم: یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ اللہ عز شانہ کا اسم مبارک، جلال و جبروت عزت و عظمت اور مدح و ثناء جیسی صفات میں سے ہے اور شئ ایسا لفظ ہے جس سے صفات عظمت و عزت، جلال و جبروت اور مدح و ثنا کا اظہار نہیں ہوتا لہذا لفظ شئ اسماے باری تعالیٰ میں سے نہیں ہوسکتا، رہا یہ کہ اسم شئ مدح و جلال وغیرہ صفات کمالیہ سے نہیں تو یہ ظاہر ہے چونکہ لفظ شئ کا مفہوم حقیر سے حقیر ذرہ اور اعظم و اشرف اشیاء کے درمیان مشترک ہے جب سب پر شئ کا اطلاق درست ہے تو خسیس ترین اشیاء پر بھی اس کا طلاق جائز ہوگا اس سے ظاہر کہ شئ مدح کا فائدہ نہیں دیتی اور اللہ تعالیٰ کے اسماء کا صفت مدح و ثنا پر دلالت کرنا اس لئے واجب ہے کہ ذات پاک کی طرح اسماے مبارکہ کو بھی عیوب و نقائص سے منزہ سمجھنا اور کمالات و برکات سے لبریز ماننا چاہئے چنانچہ قرآن حکیم میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ'' یعنی اور اللہ ہی کے ہیں بہت اچھے نام تو اسے ان سے پکارو اور انہیں چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں حق سے نکلتے ہیں (الاعراف ۱۸۰) اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے حسنیٰ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسماء ایسے ہوں جو صفات کمالیہ و رفیعہ جلیلہ پر دلالت کرنے والے ہوں لہٰذا جو اسم اس معنی پر نہ دلالت کرنے والا ہو وہ اسم حسن نہیں ہوسکتا پھر اللہ عز شانہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس کو ان اسماء حسنیٰ سے یاد کریں لیکن اس کے خلاف ارشاد ہوا ''وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ'' پس اس میں گویا تنبیہ ہے اس بات پر کہ جو اس کو ان اسماء حسنیٰ کے علاوہ یاد کرے گا وہ اس کے اسماء مبارکہ میں الحاد کرنے والا ہے اس لئے شئ کا اطلاق اس پر نہیں ہوسکتا۔

دلیل چہارم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے کسی سے یہ منقول نہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ''یا شئ'' سے کبھی بھی خطاب فرمایا ہوا اور پھر کیسے یہ حضرات اس لفظ سے خطاب فرما سکتے تھے جب کہ اس لفظ شئ کا اطلاق حقیر ترین چیزوں پر ہوتا ہے جب نبی و صحابہ کسی سے منقول نہیں تو پھر کسی بندہ کو کیونکر اجازت ہوسکتی ہے کہ عز شانہ تعالیٰ کو ایسے لفظ سے خطاب کرے بلکہ ان سے منقول ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ''یا منشئ الاشیاء یا منشی الارض و السماء'' جیسے معزز اسماء سے یاد کرتے تھے۔

نوٹ: خلاصہ یہ کہ رب تعالیٰ پر شئ کے اطلاق کرنے اور نہ کرنے پر دونوں طرف سے جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان سے ظاہر ہے کہ دونوں فریق کی دلیلیں متانت وقوت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کم نہیں ہیں اس لئے اس بحث کو معنوی بحث قرار دینا بہت بعید ہے چونکہ اس بات میں اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، ایک ذات ہے ایک حقیقت ہے کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف اس لفظ کے اس پر اطلاق کرنے میں ہے اس لئے یہ لفظی بحث ہے پس اس اعتبار سے کسی کی تکفیر وتفسیق نہیں کی جاسکتی ہے۔

مسئلہ دوم: اللہ عزشانہ تعالیٰ پر لفظ ''موجود'' کے اطلاق کے بیان میں۔

اس بحث سے پیشتر ایک مقدمہ کی تمہید ضروری ہے:۔ وہ یہ کہ لفظ وجود دو معنی میں مشترک ہے ایک یہ کہ وجود سے وجدان، ادراک اور شعور مراد لیا جائے اس تقدیر پر کہ وجود سے ادراک، وجدان اور شعور مراد ہے تو لامحالہ، موجود سے مدرک اور مشعور بہ مراد ہوگا اور وجود کا دوسرا معنیٰ حصول اور تحقق ہے۔ دونوں معنی کے درمیان فرق یہ ہے کہ کسی شئ کا اعیان میں معلوم الحصول ہونا فی نفسہ اس شئ کے حاصل ہونے پر موقوف ہے لیکن کسی شئ کا فی نفسہ حاصل ہونا اعیان میں معلوم الحصول ہونے پر موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ عقل میں کسی شئ کا فی نفسہ حاصل ہونا ممتنع اور محال ہوتا ہے نیز وہ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا ہو غرض وجود دو معنیٰ میں مشترک ہے مگر یہاں ایک بحث یہ ہے کہ کیا وجود کا معنیٰ ادراک ووجدان ابتداء موضوع ہے اور پھر ثانیاً حصول الشئ فی نفسہ کی طرف منقول ہوا ہے یا اس کے برعکس ہے کہ اولاً حصول الشئ فی نفسہ کے لئے وضع ہوا اور ثانیاً ادراک ووجدان کے معنی کے لئے منقول ہوا یا پھر دونوں معنی کے لئے ایک ساتھ وضع ہوا ہے۔ واضح رہے کہ یہ بحث بھی لفظی ہے۔ اقرب یہ ہے کہ وجود کا معنی اولاً ادراک ووجدان کے لئے وضع ہوا ہے کیونکہ جب تک انسان کو اس شئ کا شعور نہ ہوگا فی نفسہ اس شئ کا حصول معلوم نہ ہوگا۔

اس تمہید کے بعد معلوم ہو کہ ذات باری تعالیٰ پر لفظ موجود کا اطلاق دونوں طریقے پر جائز ہے اول اس کا معلوم و مشعور ہونا دوم اس کا فی نفسہ ثابت ومتحقق ہونا۔ معنی اول کے اعتبار سے قرآن میں ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری ہے '' لَوَجَدُوا اللّٰهَ '' (نساء ۶۴) چنانچہ آیت مبارکہ میں وجود، وجدان وعرفان کے معنی میں ہے لیکن معنی ثانی یعنی ثبوت و تحقق کے معنی کے اعتبار سے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

شبہ: اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جہاں وجود وجدان وادراک کے معنی میں پایا جائے گا وہاں وجود بمعنی حصول و ثبوت بھی پایا جائے گا کیونکہ اگر عدم محض ہوتا تو ایسا نہ ہوتا کہ شعور وادراک ہو اور حصول وثبوت نہ ہو۔

جواب: دو وجہوں سے یہ شبہ ضعیف ہے۔

وجہ اول: وجود بمعنی وجدان ومعرفت کے پائے جانے سے وجود بمعنی ثبوت کا پایا جانا لازم نہیں آتا چونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ معدوم بھی کبھی معلوم ہوتا ہے پس ایسا ہوسکتا ہے کہ شئ مدرک ومعلوم تو ہو لیکن فی نفسہ وہ ثابت وموجود نہ ہو۔

وجہ دوم: یہ بحث بھی لفظی ہے اس لئے کہ ایک معنی کے اعتبار سے اسم کا پایا جانا لازم نہیں کرتا کہ اسم دوسرے معنی کے اعتبار سے بھی موجود ہو۔ علاوہ ازیں اجماع مسلمین سے اس اسم کا اطلاق باری تعالیٰ پر ثابت ہے۔

شبہ: اس جواب پر یہ شبہ وارد کیا جاتا ہے کہ اسماے الٰہیہ کو ایسا ہونا چاہئے جو مدح وثنا پر دلالت کرے اور موجود ایسا نہیں ہے جو مدح وثنا پر دلالت کرتا ہو۔

جواب: دلالت اجماع کی وجہ سے موجود کا اطلاق اس پر صحیح ہے اگرچہ بظاہر اس میں مدح وثنا ظاہر نہیں ہے نیز لفظ موجود میں لفظ شئ سے زیادہ مدح وثناء کا معنی موجود ہے اس کا بیان چند وجہوں سے ظاہر ہے۔

اول: بعض لوگوں کے نزدیک لفظ شئ کا اطلاق معدوم پر بھی ہوتا ہے جیسے کہ اس کا اطلاق موجود پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں بھی لفظ شئ کا اطلاق معدوم پر کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْم" (الحج/1) اس آیت میں زلزلہ ساعت کو شئ فرمایا گیا ہے جب کہ زلزلہ ابھی موجود نہیں ہے معدوم ہے۔ اس کے برعکس موجود کا اطلاق معدوم پر کبھی نہیں ہوتا۔ اس لئے لفظ موجود کا اشارہ، مدح پر بہ نسبت شئ کے زیادہ ہے۔

دوم: لفظ موجود، معلوم کے معنی میں، صفت مدح وثنا کا فائدہ دیتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس کی الوہیت کے وجود پر اس کثرت سے دلائل ہیں کہ وہ ذات گویا کہ ہر ایک کو معلوم ہے، ہر ایک کے پاس موجود ہے اور ہر ذی عقل کے نزدیک واجب الاقرار ہے اس اعتبار سے لفظ موجود یقیناً مفید مدح وثنا ہے۔

مسئلہ سوم: (اطلاق "ذات" کے بیان میں)۔ حضرت مولانا عبد اللہ انصاری ہروی نے اپنی کتاب "الفاروق" میں چند حدیثیں نقل کی ہیں جن میں اس کی صراحت ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہ، کے لئے ذات کا اطلاق درست ہے۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ان من اعظم الناس اجراً الوزیر الصالح من امیر یطیعه فی ذات الله" لوگوں میں سب سے بڑا اجر اس وزیر صالح کو ہوتا ہے جو ذات الٰہی کی رضا میں اپنے امیر کی اطاعت کرتا ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان ابراہیم لم یکذب الا فی ثلاث ثنتین فی ذات اللہ" یعنی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے تین باتوں میں توریہ سے کام لیا دو باتیں ذات الٰہی کی خوشنودی میں کہی۔

(۳) کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "لا تسبوا علیا فانہ کان مخشوشا فی ذات اللہ" یعنی علی کو گالی نہ دو کیونکہ وہ رضائے مولیٰ میں مستغرق رہنے والے ہیں۔

(۴) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سا جہاد افضل ہے! ارشاد فرمایا "ان تجاھد نفسک و ھواک فی ذات اللہ" یعنی اپنے نفس وخواہش کو ذات الٰہی میں فنا کر دینا جہاد ہے۔

(۵) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "ان للشیطان مصاید و فخوخا منھا البطر با نعم اللہ و الفخز بعطاء اللہ و الکبر علیٰ عباد اللہ و اتباع الھویٰ فی غیر ذات اللہ"۔ ترجمہ: یعنی بیشک شیطان کے لئے بہت سے جال اور شکاری پھندے ہیں اسی میں سے اللہ کی نعمتوں پر اترانا، عطاء الٰہی پر فخر کرنا، اللہ کے بندوں پر تکبر کرنا اور ذات الٰہی کے غیر میں نفسانی خواہشات کی پیروی کرنا ہے۔

اقول: ہر وہ شئی جس کے ذریعہ امور میں سے کوئی امر حاصل ہوتا ہے یا ہر وہ لفظ جس سے دوسرے امر کی طرف دلالت ہو رہی ہو وہ لفظ دال اگر مذکر ہے تو کہا جاتا ہے "انہ ذو ذالک الامر" اور واضح مثال "عثمان ذو النورین" اور اگر وہ لفظ مؤنث ہے تو کہا جاتا ہے۔ "أنھا ذات ذالک الامر، الاسماء ذات النطاقین" ان دونوں مثالوں سے واضح ہے کہ یہ لفظ ذات اس جیسی نسبت، کے افادہ کے لئے اور ایسی اضافت کے ثبوت پر دلالت کرنے کے لئے وضع ہوا ہے جب واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ نسبت واضافت پر دلالت کے لئے وضع ہوا ہے۔ تو اب پھر بار دیگر کسی دوسری صفت کے لئے اس صفت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ محال لازم آتا ہے چونکہ اس صفت کو اگر کسی دوسری صفت کے لئے جائز مانا جائے تو دوسری کے لئے تیسری صفت اور تیسری کے لئے چوتھی صفت کا علیٰ **ھذا القیاس الی غیر النھایہ** جواز ثابت ہوگا اور یہ تسلسل مستحیل ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ لفظ (صفت) ایک حقیقت واحدہ ماہیت قائم بنفسہا مستقلہ پر جا کر منتہی ہو

تب اس وقت اس ماہیت وحقیقت پر صادق آئے گا کہ وہ حقیقت ان صفات کی ذات ہے چنانچہ یہ کہنا کہ ''انھا ذات کذا، و کذا'' یہ صادق آتا ہے حقیقت میں اس ماہیت حقیقیہ پر جو قائم بنفسہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اہل اصطلاح نے اس لفظ ذات کو اس لفظ مفرد کی طرح قرار دیا ہے جو اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔جب اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے قیوم ہے تو اس پر اسم ذات کا اطلاق حق وصحیح ہوگا رہی وہ حدیثیں جو عبداللہ ہرونی نے اپنی کتاب الفاروق میں ذکر کی ہیں وہ حدیثیں اس معنی پر دلالت نہیں کرتیں کیونکہ ان حدیثوں میں لفظ ذات سے حقیقت وماہیت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد رضاے الٰہی ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول میں ہے کہ ''لم یکذب ابراہیم الا فی ثلاث ثنتین فی ذات اللہ'' اس میں ذات سے رضاے الٰہی مراد ہے اسی طرح دوسری حدیثوں میں بھی ذات سے ماہیت وحقیقت الٰہیہ مراد نہیں ہے۔

مسئلہ چھارم: ذات باری تعالیٰ پر لفظ نفس کے اطلاق کے بیان میں ہے،لفظ نفس قرآن حکیم میں وارد ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ''تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ''(المائدۃ۱۱۶))۔یعنی کہا عیسیٰ علیہ السلام نے کہ اے مولیٰ تو جانتا ہے جو میرے نفس میں ہے اور میں نہیں جانتا ہوں جو تیرے علم میں ہے اور ارشاد ہے ''وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ'' (آل عمران ۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے سے ڈراتا ہے احادیث میں بھی لفظ نفس کا اطلاق ہوا ہے۔

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت مشہور ہے فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغل میں سوئی تھی پس میں نے دیکھا کہ آپ بستر سے غائب ہیں میں نے آپ کو تلاش کیا تو میرا ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک سے لگا درانحالیکہ آپ سجدہ ریز تھے اور آپ فرمارہے تھے۔''اللھم انی اعوذ برضاک من سخطک، واعوذ بمعافاتک من عقوبتک واعوذ بک منک احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک'' اے اللہ میں تیری ناراضگی سے تیری خوشنودی کی پناہ لیتا ہوں،اور تیرے عذاب سے تیری معافی کی پناہ لیتا اور میں تیری پناہ لیتا ہوں تیری ناپناہی سے۔میں تیری ثناء کما حقہ نہیں کرسکتا جیسا کہ تو نے اپنی ثناء کی ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''یقول اللہ تعالیٰ: انا مع عبدی حین یذکرونی، فان ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملأخیر من ملئہ، وان تقرب منی شبراً تقربت عنہ ذراعا، وان تقرب منی ذراعا تقربت منہ

باعاً وان جاء نی یمشی جئتہ اھرول"۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بیشک میں اپنے بندہ کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے خود سے یاد کرتا ہوں اگر وہ مجھے مجمع عام میں یاد کرتا ہے تو میں اسکا ذکر اس سے افضل مجمع میں کرتا ہوں، اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ قریب ہوتا ہوں اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں یعنی میری رحمت اس کی طرف دوڑتی آتی ہے۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لما خلق اللہ الخلق کتب فی کتابہ علی نفسہ وھو مرفوع فوق العرش ان رحمتی تغلب غضبی"۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے اپنی کتاب (لوح محفوظ) میں اپنے ذمہ کرم پر لازم کر کے لکھا جب کہ وہ فوق عرش مرفوع تھا کہ بیشک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

(۴) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لیس احد أحب الیہ المدح من اللہ تعالیٰ ومن اجل ذالک مدح نفسہ لیس احد اغیر من اللہ، ومن اجل ذالک حرم الفواحش، ولیس احد احب الیہ العذر من اللہ، ومن اجل ذالک انزل الکتاب وأرسل الرسل" یعنی اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی کو مدح پسند نہیں ہے اسی وجہ سے اس نے اپنی مدح فرمائی، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیر تمند نہیں ہے اسی وجہ سے اس نے فواحش کو حرام فرمایا، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی کو عذر محبوب نہیں ہے اسی وجہ سے اس نے کتاب نازل فرمائی اور رسولوں کو مبعوث فرمایا۔

(۵) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسبیح سکھائی "سبحان اللہ وبحمدہ، عدد خلقہ ومداد کلماتہ ورضا نفسہ وزنۃ عرشہ" یعنی میں اللہ کی تسبیح اور اس کی حمد بیان (کرتی ہوں) کرتا ہوں اسکی مخلوق کی تعداد، اس کے کلمات کی سیاہی کے برابر اس کی ذات کی خوشنودی اور اس کے عرش کے وزن کے برابر۔

(۶) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سبحانہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وحرمتُ الظلم علی نفسی، جعلتہ بینکم محرماً فلا تظالموا" یعنی میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور میں نے ظلم کو تمہارے درمیان حرام قرار دیا ہے پس آپس

میں ظلم نہ کرو۔

(۷) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن منبر پر آیت "وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ" (الانعام:۹۱) تلاوت فرمائی۔ "ثم اخذیمجد اللہ نفسه، أنا الجبار، انا المتکبر، انا العزیز، انا الکریم، فرجب برسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم حتی خفنا سقوطه"۔ یعنی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سبحانہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرنے لگے بایں طور کہ وہ فرماتا ہے میں جبار ہوں، میں متکبر ہوں، میں غالب ہوں، میں کریم ہوں پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسی لرزش طاری ہوگئی کہ ہم لوگوں کو اندیشہ ہوگیا کہ کہیں حضور منبر سے گر نہ جائیں۔

(۸) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت آدم وموسیٰ علیہما السلام کی ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ وہ ہیں کہ آپ نے لوگوں کو مشقت میں ڈال دیا کہ آپ کی وجہ سے لوگوں کو جنت سے باہر آنا پڑا حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ "انت الذی اصطفاک اللہ برسالته، واصطنعک لنفسه وانزل علیک التوراۃ،، الخ" اور آپ وہ ہیں کہ اللہ نے آپ کو اپنی رسالت سے چن لیا، اور اپنے لئے آپ کا انتخاب فرمایا اور آپ پر تورات کو نازل فرمائی پس آپ نے اس میں دیکھا ہوگا کہ اللہ نے اس کو میری پیدائش سے پہلے لکھ دیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں اس طرح حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تین مرتبہ حجت میں غالب آئے

۔

(۹) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ھذا دین ارتضیته لنفسی ولن یصلحه الا السخاء و حسن الخلق فاکرموه بھما"۔ یعنی یہ دین ہے جس کو میں نے اپنے لئے پسند فرمایا ہے اور سخاوت اور حسن اخلاق ہی اس کو اچھا کر سکتے ہیں لہذا ان دونوں سے اس کا اکرام کرو۔

(۱۰) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ روایت کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "من اھان لی ولیا فقد بارزنی بالمحاربة فلا ابالی فی ای وادمن الدنیا اھلکه، واقذفه فی جھنم، وما ترددتُ فی نفسی فی قضاء شئ قضیت ترددی فی قبض عبدی المؤمن، یکره الموت ولا بدله منه واکره

مساءتہ"۔یعنی جس نے میرے کسی دوست (ولی) کی توہین کی اس نے میرے ساتھ اعلان جنگ کر دیا پس مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میں اسے دنیا کی کس وادی میں ہلاک کروں اور جہنم میں پھینک دوں، اور مجھے جتنا تردد مومن کی وفات پر ہوتا ہے اتنا کسی اور کام پر نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے لئے ضروری ہے اور میں اس کے غم کو ناپسند کرتا ہوں۔

(۱۱) حضرت عبداللہ سے مروی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس بندہ کو جو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ کہے کہ اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے بندہ کا بیٹا ہوں اور تیری بندی کا بیٹا ہوں، میری چوٹی تیرے قبضہ میں ہے، مجھ میں تیرا حکم جاری اور تیرا فیصلہ حاکم ہے۔"أسألک بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک"۔اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے ہر اس اسم کے وسیلہ سے جس سے تو نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ یا تو نے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے یا علم غیب میں جو تیرے نزدیک افضل ہے کہ تو قرآن حکیم کو میرے نہاں خانہ دل میں کر دے اور میرے سینے کو پرنور کر دے، اور حزن وملال کے بادل کو چھانٹ دے تو اللہ تعالیٰ اس کے حزن وغم کو دور کر دیتا ہے اور حزن وغم کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کو فرحت وسرور عطا کرتا ہے۔

(۱۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا اور یہ کہ میں باجے اور بتوں کو توڑ دوں اور ارشاد فرمایا اقسم ربی علیٰ نفسہ ان لا یشرب عبد خمرا ثم لم یتب الی اللہ تعالیٰ منہ الا سقاہ اللہ تعالیٰ من طینۃ الخبال (الخ) یعنی میرے رب نے اپنی ذات کی قسم یاد فرمائی ہے کہ جو بندہ شراب پی لے اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو طینۃ الخبال پلائیگا، اس پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ طینۃ الخبال کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ جہنمیوں کی پیپ ہے۔(معاذ اللہ)

تنبیہ: یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ قرآنی آیات واحادیث میں جہاں کہیں رب تعالیٰ کے لئے لفظ نفس کا استعمال ہوا ہے۔تو اس سے ذات وحقیقت مراد ہوتی ہے اجزاء سے مرکب جسم مراد نہیں ہوتا کیونکہ جسم مرکب ہوتا ہے اور مرکب ممکن ہے اور ہر ممکن حادث ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے۔

مسئلہ پنجم: لفظ "شخص" کے استعمال کا بیان، رب تعالیٰ کے لئے حدیث میں لفظ شخص کا استعمال بھی ہوا ہے۔

چنانچہ سعد ابن عبادہ سے مروی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ " لا شخص اغیر من اللہ و من اجل غیرتہ حرم الفواحش ما ظھر منھا و ما بطن، و لا شخص احب الیہ العذر من اللہ و من اجل ذالک بعث المرسلین مبشرین و منذرین و لا شخص احب الیہ المدح من اللہ " یعنی اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی شخص با غیرت نہیں ہے۔غیرت ہی کی وجہ سے اس نے ظاہری و باطنی سب فاحشات کو حرام فرمایا۔اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی شخص معذرت کو محبوب نہیں رکھتا ہے اس وجہ سے اس نے بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے انبیاء و مرسلین بھیجے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی شخص مدح کو پسند کرنے والا نہیں ہے۔

تنبیہ: اس حدیث میں بھی لفظ "شخص" سے مراد ذات مخصوصہ اور حقیقت معینہ ہے وہ جسم مراد نہیں ہے جس میں تشخص و جمیت پائی جاتی ہے۔

مسئلہ ششم: اللہ عز شانہ تعالیٰ پر "لفظ نور" کے اطلاق کے بیان میں، قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" (النور ۳۵)۔احادیث میں بھی وارد ہے چنانچہ مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے عرض کیا گیا کہ آپ سے منقول ہے کہ آپ کہتے ہیں "الشقی من شقی فی بطن امہ" یعنی بدبخت وہ ہے جو شکم مادر سے بدبخت پیدا ہوا ہو۔آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "ان اللہ خلق الخلق فی ظلمۃ ثم القی علیھم من نورہ، فمن اصابہ من ذالک النور فقد اھتدیٰ و من اخطأ فقد ضلّ"۔یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو ظلمت و تاریکی میں پیدا کیا پھر اس پر اپنے نور کو انڈیلا پس جس کو نور الٰہی سے کچھ حصہ پہنچا وہ ہدایت یافتہ ہو گیا اور جس کو کچھ نہ ملا وہ گمراہ ہو گیا۔

مسئلہ حق حقیق یہ ہے کہ رب تعالیٰ پر نور کا اطلاق معنی معروف و مشہور کے اعتبار سے کئی وجوہ سے باطل ہے اول اس لئے کہ نور یا تو جسم ہوگا یا جسم کی کیفیت ہوگی۔اور جسم حادث ہے تو اس کی کیفیات بھی حادث ہونگی اور اللہ جل شانہ حدوث سے منزہ اور پاک ہے۔دوم یہ کہ نور کی ضد ظلمت ہوتی ہے اور اللہ ضد و ند سے بھی پاک و منزہ ہے۔سوم یہ کہ نور، زائل ہو جاتا ہے زوال کے بعد ظلمت و تاریکی ہی رہ جاتی ہے اور اللہ زوال و غروب سے پاک ہے۔رہا یہ امر کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے۔"اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" جس کا بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ عز شانہ آسمان و زمین کا نور ہے تو اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں

اول: یہ کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔جس کی عقلی دلیل وہ ہے جو سابق میں گذری کہ نور کا اطلاق ذات باری پر

درست نہیں۔ علاوہ ازیں باری تعالیٰ عز شانہ نے اس آیت کے بعد "**مثل نورہ**" (النور:۳۵) ارشاد فرمایا جس میں نور کی اضافت اپنی طرف فرمایا جیسے ملک کی اضافت مالک کی طرف ہوتی ہے پس یہ بھی دلیل ہے کہ وہ نور نہیں ہے بلکہ خالق نور ہے۔

دوم: یہ کہ بعض علماء نے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ کو لِلّٰهِ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ پڑھا ہے۔

سوم: یہ کہ نور آیت کریمہ میں منور کے معنی میں ہے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ انوار کا منور، اس کا مبدع اور خالق ہے۔ اس طرح تاویل کے رو سے ذات باری تعالیٰ پر نور کا اطلاق صحیح ہے۔

چہارم: رب تعالیٰ کی حکمت وارادہ اور اس کی مصلحت سے نظام کا قوام اور دنیا و آخرت کے تمام تر مہمات و مقاصد منصۂ شہود پر آئے ہیں اور آئیں گے اور جو مصالح عالم کا منتظم ہے اس پر نور کا اطلاق ہوسکتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ "فلانٌ نور هذا البلد" فلاں اس شہر کا نور ہے۔

پنجم: اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایمان و ہدایت اور معرفت جیسے اوصاف سے نوازا ہے اور یہ اوصاف جنس انوار سے ہیں جیسا کہ قرآن و احادیث اس پر شاہد ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے۔ "نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" (النور ۳۵) احادیث شریفہ میں وارد ہے۔

(۱) ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله"۔

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "هل تدرون اى الناس أكيس"۔ صحابہ نے عرض کیا اللہ و رسولہ اعلم، سرکار نے ارشاد فرمایا کہ تمام لوگوں میں جو موت کو زیادہ یاد کرے اور ان لوگوں میں جو استعداد کے لحاظ سے اچھا ہو، لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس کی علامت کیا ہے؟ ارشاد فرمایا، دار غرور سے کنارہ کشی اور دار خلود کی طرف میلان، جب نور دل میں داخل ہوتا ہے تو مرنے سے پہلے استعداد کے لئے وسیع و کشادہ ہوجاتا ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائی "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ" یعنی تو کیا وہ جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔ (الزمر ۲۲) تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، اللہ تعالیٰ کس طرح سینہ کشادہ

فرماتا ہے آپ نے فرمایا جب نور دل میں داخل ہوتا ہے تو دل کشادہ ہوجاتا ہے، فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ اس کی علامت کیا ہے؟ فرمایا "الانابة الی دار الخلود و التجافی عن دار الغرور، والتأهب للموت قبل نزول الموت"۔

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک راستہ سے گذر رہے تھے کہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو سرکار نے پوچھا "کیف اصبحت یا حارثة" اے حارثہ تم نے کیسے صبح کی انہوں نے عرض کیا "اصبحت و الله مو مناً حقاً" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انظر ما تقول" یعنی جو تم کہہ رہے ہو غور کرلو اس لئے کہ ہر حق کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے "فما حقیقة ایمانک" عرض کیا میں نے اپنے آپ کو دنیا سے کنارہ کرلیا رات کو جاگ کر، دن کو تشنہ رہ کر گذارا کیا پس گویا میں اپنے رب کے عرش کو کھلا دیکھ رہا ہوں اور گویا میں جنتیوں کو آپس میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے دیکھ رہا ہوں اور جہنمیوں کو گرتے پڑتے دیکھ رہا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تجھے عرفان حاصل ہوگیا اس پر قائم رہو پھر ارشاد فرمایا "من سره ان ینظر الیٰ رجل نور الله الایمان فی قلبه فلینظر الیٰ هذا" یعنی جسے خوشی ہو کہ اس آدمی کو دیکھے جس کے دل کو اللہ نے ایمان سے منور فرمادیا ہے تو وہ اسے دیکھ لے پھر حضرت حارثہ نے عرض کیا یارسول اللہ میرے لئے درجہ شہادت کی دعاء کیجئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے شہادت کی دعاء فرمادی اس کے بعد جب جہاد کے لئے ندا کی گئی تو سب سے پہلا گھوڑ سوار جس نے راہ خدا میں جہاد کر کے درجہ شہادت حاصل کیا وہ حضرت حارثہ تھے۔

(۵) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر ایک آواز سنی تو آپ نے اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھایا پھر ارشاد فرمایا کہ آسمان کا یہ دروازہ کھولا گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا ہے پس اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا، اور عرض کیا "یا محمد ابشر بنورین لم یؤتهما احد من قبلک" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو دو نور کی بشارت ہو آپ سے پیشتر یہ دونوں کسی کو نہیں عطا ہوا ایک فاتحۃ الکتاب ہے اور دوسری سورہ بقرہ کی آخری آیات ہیں۔

(۶) حضرت یعلی بن منبہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن قیامت کے دن پل صراط پر سے گذریگا تو جہنم اسے آواز دیگی "جز عنی یا مومن فقد اطفأ نورک لهبی" یعنی اے

مومن ہم سے جلدی دور ہو جا کہ تمہارے نور نے میری لپٹ کو بجھا دیا ہے۔

(۷) حضرت نافع سے مروی ہے وہ روایت کرتے ہیں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "اللھم بک نصبح وبک نمسی وبک نحیا وبک نموت والیک النشور، اللھم اجعلنی من افضل عبادک عندک حظا نصیبا، فی کل خیر تقسمه الیوم، من نور تھدی به اورحمة تنشرھا اورزق تبسطه، اوضر تکشفه او بلاء تدفعه او سوء ترفعه او فتنة تصرفھا" یعنی اے اللہ ہم تیری ہی پناہ میں صبح کریں، تیری ہی پناہ میں شام کریں، تیری ہی پناہ میں زندہ رہیں اور تیری ہی پناہ میں وصال کریں اے اللہ تو مجھے اپنے افضل ترین بندوں میں سے کردے جس کا تیرے نزدیک وافر حصہ ہو اس خیر سے جس کو آج تو تقسیم کریگا یعنی اس نور سے جس سے تو لوگوں کو ہدایت دیتا ہے یا اس رحمت سے جس کو تو بکھیرتا ہے یا اس رزق سے جس کو تو بانٹتا ہے یا اس مصیبت سے جس کو تو دور فرماتا ہے یا اس بلا سے جس کو دفع کرتا ہے یا اس برائی سے جس کو رفع کرتا ہے اور اس فتنہ سے جس کو ختم کرتا ہے۔

(۸) حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ سے جنتیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا " اھل الجنة شعث رؤسھم وسخة ثیابھم، لو قسم نور احدھم علیٰ اھل الارض لوسعھم" یعنی جنتی پراگندہ سر، اور آلودہ کپڑے والے ہونگے اگر ایک جنتی کا نور تقسیم کر دیا جائے تو پورے اہل زمین کو کفایت کر جائے۔

(۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں "أن اھل الجنة کل اشعث أغبر ذی طمرین، اذا استأذنوا علی الامراء لم یؤذن لھم واذا خطبوا النساء لم ینکحوا، واذا قالوا لم ینصت لقولھم، حاجة احدھم، تتلجلج فی صدرہ لو قسم نورہ علیٰ اھل الارض لوسعھم"۔ بیشک جنتی ہر وہ آدمی ہوگا جو پراگندہ سر اور غبار آلودہ ہو اور دو بوسیدہ چادر اوڑھ رکھی ہو۔ جب امراء کے پاس حاضری کا اذن طلب کریں تو ان کو اجازت نہ ملے اور جب عورتوں کو نکاح کا پیغام دیں تو اس سے نکاح نہ کیا جائے اور جب لوگ بولیں تو ان کے کلام پر خاموش نہ رہیں ان کے دل میں لوگوں کی حاجت کا کھٹکا رہتا ہے اگر ان کے نور کو روئے زمین والوں پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کو کافی ہو جائے۔

(۱۰) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

بیشک اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "نوری هدای و لااله الاالله کلمتی فمن قالها أدخلته حصنی و من ادخلته حصنی فقد أمن"۔ میرا نور میری ہدایت ہے اور لا الہ الا اللہ میرا کلمہ ہے پس جو اسے کہے گا میں اسے اپنے قلعہ میں داخل کرونگا اور جسے میں اپنے قلعہ جنت میں داخل کردوں گا تو تحقیق وہ مامون ہوگیا۔

(۱۱) ہشام بن عروہ روایت کرتے ہیں اپنے باپ سے وہ روایت کرتے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے "اعوذ بکلمات الله التامة، وبنوره الذی اشرقت له الارض، واضاءت به الظلمات، من زوال نعمتک و من تحول عافیتک و من فجاءة نقمتک و من درک الشقاء و شر قد سبق"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات تامہ کی اور اس نور کی پناہ طلب کرتا ہوں جس کی وجہ سے زمین روشن کردی گئی اور تاریکیاں منور ہوگئیں، تیری نعمت کے زوال سے، تیری عافیت کے پھر جانے سے، تیرے اچانک کے عذاب سے ابتلاء شقاوت اور گذشتہ شر سے۔

(۱۲) بخاری و مسلم اور کتب صحاح کی یہ حدیث دربارۂ نور بہت ہی مشہور ہے۔ بطور حصول سعادت پوری حدیث مع نظم و ترجمہ مذکور ہے۔ "عن ابن عباس قال بت عند خالتی میمونة لیلة و النبی صلی الله علیه وسلم عندها فتحدث رسول الله صلی الله علیه وسلم مع اهله ساعة ثم رقد فلما کان ثلث اللیل الآخر او بعضه قعد فنظر الی السماء فقرأ "ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف اللیل والنهار لاٰیت لاولی الالباب حتیٰ ختم السورة ثم قام الی القربة فاطلق شناقها ثم صب فی الجفنة ثم توضأ وضوء حسنا بین الوضوئین لم یکثر و قد ابلغ فقام فصلّٰی فقمت و توضأت فقمت عن یساره فأخذ بأذنی فأدارنی عن یمینه فتتامت صلوته ثلث عشرة رکعة ثم اضطجع فنام حتی نفخ و کان اذا نام نفخ فاٰذنه بلال بصلوة فصلی ولم یتوضأ و کان فی دعائه۔ اللهم اجعل فی قلبی نورا و فی بصری نورا و فی سمعی نورا و عن یمینی نورا و عن یساری نورا و فوقی نورا و تحتی نورا و اما می نورا و خلفی نورا و اجعل لی نورا و زاد بعضهم و فی لسانی نورا و ذکر عصبی و لحمی و دمی و شعری و بشری متفق علیه و فی روایة لهما و اجعل فی نفسی نورا و اعظم لی نورا و فی اخری لمسلم اللهم اعطنی نورا" **ترجمہ:** حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی خالہ میمونہ کے پاس ایک رات گذاری جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تھے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ

دیرا پنے گھر والوں سے بات چیت کی پھر سو گئے تو جب آخری تہائی رات ہوئی یا اسکا کچھ حصہ تو اٹھ بیٹھے آسمان کو دیکھا اور یہ آیت پڑھی۔ بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے بدلنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں حتی کہ سورہ ختم کردی، پھر مشکیزے کی طرف کھڑے ہوئے تو اس کا بندھن کھولا پھر پیالے میں پانی انڈیلا پھر بہت اچھا درمیانی وضو کیا جس میں پانی زیادہ نہ خرچ کیا مگر ہر عضو پر پہنچا دیا پھر کھڑے ہوئے تو نماز پڑھی، پس میں بھی اٹھ بیٹھا اور میں نے وضو کیا اور آپ کی بائیں طرف کھڑا ہو گیا تو آپ نے میرا کان پکڑا اور مجھے اپنی دائیں طرف گھما دیا آپ کی نماز پوری تیرہ رکعتیں ہوئیں پھر لیٹ گئے تو سو گئے حتی کہ خراٹے لئے اور آپ جب سوتے تو خراٹے لیتے۔ پھر آپ کو حضرت بلال نے نماز کی اطلاع دی تو نماز پڑھی اور وضو نہ کیا اور آپ کی دعاء میں یہ تھا۔

الٰہی میرے دل میں نور، اور میری آنکھوں میں نور، میرے کانوں میں نور میرے دائیں نور، میرے بائیں نور، میرے اوپر نور میرے نیچے نور، میرے آگے نور میرے پیچھے نور کردے اور مجھے نور بنادے، بعض محدثین نے یہ بھی زیادہ کیا ہے کہ میری زبان میں نور، اور پٹھے گوشت خون بال کھال کا بھی ذکر کیا (بخاری ومسلم) اور ان دونوں کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ میرے دل میں نور کر اور میرا نور بڑھا اور مسلم کی دوسری روایت میں ہے الٰہی مجھے نور عطا فرما۔

مسئلہ ہفتم: بعض روایات میں باری تعالیٰ پر لفظ صورت کا اطلاق ہوا ہے اس بارے میں متعدد حدیثیں مروی ہیں۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ"۔

(۲) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لا تقبحوا الوجہ فان اللہ تعالیٰ خلق آدم علی صورۃ الرحمن" اسحاق بن راہویہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "ان اللہ خلق آدم علی صورۃ الرحمن" صحیح ہے۔

(۳) حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو ایک صبح نماز پڑھائی تو کسی صاحب نے عرض کیا "ما رأیتک أسفر وجھک مثل الغداۃ" آج کی صبح کی طرح کبھی آپ کا چہرۂ زیبا ایسا منور نہ دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ما أبالی، قد بدألی ربی فی احسن صورۃ" کیوں نہیں، میرے لئے میرا رب عمدہ صورت میں ظاہر ہوا تو فرمایا "فیم یختصم الملأ الاعلیٰ یا محمد" اے **محمد**! ملأ

اعلیٰ کس بارے میں جھگڑ رہے ہیں میں نے عرض کیا اے میرے رب تو زیادہ جانتا ہے "فوضع کفه بین کتفی فوجدت بردها فعلمت مافی السمٰوت والارض" پس اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانہ کے درمیان رکھا تو میں نے اس کی ٹھنڈک محسوس کرلیا اور آسمان وزمین میں جو کچھ ہے میں نے اس کو جان لیا۔

حضرات علمائے کرام نے اس جیسی احادیث کی تاویلات میں چند وجوہ بیان فرمائے ہیں۔

اول: یہ کہ ارشاد رسول "ان اللہ خلق آدم علیٰ صورته" میں "**صورته**" کی ضمیر مضروب کی طرف عائد ہے واقعہ یہ ہے کہ ایک صاحب اپنے حسین وجمیل غلام کو زدوکوب کررہے تھے کہ سرکار نے اس کو ملاحظہ فرمالیا تو ارشاد فرمایا کہ اس کو نہ مارو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مضروب کی شکل کا پیدا فرمایا اس لئے مضروب کے چہرہ کو بگاڑنے سے احتراز لازم ہے۔

دوم: دوسری تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایسی صورت پر پیدا فرمایا کہ وہ آخری مرحلہ تھا یعنی وہ عام انسان کی طرح نطفہ، خون سے پیدا نہ ہوئے نہ ہی شکم مادر میں رہے نہ ہی شیر خوارگی میں رہے بلکہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے ان کو مرد کامل دفعۃ واحدہ پیدا فرمایا۔

سوم: تیسری تاویل یہ ہے کہ مراد صورت سے صفت ہے کہا جاتا ہے۔ "صورة هذا الامر کذا یعنی صفته کذا" پس ارشاد نبوی "خلق اللہ آدم علی صورة الرحمن" کا مفہوم یہ ہے کہ "خلقه علی صفته فی کونه خلیفة له فی ارضه متصرفا فی جمیع الاجسام الارضیة" یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صفت پر زمین میں اپنا خلیفہ بنا کر تمام اجسام ارضیہ میں تصرف کرنے والا بنایا جیسا کہ وہ تمام عالم میں نافذ القدرت ہے۔

مسئلہ ہشتم: رب تعالیٰ پر جوہر کے اطلاق میں فلاسفہ ومتکلمین کے درمیان اختلاف ہے فلاسفہ اور اسی طرح نصاریٰ ذات باری پر جوہر کا اطلاق درست مانتے ہیں لیکن حضرات متکلمین جوہر کا اطلاق محال وممتنع سمجھتے ہیں۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ جوہر سے مراد وہ ذات ہے جو محل وموضوع سے بے نیاز ہو اور اس معنی کر جوہر کا اطلاق اس پر صحیح ہے اس لئے وہ جوہر ہوسکتا ہے چونکہ وہ فوعل کے وزن پر ہے اور جہر سے مشتق ہے جس کے معنی ظہور کے ہیں اسی لئے جوہر کو جوہر کہتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت وذات اور حجمیت کے اعتبار سے ظاہر ہوتا ہے پس اس کے جوہر ہونے کا معنی یہ ہے کہ جو ظاہر الوجود ہو لیکن حجمیت تو یہ نفس جوہر نہیں بلکہ حجمیت اس کے جوہر ہونے کا سبب ہے اور وہ اس کے وجود کا ظاہر ہونا

ہے چنانچہ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے وجود پر کثرت دلائل کی وجہ سے ہر ظاہر سے زیادہ ظاہر ہے اس اعتبار سے اس پر جوہر کا اطلاق درست ہے اہل حق متکلمین کے نزدیک جوہر کا اطلاق اس پر درست نہیں کہ اسماء الٰہیہ سب توقیفی واجماعی ہیں اور یہ لفظ جوہر دونوں طریق سے خارج ہے۔اس لئے اس پر جوہر کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ نہم: جوہر کی طرح اس پر جسم کا اطلاق بھی درست نہیں بلکہ محال وممتنع ہے کہ جسم مستلزم حدوث وامکان ہے جو وجوب ذاتی کے منافی ہے یہی تمام اہل حق کا مسلک ہے البتہ اکثر کرامیہ اور فرقہ مجسمہ، اللہ عزشانہ پر جسم کا اطلاق درست مانتے ہیں وہ لاکھ کہیں کہ جسم سے مراد وہ نہیں ہے جو اعضاء جسمانیہ سے مرکب ہو بلکہ جسم سے مراد وہ ہے جو بالذات قائم ہو بنفسہ موجود ہو اپنے وجود میں موضوع ومحل کا محتاج نہ ہو مگر یہ ان کی صرف زبانی بولی ہے ان کا عقیدہ ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رب العزت کو اجزاء مرکبہ سے مرکب جسم کی طرح مانتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ عرش کے اوپر ہے وہ عرش سے زیادہ بڑا ہے وغیرہ وغیرہ اور یہ ظاہر کہ جو ایسا ہوگا اس کی ذات عرش کی دو جہتوں میں سے ایک جہت سے دوسری جہت تک ممتد ہوگی پس وہ ذات طویل، عریض اور عمیق ہوگی اور یہی جسم کا معنی ہے جس کا بطلان بدیہی ہے۔

مسئلہ دہم: (لفظ حق کے اطلاق کے بیان میں) لفظ حق کا اطلاق تین معنوں پر ہوتا ہے ایک ذات شئی پر، اس صورت میں حق کا معنی یہ ہوگا جو ذات فی نفسہ وجود حقیقی کے ساتھ موجود ہو۔دوسرا معنی اعتقاد ہے اس وقت حق کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ایسا اعتقاد ہو جو درست ہو فی نفسہ شئی کے مطابق ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ حق باطل کے مقابل بولا جاتا ہے اور باطل معدوم کو کہتے ہیں چنانچہ لبید شاعر نے کہا ہے۔

ألا كل شئ ماخلا الله باطل

جب حق کے مقابل معدوم آتا ہے تو حق کا موجود ہونا واجب وضروری ہے اور اعتقاد کو حق اس لئے کہتے ہیں کہ اعتقاد جب صواب کے مطابق ہوگا تو اس کا اثبات اور ابقا واجب ہوگا۔تیسرا معنی یہ کہ حق کا اطلاق قول وخبر پر بھی ہوتا ہے اس وقت حق سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ خبریں سچی مطابق واقعہ ہیں اور جب خبریں سچی، واقعہ کے مطابق ہوتی ہیں تو اس کا اثبات وابقا واجب ہے۔حق کے معانی سمجھنے کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ پر حق کا اطلاق صحیح ودرست ہے پس معنی اول ذات شئی کے اعتبار سے اللہ کے حق ہونے کا معنی یہ ہے کہ اللہ وہ ایسا موجود حقیقی ہے جس کا زوال وعدم محال ہے۔ دوسرے معنی اعتقاد کے اعتبار سے حق کا اطلاق اس لئے صحیح ہے کہ اس کے وجود ووجوب کا اعتقاد ایسا اعتقاد ہے جو صحیح و

درست واقع کے ایسا مطابق ہے کہ تبدیلی وتغیر نہیں ہوسکتا۔ رہے تیسرے معنی کے اعتبار سے تو اس لئے کہ یہ خبر تمام خبروں میں صادق ہونے اور واجب التقریر ہونے کے اعتبار سے حق ہے۔

قسم دوم: ان اسماء کے بیان میں جو وجود کی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس باب کے بیان سے پہلے چند مقدمہ عقلیہ کی تمہید ضروری ہے۔

مقدمہ اولیٰ: بیشک اللہ تعالیٰ ازلی وابدی ہے۔ لیکن اس معنی کر نہیں کہ وہ کسی زمانہ کے آخر آن سے ہے بلکہ وہ زمان آخر کی طرف احتیاج کے بغیر ازلی وابدی ہے۔ غرض اللہ عزشانہ تعالیٰ وجود زمان سے پہلے ازلی وابدی ہے۔

مقدمہ ثانیہ: شئ جب ازلی ہوگی تو باقی ہوگی لیکن کسی شئ کے باقی ہونے سے اس کا ازلی ہونا ضروری نہیں لفظ باقی قرآن حکیم میں وارد ہے ارشاد ہے۔ ''وَّ یَبۡقٰی وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَ الۡاِكۡرَامِ'' (الرحمن ۲۷) ''كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ'' (القصص ۸۸) چنانچہ جو ہالک وحادث نہ ہوگا لامحالہ اس کا باقی رہنا لازم ہے اور ارشاد ہے ''هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ'' (الحدید ۳) اس آیت میں اللہ عزشانہ نے اپنے کو کل ماسواء سے اول فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے غیر کا اس سے اول ہونا ممتنع ومحال ہے اس لئے کہ کوئی غیر اول ہوگا تو اس کی ذات کا اول ہونا ممتنع ہوگا، اسی طرح اپنے کل ماسواء سے وہ آخر بھی ہے کیونکہ اس کے سواء اگر کوئی آخر ہوگا تو اس کا آخر ہونا ممتنع ہوجائے گا پس جب وہ اپنے ماسواء سے اول بھی ہے اور آخر بھی ہے تو غیر کا اول وآخر ہونا لامحالہ محال وممتنع ہوگا۔ غرض اللہ عزشانہ تعالیٰ ایسا ازلی ہے جس کا کوئی اول وآخر نہیں ہے۔

مقدمہ ثالثہ: صانع عالم محدَث نہیں ہوسکتا کیونکہ صانع عالم محدث ہوجائے تو دوسرے صانع کا محتاج ہوگا اس طرح تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اس لئے صانع عالم کا قدیم ہونا لازم ہے، اور جب اس کا قدیم ہونا ثابت ہے تو اس کا زوال ممتنع ہوگا چونکہ جس کا قدم ثابت ہوتا ہے اس کا عدم محال ہوتا ہے۔ اس تمہید کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ کے اس کی ذات وصفات کے لحاظ سے چند اسماے مبارکہ ہیں۔

(۱) قدیم: یہ لفظ اصل لغت کے اعتبار سے طول مدت، لمبا زمانہ پر بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے۔ دار قدیمۃ، جب گھر بہت پرانا ہو قرآن حکیم میں ہے ''حَتّٰی عَادَ كَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ'' یہاں تک کہ پھر ہوگیا جیسے کھجور کی پرانی ڈال (ٹہنی) (یٰس ۳۹) اور ارشاد ہے ''اِنَّكَ لَفِیۡ ضَلٰلِكَ الۡقَدِیۡمِ'' (یوسف ۹۵) لیکن یہ اولیت کی نفی کا فائدہ نہیں دیتا ہے۔

(۲) ازلی: یہ لفظ ازل کی طرف منسوب ہے اس سے وہم ہوتا ہے کہ ازل ایک شئ ہے جس میں ذات الٰہی کا وجود ہے یہ معنی بداہتاً باطل ہے کہ اس صورت میں اس کی ذات ازل کی محتاج ہوگی اس لئے ازلی کا معنی یہ ہے کہ ایسا موجود جس کا کوئی اول نہ ہو۔

(۳) ابدی: زمانہ مستقبل کے اعتبار سے جو دوام کا فائدہ دے مراد اس سے ایسا موجود جس کا کوئی آخر نہ ہو۔

(۴) الباقی: اس پر باقی کا اطلاق درست ہے قرآن حکیم میں ہے "وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ" خیال رہے کہ جو ازلی ہوگا وہ باقی ضرور ہوگا لیکن جو باقی ہوگا اس کے لئے ازلی وابدی ہونا ضروری نہیں جیسا کہ اجسام واعراض میں ہوتا ہے کہ باقی ہیں لیکن ازلی وابدی نہیں۔

(۵) الدائم: ہمیشہ سے ہے قرآن حکیم میں ہے "أُكُلُهَا دَائِمٌ" تمام اشیاء سے زیادہ حق دار دوام کا اللہ تعالیٰ ہے پس درحقیقت دائم وہ اللہ ہی ہے۔

(۶) واجب الوجود لذاتہ: اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی ماہیت وحقیقت ہی اس کے وجود کا موجب ہے اور جس کی یہ صفت ہوتی ہے وہ ممتنع العدم ہوتا ہے اس لئے واجب الوجود لذاتہ کا قدیم وازلی ہونا واجب ہے لیکن ہر قدیم و ازلی کے لئے واجب لذاتہ ہونا ضروری نہیں چنانچہ ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ شئ ازلی، علت ازلیہ ابدیہ سے معلول ہو تو اس وقت وہ شئ ازلی ابدی تو ہوگی لیکن واجب الوجود نہ ہوگی۔ بزبان فارسی رب تعالیٰ پر خدای کا اطلاق بھی واجب الوجود لذاتہ کے معنی میں ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔ کیونکہ خدا، زبان فارسی کے دو لفظ سے مرکب ہے ایک لفظ "خود" سے جس کا معنی ذات شئ اور حقیقت شئ سے ہے اور دوسرا لفظ "ا" جو "جاء" کے معنی میں ہے پس لفظ مرکب کا معنی ہوگا بنفسہ جاء یعنی وہ بذاتہ وجود کی طرف آنے والا ہے غیر سے نہیں، غرض "خدا" کا معنی جو لذاتہ معبود ہو۔ (رازی صفحہ ۱۱۱ ج:۱)

(۷) الکائن: صفات الٰہیہ کے اعتبار سے قرآن حکیم میں اس لفظ ذکر کا متعدد مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مقتدرا" اور اللہ ہر چیز پر قابو والا ہے (الکھف ۴۵) اور ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْماً حَكِيْماً" (النساء ۱۱) البتہ ذات الٰہی کے اعتبار سے اس لفظ کا ذکر قرآن حکیم میں وارد نہیں ہے۔ ہاں بعض احادیث میں وارد ہے۔ چنانچہ ادعیہ ماثورہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے "یا کائنا قبل کل کون، ویا حاضرا مع کل کون، ویا باقیا بعد انقضاء کل کون" یعنی اے وہ ذات جو، ہر موجود سے پہلے موجود ہے اے وہ ذات جو، ہر موجود کے ساتھ موجود ہے اور اے وہ ذات جو، ہر موجود کے ختم ہونے کے بعد بھی باقی رہنے والی ہے۔ اس اعتبار سے کائن کا اطلاق اس پر درست ہے۔

قسم سوم: (صفات حقیقیہ کی قسموں کے بیان میں ہے)۔وہ صفت جو وجود اور کیفیات وجود کے مغایر ہو اس بحث کی بنیاد اس پر ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ان صفات کا قیام درست ہے یا نہیں۔معتزلہ اور فلاسفہ صفات کے قیام کے سخت مخالف ہیں۔اور انہوں نے اپنے اس نظریہ پر متعدد وجوہ سے استدلال کیا ہے۔

دلیل اول: اگر صفات، باری تعالیٰ کے لئے ثابت ہوں تو یہ صفات واجب لذاتہا ہونگی یا ممکن لذاتہا ہونگی رب تعالیٰ کے لئے دونوں طرح کی صفات کا ثبوت باطل ہے۔صفات کا واجب لذاتہا ہونا دو وجہوں سے باطل ہے اول وجہ یہ ہے حکمت میں یہ امر ثابت شدہ ہے کہ واجب الوجود لذاتہ واحد بالذات ہے۔دوم وجہ یہ ہے کہ واجب لذاتہ وہ ہے جو اپنے ماسوا سے بے نیاز ہو اور جبکہ صفت موصوف کی طرف محتاج ہوتی ہے لہذا وجوب ذاتی اور اس کے لئے کسی غیر کا صفت ہونے کے درمیان اجتماعیت کا قول محال ہوگا کہ واجب لذاتہ غیر محتاج اور صفت محتاج ہوتی ہے اسی طرح ان کا ممکن لذاتہا ہونا بھی دو وجہوں سے باطل ہے۔اول وجہ یہ ہے کہ ممکن لذاتہ کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ضرور چاہئے اور اس کا سبب ذات الٰہی کا غیر نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اس ذات کا جب ان،صفات سے خلو ممتنع ومحال ہے اور یہ صفت غیر کی طرف محتاج بھی ہے پس اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خود ذات غیر کی طرف محتاج ہے اور جو محتاج ہوگا ممکن لذاتہ ہوگا پس اس تقدیر پر واجب تعالیٰ کا ممکن لذاتہ ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے کہ وہ واجب بالذات ہے،اور ان صفات کا سبب ذات باری بھی نہیں ہوسکتی کہ وہ ذات تو ان صفات کا قابل ہے اگر ان صفات کا سبب بھی ہوجائے تو ذات باری ان میں مؤثر ہوگی اس وقت شئی واحد کا نسبت کرتے ہوئے شئی واحد کی طرف بیک وقت قابل ومؤثر ہونا لازم آئے گا جو محال ہے چنانچہ یہ ضابطہ بھی ثابت شدہ ہے کہ شئی واحد سے ایک ہی اثر کا صدور ہوتا ہے جب کہ فعل وقبول دو مختلف اثر ہیں۔اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اثر موثر کا محتاج ہوتا ہے پس اثر کا مؤثر کی طرف احتیاج یا تو حدوث کے بعد ہوگا یا حدوث کی حالت میں ہوگا یا عدم حدوث کی حالت میں ہوگا اول باطل ہے ورنہ اس مؤثر کی تاثیر اس اثر کے ایجاد میں تحصیل حاصل ہوگی ورو محال ہے۔اب آخری دونوں صورتیں باقی رہ گئیں جو اس کو متقاضی ہیں کہ جب شئی غیر کا اثر ہوگی تو حادث ہوگی لہذا واجب ہے کہ کہا جائے کہ جو شئی حادث نہیں ہوتی غیر کا اثر نہیں ہوسکتی پس صفات کا قول باطل ہے۔

دلیل دوم: نفی صفات پر دوسری دلیل یہ دی گئی کہ وہ صفات قدیم ہوں گی یا حادث قدیم ہونا باطل ہے اس لئے کہ قدیم ہونا صفت ثبوتیہ ہے اب اگر صفات بھی قدیم ہوں تو ذات،قدامت میں صفات کے متساوی ہوگی اور پھر ان

دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے اپنی ماہیت معینہ کی خصوصیت کے لحاظ سے مغائر ہوگی۔ اور جب ہر ایک اپنی خصوصیت خاصہ کی وجہ سے دوسرے سے مغائر ہے تو اشیاء قدیمہ میں سے ہر ایک کا دو جز سے مرکب ہونا لازم آئے گا کہ ان اشیاء قدیمہ کے درمیان جس نقطہ میں مشارکت ہے وہ غیر ہے اس نقطہ کے جس میں مخالفت ہے پھر ان دونوں جزؤں میں سے ہر ایک کا قدیم ہونا بھی واجب ہے کہ قدیم کی ماہیت کے جز کا بھی قدیم ہونا لازم ہے۔ پھر اس دونوں جز کے بارے میں کلام سابق عود کرے گا کہ یہ دو جزء بھی قدیم میں مشترک ہوں گے اور خصوصیت خاصہ میں مختلف ہوں گے پس یہ دونوں جزء کا بھی دوسرے دو جزء سے مرکب ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے اس لئے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ ذات اور صفات میں سے ہر ایک کی حقیقت اجزاء غیر متناہیہ سے مرکب ہو اور یہ ظاہر الاستحالہ ہے۔

اور ان صفات کا حادث ہونا بھی چند وجوہ سے محال ہے۔ **اوّل** اس لئے کہ حوادث کا قیام ذات باری کے ساتھ محال ہے ورنہ اس کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور محل حوادث خود حادث ہوتا ہے۔ **دوم** اس لئے کہ اس کی ذات اگر صفات حوادث کی قابل ہو تو ان حوادث کی قابلیت اس کی ذات کے لوازم سے ہوگی پس اس وقت اس قابلیت کا اس ذات کے ازلی ہونے کی وجہ سے، ازلی ہونا لازم آئے گا جب کہ حوادث کی قابلیت کا ازلی ہونا ممتنع ہے کیونکہ حوادث کی قابلیت، حوادث کے وجود کے ممکن ہونے سے مشروط ہوتی ہے اور وجود حوادث کا امکان ازل میں محال ہے لہذا اس کی قابلیت کا وجود ازل میں محال ہوگا۔ **سوم** یہ صفات اگر حادث ہوں گے تو بیشک الہ جو صفات الہیت سے موصوف ہے ان صفات کے حدوث سے قبل موجود ہوگا جب حدوث صفات سے قبل ہی وہ موجود ہے تو وہ صفات ثبوت الٰہیت میں سے مستغنی عنہا ہو جائینگی اس لئے صفات کی نفی لازم ہے۔

دلیل سوم: معتزلہ، فلاسفہ نے صفات باری تعالیٰ کی نفی کرتے ہوئے تیسری دلیل یہ دی ہے کہ صفات اگر ایسی ہیں کہ الٰہیت ان کے بغیر تام ہے یا ان کے بغیر تام نہیں ہے درصورت اول صفات کا وجود فاضل اور زائد ہوگا اور بصورت دیگر اگر الہ اپنی الوہیت میں صفات کا محتاج ہو جائے تو وہ ممکن ہو جائے گا کہ احتیاج ملازم امکان ہے اور امکان منافی الوہیت ہے کہ کیونکہ امکان حدوث کو مستلزم ہے۔

دلیل چہارم: مدائح و کمالات میں جن صفات کا اعتبار ہے ان تمام صفات میں اس کی ذات یا تو کامل ہوگی یا کامل نہ ہوگی اگر کامل ہے تو ان صفات کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی اور ناقص ہے تو وہ ذات کمال حاصل کرنے میں غیر کا محتاج ہوگی اور احتیاج منافی الوہیت ملازم امکان سے ہے۔

دلیل پنجم: تثلیث کا قول کرنے کی وجہ سے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے نصاریٰ کی تکفیر کی ہے پس نصاریٰ کے تکفیر کی وجہ یا تو یہ ہے وہ تین ذوات کے قائل ہیں یا پھر انہوں نے ذات وصفات کا قول کیا ہے۔ اول صورت کا کوئی نصرانی قائل نہیں اس لئے یہ ممتنع ہے کہ کہا جائے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے ان کی تکفیر ایسے مقولہ کی وجہ سے کی ہے جو انہوں نے کہا ہی نہیں ہے اب دوسری صورت رہ جاتی ہے کہ اللہ نے نصاریٰ کی تکفیر ذات کے ساتھ صفات کا قول کرنے کی وجہ سے کی ہے اس لئے صفات کا قول کفر ہوگا۔

صفات باری تعالیٰ کے قائلین اور ان کے دلائل

اھل حق: فلاسفہ ومعتزلہ کے برخلاف اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثابت ہیں البتہ وہ صفات، عین ذات نہیں ہیں چنانچہ یہ بدیہی ہے کہ الہ العالمین کے لئے علیم وقدیر اور حی ہونا واجب ہے لیکن اس کا علم اور اس کی قدرت وغیرہا صفات ذاتیہ، عین ذات نہیں ہوسکتیں چند وجہوں سے۔

(۱) چونکہ ''ذات اللہ'' ذات، اور ''ذات اللہ عالمۃ قادرۃ'' یعنی ذات خداوندی ایک ذات ہے اور ذات خدا عالم و قادر ہے کے درمیان واضح بدیہی فرق ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کا عالم وقادر ہونا عین ذات نہیں ہے۔

(۲) اس کے علم وقدرت کا خیال کئے بغیر اس کے موجود ہونے کا علم ممکن ہے اسی طرح اس کے علم کا خیال کئے بغیر اس کے قادر ہونے کا علم اور اس کی قدرت کا خیال بغیر اس کے عالم ہونے کا علم بھی ممکن ہے اس سے واضح ہے کہ جس طرح اس کے علم وقدرت کے درمیان عینیت نہیں ہے اسی طرح علم وقدرت بھی اس کی ذات کے عین نہیں ہیں۔

(۳) اس کا علم عام ہے جو واجب وممتنع اور ممکن سب کو عام وشامل ہے لیکن اسکا قادر ہونا علم کی طرح عام نہیں کہ تینوں قسموں سے متعلق ہوجائے بلکہ قدرت کا تعلق صرف جائز کے ساتھ خاص ہے اس سے بھی واضح ہے کہ علم وقدرت کے درمیان بہت فرق ہے دونوں ایک نہیں ہیں اسی طرح اس کی ذات اور علم وقدرت وغیرہا بھی ایک نہیں ہوسکتے۔

(۴) علم وقدرت کے درمیان ایک دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ قادر، مقدور کے وجود میں اثر انداز ہوتا ہے لیکن عالم معلوم کے وجود میں اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ مندرجہ بالا وجہوں سے یہ ظاہر وباہر ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے لئے صفات کے وجود کا اقرار واجب ہے اب خواہ وہ صفات حقیقیہ ہوں یا اضافیہ ہوں یا سلبیہ ہوں یا تینوں ہوں۔

واضح رہے کہ صفات حقیقیہ میں کچھ ایسی صفتیں ہیں جن کو حصول نسبت واضافت لازم ہے جیسے علم وقدرت وغیرہا۔ بیشک علم ایسی صفت ہے جس کو لازم ہے کہ اس کا تعلق معلوم سے ہو ایسے ہی قدرت ایسی صفت سے جس کو لازم ہے کہ

اس کا ایجاد مقدور سے متعلق ہونا صحیح ہو پس یہ صفات گرچہ حقیقیہ ہیں مگر ان کو نسبت و اضافات کے لوازم لازم ہیں۔لیکن وہ صفت حقیقیہ جو نسبت و اضافات کے بغیر پائی جاتی ہے وہ ذات باری تعالیٰ کے حق میں اس کی صفت حیات ہے جس کو قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔فلاسفہ کہتے ہیں کہ حی وہ دراک وفعال سے عبارت ہے مگر اہل فہم سے یہ پوشیدہ نہیں کہ دراکیت و فعالیت بھی صفت نسبیہ ہے پس اس معنی کر صفت حی بھی عالم و قادر جیسی صفت ہوگی، متکلمین کہتے ہیں حیات ایسی صفت ہے جس کے اعتبار کرنے سے عالم و قادر ہونا صحیح ہو جاتا ہے ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ حی کا معنی یہ ہے کہ اس کے لئے قادر و عالم ہونا ممتنع نہیں ہے ان دونوں اقوال میں بھی حیات کے معنی میں علم و قدرت کا لازم ہونا ظاہر و باہر ہے۔جب کہ علم و قدرت علیحدہ علیحدہ صفت اور حیات ایک علیحدہ صفت ہے۔

لفظ ''حی'' قرآن حکیم میں کئی مقام پر آیا ہے۔آیت الکرسی میں ہے 'اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' (البقرۃ ۲۵۵) اور ارشاد ہے ''وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ''(طہ ۱۱۱) سورہ غافر میں ہے ''هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ'' (آیت ۶۵) حی کا جو معنی فلاسفہ نے بیان کیا کہ وہ دراک وفعال سے عبارت ہے اور جو دوسری جماعت نے بیان کیا کہ جس کے لئے عالم و قادر ہونا ممتنع نہ ہو، ان دونوں معانی کی بنا پر اس میں رب تعالیٰ کے لئے مدح عظیم کا پہلو نمایاں نہیں ہوتا تو کیا سبب ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اس صفت کو مدح عظیم کی جگہ ذکر فرمایا ہے؟ جواب یہ دیا جاتا ہے تمدح کا اظہار صرف حی سے نہیں ہوتا بلکہ حی و قیوم دونوں صفت کے مجموعہ سے مدح عظیم کا مفہوم ملحوظ ہے کہ قیوم وہ ذات ہے جو اپنے ماسوا سب کی اصلاح کے لئے قائم ہو اور یہ بغیر علم کامل اور قدرت تامہ کے ممکن نہیں چنانچہ حی یعنی وہ جو دراک وفعال ہے اور قیوم جو اپنے ماسوا سب کی اصلاح حال کرنے والا ہے پس حی و قیوم کا معنی یہ ہوگا کہ جو جمیع ممکنات کو خوب خوب جاننے والا، تمام محدثات و ممکنات کو فیض وجود بخشنے والا اور ان سب کو قائم رکھنے والا ہے اس معنی کر اس میں جو مدح باری تعالیٰ ہے وہ پوشیدہ نہیں۔

باب پنجم

صفات اضافیہ پر دلالت کرنے والے اسمائے مبارکہ

تکوین یعنی فعل و خلق و تخلیق وغیرہا اللہ تعالیٰ کی صفات حقیقیہ میں سے ہے یا صفت اضافیہ میں سے ہے اہل سنت و جماعت کے نزدیک در بارۂ صفت تین اقوال ہیں۔

پہلا قول: اشعریہ کا ہے کہ صفات حقیقیہ سات ہیں وہ حیوۃ، علم، قدرت ارادہ، سمع، بصر اور کلام ہیں لیکن تکوین تو وہ

معنی اضافی حادث ہے جوصفت قدرت وصفت ارادہ ہی کی طرف راجع ہے چونکہ ارادۂ الٰہیہ جب کسی شئی کے وجود سے متعلق ہوتا ہے توصفت قدرت الٰہی اس شئی کو پردۂ عدم سے منصۂ شہود پر لے آتی ہے۔

دوسرا قول: حضرت ابومنصور ماتریدی اوران کے متبعین کا ہے۔وہ حضرات کہتے ہیں کہ تکوین ساتوں صفات حقیقیہ کی طرح آٹھویں صفت حقیقیہ ہے کیونکہ قدرت مقدور کے صدور کے لئے صفت مصححہ ہے۔ارادہ اس مقدور کے صدور کے لئے صفت مرجحہ ہے اور تکوین اس مقدور میں صفت مؤثرہ ہے گو کہ متعلقات کے اعتبار سے اس صفت تکوین کا علیحدہ علیحدہ نام ہے اوراس سے موسوم ہے۔چنانچہ اسی صفت کا تعلق جب رزق سے ہوتا ہے اسے ترزیق سے تعبیر کرتے ہیں اور جب حیوۃ سے ہوتا ہے تو اسے احیاء کہتے ہیں علی ھذا القیاس۔

تیسرا قول: ماوراءالنھر کے بعض ائمہ کا ہے انکا نظریہ ہے کہ ترزیق، احیاء وغیرہا سب صفات حقیقیہ ہیں یہ سب کسی ایک صفت کی طرف راجع نہیں ہیں۔اس صورت میں صفات بیشمار ہونگی۔یہی مذہب بعض صوفیہ کا بھی ہے۔

دلائل: حضرت ابومنصور ماتریدی اوران کے متبعین جوتکوین کوصفت حقیقیہ مانتے ہیں وہ اپنے نظریہ کے اثبات میں یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ عقل ونقل سب کا اتفاق ہے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ عالم کا خالق اوراس کا مکون ہے جب اللہ خالق و مکون ہے توصفت خلق وتکوین اس کے ساتھ ضرور قائم ہے چونکہ مشتقات کا حمل بغیر ماخذ اشتقاق کے قیام کے متصور نہیں ہوسکتا ظاہر ہے جس پر اسود، یا عالم جیسے مشتقات کا حمل ہوگا اس کے ساتھ سواد یا علم ضرور قائم ہوگا ورنہ حمل بے معنی اور لغو ہوگا۔اس لئے تکوین صفت حقیقیہ ازلیہ رب تعالیٰ کے لئے ثابت ہے۔

اس کے برخلاف اشاعرہ ومعتزلہ وغیرہم کہتے ہیں کہ تکوین صفت اضافیہ ہے انہوں نے اضافی ہونے پر دلیلیں قائم کی ہیں۔اور قدامت کی نفی کی ہے ان کی ایک دلیل یہ کہ تکوین صفت حقیقیہ کی طرح اگر قدیم ہوجائے تو اس کے قدیم ہونے سے اس کے آثار ومتعلقات کا قدیم ہونا لازم آئے گا اور اگر تکوین حادث ہوتو یہ تکوین دوسری تکوین کی محتاج ہوگی اور پھر دوسری تکوین پر گفتگو جاری ہوگی کہ قدیم ہے کہ حادث، قدیم ہونے کی صورت میں آثار کا قدیم ہونا لازم آئے گا اور حادث ہونے کی صورت میں تیسری تکوین کی محتاج ہوگی اس طرح تسلسل لازم آئے گا۔

پھر جولوگ تکوین کومکون کا عین مانتے ہیں ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے خالق، رازق، محیی، ضار اور نافع ہونے کا معنی نسبت مخصوصہ اور اضافت مخصوصہ سے عبارت ہے اور نسبت مخصوصہ یہ ہے کہ ان اشیاء کے حصول ووجود میں قدرت الٰہیہ کی تاثیر ہے۔لیکن وہ حضرات جوتکوین کومکون کا غیر مانتے ہیں ان کے نزدیک رازق وخالق ہونے کا معنی فقط صفت اضافیہ نہیں ہے بلکہ تکوین ایسی صفت حقیقیہ ہے جوصفت اضافیہ سے موصوف ہے۔

یہاں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ صفات اضافیہ کی کئی قسمیں ہیں:

ایک قسم: ان میں سے اللہ عز شانہ تعالیٰ کا معلوم ہونا، مذکور ہونا، مسبح ہونا، مجد ہونا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے "یا ایھا المسبح بکل لسان" اے وہ ذات جس کی ہر زبان سے تسبیح بیان کی جاتی ہے "یاایھا الممد و ح عند کل انسان" اے وہ ذات جو ہر انسان کے نزدیک ممدوح ہے "یا ایھا المرجوع الیہ فی کل حین و آن" اے وہ ذات جس کی طرف ہر آن اور ہر لمحہ رجوع کیا جاتا ہے وغیرہا اس قسم کے اضافات کا اطلاق غیر متناہی ہے اس لئے اس نوع کی صفات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے اسماء بھی غیر متناہی ہوں گے۔

دوسری قسم: اللہ تعالیٰ کا افعال کا فاعل ہونا ہے یہ بھی صفت اضافیہ محضہ ہے اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اشیاء کی تکوین صفت زائدہ نہیں ہے۔ اس صورت میں افعال کے فاعل ہونے کا دو مطلب ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ مخبر عنہ کا محض موجد ہے دوسرا یہ کہ وہ مخبر عنہ کا فلاں حکمت کے لئے فلاں نوع کا موجد ہے۔ قسم اول یعنی وہ لفظ ہے جو اس کے صرف موجد ہونے کو بتائے اس بارے میں کئی الفاظ ہیں جو تقریباً ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ جیسے الموجد، المحدث، المکون، المنشی، المبدع، المخترع، الصانع، الخالق، الفاطر، الباری یہ دس الفاظ متقاربہ ہیں۔ البتہ ان میں قدرے معنوی فرق ہے۔ الموجد اس کا معنی جو وجود میں مؤثر ہو یعنی اثر ڈالنے والا ہو، المحدث اس کا معنی شئ کو جو موجود کر دے بعد اس کے کہ وہ معدوم تھی۔ یہ ایجاد سے خاص ہے۔ المکون، تقریباً الموجد کے مرادف ہے، المنشئ نشؤ سے مشتق ہے جس کو نمو کہتے ہیں جو علی التدریج تھوڑا تھوڑا نمود دیتا ہے، المبدع وہ ہے جو دفعۃ واحدۃ ایجاد کرے یہ دونوں دو نوع کی طرح ہیں ایک جنس کے تحت، المخترع، مبدع کے قریب المعنی ہے۔ الصانع تقریباً اس اسم پر بولا جاتا ہے جو فعل کو علی سبیل التکلف انجام دے الخالق، تقدیر سے عبارت ہے جو حق تعالیٰ کے حق میں علم کی طرف راجع ہے۔ الفاطر فطر سے ماخوذ ہے شق اور پھاڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ احداث کے مشابہ ہے الباری وہ ہے جو بر بنائے مصلحت شئ کا احداث کرے۔ مندرجہ بالا الفاظ علی العموم باری تعالیٰ کے موجد ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

اب چند ان الفاظ کا ذکر ہے جو بعینہ شئ کے ایجاد کرنے کے اعتبار سے معروف و معلوم ہیں چنانچہ جب وہ ذات کسی نفع بخش چیز کو پیدا فرمائے تو اس شئ کی ایجاد کے اعتبار سے اس کا اسم نافع ہے۔ اور تکلیف دہ شئ کے خلق کی طرف نسبت کرتے ہوئے وہ ضار سے موسوم ہے جب زندگی بخشے اس اعتبار سے محی ہے موت دے اس اعتبار سے ممیت ہے

جب نوازش واکرام سے خاص فرمائے وہ برولطیف ہے جب قہر و جبر نازل کرے اس لحاظ سے قہار و جبار ہے، جب روزی میں قبض وضیق پیدا کردے تو قابض ہے اور جب عطاء وکرم کی بارش کردے تو باسط ہے جب مجرم و بے عمل کو عقاب سے تنبیہ فرمائے تو منتقم ہے لیکن مجرم کو جرم کی سزا نہ دے تو وہ عفو وغفور اور رحمن ورحیم ہے۔ اگر اموال میں قبض وکشاد دونوں پیدا ہو اس اعتبار سے اسکو قابض و باسط سے موسوم کرتے ہیں اور اگر یہی دو باتیں جاہ ومرتبہ میں پائی جائیں تو خافض رافع ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کے مقدورات انواع واجناس کے اعتبار سے غیر متناہی ہیں اس اعتبار سے اسماء الہیہ غیر متناہی ہوں گے۔ اب اس باب میں دو نکتے ذہن نشین رہنے چاہئے۔

نکتہ اولیٰ: تقابل کے احکام منطق وفلسفہ میں گذرے ہیں یہاں اتنا ذہن میں رہنا چاہئے کہ شئ کا مقابل کبھی شئ کی ضد ہوتی ہے اور کبھی اس کا عدم ہوتا ہے پس **المعز**، **المذل** اسی طرح **المحی**، **الممیت** اسماء متقابلہ میں سے ہیں ایک اسم شریف دوسرے اسم شریف کی ضد ہے۔ لیکن القابض، الباسط اسی طرح **الخافض الرافع** کے درمیان جو تقابل ہے وہ تقابل عدم ووجود ہے۔ چنانچہ قبض عبارت ہے اس سے کہ مال کثیر نہ دے اور خفض عبارت ہے کہ جاہ کثیر نہ دے لیکن اعزاز واذلال تو دونوں متضاد ہیں کیونکہ کسی کو عزت نہ دینا اور بات ہے اور ذلیل کرنا اور بات ہے دونوں میں فرق واضح ہے۔

نکتہ ثانیہ: یہ ہے کہ الفاظ مترادفہ کی دلالت اگرچہ مفہوم واحد پر ہوتی ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ مترادف ہوتے ہیں بظاہر ان سب کا معنی ایک ہوتا ہے تاہم تامل تام دلالت کرتا ہے کہ ان الفاظ مترادفہ کے اس معنی میں ہر ہر لفظ کے اعتبار سے دقیق ولطیف فرق ہے اس کی بہت ساری مثالیں ہیں۔ اسکی ایک مثال اسماے باری تعالیٰ میں ''الرؤف الرحیم'' ہے چنانچہ یہ دونوں اسم مبارک تقریبا مرادف ہیں مگر ان دونوں میں لطیف فرق ہے وہ یہ کہ رؤف وہ ہے جو زیادہ ایصال نفع کی طرف مائل بکرم ہو اور رحیم وہ ہے جو زیادہ دفع ضرر کی طرف مائل بکرم ہو۔ اس کی دوسری مثال الفاتح، الفتاح، النافع، النفاع، الواھب، الوھاب، ہے یہ سب الفاظ بظاہر ہم معنی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس میں بھی لطیف فرق ہے وہ یہ کہ فاتح سبب خیر کے احداث کی طرف مشعر ہوتا ہے جب کہ واھب اس خیر کے ایصال کی طرف مشعر ہوتا ہے اسی طرح نافع، ایصال نفع کی خبر کردیتا ہے تاکہ بندہ اس نفع سے منتفع ہوسکے۔ غرضیکہ سارے اسماے مبارکہ کے مابین معنوی اعتبار سے لطیف فرق ہے مگر اس پر آگاہی کے لئے معنوی دقائق اور اس کی باریکیوں سے واقفیت ضروری ہے۔

باب ششم

صفات سلبیہ پر دلالت کرنے والے اسمائے مبارکہ

صفات سلبیہ کے ذکر سے قرآن حکیم کی آیتیں لبریز ہیں، طریق ضبط یہ ہے کہ سلب یا تو ذات کی طرف راجع ہوگا یا صفات کی طرف یا افعال کی طرف، پس جن سوالب کا رجوع ذات کی طرف ہو اس کی مثال ہمارا قول "انه تعالیٰ لیس کذا، ولا کذا" وغیرہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ وہ جوہر نہیں ہے اور نہ جسم ہے نہ مکان میں ہے نہ حیز میں اور نہ حال ہے نہ محل ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ذات باری تعالیٰ دیگر تمام ذاتوں اور صفاتوں سے مخالف ہے اور دیگر تمام ذوات وصفات جو اس کی ذات کے مغائر ہیں سب غیر متناہی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ آخذ کیا جا سکتا ہے کہ سلوب غیر متناہی ہیں قرآن حکیم میں ارشاد ہے "وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ" (محمد ۳۸) "و رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ" (انعام ۱۳۳) ایسی آیات مبارکہ سے بہت واضح ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ اپنی ذات، اپنی صفات حقیقیہ اور صفات سلبیہ وغیرہا میں کسی غیر کا قطعی محتاج نہیں ہے۔ لیکن وہ سلوب جو صفات کی طرف عائد ہیں اس میں یہ امر بدیہی ہے کہ جو صفت نقص وعیب اور شائبہ امکانات کے قبیل سے ہے اس سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ واجب ہے اور نقص وعیب کے صفات میں علم کے اضداد، قدرت کے اضداد، استغناء کے اضداد اور وحدت کے اضداد شامل ہیں پس اضداد علم وغیرہ سے اللہ عز شانہ کا منزہ ہونا واجب ہے۔ اضداد علم کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ان میں سے **اول** اللہ عز شانہ تعالیٰ سے نوم واونگھ کی نفی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" (البقرۃ ۲۵۵) **دوم** نسیان کی نفی ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَمَاكَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا6" (مریم ۶۴) **سوم** جہل کی نفی ارشاد ہے "لَا عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ" غیب جاننے والا اس سے غیب نہیں ذرہ بھر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں (سباء: ۳) **چہارم** بعض معلومات کا علم دوسرے بعض کے علم سے مانع نہیں ہے کیونکہ کوئی شان اس کے کسی شان کے مانع نہیں ہو سکتی۔

وہ سلوب جن کا تعلق صفت قدرت وغیرہا سے ہے ان کی بھی چند قسمیں ہیں:۔

اول یہ کہ وہ اپنے افعال میں تعب ونصب سے منزہ ہے ارشاد ربانی ہے "وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ" اور تکان ہمارے پاس نہ آئی (ق: ۳۸) **دوم** یہ کہ وہ اپنے افعال میں آلات وادوات اسباب وسائل اور تقدم مادہ وزمان کا

محتاج نہیں ہے۔فرمان ربی ہے ''اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ''یعنی جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں ہوجا تو وہ فوراً ہوجاتی ہے (النحل:۴۰) **سوم** یہ کہ اس کے فعل کثیر اور فعل قلیل کے درمیان دربارہ قدرت کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ عزشانہ فرماتا ہے۔ ''وَ مَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ''اور قیامت کا معاملہ نہیں مگر جیسے ایک پلک کا مارنا بلکہ اس سے بھی قریب (النحل ۷۷) **چھارم** یہ کہ انتہاء قدرت اور حصول فقر سے وہ پاک ہے۔فرماتا ہے ''لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ '' بیشک اللہ نے سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی (آل عمران 181)

وہ سلوب جو صفت استغناء کی طرف راجع ہیں ان کی مثال آیت قرآنیہ ''وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ''اور وہ کھلاتا ہے اور کھانے سے پاک ہے (الانعام:۱۴) اور ارشاد ہے ''هُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ''اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا (المؤمنون:۸۸)

وہ سلوب جو صفت وحدت کی طرف راجع ہیں جس میں شرکاء، اضداد اور انداد کی نفی ہے تو ایسی آیتوں سے بھی قرآن کے پارے لبریز ہیں۔رہے وہ سلوب جو افعال کی طرف راجع ہیں جیسے کہ وہ ذات پاک یہ کام نہیں کرسکتی ہے یہ نہیں کرسکتی وغیرہ وغیرہ پس اس سے بھی قرآن حکیم بھرا ہے چنانچہ مندرجہ ذیل آیات اس نظریہ کے قطعی شاہد ہیں۔کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ باطل کا خلق نہیں فرماتا۔ ''وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا '' اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہ بنائے یہ کافروں کا گمان ہے (ص:۲۷) اور مومنین سے حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا ''وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا '' اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اے رب ہمارے تو نے یہ بیکار نہ بنایا (آل عمران:۱۹) ایسے ہی وہ لہو ولعب کا خلق نہیں کرتا۔خود فرماتا ہے ''وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ''اور ہم نے نہ بنائے آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان کھیل کے طور پر، اور ہم نے انہیں نہ بنایا مگر حق کے ساتھ (دخان:۳۸) یونہی وہ عبث و بیکاری کے کام کو خلق کرنے سے بھی پاک ہے۔ارشاد ہے ''اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ''تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار بنایا اور تمہیں ہماری طرف پھرنا نہیں، تو بہت بلندی والا ہے اللہ سچا بادشاہ (المومنون:۱۱۵) وہ کفر سے راضی نہیں ہوتا۔فرماتا ہے ''لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ''(الزمر ۷) وہ ظلم کو پسند

نہیں فرماتا ''وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ'' (البقرہ ۲۰۵) بغیر جرم کے وہ بندوں سے مواخذہ نہیں فرماتا اور نہ ان پر عتاب فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے۔ ''مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ'' اور اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم حق مانو اور ایمان لاؤ (نساء: ۱۴۷) اسی طرح عابدین وشاکرین کے شکر وعبادت سے اس کا کوئی نفع وابستہ نہیں اور مذنبین ومجرمین کے جرم وعصیاں سے اس کو کوئی ضرر لاحق نہیں ہوسکتا چنانچہ فرماتا ہے۔ ''وَاِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ ۖ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا'' اگر تم بھلائی کروگے اپنا بھلا کروگے اور اگر برا کروگے تو اپنا (الاسراء: ۷) اس کے افعال واحکام پر کسی کو کوئی اعتراض کا حق نہیں ارشاد الٰہی ہے ''لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْنَ'' اس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب سے سوال ہوگا (الانبیاء: ۲۳) اور ارشاد ہے ''فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ'' بیشک تمہارا رب جو چاہے کرے۔ (ھود: ۱۰۷) وہ وعد وعید کی خلاف ورزی نہیں کرتا، فرماتا ہے ''مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ'' میرے یہاں بات بدلتی نہیں اور نہ میں بندوں پر ظلم کروں (ق ۲۹)۔

غرض کہ ذات وصفات اور افعال کے اعتبار سے سلوب کی بے شمار قسمیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اعتبار سے بھی اس کے بے شمار بلکہ غیر متناہی اسمائے مبارکہ ہیں ذیل میں بعض اسمائے مبارکہ ذکر کئے جارہے ہیں۔ ان میں سے القدوس ، السلام ہے، قدوس دراصل اس ذات سے عبارت ہے جس کی حقیقت ذات ان ماہیات کے مخالف ہو جو بذاتہا ناقص ہوں اور السلام عبارت ہے اس ذات کا جو ذات نقص کی صفات میں سے کسی سے متصف نہ ہو پس قدوس میں ایسا سلب ہے جو بجانب ذات راجع ہے اور سلام میں ایسا سلب ہے جو بجانب صفات راجع ہے ان اسماء حسنیٰ سے ایک اسم شریف ''العزیز'' ہے اور یہ وہ ہے جس کی کوئی نظیر موجود نہ ہو ان اسماء حسنیٰ سے ایک اسم شریف ''الغفار'' ہے یہ وہ ہے جو خطا کاروں اور مجرمین سے عذاب کو ساقط کردے، ان میں ایک اسم ''الحلیم'' ہے۔ یہ وہ ہے جو عقوبت میں جلدی نہیں فرماتا ہے اور اس کے باوجود ایصال رحمت ونعمت اس سے ممتنع نہیں ہے۔ ان میں ایک اسم مبارک ''الواحد'' ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی حقیقت مخصوصہ میں کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ ہی نظام عالم اور تدبیر احوال عرش میں اس کا کوئی ساتھی ہے بلکہ کائنات کے خلق وتدبیر اور جملہ امور میں وہ یکتا واکیلا ہے ان میں سے ایک اسم شریف ''الغنی'' ہے اور وہ وہ ہے جو حاجات وضرورت سے منزہ ہو۔ ان میں ایک اسم شریف ''الصبور'' ہے جو الحلیم کے قریب المعنیٰ ہے۔ مگر دونوں کے درمیان قدرے فرق بھی ہے۔ پس الصبور وہ ذات ہے جو قدرت کے باوجود اپنے

مجرمین پر عتاب نہ فرمائے اور الحلیم بھی وہ ذات ہے جو قدرت کے باوجود اپنے مجرمین پر عتاب نہ فرمائے مگر اس میں اتنا اضافہ ہے کہ جو مجرمین تک اپنی نعمتوں کے ایصال سے منع نہ کرے ان مثالوں پر بقیہ مثالوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

باب ہفتم

صفات حقیقیہ پر صفات اضافیہ کے ساتھ دلالت کرنے والے اسماء

فصل اول: وہ اسمائے مبارکہ جو صفت قدرت پر دلالت کرتے ہیں کثیر ہیں۔

اول: "القادر" ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ" تم فرماؤ وہ قادر ہے کہ تم پر عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے (نیچے) سے (الانعام ۶۵) سورہ قیامت کے آغاز میں ہے "اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۔ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ" کیا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ہم ہرگز اس کی ہڈیاں جمع نہ فرمائیں گے کیوں نہیں ہم قادر ہیں کہ اس کے پور ٹھیک بنا دیں۔ (القیامۃ: ۳)

دوم: "القدیر" ہے ارشاد ہے "تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرَ ۙ" "بڑی برکت والا ہے وہ جس کے قبضہ میں سارا ملک ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (الملک: ۱) یہ لفظ وصف قادریت میں مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے۔

سوم: "المقتدر" ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا" اور اللہ ہر چیز پر قابو والا ہے۔ (الکھف: ۴۵) اور ارشاد ہے "فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ" سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور (القمر ۵۵)۔

چہارم: "القادرون" اس نے اپنے کو صیغہ جمع سے تعبیر کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ "فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ" پھر ہم نے اندازہ فرمایا تو ہم کیا ہی اچھے قادر ہیں (المرسلات ۲۳)۔ ان اسماء مبارکہ کے علاوہ "اسم" الملک بھی ایک شرط خاص کے ساتھ قدرت کا افادہ کرتا ہے چنانچہ یہ لفظ بھی قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر متعدد وجوہ سے وارد ہوا ہے۔

اول: "المالک" ارشاد ہے "مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" (الفاتحہ ۳)

دوم: "الملک" ارشاد ہے "فَتَعَالَی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ" (المومنون ۱۱۶) اور ارشاد ہے "ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ" (الحشر ۲۳) اور ارشاد ہے "مَلِکِ النَّاسِ" (الناس ۲)۔ یہ خیال رہے کہ قرآن حکیم میں "مالک اور ملک" دونوں آئے ہیں مگر مالک کے بہ نسبت ملک کا ذکر زیادہ ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک کے بہ نسبت ملک (بادشاہ) شان وعظمت کے لحاظ زیادہ ہوتا ہے۔

سوم: مالک الملک :ارشاد ہے "قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ" (ال عمران/26)

چھارم :الملیک: ارشاد ہے "عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ" (القمر ۵۵)

پنجم: الملک: ارشاد ہے "اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ" (الفرقان ۲۶)

: اور ارشاد ہے "لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (الحدید ۲)

لفظ قوت: لفظ قدرت سے قریب المعنی ہے یہ لفظ قرآن حکیم میں کئی طرح مذکور ہے۔

اول: القوی: ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ" (الحج ۷۴)

دوم: ذوالقوۃ: ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوا لْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ" (الذاریات ۵۸)۔

فصل دوم: ان اسماے مبارکہ کے بیان میں جو صفت علم سے متعلق ہیں۔

اول: علم اور اس کے مشتقات، اس میں کئی صورتیں ہیں۔

۱: اللہ عزشانہ تعالیٰ کے لئے علم کا ثبوت۔ ارشاد ہے "وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِنْ عِلْمِہٖ" (البقرۃ ۲۵۵) اور ارشاد ہے "وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ" (فاطر ۱۱) اور ارشاد ہے "وَ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا" (الطلاق: ۱۲) سورہ لقمان میں ہے "اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ" (لقمان: ۳۴)۔

۲: (العالم) ارشاد ہے "عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ" (الرعد ۹)

۳: (العلیم) یہ اسم پاک قرآن حکیم میں بہت مقام پر مذکور ہے۔ "عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ، عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" وغیرہ

۴: (العلام) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ "اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ" (المائدہ ۱۱۶)۔

۵: (الاعلم) ارشاد خداوندی ہے۔ "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَه ط" (الانعام ۱۲۴)۔
۶: صیغہ ماضی میں ارشاد ہے۔ "عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ" (البقرۃ ۱۸۷)۔
۷: صیغہ مستقبل میں ارشاد ہے۔ "وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ" (البقرۃ ۱۹۷)۔ اور ارشاد ہے "وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ" (النحل ۱۹)۔
۸: صیغہ ماضی میں تفعیل سے اس طرح آیا ہے۔ "وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" (البقرۃ ۳۱) اور ملائکہ کے حق میں فرمایا "قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا" (البقرۃ ۳۲)۔ نیز فرمایا "وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" (النساء ۱۱۳) اور فرمایا "اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" (پ ۲۷)۔ یہ سب اطلاقات قرآنیہ ہیں جنکا استعمال رب تعالیٰ کے لئے جائز ہے۔

معلم و علامہ: معلم اور علامہ کا اطلاق رب تعالیٰ کے لئے جائز نہیں ہے۔ اول اس لئے کہ اس میں یک گونہ نقص امکان کا شائبہ ہے اور ثانی یعنی لفظ علامہ کا اطلاق اس لئے درست نہیں ہے کہ یہ مبالغہ سے کدوکوشش سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔

اس نوع کا دوسرا لفظ خبر و خبیر ہے:

دوم: (خبر) یہ علم کے مرادف ہے چنانچہ بعض لوگوں نے علم کی تعریف، خبر سے کی ہے قرآن حکیم میں رب تعالیٰ کے لئے علم کے معنی میں خبر وارد ہوا ہے۔ بہت مقام پر علیم خبیر ارشاد ہے۔
سوم: الشهود و المشاهده ہے اسی سے شہید آیا ہے۔ جب اس کی تفسیر "مشاهد الها عالما بها" سے ہوگی تو رب تعالیٰ کے اسماء سے ہوگا لیکن جب اس کی تفسیر مشاہدہ سے نہیں شہادت سے کی جائے گی تو کلام کی صفت ہوگی۔
چہارم: الحكمة، ہے اس سے کبھی علم مراد لیتے ہیں اور کبھی نا مناسب فعل کا ترک اور مناسب و موافق فعل کا ایجاد کرنا مراد لیتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے "اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ"۔
پنجم: (اللطیف) ہے لطیف سے کبھی دقیق علم مراد لیتے ہیں اور کبھی بندوں تک راز دارانہ طور پر حیرت انگیز طریق سے نعمتوں کا پہنچانا مراد لیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔

فصل سوم: صفت کلام پر دلالت کرنے والے اسمائے مبارکہ

لفظ اول: کلام، جس میں چند وجہیں ہیں کلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ

الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ "اور اے محبوب اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔(التوبۃ:۶) صیغہ ماضی میں کلام کا ذکر اس انداز سے ہوا ارشاد ربانی ہے "وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيماً"(النساء:۱۶۴) اور ارشاد ہے "وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ" (الاعراف ۱۴۳) صیغہ مستقبل سے بھی وارد ہے۔"وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا" اور کسی آدمی کو نہیں پہنچتا کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے طور پر(الشوریٰ:۵۱)۔

لفظ دوم: لفظ قول ہے اس میں بھی چند وجہیں ہیں۔صیغۂ ماضی میں سے متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے ارشاد ہے "وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ" (البقرہ:۲۰) مستقبل کے صیغہ سے ارشاد ہے ۔ "اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ" (البقرۃ:۶۸) قیل وقول سے ارشاد ہے۔"وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلاً"(النساء:۱۲۲)اور فرمان ہے "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ"(ق:۲۹)۔

لفظ سوم: "امر" ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ" (الروم:۴)"اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" (الاعراف:۵۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً"(البقرۃ:۶۷)۔

لفظ چہارم: الوعد، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَعْداً عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ"(التوبۃ۱۱۱)اور ارشاد ہے "ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ"(یونس:۴)۔

لفظ پنجم: وحی ہے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ارشاد ہوا ہے۔فرمایا "وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا"(الشوریٰ۵۱)اور فرمایا "فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى"(النجم:۱۰)

لفظ ششم: شکر ہے اعمال حسنہ کے بدلے جزائے خیر عطا فرمانے کو اللہ عزشانہ تعالیٰ نے شَاكِراً لِعِبَادِهٖ جیسے معزز لفظ سے ارشاد فرمایا چنانچہ ارشاد ہے "فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا"(الاسراء:۱۹)اور فرمان الٰہی ہے "وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِراً عَلِيْماً"(النساء۱۴۷)۔

فصل چہارم: صفت ارادہ اور اس کے ہم معنیٰ الفاظ سے متعلق اسمائے مبارکہ کا بیان

لفظ اول: ارادہ کے بارے میں ارشاد ہے ۔"يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (۱۸۵البقرۃ) یعنی اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔

لفظ دوم: رضا کے بارے میں ارشاد ہے۔"اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ "اور اگر شکر کرو تو اسے تمہارے لئے پسند فرماتا ہے۔ اور اپنے بندوں کی ناشکری اسے پسند نہیں۔(الزمر:۷)اور فرمایا "وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ "(الزمر ۷) اور ارشاد ہے۔"لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" بیشک اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ اس پیڑ کے نیچے تمہاری بیعت کر رہے تھے۔(الفتح:۱۸) سابقین اولین کی صفت کے بارے میں ارشاد فرمایا"رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ"اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی (المجادلۃ:۲۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔"وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى" اور اے میرے رب میں تیری طرف جلدی کر کے حاضر ہوا کہ تو راضی ہو۔(طہ:۸۴)

لفظ سوم: لفظ محبت ہے ارشاد ہے"فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ"یعنی اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ اللہ کے پیارے اور اللہ ان کا پیارا (المائدۃ ۵۴) اور فرمان ہے"وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ"اور اللہ پسند رکھتا ہے ستھروں کو۔(البقرۃ:۲۲۲)

لفظ چہارم: کراہت ہے ارشاد ہے"كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا" یہ جو کچھ گذرا ان میں کی بری بات تیرے رب کو ناپسند ہے (الاسراء:۳۸) اور فرمان ہے "وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ" مگر خدا ہی کو انکا اٹھنا ناپسند ہوا تو ان میں کاہلی بھر دی (التوبۃ:۴۶) اشعریہ کا قول یہ ہے کہ کراہت کا معنی یہ ہے کہ فعل کے کرنے کا ارادہ نہ کرے۔لیکن معتزلہ کہتے ہیں کہ کراہت صفت ارادہ سے علیحدہ ایک صفت ہے وھو تعالیٰ اعلم۔

فصل پنجم: صفت سمع وبصر سے متعلق اسمائے مبارکہ کا بیان

صفت سمع وبصر سے متعلق اسمائے مبارکہ کا ذکر قرآن حکیم میں بہت مقام پر آیا ہے۔ارشاد ہے"لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ"(الشوریٰ:۱۱) اور ارشاد ہے" لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ "(الاسراء:۱) ارشاد پروردگار ہے"اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى "(طہ:۴۶)اور فرمایا 'لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ"(مریم:۴۲)اور فرمان ہے"لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ"(انعام:۱۰۳)۔

مندرجہ بالا مختصر گفتگو صفت حقیقیہ واضافیہ سے متعلق تھی اب ذیل میں صفات اضافیہ کے ساتھ سلبیہ کا بیان ملاحظہ کیجئے۔

فصل ششم: صفات اضافیہ کا سلبیہ کے ساتھ بیان

صفات اضافیہ مع سلبیہ میں سے ''الاول'' ہے اول وہ ہے جو اپنے غیر پر سابق ہو اور کوئی غیر اس پر سابق نہ ہو۔ پس اس کا غیر پر سابق ہونا اضافت ہے اور ہمارا یہ کہنا کہ اس پر کوئی سابق نہیں ہے سلب ہے اس معنی کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ لفظ اول اضافت وسلب کے مجموعہ مرکب سے حاصل معنی کا افادہ کرتا ہے۔ اسی طرح لفظ ''الآخر'' کا حال ہے کہ وہ صفات اضافیہ مع سلبیہ سے ہے کہ آخر وہ ہے جو اپنے غیر کے بعد بھی باقی وقائم رہے اور اس کے بعد کوئی غیر باقی نہ رہے۔ البتہ لفظ ''الظاہر'' تو وہ اضافت محضہ ہے اس لئے کہ اس کا معنی ہوتا ہے دلائل کے اعتبار سے اس کا ظاہر ہونا، رہا لفظ ''الباطن'' تو وہ سلب محض ہے اس لئے کہ اس کا معنی ہے اس کا ماہیت وحقیقت کے اعتبار سے مخفی ہونا۔

صفات اضافیہ مع سلبیہ میں سے ''القیوم'' ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں مبالغہ پر دلالت کرتا ہے اور یہ مبالغہ دو امر کے اجتماع کے وقت حاصل ہوتا ہے ایک یہ کہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور یہ اس لئے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں واجب الوجود ہے دوسرا یہ کہ اس کے ماسوا سب اپنی ذوات وصفات میں اسی کی طرف محتاج ہیں یعنی وہ اپنے سوا سب کا مبدأ ہے۔ پس اول سلب ہے اور دوم اضافت ہے اور دونوں کا مجموعہ قیوم ہے۔

فصل ہفتم: ذات، صفات حقیقیہ اضافیہ اور سلبیہ پر دلالت کرنے والے اسمائے مبارکہ کا بیان

ان اسماء میں ''الاالہ'' ہے جو ذات، صفت حقیقیہ، اضافیہ اور سلبیہ سب کا افادہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہ اسم اس کے موجود ہونے پر، اور اس وجود کی کیفیات یعنی ازلی، ابدی اور واجب الوجود ہونے پر دال ہے۔ اور صفات سلبیہ پر بھی دال ہے جو تنزیہہ پر دال ہے اسی طرح صفات اضافیہ پر بھی دلالت کرتا ہے جو ایجاد وتکوین پر دلالت کرتے ہیں۔ اس میں اختلاف یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق غیر اللہ پر درست ہے یا نہیں بہت لوگوں نے غیر اللہ کے لئے عام مانا ہے، کفار قریش اپنے بتوں کے لئے اس لفظ کا استعمال کرتے تھے۔ نیز بعض اذکار میں بھی آیا ہے جیسے یا الہ الالھۃ لیکن امام رازی وغیرہ نے غیر پر اس لفظ کے اطلاق کو بعید قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ دین اسلام میں اس کا استعمال غیر پر جائز نہیں ہے رہا اسم جلالت لفظ اللہ تو اس کا تفصیلی بیان انشاء اللہ عنقریب آئے گا۔

فصل ہشتم: ان اسماء کا بیان جن میں عقلاء کا اختلاف ہے کہ **اسمائے ذات سے ہیں یا اسمائے صفات سے**

یہ اختلاف اہل تنزیہہ اور اہل تشبیہ کے درمیان ایک بنیادی اختلاف کا شاخسانہ ہے۔ اہل تشبیہ کا گمراہ کن عقیدہ یہ

ہے کہ جو موجود ہوگا وہ یا تو متحیز ہوگا یا متحیز میں حال ہوگا لیکن جو نہ متحیز ہو اور نہ متحیز میں حال ہو تو وہ دونوں قسموں سے خارج ہوگا لہذا وہ عدم محض ہوگا۔

اس کے برخلاف اہل توحید و تقدیس کہتے ہیں متحیز منقسم ہوتا ہے اور ہر منقسم محتاج ہوتا ہے پس ہر متحیز کا محتاج ہونا ضروری ہے لیکن جو محتاج نہ ہو اس کا متحیز ہونا بھی ممتنع ہوگا اسی طرح جو کسی متحیز میں حال ہوگا وہ بدرجہ اولیٰ محتاج ہوگا اس لئے واجب الوجود لذاتہ کا متحیز ہونا یا متحیز میں حال ہونا دونوں ممتنع ہے۔ رہے وہ الفاظ جن کا ظاہر جسمیت یا حیز و مکان میں حلول کی طرف مشعر ہے تو وہ صحیح تاویل کی طرف راجع ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ **عظیم** ہے اس کو دیکھتے ہوئے اہل تشبیہ نے کہا کہ اس کی ذات حجمیت و مقدار میں عرش سے اور ہر اس چیز سے جو عرش کے نیچے ہے بڑی ہے۔ اسی میں سے ایک لفظ **کبیر** ہے اور اس سے جو مشتق الفاظ ہیں اور وہ لفظ **اکبر**، لفظ کبریاء، اور لفظ متکبر ہے۔ ان دونوں الفاظ کے درمیان فرق چندہ وجوہ سے ہے۔

اول: یہ کہ اخبار الٰہیہ میں وارد ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "الکبریاء ردائی و العظمۃ ازاری" اس حدیث پاک میں کبریاء کو رداء کے قائمقام فرمایا گیا اور عظمت کو ازار کے قائمقام فرمایا اور یہ معلوم کہ رداء بہ نسبت ازار کے مرتبہ میں بلند تر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صفت کبریاء صفت عظمت سے کہیں ارفع ہے۔

دوم: شریعت نے دونوں حال کے درمیان فرق کیا ہے چنانچہ تکبیر تحریمہ میں "**اللہ اکبر**" کہنا معتاد و متوارث و ماثور تو ہے لیکن **اللہ اعظم** کہنا معتاد و متوارث نہیں ہے جس سے ظاہر ہے کہ صفت کبریاء، صفت عظمت سے بڑھ کر ہے۔

سوم: یہ کہ کبیر سے جو الفاظ مشتق ہیں وہ سب شان الٰہی کے لئے وارد ہیں مثال کے طور پر اکبر، متکبر وغیرہا، برخلاف عظیم کے کہ متعظم مذکور نہیں ہے۔ البتہ دونوں لفظوں میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ میں ذکر فرمایا ہے ارشاد ہے۔ "**وَ لَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ**" اور اسے بھاری نہیں ان کی نگہبانی اور وہی ہے بلند بڑائی والا (البقرۃ:۲۵۵) اور دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ "**حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَا ذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ**" یہاں تک کہ جب اذن دے کر ان کے دلوں کی گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے ایک دوسرے سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا یہی بات فرمائی وہ کہتے ہیں جو فرمایا حق فرمایا اور وہی ہے بلند بڑائی والا (سبا: ۲۳) ان دونوں آیتوں میں "**العلی**" کے ساتھ ایک جگہ "**الکبیر**" ارشاد ہے اور دوسری جگہ "**العلی**"

کے ساتھ "**العظیم**" مذکور ہے جس کا مفاد یہ کہ کبیر و عظیم میں کوئی فرق نہیں ہے جبکہ گذشتہ وجوہ سے دونوں کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ پس اس عقدہ کشائی کے لئے ذیل میں ایک قیمتی بحث مذکور ہے۔ وہ یہ کہ کبیر وہ ذات ہے جو بذات خود کبیر ہو دوسرے اس کو کبیر سمجھیں نہ سمجھیں بلفظ دیگر وہ ذات جو صفت کبریائی سے متصف ہو خواہ اس صفت کا عرفان دوسروں کو ہو نہ ہو۔ اس کے برعکس صفت عظمت یہ ہے کہ وہ صفت ایسی ہو کہ دوسرے اس کو عظیم سمجھیں غرض صفت کبریاء ذاتی ہے اور صفت عظمت عرضی ہے اور ذاتی، عرضی سے اعلیٰ و اشرف ہوتی ہے۔ "**وھو تعالیٰ اعلم بالصواب والیہ اتوب وانیب**"۔

مجسمہ و مشبہ وغیرہا فرق ضالہ نے جسمیت و جہت کا نظریہ باطلہ جن الفاظ کو دیکھ کر قائم کیا ان میں سے ایک لفظ **علو** ہے۔ جس سے **العلی**، **الاعلیٰ** اور **المتعالی** وغیرہا مشتق ہیں اور یہ سب الفاظ قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۵۵ پر "**العلی**" ارشاد ہے۔ سورہ اعلیٰ میں ہے "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَىَ" اللہ عز شانہ تعالیٰ کے اسم مبارک کے بعد لفظ "تعالیٰ" کا استعمال اجماعی ہے سورہ نحل میں ارشاد ربانی ہے "ط سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" (النحل:۱) ان الفاظ متعالیہ کے ظاہر کو دیکھ کر مشبہ و مجسمہ نے رب تعالیٰ کو جہت و مکان میں ہونا قرار دیا چنانچہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے علو ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ جہت فوق میں موجود ہے پھر بعض نے کہا وہ عرش پہ جلوس فرمائے ہے بعض نے کہا کہ وہ بعد متناہی کے ساتھ عرش کے مبائن ہے۔ اور بعض دوسرے نے کہا کہ وہ بعد غیر متناہی کے ساتھ عرش کے مبائن ہے اس کے برخلاف اہل تقدیس و تنزیہہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ جہت مکان حیز وغیرہ شائبہ امکانات سے منزہ ہے رہے وہ الفاظ جن سے جہت و جسمیت کی طرف اشارہ ہے تو اس کی صحیح تاویل ہے جو چند وجہوں پر مشتمل ہے۔

وجہ اول: معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مدت وجود کے اعتبار سے عظیم ہے اور وہ اس لئے کہ وہ ازلی و ابدی ہے اور ازلی و ابدی ہونا، وجود، بقاء اور دوام میں عظمت و کبریائی کی انتہاء ہے۔

وجہ دوم: معنی یہ ہے کہ وہ علم و عمل میں عظیم ہے۔

وجہ سوم: معنی یہ ہے کہ وہ رحمت و حکمت میں عظیم ہے۔

وجہ چہارم: معنی یہ ہے کہ وہ کمال قدرت میں عظیم ہے۔

یہ تاویل لفظ عظیم کی ہے اور لفظ علو کا مفہوم اہل تنزیہہ کے نزدیک یہ ہے اللہ شانہ تعالیٰ، صفات نقائص و حاجات سے منزہ ہے مختصر یہ کہ **العظیم والکبیر** مشبہ کے نزدیک اسمائے ذات سے ہیں لیکن اہل توحید کے نزدیک

اسمائے صفات سے ہیں ہاں اسم "العلی" ہر ایک کے نزدیک اسمائے صفات سے ہی ہے مگر مشبہ کہتے ہیں کہ وہ ذات حیز یعنی علو اعلیٰ میں موجود ہے۔ اور اہل حق کے نزدیک "العلی" کا معنی یہ ہے کہ اللہ ہر اس چیز سے پاک ہے جو الوہیت کے شایان شان نہیں۔

فصل نہم: ان اسمائے مبارکہ کا بیان جو اسمائے مضمرہ سے ہیں

اسماء مضمرہ تین ہیں "انا" (میں)، "انت" (تو) اور "ھو" (وہ) ان تینوں میں سب سے زیادہ معرفت لفظ "انا" سے ہوتی ہے چونکہ لفظ انا سے ذات وشخص خود اپنی طرف اشارہ کرتا ہے اور ہر ایک کے نزدیک اعرف المعارف خود شخص کی ذات ہوتی ہے پھر ان اقسام میں سے درمیانی مرتبہ "انت" کو حاصل ہے کہ اس سے غیر کو خطاب کیا جاتا ہے جب کہ غیر، موجود وحاضر ہو پس اس وجہ سے کہ یہ غیر سے خطاب کے لئے آتا ہے لفظ "انا" سے کم درجہ ہے مگر اس حیثیت سے کہ مخاطب کا موجود وحاضر ہونا شرط ہے "ھو" سے برتر ہے اس تقریر سے یہ ظاہر ہے کہ تینوں میں اعلیٰ و افضل "انا" ہے۔ درمیانی رتبہ والا "انت" ہے اور "ھو" ان سب میں ادنیٰ ہے۔

واضح رہے کہ یہ فرق نحویوں کے استعمال کے اعتبار سے غیر اللہ پر اطلاق کے وقت ہوگا مگر جب "انا"، "انت" اور "ھو" سے ذات باری تعالیٰ مراد ہو تو اعلیٰ واوسط اور ادنیٰ کا کوئی لحاظ نہ ہوگا کہ وہ ذات ازلا و ابدا اعلیٰ واکبر ہی ہے وہاں ادنیٰ واوسط کا گذر نہیں ہے۔

ان تینوں کلمات ضمائر کا استعمال قرآن حکیم میں ہوا ہے۔ لفظ "انا" کے لئے ارشاد ہے "اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا" ڈر سناؤ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں (النحل:۲) "اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ" بیشک میں ہی ہوں اللہ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری بندگی کر (طہ:۱۴) لفظ "انت" کے بارے میں یہ ارشاد ہے۔ "فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ" تو اندھیریوں میں پکارا کوئی معبود نہیں سوا تیرے (الانبیاء:۸۷) اور لفظ "ھو" کے ساتھ بیشمار مقامات پر ارشاد ہے۔ اول سورہ بقرہ میں سے "وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا مہربان (البقرۃ: ۱۶۳) سورہ مزمل میں ہے "رَبُّ الْمَشْرِقِ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا" وہ پورب کا رب اور پچھم کا رب اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم اسی کو اپنا کارساز بناؤ (المزمل:۹)۔

ان تینوں قسموں کے احکام درج ذیل ہیں:

ارشاد باری تعالیٰ "لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا" کا تکلم اللہ عزشانہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا یا جو اللہ عزشانہ کی طرف سے بطور حکایت بیان کرے۔ اس کو اجازت ہے وجہ یہ کہ یہ کلمہ اس کے قائل کے لئے الوہیت کے اثبات کا متقاضی ہے اور یہ اللہ عزشانہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لئے لائق نہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس کلمہ کی معرفت لفظ "انا" کی معرفت پر موقوف ہے اور یہ معرفت کامل طور پر صرف حق سبحانہ تعالیٰ کو حاصل ہے کیونکہ ہر شخص کو اپنی ذات کا علم دوسرے سے زیادہ حاصل ہے بالخصوص ذات باری تعالیٰ کہ اس کو جب تمام اغیار کا علم کامل ہے تو ظاہر ہے کہ اپنی ذات کا علم بھی اکمل ہوگا پس اس سے ثابت کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا" کا علم تام اور کامل صرف حق تعالیٰ کو ہے۔

رہا دوسرا درجہ اور وہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ" ہے اس کا حکم یہ ہے کہ بندہ کی طرف سے اسکا تکلم درست ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ بندہ مکمل حاضر ہو غائب نہ ہو لیکن اس حالت حضوری کا حصول ہر شخص کو میسر نہیں ہوتا اس کا اتفاق اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کو حاصل ہوا جب آپ نفس کے تمام حظوظ وخواہشات سے الگ ہو گئے (غائب) جس سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان جب تک نفس کے تمام خواہشات سے دور نہ ہو جائے مقام مشاہدہ پر فائز نہیں ہوسکتا۔ تیسرا درجہ "ھو" کا ہے جو "لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ" میں مذکور ہے یہ ذکر ہر غائبین کی طرف سے درست ہے۔

خیال رہے کہ قرب و بعد، کمال تجلی، اور قلت تجلیات کے لحاظ سے حضوری کے مختلف درجات ہیں۔ درجہ کاملہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہر درجہ ناقص ہے اور جب حضوری کے درجات غیر متناہی ہیں تو کمالات ونقصانات کے درجات ومراتب بھی غیر متناہی ہوں گے غرض غیبت وحضور کے درجات غیر متناہی ہیں پس اگر کسی پر ایک اعتبار سے صادق آتا ہے کہ وہ حاضر ہے تو اسی پر دوسرے اعتبار سے صادق آتا ہے کہ وہ غائب ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

ایاغائبا حاضرا فی الفواد

سلام علی الغائب الحاضر

شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی الجیلانی جانشین محدث اعظم ہند کچھوچھہ شریف نے اپنے مدحیہ کلام میں کہا:

ہر ہر ذرہ سے نمایاں ہے مگر پنہاں ہے — میرے معبود تیری پردہ نشینی ہے عجیب

دور اتنا کہ تخیل کی رسائی ہو محال — قربت کا یہ عالم کہ رگ جاں سے قریب

طریقت کے مشہور بزرگ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حاضرین نے "لا الہ الا اللہ" پڑھنے کو کہا تو آپ نے فرمایا۔

کل بیت أنت حاضرہ غیر محتاج الی السرج

یعنی ہر گھر میں تیرا جلوہ ہے چراغ کی حاجت نہیں ہے

وجھک المامول حجتنا یوم یاتی الناس با لحجج

یعنی امید کا مرکز تیرا وجہ کریم ہمارے لئے اس دن حجت ہے جب لوگ اپنی حجتیں لے کر آئیں گے۔

لفظ "ھو" گرچہ بہت مختصر ہے مگر اس میں عجیب وغریب اسرار پنہاں ہیں سب کا بیان ناممکن ہے بعض اسرار ورموز ذیل میں مذکور ہیں

(۱) آدمی جب "یا ھو" کا ورد کرتا ہے تو گویا یہ کہتا ہے "من انا حتیٰ اعرفک، ومن انا حتی أکون مخاطباً لک، وما للتراب ورب الارباب، ای مناسبة بین المتولد عن النطفة والدم وبین الموصوف بالازلیة والقدم"۔ یعنی میری کیا حیثیت کہ میں پہچانوں تجھے، اور میں کون ہوں کہ تجھ سے خطاب کروں، مٹی اور رب الارباب کے درمیان کیا مناسبت، یعنی جو نطفہ وخون سے پیدا شدہ ہے اس کو ازلیت وقدم سے متصف ذات سے کیا مناسبت کہ تو اعلیٰ ہے تمام مناسبات سے اور تو عقول وخیالات کے علائق سے پاک ہے۔ اسی سبب سے بندہ جب اسکو خطاب کرتا ہے تو غائبین کے خطاب سے خطاب کرتا ہے۔ تو کہتا ہے "یاھو"۔

(۲) بندہ جب اس لفظ کا تکلم کرتا ہے تو گویا اپنے آپ کو معدوم محض یا خسیس ترین شئ تصور کرتا ہے بلکہ جملہ ماسوی اللہ کے معدوم محض کا اقرار کرتا ہے۔ چونکہ جب وہ "یا ھو" کہتا ہے تو حکم لگاتا ہے کہ اللہ کے ماسوا سب معدوم محض اور نفی صرف ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "کُلُّ شَیءٍ ھَالِکٌ اِلّا وَجْھَہٗ" فنا کے یہ دونوں مقامات نہایت ہی عظیم وجلیل ہیں کہ جو اپنی ذات کو فناء کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ایسا بلند کر دیتا ہے کہ ثریا کی رفعت اس پر رشک کرتی ہے مگر یہ اسی کو حاصل ہوتا ہے جو ذکر الٰہی "یاھو" پر مداومت کرتا ہے۔

(۳) بندہ جب اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت وشئ کا ذکر کرتا ہے تو اس کو معرفت الٰہی میں کمال استغراق پیدا نہیں ہوتا مثال کے طور پر جب بندہ "یا رحمن" کہتا ہے تو اس وقت اس کی رحمت کا تذکرہ کرتا ہے اس وقت بندہ کا ذہن رحمت الٰہی کی طلب کی طرف مائل ہو جائے گا پس وہ بھی رحمت الٰہی میں اپنے حصہ کا طالب ہوگا، یونہی بندہ جب "یا

کریم''، ''یامحسن''، ''یا غفار''، ''یا وہاب''، ''یا فتاح'' جیسے اذکار عالیہ وصفات الہیہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے کرم ونوازش، غفران وعطا وغیرہا کی طرف ذاکر کا میلان طبع ہوجاتا ہے۔ پس وہ ذاکر بھی کرم وعطا میں اپنے حصہ کا طلب گار ہوگا اسی طرح تمام اسماء کا حال ہے۔ مگر جب بندہ ''یا ھو'' کا ذکر کرتا ہے تو اس وقت اس کو صرف ذات کی معرفت ہوتی ہے۔ چونکہ اس ذکر میں ذات کے علاوہ کسی غیر کی طرف توجہ نہیں جاتی ذکر کرتے کرتے ذاکر کا قلب ذکر الٰہی کے نور سے منور ومجلیٰ ہوجاتا ہے اور جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ نور قلب سے آفاق جہاں کا مشاہدہ کرلیتا ہے اور کوئی حجاب اس کے آڑے نہیں آتا۔

(۴) اللہ عزشانہ تعالیٰ کی جو صفات بندوں کے علم میں ہیں وہ دو طرح کی ہیں صفات جلال، صفات اکرام، صفات جلال کی مثال ہمارا قول، ''لیس بجسم'' وہ جسم نہیں ہے۔ ''ولا بجوھر'' نہ جوہر ہے نہ مکان میں ہے نہ محل میں ہے وغیرہا۔

اعتراض: یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کوئی شخص سلطان سے خطاب کرے اور کہے آپ اندھے نہیں ہیں آپ گونگے بہرے نہیں ہیں وغیرہا معائب ونقائص شمار کرکے بادشاہ سے اس کی نفی کرے تو ایسا شخص زجر وتوبیخ اور تادیب کا مستحق ہے کہ اس نے اسن معائب ونقائص کی نفی کرکے بادشاہ کی تعظیم نہیں بلکہ گستاخی وبے ادبی کی ہے۔ اور رہے صفات اکرام جیسے اسکا تمام مخلوقات کا خالق ہونا اور تمام مخلوقات کو اکمل واحسن نظام سے مرتب کرنا وغیرہا تو صفات اکرام میں بھی دو طرح سے اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں۔

اول: اعتراض کی تقریر اس طرح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خالق کا کمال، مخلوق کے کمال سے ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ غیر متناہی مراتب ودرجات سے اجل واعلیٰ ہے پس جب ہم اللہ عزشانہ تعالیٰ کی صفات کمال وجلال کی تعریف، مخلوقات کے توسط سے کریں اور کہیں کہ وہ ایسی ایسی عظیم ترین مخلوقات کا خالق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے خالق کائنات کے کمالات کی تعریف کے لئے مخلوقات کے کمال کو شرح وبیان اور معرف کا درجہ دے دیا اور اس میں شک نہیں کہ یہ سوء ادب ہے۔

دوم: جو آدمی سلطان قاہر کی اس طرح تعریف کرے کہ اس نے فلاں فقیر کو ایک روٹی کا ٹکڑا یا ایک قطرہ پانی دیا ہے ایسا شخص بادشاہ کے عتاب میں گرفتار ہوگا کہ اس نے بادشاہ کی توہین کی ہے بلاتشبیہ وتمثیل یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ قادر مطلق تو جمیع مخلوقات عرش سے لیکر کائنات کے آخری ذرہ کا مالک ہے سب اس کے خزانۂ قدرت میں ہے وہ بندوں کو جو بھی عطا

کرے اس کی غیر متناہی قدرت کے پیش نظر اس کی حیثیت ایک ٹکڑا روٹی سے زیادہ نہیں ہے جب دنیاوی مجازی بادشاہ کے لئے ایک ٹکڑا روٹی کا ذکر سوء ادبی ہے تو خالق کائنات قادر مطلق کی طرف نسبت کرتے ہوئے ضرور بے ادبی ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ دونوں مذکورہ طریقوں سے رب تعالیٰ کی حمد وثنا نامناسب ہے۔

جواب: مذکورہ دونوں طریقوں سے رب تعالیٰ کی مدح وثنا کرنے کی رخصت اس طور پر ہوسکتی ہے۔

انسان کا نفس، عالم حس وخیال میں مستغرق رہتا ہے جب آدمی اپنے نفس کو عالم قدس کے آستانہ سے جذب کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو ضرورت ہوتی ہے کہ بارگاہ قدس کے جلال وکمال سے اپنے نفس کو آگاہ کرے اور کمال قدرت اور جلال الٰہی سے نفس کو آگاہ کرنے کی یہی صورت ہے کہ بندہ صفات اکرام وصفات جلال سے حمد وثنا بیان کرے جب ان دونوں صفات کے ذریعہ ذکر پر مواظبت کرتے کرتے بندہ کا نفس ایسا پاکیزہ ہوجاتا ہے کہ عالم مشاہد ودنیائے حس و خیال سے نفس کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور بارگاہ قدس کے مراتب عالیہ کی اس کو آگاہی ہوجاتی ہے جب نفس قرب کے اس مقام پر پہنچتا ہے تو ان دونوں طریقوں سے مدح وثناء بیان کرنے میں جو اعتراضات وارد ہوئے نفس پر عیاں ہوجاتے ہیں اس وقت بندہ اذکار کے مذکورہ طریقوں کو چھوڑ دیتا ہے اور "یاھو" کا ذکر کرتا ہے۔ گویا بندہ یہ کہتا ہے کہ تیری بارگاہ قدس اس سے بلند تر ہے کہ میں تیری تعریف تجھ سے مخلوقات کے نقائص کے سلب سے یا مخلوقات کے کمالات کو تیری طرف منسوب کرکے کروں کیونکہ تیرا کمال وہم وخیال سے بلند تر اور تیری جلالت شان، فکر ونظر سے بزرگ تر ہے میں تو تیری تعریف تیری ذات کے حوالہ سے کروں گا اور کہونگا "یاھو" حتی کہ میں تجھے لفظ "انت" سے بھی خطاب نہ کروں گا کہ اس میں بھی حامدین کی بڑائی ظاہر ہوتی ہے بلکہ میں "ھو" سے زیادہ کوئی کلمہ نہیں کہونگا تاکہ اقرار اور دلیل ہوجائے کہ کہ مادح، ممدوح کی لذاتہ، بذاتہ مدح کررہا ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوجائے کہ حضرت قدس، حضور مخلوقات کی مناسبت سے بے نیاز ہے۔

اس مختصر تقریر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کلمہ "ھو" میں تجلیات ومکاشفات کے مقام میں کس قدر اسرار الٰہیہ پنہاں ہیں پس جو ان اسرار پر آگاہ ہوجائے اس کے لئے یقیناً یہ ذکر اشرف الاذکار ہے چنانچہ بعض بزرگوں کا دیکھا سنا واقعہ ہے کہ ھو ھو کی لذت آشنائی میں انہوں نے اپنی زندگی فنا کردی۔

(۵) اس ذکر "یا ھو" پر جو مواظبت اور ہمیشگی کرتا ہے یہ ذکر شوق الی اللہ میں اضافہ کرتا ہے اور شوق الی اللہ تمام مقامات میں سب سے لذت آفریں اور بہجت وسرور کا باعث ہوتا ہے۔ اس ذکر سے شوق الی اللہ کا اضافہ اس طرح ہوتا

ہے کہ کلمہ ھوضمیر غائب ہے جب بندہ اس کلمہ سے رب تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ حق سے غائب ہے۔ پھر بندہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ غیبت مکان و جہت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ غیبت اس لئے لاحق ہوئی کہ بندہ حدوث وامکان کے نقائص سے متصف، اور احاطہ مکان وزمان کے عیوب سے معیوب ہے جب عقل اس راز پر متنبہ ہوجاتی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ تمام ممکنات ومحدثات میں یہ عیوب و نقائص پائے جاتے ہیں تو یہ یقین کرلیتی ہے کہ جملہ محدثات و ایجادات حق سبحانہ وتعالیٰ کے علومرتبہ سے غائب ہیں اور عقل یہ جانتی ہے کہ یہ غیبت نقصان وکمال اور حاجت واستغناء میں فرق کے سبب حاصل ہوئی اس وقت عقل کو اس بات کا اعتقاد جازم ہوجاتا ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ گوناگوں ایسے کمالات سے متصف ہے جو محدثات وامکانات کے کمالات کی مشابہات سے منزہ اور پاک ہے جب اس کے کمالات ایسے بلند وبالا ہیں تو اسکا تصور فکر وخیال اور عقل ونظر کے تصور سے غائب ہوگا البتہ کمالات عالیہ میں سے کچھ کا من وجہ ادراک ہوگا اور کچھ کا من وجہ ادراک نہ ہوگا جب بندۂ ذاکر کو بعض وجوہ سے قدرے کمالات کا شعور ہوگیا تو مزید وہ کمالات کے درجات ومراتب تک رسائی کے لئے کوشاں رہے گا اور اس کے شعور وآگاہی کے لئے اس کے شوق میں روز افزوں ترقی ہوگی۔ اور جب درجات ومراتب غیر متناہی ہیں تو اس کے شوق کے درجات بھی غیر متناہی ہوں گے اور چونکہ بندہ مرتبہ اسہل سے مرتبہ اعلیٰ تک وصول کے شوق میں سرگرداں ہے تو اس کا شوق ہر لمحہ اقوی واکمل ہوگا۔ بہرحال اس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ لفظ ''ھو'' شوق الی اللہ کا افادہ کرتا ہے۔ رہا یہ امر کہ شوق الی اللہ تمام مقامات میں اعظم ہے وہ اس لئے کہ شوق الی اللہ، آلام ومصائب اور پے در پے لذات دونوں کے حصول کا افادہ کرتا ہے چونکہ جس قدر وصول ہوتا ہے بندہ کو اتنی ہی لذت ہوتی ہے اور جب وصول میں رکاوٹ ہوجاتی ہے تو بندہ آلام میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ پھر جب قرب الٰہی کی لذت کا شعور ہوتا ہے تو وصال کی تڑپ میں جو الم پیدا ہوا تھا وہ زائل ہوجاتا ہے اور مزید بہجت وسرور پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لئے جو مسرت وشادمانی کے وصال کی منزلیں حاصل کرنا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ اس ذکر پر مداومت کرے۔

(۶) اس ذکر مبارک کی جلالت شان کی شرح طویل ہے۔ مختصراً ذیل میں مذکور ہے۔ مگر اس کے لئے پہلے دو مقدمہ کی تمہید ضروری ہے۔

مقدمہ اولیٰ: علم کی دو قسمیں بہت مشہور ہیں تصور وتصدیق۔

تصور: یہ ہے کہ نفس میں شئی کی صورت حاصل ہو مگر یہ کہ نفس اس پر کوئی قطعی حکم وجودی وعدمی کا نہ لگائے۔

تصدیق: یہ ہے کہ نفس میں شئ کی مخصوص صورت حاصل ہو نیز اس پر نفس کسی شئ کے وجود یا عدم کا حکم بھی لگائے۔

تصور و تصدیق کی معرفت کے بعد یہ سمجھنا چاہئے کہ تصور مقام توحید ہے اور تصدیق مقام تکثیر ہے۔

مقدمہ ثانیہ: پھر تصور کی دو قسمیں ہیں ایک وہ تصور جس میں عقل تصرف کرنے پر قادر ہے۔ دوسرا وہ تصور جس میں عقل تصرف نہیں کر سکتی۔

تصور کی قسم اول وہ ماہیات مرکبہ کا تصور ہے بیشک ماہیات مرکبہ کا تصور، اس مرکب کے اجزاء کی ماہیت کے استحضار کے واسطہ کے بغیر ممکن نہیں ہوتا ہے اس تصرف کو عمل و فکر کہتے ہیں اور یہ بعض وجوہ سے تصرف ہے لیکن تصور کی قسم دوم تو اس میں ان ماہیات بسیطہ کا تصور ہوتا ہے جو ترکیبات کی تمام جہتوں سے منزہ ہوتی ہیں اس تصور میں انسان کے لئے کوئی ایسے عمل کا تصور ممکن نہیں جو اس ماہیت کے استحضار کا وسیلہ ہو اس تفصیل سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تصدیق مقام تکثیر میں قائم ہے نسبت کرتے ہوئے تصور کی طرف اور تصور توحید ہے نسبت کرتے ہوئے تصدیق کی طرف، نیز یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماہیت بسیطہ کا تصور ہی انتہائی توحید ہے اور کثرت سے بعید ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھنا چاہئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے ذکر میں ہمارا "**یا ھو**" کہنا تصور محض ہے تصدیق سے خالی ہے۔ چنانچہ یہ تصور اس حقیقت کا تصور ہے جو ترکیب و کثرت کی تمام جہتوں سے منزہ ہے۔ غرضیکہ ذکر "**یا ھو**" انتہاء درجہ کی توحید کثرت سے تنزیہہ پر دال ہے اور یہ اعظم مقامات ہے۔

(۷) شئ کی تعریف تین طرح سے ہوتی ہے۔ اول شئ کی تعریف شئ سے، دوم شئ کی تعریف اجزاء داخلیہ سے، سوم شئ کی تعریف اجزاء خارجیہ سے۔

اول قسم کی تعریف، تعریف بنفسہ کہلاتی ہے اور وہ محال ہے اس لئے کہ معرف بالفتح، معرف بالکسر سے مقدم ہوتا ہے پس شئ کی تعریف بنفسہ، شئ کے علم کو شئ کے علم سے پیشتر اس شئ کے علم کا تقاضہ کرتی ہے اور یہ محال ہے۔ قسم دوم امور داخلیہ سے تعریف، تو یہ حق تعالیٰ کے حق میں محال ہے کیونکہ ایسی تعریف ماہیت مرکبہ کی ہوتی ہے اور ترکیب حق تعالیٰ کے حق میں محال ہے کہ وہ واحد حقیقی ہے۔ رہی قسم ثالث اور وہ امور خارجیہ سے تعریف کرنا ہے تو یہ بھی باطل محض ہے کیونکہ خلق کے احوال، واجب قدیم لذاتہ کے احوال سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتے اس لئے ذات باری تعالیٰ اپنی ذات مخصوصہ اور ہویت معینہ میں اپنے ماسوا سب سے مبائن و مخالف ہے جب واقعہ یہ ہے تو مخلوق کے احوال ذات باری کی حقیقت مخصوصہ اور ماہیت ازلیہ کے لئے کاشف نہیں ہو سکتے اس لئے اس کی ہویت مخصوصہ اور ماہیت معینہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے تعریف کا دروازہ مسدود ہو جاتا ہے۔ بس اسکی تعریف کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ انسان اپنی عقل

وروح کی رفتار کو اس کی ہویت کے مطلع انوار کی طرف اس امید کے ساتھ متوجہ کردے کہ کبھی نہ کبھی نور جلال کی کچھ شعائیں اس کی عقل وروح کو منور کردیں گی تو وہ اس نور کے دیدار سے سعادتمند ہوجائے گا پس ذاکر کا "یاھو" کہنا عقل و روح کو حضرت قدس کی طرف متوجہ کردیتا ہے اس طرح بسا اوقات ذاکر کو یہ سعادت حاصل ہوجاتی ہے۔

(۸) یہاں پہلے ایک مثال ذہن نشین کرلیجئے وہ یہ کہ جب آدمی کسی پروقار و بارعب بادشاہ یا سلطان قاہر کے دربار میں جاتا ہے اور اپنی عقل ونگاہ سے اس کی ہیبت وعظمت کا کمال اور اس کی باوقار سلطنت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کی عقل پر اس بادشاہ کی ہیبت وعظمت اور اس کی سلطنت کا جاہ وجلال اس کے ذہن ودماغ پر ایسا بیٹھ جاتا ہے کہ وہ آدمی ہر چیز سے غافل ہوجاتا ہے حتی کہ اگر بھوکا ہے تو اپنی بھوک بھول جاتا ہے۔ سخت درد والم میں مبتلا ہے تو اپنی تکلیف فراموش کرجاتا ہے بلکہ اس حالت میں اپنے باپ یا بیٹے کو بھی دیکھتا ہے تو پہچان نہیں سکتا اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ بادشاہ کا رعب وداب اور اس کی عظمت وہیبت اس کے ذہن ودماغ پر اس طرح سوار ہے کہ اس سے دوسرے کا شعور جاتا رہا، بلاتشبیہ وتمثیل یہ کہئے کہ بندہ نے جب "یَا هُوَ" سے ذکر کیا اور نور جلال کی ایک چھینٹ سے اس کی عقل وروح متجلی ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس کی عقل پر خوف ودہشت، روح پر حیرت اور فکر پر غفلت طاری ہوگی اس وقت بندہ اس ہویت کے ماسوا سے غائب ہوجائے گا اور اس کے سوا التفات کرنے سے معزول ہوگا جب بندہ اپنے آپ کو ایسی حالت میں پاتا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا تو اس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنی عقل سے کہے تو "هُوَ" کہے اور زبان سے بولے تو "**هو**" بولے غرضیکہ وہ اس ذکر پر مداومت کرنے لگے تو امید ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس منزل پر پہنچے گا جہاں سے اسے قرب ووصال کی منزل قریب تر دکھائی دے گی۔

(۹) ذکر "**یا هو**" میں جو اسرار ورموز ہیں دو چند آپ نے پڑھا۔ ایک فائدہ اس ذکر کا یہ بھی ہے جو مروی ہے سید الذاکرین صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے ارشاد فرمایا "**من جعل همومه هماً واحداً كفاه الله هموم الدنيا والآخرة**" جس نے اپنے سارے حاجات کو ایک حاجت کردیا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا وآخرت کی حاجتوں سے کفایت فرمائے گا۔ گویا بندہ عرض کرتا ہے کہ دنیا وآخرت میں ہمارے لئے بے حدو بے شمار حاجتیں ہیں اور حاجات غیر متناہیہ ہیں پس ان غیر متناہی حاجات کو وہی پورا کرسکتا ہے جو ذات غیر متناہی قدرتوں غیر متناہی رحمتوں اور غیر متناہی حکمتوں سے متصف ہے۔ اور خود سے میں (بندہ) اپنی ساری ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا نہیں کرسکتا بلکہ ان تمام حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہ صرف خدائے وحدہٗ لاشریک لہ کی ذات ہے۔ اس لئے بندہ اپنی ساری

حاجتوں سے صرف نظر کر کے صرف ایک حاجت کے حصول میں لگ گیا وہ اس طرح کہ اس نے اپنے مہم وارادہ کو صرف ذکر الٰہی کے ساتھ مشغول کر دیا اور اپنی زبان کو ذکر الٰہی میں مصروف کر دیا جب بندہ ذکر میں منہمک ومشغول ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت کی ساری ضرورتوں کے لئے اس کو کافی ہو جاتا ہے۔

(۱۰) بندہ جب کسی شئ کے علم میں مستغرق ہوتا ہے تو اس وقت کسی دوسری شئ کی طرف اس کی توجہ اور اشتغال عقلاً نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ جب اپنی عقل وفکر کی لگام کو کسی ایک شئ کی طرف موڑتا ہے تو دوسری طرف کا چھوٹ جانا امر واقعی ولازمی ہے ایسی حالت میں گویا بندہ عرض کرتا ہے کہ میرے ذہن کا جب یہ حال ہے کہ ایک شئ کے آنے کے بعد دوسری شئ غائب ہو جاتی ہے تو کیوں نہ میں اپنے قلب ونظر کو صرف اور صرف اشرف معلومات کے ذکر میں مشغول کر دوں اور اپنی زبان کو اشرف مذکورات کے ذکر سے مشرف کر لوں یہی وجہ ہے کہ وہ ذکر ''یا ھو'' پر مواظبت کرنے لگتا ہے۔

(۱۱) ذکر تمام درجات ومقامات میں اشرف ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عز شانہ سے روایت کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ جب بندہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنی ذات میں یاد کرتا ہوں اور جب بندہ مجمع عام میں یاد کرتا ہے تو میں اسے ایسے مجمع عام میں یاد کرتا ہوں جو اس سے افضل ہے۔ جب واقعہ یہ ہے تو یقین کر لو کہ تمام اذکار میں افضل ذکر وہ ذکر الٰہی اور اس کی وہ حمد وثناء ہوتی ہے جو دست سوال دراز کرنے سے خالی ہو چنانچہ حدیث قدسی ہے کہ جس بندہ کو میرا ذکر مجھ سے مانگنے سے روکے رکھے تو اس بندہ کو مانگنے والوں کی عطا سے بڑھ کر عطا کرتا ہوں۔

حدیث شریف کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ ذہن نشین رہے کہ بندہ فقیر ومحتاج ہے اور فقیر ومحتاج اپنے آقا ومخدوم کو ایسے خطاب سے ندا کرے جو طلب وسوال پر مبنی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فقیر کرم کا طلبگار ہے۔ چنانچہ سائل وفقیر نے غنی سے جب کہا اے کریم، اے نفع دہندہ، اے رحم فرمانے والے وغیرہ تو اس کا مفہوم بہت ظاہر ہے کہ وہ غنی، کریم، نافع اور رحمن سے کرم وعطا اور نفع ورحمت کا طالب ہے ایسی صورت میں خالص اس کی حمد نہیں ہوتی کہ اس میں غرض شامل ہوتی ہے ذکر خالص اور ثناء جمیل یہ ہے کہ اپنی غرض وسوال سے خالی ہو پس بندہ اپنے ذکر کے الفاظ میں ''یاھو'' کہتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس کا مقصود ذکر خالص ہے غرض وسوال مقصود نہیں ہے اس لئے یہ درجات اذکار میں افضل ہے۔ بعض کتب تصوف میں ذکر شریف ان الفاظ میں مذکور ہے۔

یاھو، یامن لاھو الاھو، یامن لااله الاھو، یاازل، یاابد،
یادھر یادیھار، یادیھور، یامن ھو الحی الذی لایموت

امام غزالی نے فرمایا ہے کہ "لا الہ الا اللّٰہ" عوام کے کلمات توحید ہیں اور "لا الہ الا ھو" خواص کے کلمات توحید ہیں۔قرآن میں دونوں قسم کے اذکار مذکور ہیں۔ارشاد ربانی ہے "وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" (القصص 88) اور اس کے بعد ارشاد ہے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (ایضا)" الا وجھہ کا معنی الا ھو" ہے۔لا الہ کے بعد الا ھو کا ذکر دلیل ہے اس بات کی کہ یہ کلمہ غایت توحید ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ذکر "یا ھو" بے شمار حقائق و معارف اور اسرار و رموز پر مشتمل ہے مولائے کریم ہم سب کو اپنے ذکر کی توفیق مرحمت فرمائے آمین۔

باب ہشتم

اسمائے الٰہیہ سے متعلق بقیہ مباحث کا بیان

مسئلہ اول: اسمائے الٰہیہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ وہ توقیفیہ ہیں یا اصطلاحیہ کچھ علما کا قول ہے کہ اسماء وصفات میں سے اللہ عز شانہ تعالیٰ پر صرف اسی اسم و وصف کا اطلاق درست ہے جس کا ذکر قرآن وحدیث میں مذکور ہے دوسرے علما کا قول ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ پر ہر اس اسم و وصف کا اطلاق درست ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی جلالت شان کے شایان شان ہو۔

امام غزالی نے کہا ہے کہ اسم و وصف الگ الگ چیزیں ہیں مثال کے طور پر میرا نام محمد ہے، اسکا نام ابوبکر ہے یہ اسماء کے قبیل سے ہے اور اس انسان کا طویل ہونا فقیہ ہونا وغیرہ وغیرہ از قبیل صفات ہیں جب اسم و وصف میں یہ فرق ہے تو اطلاق کے بیان میں یہ توجہ رہے کہ اللہ تعالیٰ پر انہیں اسماء کا اطلاق درست ہے جو قرآن وحدیث میں وارد ہیں لیکن جو صفات ہیں وہ توقیفیہ نہیں ہیں۔

فریق اول کے دلائل: بیشک عالم اس کے لئے بہت اسماء ہیں پس ہم اللہ تعالیٰ کو عالم ہونا کہتے ہیں لیکن طبیب ،فقیہ، متیقن اور متبین جیسے اوصاف سے متصف نہیں کرتے ہیں اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسماء توقیفیہ ہیں۔

جواب: یہ دیا گیا ہے کہ طبیب خبر میں وارد ہے چنانچہ منقول ہے کہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب بیمار ہوئے تو ان سے کہا گیا کہ ہم طبیب کو بلاتے ہیں آپ نے فرمایا ''الطبیب امرضنی'' طبیب نے مجھے بیماری دی ہے۔ فقیہ کہتے ہیں متکلم کے کلام سے اس کی غرض کو سمجھنا اس کے کلام میں شبہ داخل ہونے کی وجہ سے۔ اس معنی کر رب تعالیٰ پر فقیہ کا اطلاق محال ہے۔

رہا المتیقن تو یہ ''یقن الماء فی الحوض اذا اجتمع فیه'' سے مشتق ہے پس یقین اس علم کو کہتے ہیں جو پے در پے امارات کثیرہ حاصل ہونے کے سبب مجموعہ امارات اس مبلغ پر پہنچ جائے کہ جزم کا فائدہ دے۔ اور یہ حق تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔ اسی طرح المتبین بھی محال ہے۔ چونکہ تبیین خفاء کے بعد ظہور کا نام ہے علاوہ ازیں تبیین بینونۃ اور ابانت سے مشتق ہے اور ابانت، دو امر متصل کے درمیان تفریق کرنے کا نام ہے جب قلب میں ایک صورت کا دوسری صورت سے اشتباہ پیدا ہو جائے اور پھر ایک دوسرے سے منفصل ہو جائے تو بینونت حاصل ہوتی ہے اسی سبب سے اسکو بیان وتبیین کہتے ہیں۔ اسی لئے تبیین کا اطلاق بھی درست نہیں ہے۔

فریق دوم کے دلائل: فریق دوم کہتے ہیں کہ اسمائے الٰہیہ کو توقیفیہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ **اولاً:** اس لئے کہ اسمائے الٰہیہ فارسی، ترکی ہندی سب زبان میں مذکور ہیں جب کہ ان اسماء سے کوئی قرآن وحدیث میں وارد نہیں ہے حالانکہ ہر جگہ کے مسلمانوں کا ان اسماء کے اطلاق پر اجماع ہے۔ **ثانیاً:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۱'' (اعراف ۱۸۰) اسم حسن وہ صفات ہے جو مدح اور نعوت جلال پر دلالت کرے۔ پس ہر وہ نام جو اس صفت پر دلالت کرے وہ اسم حسن ہوگا، حق تعالیٰ کی شان میں اس آیت کے بموجب ایسے اسمائے عالیہ کا اطلاق جائز ہوگا۔ **ثالثاً:** الفاظ اس وقت مفید ہوتے ہیں جب معانی کی رعایت ملحوظ ہو لہٰذا جب الفاظ کے معانی صحیح و درست ہیں تو الفاظ معینہ کے اطلاق سے منع عبث و بیکار ہے۔

حضرت امام غزالی کا رجحان گروہ اول کے نظریہ سے میل کھاتا ہے جیسا کہ گذرا نیز انہوں نے کہا جب ہم میں سے کسی کے حق میں کوئی دوسرا شخص اس کا نام وضع کرتا ہے تو ہم اسے بے ادبی پر محمول کرتے ہیں پس اللہ تعالیٰ کے حق میں بدرجہ اَولیٰ اسم کا وضع کرنا بے ادبی متصور ہوگا۔ البتہ صفات کا ذکر تو مختلف الفاظ سے صفات کا ذکر ہم سب کے حق میں بلا نکیر صحیح ہے اس لئے حق تعالیٰ کے حق میں صفات عالیہ غیر توقیفیہ کا اطلاق صحیح ہوگا۔

مسئلہ دوم: قرآن میں بہت سے ایسے الفاظ وارد ہیں جو صفات پر دلالت کرتے ہیں مگر اللہ عز شانہ تعالیٰ کے حق میں ان صفات کا اثبات ممکن نہیں ہے۔ ذیل میں چند صورتیں مذکور ہیں۔

(۱) الاستھزاء، ارشاد ہے ''اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ'' (البقرۃ:۱۵) کہ استہزاء جہل ہے قوم بنی اسرائیل نے جب موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا ''قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا'' تو موسیٰ علیہ اسلام نے جواباً فرمایا تھا ''قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ'' (البقرۃ:۶۷)

(۲) المکر: ارشاد ہے ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ'' (آل عمران:۵۴)۔

(۳) الغضب: ارشاد ہے ''غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ'' (الفتح:۶)۔

(۴) التعجب: ارشاد ہے ''بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ'' (الصافات:۱۲) جس قرأت میں ت کے ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اس کے مطابق تعجب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی جب کہ تعجب ایسی حالت کو کہتے ہیں جو قلب میں کسی شئی کے جہالت کے وقت طاری ہوتی ہے۔

(۵) المتکبر: ارشاد ہے ''اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ'' (الحشر:۲۳) کبر عند الناس غیر مستحسن صفت ہے لیکن

اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے لئے استعمال فرمایا ہے یہ اسی کو سزاوار ہے تاہم ہمکو اس جیسی صفت تنہا استعمال کرنے سے احتراز چاہئے البتہ چند صفات کو مجموعی طور پر استعمال کرنا چاہئے جیسا کہ سورہ حشر میں ہے۔

(۶) الحیاء: ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً" (البقرۃ:۲۶) حیاء کسی فعل قبیح کے ارتکاب کرنے پر قلب اور چہرہ پر جو تغیر و آثار رونما ہوتے ہیں اسے حیاء کہتے ہیں۔ ایسے وہ تمام الفاظ جو اپنے ظاہر معنی کے اعتبار سے جلالت باری تعالیٰ کے لئے نا مناسب ہیں پھر بھی ان کا ذکر قرآن وحدیث میں ہوا ہے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ الفاظ اپنے ظاہری ابتدائی معانی پر نہیں ہیں بلکہ مجازی وانتہائی معنی کے اعتبار سے مذکور ہیں۔ ایسے الفاظ کے معنی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک معنی وہ ہوتا ہے جو آغاز وابتدا میں پایا جاتا ہے اور دوسرا وہ معنی ہوتا ہے جو انتہا میں وجود پذیر ہوتا ہے اس کو آثار ونتائج کہتے ہیں۔ بطور مثال غضب کو سمجھئے کہ مزاج کی گرماہٹ اور قلب میں خون جوش مارنے کے وقت قلب میں جو ابتدائی حالت پیدا ہوتی ہے اسے غضب کہتے ہیں اور آخر میں غضب کا جو اثر اور نتیجہ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مغضوب علیہ کو ضرر پہنچاتا ہے۔ پس رب تعالیٰ کے لئے جب غضب کا استعمال ہوگا تو معنی میں نتیجہ کا لحاظ ہوگا نہ کہ ابتدا کا ایسے ہی دیگر الفاظ کو سمجھنا چاہئے تفصیل کے لئے اس مقام کی تفسیر دیکھنی چاہئے۔

مسئلہ سوم: حضرت امام رازی کہتے ہیں کہ میں نے بعض کتب تذکیر میں دیکھا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے چار ہزار اسماے مبارکہ ہیں ایک ہزار اسماے مبارکہ قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں موجود ہیں، ایک ہزار تورات میں، ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں ہیں، اور کہا جاتا ہے دوسرا ایک ہزار لوح محفوظ میں ہیں جو عالم بشر تک نہیں پہنچے۔ حضرت امام رازی کہتے ہیں کہ صوفیا کی کتابوں میں مذکور اسمائے باری تعالیٰ کی یہ تعداد مستبعد نہیں ہے۔ چونکہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اقسام، سلوب واضافات کے اعتبار سے غیر متناہی ہیں، اس پر ہم شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں پس عالم اعلیٰ اور عالم اسفل کی تدبیر میں حکمت الہیہ کے احوال وآثار پر جس شخص کو زیادہ آگاہی اور واقفیت ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے اسماء پر بھی زیادہ اطلاع ہوگی یونہی مدح وتعظیم کو ثابت کرنے والی صفات پر بھی اسے زیادہ اطلاع ہوگی۔ چنانچہ جو شخص بدن انسان کی تشریح کا مطالعہ کرلے اور بدن انسانی کی تخلیق میں ودیعت کردہ ہزاروں ہزار حکمت الہیہ اور رحمت خداوندی پر مطلع ہوجائے تو یقیناً اس کی عقل دسیوں ہزار ایسے اسماء الہیہ سے واقف ہوگی جو مدح و تعظیم پر دلالت کرنے والے ہیں۔ پھر بدن انسانی کی تخلیق میں ودیعت کردہ جس رحمت خداوندی اور حکمت الہیہ پر وہ مطلع ہوا ہے اس کی واقفیت اس کی عقل کو تنبیہ کرتی ہے اس بات پر کہ بدن انسانی کی تخلیق میں مزید ان گنت رحمت و

حکمت کارفرما ہیں جس پر وہ مطلع نہیں ہوسکا ہے۔

اور وہ اس طور پر کہ تشریح ابدان کا علم رکھنے والا جب یہ جان لے گا کہ ارواح دماغیہ سات ہیں تو اس کو ان میں سے ہر ایک کی تخلیق کا فائدہ اور اس کی حکمت بھی معلوم ہوگی پھر جب وہ یہ جان لے گا کہ ان ارواح میں سے ہر ایک تین یا چار قسموں پر منقسم ہے تو اس کو ان میں سے ہر ایک کی وجہ حکمت کا بھی ادراک ہوگا۔ پھر عقل ادراک کرتی ہے کہ ان اقسام میں سے ہر ایک باریک باریک ہڈیوں میں منقسم ہوگئی ہے اور پھر یہ باریک ہڈیاں بھی دوسری قسموں میں پھیلی ہوئی ہیں اور یہ سب قسمیں ایک خاص خاص عضو کے ساتھ متصل ہیں اور ان قسموں کا عضو خاص کے ساتھ اتصال ایک خاص گذرگاہ پر ہوتا ہے غرضیکہ ارواح دماغیہ کے کل اقسام، تقسیم در تقسیم اور دقیق سے ادق ہوکر اتنی زیادہ ہوجاتی ہیں کہ احاطۂ عقل میں نہیں آسکتیں۔

مختصر یہ کہ دسیوں ہزار پھیلے ہوئے پٹھے عقل کو تنبیہ کرتی ہیں کہ اس بدن کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے اقسام، تحدید وشمار سے خارج ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ''وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' (النحل:18)

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس حکمت کے انواع واقسام میں سے جو کوئی دوسری نوع کی حکمت پر مطلع ہوگا اس کو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم آخر کی معرفت ہوگی اور جب اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے مراتب اور اس کی رحمتوں کے درجات کی کوئی غایت وانتہا نہیں تو اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا کی بھی کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔ چنانچہ حکیم جالینوس نے اپنی کتاب منافع الاعضاء میں ذکر کیا ہے کہ جب میں نے اس کتاب کو تصنیف کیا تو میں اس میں مجمع النور کے منافع کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی عظمت وشرف کے پیش نظر اس کے لکھنے میں بخل سے کام لیا پس ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک فرشتہ اترا ہے اور وہ کہہ رہا ہے اے جالینوس! تیرا رب فرماتا ہے کہ تو نے میرے بندوں سے میری حکمتوں کو کیوں پوشیدہ رکھا اور ظاہر نہیں کیا؟ تو جب میں بیدار ہوا تو میں نے اس عنوان پر ایک مستقل کتاب لکھی اور تشریح وبیان میں از حد مبالغہ کیا۔ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا کی انتہا نہیں ہے۔

مسئلہ چہارم: حضرت فخر رازی کہتے ہیں طلسمات اور عزیمتوں کی کتابوں میں بہت سے ایسے اذکار نقوش، تعویذات اور جھاڑ پھونک کی علامتیں لکھی رہتی ہیں جو بالکل نامعلوم ہوتے ہیں سمجھ میں نہیں آتے کہ کیا لکھے ہیں جس

طرح اس کے الفاظ نا معلوم ہوتے ہیں اسی طرح اس کی کتابت بھی غیر مفہوم ہوتی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابت، الفاظ پر دال ہوتی ہے اور الفاظ صورت ذہنیہ پر دلالت کرتے ہیں پس اگر ان رقیات کی دلالت کسی چیز پر بالکل نہ ہو تو اس میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی چیز پر دلالت ہوگی تو اس کی دلالت یا تو اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے نعوت کبریائی پر ہوگی یا کسی دوسری شئی پر دلالت ہوگی۔ اگر دوسری شئی پر دلالت ہو تو فائدہ مند نہیں کیونکہ غیر اللہ کا ذکر فائدہ نہیں دیتا، نہ ترغیب کا نہ ہی ترہیب کا۔ لہٰذا شق اول باقی رہی وہ یہ کہ نقوش رقیات ذکر اللہ اور صفات مدح وثناء پر دلالت کرتے ہیں۔ اور جب ذکر الٰہی کی قسمیں مضبوط ومحدود ہیں اس پر زیادتی نہیں ہوسکتی تو ان کلمات کے بارے میں احسن تاویل یہ ہے کہ کہا جائے کہ یہ کلمات ان دعاؤں کی جنس سے ہیں جو ماثور ومنقول ہیں رہا وہ اختلاف جو لغات وزبان کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے سو وہ قلیل الاثر ہے البتہ واجب ہے کہ یہ اذکار معلومہ، بہ نسبت ان اذکار مجہولہ کے تاثیر میں زیادہ دخیل ہوں۔ لیکن اس مقام پر کوئی قائل کہہ سکتا ہے کہ اکثر خلق کے نفوس ناقص وقاصر ہیں پس جب لوگ ان اذکار معلومہ کا ورد کریں گے۔ اور اس کے ظاہر کو سمجھیں گے اور چونکہ ان کے پاس خداداد روشن پر نور انی قوی اور پاکیزہ نفوس نہیں ہوتے تو ان کے تاثرات الٰہیات سے قوی تر نہیں ہونگے اور ان کے نفوس جسمانیات سے مجرد نہ ہوں گے پس ان اذکار کے سبب ان کے نفوس میں قوت تاثیر پیدا نہ ہوسکے گی اس کے برخلاف جب لوگ الفاظ مجہولہ کو پڑھیں گے اور اس کے معانی کو کچھ سمجھ نہ پائیں گے تو ان کے اوہام وخیالات میں یہ بات سما جائے گی کہ یہ ایسے بلند ترین کلمات عالیہ ہیں جو ہمارے فہم سے بالاتر ہیں اس سے ان کے نفوس اور قلوب واذہان پر خوف ورعب طاری ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عالم جسمانیات سے کنارہ کشی کر کے عالم قدس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اور اسے مزید تاثیر پر قدرت وقوت حاصل ہوگی اس سے ظاہر ہے کہ طلسمات وعزائم کی کتابوں اور حضرات صوفیاء کے بیاض میں غیر معلوم اذکار ونقوش بھی نہ یہ کہ صرف فائدہ مند ہیں بلکہ قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔

مسئلہ پنجم: یاد رہے کہ مخلوق اور خالق کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء کے درمیان عجیب وغریب مناسبات پائے جاتے ہیں عاقل کے لئے ضروری ہے کہ ان مناسبات کا اعتبار کرے تاکہ ذکر سے منتفع ہوسکے۔ اس کلام کی تفہیم کے لئے ایک مقدمہ عقلیہ کی تمہید ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ ثابت شدہ امر ہے کہ نفوس ناطقہ بشریہ جوہر وماہیت کے اعتبار سے مختلف ہیں پس ان میں سے بعض نفوس قدسیہ الٰہیہ حرہ کریمہ ہوتی ہیں، بعض نفوس سفلیہ ظلمانیہ خسیسہ ہوتی ہیں، بعض نفوس رحیمہ عظیمہ کہلاتی ہیں، بعض قاسیہ قاہرہ کہی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض نفوس ایسے بھی

ہوتے ہیں جن کی چاہت ومحبت اور میلان جسمانیات سے بہت ہی قلیل ہوتا ہے اور بعض وہ نفوس ہوتے ہیں جو ریاست اور ملک گیری سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں چنانچہ جو خلق کے احوال کا جائزہ لیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ نفوس یقیناً مختلف ہوتے ہیں اور ان کے احوال ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ احوال جواہر نفس کو لازم ہیں۔ پس بیشک ہر وہ شخص جو اپنے نفس کے احوال پر نگاہ رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ارادہ، کراہت اور رغبت و رہبت وغیرہ میں اس کے لئے ایک خاص نہج اور واضح طریقہ ہے۔ بیشک ریاضت ومجاہدہ اس کو اس کے احوال اصلیہ اور مناہج فطریہ سے پھیر نہیں سکتے، ریاضت ومجاہدہ کی تاثیر اس میں ہوتی ہے کہ نفوس کے اخلاق رذیلہ کمزور ہو جائیں اور اخلاق حسنہ دوگنا ہو جائیں اور کسی انسان پر غلبہ واستیلا نہ کرے رہا یہ کہ ریاضت ومجاہدہ سے انسان اپنی جبلی وفطری حالت سے پلٹ کر دوسری حالت میں آجائے تو یہ محال ہے۔ اسی طرف اشارہ ہے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی ''الناس معادن کمعادن الذهب والفضة'' میں اور ''الارواح جنود مجندة'' میں۔ مندرجہ بالا تمہید کے ذہن نشین ہونے کے بعد یہ سمجھنا چاہئے کہ جنسیت ضم ہونے کی علت ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسمائے الٰہیہ میں سے ہر اسم پاک کا ایک معین معنی ہے لہٰذا ہر وہ نفس جس پر اسمائے الٰہیہ میں سے کسی اسم کا معنی غالب ہوگا اس نفس کو اس اسم پاک کے ساتھ خاص مناسبت ہوگی پس جب بندہ اس اسم پاک کا ورد کرتا ہے اور اس پر مواظبت کرتا ہے تو بہت جلد وہ اس اسم پاک کی برکتوں سے منتفع ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ ابوالخبیب بغدادی، سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو ایک یا دو بار چلہ کشی کا حکم دیتے تھے اتنی مقدار میں جتنا وہ ضروری سمجھتے تھے جب وہ چلہ کشی سے فارغ ہو جاتا تو اس کے پاس اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ کا ورد کرتے اور اس کے چہرہ کو دیکھتے رہتے اگر یہ دیکھتے کہ اس کے چہرہ پر ننانوے اسمائے الٰہیہ میں سے کسی اسم پاک کے اثرات وبرکات نہیں ظاہر ہو رہے ہیں تو اس شخص کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتے کہ یہاں سے نکل کر بازار جا اور دنیا کے مہمات میں مشغول ہو جا کہ تمہاری یہ منزل نہیں ہے۔ اور اگر یہ دیکھتے کہ اس کے چہرہ پر اسمائے مبارکہ میں سے کسی اسم کے اثرات وبرکات ظاہر ہو رہے ہیں تو کہتے کہ اس ذکر پر مواظبت کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ نفوس میں سے ہر ایک اگر اپنی حالت مخصوصہ مناسبہ کے مطابق کسی خاص اسم الٰہی کا ورد رکھے تو اس اسم مبارک کے اثرات وبرکات سے منتفع ضرور ہوگا۔

مسئلہ ششم: (**اسمائے الٰھیہ اور اس کے فضائل و برکات کے بیان میں**) اللہ عزشانہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ مبارکہ میں سے ذاتیہ، صفاتیہ، سلبیہ واضافیہ کا مختصر بیان گذرا ذیل کے سطور میں احادیث مبارکہ سے ماخوذ

اسمائے الٰہیہ مبارکہ حوالہ قرطاس کررہے ہیں تاکہ یہ کتاب باعظمت ہوجائے اور لوگ اسمائے حسنیٰ مبارکہ کا ورد کرکے اس کے فیضان وبرکات سے مالامال ہوسکیں۔ چنانچہ ارشادنبوی ہے۔

(۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان للہ تعالیٰ تسعۃ وتسعین اسماً مائۃ الا واحدۃً من احصاھا دخل الجنۃ وفی روایۃ وھو وتر یحب الوتر متفق علیہ۔

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک کم سو یعنی ننانوے نام ہیں جو ان ناموں کی محافظت کرے جنت میں جائے گا اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند فرماتا ہے۔ یہ روایت صحیح البخاری اور مسلم کی ہے۔ اور امام ترمذی نے جامع ترمذی میں اور بیہقی نے الدعوات الکبیر میں بایں الفاظ روایت کیا ہے۔

"عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان للہ تعالیٰ تسعۃ وتسعین اسماً من احصاھا دخل الجنۃ"۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو انکا ذکر کرے گا جنت میں جائے گا اور وہ یہ ہیں۔

(۱) ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو (۲) الرحمن (۳) الرحیم (۴) المَلِکُ (۵) القدوس (۶) السلام (۷) المومن (۸) المھیمن (۹) العزیز (۱۰) الجبار (۱۱) المتکبر (۱۲) الخالق (۱۳) البارئ (۱۴) المصور (۱۵) الغفار (۱۶) القھار (۱۷) الوھاب (۱۸) الرزاق (۱۹) الفتاح (۲۰) العلیم (۲۱) القابض (۲۲) الباسط (۲۳) الرافع (۲۴) المعز (۲۵) المذل (۲۶) السمیع (۲۷) البصیر (۲۸) الحکم (۲۹) العدل (۳۰) اللطیف (۳۱) الخبیر (۳۲) الحلیم (۳۳) العظیم (۳۴) الغفور (۳۵) الشکور (۳۶) العلی (۳۷) الکبیر (۳۸) الحفیظ (۳۹) المقیت (۴۰) الحسیب (۴۱) الجلیل (۴۲) الکریم (۴۳) الرقیب (۴۴) المجیب (۴۵) الودود (۴۶) المجید (۴۷) الباعث (۴۸) الشھید (۴۹) الحق (۵۰) الوکیل (۵۱) القوی (۵۲) المتین (۵۳) الولی (۵۴) الحمید (۵۵) المحصی (۵۶) المبدی (۵۷) المعید (۵۸) المحی (۵۹) المیت (۶۰) الحی (۶۱) القیوم (۶۲) الواجد (۶۳) الماجد (۶۴) الواحد (۶۵) الاحد (۶۶) الصمد (۶۷) القادر (۶۸) المتقدر (۶۹) المقدم (۷۰) المؤخر (۷۱) الاول (۷۲) الآخر (۷۳) الظاہر (۷۴) الباطن

(۷۵)الوالی (۷۶)المتعالی(۷۷) البر(۷۸) التواب (۷۹)المنتقم (۸۹)العفو (۸۱)الرؤف (۸۲)مالک (۸۳)الملک (۸۴)ذو الجلال والاکرام (۸۵)المقسط (۸۶)الجامع (۸۷)الغنی (۸۸)المغنی (۸۹)المعطی (۹۰)المانع (۹۱)الضار (۹۲)النافع (۹۳)النور (۹۴)الهادی (۹۵)البدیع (۹۶)الباقی (۹۷)الوارث (۹۸)الرشید (۹۹)الصبور۔

یعنی وہ اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بڑا مہربان، رحم فرمانے والا، بادشاہ ہے، پاک ہے، عیوب سے سلامت ہے، امن دینے والا، نگہبان ہے، غالب ہے، بدلہ کرنے والا ہے، بلند ہے، پیدا کرنے والا، ایجاد فرمانے والا، صورت دینے والا، گناہ بخشنے والا، زبردست غلبہ والا، خوب عطا فرمانے والا، روزی رساں ہے، کھولنے والا، علم والا، تنگی وفراخی دینے والا، نیچا اونچا کرنے والا، عزت وذلت دینے والا، سننے دیکھنے والا، حکومت وانصاف والا، مہربانی کرنے والا، خبر رکھنے والا، حلم وعظمت والا، بخشنے والا، قدرداں، بلندی وبزرگی والا، حفاظت فرمانے والا، قوت دینے والا، حساب لینے والا، جلالت وبخشش والا، نگہبان، دعائیں قبول فرمانے والا، فراخی دینے والا، حکمت والا، بزرگی والا، اٹھانے والا، حاضر، دائم، کارساز، قوت واستواری والا، مددگار، لائق تعریف، سب کو جاننے والا، شروع کرنے والا، لوٹانے والا، زندگی وموت بخشنے والا، زندہ ہمیشہ قائم رکھنے والا، وجود ہستی والا، بزرگی والا، ایک اکیلا، لائق بھروسہ، قدرت وقوت اقتدار والا، آگے پیچھے کرنے والا، سب سے پہلے، سب سے آخر، کھلا، چھپا، مددگار، عظمت والا، احسان فرمانے والا، توبہ قبول فرمانے والا، بدلہ لینے والا، معافی دینے والا، رافت والا، ملک کا مالک، غضب وکرم والا، انصاف والا، جمع فرمانے والا، بے پرواہ، بے پرواہ کرنے والا، دینے والا، روکنے والا، نفع ونقصان کا مالک، روشن کرنے والا، ہدایت دینے والا، بے مثال، ہمیشہ باقی، وارث ہدایت دینے والا، صبر والا ہے، تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۔ بڑی برکت والا ہے تمہارے رب کا نام جو عظمت وبزرگی والا۔ (سورہ رحمن: ۷۸)

مسئلہ ہفتم: (اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں) اللہ عزشانہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی تفسیر اور اسمائے مبارکہ کے ذکر کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ کا ذکر کرنا ضروری ہوجاتا ہے گو کہ یہ مقام اس کا متقاضی نہیں ہے کہ موقع ومحل اسمائے الٰہیہ کی تفسیر کا ہے۔ مگر قافلہ سالار عشق ومحبت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ یا کم از کم نام کے بعد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک نہ ذکر کرنا جرم ہے اور جان بوجھ کر صرف اعتنا کرنے والا دنیائے عشق ومحبت کا مجرم کہلاتا ہے۔ پھر کوئی مومن بھلا ایسا کیوں کرسکتا ہے جب کہ خود اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کا

نام اپنے نام کے ساتھ نہ یہ کہ صرف کلمۂ شہادت اور کلمات اذان واقامت میں ضم فرمایا ہے بلکہ پایۂ عرش، ابواب جناں ،جبین ملائکہ اور حوران بہشت کے سینوں پر بھی اپنے نام کے ساتھ اپنے محبوب کا نام لکھا ہے۔ المواہب اللدنیہ میں ہے۔

"وروی أنه لما خرج آدم من الجنة رأی مکتوبا علی ساق العرش وعلی کل موضع فی الجنة اسم محمد صلی الله علیه وسلم مقرونا باسم الله تعالیٰ فقال یارب هذا محمد من هو؟ فقال تعالیٰ هٰذا ولدک الذی لولاه ماخلقتک فقال: یارب بحرمة هذا الولد ارحم هٰذا الوالد، فنودی: یاآدم ،لو تشفعت الینا بمحمد فی اهل السمٰوت والارض لشفعناک"۔

اس کے تحت زرقانی میں ہے۔

(رأی مکتوبا علی ساق العرش) وکانت الکتابة قبل خلق السمٰوت والارض بألفی سنة کما روی عن انس (وعلی کل موضع فی الجنة) من قصر وغرفة ونحور حور عین وورق شجرة طوبی و ورق سدرة المنتهیٰ واطراف الحجب وبین أعین الملائکة ، رواه ابن عساکر"۔ (ص:۱۱۸/ج:۱)

یعنی مروی ہے کہ حضرت آدم علی نبینا علیہ وعلیہ السلام جب جنت سے باہر آئے تو دیکھا کہ پایۂ عرش پر اور جنت میں ہر جگہ یہاں تک کہ جنت کے محلات، بالا خانے، حوران بہشت کے سینوں، شجر طوبیٰ کے اوراق اور سدرۃ المنتہیٰ کے پتوں آسمانوں کے دروازوں پر اور فرشتوں کی نگاہوں کے درمیان، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک، اللہ تعالیٰ کے نام پاک کے ساتھ ملا ہوا لکھا ہے اور یہ تحریر آسمان وزمین کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے کی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ دیکھ کر فرمایا اے رب یہ محمد کون ہیں! رب تعالیٰ نے فرمایا اے آدم یہ تمہاری ذریت سے وہ مولود ہے کہ اگر ان کو پیدا کرنا نہ ہوتا تو تمہیں نہ پیدا کرتا، حضرت آدم نے عرض کیا اے رب میرے اس لڑکا کے طفیل اس کے اس باپ پر رحم فرما۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اے آدم میرے محبوب محمد کے وسیلہ سے اگر تمام آسمان والوں اور زمین والوں کے لئے سفارش کرتے تو ہم سب کے حق میں تمہاری شفاعت قبول کر لیتے۔

چنانچہ اس لئے کہ رب تعالیٰ کے نام سے نبی پاک کا نام جدا کرنا شیوۂ عاشقی کے خلاف ہے حضرت صدیق اکبر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی میں اللہ کے ساتھ نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی منقش کروادیا حالانکہ آپ کو صرف اللہ کا نام لکھوانے کا حکم دیا گیا تھا مگر آپ نے اسے ایمانی غیرت کے خلاف سمجھا اور اللہ کے ساتھ رسول اللہ کا نام بھی لکھوادیا اس

پر حضرت صدیق کو جو اجر ملا اس کو آئندہ اوراق میں ملاحظہ کریں گے پس راہ روان منازل عشق کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میں نے بھی اسمائے حسنی الٰہیہ کے ساتھ اسمائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنے کا اہتمام کیا۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ بھی کثیر ہیں کہ اسماء کی کثرت ذات وشخصیت کی عظمت وعلومرتبت پر دال ہوتی ہے چنانچہ بعض علمائے عظام نے اسمائے حسنیٰ کی طرح اسمائے نبویہ کو بھی ننانوے شمار کرایا ہے۔ دلائل الخیرات شریف میں علامہ جزولی نے دوسو کے قریب اسماء النبی ذکر کئے ہیں۔ جبکہ "**المستوفیٰ فی اسماء المصطفیٰ**" میں ابن دحیہ نے تین سو کے قریب ذکر کیا ہے اور امام ابوبکر ابن عربی نے شرح ترمذی میں کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ ایک ہزار ہیں کچھ قرآن میں ہیں کچھ احادیث میں مذکور ہیں تو کچھ کتب سابقہ سماویہ میں ہیں۔ غرض کہ اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں علمائے اسلام کا اختلاف ہے۔ وجہ اختلاف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اوصاف وکمالات کا ذکر فرمایا ہے ان کو جنہوں نے اسماء میں شمار کیا ہے ان کے نزدیک تعداد بڑھ گئی ہے اور جنہوں نے صرف اسماء علمیہ کو دیکھا ان کے نزدیک اسمائے مبارکہ کی تعداد کم ہے۔ اس لئے ان حضرات نے کہا کہ یہ اوصاف ہیں اسماء اعلام نہیں ہیں، چنانچہ امام نووی نے کہا کہ اسماء مذکورات میں سے بعض صفات ہیں ان پر اسماء کا اطلاق بطور مجاز ہے یہی بات علامہ سیوطی نے کہی ہے کہ ان میں اکثر صفات ہیں چنانچہ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ننانوے اسمائے مبارکہ شمار کرنے میں بھی اختلاف ہے۔ تفصیلات کے لئے دیکھیں ابن دحیہ، قرطبی، سخاوی، سیوطی، یوسف نبہانی اور جزولی وغیرہم کی درجنوں کتابیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ کی جمع و ترتیب کے بیان میں استناد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم ان میں سے مشہور ومعروف ننانوے اسماء النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نقل کر کے اس عنوان کا اختتام کرتے ہیں۔

اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۲) احمد (۳) حامد (۴) محمود (۵) احید (۶) وحید (۷) الماحی (۸) الحاشر (۹) العاقب (۱۰) طہ (۱۱) یٰس (۱۲) الطاہر (۱۳) المطہر (۱۴) الطیب (۱۵) السید (۱۶) الرسول (۱۷) النبی (۱۸) رسول الرحمۃ (۱۹) رسول

الملاحم(۲۰) رسول الرحمة(۲۱) المدثر(۲۲) المزمل(۲۳) عبدالله(۲۴) حبیب الله (۲۵) صفی الله(۲۶) نجی الله(۲۷) کلیم الله(۲۸)خاتم الانبیاء(۲۹)خاتم الرسل(۳۰) نبی الرحمة(۳۱) نبی التوبه(۳۲) الشاهد(۳۳) الشهید(۳۴) المشهود(۳۵) البشیر(۳۶) المبشر(۳۷)النذیر(۳۸) المنذر(۳۹) النور(۴۰) السراج(۴۱)المصباح(۴۲) المهدی(۴۳) المنیر(۴۴) الد اعی(۴۵)المدعو (۴۶)الحبیب(۴۷) المجاب (۴۸)العفو (۴۹) الولی (۵۰) الحق(۵۱)القوی (۵۲)الامین (۵۳) الکریم (۵۴)المکرم (۵۵)المکین(۵۶)المتین(۵۷)المبین (۵۸)المصطفیٰ (۵۹)المجتبیٰ (۶۰) المنتقیٰ(۶۱)الامی (۶۲) المختار (۶۳) المشفع (۶۴) الصالح (۶۵)المصلح (۶۶) المهیمن (۶۷) الصادق (۶۸) المصدق (۶۹) الصدق (۷۰) البر(۷۱) المبر (۷۲) الوجیه(۷۳) النصیح (۷۴) الناصح (۷۵) الوکیل (۷۶)المتوکل (۷۷) الکفیل (۷۸)الشفیق (۷۹)المقدس (۸۰)الهادی (۸۱)المهدی (۸۲)المقدم (۸۳)عزیز (۸۴) الفاتح(۸۵) المفتاح (۸۶) رؤف (۸۷) الرحیم(۸۸) الناصر(۸۹) المنصور(۹۰) الاعلیٰ (۹۱)الامام(۹۲)الحنیف(۹۳)الحریص(۹۴)الثاقب(۹۵)الیتیم(۹۶)النجم(۹۷)الحجة (۹۸)خطیب النبیین(۹۹)رحمة للعٰلمین صلی الله تعالیٰ علیه وعلیٰ آله وصحبه وسلم۔

نوٹ:۔ الله سبحانہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ورد کرتے وقت ہر اسم پاک کے ساتھ جل جلالہ اور رسول الله ﷺ کے اسمائے مبارکہ کے ورد کرتے وقت ہر نام مبارک کے ساتھ صلی الله علیہ وسلم کا اضافہ ضرور کریں۔

باب نہم

اسم جلالت لفظ ''اللہ'' سے متعلق مباحث کے بیان میں

تمہید: ذات باری تعالیٰ کی حقیقت انسانی ادراک سے ماوراء ہے ذات باری تعالیٰ کے وجود وتوحید پر گو کہ عالم کا ذرہ ذرہ دلیل وگواہ ہے مگر اس راہ میں بڑے بڑے عقلاء کی عقلیں حیرت زدہ ہیں کچھ نافہموں نے تو شروع ہی سے صانع عالم کا انکار کر دیا اور کچھ وجود کے قائل ہوئے بھی تو شرک وکفر کے ورطۂ ظلمات میں بھٹکتے رہے چنانچہ اس ذات وحدہٗ لاشریک لہ کے بالمقابل ہزاروں ان گنت باطل خداؤں کی پرستش کرنے لگے۔ ہاں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے جسے توفیق مرحمت فرمائی انہوں نے حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کی دعوتوں پر لبیک کہتے ہوئے خدائے تعالیٰ کو ویسا ہی مانا جیسا ماننے کا حق تھا۔ تاہم اس کی ذات کی کنہ تک کسی کی رسائی نہیں پھر اس کی کنہ تک کسی اور کی کیونکر رسائی ہوسکتی جب کہ بالغان معرفت اور اہل حق وتوحید میں اہل زبان کو اس ذات پر دلالت کرنے والے لفظ اللہ تک صحیح رسائی نہ ہوسکی چنانچہ اس لفظ میں نحویوں بلکہ مفسرین حضرات کا زبردست اختلاف ہے کہ یہ لفظ علم ہے یا مشتق ہے، مشتق ہے تو اس کا مشتق منہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ، اس تفصیل کے لئے ذیل کے سطور کو پڑھئے اور غور کیجئے کہ جس ذات پر دلالت کرنے والے لفظ کی حقیقت تک اہل علم کی رسائی نہ ہوسکی بعینہ اس ذات کی حقیقت تک رسائی کیونکر ممکن ہوسکتی ہے۔

مسئلہ اول:۔ (تفسیر اول) حضرت امام رازی وغیرہ مفسرین کا مذہب مختار یہ ہے کہ لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کا اسم علم ہے۔ اس لئے وہ مشتق نہیں ہے یہی مذہب خلیل نحوی اور سیبویہ اور اکثر اصولیین وفقہاے کرام کا ہے اسم علم ہونے پر متعدد دلیلیں ہیں۔

پہلی دلیل: لفظ اللہ علم ہے مشتق نہیں ہے اس لئے کہ اگر لفظ اللہ مشتق ہوگا تو اس کا معنی کلی ہوگا اور کلی کا مفہوم معلوم ہے کہ جس کا نفس تصور وقوع شرکت سے مانع نہیں ہوتا اور مشتق کا معنی کلی پر اس لئے دلالت کرتا ہے کہ مشتق ایسی شئ مبہم یا ذات مبہم پر دلالت کرتا ہے جس کے ساتھ مشتق منہ حاصل ہو اور یہ معنی کثیرین کے درمیان وقوع شرکت سے مانع نہیں پس اگر یہ لفظ مشتق ہو تو اس میں کثیرین کے درمیان شرکت کا وقوع مانع نہیں ہوگا اس وقت ''لا الہ الا اللہ'' کا معنی توحید حقیقی نہیں رہ جائے گا۔ کیونکہ لفظ اللہ کے مشتق ہونے کی تقدیر پر اس کے تحت اشخاص کثیرہ داخل ہونگے اور اللہ واحد حقیقی نہیں رہیگا اور نہ یہ کلمہ توحید خالص ہوگا جبکہ تمام ارباب علم ودانش اور عقلاء کا اجماع ہے کہ یہ کلمہ توحید خالص ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ لفظ اللہ اسم علم ہے ذات معینہ کے لئے موضوع ہے مشتق نہیں ہے۔

دوسری دلیل: یہ معلوم ہے کہ کسی ذات کی صفات کو ذکر کرنے کے لئے اولاً اس کا اسم علم ذکر کیا جاتا ہے جو موصوف بنتا ہے پھر بعد میں اس کی صفت لائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر زیدنِا العالم، زیدن الفقیہ وغیرہ۔ بلاتمثیل جب ہم اللہ تعالیٰ کی صفات مقدسہ کو ذکر کریں گے تو اولاً لفظ اللہ کو ذکر کریں گے بعدہٗ اس کے صفات مدائح وکمالات کا ذکر کریں گے جیسے کہیں "الله العالم القادر الحکیم" قرآن حکیم میں ہے "هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ" وغیرہا۔ اس کے برعکس استعمال نہیں کرسکتے اور نہ ہی قرآن وحدیث میں ایسا مذکور ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ علم ہے مشتق نہیں ہے۔

اعتراض: دلیل دوم پر بایں طور اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ سورہ ابراہیم کے آغاز میں اس طرح ارشاد ربانی ہے "اَلْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ" (ابراہیم: ۱/۲) آیت متلوہ میں "اَلْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ" صفت پہلے ہے اور اللّٰہ صفت کے بعد ہے۔

جواب: اس میں دو قرأت ہے اول اسم جلالت اللہ مرفوع ہے اور ترکیب میں مبتدا واقع ہے اس صورت میں اعتراض ہی واقع نہ ہوگا کہ اعتراض صفت موصوف ہونے کی تقدیر پر تھا اور پیش کردہ آیت میں خبر ومبتدا کی ترکیب ہے۔ ثانیاً "اَلْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ" کی مناسبت سے اسم جلالت اللہ کو مجرور جنہوں نے پڑھا ہے اس صورت میں صفت و موصوف نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے قول "هذه الدار ملک للفاضل العالم زید" کی طرح ہے کہ جیسے اس مثال میں "زید العالم الفاضل" صفت وموصوف نہیں ہے بلکہ بدل مبدل منہ ہے کیونکہ جب یہ کہا گیا "هذه الدار ملک للعالم الفاضل" تو ایک اشتباہ رہ جاتا ہے کہ وہ عالم فاضل کون ہے تو اس اشتباہ کو زید کا اضافہ کرکے دور کردیا جاتا ہے کہ جس عالم وفاضل کے لئے گھر کی ملکیت کی بات کہی جارہی ہے وہ زید ہے۔ غرض جیسے یہاں لازم نہیں آتا کہ اسم علم صفت ہے ایسے ہی ارشاد باری تعالیٰ "اَلْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ" میں بھی لازم نہیں کہ اللہ صفت ہے۔

تیسری دلیل: ارشاد باری تعالیٰ ہے "ط هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا" (مریم ۶۵) اس آیت میں اسم سے صفت مراد نہیں ہوسکتی ورنہ ارشاد "هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا" کا کذب لازم آئے گا پس واجب ہے کہ اسم علم مراد ہو اور وہ لفظ اللہ ہے۔

اسم علم نہ ہونے کے دلائل

دلیل اول: مفسرین کا وہ طبقہ جو اسم جلالت لفظ اللہ کو اسم علم نہیں کہتا ان کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

(۱) ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَهُوَ اللهُ فِي السَّمٰوٰتِ" (الانعام:۳) اور ارشاد ہے "هُوَ اللهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" (الحشر:۲۲) بیشک ان آیتوں میں لفظ اللہ کا صفت واقع ہونا ضروری ہے اسم علم نہیں ہوسکتا ورنہ ذات باری تعالیٰ کا آسمانوں میں ہونا لازم آئے گا اور یہ بدیہی البطلان ہے لیکن لفظ اللہ کو صفت مان لیں تو کوئی خرابی نہیں لازم آتی ہے کیونکہ اس تقدیر پر معنی یہ ہوگا "ھو معبود فی السموٰت" یعنی جس کی آسمانوں اور زمین میں عبادت کی جاتی ہے۔

دلیل دوم: اسم علم اشارہ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور اشارہ حق تعالیٰ کے حق میں ممتنع ہے لہذا اسم علم بھی ممتنع رہے گا۔

دلیل سوم: اسم علم کی وضع اس لئے ہوتی ہے تا کہ ایک شخص دوسرے شخص سے ممتاز ہوجائے جو حقیقت و ماہیت میں مشابہ ہوتے ہیں اور اس کا حق تعالیٰ کی شان میں ممتنع ومحال ہونا ظاہر ہے اور جب یہ ممتنع ہے تو اسم علم ہونا بھی محال ہوگا۔

مسئلہ دوم:۔ وہ لوگ جو لفظ اللہ کو اسم مشتق کہتے ہیں انہوں نے اس میں کئی فروع ذکر کئے ہیں۔

فرع اول: الہ معبود کو کہتے ہیں خواہ برحق معبود ہو خواہ باطل، لیکن عرف شرع میں معبود برحق ہی پر اس کا استعمال غالب ہے۔

معبود وہ ہے جس کی عبادت کی جائے اور جو عبادت کا مستحق ہے وہ صرف اللہ عز شانہ تعالیٰ ہے کیونکہ تمام اصولی و فروعی نعمتوں کا عطا کرنے والا وہی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ موجود یا تو واجب ہوگا یا ممکن ہوگا اور واجب صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس کے سوا سب ممکن ہے۔ اور ممکن بغیر مرجح کے وجود پذیر نہیں ہوتا اور مرجح اللہ تعالیٰ ہے پس تمام ممکنات اس کی ایجاد وتکوین سے ہی موجود ہوئے ہیں خواہ ابتداء ہو یا کسی واسطہ سے ہو ہر ایک شئی میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے خلق وایجاد کا اثر ہے۔ لہذا بندہ کو جتنی بھی نعمتیں ملی ہیں سب اسی درگاہ کی عطا کردہ ہیں اس سے ظاہر ہے کہ غایت انعام اللہ عز شانہ کی طرف سے صادر ہوئی ہے اور عبادت غایت تعظیم سے عبارت ہے پھر عقل کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ جس کی طرف سے غایت انعام ہو وہی غایت تعظیم کا مستحق ہے اس لئے عبادت کا مستحق صرف اور صرف اللہ عز شانہ تعالیٰ ہے۔

فرع دوم: عبادت کا حق یہ ہے کہ صرف اللہ عز شانہ تعالیٰ کے لئے کی جائے اس میں کسی قسم کی غرض شامل نہ ہو اس لئے عبادت جنت کی لالچ کے لئے یا جہنم کے عذاب کے خوف سے نہ کرنی چاہئے ایسا کرنا جہالت و بے وقوفی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔

(۱) صوفیا کہتے ہیں کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اس نیت سے کی تا کہ اس کی عبادت کے ذریعے کوئی دوسری چیز حاصل کرے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اس نے معبود اس شئی کو سمجھا اور اللہ تعالیٰ کو اس معبود تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا لہذا عبادت میں ایسی نیت سے احتراز لازم ہے کہ یہ جہل عظیم ہے جس سے بہت لوگ غافل ہیں۔

(۲) صوفیا کہتے ہیں کہ کسی نے یہ کہا میں جنت کی وجہ سے یا جہنم کے خوف سے نماز پڑھتا ہوں، تو یہ نماز صحیح نہ ہوگی۔

(۳) عبادت میں غرض شامل ہونے سے عبادت رائیگاں جاتی ہے۔ چنانچہ جس نے کوئی عمل کیا کسی غرض کے حصول کے لئے اور وہ غرض ایسی ہے کہ وہ کسی دوسرے طریق سے بھی حاصل ہوسکتی ہے تو وہ اس عمل کو چھوڑ کر دوسرا ذریعہ بھی استعمال کرسکتا ہے۔ کچھ یہی حال غرضی عبادت کا ہے کہ اگر کسی نے غرض وثواب کے لئے عبادت کیا ہے اور ثواب کسی دوسرے طریق سے بھی حاصل ہوسکتا ہے تو وہ عبادت چھوڑ دیگا اور جو ایسا ہے اسکو اللہ سے محبت ہے نہ اللہ کا اس کے دل میں خوف ہے بلکہ جہالت وحرص میں مبتلا شخص ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے کچھ مخلص بندے ایسے ہیں جو غرض اعلیٰ کی نیت سے عبادت کرتے ہیں کہ اس سے خدمت الٰہی کا شرف حاصل کرتے ہیں چنانچہ جب وہ نماز کو شروع کرتے ہیں تو دل میں عزت ربوبیت اور ذلت عبودیت کی نیت ہوتی ہے، زبان ذکر الٰہی سے تر رہتی ہے اور اس کے اعضاء وجوارح اس کے حکم کی ادائیگی میں مشغول رہتے ہیں غرض بندہ کے اجزاء میں اس کا ہر جز عبادت وخدمت الٰہی پر مامور رہتا ہے عبادت سے مقصود یہی شرف ومنزلت کا حصول ہے۔

فرع سوم: الہ وہ ہے جس کی عبادت کی جائے یا جو معبود ہے۔ ایسا کہنے کو بعض علماء چند وجہوں سے منع کرتے ہیں۔

(۱) بتوں کی بھی عبادت کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ معبود نہیں ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ، جمادات وبہائم کا بھی معبود ہے حالانکہ جمادات وبہائم وغیرہا سے عبادات کا صدور محال ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ بچے، پاگل وغیرہ سب کا رب ومعبود ہے حالانکہ ان جیسوں سے بھی عبادت صادر نہیں ہوتی۔

(۴) لازم آئے گا کہ وہ ازل میں معبود نہیں تھا کہ ازل میں کوئی اس کا عبادت کرنے والا نہ تھا۔

فرع چہارم: بعض علما نے کہا ہے کہ الہ وہ نہیں ہے جو معبود ہو حتیٰ کہ مذکورہ اعتراضات وارد ہوں، بلکہ الہ وہ ہے جو معبود ہونے کا مستحق ہو یا عبادت کئے جانے کے لائق ہو لیکن اس قول پر بھی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

(۱) لازم آئے گا کہ وہ جمادات وبہائم اور مجانین واطفال کا معبود نہیں ہے۔

(۲) لازم آئے گا کہ وہ ازل میں معبود نہیں ہے۔

کچھ حضرات نے یہ کہا کہ معبود وہ ہے جو ایسے افعال پر قادر ہو کہ اگر وہ انکو جود بخشے تو وہ ایسے لوگوں سے عبادت کئے جانے کا مستحق ہوجائے جن سے عبادت کا صدور صحیح ہو۔اس تعریف پر ازل میں معبود ہونا ثابت ہے جب کہ اول دونوں تعریف پر بہرحال یہ اعتراض قائم رہے گا کہ ازل میں اس کا معبود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

تفسیر دوم: ''الاله''الهتُ الی فلان'' سے مشتق ہے یعنی میں نے فلاں کے پاس سکون حاصل کیا پس الہ کو الہ اس لئے کہتے ہیں کہ عقول کو بغیر اس کے ذکر کے سکون نہیں ملتا اور روحوں کو اس کی معرفت کے بغیر عروج و کمال نہیں حاصل ہوتا۔اس کو درج ذیل وجہوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(۱) کمال،محبوب لذاتہ ہے اور حق کے ماسوا وہ ناقص لذاتہ ہے، کیونکہ ممکن من حیث ھوھو، معدوم ہے، اور عدم اصل نقصان ہے پس ناقص لذاتہ میں کامل لذاتہ کی تکمیل کے بغیر کمال نہیں آسکتا اور کامل لذاتہ حق تعالیٰ ہے تو ثابت کہ وہی محبوب لذاتہ بھی ہو۔ چنانچہ جو اس کو لذاتہ محبوب بنالیتا ہے اس کو مکمل سکون حاصل ہوجاتا ہے اور دنیا و آخرت کے حزن و ملال اور خوف و دہشت سے بے پرواہ ہوجاتا ہے۔اس لئے ارشاد ہوا''لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''۔

(۲) حق تعالیٰ کے ماسوا سب ممکن لذاتہ ہے اور ممکن لذاتہ قائم بذاتہ نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر سے متعلق ہوکر باقی رہتا ہے کیونکہ اس کا وجود ہی غیر کے وجود سے قائم ہوتا ہے۔پس کوئی ممکن بغیر تعلق واجب لذاتہ، وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ جب وجود خارجی کا یہ حال ہے تو وجود عقلی میں بھی ایسا ہی ہوگا چنانچہ عقلیں اس کی رحمت کے سائبان سے اور قلوب اس کے فضل و کرم کے دامان سے جب تک چمٹی رہیں عقل و دماغ اور ارواح و قلوب کو سکون میسر ہوتا رہتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ''۔

تفسیر سوم: الالہ ''**وله**'' سے مشتق ہے اور ''**وله**،ذھاب عقل''یعنی عقل چلے جانے کو کہتے ہیں خلق یعنی مخلوق دو طرح کی ہیں ایک قسم ان کی جو دریائے معرفت کے ساحل تک پہنچ گئی ہوں۔دوسری قسم ان کی جو اس سے محروم ہوں ایسے لوگ جہالت کی گھاٹیوں اور حیرت کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں گویا انہوں نے اپنی عقلوں اور روحوں کو بیکار کردیا ہے لیکن جو بحر معرفت کے ساحل تک پہنچ چکے ہوں ان کی رسائی عرصہ نور، اور جلال و کبریاء کے میدان تک ہوجاتی ہے اور وہ فردانیت وصمدیت کی وادیوں میں پہنچ کر عقل وحواس کو کھو بیٹھتے ہیں اس لحاظ سے اس کی معرفت میں ساری مخلوق کی عقلیں زائل ہیں لہٰذا وہ اس معنی کر بھی یقیناً ساری مخلوق کا الہ ہے۔

تفسیر چہارم: الہ ''**لاہ**'' سے مشتق ہے لاہ بلند ہونے کو کہتے ہیں اور حق سبحانہ تعالیٰ ممکنات کی مشابہت اور

محدثات کی مناسبت سے بلند ہے چنانچہ واجب لذاتہ صرف وہی ہے۔ کامل لذاتہ صرف وہی ہے، اپنی ہویت میں ایک یکتا حق صرف وہی ہے اپنے ماسوا، سب کا موجد صرف وہی ذات ہے۔ نیز وہ مکانیت کے اعتبار سے بلند ہونے سے بلند ہے کیونکہ مکان کے اعتبار سے جس کو بلندی ہوتی ہے ایسی بلندی میں بلندی بالذات مکان کو حاصل ہوتی ہے اور متمکن کو بالعرض بلندی ہوتی ہے۔ اور جو بالذات بلند ہو ظاہر ہے کہ بالعرض بلند سے اشرف وافضل ہوگا پس اگر مکانیت کے لحاظ سے بلندی ہو تو مکان کی بلندی، رحمن کی بلندی سے افضل، اشرف ہوجائے گی اور یہ بدیہی البطلان ہے۔ جب حق سبحانہ تعالیٰ کے حق میں مکانیت جیسی بلندی باطل ومحال ہے تو ہم نے جان لیا کہ مکان جیسی بلندی سے وہ بلند تر ہے۔

تفسیر پنجم: ''الہ فی الشئ'' سے ماخوذ ہے یہ اس وقت کہتے ہیں جب شئ کے بارے میں متحیر ہوجائے اور اس تک راہ یاب نہ ہو۔ چنانچہ بندہ جب اس بارے میں فکر کرتا ہے تو متحیر ہوجاتا ہے کیونکہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے ارباب عقول واذہان مسئلہ الٰہیات میں حیرت زدہ ہیں۔

تفسیر ششم: ''لاہ یلوہُ'' سے مشتق ہے حجاب میں ہونے کو کہتے ہیں اس کا محتجب ہونا کئی وجوہ سے ہے۔

اول: وہ اپنے کنہ صمدیت میں عقول سے محتجب ہے مثال کے طور پر اگر فرض کرلیا جائے کہ وسط آسمان میں سورج ٹھہرا ہے متحرک نہیں ہے تو سورج کی روشنی دیواروں پر ٹھہری رہے گی اس سے زائل نہ ہوگی اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دیوار پر سورج کی جو روشنی پڑ رہی ہے وہ اس کی ذاتی ہے چونکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب سورج غائب ہوجاتا ہے تو سورج کی روشنی بھی دیوار سے غائب ہوجاتی ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ روشنیاں جو آرہی ہیں وہ سورج کی ٹکیہ سے حاصل ہوتی ہیں بلاتشبیہ وتمثیل، جملہ عالم مخلوقات کی طرف، اللہ عزشانہ کی بارگاہ قدس سے جو وجود حاصل ہوا ہے وہ اس نور کی طرح ہے جو قرص شمس سے حاصل ہوتا ہے پس اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے طلوع وغرب، اور غیبت و حضور جائز وصحیح ہے تو اس کے غروب کے وقت ممکنات سے وجود کی روشنی گم ہوجائے گی اس سے ظاہر ہے کہ ممکنات کے وجود کا نور اسی سے ہے وہی مطلع انوار ہے لیکن چونکہ جب طلوع وغروب اس کے حق میں محال ہے تو اس لئے بعض ناقص ذہن میں یہ خطرہ گذرتا ہے کہ تمام اشیاء بذاتہا موجود ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے نور کے احتجاب کا سبب اس کا کمال ہے اسی لئے بعض محققین نے کہا ہے کہ پاک ہے وہ ذات جو اپنی شدت ظہور کے باعث عقول سے پوشیدہ ہے اور اپنے کمال نور کے سبب عقلوں سے مخفی ہے پھر حضرت شیخ الاسلام کا وہی شعر پڑھئے۔

ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے مگر پنہاں ہے
مرے معبود تیری پردہ نشینی ہے عجیب

تفسیر ہفتم: ''الہ الفصیل'' سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب گائے کا بچہ اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ چونکہ بندہ ہر حال میں بارگاہ خداوندی میں تضرع کے ساتھ چمٹ جاتا ہے اس پر کئی امور دال ہیں۔

(۱) انسان جب کبھی بہت بڑی مصیبت وآفت میں گھر جاتا ہے تو وہ اس وقت سب چیز کو چھوڑ کر صرف خدا کی طرف رجوع کر جاتا ہے اور قلب وزبان سے یارب، یارب کرنے لگتا ہے لیکن جب وہ مصیبتوں سے چھٹکارا پا جاتا ہے اور نعمتوں وراحتوں کے دن آتے ہیں تو وہ خدا کو بھولنے لگتا ہے۔ اور اسباب ضعیفہ واحوال خسیسہ پر بھروسہ کرنے لگتا ہے۔ بندہ کا یہ فعل یقینا اس کی پہلی حالت کے متناقض ہے۔ کیونکہ آفات وحادثات سے چھٹکارا دینے والا اور خیرات و راحات کا عطا کرنے والا اگر کوئی غیر اللہ ہے تو اس کو نزول بلا کے وقت بھی غیر اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا واجب تھا لیکن اگر تمام مہمات کا مصلح صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے اور یقینا ہے تو واجب ہے کہ جس طرح اس نے بوقت نزول بلیات وآفات صرف خدا کو یاد کیا تھا تو بوقت راحت وآسائش بھی خدائے تعالیٰ ہی کو یاد کرنا چاہئے تھا لیکن بوقت مصیبت و بلا اسکو پکارنا اور بوقت راحت اسکو بھول جانا اہل ایمان کا شیوہ نہیں ارشاد باری تعالیٰ ''اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا'' (المعارج/20، 21) یعنی جب انسان کو مصیبت پہنچتی ہے تو ہڑ بڑا اٹھتا ہے اور جب راحت پہنچتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، اس میں انسان کی اسی دوہری پالیسی کا ذکر ہے۔

(۲) خیر وراحت سب اللہ تعالیٰ ہی سے مطلوب ہے اور طلب کے لئے تضرع الحاح اور اس کی بارگاہ میں دست سوال دراز کرنا ضروری ہے۔

(۳) بظاہر احسان فرمانے والا یا تو اللہ تعالیٰ ہے یا اس کا غیر ہے۔ اگر غیر احسان کرنے والا ہے تو غیر کے قلب میں اللہ تعالیٰ نے احسان کا داعیہ اور رحم کا جذبہ پیدا کیا ہے جبھی تو اس نے احسان کیا ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ محسن حقیقی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور جب وہی محسن حقیقی ہے تو لازم ہے کہ ہر حالت واوقات میں صرف اسی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

حکایت: کچھ مریدین نے اپنے شیخ ومرشد سے کثرت وسوسہ کی شکایت کی، اس پر شیخ نے کہا میں دس سال تک لوہار رہا، پھر دس سال تک دھوبی رہا اور پھر تیسرے دس سال میں محافظ ونگراں رہا۔ مریدین نے عرض کیا ہم نے تو کبھی آپ کو لوہار، دھوبی اور نگراں نہیں دیکھا ہے شیخ نے فرمایا میں نے یہ تینوں پیشہ کیا ہے لیکن تم نے اسے دیکھا نہیں، کیا تم نہیں جانتے ہو کہ قلب لوہا کی طرح ہے پس میں مثل لوہار اپنے قلب کو خوف الٰہی کی آگ میں تپا تپا کر دس سال تک نرم

کرتا رہا پھر میں اس کے بعد قلب کو گناہوں کے زنگوں سے دس سال تک متواتر دھوتا رہا پھر میں اس کے بعد دروازہ قلب پر ''لا الہ الا اللہ'' کی شمشیر براں لیکر بیٹھ گیا پس میں لگا تار دس سالوں تک ایسا ہی رہا یہاں تک کہ قلب سے غیر اللہ کی محبت نکل گئی اور اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت داخل ہوگئی۔ پس جب عرصۂ قلب غیر اللہ سے خالی ہوگیا اور حب الٰہی اس میں پختہ اور قوی ہوگئی تو عالم جلال کے سمندر سے ایک قطرہ نور گرا جس میں قلب غرق ہوکر رہ گیا جس سے سب چیزیں فنا ہوگئیں اور خود میں سب سے فنا ہوگیا اور اس میں صرف، اسرار کلمہ لا الہ الا اللہ ہی باقی رہ گئے۔

تفسیر ہشتم: ''الاله'' الہ ''الرجل یأله'' سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی پر سخت مصیبت نازل ہوتی ہے جس سے مصیبت زدہ گھبرا جاتا ہے تو کوئی اس کو پناہ دیتا ہے۔ اور یہ معلوم کہ تمام مخلوقات کو ہر چھوٹی بڑی مصیبت سے پناہ دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ'' اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ (المومنون: ۸۸) اور اس لئے بھی کہ وہی در حقیقت منعم ہے ارشاد باری ہے۔ ''وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ'' اور تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے۔ (النحل: ۵۳) اور اس لئے کہ وہی کھلانے والا ہے ارشاد الٰہی ہے ''وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ'' اور وہ کھلاتا ہے اور کھانے سے پاک ہے۔ (الانعام: ۱۴) اور اس لئے کہ وہی وجود بخشنے والا ہے ارشاد خالق کائنات ہے ''قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ'' غرض اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ہی ذات عدم سے وجود دینے والی اور عدم کو قوت و فعل اور تکمیل کے مراحل سے گذارنے والی ہے لہذا وہی ذات صرف اللہ ہے جس سے ہر مصیبت میں فریاد کی جاسکتی ہے۔

مسئلہ دوم: اسم جلالت: لفظ اللہ کی تفسیر میں قاضی بیضاوی نے تقریبا یہی مذکورہ باتیں کہی ہیں لیکن بہت مختصر مگر جامع ہیں ہم ذیل میں اپنے انداز میں بیضاوی کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر بیضاوی: لفظ اللہ کے بارے میں چار اقوال ہیں

(۱) لفظ اللہ اسم مشتق ہے۔ (۲) علم۔ (۳) صفت مشتقہ۔ (۴) لفظ اللہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔

وجہ حصر: لفظ اللہ عربی زبان کا لفظ ہوگا یا غیر عربی ہوگا اگر غیر عربی ہے تو سریانی زبان کا لفظ ہوگا جو اصل میں لاھا ہے آخر کے حرف کو حذف کر کے اول میں الف لام داخل کر دیا اور مدغم ہوکر اللہ ہوگیا۔ اگر عربی ہے تو علم ہوگا یا اسم مشتق ہوگا، علم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہی سے ذات معین کے لئے وضع کیا گیا ہوگا اگر علم ہے تو قول دوم ہے اور اگر مشتق ہے تو پھر دو صورتیں ہیں اسم مشتق ہوگا یا صفت مشتقہ ہوگا اگر صفت مشتقہ ہے تو قول ثالث اور اگر اسم مشتق ہے تو قول اول ہے۔

پہلا قول یہ ہے کہ لفظ اللہ اسم مشتق ہے، اس کے بیان سے پہلے ایک مقدمہ کی تمہید ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ لفظ جو فعل اور حرف کے مقابل بولا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) علم (۲) اسم جنس (۳) صفت مشبہ، دلیل حصر یہ ہے کہ اسم کا نفس تصور شرکت سے مانع ہوگا یا نہیں اگر مانع ہے تو علم اگر مانع نہیں تو اس کی دو صورت ہے یا تو اس سے ذات من حیث الذات سمجھ میں آئے گی بغیر اتصاف بالمعنی کے یا پھر ذات کے ساتھ ساتھ کوئی معنی وصفی بھی سمجھ میں آتا ہوگا اول کو اسم جنس اور ثانی کو صفت مشتقہ کہتے ہیں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ مشتق، اسم جنس اور علم کے بالمقابل آتا ہے لیکن قاضی بیضاوی نے مشتق سے اسم جنس اور علم کے مقابل معنی مراد نہیں لیا ہے بلکہ مشتق سے مراد یہ ہے کہ کسی اصل سے ماخوذ ہونا چاہئے صفت ہو یا اسم ہو اور ذات سے مراد وہ چیز ہے جو مستقل بالمفہومیت ہے اور معین سے مراد یہ ہے کہ اس میں کسی قدر تعین ہو خواہ شخصی ہو یا نوعی یا جنسی، اول کی مثال زید دوم کی فرس اور سوم کی حیوان ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھئے کہ جنہوں نے لفظ اللہ کو اسم مشتق کہا ہے ان کے نزدیک لفظ اللہ کی اصل الہ ہے اور الہ لغوی حیثیت سے ہر معبود پر بولا جاتا ہے خواہ معبود برحق ہو یا معبود باطل ہو لیکن اس پر جب لام عہد داخل ہوتا ہے تو بطور غلبہ معبود برحق کے لئے استعمال ہوتا ہے پھر اس کے ہمزہ کو خلاف قیاس حذف کر کے الف لام اس کے عوض لایا گیا اسی وجہ سے یا اللہ منادی ہونے کی صورت میں ہمزہ قطعی کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تاکہ معرف باللام سے ممتاز ہو جائے مگر لفظ اللہ تو معبود برحق ہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے علاوہ پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ غرض لفظ اللہ جب اسم مشتق ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی مشتق منہ ہوگا مشتق منہ کے بارے میں سات اقوال ہیں۔

قول اول: یہ ہے کہ وہ ''الہ الھۃ و الوھیۃً'' سے ماخوذ ہے جو باب فتح سے ہے جس کے معنی ہیں عبادت کرنا تو اب اِلٰہ معنی میں مالوہ یعنی معبود کے ہوگا چونکہ اللہ تعالیٰ ساری مخلوقات کا معبود ہے اس وجہ سے اس کو اللہ کہتے ہیں اور اسی الہ سے باب تفعل سے ''تألہ'' آتا ہے جس کے معنی یہ ہیں ''صار کا لعبد'' یعنی غلام کی مانند ہو گیا اور باب استفعال سے ''استالہ'' آتا ہے جس کے معنی ہیں صار مشابھا للعبد یعنی عبد کے مشابہ ہو گیا۔

قول دوم: یہ ہے کہ یہ ''أله'' سے ماخوذ ہے جو باب سمع سے ہے جس کے معنی ہیں متحیر ہو جانا پس اس صورت میں مالوہ کے معنی ہوں گے جس کے بارے میں سب متحیر ہوں اس معنی کر اللہ کو اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی معرفت میں تمام عقلیں متحیر ہو کر رہ گئیں یہی وجہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے سلسلہ میں بڑے بڑے اہل عقل گمراہ ہو گئے۔

قول سوم: یہ ہے کہ یہ ''الھت الی فلان'' سے ماخوذ ہے یعنی میں نے فلاں کے پاس جا کر سکون و اطمینان

حاصل کیا پس الہ کے معنی یہ ہونگے جس کے قرب میں سکون حاصل کیا جائے اور اس معنی کر اللہ کو اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ قلوب اس کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" مولانا روم فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام
شیر و شکر می شود جانم تمام

نیز مومنین کی روحیں اس کی معرفت حاصل کر کے سکون حاصل کرتی ہیں اور بے چین دل، پریشان ذہن اور مضطرب الحال انسان کو صرف وہی ذات سکون واطمینان عطا کر سکتی ہے۔

قول چھارم: یہ ہے کہ یہ اس الہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہوتے ہیں، نازل شدہ مصیبت سے گھبرانا اور پھر اس کے بعد لفظ "الھه" استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے مصیبت زدہ شخص کی مصیبت کو دور کرنا اور پناہ دینا گویا الہ ملجأ کے معنی میں ہے یعنی جائے پناہ۔ پس معبود کو الہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ مصیبت سے گھبرایا ہوا شخص معبود کی پناہ پکڑتا ہے اور معبود اس کو پناہ دیتا ہے اگر پناہ دینے والا معبود برحق ہے تو حقیقتاً پناہ دیتا ہے اور اگر معبود باطل ہے تو صرف اس کے گمان باطل کے لحاظ سے وہ اس کا پناہ دہندہ ہے۔

قول پنجم: یہ ہے کہ "اله الفصیل" سے مشتق ہے، فصیل اونٹ کے بچہ کو کہتے ہیں یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ اونٹ کا بچہ اپنی ماں کا بہت زیادہ مشتاق ہوتا ہے اور اس سے جا کر چمٹ جاتا ہے پس الہ کے معنی یہ ہوں گے جس کے پاس جا کر بندے چمٹ جائیں اور اللہ کو اللہ اس معنی کر اس لئے کہتے ہیں کہ بندے مصیبت کے وقت گڑگڑا کر رحمت الٰہی کے مشتاق ہوتے ہیں اسی کے ذکر میں لگ جاتے ہیں گویا اللہ کے قرب میں جا کر چمٹ جاتے ہیں۔

قول ششم: یہ ہے کہ یہ "وله" سے ماخوذ ہے جس کے معنی متحیر ہونے اور مخبوط العقل ہونے کے ہیں وجہ تسمیہ وہی ہے جو الہ بمعنی تحیر میں مذکور ہوئی مگر ان دونوں میں فرق لفظی طور پر ہوگا کہ الہ کی صورت میں ہمزہ اصلی ہوگا اور ولہ کی صورت میں ہمزہ واو سے مبدل ہوگا۔

قول ھفتم: یہ ہے کہ یہ "لاہ یلیه لیها و لاهاً" سے مشتق ہے اس کے دو معنی آتے ہیں ایک پوشیدہ ہونا، دوسرے بلند ہونا، اب الہ کی اصل لاہ ہوگی، الف لام داخل کر کے اللہ بنایا گیا اور لاہ کے معنی محتجب و مرتفع کے ہوں گے پس اللہ کو اللہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی ذات میں دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ احتجاب کا معنی تو ظاہر ہے کہ وہ مخلوقات کی

نگاہوں سے مخفی، پوشیدہ ہے۔اور ارتفاع کا معنی بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی سے بالاتر ہے اور ان تمام نقائص سے پاک ہے جو اس کی شایان شان نہیں۔

دوسرا قول: علم کا ہے یعنی لفظ اللہ ذات مخصوص کا علم ہے۔ چنانچہ وہ کسی اصل سے ماخوذ نہیں ہے یہ قول زجاج نحوی اور سیبویہ کی طرف منسوب ہے ان حضرات نے اپنے نظریہ کی تائید میں تین دلیلیں پیش کی ہیں۔

دلیل اول: یہ لفظ اللہ صرف موصوف بنتا ہے اور تمام اسماء اس کے صفات واقع ہوتے ہیں اور یہ کبھی صفت واقع نہیں ہوتا۔ پھر یہ ذات باری تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے لہذا علم ذات ہونا ظاہر ہے۔

دوسری دلیل: اللہ عزشانہ تعالیٰ کے لئے ایک اسم ایسا ہونا چاہئے جس پر اس کے تمام اوصاف وکمالات جاری و محمول ہوسکیں اور وہ خود کسی کی صفت نہ بنے پس جب ہم اس کے ان اسماء کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر صحیح و درست ہے تو ان میں لفظ اللہ کے سوا کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس پر تمام اوصاف جاری ہوں اس لئے لفظ اللہ صفت نہیں ہوسکتا جب صفت کی نفی ہوگئی تو اسمیت کا ثبوت ہوگیا اور چونکہ یہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے لہذا علم ہے۔

تیسری دلیل: لفظ اللہ کو اگر صفت مانا جائے تو ذات باری تعالیٰ پر اس کا اطلاق صفات غالبہ کے طور پر ہوگا جیسے صفت رحمن کا اطلاق صفت غالبہ کے طور پر ہوتا ہے اور جب اس کا استعمال صفت غالبہ کے طور پر ہوگا تو "لاالہ الا اللّٰہ" مفید توحید نہ رہے گا جس طرح "لاالہ الاالرحمن" مفید توحید نہیں، اور "لاالہ الا اللّٰہ" کا مفید توحید نہ ہونا باطل ہے کیوں کہ "لاالہ الا اللّٰہ" کے مفید توحید ہونے پر اجماع ثابت ہے لہذا لفظ اللہ کا صفت ہونا باطل ہے۔ رہا یہ امر کہ یہ مفید توحید کیوں نہیں تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ صفت کا مدلول معنی وصفی ہوتا ہے جس میں ابہام ہوتا ہے ذات معین اس کا مدلول نہیں ہوتی ضرورت کی وجہ سے اس میں ذات کا اعتبار کیا جاتا ہے تاکہ وصفی معنی کا اس کے ساتھ قیام ہوسکے اور معنی وصفی مانع شرکت نہیں ہے، اس لئے اللہ اگر معنی وصفی پر دلالت کرے تو مانع شرکت نہ ہوگا۔ بخلاف علم کے کہ اس میں شرکت نہیں ہوتی۔

تیسرا قول: وصف ہونے کا ہے۔ یعنی لفظ اللہ حقیقت میں وصف ہے مذہب اول اور اس مذہب میں فرق یہ ہے کہ مذہب اول یعنی اسم مشتق کی صورت میں لفظ اللہ کو اسم مانا تھا اور اسم میں ذات معینہ پر دلالت کسی نہ کسی طرح بہر حال ہوتی ہے لیکن اس تیسرے مذہب کے نظریہ صفت کی صورت میں ذات پر دلالت نہیں ہوتی کہ صفت کے اندر معنی

وصفی تو متعین ہوتے ہیں مگر ذات ابہام کے درجہ میں ہوتی ہے الغرض مسلک ثالث یہ ہے کہ لفظ اللہ وصف ہے لیکن اس قول پر ماقبل کے دو اعتراضات وارد ہوں گے اول یہ کہ جب وصف ہے تو پھر کسی اسم کی صفت کیوں نہیں بنتا۔ دوم یہ کہ صفت ماننے کی صورت میں مانع شرکت نہیں ہوگا جس کی وجہ سے کلمہ لا الہ الا اللہ مفید توحید نہیں ہوگا۔

جواب: دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے کہ جب بطور غلبہ یہ ذات باری ہی کے لئے اس طور پر مخصوص ہو گیا کہ علم کی حیثیت اختیار کر لی تو پھر امتناع وصف اور عدم احتمال شرکت میں وہ علم ہی کے قائم مقام ہو گیا، پس جس طرح علم کے اوصاف تو ذکر کئے جاتے ہیں لیکن وہ خود کسی کا وصف نہیں ہوتا اور جس طرح علم شرکت کا احتمال نہیں رکھتا ایسے ہی لفظ اللہ بھی کسی کا وصف نہیں بنتا اور نہ شرکت کا احتمال رکھتا جیسے الثریا اور لفظ الصعق کہ حقیقت میں یہ وصف تھے لیکن بطور غلبہ علم ہو گئے۔ اور علم کی حیثیت اختیار کر لی اسی طرح لفظ اللہ بھی علم ہو گیا۔

دلیل اول: قاضی بیضاوی نے لفظ اللہ کو وصف قرار دیا ہے اور اسی کو اظہر قرار دیا ہے۔ اور اس کی اظہریت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کی ذات فی نفسہ بغیر کسی امر آخر کا اعتبار کئے ہوئے خواہ وہ امر آخر صفت حقیقی ہو یا صفت اضافی ہو، انسان کی عقل میں نہیں آسکتی لہٰذا کسی لفظ کا مدلول بھی نہیں ہوسکتی اس لئے کہ الفاظ تو ان چیزوں پر دلالت کرتے ہیں جو ذہن میں پائی جاتی ہیں اور ذات باری تعالیٰ ذہن میں نہیں پائی جاسکتی تو ذات باری کسی لفظ کا مدلول نہیں بن سکتی لہذ الفظ اللہ کے بارے میں یہ کہنا کہ ذات باری کے لئے وضع کیا گیا ہے درست نہیں۔

دلیل دوم: وصف ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے اگر لفظ اللہ علم ذاتی ہو تو ارشاد باری تعالیٰ ''وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ'' کا معنی بمطابق عقیدہ صحیحہ حقہ درست نہ ہوگا اس لئے کہ اس صورت میں معنی ہوگا وہ ذات جو شخص ہے آسمانوں میں ہے اس معنی پر آسمان ذات باری کا محل قرار پائے گا اور وہ محل حوادث ہو جائے گا جو اس کی شان کے لحاظ سے بدیہی البطلان ہے کہ جو محل حوادث ہے وہ خود حادث ہے حالانکہ وہ ازلی قدیم ہے۔

دلیل سوم: وصف ہونے پر تیسری دلیل یہ ہے کہ لفظ اللہ اصول مذکورہ یا صیغہائے مذکورہ سے مشتق ہے اور اشتقاق کا معنی ہے دو لفظوں میں سے ایک کا دوسرے کے لفظ و معنی میں مشارک ہونا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ اللہ اور اس کے ساتوں مشتقات منہ کے درمیان لفظی و معنوی اعتبار سے مشارکت ہے اس لئے لفظ اللہ کو بہر حال مشتق تو ماننا ہی پڑیگا لیکن اشتقاق کے معنی کا ثابت ہونا کسی لفظ کے اندر یہ اس کے مشتق ہونے کی دلیل ظنی ہے اور مباحث لغوی کے اندر دلیل ظنی کافی ہے لہذ الفظ اللہ کا مشتق ہونا ثابت ہے اب یہ مشتق اسم ہوگا یا وصف ہوگا دلائل مذکورہ سے ظاہر ہے کہ

یہ وصف ہے لیکن ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس لئے صفات غالبہ کے طور پر ذات باری کے لئے استعمال ہونے لگا۔

چوتھا قول: یہ ہے کہ لفظ ''اللہ'' سریانی زبان کا لفظ ہے اصل لاھاً ہے الف کے ساتھ اور بعض نے کہا کہ یہ عبرانی لفظ ہے ان کی زبان میں الف کے ساتھ بولا جاتا ہے جیسے فارسی میں الہا کہتے ہیں معبود کے معنی میں ہے پھر اس کو عربی بنالیا گیا وہ اس طرح کہ آخر کے الف کو حذف کر دیا گیا اور محض ابتداء کرنے کی وجہ سے شروع میں الف لام زیادہ کر دیا پھر بعد ادغام لفظ اللہ ہو گیا۔

مسئلہ سوم: باعتبار لغت لفظ اللہ کے مشتق ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا کہ یہ لفظ عربی نہیں ہے بلکہ عبرانی و سریانی ہے جیسا کہ گذرا وہ کہتے ہیں کہ ''الھا ر حمانا و مرحیانا'' تھا لیکن معرب ہو کر ''اللّٰہ الرحمن الرحیم'' ہو گیا مگر یہ بعید معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں لغت میں مشابہت پائے جانے کی وجہ سے یہ لازم نہیں کہ اس لفظ کے اصل عربی ہونے میں کوئی طعن ہو۔ اس پر دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ'' (لقمان:۲۵) اور ارشاد ہے ''هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا'' (مریم:۶۵) اور سب کا اتفاق ہے کہ اس سے لفظ اللہ مراد ہے۔

اس کے علاوہ اکثر حضرات کا قول ہے کہ یہ لفظ عربی ہے مگر جو اسم علم مانتے ہیں انہوں نے اشتقاق کی بحثوں سے اعراض کیا ہے۔ البتہ جو اسم علم ہونے کے منکر ہیں ان میں دو قول ہے۔ کوفیوں کا کہنا یہ ہے کہ اس لفظ کی اصل الاہ ہے اس پر تعظیم کے لئے الف لام داخل کر دیا گیا تو الالاہ ہو گیا پھر ہمزہ بر بنائے ثقالت حذف کر دیا گیا اب دو لام اکٹھے ہوئے پس اول کو دوم میں ادغام کر دیا تو لفظ اللہ ہو گیا، اس کے برعکس بصری حضرات کہتے ہیں اس کی اصل لاہ ہے پس اس کے ساتھ الف لام کو لاحق کر دیا تو اللہ ہوا

مسئلہ چہارم: خلیل نحوی نے کہا ہے کہ تمام مخلوق کا اجماع ہے کہ لفظ اللہ، اللہ عز شانہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے بلکہ الالہ بھی اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے لیکن بہت سے لوگ غیر اللہ پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں کچھ اضافت کے ساتھ جیسے کہا جاتا ہے۔ الہ کذا، اور کچھ بلا اضافت جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قوم موسیٰ علیہ السلام کی خبر دیتے ہوئے فرمایا ''اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ'' (الاعراف:۱۳۸) بولے اے موسیٰ! ہمیں ایک خدا بنا دے جیسا ان کے لئے اتنے خدا ہیں، بولا تم ضرور جاہل لوگ ہو۔

مسئلہ پنجم: اسم جلالت لفظ اللہ کے بہت سے ایسے خواص ہیں جو دوسرے اسماء میں نہیں ہیں ذیل میں اس اسم مبارک کے چند خواص کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خاصہ اولیٰ: جب لفظ اللہ سے الف کو حذف کر دیا جائے تو یہ اسم ''لله'' کی صورت میں باقی رہتا ہے اور یہ بھی اللہ سبحانہ کے ساتھ خاص ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ'' اور اللہ ہی کی ملک ہیں تمام لشکر آسمانوں اور زمین کے۔ (الفتح:۴) اور ارشاد ہے ''وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ'' اور اللہ ہی کیلئے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے۔ (المنافقون:۷) پھر اگر للہ سے لام اولیٰ کو حذف کر دیا جائے تو ''لہ'' باقی رہے گا جیسا کہ ارشاد ہے ''لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' اسی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں۔ (الزمر:۶۳) اور ارشاد ہے ''وَلَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ'' اسی کا ملک ہے اور اسی کی تعریف۔ (التغابن:۱) پھر لہ سے لام کو حذف کر دیا جائے تو ''ھو'' باقی رہتا ہے یہ بھی باری تعالیٰ عز شانہ پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' (الاخلاص:۱) اور ارشاد ہے ''هُوَ الْحَيُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' (غافر:۶۵) اور یہ معلوم ہے کہ ھو میں واؤ زائد ہے کیونکہ تثنیہ وجمع کی صورت میں واؤ نہیں آتا ہے کہتے ہیں ھما، ھم پس ان دونوں میں واؤ باقی نہیں رہتا اسی طرح لفظ اللہ میں ہر جگہ یہ خاصیت پائی جاتی ہے جب کہ دوسرے اسماء میں یہ بات نہیں۔ پھر جس طرح باعتبار لفظ ''اللہ'' یہ خاصیت خاصہ پائی جاتی ہے۔ باعتبار معنی بھی خاصیت موجود ہوتی ہے وہ اس طرح کہ جب کوئی اللہ عز شانہ سے دعا کرے لفظ یا رحمن سے تو اس نے صفت رحمت سے متصف کر کے دعا کیا لیکن اس نے اس کو دوسری صفت قہر وغیرہ سے متصف نہیں کیا۔ اسی طرح جب اسکو یا علیم سے یاد کرے تو اس نے صفت علم سے متصف کر کے تو اسکا ذکر کیا لیکن صفت قدرت وغیرہ سے متصف نہیں کیا لیکن جب بندہ یا اللہ کہتا ہے تو گویا اس نے اس کو اس کے تمام صفات کمالیہ سے متصف کر کے یاد کیا کیونکہ الٰہ، الٰہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ اپنی تمام صفات کمالیہ کا جامع نہ ہو البتہ دعا میں اسم جلالت لفظ ''اللھم'' کے بجائے لفظ ''ربنا'' کا استعمال طریقہ انبیاء ہے چنانچہ حضرات انبیائے کرام سے قرآن حکیم میں جو دعائیں منقول ہیں ان میں اکثر دعاؤں میں ''ربنا'' ہی مذکور ہے کہ ''ربنا'' قبولیت کے لئے اکسیر ہے۔ ''احسن الدعاء لآداب الدعاء'' میں ہے۔

''پانچ بار ''یا ربنا'' کہنا بھی مؤثر اجابت ہے۔ قرآن مجید میں اس لفظ مبارک کو پانچ بار ذکر کر کے اس کے بعد ارشاد فرمایا ''فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ'' تو ان کی دعا قبول کی ان کے رب نے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جو شخص عجز کے وقت پانچ بار "یاربنا" کہے اللہ تعالیٰ اسے اس چیز سے جس کا خوف رکھتا ہے امان بخشے اور جو چیز چاہتا ہے عطا فرمائے۔ پھر یہ آیتیں تلاوت کیں۔ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، الی قوله تعالیٰ، اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" (آل عمران/191 تا194)

ابن ابی حاتم نے حضرت عطا سے روایت کیا فرماتے ہیں جو بندہ تین بار یارب، یارب، یارب کہے اللہ تعالیٰ اس پر نظر کرم فرماتا ہے، جب یہ قول حضرت خواجہ حسن بصری سے بیان کیا گیا تو آپ نے اس کی تائید میں یہ آیت کریمہ تلاوت کی اور فرمایا کہ اس آیت میں بار بار ربنا فرمایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک بار موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا "یارب" اے میرے رب فوراً جواب آیا "لبیک" اے موسیٰ میں حاضر ہوں موسیٰ علیہ السلام اس جواب پر بہت خوش ہوئے عرض کیا اے مولیٰ کیا یہ صرف میری خصوصیت ہے کہ میری پکار پر تو نے جواب دیا یا دوسروں پر بھی یہ کرم ہوگا فرمایا نہیں بلکہ جو بندہ مجھے رب کہہ کر پکارے گا میں اس کے جواب میں لبیک فرماؤں گا (روح المعانی)

خاصہ ثانیہ: اس اسم شریف کا عظیم خاصہ یہ ہے جو کلمہ طیبہ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے، کلمہ طیبہ لااله الاالله محمد رسول الله، کی خصوصیت یہ ہے کہ کفر وشرک میں مبتلا شخص جب اس کو پڑھ لیتا ہے تو وہ وادی کفر سے نکل کر دائرہ اسلام میں داخل ہوجاتا ہے لیکن کلمہ طیبہ کو یہ خصوصیت و برکت صرف اسم جلالت لفظ "الله" کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے کیونکہ کوئی کافر لااله الاالرحمن، الاالرحیم، الا الملک القدوس وغیرہ اسمائے حسنیٰ سے اس کے معبود ہونے کا اقرار کرلے تو بھی کفر سے خارج اور اسلام میں داخل نہ سمجھا جائے گا لیکن اس کی بجائے اگر اشهد أن لااله الا الله، کہہ دیتا ہے تو وہ کفر وشرک سے نکل جاتا ہے اور اسلام میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس اسم شریف کی ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے اسماء کو حاصل نہیں۔ بیشک اللہ ہی تعالیٰ صواب کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔

فوائد ولطائف کا بیان

فائدہ (۱): قرضدار کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ دور ہی سے اپنے قرض خواہ کو دیکھتا ہے تو اس سے راہ فرار اختیار کرتا ہے لیکن اللہ کریم اپنے بندوں سے فرماتا ہے۔ اے میرے بندو! تم میرے قرضدار ہو کثرت گناہ کے ارتکاب اور ناشکری نعمت کے سبب تم قرضدار ہوگئے لیکن تم مجھ سے بھاگو نہیں بلکہ میں کہتا ہوں "فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ" (الذاریات:۵۰) کہ میری طرف دوڑ کر آؤ میں ہی وہ ہوں جو تمہارے قرض ادا کردونگا اور تمہاری مغفرت

فرماں دونگا۔ نیز دنیا کے بادشاہوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ غریبوں اور فقیروں کے لئے ان کے دروازے بند رہتے ہیں اور امراء کے لئے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں لیکن میری بارگاہ کا اس سے الگ قانون ہے کہ فقراء کے لئے میری رحمت کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔

فائدہ (۲): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بیشک اللہ عز شانہ کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے اس نے جن وانس، طیور و بہائم وغیرہ جملہ مخلوقات کے درمیان ایک رحمت کو نازل فرمایا ہے۔ اسی ایک رحمت کے ظہور کا نتیجہ ہے کہ ان کے درمیان لطف و مہربانی اور آپسی مودت و محبت کا دور دورہ قائم ہے۔ اور ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ روز قیامت ظاہر فرمائے گا جن سے وہ اپنے مومن بندوں پر رحم فرمائے گا۔ واضح رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بطور تفہیم وارد ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ رحمن ورحیم کی رحمتوں کے سمندر کا کنارہ نہیں لہذا عقلا اس کی تحدید ممکن نہیں ۔

فائدہ (۳): حضور رحمت عالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں سے فرمائے گا کہ اے میرے بندو! کیا تم کو پسند ہے کہ تم مجھ سے ملاقات کرو (یا کیا تم مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہو) اسوقت بندے عرض کریں گے ہاں میرے پروردگار! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں؟ بندے کہیں گے مولیٰ ہم تیرے فضل و کرم اور عفو و مغفرت کے امیدوار ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے بندو میں نے تمہارے لئے اپنی مغفرت اپنے ذمہ کرم پر واجب کرلیا ہے۔

فائدہ (۴): حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بعض (گنہگار) بندوں کے سامنے ان کے گناہوں کے ایسے ایسے ننانوے دفتر پھیلا دے گا جن میں سے ہر ایک تا حد نگاہ طویل و عریض ہوگا پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا اے میرے بندہ! کیا تم اس میں سے کسی کا انکار کرتے ہو، کیا کراماً کاتبین نے تم پر کوئی ظلم تو نہیں کیا، بندہ کہے گا نہیں اے میرے رب، اللہ فرمائے گا اے بندہ ان گناہوں کے کرنے میں تم کوئی عذر پیش کر سکتے ہو، بندہ کہے گا نہیں میرے رب، پھر وہ بندہ اپنے قلب کو آگ پر رکھ دیگا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ بیشک میرے نزدیک تیری ایک نیکی ہے اور بیشک آج کے دن کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا پھر اللہ تعالیٰ ایک پرچہ نکالے گا جس میں "اشهد أن لااله الا الله واشهد أن محمدا رسول الله" لکھا ہوگا، بندہ عرض کرے گا اے مولیٰ ان گناہوں کے دفاتر کے سامنے اس ایک پرچہ کی کیا حیثیت ہے؟ پس اس پرچہ کو میزان

کے ایک پلہ میں اور تمام دفاتر گناہ کو دوسرے پلہ میں رکھا جائے گا تو پرچہ کلمہ شہادت کا پلہ بھاری ہوجائے گا اور تمام سجلات ہلکے پڑ جائیں گے کہ ذکر الٰہی سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہیں ہوسکتی۔

فائدہ (۵): مروی ہے کہ ایک بچہ کسی غزوہ میں پایا گیا جو سخت لوگرمی میں پڑا ہوا تھا پس ایک خاتون نے اس بچہ کو دیکھا تو بچہ کے پاس آئی اور اس کو اٹھا کر اپنے سینہ سے چمٹا لیا پھر اس کو گرمی سے بچانے کے لئے خود زمین پر بیٹھ گئی اور اپنے پیٹ پر بچہ کو بیٹھا لیا اور بولی **ابنی ابنی**، میرا بیٹا میرا بیٹا اس اداء مشفقانہ کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ تم کو اس خاتون کی اپنے بیٹا کے ساتھ شفقت کو دیکھ کر تعجب ہوا تو سن لو کہ بیشک اللہ عز شانہ تعالیٰ تم سبھوں پر اس خاتون کی اپنے بیٹا پر شفقت سے زیادہ مہربان ہے۔ حضرات صحابہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

★★★

★★

باب دھم

قول: "الرحمن الرحیم" کے بیان میں

بحث کے آغاز میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اشیاء چار طرح کی ہوتی ہیں:

☆ ایک وہ شئی جو نفع بخش اور ساتھ ساتھ ضروری بھی ہو۔
☆ دوسری وہ شئی جو نفع بخش تو ہو لیکن ضروری نہ ہو۔
☆ تیسری وہ شئی جو ضروری تو ہو لیکن نفع بخش نہ ہو۔
☆ چوتھی وہ شئی جو نہ نفع بخش ہو نہ ہی ضروری ہو۔

قسم اول: یعنی جو شئی نفع بخش اور ضروری دونوں ہو پس وہ یا تو صرف دنیا میں ہوگی جیسے نفس (سانس) کیونکہ وہ اگر ایک لمحہ کے لئے رک جائے تو آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یا وہ ایسی ہی آخرت میں ہوگی جیسے معرفت الٰہی کہ اگر وہ ایک لمحہ کے لئے زائل ہو جائے تو اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے عذاب کا مستوجب ہو جاتا ہے۔

قسم دوم: وہ جو نفع بخش تو ہو لیکن ضروری نہ ہو جیسے دنیا میں مال اور تمام علوم و معارف آخرت میں۔

قسم سوم: وہ جو ضروری ہو لیکن نفع بخش نہ ہو دنیا میں اس کی مثال تمام قسم کی مصیبتیں، امراض وغیرہ ہیں مثال کے طور پر، موت، فقر بڑھاپا وغیرہ، آخرت میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کیونکہ منافع آخرت کو مضار لازم نہیں ہے۔

قسم چہارم: وہ شئی جو نہ نفع بخش ہو اور نہ ضروری ہو اس کی مثال دنیا میں فقر و فاقہ اور آخرت میں عذاب ہے۔

درج بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ نفس دنیا میں نافع و ضروری ہے اگر انسان سے ایک لمحہ کے لئے منقطع ہو جائے تو فی الحال اس کی موت واقع ہو جائے یونہی معرفت آخرت کے لئے ایک ایسا ضروری امر ہے کہ ایک لمحہ کے لئے قلب سے زائل ہو جائے تو دل مر جائے۔ لیکن دنیاوی پہلی موت، اخروی ثانوی موت سے زیادہ آسان ہے کیونکہ دنیاوی موت کی تکلیف وقتی و عارضی ہوتی ہے لیکن اخروی موت کی تکلیف دائمی اور ابدالآباد تک قائم رہنے والی ہے۔ اور جیسے تنفس کہ اس کا دو طرح کا اثر ہوتا ہے ایک یہ کہ خوشگوار پاکیزہ ہوا کو دل سے گذارتی ہے اور اس کو معتدل صحیح اور سلامت رکھتی ہے۔ دوسرا اثر یہ ہے کہ گرم فاسد متحرق ہوا کو قلب سے خارج کرتی ہے۔ ایسے ہی فکر کا دو اثر ہوتا ہے ایک یہ کہ حجت و برہان کی نسیم طیب کو قلب تک پہنچاتا ہے اور ایمان و معرفت کے اعتدال کو قلب پر قائم رکھتا ہے دوسرا یہ کہ قلب میں پیدا شدہ شبہات کی فاسد ہوا کو قلب سے نکال پھینکتا ہے پس یہ دونوں امر کامل طور پر جس عقل پر منکشف ہو جاتے ہیں

معرفت و جہالت کے مابین تمیز ہوجاتی ہے لہذا تمیز وانکشاف کی یہ نعمت جس کسی کو ملی وہ رحمت الٰہیہ کے بحر ناپیدا کنار کا ایک قطرہ اور اس کے احسانات کے ذرات میں سے ایک ذرہ ہے اس وقت ایک مومن کے قلب وفکر پر یہ منکشف ہوجاتا ہے کہ اللہ رحمن ورحیم ہے۔

اس کو مزید تفصیل سے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ خود انسان اپنے آپ میں اس طرح غور کرے کہ وہ نفس، روح اور بدن وجسد سے مرکب ایک جوہر ہے۔ لیکن نفس تو کوئی شک نہیں کہ مبدأ فطرت سے وہ جاہل تھا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے ''وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'' اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا کہ کچھ نہ جانتے تھے اور تمہیں کان اور آنکھ اور دل دیئے کہ تم احسان مانو (النحل:۷۸) پھر قوت حساسہ محرکہ ومدرکہ اور عاقلہ کے مراتب کے بارے میں غور کرے نیز معقولات کے مراتب ودرجات اور اس کی جہتوں کے بارے میں نظر کرے تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ اگر عاقل معقولات کے علم کے حصول میں لگ جائے اور اس میں برق خاطف جیسی رفتار اور تیز رو ہوا جیسی سرعت سے حصول علم کا سفر طے کرنے لگے اور اس سفر میں ابدالآباد اور ہمیشہ ہمیش لگا رہے تو وہ معارف وعلوم کی ایک مقدار متناہی ہی حاصل کر سکے گا جب کہ جو علوم اس کو حاصل نہیں ہوئے وہ سب غیر متناہی سمندر ہیں اور متناہی، غیر متناہی کے بالمقابل کثیر میں قلیل ہے۔ اس وقت یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے جو رب العلمین نے فرمایا ہے۔ ''وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا'' اور تمہیں علم نہیں مگر تھوڑا (الاسراء:۸۵)

رہا بدن کا معاملہ تو وہ اخلاط اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے مرکب ایک جوہر ہے پس اس کی ترکیب کی کیفیت اور تشریح کی تفصیلات میں اگر غور کرے پھر اللہ تعالیٰ نے ان اجزاء واعضاء میں سے ہر ایک میں جو منافع عالیہ اور آثار شریفہ ودیعت فرمائی ہے اگر ان کا بنظر غائر کوئی مطالعہ کرے تو اس کے نزدیک ارشاد باری تعالیٰ ''وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' کی صداقت وحقانیت واضح ہوجاتی ہے (النحل:18) اس طرح تم کو تمہاری خلقت وہدایت میں اس کی کمال رحمت کی جو اثر آفرینی ہے ظاہر ہوجائے گی بہر حال عقل سلیم میں اس کی صفت رحمانیت ورحیمی کا معنی کچھ نہ کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس بحث میں یہ خیال بھی ضروری ہے کہ کیا غیر اللہ کے لئے بھی رحمت ثابت ہے یا نہیں، اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ حقیقی رحمت صرف اللہ عز شانہ تعالیٰ کی ہے اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ غیر اللہ کے لئے بھی رحمت ہے تو بھی غیر کی بہ نسبت، اللہ کی رحمت اکمل دائم ہے، یہاں دو مقام ہے۔

مقام اول: یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی رحمت نہیں اس پر کئی وجوہ سے دلیل قائم ہے۔

۱: **جود:** مناسب چیزوں کا بغیر عوض فائدہ پہنچانے کو کہتے ہیں جود کے اس معنی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی جواد ورحیم حقیقی نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ کے سوا جو کوئی کچھ عطا کرتا ہے وہ اپنی عطا پر اس کا عوض لیتا ہے عوض کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک ان میں سے جسمانیہ ہے مثلاً کوئی ایک دینار اس لئے دے کہ اس کے بدلے کپڑا لے اور ایک ان میں سے روحانیہ ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ مال دے طلب خدمت کے لئے، دوسرا یہ کہ مال دے طلب اعانت کے لئے، تیسرا یہ کہ مال دے طلب ثناء جمیل کے لئے، چوتھا یہ کہ مال دے ثواب جزیل کے حصول کے لئے پانچواں یہ کہ مال دے تاکہ اس کے قلب سے مال کی محبت ختم ہوجائے۔ چھٹا یہ کہ مال دے تاکہ اس کے قلب سے رقت جنسیت زائل ہوجائے۔ یہ سب اعواض روحانیہ کہلاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جو کوئی عطا وبخشش کرتا ہے اس سے اس کا مقصود اس عطا کے توسط سے یک گونہ کمال کا حصول ہوتا ہے۔ اور جو عطا کے عوض، کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کا ارادہ رکھے ایسی عطا کو جود وسخا، ہبہ وعطیہ کا نام نہیں دیا جاسکتا بلکہ حقیقتاً معاوضہ ہے لیکن حق سبحانہ تعالیٰ تو وہ کامل لذاتہ ہے پس اس کے لئے یہ محال ہے کہ کوئی چیز کمال کے حاصل کرنے کے لئے عطا کرے اس لئے جواد مطلق اور راحم مطلق صرف اللہ عزشانہ تعالیٰ ہے اس کی عطا بغیر مطالبہ عوض ہے۔

۲: اللہ کے سوا سب ممکن لذاتہ ہے اور ممکن لذاتہ، بغیر واجب لذاتہ کے ایجاد کے وجود پذیر نہیں ہوسکتا اور غیر اللہ کی رحمت بھی ممکن ہے پس رحمت غیر بھی ایجاد واجب لذاتہ سے ہے اس سے ثابت کہ رحیم حقیقی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

۳: انسان کے لئے فعل وترک دونوں جائز، انسان ترک پر فعل کو اسی وقت ترجیح دے سکتا ہے جب اس کے قلب میں فعل کا داعیہ جازمہ پایا جائے بغیر اس داعیہ کے اس سے رحمت کا صدور نہیں ہوسکتا لیکن جب یہ داعیہ پایا جائے گا تو رحمت کا صدور اس سے واجب ہوجائے گا جب رحم، داعیہ رحمت پر موقوف ہے اور رحمت کا داعیہ وجذبہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو درحقیقت رحم فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

۴: عارضی طور پر اگر فرض کرلیا جائے کہ کسی نے کسی کی غلہ گیہوں وغیرہ سے مدد کرکے اس پر رحم کیا لیکن یہ گیہوں وغلہ وغیرہ اس وقت تک قابل انتفاع نہیں ہوسکتا جب تک کہ معدہ ہاضمہ موجود نہ ہو، اسی طرح اگر کسی نے کسی کو خوبصورت ثمر بار باغ عطا کیا تو یہ باغ اس وقت تک لائق انتفاع نہیں ہوسکتا جب تک اس کی آنکھ میں قوت باصرہ نہ ہو حالانکہ حق یہ ہے کہ اس غلہ اور بستان کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور ان دونوں سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے قوت ممکنہ دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اور تمام طرح کی آفات و بلیات اور خوفزدہ کرنے والی چیزوں سے حفاظت فرمانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے تا کہ ان چیزوں سے کما حقہ نفع حاصل کیا جا سکے۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ منعم حقیقی اور راحم مطلق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

مقام دوم: یہ ہے کہ غیر اللہ کی طرف سے بھی رحمت ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت غیر کی طرف نسبت کرتے ہوئے اتم، اکمل اور اعظم ہے۔ اس پر بھی چند وجوہ سے دلالت ہے۔

اول: انعام و احسان منعم و محسن کی بلندی اور رفعت شان کو ظاہر کرتا ہے جب کہ منعم علیہ کی دناءت، کمزوری اور ضعف مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے اس وجہ سے منعم علیہ، منعم کی بارگاہ کا متواضع ہو جاتا ہے پس جب ایک بندہ کسی دوسرے کے احسان سے متواضع ہو جاتا ہے تو زیادہ بہتر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا متواضع رہے کہ بارگاہ خداوندی کا متواضع ہونا، کسی مخلوق کی بارگاہ کا متواضع ہونے سے بہر حال بدرجہا افضل ہے۔

دوم: بیشک اللہ تعالیٰ جب انسان پر کوئی نعمت سے انعام کرتا ہے تو پھر اس سے ایسے عمل کا مطالبہ کرتا ہے جس سے وہ اخروی نعمتوں کو حاصل کر سکے گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کو حکم دیتا ہے کہ تم دائمی سعادتمندی اور اخروی نعمتیں حاصل کر لو۔ لیکن خدائے تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا فضل و احسان کرتا ہے تو وہ تمہیں اپنی خدمت میں مشغول رکھنے کا حکم دیتا ہے اور مقصود اصلی سے برگشتہ کرنے لگتا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ حالت اولیٰ، حالت ثانیہ سے افضل ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "الید العلیا خیر من الید السفلیٰ"۔

سوم: سلطان وقت جب کسی پر نوازش و اکرام کرتا ہے تو وہ اپنے موہوب لہ کے تفصیلی حالات سے آگاہ نہیں ہوتا چنانچہ کبھی وہ ایسے شخص کو نواز دیتا ہے جس کو اس کی نوازش کی قطعی حاجت نہیں ہوتی اور کبھی وہ اپنے انعام کو ایسے شخص سے روک لیتا ہے جو اس کے اس انعام کا محتاج اور ضرورتمند ہوتا ہے نیز وہ تمام اوقات تمام قسموں کی حاجتوں کو پورا کرنے پر قادر بھی نہیں ہوتا، اس کے برعکس بادشاہ حقیقی حق سبحانہ تعالیٰ تمام معلومات کا عالم اور جملہ ممکنات پر قادر ہے جب آدمی کو کوئی ضرورت یا حاجت پیش آتی ہے تو وہ قبل از وقت جانتا ہے اور بندہ اس سے کوئی شئی مانگتا ہے تو وہ فی الفور عطا کرنے پر قادر ہے غرض اللہ ہی کی عطا و رحمت افضل و اعلیٰ اور اصلی و حقیقی ہے۔

چہارم: انعام و احسان منعم کی احسانمندی کو واجب کرتا ہے پس حق تعالیٰ کے احسان کا قبول کرنا بندہ کے احسان مند ہونے سے افضل ہے۔ ان تفصیلات سے ظاہر کہ رحمن و رحیم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ بقیہ بحثیں انشاء المولیٰ تفسیر "الرحمن الرحیم" کے ذیل میں آئیں گی۔

باب یازدھم

فضائل ونکات بسم اللہ الرحمن الرحیم

اول: حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا علیہ السلام بیمار ہوئے آپ کے شکم مبارک میں شدید درد لاحق ہوا رب تعالیٰ کی بارگاہ میں درد ہونے کا ذکر کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنگل کی ایک گھاس کی طرف راہنمائی فرمائی آپ نے اس گھاس کو کھایا تو بحکم الٰہی مرض سے شفایاب ہوگئے، پھر دوسرے وقت وہ درد عود کر آیا پھر آپ نے وہی گھاس کھایا لیکن آپ کا مرض ٹھیک ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا تو آپ نے اپنے رب سے عرض کیا اے میرے رب پہلے میں نے اس گھاس کو کھایا تو اس سے فائدہ ہوا لیکن جب دوسری مرتبہ کھایا تو میرا مرض مزید بڑھ گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ پہلی بار تم میری طرف سے گھاس کی طرف گئے تھے اس لئے تم کو شفا ملی اور دوسری مرتبہ تم اپنی طرف سے گھاس کی طرف گئے اس لئے تمہارا مرض بڑھ گیا اے موسیٰ سن لو کہ پوری دنیا سم قاتل ہے اور میرا نام اس کا تریاق ہے۔

دوم: حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ عنہا ایک رات نماز تہجد پڑھ کر سو گئیں، اس اثناء میں آپ کے گھر میں چور داخل ہوا اور آپ کے کپڑوں کو لیکر جانے لگا لیکن دروازہ نہ پاسکا پس جب اس نے کپڑے کو رکھ دیا تو دروازہ مل گیا پھر کپڑے اٹھایا لیکن اٹھاتے ہی دروازہ غائب ہوگیا اسی طرح تین مرتبہ کیا جب کپڑے رکھ دیتا دروازہ دکھائی دینے لگتا اور جب کپڑے اٹھا لیتا دروازہ اس کی نظر سے غائب ہوجاتا، تین دفعہ ایسا کرنے کے بعد گھر کے گوشہ سے آواز آئی اے بد بخت کپڑے رکھ اگر رابعہ سوئی ہے تو کیا ہوا گرچہ حبیب سویا ہے مگر اس کا محبوب سلطان بیدار ہے۔

سوم: بعض عارفین کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی بکریاں چراتے تھے، ان کی بکریوں کے ریوڑ میں بھیڑیئے داخل ہوجاتے تھے لیکن بھیڑیئے ان کی بکریوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ لوگوں نے دیکھا تو ان کو بڑی حیرت ہوئی بولے بھیڑیئے کو بکریوں سے دوستی کب سے ہوگئی۔ اس بزرگ نے کہا جب سے بکریوں کے چرواہے کو خدا سے دوستی ہوگئی ہے۔ ایسا ہی واقعہ حضرت رابعہ بصریہ کی طرف بھی منسوب ہے کہ آپ کی بکریاں، شیر کے ساتھ ایک پنگھٹ پر پانی پیا کرتی تھیں لوگوں نے پوچھا اے رابعہ تمہاری بکریوں کو شیر سے دوستی کب سے ہوگئی اس پر حضرت رابعہ نے جواب دیا جب سے رابعہ نے خدا سے دوستی کر لی ہے۔

پیر کامل حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخش قدس سرہٗ نے اپنی تصنیف لطیف، کشف المحجوب میں حضرت حبیب اسلم راعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ائمہ طریقت میں سے ایک بزرگ، فقیر کبیر، تمام ولیوں کے

امیر ابوحلیم حضرت حبیب اسلم راعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں آپ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مصاحب میں سے ہیں آپ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "نیة المومن خیر من عمله" مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

آپ بکریاں پالتے تھے اور فرات کے کنارے پر چرایا کرتے تھے آپ کا مسلک خلوت گزینی تھا ایک بزرگ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ میرا گذر اس طرف ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ تو نماز میں مشغول ہیں اور بھیڑیا ان کی بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے میں ٹھہر گیا کہ اس بزرگ کی زیارت سے مشرف ہونا چاہئے جن کی بزرگی کا کرشمہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں بڑی دیر تک انتظار میں کھڑا رہا یہانتک کہ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سلام عرض کیا آپ نے جواب سلام کے بعد فرمایا کس کام سے آئے ہو، میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی بکریوں سے بھیڑیوں کو ایسا لگاؤ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کر رہا ہے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ بکریوں کے چرواہے کو حق تعالیٰ سے دلی ربط ہے۔ یہ فرما کر آپ نے لکڑی کے پیالے کو پتھر کے نیچے رکھ دیا، پتھر سے دو چشمے جاری ہوئے ایک دودھ کا دوسرا شہد کا پھر فرمایا نوش کرو میں نے عرض کیا یہ مقام آپ نے کس طرح حاصل کیا آپ نے فرمایا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے ذریعے، اے فرزند! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اگرچہ ان کی مخالف تھی لیکن پتھر نے انہیں پانی دیا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجے میں نہ تھے جب کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرماں بردار ہوں تو یہ پتھر مجھے دودھ اور شہد کیوں نہ دیگا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔

چھارم: بسم اللہ کا معنی "أبدأ باسم الله" ہے۔ تخفیف کی وجہ سے ابدأ کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ پس جب بندہ "بِسْمِ اللّٰهِ" کہتا ہے تو گویا وہ "ابدأ بسم الله" کا تکلم کرتا ہے۔ اس سے مقصود تنبیہ کرنا ہے اس بات پر کہ بندہ کے کسی کام میں لگنے سے پہلے اس کے کام کا مدار تخفیف و تسہیل اور مسامحت پر ہونا چاہئے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اول کلمہ ابدأ کو ذکر کر کے پھر ساقط فرما کر بندہ کے لئے صفح و احسان کی دلیل بنا دیا ہے۔

پنجم: مروی ہے کہ فرعون نے دعویٰ الوہیت سے پیشتر ایک محل تعمیر کروایا تھا اور اس کے باہری دروازہ پر اس نے "بسم الله" لکھنے کا حکم دیا تھا جب خدائی کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا چنانچہ آپ نے اس کو رشد و ہدایت کی دعوت دی، (بہت فہمائش کی، معجزات دکھلائے) لیکن اس پر آپ کی دعوت کا کچھ اثر نہ ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا مولا کتنا بلاؤں میں اس میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتا ہوں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے موسیٰ شاید تم اس کو ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تم اس کے کفر کو دیکھ رہے ہو اور میں اس کے دروازہ پر لکھا ہوا اپنا نام دیکھ رہا ہوں۔

اس سے نکتہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے دروازہ پر اس کلمہ مبارکہ کو لکھ لیتا ہے وہ ہلاکت سے مامون ہو جاتا ہے گرچہ وہ کافر ہی ہو لہذا وہ شخص جو صاحب ایمان ہو اگر اس نے ابتدائے عمر سے ہی آخر عمر تک اپنے سوداء قلب میں یا دل کی تختی پر اس کلمہ مبارکہ کو منقش کر لیا تو اس کی عظمت وسعادت کا کیا حال ہوگا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ششم: اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم پاک رحمن ورحیم ذکر فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندے پر ضرور مہربان ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ رحم نہ فرمائے۔ روایت ہے کہ ایک منگتا ایک عظیم الشان دروازہ پر مانگنے کے لئے کھڑا ہوا صاحب خانہ نے اس کو بہت تھوڑا عطا کیا وہ فقیر دوسرے دن پھوڑا لیکر آیا اور دروازہ توڑنے لگا اس سے کہا گیا ایسا کیوں کر رہے ہو اس نے کہا کہ یا تو بھیک کے مطابق اپنے دروازہ کو چھوٹا کر لو یا دروازہ کی رفعت وبلندی کے مطابق بھیک دو۔ اے ہمارے معبود رحمت کا بحر بیکراں نسبت کرتے ہوئے تیری رحمت کی طرف عرش کی بہ نسبت ایک ذرہ سے کم ہے۔ پس اے ہمارے پروردگار جس طرح تو نے اپنی ازلی کتاب کے آغاز میں اپنے بندوں پر اپنی صفت رحمت کا القا فرمایا ہے لہذا ہم کو بھی اپنے فضل وکرم اور رحم وکرم سے محروم نہ فرما۔

ہفتم: اللہ اس ذات واجب الوجود کا نام ہے جو تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے ظاہر ہے کہ لفظ اللہ، علم وقدرت، سمع، بصر اور حی وغیرہ کے علاوہ صفت قہر وجبر کو بھی شامل ہے لیکن لفظ اللہ کے بعد صفت رحمن ورحیم کو ذکر فرمایا اس میں دلیل ہے کہ اس کی رحمت، اس کے قہر وجبر سے اکمل واکثر ہے۔

ہشتم: بادشاہ کے خدام جب کبھی کوئی چیز گھوڑا، خچر وغیرہ خریدتے ہیں تو اس پر بادشاہ کا علامتی نشان لگا دیتے ہیں تاکہ کوئی دشمن اس پر نگاہ طمع نہ کرے بلا تمثیل سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے تمہاری عبادت و طاعت پر نگاہ طمع ڈالے ہوا ہے لہذا جب تم کسی کام میں لگو تو بسم اللہ کے علامتی نشان سے اسکو نشاں زدہ کر دو تاکہ شیطان کی طمع جاتی رہے۔

نہم: ہر کام کے آغاز میں تسمیہ پڑھنے کی ترغیب اور اس پر حصول برکت اور کام کی تکمیل کا وعدہ اس بات کا اشاریہ اور تنبیہ ہے کہ بندہ ہر وقت نفس کو ذکر الٰہی سے معمور رکھے کبھی نفس کو غافل نہ کرے حتی کہ دارین میں ذکر الٰہی سے دوری اختیار نہ کرے تاکہ دنیا وآخرت میں اس کے فوائد وبرکات سے مستفیض ہوتا رہے۔

مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی مبارک انگوٹھی عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا اس میں "لاالہ الا اللّٰہ" منقش کروادو، حضرت صدیق اکبر نے انگوٹھی نقاش کے حوالہ کیا اور فرمایا اس میں "لاالہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" نقش کردو، نقاش نے حسب حکم اس میں "لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" نقش کر دیا، حضرت صدیق اکبر وہ انگوٹھی لیکر بارگاہ رسالت میں پہنچے اور حضور کو دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس انگوٹھی کو دیکھا تو اس میں "لاالہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" اور "ابوبکر الصدیق" منقش تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر اس میں یہ زوائد کہاں سے آئے حضرت ابوبکر نے عرض کیا "یا رسول اللہ مارضیت أن أفرق اسمک عن اسم اللہ" یا رسول اللہ مجھے گوارہ نہیں ہوا کہ آپ کے اسم مبارک کو اللہ تعالیٰ کے نام سے جدا کروں، رہا باقی زائد تو میں نے نقش کے لئے نہیں کہا تھا، حضرت ابوبکر اپنا نام دیکھ کر شرمندہ تھے کہ حضرت جبرئیل امین بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ أما اسم ابی بکر فکتبتہ لانہ مارضی أن یفرق اسمک عن اسم اللہ فما رضی اللہ ان یفرق اسمہ عن اسمک" یعنی یا رسول اللہ ابوبکر کا نام میں نے لکھا ہے کیوں کہ جب ان کو آپ کا نام خدا کے نام سے جدا کرنا گوارہ نہیں تو خدا کو بھی ان کا نام آپ کے نام سے جدا کرنا گوارہ نہیں ہے۔

نکتہ اس میں یہ ہے کہ حضرت صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو خدائے تعالیٰ کے نام سے جدا کرنے پر راضی نہ ہونے کے سبب یہ شرف و بزرگی پالیا تو اس مومن کے بارے میں کیا تصور ہے جس نے اپنے قلب سے اللہ و رسول کے نام کو کبھی جدا نہیں کیا بلکہ اللہ و رسول کے اسمائے مبارکہ ان کے قلوب میں ہمیشہ منقش رہے۔

دھم: حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی پر سوار ہوئے تو فرمایا "بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا" (ہود:۴۱) اللہ تبارک وتعالیٰ نے کلمہ تسمیہ کے نصف کی برکت سے آپ کے ساتھ آپ کے متبعین کو غرق و ہلاکت سے نجات عطا فرمایا۔ لہذا جو شخص اپنی پوری زندگی اس کلمہ پر مواظبت کرے گا اللہ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ نجات سے محروم نہیں رہ سکتا نیز اللہ تعالیٰ نے اس کلمہ کی برکت سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دنیا و آخرت کی مملکت عطا فرمائی چنانچہ آپ نے فرمایا تھا "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (النمل ۳۰) لہٰذا امید ہے کہ جو بندۂ مومن اس کلمہ طیبہ پر مواظبت کرے گا وہ دنیا و آخرت کی بادشاہی سے فائز المرام ہوگا۔

یازدھم: قول سلیمان علیہ السلام "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" میں کسی کو یہ

شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام کو، اسم الٰہی سے پیشتر کیوں ذکر کیا۔ اس شبہ کا کئی جواب ہے۔

(۱) ملکہ سبا بلقیس نے جب دیکھا کہ ایک خط اس کے تکیہ پر رکھا ہوا ہے حالانکہ وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا پھر اس نے دیکھا اس کی دیوار پر ایک ہدہد کھڑا ہے تب اس نے سمجھا کہ یہ خط اسی ہدہد نے لایا ہے جب خط لیا تو بلقیس نے کہا "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ" بیشک یہ خط سلیمان کی طرف سے آیا ہے اور جب خط کھولا تو دیکھا اس میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لکھا ہے پس اس نے کہا اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس سے ظاہر ہے کہ "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ" حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول نہیں ہے بلکہ بلقیس کا مقولہ ہے۔

(۲) حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط پر بطور پتہ کے "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ" لکھا تھا لیکن اندر خط کا آغاز "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے کیا تھا جیسا کہ خطوط نویسی کا طریقہ ہے جب بلقیس نے اس خط کو لیا تو خط کے اوپر پتہ دیکھا تو بولی "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ" پھر جب خط کھولا تو پڑھا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو کہا "وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" یعنی اس خط کا آغاز "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے ہوا ہے۔

(۳) تیسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بلقیس چونکہ کافرہ ستارہ پرست تھی اندیشہ لاحق تھا کہ اگر وہ ابتدا میں اللہ عز شانہ کا نام پاک دیکھے گی تو کہیں سب وشتم نہ کرے اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے اپنے نام کو ذکر کیا کہ اگر وہ گالی دے تو مجھے ہی گالی دے اللہ تعالیٰ کا نام پاک اس کی ہرزہ سرائی سے محفوظ رہے۔

دوازدھم: بسم اللّٰہ میں بسم کی با "البر" سے مشتق ہے اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین پر دنیا و آخرت میں قسم قسم کے برکات سے بر وصلہ فرمانے والا ہے سب سے بڑی کرامت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو اپنے دیدار پر انوار سے مشرف فرمائے گا۔

منقول ہے کہ کسی بزرگ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا وہ یہودی بیمار پڑا وہ بزرگ اس کی عیادت کے لئے گئے اس سے کہا اسلام قبول کرلو، یہودی نے کہا، اسلام کس لئے قبول کرلوں بزرگ نے فرمایا جہنم کے خوف سے یہودی بولا مجھے اس کی پرواہ نہیں، پھر بزرگ نے کہا جنت کی لالچ میں اسلام قبول کرلو اس نے کہا مجھے اس کی خواہش نہیں بزرگ نے کہا تب تم کیا چاہتے ہو یہودی نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ذات کریم کے دیدار پر انوار سے مشرف کردے اس نے کہا اسلام قبول کرلو اللہ تعالیٰ تم کو تیرا مطلوب عطا فرمائے گا یہودی نے کہا اس کی مجھے ایک تحریر لکھ دو تاکہ سند رہے بزرگ نے اس کو تحریر لکھ کر دے دی کہ اگر تم اسلام قبول کرلو گے تو اللہ تمہیں اپنے دیدار سے مشرف

فرمائے گا، اس نے اسلام قبول کرلیا اور کلمہ طیبہ پڑھتے ہی اس کا انتقال ہوگیا، بزرگ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کو دفن کردیا بعد تجہیز وتکفین اس بزرگ نے اس کو خواب میں دیکھا کہ وہ بہار جنت میں شاداں و فرحاں ہے اس سے پوچھا اے نیک بخت تیرے ساتھ تیرے رب نے کیسا سلوک کیا اس نے کہا اللہ نے مجھے بخش دیا اور مجھ سے فرمایا کہ اے میرے بندے تو نے میرے شوق لقا میں اسلام قبول کیا ہے۔

"بسم" کی سین باری تعالیٰ کے اسم "سمیع" سے ماخوذ ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش سے تحت الثریٰ تک موجودات ومخلوقات کی دعا، پکار اور آواز کو سنتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بطور استشہاد مذکور ہے۔

مروی ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایک منافق کے ساتھ طائف کی طرف نکلے جب ان دونوں کا گذر ایک جنگل سے ہوا تو منافق بولا کہ ہم لوگ یہاں داخل ہوکر آرام کریں گے پس دونوں اس جنگل میں داخل ہوئے، منافق کی بات پر اعتماد کرکے حضرت زید بن حارثہ تو سو گئے لیکن منافق جاگتا رہا پھر اس نے حضرت زید کے ہاتھ پیر کو باندھ دیا اور قتل کرنے کا ارادہ کیا حضرت زید نے اس سے کہا تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور مجھ کو ان سے سخت نفرت ہے حضرت زید نے رب تعالیٰ سے استغاثہ کرتے ہوئے دعا کیا "یارحمن اغثنی" اے رحمن میری مدد فرما اتنے میں منافق نے ایک آواز سنی کوئی کہہ رہا تھا "ویحک لاتقتله" خرابی ہو تیری اس کو قتل مت کر، منافق جنگل سے باہر نکلا ادھر ادھر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا، پھر لوٹ آیا اور آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو پھر پہلے سے زیادہ سخت آواز سنی کوئی کہہ رہا تھا اسے مت قتل کر۔ پھر باہر نکلا ادھر ادھر دائیں بائیں دیکھا کوئی نظر نہ آیا اب تیسری مرتبہ آیا اور حضرت زید کو قتل کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ ویسے ہی سخت آواز سنائی دی منافق آواز سنکر باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک گھوڑ سوار ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ ہے آنے والے گھوڑ سوار نے ایک ہی ضرب میں اس منافق کو قتل کردیا اور جنگل میں داخل ہوکر جہاں حضرت زید بندھے ہوئے پڑے تھے گھوڑ سوار نے حضرت زید کے بندھن کو کھولا اور پوچھا کیا تم مجھے پہچانتے ہو میں جبرئیل امین ہوں، جس وقت تم نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا تو میں ساتویں آسمان پر تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میرے بندے کی مدد کو پہنچو چنانچہ پہلی پکار کے وقت میں ساتویں آسمان پر تھا، دوسری آواز میں آسمان دنیا میں اور تیسری آواز پر منافق کے پاس موجود تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بندہ جب اخلاص کے ساتھ اپنے رب کو پکارتا ہے تو وہ اس کی فریاد سنتا ہے اور فی الفور اس کی مدد فرماتا ہے۔ (رازی)

بسم کی میم اس کے اسم "مالک" سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ عرش سے تحت الثریٰ تک سب اس کی ملک ہے اور سب پر اس کی بادشاہت ہے۔

امام سدی نے کہا کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے عہد مبارک میں لوگ قحط میں مبتلا ہو گئے، لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بارگاہ میں آئے اور عرض کیا اے اللہ کے نبی آپ لوگوں کو لیکر دعاے استسقاء کے لئے نکلئے چنانچہ آپ تمام لوگوں کے ساتھ دعاے استسقاء کے لئے نکلے تو آپ نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے اپنے رب سے کہہ رہی ہے۔"اللھم انا خلق من خلقک و لا غنی لی عن فضلک" یعنی اے اللہ میں تیری ایک مخلوق ہوں اور تیرے فضل سے بے نیاز نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان پر خوب بارش برسائی حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں سے فرمایا اپنے گھر کو لوٹ جاؤ بیشک اللہ تعالیٰ نے غیر (چیونٹی) کی دعاء کی وجہ سے تم سب کی دعاؤں کو قبول کر لیا ہے۔

اسم جلالت لفظ اللہ کے ذکر کے برکات

بِسْمِ اللّٰہِ میں جب بسم کی اتنی برکتیں ہیں تو لفظ اللّٰہ کی برکتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے اس لئے شیوۂ مومن یہی ہونا چاہئے کہ تا حیات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اللہ اللہ کرتا رہے، جب موت کا وقت آئے تو اللہ اللہ کرتے کرتے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرے، جب قبر میں نکیرین کا سامنا ہو تو اللہ اللہ کرتا رہے، جب میدان قیامت میں اکٹھا کیا جائے تو اللہ اللہ کرتا رہے جب اعمال تولے جائیں تو زبان پر اللہ اللہ جاری رہے، جب پل صراط سے گذر ہو تو اللہ اللہ کا ورد کرتا رہے اور جب جنت میں جائے تو اللہ اللہ بولتا جائے اور جب جنت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار پر انوار سے مشرف ہو تو کہے اللہ ہے۔ سبحان اللہ، دعاء ہے کہ مولائے کریم ہم سب اہل ایمان کو ہمیشہ ہر دم ہر جگہ اپنے نام پاک کے ذکر قلبی و ذکر لسانی کی توفیق مرحمت فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

سیزدھم: "بِسْمِ اللّٰہِ الرحمٰنِ الرَّحِیْمِ" میں اللہ تعالیٰ کے تین اسماے عالیہ مذکور ہیں اللہ، رحمن، رحیم، ان تین اسماے مبارکہ کے ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ" تو کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور ان میں کوئی میانہ چال پر ہے اور ان میں کوئی وہ ہے جو اللہ کے حکم سے بھلائیوں میں سبقت لے

گیا(فاطر:۳۲) گویا آغاز قرآن بسم اللہ ہی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے فرمادیا کہ ''میں اللہ ہوں سابقین کے لئے، رحمن ہوں مقتصدین کے لئے، اور رحیم ہوں ظالمین کے لئے نیز اللہ وہ جو نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے، رحمن وہ جو اولیاء کی لغزشوں کو درگذر کرنے والا ہے اور رحیم وہ جو گنہگاروں کو معاف فرمانے والا ہے، اور اس کی کمال رحمت سے یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے بندہ میں تمہارے ایسے جرم وگناہ جانتا ہوں کہ اگر اسے تمہارے ماں باپ جان جائیں تو تمہیں گھر سے نکال دیں، تمہاری بیوی جان جائے تو تم پر برافروختہ ہوجائے، تمہاری لونڈی جان جائے تو راہ فرار اختیار کرلے اور اگر تمہارے پڑوسی جان لیں تو تمہارے گھر کو اجاڑ پھینکیں مگر ایک میں ہوں کہ تمارے سارے گناہوں اور جرموں کو جانتے ہوئے بھی ان کو اپنی چادر رحمت سے چھپاتا ہوں تاکہ تم جان لو کہ بیشک میں ہی معبود کریم اور رحمن ورحیم ہوں۔

چھاردھم: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں تین اسماے مبارکہ ہیں لفظ اللہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی ولایت اہل ایمان کے لئے ثابت ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ'' اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا انہیں اندھیریوں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔(البقرۃ:۲۵۷) اسم رحمن موجب محبت ہے ارشاد ہے ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا'' بیشک وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے عنقریب ان کے لئے رحمن محبت پیدا کردیگا(مریم:۹۶) اور اسم رحیم اس کی رحمت کا موجب ہے ارشاد ہے ''وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا''(احزاب:۴۳)۔

پانزدھم: (۱) مروی ہے کہ جس کسی نے زمین پر پڑے کسی ایسے کاغذ کو اجلال وتعظیم اسماے رب العلمین کی وجہ سے اٹھایا خدا کے نزدیک صدیقین میں لکھا جائے گا اور اس کے والدین سے عذاب میں تخفیف ہوجائے گی اگرچہ والدین مشرک ہوں اس سلسلہ میں حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے اماموں میں سے ایک عظیم بزرگ ہیں آپ کا ابتدائی زمانہ کچھ اچھا نہ تھا چنانچہ آپ کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن نشہ کی حالت میں گھر سے نکلے راستہ میں ایک کاغذ کا پرزہ پڑا ملا جس پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' تحریر تھا تعظیم سے اٹھا کر خوشبو سے معطر کرکے پاک جگہ میں رکھ دیا اسی رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یا بشر طیبت اسمی فبعزتی لا طیبن اسمک فی الدنیا والآخرۃ'' اے بشر تم نے میرے نام کو خوشبو میں بسایا قسم ہے مجھے اپنی عزت کی کہ میں ضرور تمہارے نام کی خوشبو کو دنیا وآخرت میں پھیلاؤنگا

یہاں تک کہ جو بھی تمہارے نام کو لیگا یا سنے گا اس کے دل کو راحت نصیب ہوگی۔خواب سے بیدار ہوتے ہی توبہ کی اور مضبوطی کے ساتھ طریقہ زہد پر گامزن ہو گئے۔حق تعالیٰ کے مشاہدہ کا غلبہ اس حد تک تھا کہ ہمیشہ ننگے پاؤں رہے لوگوں نے برہنہ پا رہنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا زمین خدا کا فرش ہے میں جائز نہیں سمجھتا کہ فرش پر چلوں کہ میرے پاؤں اور اس کے فرش کے درمیان کوئی چیز حائل ہو غرض آپ کے نزدیک جوتے بھی حجاب ہیں (کشف المحجوب)۔

اعلیٰحضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے اپنے والد محترم رئیس المتکلمین حضرت مولانا نقی علی خاں علیہ الرحمہ کی کتاب ''فضائل دعا'' میں یہ وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔

''حضرت حافی قدس سرہٗ الصافی کی برہنہ پائی پر ان کی برہنگی کی وجہ وہ تھی جو خود انہوں نے بیان فرمائی اور امام یافعی نے روض الریاحین میں ذکر کی۔کہ وہ امیر کبیر تھے۔رئیسانہ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے۔ایک دن اپنی مجلس بیغمی میں تھے۔کہ دروازے پر کسی فقیر نے آواز دی۔کنیز گئی فقیر نے پوچھا۔تیرا آقا کیا کرتا ہے؟ اس نے بیان کیا۔کہا تیرا آقا بندہ ہے یا آزاد؟ کہا آزاد کہا سچ کہتی ہے۔بندہ ہوتا۔تو بندگی میں ہوتا۔یہ آواز حضرت بشر کے گوشِ مبارک میں پڑی فوراً حال متغیر ہوا۔بیتابانہ ننگے پاؤں دوڑے۔فقیر کو نہ پایا دنیا چھوڑی۔محبت مولیٰ کے رنگ میں رنگے گئے۔مگر اس دن سے جوتا نہ پہنا۔اگر کوئی پوچھتا۔فرماتے میرے مولیٰ نے مجھ سے اسی حالت پر صلح کی۔یعنی جس وقت جذبِ الٰہی نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔میں اس وقت ننگے پاؤں ہی تھا۔لہٰذا اسی حال پر رہنا چاہتا ہوں۔اب ان کی قدرِ برہنہ پائی دیکھئے جب تک زندہ رہے تمام جانوروں نے راستوں میں لید، گوبر، پیشاب کرنا چھوڑ دیا۔کہ حافی کے پاؤں خراب نہ ہوں۔ایک دن کسی نے بازار میں لید پڑی دیکھی کہا۔'' اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پوچھا گیا کیا ہے؟ کہا حافی نے انتقال کیا۔تحقیق کے بعد یہی امر نکلا'' رضی اللہ تعالیٰ عن اولیائہ و نفعنا ببرکاتھم فی الدنیا و الدین آمین''۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ابوہریرہ جب تم وضو کرو تو کہو بِسْمِ اللّٰہِ بیشک فرشتے تمہارے لئے مسلسل نیکیاں لکھتے رہیں گے یہانتک کہ تم فارغ ہو جاؤ اور جب تم اپنے اہل سے ملنے لگو تو بِسْمِ اللّٰہِ کہہ لو بیشک تمہارے محافظ تمہارے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھتے رہیں گے جب تک کہ تم جنابت کا

غسل نہ کرلو۔ اگر اس واقعہ سے تم کو کوئی لڑکا تولد ہوا تو لڑکا کی ہر ہر سانس کے بدلے تمہارے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی بلکہ اس بچہ کی اگر نسل جاری ہوئی تو اس کی نسلوں کی سانسوں کے بدلے تمہارے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اے ابو ہریرہ جب تم کسی سواری پر سوار ہو تو سوار ہوتے وقت "بِسْمِ اللهِ" اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہہ لیا کرو، سواری کے ہر قدم کے بدلے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے نیکیاں لکھے گا اور جب تم کشتی پر سوار ہو تو "بِسْمِ اللهِ" و "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہہ لیا کرو تمہارے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی جب تک تم اس سے نکل نہ جاؤ۔

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بنی آدم کی شرمگاہ اور جنوں کی آنکھوں کے درمیان پردہ پوشی "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرمگاہ کھولنے سے پہلے جب بِسْمِ اللّٰهِ پڑھ لیا جاتا ہے تو جنوں کی آنکھیں ایسی اندھی ہوجاتی ہیں کہ وہ انسانوں کی شرمگاہوں کو دیکھ نہیں پاتیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ تسمیہ جس طرح دنیا میں تمہارے دشمن شیطان سے حجاب بناتا ہے اسی طرح آخرت میں تسمیہ، زبانیہ سے حجاب کردیگا

سانزدھم: قیصر روم نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس خط لکھا کہ میرے سر میں برابر درد رہتا ہے کبھی سکون نہیں ملتا اس لئے میرے لئے کوئی دوا بھیجئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس ایک ٹوپی بھیجی جب قیصر اس ٹوپی کو سر پر رکھتا تو درد سے آرام ہوجاتا اور جب اس کو اتار لیتا تو درد شروع ہوجاتا۔ اس کو اس سے بہت تعجب ہوا ٹوپی کھول کر دیکھا تو اس میں سے ایک کاغذ نکلا جس میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لکھا ہوا تھا۔

ھفدھم: حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جس نے وضو کیا اور بِسْمِ اللّٰهِ نہ پڑھا تو یہ وضو صرف اس کے اعضاء کے لئے طہارت ہوگی لیکن اگر بِسْمِ اللّٰهِ پڑھ لیا تو اعضاء کے ساتھ اس کا پورا بدن طاہر ہوجاتا ہے۔ جب وضو کے وقت تسمیہ پورے بدن کے لئے طہارت کا سبب ہے تو صمیم قلب سے اس کا ذکر یقیناً کفر و شرک اور بدعت و ضلالت سے قلوب کے لئے پاکی کا سبب ہوگا۔

ھیزدھم: حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مجوسی کی ایک بستی سے گذر رہے تھے تو اہل محلہ نے حضرت خالد سے اسلام کی حقانیت کی نشانی طلب کی اور کہا اگر آپ کوئی نشانی دکھا دیتے ہیں تو ہم اسلام قبول کرلیں گے آپ نے فرمایا میرے پاس زہر قاتل لاؤ چنانچہ بھر پیالہ زہر لایا گیا آپ نے زہر کے پیالہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھ کر پورا زہر نوش کرلیا، بفضلہٖ تعالیٰ آپ محفوظ رہے زہر نے کچھ نقصان نہ دیا، مجوسیوں کو کہنا پڑا یقیناً اسلام دین حق ہے۔

نوازدھم: اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ایک قبر سے گذرے آپ نے مشاہدہ فرمایا کہ عذاب کے فرشتے ایک مردہ کو عذاب دے رہے ہیں پھر اپنی حاجت سے فارغ ہوکر اسی قبر سے گزرے تو دیکھا کہ اسی قبر والے پر رحمت ونور کے طبق نچھاور کررہے ہیں آپ کو اس سے تعجب لاحق ہوا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ اے عیسیٰ یہ بندہ گنہگار تھا اس لئے جب مرا تو میرے عذاب میں گرفتار ہوگیا، مگر مرتے وقت اس نے اپنی بیوی کو حاملہ چھوڑا تھا بیوی نے بچہ جنا اور اس کی اچھی طرح پرورش کی جب بڑا ہوا تو اس کی ماں نے بچہ کو مکتب بھیجا اور معلم نے اس کو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھایا پس مجھے حیا آئی کہ اس بندے کو زمین کے نیچے آگ کا عذاب دوں جس کا بیٹا زمین کے اوپر میرے نام کا ذکر کرے۔

بستم: عمرہ فرغانیہ کبار عارفات میں سے گذری ہیں ان سے پوچھا گیا کہ آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ جنبی اور حائضہ کو قرأت قرآن سے منع کیا گیا ہے لیکن تسمیہ سے ممانعت نہیں ہے فرمایا کہ تسمیہ میں حبیب کے اسماء پاک کا ذکر ہے اور حبیب کو حبیب کے ذکر سے روکا نہیں جاتا۔

بست ویکم: الرحیم کے بارے میں فرمایا گیا کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ چھ جگہوں میں مہربان ہے۔ (۱) قبر اور اس کے حشرات میں، (۲) قیامت اور اس کے ظلمات میں، (۳) میزان اور اس کے درجات میں، (۴) نامہ اعمال کی قرأت اور اس کے فزعات میں، (۵) پل صراط اور اس کے فزعات میں، (۶) جہنم اور اس کے درکات میں۔

بست ودوم: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں انیس حروف ہیں، جس سے دو فائدے وابستہ ہیں ایک یہ کہ جہنم پر مقرر فرشتوں کی تعداد انیس ہے جنہیں زبانیہ کہا جاتا ہے جو بندہ مومن 'بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ' پڑھنے کا عادی ہوگا اللہ تعالیٰ تسمیہ کے انیسوں حروف کی برکتوں سے جہنم کے انیسوں فرشتوں کے عذاب کو دفع فرمادیگا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن ورات میں چوبیس گھنٹے اور ساعات بنائے ہیں اور پھر پانچ ساعتوں میں پانچ وقتوں کی نماز فرض کی ہے۔ لیکن بقیہ انیس ساعتوں میں کچھ فرض نہیں نماز کی پانچ ساعتوں میں اگر بندہ سے گناہ سرزد ہوجائے تو پانچوں نمازیں پانچوں ساعات کے گناہوں کا کفارہ ہوجائیں گی رہے انیس ساعات جس میں کچھ فرض نہیں تو ان انیس ساعات میں گناہوں کا کفارہ کس طرح ادا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے بندوں کو بسم اللہ الرحمن الرحیم عطا فرمایا ہے جس میں انیس حروف ہیں کہ بندہ نے صدق دل سے ایکبار بھی پڑھ لیا تو انیسوں ساعات کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا۔

بست و سوم: منقول ہے کہ ایک عارف باللہ نے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "لکھ کر اہل خانہ کے حوالہ کیا اور وصیت کی کہ اس پرزہ کو اس کے کفن میں رکھ دیا جائے، ان سے پوچھا گیا کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا، انہوں نے فرمایا میں قیامت کے دن رب تعالیٰ سے عرض کرونگا کہ اے میرے معبود تو نے کتاب نازل کیا جس کا عنوان تو نے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "کو بنایا اس لئے میرے ساتھ اپنی کتاب کے عنوان کے مطابق برتاؤ فرما۔

بست و چھارم: سورہ توبہ میں جنگ وقتال اور قہر وغضب کا حکم ہے اس لئے اس کے آغاز میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" مکتوب نہیں ہے نیز ذبح کے وقت "بسم الله الله اکبر" پڑھنے کا حکم ہے لیکن "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھنا درست نہیں کیونکہ قتل وقتال کے وقت رحمن ورحیم کا ذکر مناسب نہیں، ہاں ہر دن کم از کم سترہ رکعات نماز فرض میں اس کا پڑھنا مسنون ہے جس میں اس بات کی طرف دلیل ہے کہ اے بندہ تمہیں قتل وعذاب کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ رحم وکرم اور احسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

بست و پنجم: تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "کی نسبت سوال کیا آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے اللہ تعالیٰ کے بڑے ناموں میں اور اس میں اس قدر نزدیکی ہے جیسے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی میں،۔ابن مردویہ میں یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے معلم کے پاس بٹھایا تو اس نے کہا لکھئے "بِسْمِ اللّٰهِ" حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا "بِسْمِ اللّٰهِ" کیا ہے؟ استاد نے جواب دیا میں نہیں جانتا آپ نے فرمایا "ب" سے مراد اللہ تعالیٰ کا بہاء یعنی حسن وجمال اور "سین" سے مراد اس کی سناء یعنی بلندی ہے اور "م" سے مراد اس کی ملکیت یعنی بادشاہی ہے اور اللہ کہتے ہیں معبودوں کے معبود کو، اور رحمن کہتے ہیں دنیا وآخرت میں رحم کرنے والے کو اور آخرت میں رحم وکرم کرنے والے کو رحیم کہتے ہیں، ابن جریر میں بھی یہ روایت موجود ہے لیکن سند کے اعتبار سے غریب ہے۔(ابن کثیر)

بست و ششم: حدیث شریف میں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب مجھے معراج ہوئی تو تمام بہشتیں میرے سامنے پیش کی گئی، تو ان میں میں نے چار نہریں دیکھیں:

(۱) پانی کی۔
(۲) دودھ کی۔
(۳) شراب کی۔
(۴) شہد کی۔

میں نے جبریل سے نہروں کے متعلق پوچھا کہ یہ نہریں کہاں سے آتی اور کہاں جاتی ہیں؟ جبریل نے کہا حضور! جاتی تو حوضِ کوثر میں ہیں اور یہ مجھے معلوم نہیں کہ آتی کہاں سے ہیں، آپ اپنے رب سے پوچھئے، وہ آپ کو بتائے گا یا دکھائے گا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے التجا کی، رب تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ حاضر ہوا ،تحفۂ سلام پیش کر کے عرض کی، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آنکھیں بند کیجئے۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ پھر عرض کی، آنکھیں کھولئے۔ میں نے دیکھا تو مجھے ایک درخت نظر آیا اور مجھے سفید موتی کا ایک قبہ دکھائی دیا۔ اس کا ایک مقفل دروازہ سونے کا تھا اور وہ اتنا وسیع تھا کہ اگر دنیا کے جن وانسان جمع ہو کر اس پر بیٹھیں تو ایسے معلوم ہوں گے جیسے پہاڑ پر پرندے بیٹھے ہوں۔ پس میں نے ان نہروں کو دیکھا کہ وہ اس قبہ کے نیچے سے آرہی ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں واپس ہونے لگا۔ فرشتے نے عرض کی، حضور! اس قبہ کے اندر داخل کیوں نہیں ہوتے؟ میں نے کہا اس میں دخول کیسے ہو، اس پر تو تالا لگا ہوا ہے اور کنجی بھی نہیں ہے۔ اس نے عرض کی، اس کی کنجی تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" ہے۔ پس میں نے تالا کے قریب بسم اللہ شریف پڑھا محض بسم اللہ شریف پڑھنے سے تالا کھل گیا۔ پھر میں اس قبہ کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ چار نہریں اس قبہ کے چار ستونوں سے جاری ہو رہی ہیں اور ان چاروں ستونوں پر بسم اللہ شریف لکھا ہوا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا کہ پانی کی نہر بسم اللہ شریف کی میم سے اور دودھ کی اللہ کی ہاء سے، اور شراب کی رحمن کی میم سے اور شہد کی رحیم کے میم سے اب مجھے معلوم ہوا کہ چاروں نہروں کا منبع بسم اللہ شریف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم)! جو شخص تیری امت میں ریا سے پاک ہو کر خالص نیت سے مجھ کو ان اسماء سے یاد کرے گا اور کہے گا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو میں اسے چاروں نہروں سے پانی پلاؤں گا۔
متن روایت کے کچھ جملے بغرض حصول تبرک ہدیۂ ناظرین ہیں۔

فلما اردت ان ارجع قال لی ذالک الملک لم لا تدخل القبة قلت کیف ادخل و علیٰ بابها قفل لا مفتاح له عندی قال مفتاحه 'بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" فلما دنوت من القفل و قلت "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" انفتح القفل فد خلت فی القبة فرأیت هذه الانهار تجری من اربعة ارکان القبة و رأیت مکتوبا علیٰ اربعة ارکان القبة 'بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" و رأیت نهر الماء یخرج من میم بسم الله و رأیت نهر اللبن یخرج من هاء الله و نهر الخمر یخرج من میم الرحمن و نهر العسل من میم الرحیم فعلمت ان اصل هذه الانهار الاربعة من البسملة۔ الخ (روح البیان /ص۹/ج:۱)

بست وھفتم: حدیث شریف میں ہے وہ دعا مردود نہیں ہوتی جس کے اول میں بسم اللہ شریف ہو۔

بست وھشتم: احمد بونی لطائف الاشارات میں تحریر فرماتے ہیں کہ شجر وجود بسم اللہ شریف سے متفرع ہوا۔ اور تمام عالم اس کے سبب سے قائم ہے باعتبار اجمال وتفصیل کے یہی وجہ ہے جو شخص اس کا ورد کرتا ہے عالم علوی وسفلی میں اس کی ہیبت چھا جاتی ہے۔

بست ونھم: شیخ اکبر قدس سرہٗ فتوحات میں فرماتے ہیں کہ جب سورہ فاتحہ پڑھی جائے تو بسم اللہ شریف کو اس کے ساتھ ملا کر ایک دم میں پڑھنی چاہئے فصل درمیان میں ہرگز نہ ہو۔ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر حضرت جبریل سے روایت کرتے ہیں وہ قسم کھا کر حضرت میکائیل سے اور وہ قسم کھا کر حضرت اسرافیل سے اور وہ قسم کھا کر اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے (اسرافیل کو) فرمایا اے اسرافیل! مجھے اپنی عزت وجلالت اور سخاوت کی قسم ہے جس نے ایک بار بسم اللہ شریف کو الحمد شریف کے ساتھ ملا کر پڑھا تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اسے بخش دیا، اس کی تمام نیکیاں قبول فرمائیں اور اس کے گناہ معاف کر دیئے اور اس کی زبان کو ہرگز نہ جلاؤں گا، اور اس کو عذابِ قبر، عذابِ نار، عذابِ قیامت اور بڑے خوف سے نجات دوں گا، اور وہ تمام انبیاو اولیا سے پہلے میرے حضور میں پہنچے گا۔ واللہ اعلم (روح البیان)

سی: صحیح مسلم شریف میں حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کھانے پر بسم اللہ نہ پڑھی جائے، شیطان کے لئے وہ کھانا حلال ہو جاتا ہے۔ یعنی بسم اللہ نہ پڑھنے کی صورت میں شیطان اس کھانے میں شریک ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص مکان میں آیا اور داخل ہوتے وقت اور کھانا کے وقت اس نے بسم اللہ پڑھ لی تو شیطان اپنی ذریت سے کہتا ہے کہ اس گھر میں نہ تمھیں رہنا ملے گا نہ کھانا اور اگر داخل ہوتے وقت بسم اللہ نہ پڑھی تو کہتا ہے، اب تمھیں رہنے کی جگہ مل گئی اور کھانے کے وقت بھی بسم اللہ نہ پڑھی تو کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ بھی ملی اور کھانا بھی ملا۔۔۔۔ شرح سنہ میں ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کھانا پیش کیا گیا ابتدا میں اتنی برکت ہم نے کسی کھانے میں نہیں دیکھی، مگر آخر میں بڑی بے برکتی دیکھی، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ایسا کیوں ہوا؟ ارشاد فرمایا ہم سب نے کھانے کے وقت بسم اللہ پڑھی تھی، پھر ایک شخص بغیر بسم اللہ پڑھے کھانے کو بیٹھ گیا، اس کے ساتھ شیطان نے کھانا کھالیا۔

تسمیہ کی جزئیت وعدم جزئیت کا بیان

اس مقام پر حضرت امام رازی نے کہا ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سورہ فاتحہ کی اول آیت ہے اور سورہ فاتحہ کے ساتھ اس کی قرأت واجب ہے امام مالک وامام اوزاعی نے کہا کہ وہ سورہ نمل کے علاوہ قرآن سے نہیں ہے لہٰذا سوائے رمضان المبارک کے قیام کے سراً و جہراً اس کی قرأت نہ ہوگی۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی اس پر کوئی نص صریح نہیں ہے لیکن کہا ہے کہ تسمیہ کو سراً پڑھا جائے گا اور انہوں نے نہیں کہا ہے کہ یہ کسی سورہ کی اول آیت ہے یا نہیں۔ یعلی نے کہا میں نے محمد بن حسن سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے بارے میں پوچھا تو فرمایا "مابین الدفتین" قرآن ہے اس پر یعلی نے کہا کہ تب اس کی جہراً قرأت کیوں نہیں کرتے تو امام محمد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بعض فقہاء حنفیہ نے کہا ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے اس مسئلہ میں پڑنے سے پرہیز کیا کیونکہ تسمیہ کا قرآن سے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ نہایت ہی مشکل مسئلہ ہے اس لئے اس سے سکوت بہتر ہے۔ امام کرخی نے کہا کہ خاص اس مسئلہ کے بارے میں مجھے متقدمین حنفیہ کی رائے معلوم نہ ہوسکی تاہم حضرات متقدمین کا تسمیہ کو سراً پڑھنے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ تسمیہ سورہ سے نہیں ہے۔

مسئلہ تسمیہ کی تین نہج پر گفتگو کی جاسکتی ہے:

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ مسئلہ تسمیہ کیا مسائل اجتہادیہ سے ہے؟ تاکہ اس میں ظواہر اور اخبار آحاد سے استدلال کیا جائے یا مسائل اجتہادیہ سے نہیں ہے بلکہ مسئلہ تسمیہ، مسئلہ قطعیہ سے ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اگر تسمیہ مسائل اجتہادیہ سے ہے تو اس میں حق کیا ہے؟

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ بہرصورت تسمیہ کو جہراً پڑھا جائے یا سراً۔

تسمیہ سے متعلق مندرجہ بالا امور ومعلومات کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل بحثیں پڑھئے۔

بحث اول: اس بیان میں کہ تسمیہ، مسائل قطعیہ سے نہیں ہے اور قاضی ابوبکر نے کہا کہ وہ مسئلہ قطعیہ سے ہے لہٰذا اس میں خطا ولغزش گرچہ حد تکفیر کو نہ پہنچے گی لیکن تفسیق کی حد کو ضرور پہنچ جائے گی اپنے نظریہ کے اثبات میں انہوں نے دلیل یہ دی ہے کہ تسمیہ اگر قرآن سے ہوتا تو اس کے اثبات کا طریقہ تواتر سے ہوتا یا آحاد سے پہلی صورت باطل ہے کیونکہ تسمیہ کا قرآن سے ہونے کا ثبوت اگر تواتر سے ہوتا تو علم ضروری وبدیہی حاصل ہوجاتا کہ وہ قرآن سے ہے کہ

تواتر علم ضروری بدیہی کا افادہ کرتا ہے اگر ایسا ہوتا تو امت کے کسی فرد کا اس میں اختلاف نہ ہوتا کہ تواتر کے علم میں اختلاف نہیں ہوتا اور دوسری صورت بھی باطل ہے کیونکہ خبر واحد افادۂ ظن کرتا ہے۔ پس اگر قرآنیت کے اثبات کے لئے خبر واحد کو راہ ہو جائے تو قرآن حجت یقینہ ہونے سے خارج ہو جائے گا اس طرح وہ ظنی ہو جائیگا پھر تو دعویٰ روافض کو کہ قرآن میں زیادتی و کمی اور تغیر و تحریف ہوئی ہے گنجائش مل جائیگی جب تو اسلام خطرہ میں پڑ جائے گا۔

معارضہ: حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی ابوبکر پر بایں طور معارضہ قائم کیا ہے کہ تسمیہ کا قرآن سے نہ ہونا اگر تواتر سے ثابت ہے تو لازم آئے گا کہ اس میں اختلاف نہ ہوتا اور اگر نہ ہونے کا ثبوت احاد سے ہے تو لازم کہ قرآن ظنی ہو پھر حضرت غزالی نے خود ایک سوال قائم کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی کہے کہ عدم، قرآن سے نہیں اس لئے اس عدم کے اثبات کے لئے کسی نقل کی ضرورت نہیں کہ اصل عدم ہے لیکن ہمارا یہ کہنا کہ وہ قرآن سے ہے ثبوتی ہے تو اس کے لئے نقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

جواب: پھر جواب بایں طور دیا ہے کہ یہ اگرچہ عدمی ہے مگر تسمیہ کا قرآن کے خط میں مکتوب ہونا وہم پیدا کرتا ہے کہ وہ قرآن سے ہے اس لئے یہاں تسمیہ کے لئے قرآن سے نہ ہونے کا حکم کرنا بغیر کسی علیحدہ دلیل کے ممکن نہیں ہے۔ واضح رہے کہ امام غزالی کے اس جواب پر قاضی ابوبکر کا کلام سابق عود کرے گا کہ وہ علیحدہ دلیل تواتر سے ثابت ہے یا آحاد سے اگر تواتر سے ثابت ہوتا تو اختلاف نہ ہوتا اور آحاد سے ثابت ہو تو قرآن ظنی ہو جائے گا غرض جو قاضی نے کہا ہے اس پر شیخ غزالی کا معارضہ زیادہ نفع بخش ثابت نہیں ہو سکا۔

حضرت امام رازی نے فیصلہ کن گفتگو کرتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ نقل متواتر سے ثابت ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کلام الٰہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے چنانچہ وہ خط قرآنی کے ساتھ مصحف شریف میں ثابت ہے اس لئے قرآن سے ہونے نہ ہونے کی بحث بیکار ہے تاہم یہاں تسمیہ سے متعلق کچھ ایسے احکام شرعیہ پائے جاتے ہیں جن کا تعلق خواص قرآن سے ہے مثلاً اس کی قرأت نماز میں واجب ہے یا نہیں، جنبی کے لئے اس کی قرأت درست ہے یا نہیں اور محدث کو اسکا چھونا جائز ہے یا نہیں وغیرہ۔ لہٰذا تسمیہ کے قرآن سے ہونے نہ ہونے کا مدار مذکورہ بالا مسائل کے ثبوت و عدم ثبوت پر ہے اور ان احکام کا ثبوت یا عدم ثبوت امور اجتہادیہ سے ہے اس لئے ثابت کہ مسئلہ تسمیہ اجتہادی ہے قطعی نہیں ہے اس لئے قاضی کا تسمیہ کو قطعی کہنا محل نظر ہے۔

بحث دوم: اس بیان میں کہ تسمیہ قرآن سے ہے یا نہیں اور یہ کہ وہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے یا نہیں، واضح رہے

کہ قراء مکہ وکوفہ اور حجاز کے اکثر فقہاء کا قول یہ ہے کہ تسمیہ قرآن سے ہے اور وہ فاتحہ کا جز ہے اور یہی قول عبداللہ ابن مبارک اور امام ثوری کا بھی ہے۔ان حضرات نے اپنے نظریہ کے اثبات میں بہت دلیلیں پیش کی ہیں ان کے موقف کی مندرجہ ذیل چند دلیلیں ذکر کی جاتی ہیں۔

دلیل اول: حضرت امام شافعی نے امام مسلم سے روایت کیا انہوں نے ابن جریج سے وہ ابن ابی ملیکہ سے وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں آپ فرماتی ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتحۃ الکتاب کی قرأت فرمائی تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو ایک آیت شمار فرمایا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کو ایک آیت ، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو ایک آیت، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کو ایک آیت ،اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کو ایک آیت "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کو ایک آیت اور "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کو ایک آیت شمار فرمایا۔

دلیل دوم: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب میں سات آیتیں ہیں ان میں پہلی "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" ہے۔

دلیل سوم: ثعلبی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابو بریدہ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی آیت کی خبر نہ دوں جو سلیمان علیہ السلام کے بعد میرے علاوہ کسی نبی پر نازل نہیں ہوئی میں نے کہا کیوں نہیں فرمایا کس چیز سے تم قرآن شروع کرتے ہو جب نماز پڑھتے ہو میں نے کہا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے تو حضور نے فرمایا "ھی ھی" یہی، یہی ہے۔

دلیل چھارم: ثعلبی نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ بیشک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا کہ جب تم نماز میں کھڑے ہوتے ہو تو کیا کہتے ہو انہوں نے کہا کہ میں 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کہتا ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہا کرو، حضرت ام سلمی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" قرأت کرتے تھے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک آپ جب نماز میں سورہ شروع کرتے تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس نے اس کی قرأت نہ کی تحقیق اس نے کمی کردی

حضرت سعید بن جبیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ "وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" کے بارے میں کہ وہ فاتحہ الکتاب ہے ان سے عرض کیا گیا کہ پھر ساتویں آیت کہاں ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم ام القرآن پڑھو تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو نہ چھوڑو کہ وہ اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ فاتحہ میرے اور میرے بندوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کردی گئی ہے بندہ جب "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی جب بندہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پڑھتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد بیان کی، جب بندہ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہتا ہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا بیان کی، جب "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کہتا ہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے بندے نے اپنے معاملات کو میرے سپرد کردیا، جب "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کہتا ہے تو اللہ عزشانہ فرماتا ہے "هذا بيني وبين عبدي" یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے "هذا لعبدي ولعبدي ما سأل" یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا اس کو ملے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو حدیث بیان فرمارہے تھے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے لئے آیا پس اس نے نماز شروع کی اور تعوذ پڑھا پھر "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" شروع کردیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنا تو ارشاد فرمایا کہ اے شخص تو نے نماز کو اپنے اوپر کاٹ دیا کیا تم کو نہیں معلوم ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" الحمد سے ہے پس جس نے اس کو چھوڑ دیا تو اس کی ایک آیت کو چھوڑ دیا اور جس نے اس سے ایک آیت چھوڑ دی تو درحقیقت اس نے اپنی نماز قطع کردی۔ سن لو کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی اسی طرح حضرت طلحہ بن عبیداللہ سے مروی ہے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو ترک کیا اس نے کتاب اللہ کی ایک آیت کو ترک کیا۔ یہ ساری حدیثیں شیخ ابواسحاق ثعلبی کی تفسیر سے بحوالہ تفسیر رازی منقول ہیں۔

دلیل پنجم: بسم اللہ کا پڑھنا فاتحہ کے شروع میں واجب ہے اس لئے اس کا آیت ہونا بھی ضروری ہے آغاز فاتحہ میں قرأت تسمیہ کے وجوب کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ'' (العلق:۱) میں ہے چونکہ آیت متلوہ میں ''حرف با'' صلہ زائدہ نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ایک اجماعی قاعدہ ہے کہ قرآن کا کوئی حرف بے فائدہ نہیں ہے لہٰذا با زائدہ نہیں ہوسکتا بلکہ باذو معنی ہوگا، اس تقدیر پر، آیت کا مفہوم ہوگا ''اقرأ مفتتحاً باسم ربک'' اور یہ ظاہر کہ امر وجوب کے لئے ہے اور یہ وجوب، نماز میں قرأت کے علاوہ قرأت کیلئے ثابت نہیں لہذا نماز میں قرأت کے وقت بسم اللہ کی قرأت کا وجوب ثابت ہوگا تا کہ نص بے معنی وغیر مفید ہونے سے محفوظ رہ سکے۔

دلیل ششم: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' خط قرآنی میں لکھا جاتا ہے حالانکہ جو قرآن سے نہیں ہے اس کو خط قرآنی میں نہیں لکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مصحف میں اسمائے سورہ کے لکھنے سے علمانے منع کیا ہے اور اعشار و اخماس کی علامتوں کو لکھنے سے بھی علمانے منع کیا ہے ان سب باتوں سے مقصود یہ ہے کہ جو چیزیں قرآن سے نہیں ہیں وہ قرآن کے ساتھ مخلوط نہ ہونے پائیں۔ پس اگر تسمیہ قرآن سے نہ ہوتا تو اسے خط قرآنی میں نہ لکھتے مگر جب علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ تسمیہ کو خط قرآن میں لکھا جائے تو ہم نے سمجھ لیا کہ تسمیہ قرآن سے ہے۔

دلیل ہفتم: تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جو دفتین کے مابین ہے قرآن کلام اللہ ہے اور تسمیہ بھی دفتین کے درمیان ہے لہذا اس کو بھی کلام اللہ سے کہنا واجب ہوگا۔

واضح رہے کہ اکثر مفسرین، فقہا اور محدثین کا اتفاق ہے کہ سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں مگر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' ان میں سے ایک مستقل آیت ہے اور ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' ایک مستقل آیت ہے۔ لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ آیت نہیں ہے بلکہ ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' ایک آیت ہے اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' ایک دوسری آیت ہے۔ غرض سات آیات ہونے پر اتفاق ہے اور بسم اللہ کے آیت ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ ذیل میں طرفین کی دلیلیں اور مذہب راجح کی ترجیحات پیش ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جو حضرات تسمیہ کو فاتحہ کی آیت کہتے ہیں انہوں نے اپنے موقف پر مندرجہ ذیل دلیلیں دی ہیں۔

دعویٰ: تسمیہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے:

دلائل:

(۱) قبل فاتحہ تسمیہ کی قرأت واجب ہے اور دلیل وجوب، دلیل آیت اتباع (واتبعوہ) ہے چونکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ بھی مانتے ہیں کہ تسمیہ افضل ہے جب ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پڑھا ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھنا ثابت ہے تو ہم پر اس کا پڑھنا واجب ہے اللہ عز وجل کا ارشاد ہے (واتبعوہ) پس آیت سے تسمیہ کی قرأت کا وجوب ثابت ہوگیا پس جب تسمیہ واجب تو اس کا آیت ہونا لازم کہ کوئی قائل بالفصل نہیں ہے۔

(۲) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "کل امر ذی بال لا یبدأ فیہ باسم اللہ فھو ابتر و اجزم" یعنی جس کام کی ابتدا اسم الٰہی سے نہیں ہوتی وہ کام ناقص اور ادھورا رہ جاتا ہے۔ اور ایمان کے بعد تمام اعمال میں سب سے افضل و اعظم نماز ہے پس نماز میں بغیر تسمیہ فاتحہ کی قرأت، نماز کے نقصان و ناتمام ہونے کو بحکم حدیث مذکور ثابت کرتا ہے۔ چونکہ حدیث میں لفظ ابتر مذکور ہے اور ابتر کمال نقصان و خلل پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن کی مذمت کے مقام میں اس لفظ کو ذکر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے "اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ" بیشک جو تمہارا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے۔ (الکوثر: ۳) اس لئے لازم ہے کہ جو نماز قرأت تسمیہ سے خالی ہو کر پڑھی جائے وہ کامل طور پر ناقص ہوگی اور ہر وہ جس کو ایسے کامل نقصان کا اقرار ہوگا وہ اس کے فساد کا قول ضرور کریگا اور فساد اسی وقت ہوگا جب واجب کا ترک ہو اس سے ثابت کہ تسمیہ واجب ہے۔

(۳) روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کونسی ہے۔ عرض کیا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، تو آپ نے اس کی تصدیق فرمائی۔

(۴) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ آئے آپ نے لوگوں کو جہری نماز جہر کے ساتھ پڑھائی سورہ فاتحہ پڑھا مگر "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" نہیں پڑھا جب نماز سے فارغ ہوئے تو مسجد کے ہر ہر گوشہ سے حضرات مہاجرین و انصار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کہنے لگے کیا آپ بھول گئے جب آپ نے نماز شروع کی تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہاں پڑھا پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے نماز کا اعادہ کیا اور "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھا۔ یہ حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ صحابہ کا اجماع ہوگیا ہے کہ تسمیہ نہ یہ کہ صرف قرآن سے ہے بلکہ فاتحہ سے بھی ہے نیز یہ کہ تسمیہ بالجہر اولیٰ ہے۔

(۵) بیشک حضرات انبیاے کرام علیہم السلام ہر اعمال خیر کا آغاز اسم الٰہی سے کرتے تھے پس واجب کہ ہم سب کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اعمال خیر کے آغاز میں تسمیہ واجب ہو پھر جب رسول کے حق میں تسمیہ واجب ہوگا تو ہمارے حق میں بھی واجب ہوگا اور جب ہمارے حق میں تسمیہ کا وجوب ثابت ہوگا تو تسمیہ کا فاتحہ سے ہونے کا وجوب ثابت ہوگا مقدمہ اولیٰ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب کشتی پر سوار ہونے کا ارادہ فرمایا تو ارشاد ہوا "وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا" (ہود:۴۱) اور اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکہ سبا بلقیس کو خط لکھا تو اس طرح آغاز فرمایا "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (النمل:۳۰) رہا دوسرا مقدمہ کہ جب تمام انبیا پر تسمیہ واجب ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی واجب ہوگا تو اس کی دلیل آیت کریمہ "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ" یہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تو تم انہیں کی راہ چلو۔ (الانعام:۹۰) ہے اور جب رسول کے حق میں واجب ہوا تو ہمارے حق میں بھی واجب ہوگا کہ ارشاد ہے (وَاتَّبِعُوْهُ) لہٰذا اس کا فاتحہ سے ہونا ثابت ہے

دعویٰ: تسمیہ جزو فاتحہ نہیں ہے۔

دلائل: حضرات احناف اور وہ حضرات جو تسمیہ کو سورہ فاتحہ کا جز نہیں مانتے ان کی دلیلیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) صحیح البخاری، مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے "قال صليت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم وخلف ابى بكر و عمر و عثمان فلم اسمع احدا منهم يقرأ بسم الله الرحمن الرحيم" یعنی میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے لیکن ان میں سے کسی کو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتے نہیں سنا۔

(۲) عن انس أن النبى صلى الله عليه وسلم وابا بكر و عمر كانوا يفتتحون الصلوٰة بالحمد لله رب العلمين (مسلم شریف) یعنی بیشک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم نماز کو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے شروع فرماتے تھے۔

(۳) نسائی، ابن حبان، اور طحاوی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا "قال صليت خلف النبى صلى الله عليه وسلم وابى بكر و عمر و عثمان فلم اسمع يجهر ببسم الله الرحمن الرحيم" میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نمازیں پڑھی

لیکن ان حضرات میں سے کسی کو بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھتے نہیں سنا۔

(۴) طبرانی نے معجم کبیر میں، ابونعیم نے حلیہ میں، ابن خزیمہ اور طحاوی نے حضرت انس سے روایت کی أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابا بکر و عمر کانوا یسرون بسم اللہ الرحمن الرحیم بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہما بسم اللہ کو آہستہ پڑھتے تھے۔

(۵) ابوداؤد، دارمی اور طحاوی نے بایں الفاظ روایت کیا ہے "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابا بکر و عمر و عثمان کانوا یستفتحون القرأۃ بالحمد للہ رب العلمین"۔

(۶) صحیح مسلم میں یہ بھی مروی ہے۔"أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابا بکر و عمر و عثمان کانوا یستفتحون القرأۃ بالحمد للہ رب العلمین لا یذکرون بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول القرأۃ ولا فی آخرھا" بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم، الحمد للہ سے قرأت شروع فرماتے تھے بسم اللہ کو نہ قرأت کے شروع میں ذکر کرتے اور نہ قرأت کے آخر میں۔

(۷) ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے "عن ابن مسعود انہ کان یخفی بسم اللہ الرحمن الرحیم والاستعاذۃ وربنا لک الحمد" حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"، "اعوذ باللہ" اور "ربنا لک الحمد" آہستہ پڑھا کرتے تھے۔

(۸) حضرت امام محمد نے کتاب الآثار میں حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا "قال اربع یخفیھن الامام بسم اللہ الرحمن الرحیم"، وسبحانک اللھم والتعوذ وآمین یعنی چار چیزوں کو امام آہستہ پڑھے گا، بسم اللہ ، سبحانک اللھم ، اعوذ باللہ اور آمین۔

(۹) مسلم اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے "قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفتتح الصلوۃ بالتکبیر والقرأۃ بالحمد للہ رب العلمین" فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز تکبیر سے شروع فرماتے تھے اور قرأت کو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے شروع کرتے تھے۔

(۱۰) عبدالرزاق نے ابو فاختہ سے روایت کی "أن علیا کان لا یجھر بسم اللہ الرحمن الرحیم وکان یجھر بالحمد للہ رب العلمین" حضرت علی مرتضیٰ مشکل کشا رضی اللہ عنہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کو بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

مندرجہ بالا تمام احادیث مبارکہ سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تسمیہ جز فاتحہ نہیں ہے۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء اربعہ فاتحہ کے ساتھ اسے ضرور قرأت بالجہر فرماتے لہٰذا جن حدیثوں میں قرأت کا ذکر ہے اسے بطور مسنون پڑھنا کہا جائے گا اس طرح دونوں طرح کی احادیث پر عمل ہوجائے گا جیسا کہ دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ "قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نھض فی الثانیۃ استفتح بالحمد للہ رب العلمین ولم یسکت"۔ (شرح معانی الآثار صفحہ ۱۱۸، ج:۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تو الحمدللہ سے قرأت شروع کردیتے اور خاموش نہ رہتے۔

اس حدیث پاک کے مدنظر امام طحاوی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورہ فاتحہ سے نہیں ہے کیونکہ اگر وہ سورہ فاتحہ کا جزء ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری رکعت میں ضرور تلاوت فرماتے جیسے کہ الحمدللہ کی قرأت فرمائی پس جب دوسری رکعت میں بسم اللہ کی قرأت نہیں کی تو لازم کہ پہلی رکعت میں بھی قرأت نہیں کی غرض یہ کہ تسمیہ کا فاتحہ یا کسی سورہ کا جزء ہونا ثابت نہیں۔ تسمیہ کا نزول دو سورتوں کے درمیان فاصلہ کے لئے اور حصول برکت کے لئے ہوا ہے جیسا کہ جامع قرآن حکیم امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے استفسار پر فرمایا تھا حضرت عبداللہ ابن عباس عنہما نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ کیا بات ہے کہ آپ حضرات نے سورہ انفال اور سورہ برأت کو ملا دیا ہے اور دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھا ہے جب کہ دونوں الگ الگ سورتیں ہیں حضرت عثمان غنی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ فرماتے کہ اس کو فلاں سورہ میں رکھو جس میں ایسا ایسا ذکر ہے اور چونکہ سورہ برأت و انفال نظم و معنی کے اعتبار سے ملتی جلتی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے مگر ہم سب اس بارے میں پوچھ نہیں سکے کہ یہ سب طوال میں سے ہے یا مئین میں سے ہے اس لئے ہم لوگوں نے ان دونوں کے درمیان تسمیہ چھوڑ دیا کہ کہیں وہ سبع طوال میں سے نہ ہو چنانچہ ان دونوں سورتوں کو ملا دیا اور بسم اللہ نہیں لکھا۔

شرح معانی الآثار میں امام طحاوی فرماتے ہیں "فھذا عثمان یخبر فی ھذا الحدیث ان بسم اللہ الرحمن الرحیم لم تکن عندہ من السورۃ وانہ انما کان یکتبھا فی فصل السور وھی غیرھن

'سب سے پہلی وحی کا حال اصح الکتب صحیح البخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ سے اس طرح مروی ہے کہ حضرت

جبرئیل امین علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا "اقرأ" پڑھئے، حضور نے فرمایا "ماانا بقاری" میں پڑھنے والا نہیں، پھر عرض کیا "اقرأ" حضور نے وہی جواب دیا تیسری بار عرض کیا "اقرأ باسم ربک الذی خلق" حضور نے پڑھنا شروع کر دیا، اس میں بسم اللہ کا کہیں ذکر نہیں کہ اقرأ سے پہلے تسمیہ بطور جزئیت نازل ہوا ہو، اگر نازل ہوئی ہوتی تو حضرت جبرئیل پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کی تلقین کرتے مگر ایسا نہ کیا جس سے ظاہر ہے کہ تسمیہ سورہ اقرأ میں بطور جزئیت نازل نہیں ہوا۔ پھر اس حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ بسم اللہ ہر سورہ کے آغاز میں سورہ کے اوپر لکھا جاتا ہے اور یہ طریقہ کتابت متوارث ومجمع علیہ ہے۔ اگر سورہ کا جز ہوتا تو تسمیہ کو سورہ کے اوپر علیحدہ کر کے لمبے حروف کے ساتھ نہ لکھا جاتا بلکہ جیسے اور آیتیں ملی ہوئی لکھی گئی ہیں ایسے ہی بسم اللہ کو بھی تمام آیتوں کے ساتھ لکھا جاتا جیسا کہ سورہ نمل میں بسم اللہ کو ملا کر لکھا گیا ہے کہ یہاں پر بسم اللہ جز وسورہ ہے لیکن سورہ نمل میں دیگر آیتوں کی طرح ملا کر لکھنا اور اوائل سورہ میں آیات کے ساتھ ملا کر نہ لکھنا بلکہ امتیازی طور پر لکھنا دلیل ہے کہ نمل میں بسم اللہ جز ہے اور دوسری سورہ میں جز نہیں ہے بلکہ بطور تبرک وفصل سورہ کے لئے ہے۔

پس جس طرح سورہ "اقراء" وغیرہ سورہ میں بسم اللہ جز ءسورہ نہیں ہے اسی طرح فاتحہ میں بھی جز ءسورہ نہیں ہوگا اس کی تائید سورہ فاتحہ والی حدیث قدسی سے ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین، فاذا قال العبد الحمد للہ رب العلمین یقول اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم یقول اللہ تعالیٰ أثنی علی عبدی واذا قال مالک یوم الدین یقول اللہ تعالیٰ مجدنی عبدی، واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین یقول اللہ تعالیٰ ھذا بینی وبین عبدی الی آخر الحدیث"۔ اس حدیث سے استدلال دو طریق پر ہے۔

اول: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تقسیم فاتحہ کے وقت بسم اللہ کو نہیں ذکر کیا اگر بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہوتی تو بموقع تقسیم تسمیہ کا بھی ذکر ہوتا۔

دوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین" اس میں صلوٰۃ سے مراد فاتحہ ہے اور یہ تنصیف صحیح اسی صورت میں ہوتی ہے کہ تسمیہ کو فاتحہ سے نہ مانا جائے کیونکہ سورہ فاتحہ بالاتفاق سات آیات پر مشتمل ہے اس لئے حکم تنصیف کے مطابق واجب ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" سے لیکر "نَعْبُدُ" ساڑھے تین آیات تک رب

تعالیٰ کے لئے ہواور ''وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' سے لیکر آخر سورہ ساڑھے تین آیات بندوں کے لئے ہولیکن اگر ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کو جزء فاتحہ مانیں گے تو اللہ تعالیٰ کے لئے ساڑھے چار آیات ہوجائیں گی اور بندہ کے لئے ساڑھے تین آیات ہونگی اس طرح تنصیف بیکار ہوجائیگی۔

حاصل یہ کہ اس بارے میں کہا جائے کہ دونوں طرح کی روایات ہیں مگر تمام مرویات پر عمل کرنے کا ایک یہی طریقہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین نے تسمیہ کو بطور قرأت نہیں پڑھا بلکہ ثنا وتعوذ کی طرح بطور ذکر وتبرک پڑھا اگر تسمیہ کو بطور قرأت وتلاوت پڑھنے پر بضد ہونگے تو ان تمام احادیث کا ترک لازم آئے گا جس میں تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ الحمدللہ سے نماز کی قرأت شروع فرماتے تھے اور بعض احادیث کے ترک سے سب پر عمل کرنا بہتر ہے لہذا یہ کہا جائے کہ ثنا وتعوذ کی طرح تسمیہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور ذکر وتبرک پڑھا ہے تلاوت کے طور پر کبھی نہیں پڑھا ورنہ جہری نماز کی پہلی رکعت میں تسمیہ کی قرأت سراً کرنے کا کوئی معنی نہیں ہوگا تسمیہ کو سراً پڑھنا اور آیات کو جہراً پڑھنا بڑی واضح دلیل ہے کہ آغاز سورہ میں جو تسمیہ ہے وہ قرآن سے نہیں اگر قرآن سے ہوتا تو دوسری آیتوں کی طرح تسمیہ کی بھی جہراً قرأت فرماتے کبھی جہر کو ترک نہ فرماتے جس طرح درمیان سورہ نمل میں جو تسمیہ ہے اس کی دوسری آیتوں کی طرح بالجہر قرأت کی جاتی ہے کہ وہ قرآن سے ہے مگر تسمیہ کی دیگر کسی سورت کے آغاز میں بالجہر قرأت نہیں کی جاتی کہ قرآن سے نہیں ہے اسی طرح فاتحہ کے شروع میں بھی تسمیہ کی بالجہر قرأت نہیں کی جائے گی کہ یہاں بھی قرآن سے نہیں ہے۔

بحث سوم: سورہ فاتحہ کی تعداد آیات کے بیان میں، حضرت حسن بصری سے بعض روایت شاذہ میں ہے کہ سورہ فاتحہ میں آٹھ آیتیں ہیں لیکن روایت مشہورہ جس پر اکثر فقہاء ومفسرین کا اعتماد ہے یہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں۔ چنانچہ آیت قرآنیہ ''وَلَقَدْ آتَیْنَاکَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِیْ'' کی تفسیر، فاتحہ کی سات آیتوں سے بھی کی گئی ہے پس جنہوں نے ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کو سورہ فاتحہ کا جز مانا ہے ان کے نزدیک ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' پوری ایک آیت ہے اور جن کے نزدیک تسمیہ جزو فاتحہ نہیں ہے ان کے نزدیک صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ '' ایک آیت ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' ایک دوسری آیت ہے۔

بحث چہارم: اس بیان میں ہے کہ تسمیہ کو جزو سورہ ماننے کی صورت میں تسمیہ ایک مستقل آیت ہے یا پھر اپنے ما

بعد والی آیت کے ساتھ ضم ہوکر آیت ہے حضرات شوافع کے نزدیک تسمیہ مابعد والی آیت کے ساتھ مل کر آیت ہے اور احناف کے نزدیک چونکہ تسمیہ جز وسورہ ہی نہیں اس لئے بسم اللہ کا مستقل وغیر مستقل آیت ہونا خارج از بحث ہے۔ چنانچہ حدیث شریف سے بھی تسمیہ کے آیت نہ ہونے کی تائید ہوتی ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ ملک میں تیس آیتیں ہیں۔ اور سورہ کوثر میں تین آیتیں ہیں۔ اگر تسمیہ کو آیت میں شمار کرتے تو سورہ ملک میں اکتیس اور سورہ کوثر میں چار آیتیں ہوجائیں گی جو ارشاد رسول کے خلاف ہوگا۔

بحث پنجم: قرأت تسمیہ کی کیفیت کے بیان میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے امام احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ تسمیہ فاتحہ کی ایک آیت ہے مگر جہری وسری ہر نماز کی ہر رکعت میں اس کی قرأت سراً ہی کی جائے گی۔ امام شافعی سے مروی ہے کہ تسمیہ فاتحہ سے ہے اس لئے اس کی قرأت جہری ہوگی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا فرمان یہ ہے کہ تسمیہ سورہ فاتحہ سے نہیں ہے تاہم جہری وسری ہر نماز میں سراً تسمیہ مسنون ہے۔ شوافع واحناف ہر ایک کی دلیلیں اور ترجیحات ما سبق میں گذر چکی ہیں۔

بحث ششم: (تسمیہ کے متفرعات)

(۱) تسمیہ کے فاتحہ سے ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ اس کی قرأت بھی واجب ہوگی اس لئے جو حضرات جزئیت تسمیہ کے قائل ہیں وہ وجوب قرأت کے بھی قائل ہیں اور جو جزئیت کے قائل نہیں ہیں وہ تسمیہ کی قرأت میں اختلاف کرتے ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب حسن بن صالح بن سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ وغیرہم تسمیہ کی سری طور پر قرأت کے قائل ہیں جب کہ حضرت امام مالک فرائض میں جہراً وسراً کسی اعتبار سے قرأت تسمیہ کو مناسب نہیں سمجھتے البتہ نوافل میں تسمیہ کی قرأت اور ترک دونوں کا اختیار دیتے ہیں۔

(۲) حضرت امام شافعی کے مذہب کا مقتضی یہ ہے کہ تسمیہ نماز کی ساری رکعتوں میں واجب ہے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں دو روایت منقول ہیں یعلی نے امام ابو یوسف سے روایت کر کے امام اعظم سے بیان کیا ہے کہ قبل فاتحہ ہر رکعت میں تسمیہ کی قرأت مسنون ہے اور امام ابو یوسف ومحمد اور حسن بن زیاد تینوں بزرگوں نے حضرت امام اعظم سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ صرف پہلی رکعت میں ابتداء قرأت کے وقت تسمیہ مسنون ہے اور پھر بعد والی رکعتوں میں تسمیہ کا پڑھنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

(۳) حائض وجنب اور نفساء کے لئے قرأت تسمیہ کے جواز کے بارے میں اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ بہ نیت تلاوت و قرأت جائز نہیں ہے لیکن بطور دعاء وتبرک پڑھنے میں حرج بھی نہیں ہے۔

(۴) حضرات ائمہ کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ وضو کے شروع میں تسمیہ پڑھنا مندوب ہے واجب نہیں ہے چونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے "توضأ کما امرک اللہ بہ" کہ وضو کرو جیسا اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے اور ظاہر ہے کہ آیت وضو میں تسمیہ مذکور نہیں اس لئے بسم اللہ پڑھنا واجب نہ ہوگا یہی مذہب حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اوران کے احباب کا ہے۔ اہل ظواہر بسم اللہ پڑھنے کو ابتدائے وضو میں واجب گردانتے ہیں چنانچہ جس کسی نے عمدا یا سہوا بسم اللہ کو ترک کر دیا تو اس کا وضو اور نماز نہ ہوگی اسحاق نے تفصیل کی ہے وہ یہ کہ اگر عمداً ترک کیا تو ناجائز ہے او ربھول سے ترک ہوا تو جائز ہے۔

(۵) حضرات علمائے اسلام کا اس بارے میں بھی اتفاق ہے کہ ہر جائز ومباح کام تسمیہ سے شروع کرنا مستحب ہے پس جب سوئے تو بسم اللہ کہہ کر سوئے، جاگے تو بسم اللہ کہتے ہوئے جاگے عبادت کا قصد کرے تو بسم اللہ پڑھے گھر میں داخل ہو تو بسم اللہ کہہ کر داخل ہو گھر سے نکلے تو بسم اللہ کہہ کر نکلے، کھائے اور پیئے تو بسم اللہ سے شروع کرے لین دین کرے تو بسم اللہ سے آغاز کرے، دودھ پلانے والی ماں یا دایہ جب بچہ کو دودھ پلائے تو بسم اللہ پڑھ کر پلانا شروع کرے کہ یہ بچہ کی حیات دنیا کا آغاز ہے اور جب موت ہوتی ہے اور قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو بھی بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے کہ یہ دنیا کی زندگی کی انتہا ہے پھر جب بندۂ مومن قبر سے اٹھے گا تو بتوفیق الٰہی بسم اللہ کہتا ہوا اٹھے گا اور جب موقف میں حاضر ہوگا تو بسم اللہ کہے گا آغاز دنیا سے لیکر برزخ اور حشر تک بسم اللہ کے ورد کی برکت یہ ہوگی کہ اس کو جہنم سے دور کر دیا جائے گا۔

(۶) مقتدی کا نماز میں قرأت کرنے کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے، حضرت امام شافعی سے اس بارے میں دو روایت ہے قول جدید یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت بہر حال واجب ہے خواہ امام قرأت سری کرے یا جہری، اور قول قدیم یہ ہے کہ جب امام سری قرأت کرے تو مقتدی پر قرأت واجب ہے اور جہری میں واجب نہیں ہے یہی قول حضرت امام مالک اور ابن مبارک کا ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقتدی کے لئے قرأت خلف الامام جائز نہیں۔

بحث ہفتم: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" میں تین اسمائے الٰہیہ کی ذکر کے وجوہ

خلق کی عقلوں پر تجلیات الٰہیہ ہوئیں جن کے تین مراتب ہیں۔

اول امر میں اس نے اپنے افعال وآیات سے تجلی فرمائی۔ وسط امر میں اس نے اپنی صفات سے تجلی فرمائی اور آخر

امر میں اپنی ذات کی تجلی فرمائی۔ پس کہا گیا کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنے عام بندوں کے لئے اپنے افعال وآیات سے تجلی فرمائی ارشاد ہے۔ ''وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ''اوراس کی نشانیوں سے ہیں دریا میں چلنے والیاں جیسے پہاڑیاں (شوریٰ:۳۲) اورفرمایا ''اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ'' بیشک آسمانوں اورزمین کی پیدائش اوررات ودن کی باہم بدلیوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے۔ (آل عمران:۱۹۰) پھراپنے اولیاے کرام پراپنی صفات کی تجلی فرمائی۔ چنانچہ ارشادفرمایا ''وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا'' اورآسمانوں اورزمین کی پیدائش میں غورکرتے ہیں، اے رب ہمارے تونے یہ بیکارنہ بنایا۔ (آل عمران:۱۹۱) اوراکابرانبیاے کرام وروسائے ملائکہ پراپنی ذات کی تجلی فرمائی۔ ارشادہے ''قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ''کہواللہ، پھرانہیں چھوڑدوان کی بیہودگی میں انہیں کھیلتا۔ (الانعام:۹۱)

ان مراتب تجلیات کے بعد یہ سمجھئے کہ اسم جلالت ''اللہ'' تجلی ذات میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے سب سے زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ یہ اسم پاک لفظ میں سب سے زیادہ ظاہر اور معنی میں عقل سے بہت ہی بعید ہے۔ غرضیکہ یہ اسم پاک ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے پس اس کا انکار محال اوراس کے اسرار ناقابل ادراک ہیں حضرت حسین بن منصور حلاج نے کہا ہے۔

اسم مع الخلق قدتا هوا ولهاً
ليعلموا منه معنى من معانيه
والله ما وصلوامنه الى سبب
حتى يكون الذى ابداه مبد يه

مزید کہا:

ياسر سر يد ق حتى
يخفىٰ علىٰ وهم كل حى
فظاهرا باطنا تجلى
لكل شئ بكل شئ

رہا اسم رحمن پس وہ حق تعالیٰ کی تجلی کا فیضان اس کے صفات عالیہ سے کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ''قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ

ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ''تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو، جو کہہ کر پکارو، سب اسی کے اچھے نام ہیں (الاسریٰ:۱۱۰) اور اسم رحیم پس وہ حق تعالیٰ کی تجلی کا فیضان اس کی آیات وافعال سے کرتا ہے مختصر یہ کہ تسمیہ میں تین اسمائے مبارکہ کا ذکر انبیا، اولیا اور عوام الناس کے اعتبار سے ہے حضرات انبیاو مرسلین علیہم السلام کو خاص اسم ذات لفظ اللہ کی تجلیات کا فیضان ہوتا ہے اولیاے کرام اور مخصوص برگزیدہ بندوں کو اسم رحمن صفات عالیہ کی تجلیات کا فائدہ دیتا ہے اور عام عباد کو اسم رحیم، اس کی آیات وافعال سے تجلی کا فائدہ دیتا ہے۔

بحث ہشتم: مسائل تسمیہ کے بیان میں۔

(۱) ہر جائز ومباح اور مشروع کام کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔ حتی کہ اکل وشرب اور صحبت وجماع اور طہارت واستنجا سے قبل بھی، اس سے کام بابرکت ہوتا ہے اور پائے تکمیل تک پہنچتا ہے اور شیطانی دخل وخلل سے محفوظ رہتا ہے اور عبادات میں کہیں مسنون ہے تو کہیں مستحب ہے البتہ ذبیحہ کے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔

وضو میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے اسی طرح نماز میں بعد ثنا وتعوذ بھی تسمیہ مسنون ہے بلکہ ہر قرأت کے شروع میں تسمیہ مسنون ہے۔ رمضان شریف کی تراویح میں ایک بار بسم اللہ شریف جہر سے پڑھنا سنت ہے۔ اور ہر سورہ کی ابتدا میں آہستہ پڑھنا مستحب ہے۔ اور یہ جو آج کل بعض جہال نے نکالا ہے کہ ایک سو چودہ بار بسم اللہ جہر سے پڑھی جائے ورنہ ختم نہ ہوگا مذہب حنفی میں بے اصل ہے۔ (بہار شریعت: ۴) سورتوں کے شروع میں بسم الرحمن الرحیم ایک پوری آیت ہے مگر صرف اس کے پڑھنے سے فرض ادا نہ ہوگا۔ البتہ بعض مقامات پر تسمیہ پڑھنا ناجائز وحرام بلکہ کفر ہے۔ ستر کھلا ہونے کی حالت میں، اب خواہ طہارت واستنجا کی وجہ سے کھلا ہوا، یا صحبت وجماع کیوجہ سے یا کسی اور سبب سے ان حالات میں تسمیہ یا کوئی بھی ذکر لسانی ناجائز ومنع ہے۔ اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی حالت میں جیسے زنا وشراب نوشی کے وقت تسمیہ پڑھنا نہ یہ کہ صرف گناہ ہے بلکہ کفر ہے۔

نماز میں اعوذ باللہ قرأت کے تابع ہے اور مقتدی پر قرأت نہیں لہذا تعوذ وتسمیہ بھی ان کے لئے مسنون نہیں رہا جس مقتدی کی کوئی رکعت جاتی رہی ہو تو جب وہ اپنی باقی رکعت پڑھے اس وقت ان دونوں کو پڑھے۔ تعوذ صرف پہلی رکعت میں ہے اور تسمیہ ہر رکعت کے اول میں مسنون ہے۔ فاتحہ کے بعد اگر اول سورہ شروع کی تو سورہ پڑھتے وقت بسم اللہ پڑھنا مستحسن ہے۔ قرأت خواہ جہری ہو یا سری مگر بسم اللہ بہر حال آہستہ پڑھی جائے اگر ثنا، تعوذ وتسمیہ پڑھنا بھول گیا اور قرأت شروع کردی تو اعادہ نہ کرے کہ ان کا محل ہی فوت ہوگیا۔

سورۃ الفاتحہ میں کلام کے بیان میں

اس میں چند ابواب ہیں

باب اول: سورہ فاتحہ کے اسمائے مبارکہ کے بیان میں، یاد رہے کہ سورہ فاتحہ کے اسمائے مبارکہ مع وجوہ تسمیہ ابتدائے اوراق میں مذکور ہو چکے ہیں۔

باب دوم: سورہ فاتحہ کے نزول وفضائل کے بیان میں، اس باب میں چند مسائل کا بیان ہوگا۔

مسئلہ اول: اس سورہ مبارکہ کے نزول کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں۔

اول: یہ سورہ مبارکہ مکیہ ہے امام ثعلبی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ مولا علی نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ مکہ معظّمہ میں نازل ہوئی زیر عرش خزانہ سے۔ پھر امام ثعلبی نے کہا کہ اسی پر اکثر علماء ہیں نیز انہوں نے حضرت عمرو بن شرحبیل سے بھی روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ قرآن سے جو چیز سب سے پہلے نازل ہوئی وہ "الحمد لله رب العلمين" ہے اور وہ اس لحاظ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے رازدارانہ طور پر فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے ساتھ کوئی چیز لاحق ہوگئی حضرت خدیجہ نے عرض کیا وہ کیا؟ آپ نے فرمایا کہ جب میں تنہائی میں ہوتا ہوں تو "اقرأ" کی آواز سنتا ہوں، پھر آپ حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لے گئے اور اس واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تو ورقہ نے کہا کہ جب آپ ایسی آواز سنیں تو "فاثبت له" ثابت قدم رہیں پس حضرت جبرئیل امین آئے اور حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا "قل بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اسی طرح ابو صالح نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" فرمایا تو قریش نے "دق الله فاک" جیسا نازیبا کلمہ کہا۔

دوم: سورہ فاتحہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی چنانچہ ثعلبی نے اپنی سند سے حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا کہ سورہ فاتحہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی حسین بن فضل نے کہا ہر عالم سے لغزش ہوئی ہے اور مجاہد سے یہ لغزش ہوئی کہ انہوں نے سورہ فاتحہ کو مدنی کہہ دیا جبکہ تمام علما ان کے خلاف ہیں، اس کی دو وجہ ہے۔

اول وجہ: یہ کہ سورہ الحجر بالاتفاق مکی ہے اور اسی میں "وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" ارشاد ہے اور سبع مثانی سورہ فاتحہ ہے لہذا یہ واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سورہ حجر مکی سے پہلے سورہ فاتحہ عطا فرما دی تھی۔

دوم وجہ: یہ ہے کہ یہ شرعاً وعقلا بعید ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظّمہ میں اعلان نبوت کے بعد دس سال سے زائد قیام پذیر رہے ہوں اور آپ پر سورہ فاتحہ نازل نہ ہوئی ہو حالانکہ نماز مکہ معظّمہ میں فرض ہو چکی تھی اور نماز میں اس سورہ کا بالاتفاق پڑھنا فرض ہے لہذا یہ مسلم ہے کہ یہ سورہ مکہ معظّمہ میں نازل ہو چکی تھی۔

سوم: تیسرا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ایک مرتبہ مکہ معظّمہ میں نازل ہوئی اور دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اس وجہ سے بھی اس سورہ کو مثانی کہا جاتا ہے اور دوبارہ نزول اس سورہ کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے۔

چہارم: علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں نزول سورہ فاتحہ کے سلسلہ میں چوتھا قول بھی ذکر کیا ہے وہ یہ کہ وہ آدھی آدھی نازل ہوئی ہے آدھی مکہ میں اور آدھی مدینہ میں نازل ہوئی یہ قول ابواللیث سمرقندی کی طرف منسوب ہے۔

مسئلہ دوم: اس سورہ مبارکہ کے فضائل کے بیان میں۔ اس سورہ مبارکہ کے بہت سے فضائل کا بیان آغاز صفحات میں فضائل سورہ فاتحہ کے ذیل میں گذر چکا ہے اس لئے یہاں ایک مختصر ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب میں زہر سے شفاء ہے۔

(۲) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل فرمانے کا حتمی فیصلہ صادر فرمالیتا ہے کہ اس اثنا میں اس قوم کا ایک بچہ مکتب میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ بچہ کی قرأت فاتحہ سن کر اس قوم سے چالیس سال تک عذاب کو اٹھالیتا ہے۔

(۳) حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمایا ہے تمام آسمانی کتابوں کے علوم اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن میں سمو دیئے ہیں اور ان چاروں کے علوم کو صرف قرآن میں ودیعت فرمادی ہے اور قرآن کے علوم کو مفصل میں اور مفصل کے علوم کو سورہ فاتحہ میں رکھ دیا ہے پس جس کو فاتحہ کی تفسیر کا علم ہو گیا گویا اس کو تمام آسمانی کتابوں کا علم ہو گیا اور جس نے اس کو پڑھ لیا تو گویا اس نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن سب کی قرأت کر لی۔

وجہ یہ ہے کہ تمام کتب الہیہ سے مقصود، اصول، فروع اور مکاشفات کا علم ہے اور وجوہ تسمیہ میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سورہ فاتحہ ان تینوں قسموں کے علوم پر مشتمل ہے پس جب ایسے مطالب عالیہ شریفہ سورہ فاتحہ میں حاصل ہیں تو گویا سورہ فاتحہ ایسی ہوگئی جیسے کہ وہ جملہ مطالب الہیہ پر مشتمل ہے۔

مسئلہ سوم: علمائے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سورہ مبارکہ میں حروف ہجائیہ میں سے سات حروف نہیں ذکر کئے گئے ہیں اور یہ حروف ثاء، جیم، خا، زاء، شین، ظاء اور فاء ہیں۔ ان ساتوں حروف کے مذکور نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب حروف کسی نہ کسی طرح عذاب کی طرف مشعر ہیں چنانچہ ثاء ویل وثبور پر دلالت کرتی ہے ارشاد ربانی ہے "لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرً وَاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرً كَثِيْرًا "فرمایا جائے گا آج ایک موت نہ مانگو اور بہت سی موتیں مانگو (الفرقان: ۱۴)۔ جیم، جہنم کا پہلا حرف ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ "بیشک جہنم ان سب کا وعدہ ہے۔ (الحجر: ۴۳) اور ارشاد ہے "وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ "اور بیشک ہم نے جہنم کے لئے پیدا کئے بہت جن اور آدمی (الاعراف ۱۷۹) خاخزی ورسوائی کی طرف دال ہے قرآن کا ارشاد ہے "لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ "جس دن اللہ رسوا نہ کرے گا نبی اور ان کے ساتھ ایمان والوں کو (التحریم: ۸)، اور ارشاد ہے "اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكَافِرِيْنَ "آج ساری رسوائی اور برائی کافروں پر ہے (النحل: ۲۷) زاء وشین، زفیر وشہیق کا پہلا حرف ہے ارشاد باری ہے "لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ "تو وہ جو بد بخت ہیں تو وہ دوزخ میں ہیں وہ اس گدھے کی طرح رینکیں گے۔ (ہود: ۱۰۶) علاوہ ازیں زاء زقوم پر دلالت کرتی ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔ "اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ "بیشک تھوہڑ کا پیڑ گنہگاروں کی خوراک ہے (الدخان: ۴۳) اسی طرح شین شقاوت قلبی پر بھی دلالت کرتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ "(ھود: ۱۰۶) ظاء ساقط کر دیا کہ قرآن حکیم میں آیا "اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ "چلو اس دھوئیں کے سائے کی طرف جس کی تین شاخیں نہ سایہ دے نہ لپٹ سے بچائے (المرسلات: ۳۰) نیز ظاء، لظی پر بھی دلالت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى "ہرگز نہیں وہ تو بھڑکتی آگ ہے کھال اتار لینے والی بلا رہی ہے (المعارج: ۱۵) اور فا اس لئے نہیں ذکر ہوا کہ وہ فراق وجدائیگی پر دلالت کرتی ہے ارشاد ربانی ہے "يَوْمَ يَتَفَرَّقُوْنَ "(الروم: ۱۴) نیز ارشاد ہے "لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى "اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ وہ تمہیں عذاب سے ہلاک کر دے اور بیشک نامراد رہا جس نے جھوٹ باندھا (طہ: ۶۱)۔

اعتراض: یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ جتنے حروف ہیں سب کسی نہ کسی طرح کسی عذاب کی طرف ضرور مشعر ہیں لہذا صرف سات حروف کو نہ ذکر کرنے کی وجہ مشعر الی العذاب قرار دینا صحیح نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی فائدہ ہے۔

جواب: یہ ہے کہ اس میں فائدہ ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے صفت جہنم کے ذکر میں فرمایا ہے۔ ''لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ'' اس (جہنم) کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ کے لئے ان میں سے ایک حصہ بٹا ہوا ہے (الحجر: ۴۴) اور اللہ تعالیٰ نے اس سورہ سے سات حروف کو ساقط فرمادیا اور وہ وہ حروف ہیں جو عذاب پر دلالت کرنے والے الفاظ میں اوائل سے ہیں گویا تنبیہ ہے اس بات پر کہ جو اس سورہ مبارکہ کی قرأت کرے گا، اس پر ایمان لائے گا اور اس کے حقائق کی معرفت حاصل کرے گا وہ جہنم کے ساتوں درکات سے مامون ومحفوظ ہوجائے گا ۔اللہ تعالیٰ اعلم بمرادہ بذالک۔

باب سوم: (سورہ فاتحہ کے اسرار عقلیہ کے بیان میں)

مسئلہ اول: اللہ عزشانہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' تمام تعریف اللہ کے لئے ہے اس مقام پر دو سوال قائم ہوتے ہیں۔

ایک وجود الہ، دوسرا اس کے مستحق حمد ہونے کی کیا دلیل ہے؟۔ جب یہ دونوں سوال متوجہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے بعد '' رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ،اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' ذکر فرمایا تاکہ دونوں سوالوں کا جواب ہوجائے ۔سوال اول کا جواب '' رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' میں ہے اور سوال دوم کا جواب ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' میں موجود ہے۔ جواب اول کی تقریر مندرجہ ذیل وجوہ سے ہے۔

(۱) شئ کے وجود کا علم دو طرح ہوتا ہے، ضروری وبدیہی یا نظری واکتسابی

ضروری وبدیہی: جن چیزوں کا علم ہم کو بغیر غور وفکر حاصل ہوتا ہے اس کو ضروری وبدیہی سے تعبیر کرتے ہیں جیسے حرارت وبرودت کا علم۔

نظری واکتسابی: جن چیزوں کا علم ہم کو بہت غور وخوض کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے اس کو نظری کہتے ہیں جیسے جن وملائکہ وغیرہ کا علم۔ ضروری ونظری کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے لینے کے بعد یہ متعین ہوجاتا ہے کہ خدا کے وجود کا علم ضروری وبدیہی نہیں ہے کیونکہ فی البدیہہ خدا کے وجود کا علم کسی کو نہیں ہوتا ورنہ اس کے وجود میں کسی کو اختلاف نہیں ہوتا ، ارباب عقل ودانش کا باب الٰہیات میں زبردست اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ وجود الہ کا علم نظری ہے۔ اور علوم نظریہ کا حصول چونکہ بلا دلیل نہیں ہوتا اسلئے خدا کے وجود کا علم بھی بغیر دلیل نہیں ہوگا پس اس کے وجود پر دلیل یہ عالم محسوسات ہے جس میں آسمان، زمین، پہاڑ، سمندر، معادن، نباتات اور حیوانات وغیرہا ہیں۔ جو سب کے سب ایک مدبر

کے محتاج ہیں جو اپنے حسن تدبیر سے ان کا قیام کرے، ایک موجود کی طرف محتاج ہیں جو ان اشیاء کو وجود بخشے، ایک مربی کے محتاج ہیں جو ان کی تربیت فرمائے اور ایسے مبقی کی طرف محتاج ہیں جو ان کو باقی رکھے۔ پس ارشاد خداوندی (رب العلمین) اس دلیل کی طرف اشارہ ہے جو الہ قادر وحکیم کے وجود پر دلالت کرتا ہے پھر اس میں چند لطیف اشارے ہیں۔

(۱) عالمین، اللہ کے ماسوا ہر شئ کو شامل ہے پس رب العلمین میں اشارہ ہے کہ اللہ کے ماسوا سب اللہ ہی کے محتاج ہیں، چنانچہ وہ سب اپنے موجود ہونے میں اسکی ایجاد کا اور اپنی بقاء میں اس کے ابقاء کے محتاج ہیں، غرض عالم کا ہر جزء الذی لایتجزی، ہر جوہر فرد اور ہر ہر عرض، الہ حکیم قادر کے وجود پر واضح برہان اور دلیل قطعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمین کا ہر ہر ذرہ اس کی حمد وثنا میں رطب اللسان ہے ارشاد باری ہے۔ ''تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ''یعنی اس کی پاکی بولتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہیں اور کوئی چیز نہیں جو اسے سراہتی ہوئی اس کی پاکی نہ بولے ہاں تم انکی تسبیح نہیں سمجھتے۔ (الاسراء: ۴۴)۔

(۲) اس سورہ مبارکہ میں ''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' ارشاد ہوا، خالق العالمین ارشاد نہ ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے عقلاء کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ اشیاء وحوادث سب حدوث کی حالت میں محدث وموجد کی طرف محتاج ہیں لیکن عقلاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اشیاء موجود ہونے کے بعد، بقا میں موجد ومبقی کے محتاج ہیں یا نہیں، ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ شئ اپنی بقا میں سبب سے بے نیاز ہے باقی رہنے کے لئے وہ کسی مبقی کی طرف محتاج نہیں ہے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں ''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' فرما کر اس نظریہ کو کالعدم کر دیا چونکہ رب مربی کے معنی میں ہے اور مربی وہ ہے جو شئ کو باقی رکھنے اور اس کی اصلاح حال کے لئے قائم ہو غرض (رب العلمین) میں تنبیہ ہے کہ جمیع عالم صرف وجود ہی میں نہیں بلکہ بقاء میں بھی اسی کا محتاج ہے۔ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اس لئے لفظ رب کے ذکر کو مخصوص فرمایا تا کہ تنبیہ ہو جائے کہ اللہ کے ماسوا، کوئی ذرہ اس سے بے نیاز نہیں ہے نہ ہی اپنے وجود میں اور نہ ہی اپنی بقا میں۔

(۳) اس سورہ مبارکہ کا ایک نام ''ام القرآن'' ہے گویا اس سورہ کی حیثیت اصل ومعدن کی ہے اس کی بہ نسبت دوسری سورتیں فروع کی طرح ہیں۔ ملاحظہ ہو اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اس سورہ کے بعد چار سورتوں کو (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) سے شروع فرمایا ہے۔ ان میں پہلی سورۃ الانعام ہے جس میں ارشاد ہوا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ'' (الانعام:۱) اس آیت میں العلمین کے اقسام میں سے ایک قسم مذکور ہے کیونکہ لفظ عالم

ماسوااللہ سب کوشامل ہےاورآسمان وزمین اورظلمات ونور،اللہ کے ماسواعالم کےاقسام میں سےایک قسم ہے گویاسورہ فاتحہ کے آغاز میں عالم کے جمیع اقسام مذکور ہیں اورسورہ انعام میں ان اقسام میں سے ایک قسم کا ذکر ہے۔ بلفظ دیگر یہ کہیں کہ ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہمقسم ہےاورانعام میں ایک قسم کاذکر ہے۔

دوسری جگہ سورہ کہف میں ارشادفرمایاہے۔''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ''اس سے مقصود معارف کے ذریعہ ارواح کی تربیت ہے کیونکہ جو کتاب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی وہ مکاشفات ومشاہدات کے حصول کا ذریعہ ہےغرض اس میں تربیت روحانیہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ سورہ فاتحہ کے آغاز میں جملہ عالمین کے حق میں تربیت عامہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ملائکہ،انس وجن کی تربیت روحانیہ بھی داخل ہےاورآسمان وزمین اوراس میں موجودات کی تربیت جسمانیہ بھی داخل ہے چنانچہ حضرت سید شاہ محمد قطب الدین حسینی صابری نےتفسیر سورہ فاتحہ میں لکھاہے

''پھررَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''میں وحی الٰہی کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اسم''رب'' کا تقاضا ہے کہ وہ ہرمخلوق کو اس کے کمال تک پہنچائے انسان کا حقیقی کمال جسم کی پرورش تک محدودنہیں ہے بلکہ اخلاق کی تکمیل بھی ضروری ہے جس طرح جسم کے کمال کے لئے عالم جسمانی میں خارجی سامان رب نے پیدا کئے ہیں ضروری ہے کہ روحانی کمال حاصل کرنے کے لئےبھی خارجی سامان مہیاہوویہی وحی الٰہی ہے''۔

مختصر یہ کہ سورہ کہف میں فقط ایک نوع کا ذکراورسورہ فاتحہ میں تمام انواع کی تربیت کاذکر ہے۔

تیسری جگہ سورہ سبامیں ارشاد ہے''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ''(سباء:۱)
سورہ انعام میں آسمان وزمین کی پیدائش کا ذکر ہے جوساری مخلوقات کامحل ہےاوراس سورہ میں آسمان وزمین میں پیدا شدہ چیزوں کا ذکر ہے جوحال ہے پس جب سورہ انعام سورہ فاتحہ کے اقسام میں سے ایک قسم ہےتوسورہ سباءبھی سورہ فاتحہ کے اقسام میں سے ایک قسم ہی ہے۔

چوتھی جگہ سورہ فاطر میں فرمایاہے''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ''سورہ انعام کے آغاز میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان وزمین کا خالق ہےاورخلق تقدیر سے عبارت ہےاوراس سورہ میں ہے کہ وہ آسمان وزمین کا فاطر ہے یعنی اس کی ذوات کا محدث ہے اور تقدیر واحداث کے درمیان فرق ظاہر ہے تاہم یہ بھی''اَلْحَمْدُ لِلّٰه رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''میں مذکوراقسام عالم میں سےایک قسم کاذکر ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام میں جب ذکر فرمایا کہ وہ آسمان وزمین کا خالق ہے تو یہ ذکر کیا کہ وہ ظلمات ونور کا جاعل ہے۔لیکن سورہ ملائکہ یعنی فاطر میں جب ذکر کیا کہ وہ سمٰوت وارض کا فاطر ہے تو یہ ذکر کیا کہ وہ ملائکہ کا رسل بنانے والا ہے پس سورہ انعام میں سمٰوات وارض کی تخلیق کے بعد،ظلمات وانوار کے جعل کا ذکر ہے اور سورۂ ملائکہ میں سمٰوات وارض کے فطر کے ذکر کے بعد، روحانیت کے جعل کا ذکر کیا یہ ایسے اسرار عجیبہ اور لطائف عالیہ ہیں جن پر ہر شخص مطلع نہیں ہوتا۔تاہم متلوہ چاروں آیتیں جن میں الحمدللہ سے آغاز ہوا ہے،سورہ فاتحہ کے آغاز میں مذکور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' کے بحر اعظم کے انواع میں داخل ہیں۔ایسا عموم اس لئے رکھا تا کہ کتاب اللہ کے آغاز ہی میں معبود حقیقی ازلی قدیم کے وجود پر دلیل قائم ہوجائے۔

مسئلہ دوم: ارشاد (رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) جس طرح وجود الہ قدیم کی دلیل ہے اسی طرح اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ اپنی ذات میں زمان ومکان اور حیز وجہت سے پاک ہے کیونکہ یہ بیان سابق سے معلوم ہوگیا کہ عالمین اللہ کے سوا تمام موجودات کو شامل ہے اور اللہ کے ماسوا، جملہ موجودات میں زمان ومکان بھی ہے اور مکان فضاء وحیز اور فراغ ممتد سے عبارت ہے اور زمان اس مدت کو کہتے ہیں جس کے سبب قبلیت وبعدیت پائی جاتی ہے پس ارشاد باری تعالیٰ ''رب العلمین'' دلالت کرتا ہے کہ وہ مکان وزمان کا رب ہے، ان دونوں کا خالق اور موجد ہے پھر یہ معلوم کہ خالق کے وجود کا مخلوق کے وجود سے سابق ہونا ضروری ہے جب واقعہ یہ ہے تو اس کی ذات حیز و فضا اور فراغ سے قبل موجود ہوگی، اور حیز وجہت سے متعالی ہوگی، پس اگر اس کی ذات فضاء کے وجود کے بعد، فضاء کے اجزاء میں سے کسی جز میں موجود ہو تو اس کی ذات کی حقیقت کا انقلاب لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔لہذا ارشاد باری تعالیٰ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اس اعتبار سے زمان ومکان سے ذات کی تنزیہہ پر بھی دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ سوم: یہ ارشاد جس طرح زمان ومکان سے تنزیہہ باری پر دال ہے اسی طرح اس کے محل میں حلول سے منزہ ہونے پر بھی دال ہے جیسا کہ نصاریٰ اور حلولیہ، حلول کے باطل نظریہ کے قائل ہیں چونکہ جب وہ عالمین کا رب ہے تو عالمین کا خالق بھی ہے اور خالق، مخلوق سے سابق ہوتا ہے لہذا اس کی ذات ہر محل سے قبل موجود ہوگی اور جب محل سے قبل اس کا وجود ضروری ہوا تو محل سے بے نیاز ہوا پس محل کے موجود ہونے کے بعد، محل کی طرف احتیاج محال ہوا۔

مسئلہ چہارم: آیت مبارکہ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) سے باب الوہیت کے ایک دوسرے عقیدہ پر روشنی پڑتی ہے۔وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے نہ کہ وہ موجب بالذات ہے جیسا کہ

معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ فاعل مختار وہ ہے جس کے ارادہ واختیار سے فعل کا صدور ہو فاعل موجب وہ ہوتا ہے جس کے بغیر ارادہ واختیار اور بغیر قدرت فعل کا صدور ہو۔ اس آیت میں تمام حمد کا مستحق اللہ رب العلمین کو فرمایا گیا جس سے ظاہر ہے کہ وہ فاعل مختار ہے کیونکہ فاعل موجب اپنے افعال میں سے کسی فعل پر حمد وثنا اور تعظیم کا ہرگز مستحق نہیں ہوتا، مثال کے طور پر انسان جب آگ کی گرمی اور برف کی برودت سے انتفاع حاصل کرتا ہے تو وہ آگ و برف کی حمد نہیں بیان کرتا کیونکہ آگ کی تاثیر، تسخین اور برف کی تاثیر تبرید اس کے قدرت واختیار سے نہیں ہے بلکہ طبعی ہے پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنے مستحق حمد وثنا ہونے کو بیان کیا تو اس سے ثابت کہ وہ فاعل مختار ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ فاعل موجب ہوتا تو ظاہر ہے کہ تمام آثار ومعلومات، موثر موجب کے قدیم ودائمی ہونے کے سبب قدیم ودائمی ہوتے تو عالم ہی قدیم ہوتا اور اس میں تغیر ممتنع ہوتا حالانکہ ہم اس میں تغیرات کا روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں، اس مشاہدہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عالم میں مؤثر قادر مختار ہے فاعل موجب نہیں ہے۔ لہذا وہ مستحق حمد وثنا ہوگا۔

مسئلہ پنجم: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عالم کو اپنے بندوں کی مصلحتوں کے مطابق اور ان کے منافع کے موافق پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ عالم بالا اور عالم اسفل میں اس کے استحکام واتقان کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ایسا محکم نظام کائنات اور ایسا مستحکم کارخانہ عالم یقیناً اس عالم کے پیدا کرنے والے کے کمال قدرت اور وفور علم پر دلالت کرتا ہے۔ پس جس طرح ارشاد باری تعالیٰ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' اللہ عزشانہ تعالیٰ کے وجود پر، حیز ومکان سے منزہ ہونے پر، اور مکان میں حلول سے منزہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کاملہ، حکمت بالغہ، اور علوم غیر متناہیہ پر دلالت کرتا ہے۔

جواب سوال دوم: باب ثالث کے آغاز میں معلوم ہوا کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' دو سوالوں کا جواب ہے ایک سوال کے جواب کی تقریر گذر چکی اب ذیل میں دوسرے سوال کے جواب کی تقریر ذکر کی جاتی ہے سوال یہ تھا کہ صرف وہ ہی مستحق حمد وثنا کیوں ہے۔ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' ہے، اس جواب کی تقریر یہ ہے کہ دنیا میں بندہ کی دو طرح کی حالت ہوتی ہے ایک حالت سعادت ونیک بختی اور صحت وسلامتی کی ہوتی ہے اور دوسری حالت رنج والم اور فقر ومحتاجگی کی ہوتی ہے۔ پھر صحت وسلامتی اور سعادت ونیک بختی اور تمام مسرت وشادمانی کے اسباب وذرائع بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے، ایجاد کرنے اور اس کے مکون کرنے سے ہیں مسببات کے ساتھ اسباب کا بھی پیدا کرنے والا ہے کیونکہ وہ رحمن ورحیم ہے۔ رہی رنج والم اور فقر ومحتاجگی کی حالت تو

وہ دوطرح کی ہوتی ہے۔کبھی من جہت العباد ہوتی ہے اور کبھی من جانب اللہ ہوتی ہے اگر رنج ومحن اور ظلم وزیادتی کسی بندہ کو کسی بندہ کی طرف سے پہنچتی ہے تو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم روز قیامت ظالم سے مظلوم کا انصاف دلائیں گے اور اگر آفات وبلیات آسمانی کسی بندے کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ مصائب وبلیات پر صبر کرنے والوں کو ہم فضل کثیر اور ثواب عظیم عطا کریں گے جب واقعہ یہ ہے تو ثابت کہ بے انتہا حمد اور بے غایت ثناء کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔

مذکورہ مختصر بیان سے کچھ حد تک اندازہ ہوتا ہے ارشاد رب العلمین ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ''ایسی ترتیب عالیہ اور کمال بلاغت پر مرتب ومرکب اور فائز ہے کہ عقل انسانی میں اس سے افضل واکمل کلام کا تصور ممکن نہیں۔

یاد رہے کہ ربوبیت کی صفات معتبرہ کو بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے عبودیت میں معتبر کلام کو ذکر فرمایا ۔چنانچہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ''ارشاد فرمایا۔جاننا چاہئے کہ انسان جسد وروح کا مجموعہ مرکب ہے بدن، روح کے لئے نفع بخش اشیاء کے اکتساب کا آلہ ہے پس جسد کے احوال میں افضل حالت یہ ہے کہ بدن ایسے افعال واعمال بجالائے جو روح کے لئے روحانی سعادتوں میں معین ومددگار ہو اور اس کے افضل ترین اعمال سے یہ ہے کہ وہ ایسے اعمال کرے جو معبود کی عبادت و بندگی پر دلالت کرے لہٰذا اس دنیا میں بندہ کی سب سے عمدہ اور اچھی حالت یہ ہے کہ وہ عبادات الٰہیہ پر مواظبت کرے اور یہ انسان کی سعادت کا پہلا درجہ ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ '' سے یہی مراد ہے۔بندہ اس درجہ پر جب ایک مدت تک قائم رہتا ہے تو اس وقت عالم غیب کے انوار سے اس پر یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ عبادات وطاعات کے بجالانے میں وہ مستقل نہیں ہے بلکہ توفیق الٰہی اعانت خداوندی اور عصمت پروردگار اس کے شامل حال رہی کیونکہ اعمال خیر کی بجا آوری بغیر توفیق الٰہی ناممکن ہے اور یہ کمال وسعادت کا اوسط درجہ یا دوسری منزل ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ''وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ''اسی طرف اشارہ ہے۔پھر جب بندہ اس مقام سے آگے بڑھتا ہے تو اس کے نزدیک یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت اللہ ہی کی طرف سے ہے اور مکاشفات اور تجلیات کے انوار بغیر ہدایت الٰہیہ کے نہیں حاصل ہوسکتے اسی مقصود کی طرف اشارہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ''میں ہے۔اس میں چند لطیفے ہیں ان لطائف کا بیان صراط مستقیم کی تفسیر میں ذکر ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

باب چہارم: مسائل سورۂ فاتحہ کے بیان میں

مسئلہ اول: اکثر علما وفقہا اور محدثین کا اجماع ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کی قراءت واجب ہے اور حضرت اُصم اور

حضرت حسن بن صالح سے مروی ہے کہ وہ واجب نہیں ہے۔ اکثر علما کی دلیل وہ حدیثیں ہیں جو قراءت فاتحہ کے وجوب وثبوت پر دلالت کرتی ہیں ان کے علاوہ مندرجہ دلیلیں بھی دی جاتی ہیں۔

(۱) اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ "نماز قائم رکھوسورج ڈھلنے سے رات کی اندھیری تک اور صبح کا قرآن (الاسراء/ 78) (قرآن سے مراد قرأت ہے تقدیری عبارت یہ ہوگی **اقم قرأة الفجر**، **أقم** فعل امر ہے جس کا مقتضی علی الاطلاق وجوب ہے۔

(۲) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا نماز قرأت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ہاں سائل نے عرض کیا "وجبت" قرأت واجب ہوگئی پس سرکار نے وجوب کو ثابت رکھا۔

(۳) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا نماز میں قرأت کی جائے گی؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بغیر قرأت کے نماز ہوتی ہے؟

امام اصم نے جو یہ کہا کہ قرأت واجب نہیں ہے ان کی دلیل حدیث رسول "صلوا کما رأیتمونی اصلی" ہے حاصل دلیل یہ ہے کہ نماز کو اس حدیث میں اشیاء مرئیہ سے قرار دیا گیا ہے اور قرأت مرئیہ نہیں ہے لہذا قرأت نماز سے خارج رہے گی ان کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ رویت جب دو مفعول کی طرف متعدی ہوتی ہے تو اس سے علم مراد ہوتا ہے۔

مسئلہ دوم: اس مقام پر امام فخر الدین رازی نے کہا ہے۔ "**قال الشافعی رحمہ اللہ، قرأة الفاتحة واجبة فی الصلوٰة، فان ترکها فیها حرفاً واحدا وهو یحسنها لم تصح صلاته وبه قال الاکثرون وقال ابو حنیفة لاتجب قرأة الفاتحة**" یعنی حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا یہ ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے لہذا اگر اس میں سے ایک حرف بھی چھوڑ دیا حالانکہ وہ اسے اچھی طرح پڑھ سکتا تھا تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی یہی اکثر علما ے اسلام کا قول ہے اور ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ سورہ فاتحہ کی قرأت واجب نہیں ہے۔

اقول: یہ حضرت امام رازی کی خامہ فرسائی کی حقیقت بیانی کا حال ہے، تعصب جانبداری کا نشہ یا حق وناحق کا فیصلہ جب انسان کے دماغ میں پہلے آجاتا ہے اور دلائل کی چھان بین بعد میں کرتا ہے تو حق وصواب تک پہنچنا یقینی نہیں رہ جاتا یہی حال کچھ جانبدار مصنفین کا بھی رہا۔ محققین ایسا نہیں کرتے ورنہ وہ ارباب تحقیق کے زمرہ سے خارج ہوجائیں گے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یقینا حضرات ائمہ اربعہ میں سے ایک امام برحق ہیں جن کے اقوال وفتاویٰ پر امت کا بڑا

طبقہ اعتماد و بھروسہ کرتا ہے مگر یہ حقیقت واقعہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد کے شاگرد ہیں چنانچہ آپ نے حضرت امام محمد کی کتابوں سے اکتساب فیض کیا ہے اس لئے زندگی بھر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے احسان مند رہے اور اس کا برملا اظہار فرمایا کہ سب فقہا فقہ میں ابوحنیفہ کے عیال ہیں۔ حتی کہ جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی مشکل امر درپیش ہوتا تو امام اعظم ابوحنیفہ کے مزار پر تشریف لاتے اور مسلک امام اعظم کے مطابق دو رکعت نماز پڑھ کر ان کے وسیلہ سے دعا کرتے فرماتے ہیں کہ ہماری مشکل آسان ہوجاتی تھی۔

ادب کا یہ حال حضرت امام شافعی کا ہے۔ مگر مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے جانبدار وحمایتی بعض علماء ومحدثین جیسے رازی وترمذی وغیرہم نے حضرت امام اعظم کے لئے ایسے خشک لب ولہجہ کا استعمال کیا جسے دیکھ کر علماء کی وقعت و عظمت دل سے نکل جاتی ہے اسی مقام پر دیکھیں جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا تو کس طرح دعائیہ کلمات رحمہ اللہ کہہ کر ان کی تکریم کی مگر جب امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو ''ابوحنیفہ'' سے زیادہ کی توفیق نہ ہوسکی۔ پھر حضرت امام شافعی کے قول کو اکثر علماء کی تائیدات سے موید بھی بتادیا مگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس مسئلہ میں تن تنہا قرار دیا اور لکھ دیا کہ ابوحنیفہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب نہیں کہتے البتہ امام شافعی اور اکثر علماء واجب فرماتے ہیں۔ پھر مذہب امام شافعی کی تائید میں حضرت فخر رازی نے اٹھارہ دلیلیں ذکر کی ہیں ذیل میں ہم ان کی کچھ اہم دلیلوں کو ذکر کریں گے اور اس کا جائزہ لیں گے۔

لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ احناف کے متون وشروح اور فتاویٰ کی تمام کتابوں میں نماز میں سورہ فاتحہ کی قرأت کے وجوب پر صراحت موجود ہے مگر امام رازی کی اس پر نظر نہیں پہنچی اور لکھ دیا ہے کہ ابوحنیفہ سورہ فاتحہ کو واجب نہیں کہتے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ فتح القدیر میں ہے۔

''القراءۃ فرض، وواجب وسنۃ ومکروہ فالفرض عندہ فی روایۃ مایطلق علیہ اسم القرآن ولم یشبہ قصد خطاب احد و نحوہ، وفی روایۃ آیۃ وفی روایۃ کقولھما، والواجب قرائۃ الفاتحۃ وثلاث آیات قصار او آیۃ طویلۃ یعنی فی غیر الاخریین والاخیرۃ من المغرب والمسنونۃ اما فی السفر او الحضر فیعلم من الکتاب والمکروہ ترک شیٔ من القرأۃ الواجبۃ'' (صفحہ ۳۳۸/ج:۱، فصل فی القرأت) یعنی نماز میں قرأت قرآن کی چار صورتیں ہیں، قرأت فرض، قرأت واجبہ، قرأت مسنونہ اور قرأت مکروہ، پس قرأت فرض کی مقدار حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک روایت میں اتنی ہے جس پر اسم قرآن کا اطلاق ہوسکے اور کسی سے خطاب و

غیرہ کی طرح نہ ہو اور ایک روایت میں فرض ایک آیت ہے اور ایک تیسری روایت میں فرض کی مقدار امام کے نزدیک اتنی ہی ہے جتنی حضرات صاحبین کہتے ہیں۔ اور قرأت واجبہ، سورہ فاتحہ اور تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت ہے۔ لیکن اخریین اور مغرب کی آخری رکعت کے غیر میں یعنی پہلی دونوں میں واجب ہے۔ اور قرأت مسنونہ سفر و حضر میں وہ مقدار ہے جس کو صاحب ہدایہ نے ذکر کیا ہے۔ اور قرأت مکروہ، قرأت واجبہ میں سے کسی شئی کو ترک کر دینا ہے۔

یہ ہے مذہب امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ جس میں صراحت ہے کہ سورہ فاتحہ کی قرأت نماز میں واجب ہے مگر حضرت رازی ان نصوص کو ماننے کے لئے تیار نہیں جبھی تو اٹھارہ دلیلیں دیکر ثابت کرنا چاہا ہے کہ ابو حنیفہ نے ارشاد رسول ،فعل رسول، عمل خلفاے راشدین و اجماع صحابہ بلکہ اجماع اہل شرق و غرب کے خلاف قول کیا ہے ذیل میں ان کی چند دلیلیں ذکر کی جاتی ہیں

(۱) **دلیل اول:** حدیث مشہور ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین، فاذاقال العبد الحمد لله رب العلمین یقول الله تعالیٰ حمدنی عبدی الی آخر الحدیث" اس حدیث سے استدلال اس طور پر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر صلوٰۃ و نماز کے بارے میں حکم فرمایا کہ وہ اس کے اور اس کے بندوں کے درمیان نصفا نصف ہیں پھر بیان فرمایا کہ یہ تنصیف سورہ فاتحہ کی آیتوں کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی گویا کہ نماز اس تنصیف سے منفک نہیں ہوسکتی اور تنصیف اس سورہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور یہ معلوم کہ لازم کا لازم لازم ہوتا ہے تو واجب ہوا کہ یہ سورہ نماز کے لوازم میں سے ہو اور یہ لزوم اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب قرأت فاتحہ کو صحت نماز کے لئے شرط و ضروری قرار دیا جائے۔

(۲) **دلیل دوم:** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" اور ایک دوسری روایت میں ہے "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" اس روایت سے ظاہر ہے کہ نفی صلوٰۃ پر داخل نہیں ہے بلکہ نماز کے حصول پر داخل ہے اور آدمی کے لئے نماز کے حصول کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے منتفع ہو اور اس کے سبب عہدۂ تکلیف سے سبکدوش ہو جائے پس اس تقریر سے ظاہر ہے کہ نفی ظاہر پر محمول ہے۔

(۳) **دلیل سوم:** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کل صلوٰۃ لم یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فھی خداج غیر تمام" اس حدیث میں دلیل ہے کہ سورہ فاتحہ نہ پڑھنے پر نماز جائز نہ ہوگی بلکہ اعادہ صلوٰۃ کی تکلیف باقی رہے گی اس لئے جب تک نماز بطریق تمام و کمال نہ پڑھی جائی گی عہدۂ تکلیف سے باہر نہ ہوگا اور کامل اسی وقت ہوگی جب سورہ فاتحہ کے ساتھ پڑھی جائے۔ لہٰذا سورہ فاتحہ واجب ہے۔

(۴) **دلیل چھارم:** حضرت رفاعہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوئے اور نماز پڑھی جب نماز سے فارغ ہوئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جاؤ نماز پڑھو اس لئے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی اسی طرح تین مرتبہ کیا تو اس شخص نے عرض کیا "علمنی الصلوٰۃ یارسول اللہ" یارسول اللہ مجھے نماز سکھا دیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم قبلہ کی طرف متوجہ ہو تو تکبیر کہو اور فاتحۃ الکتاب کی قرأت کرو۔ طریق استدلال یہ ہے کہ اِقْرَأْ امر ہے اور امر کا مقتضی وجوب ہے لہٰذا سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ نیز اس شخص نے کہا تھا "علمنی الصلوٰۃ" لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس کو بتایا واجب ہے کہ وہ نماز سے ہوگا اور چونکہ قرأت فاتحہ کو بھی ذکر کیا ہے اس لئے قرأت فاتحہ بھی نماز کے اجزاء میں سے ہوگی۔

(۵) **دلیل پنجم:** مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں ایسی سورہ کی خبر نہ دوں جس کی مثل توریت میں ہے نہ انجیل وزبور میں صحابہ نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نماز میں کیا پڑھتے ہو بولے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ھی ھی" یہ یہی سورہ ہے۔ طریق استدلال یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استفسار پر تمام موجود صحابہ نے کہا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اس کا مطلب یہ ہے کہ درمیان صحابہ یہ مشہور تھا کہ ہر کوئی نماز میں سورہ فاتحہ ضرور پڑھتا تھا لہٰذا قرأت فاتحہ اجماعی مسئلہ تھا۔

اس طرح حضرت امام رازی علیہ الرحمہ نے بہت سی دلیل ذکر کی ہے اور وجوب ثابت کرنے کی کوشش ہے لیکن ان کے یہ دلائل اگر مثبت وجوب ہیں تو بھی حنفیہ کے خلاف نہیں کہ حنفیہ نماز میں سورہ فاتحہ کے حرف حرف کی قرأت کو واجب مانتے ہیں۔ اور اگر وجوب کا کوئی دوسرا معنی ہے جو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معتبر ہے وہ یہ کہ وجوب ان کے نزدیک فرض ورکن کے معنی میں ہے تو ان دلیلوں سے کبھی وہ رکنیت وفرضیت کو ثابت نہیں کر سکتے ورنہ قرآن حکیم اور بہت سی حدیثوں کے خلاف ہوگا اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن" (المزمل:۲۰)۔

احناف کی دلیل: قرآن حکیم کی آیت مبارکہ ہے ارشاد ربانی ہے 'فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن" خود حضرت امام رازی نے کہا۔

"واحتج ابو حنیفة بالقرآن والخبر اما القرآن فقوله تعالیٰ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن'

وأما الخبر فما روی ابو عثمان النهدی عن ابی ہریرۃ انه قال امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أن أخرج وأنادی: لا صلوٰۃ الا بقرائۃ ولو بفاتحۃ الکتاب"۔یعنی ابوحنیفہ نے قرآن وحدیث سے سورہ فاتحہ کے فرض نہ ہونے پر دلیل پیش کیا ہے رہا قرآن تو وہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن ہے یعنی قرآن میں سے جہاں سے میسر ہو پڑھو۔اور حدیث وہ جو ابوعثمان نہدی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں باہر نکل کر لوگوں میں اعلان کردوں کہ بغیر قرأت کے نماز نہیں ہوتی گرچہ سورہ فاتحہ ہی سہی۔

اس کے علاوہ سینکڑوں حدیثیں ہیں جو مذہب امام اعظم کی مؤید ہیں مگر امام رازی کو نظر نہ آئیں اور نظر آئیں تو ذکر کرنے کی زحمت نہ فرمائی علاوہ ازیں بہت حدیثیں جو انہوں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ کی تائید میں ذکر کی ہے ان کا حال یہ ہے کہ اکثر مؤول ہیں اسی وجہ سے حنفیہ نے بھی انہیں حدیثوں کو اپنا مستدل بنایا ہے چنانچہ انہوں نے حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ جو حدیث ذکر کی ہے "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" وہ حجت نہیں بن سکتی کیونکہ انہوں نے گرچہ حدیث کا معنی یہ بیان کہ جنہوں نے فاتحہ نہ پڑھی ان کی نماز صحیح نہیں لیکن احناف کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز کامل نہیں، ان کے نزدیک لاصلوٰۃ کی خبر "صحیح" ہے اور ہمارے نزدیک لاصلوٰۃ کی خبر "کامل" ہے اور یہ ترجمہ چند وجہوں سے زیادہ مناسب ہے۔

(۱) حنفی ترجمہ کی صورت میں یہ حدیث آیت مبارکہ "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن" کے معارض نہ ہوگی جب کہ مذہب شافعی کے ترجمہ پر حدیث وقرآن میں تعارض ہوگا۔کیونکہ قرآن سے معلوم ہو رہا ہے کہ مطلق الحمد سے ناس تک کہیں سے پڑھے فرض ادا ہو جائیگا اور حدیث کہہ رہی ہے سورہ فاتحہ فرض ہے۔

(۲) اسی حدیث میں حضرت امام مسلم کی روایت میں یہ الفاظ مذکور ہیں۔"لمن لم یقرأ بام القرآن فصاعدا" یعنی جس نے ام القرآن اور کچھ زیادہ نہ پڑھا اس کی نماز نہیں پس اگر یہ حدیث سورہ فاتحہ کی فرضیت پر دلالت کرنے والی ہے تو کچھ زیادہ یعنی کوئی سورہ یا چند آیات کی قرأت کی فرضیت پر بھی دلالت کرتی ہے لیکن وہ حضرات سورہ فاتحہ کو تو فرض مانتے ہیں اور کوئی سورہ یا چند آیتوں کی قرأت کو فرض نہیں مانتے ایک حدیث کے جملہ سے کچھ فرض ماننا اور کچھ نہ فرض ماننا خرق دلیل ہے لہذا یہ حدیث ان کے لئے حجت نہیں بن سکتی۔اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو حدیث "فھی خداج غیر تمام" ذکر کی ہے یہ بھی حنفیہ کی موید ہے کہ اس میں ناقص فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ نماز

ہوگی ہی نہیں۔اور رفاعہ بن عامر کی جو حدیث نقل فرمائی ہے جس میں اپنے منطقی صغریٰ و کبریٰ کو ترتیب دیکر فرضیت سورہ فاتحہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ان کا اپنا عمل ہے اس معنی کی صریح حدیث صحیحین میں موجود ہے جس سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کی صراحتاً ترجمانی ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص مسجد میں آیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے ایک گوشہ میں جلوہ گر تھے اس نے نماز پڑھی پھر بارگاہ رسالت میں آیا حضور کو سلام کیا، اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وعلیک السلام "لوٹ جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نہیں پڑھی، وہ لوٹ گیا نماز پڑھی پھر آیا سلام کیا آپ نے فرمایا "وعلیک السلام "لوٹ جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی، اس نے تیسری بار یا اس کے بھی بعد عرض کیا "علمنی یا رسول اللہ" مجھے نماز سکھا دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اچھے طریقے سے وضو کرلو پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہوجاؤ "فکبر ثم اقرأ بما تیسر معک من القرآن" یعنی جس قدر قرآن آسان ہو پڑھ لو پھر رکوع کرو یہاں تک کہ رکوع میں مطمئن ہوجاؤ پھر اٹھو حتی کہ سیدھے کھڑے ہوجاؤ پھر سجدہ کرو حتی کہ سجدہ میں مطمئن ہوجاؤ، پھر اٹھو یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر سجدہ کرو حتی کہ سجدہ میں مطمئن ہوجاؤ پھر اٹھو حتی کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور ایک روایت میں ہے پھر اٹھو حتی کہ سیدھے کھڑے ہوجاؤ پھر اپنی ساری نماز میں اسی طرح کرو۔ (متفق علیہ)

یہی ایک حدیث صریح دال ہے کہ نماز میں قرأت فرض ہے سورہ فاتحہ فرض نہیں ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے وضو استقبال قبلہ، تکبیر تحریمہ وغیرہ شرائط و فرائض کے ساتھ نفس قرأت کو ذکر فرمایا ہے سورہ فاتحہ کو خاص نہیں فرمایا لہذا جن حدیثوں میں یہ وارد ہے کہ بغیر سورہ فاتحہ نماز نہیں ہوتی اس کا معنی یہی کرنا ہوگا کہ نماز کامل نہیں تاکہ یہ حدیث اور اس معنی کی دوسری حدیثیں، خاص کر آیت قرآنیہ "**فاقرءوا**" کے درمیان تعارض و اختلاف نہ پیدا ہو۔ اس طرح ساری حدیثوں پر اور آیت قرآنیہ پر عمل بھی ہوجائے گا اور کسی حدیث کا ترک بھی لازم نہ آئے گا۔

قرأت خلف الامام: اس بحث میں یہ ذکر کردینا بھی خالی از فائدہ نہیں ہوگا کہ حنفیوں کے نزدیک سورہ فاتحہ پڑھنے سے مطلقاً پڑھنا مراد ہے خواہ حقیقتاً ہو یا حکما، منفرد و امام حقیقتاً پڑھے گا اور مقتدی کے لئے حکماً پڑھنا کافی ہے۔ مقتدیوں کو قرأت خلف الامام سے ممانعت کا حکم قرآن، احادیث مبارکہ اور آثار و اعمال صحابہ کرام سے ثابت ہے۔

(۱) قرآن حکیم کی آیت گذری ارشاد باری تعالیٰ ہے "**وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ**" اور جب قرآن کی قرأت کی جائے تو خوب غور سے سنو اور خاموش رہو اس امید پر کہ تم رحم کئے

جاؤ۔ واضح رہے کہ ابتدائے اسلام میں نماز میں کلام وسلام جائز تھا اور مقتدی قرأت بھی کرتے تھے، جب "وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ" نازل ہوئی تو بات چیت منسوخ ہوگئی صحیح مسلم "باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ" اور صحیح البخاری باب "ماینهی من الکلام فی الصلوٰۃ" میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ "قال کنا نتکلم فی الصلوٰۃ یکلم الرجل صاحبه وهو الی جنبه فی الصلوٰۃ حتی نزلت وقوموا لله قانتین فامرنا بالسکوت ونهینا عن الکلام" یعنی ہم لوگ نماز میں باتیں کرلیا کرتے تھے آدمی اپنے بغلگیر ساتھی سے بات کرلیتا حتی کہ "وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ" نازل ہوئی پس ہم کو خاموشی کا حکم دیا گیا اور بات چیت سے منع کردیا گیا۔ متلوہ آیت مبارکہ کے نزول کے بعد نماز میں عام کلام وسلام تو ممنوع ہوگیا مگر قرأت قرآن مقتدی کرتے ہی رہے۔ لیکن پھر جب "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا الاٰية" نازل ہوئی تو مقتدیوں کے لئے قرأت بھی ممنوع ہوگئی اور صرف سننے اور خاموش رہنے یا صرف خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔

ملاحظہ کیجئے تفسیر مدارک میں اس آیت مبارکہ کے تحت ہے "وجمهور الصحابة علی انه فی استماع المؤتم" تفسیر خازن میں ہے۔ "وعن ابن مسعود انه سمع ناسا یقرؤن مع الامام فلما انصرف قال اما أن لکم ان تفقهوا واذا قرئ القرآن" یعنی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کو امام کے ساتھ قرأت کرتے سنا جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کیا ابھی بھی لوگوں کے لئے وقت نہیں آیا کہ وہ آیت "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ" کو سمجھیں۔

تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس میں ہے "واذا قرء ی القرآن فی الصلوٰۃ المکتوبة فاستمعوا له الی قرأته وانصتوا القرأته" یعنی جب فرض نماز میں قرآن پڑھا جائے تو اس کی قرأت کو کان لگا کر سنو اور قرآن پڑھے جاتے وقت خاموش رہو۔

مندرجہ بالا تصریحات سے بہت روشن ہے کہ "قرأة خلف الامام" ابتدائے اسلام میں رائج تھی لیکن جب آیت مبارکہ "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ" نازل ہوئی تو قرأت خلف الامام منسوخ ہوگئی اس لئے جن حدیثوں میں قرأت خلف الامام سے لازمی حکم ثابت ہوتا ہے وہ آیت متلوہ سے منسوخ ہے۔ جب کہ بہت احادیث مبارکہ سے بھی قرأت مقتدی کی ممانعت ثابت ہے ملاحظہ ہو۔

(۲) حضرت عطاء بن یسار سے مروی ہے۔ "انه سأل زید ابن ثابت عن القراۃ مع الامام فقال لا قرأة

مع الامام فی شیٔ" کہ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے امام کے ساتھ قرأت کرنے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ امام کے ساتھ کسی میں کچھ بھی قرأت نہیں۔

(۳) مسلم شریف باب التشھد میں ہے "فقالہ ابوبکر فحدیث ابی ہریرۃ فقال ھو صحیح یعنی اذا قرأفانصتوا" یعنی ابوبکر نے سلیمان سے پوچھا کہ ابوہریرہ کی حدیث کیسی ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ صحیح ہے یعنی جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو، حدیث صحیح ہے۔

(۴) جامع ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الاأن یکون وراء الامام ھذا حدیث حسن صحیح" جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو گویا اس نے نماز نہ پڑھی مگر یہ کہ امام کے پیچھے ہو یعنی امام کے پیچھے ہو تو نہ پڑھے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(۵) نسائی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما جعل الامام لیوتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأفانصتوا" اسی طرح ابوداؤد، ابن ماجہ میں ہے جیسا کہ مشکوٰۃ میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے پس وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، اور جب قرأت کرے تو خاموش ہو جاؤ۔

(۶) شرح معانی الآثار میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قرأۃ" یعنی جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت، مقتدی کی قرأت ہے۔

(۷) موطأ امام محمد میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قرأۃ قال محمد بن منیع وابن الھمام ہذا الاسناد صحیح علی شرط الشیخین" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جسکا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے۔ محمد بن منیع اور امام ابن الھمام نے فرمایا کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

(۸) شرح معانی الآثار میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "قال صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم اقبل بوجھہ فقال أتقرؤن والامام یقرأ فسکتوا فسألھم ثلثا فقالوا انا لنفعل قال لا تفعلوا" حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی پھر صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ کیا امام کی قرأت کی حالت میں تم بھی قرأت کرتے ہو صحابہ نے خاموشی اختیار کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین بار یہی سوال دہرایا تب صحابہ نے عرض کیا ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آئندہ ایسا نہ کرنا۔

(۹) اسی میں حضرت مولیٰ علی سے مروی ہے "من قرأ خلف الامام فلیس علیٰ فطرۃ" جو امام کے پیچھے قرأت کرے وہ دین فطرت پر نہیں۔

(۱۰) دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کیا ہے "انہ قال، قال رجل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اقرأ خلف الامام او انصت قال بل انصت فانہ یکفیک" یعنی ایک شخص نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں امام کے پیچھے قرأت کروں یا خاموش رہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (امام کے پیچھے) خاموش رہو کہ وہ تیرے لئے کافی ہے۔

(۱۱) دارقطنی نے امام شعبی سے روایت کیا "انہ قال قال رجل ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا قراءۃ خلف الامام یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام کے پیچھے کوئی قرأت نہیں۔

(۱۲) بیہقی نے بحث قرأت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام الکتاب فھی خداج الا صلوٰۃ خلف الامام" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے سوا اس نماز کے جو امام کے پیچھے ہو۔

(۱۳) حضرت امام محمد شیبانی نے موطأ میں اور عبدالرزاق نے مصنف میں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے "قال لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرا" جو امام کے پیچھے قرأت کرے کاش اس کے منہ میں پتھر ہو۔ اس طرح شرح معانی الآثار میں بہت سارے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعود، زید بن ثابت، حضرت فاروق اعظم، حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ ابن عباس، جابر بن عبداللہ، حضرت علی مرتضیٰ اور علقمہ وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین سے مروی ہے کہ یہ حضرات قرأت خلف الامام کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان میں سے کوئی یہ فرماتے کہ امام کے پیچھے جو قرأت کرے اس کے منہ میں آگ ہو کوئی فرماتے اس کے منہ میں پتھر ہو کوئی فرماتے کہ وہ فطرت کے خلاف ہے۔ پھر عقل و قیاس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں ہونی چاہئے۔

(۱) کیونکہ نماز میں جیسے سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ایسے ہی سورہ ملانا یا کم از کم تین آیتوں کا پڑھنا ضروری ہے چنانچہ مسلم شریف کے حوالہ سے یہ روایت گذری۔ "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بام القرآن فصاعداً" اس کی نماز نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ اور کچھ نہ پڑھے حالانکہ غیر مقلدین بھی مقتدی کا امام کے پیچھے سورہ نہ پڑھنے کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ سورہ میں امام کی قرأت کافی ہے تو چاہئے کہ مقتدی سورہ فاتحہ بھی نہ پڑھے اور امام کی قرأت ہی اسکو کافی ہو۔

(۲) اگر مقتدی پر سورہ فاتحہ پڑھنا لازم ہوتا تو اس مقتدی کی وہ رکعت شمار میں نہ آئے گی جس نے امام کو حالت رکوع میں پایا چونکہ اس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی ہے حالانکہ سب کا اتفاق ہے کہ رکوع میں شریک ہونے والا پوری رکعت پانے والا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نماز میں جو چیزیں واجب وفرض ہیں اسکو چھوڑنے سے نماز نہیں ہوتی جیسے کوئی شخص تکبیر تحریمہ نہ کہے یا تکبیر تحریمہ کے ساتھ ایک تسبیح کے مقدار قیام نہ کرے اور رکوع کرلے وغیرہ وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں فرض ہیں۔ پس اگر سورہ فاتحہ فرض ہوتی تو حالت رکوع میں امام کو پانے والے کی وہ رکعت پوری نہ ہوتی کہ اس نے فرض کو چھوڑا ہے۔ لیکن باتفاق رکعت کا پوری ہوجانا اس بات کی دلیل ہے کہ سورہ فاتحہ فرض نہیں ہے۔

(۳) مقتدی پر اگر قرأت فاتحہ بھی فرض ہو اور آمین بھی فرض ہو تو یہ استحالہ لازم آئے گا کہ اگر امام، مقتدی سے پہلے سورہ فاتحہ سے فارغ ہوجائے تو یہ مقتدی جو درمیان فاتحہ خوانی میں ہے آمین کہے یا نہ کہے، اگر کہے گا تو اپنی فاتحہ ختم کرکے بھی آمین کہے گا یا نہیں بہرصورت نماز میں فساد ضرور لازم آئے گا۔

(۴) ایک استحالہ یہ بھی لازم آئے گا کہ اگر مقتدی فاتحہ کے بیچ میں ہو اور امام فارغ ہوکر رکوع میں چلا جائے تو مقتدی کیا کرے، رکوع میں جائے یا فاتحہ پڑھتا رہے اگر فاتحہ پڑھتا ہے تو رکوع چھوٹتا ہے اور اگر رکوع میں جاتا ہے تو قرأت فاتحہ چھوڑنا پڑیگا لہٰذا اس طرح کے تمام استحالات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ "قراءۃ الامام قرأۃ له" امام کی قرأت، مقتدی کی قرأت ہے جیسی احادیث پر عمل کیا جائے تاکہ آیت قرآن اور سب احادیث مبارکہ پر کسی نہ کسی طرح عمل ہوجائے۔

اختلاف ائمہ: یعنی نماز میں مقتدی کے قرأت کرنے کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے، حضرت امام شافعی سے اس بارے میں دو روایت ہے قول جدید یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت بہرحال واجب ہے خواہ امام قرأت سری کرے یا جہری، اور قول قدیم یہ ہے کہ جب امام سری قرأت کرے تو مقتدی پر قرأت واجب ہے اور جہری میں واجب نہیں ہے یہی قول حضرت امام مالک اور ابن مبارک کا ہے مگر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقتدی کے لئے قرأت خلف الامام جائز نہیں۔

شوافع کے دلائل:

(۱): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" (المزمل:۲۰) طریق استدلال اس طور پر ہے کہ آیت متلوہ میں حکم قرأت منفرد و مقتدی دونوں کو عام ہے اس لئے قرأت دونوں طرح کے نمازی پر واجب ہوگی۔

(۲) بہت ہی مشہور حدیث ہے "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ بغیر قرأت فاتحہ نماز نہیں ہوتی۔

(۳) ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں محمود بن ربیع عن عبادہ بن صامت روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز صبح میں قرأت فرمائی تو قرأت میں ثقالت محسوس ہوئی جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ " مالی أراکم تقرؤن خلف امامکم "یعنی کیا بات کہ تم کو دیکھتا ہوں کہ تم امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو، صحابہ کہتے ہیں ہم نے کہا ہاں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ام القرآن کے علاوہ کچھ نہ پڑھو کہ جس نے اسے نہ پڑھا اس کی نماز نہیں ہوتی۔

(۴) حضرت امام مالک نے اپنی موطأ میں علاء بن عبدالرحمن سے روایت کیا کہ انہوں نے ابوالسائب مولی ہشام سے سنا ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کوئی نماز پڑھی اور اسمیں ام القرآن نہ پڑھی "فھی خداج غیر تام "تو یہ ناقص ناتمام ہے۔ابوالسائب کہتے ہیں میں نے کہا اے ابوہریرہ بیشک میں بھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں تو ابوہریرہ نے فرمایا اقرأ بھا یا فارسی فی نفسک اے فارسی اپنے دل میں قرأت کرلیا کرو۔

(۵) دارقطنی نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو وہ بعض نمازیں پڑھائیں جس میں قرأت جہری ہے جب نماز سے فارغ ہوئے تو اپنے وجہ کریم سے ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ کیا تم بھی قرأت کرتے ہو جب میں جہری قرأت کرتا ہوں؟ تو بعض نے کہا کہ بیشک ہم ایسا کرتے ہیں ارشاد فرمایا "انا اقول مالی انا زع القرآن" کیا بات ہے کہ قرآن میں مجھ سے جھگڑا کیا جاتا ہے جب جہری قرأت کی جائے تو ام القرآن کے سوا کچھ نہ پڑھو کیونکہ جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں۔ (رازی صفحہ ۱۷۶ ج:۱)

احناف کے دلائل: گذشتہ اوراق میں اس کی دلیلیں گذر چکی ہیں خلاصہ یہ ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک قرأت خلف الامام جائز نہیں کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے حدیث شریف ہے میں کہ امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے اور ارشاد ہے کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، رکوع کرے تم بھی رکوع کرو سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور جب قرأت کرے تو تم خاموش ہوجاؤ اس طرح بہت سی احادیث واخبار سے ثابت و

ظاہر ہے کہ مقتدی پر قرأت واجب نہیں، رہی وہ حدیثیں جس میں قرأت فاتحہ کا لزوم ثابت ہے وہ منفرد یا صرف امام کے حق میں لزوم ثابت ہوگا تا کہ دوسری احادیث جس میں قرأت نہ کرنے کا ثبوت ہے سے تعارض نہ ہو نیز قرآن حکیم کا ارشاد ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ''بھی نفی قرأت کا حکم کرتا ہے دلائل سے قطع نظر زیر بحث مسئلہ کو سمجھنے کے لئے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا، قرأت خلف الامام کے قائلین کے ساتھ مناظرہ ہی کافی ہے جو انصاف پسند آپ کے طرز استدلال کو پڑھ لیگا وہ بالیقین اس نظریہ کا قائل ہوجائے گا کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے اور لطف کی بات یہ کہ اس مناظرہ کی حکایت حضرت امام رازی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب تفسیر کبیر میں بیان کی ہے جو قرأت خلف الامام کے زبردست حامی ہیں ملاحظہ ہو حضرت رازی تفسیر سورہ بقرہ زیر آیت ۱۳۱ رقمطراز ہیں۔

''یحکی أن جماعة من اهل المدینة جاءوا الیٰ ابی حنیفة لیناظروه فی القرأة خلف الامام ویبکتوه ویشنعوا علیه فقال لهم لا یمکننی مناظرة الجمیع ففوضوا أمر المناظرة الی اعلمکم لأناظره فاشاروا الی واحد فقال هذا اعلمکم؟قالوا نعم، قال والمناظرة معه کالمناظرة معکم؟قالوا نعم قال والالزام علیه کالالزام علیکم؟قالوا نعم قال وان ناظرته والزمته الحجة فقد لزمتکم الحجة؟قالوا نعم قال کیف؟قالوا لانارضینا به اماما فکان قوله قولا لنا قال ابو حنیفة فنحن لما اخترنا الامام فی الصلوة کانت قرأته قرأة لنا وهو ینوب عنا فأقروا له بالالزام''(صفحه ۱۷۹/ج:۲)۔یعنی مدینہ منورہ کے علما کی ایک جماعت ''قرأت خلف الامام'' کے مسئلہ پر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مناظرہ کرنے آئی تا کہ آپ کو دلائل سے خاموش کردیں اور آپ پر طعن تشنیع کریں۔حضرت امام نے فرمایا کہ آپ لوگوں میں پوری جماعت سے بروقت مناظرہ نہیں کرسکتا اس لئے آپ لوگوں میں جو سب سے بڑا عالم ہو اس کو مجھ سے مناظرہ کرنے کی ذمہ داری سونپ دو تا کہ میں ان کے ساتھ مناظرہ کروں انہوں نے اپنے ایک سب سے بڑے عالم کی طرف اشارہ کیا، امام نے پوچھا کیا یہ آپ لوگوں میں سب سے بڑے عالم ہیں انہوں نے کہا، ہاں امام اعظم نے فرمایا کیا میرا ان کے ساتھ مناظرہ کرنا تم لوگوں کے ساتھ مناظرہ کرنے کی طرح ہوگا انہوں نے کہا، ہاں، آپ نے فرمایا، ان پر جو الزام قائم ہوگا گویا وہ تم پر الزام ہوگا انہوں نے کہا ہاں، پھر امام نے فرمایا اگر میں ان کے ساتھ مناظرہ کروں اور دلیل میں غالب آجاؤں تو گویا تم پر بھی غالب آجاؤں گا انہوں نے کہا ہاں حضرت امام نے دریافت فرمایا کہ کیسے ہوسکتا کہ جو دلیل ان پر قائم ہو تو وہی دلیل تم

پر بھی قائم ہوجائے، انہوں نے جواب دیا اس لئے کہ ہم اسے اپنا امام بنانے پر راضی ہیں تو اس کی بات، ہماری بات ہوگی، اس پر امام اعظم نے فرمایا کہ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ جب ہم نے ایک شخص کو نماز میں اپنا امام مان لیا تو اس کا قرأت کرنا ہمارا قرأت کرنا ہے کہ وہ ہماری نمائندگی کرتا ہے کہ ہمارا قائم مقام ہے، حضرت امام کی یہ بات سن کر سب نے ان کے الزام کو تسلیم کرلیا۔ تفصیلات گذر چکی ہیں اس باب کے تعلق سے مزید تحقیقات کتب مذہب سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

فرع: (۱۱) مذہب امام اعظم میں جو منفرد اور مذہب امام شافعی میں جو منفرد و مقتدی سورہ فاتحہ اچھی طرح قرأت نہیں کرسکتا اس کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اسے سورہ فاتحہ سے کچھ یاد ہے یا کچھ بھی یاد نہیں ہے اگر ایک آیت بھی کم از کم یاد ہے تو وہی ایک آیت پڑھے اور اسکے ساتھ چھ آیات بطریق اقرب پڑھے اور اگر سورہ فاتحہ سے کچھ بھی یاد نہیں ہے تو قرآن میں کہیں سے کچھ بھی یاد ہے تو اسی کو پڑھے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن" یعنی قرآن سے جو میسر ہو اس کو پڑھو لیکن اگر قرآن سے کچھ بھی یاد نہیں ہے تو اس پر کچھ نہ کچھ ذکر کرنا لازم ہے یعنی کم از کم الحمدللہ، اللہ اکبر جیسے کلمات کہے یہ مذہب حضرت امام شافعی کا ہے دلیل حضرت رفاعہ بن مالک کی حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نماز کا ارادہ کرے تو وضو کرے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے پھر اللہ اکبر کہے اور اگر اس کو قرآن سے یاد ہے تو اس کو پڑھے اور اگر کچھ بھی یاد نہیں تو اللہ کی حمد و کبریائی بیان کرے اس مقام پر امام رازی نے کہا کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اگر فاتحہ و قرآن سے کچھ یاد نہیں ہے تو ذکر اس پر لازم نہیں ہے۔

مسئلہ سوم: حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک بحکم قرآن "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن" کے بموجب نماز میں نفس قرأت فرض ہے۔ یہی حضرات صاحبین کا بھی موقف ہے مگر ان میں مقدار فرضیت میں قدرے اختلاف ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک کم از کم ایک آیت کی قرأت فرض ہے لیکن حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد کہتے ہیں تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت کی قرأت فرض ہے۔

سورہ فاتحہ و قرأت کے کچھ مسائل کا بیان:

(۱) قرأت اس کا نام ہے کہ تمام حروف مخارج سے ادا کئے جائیں تاکہ ہر حرف دوسرے سے صحیح طور پر ممتاز ہوجائے۔ اور آہستہ پڑھنے میں بھی اتنی آواز ضروری ہے کہ خود سن سکے اگر حروف صحیح صحیح تو پڑھا مگر اس قدر آہستہ پڑھا کہ خود نہ سنا اور کوئی مانع شور و غل یا ثقل سماعت نہیں تو نماز نہ ہوئی (عالمگیر و بہار)۔

(۲) مطلقاً ایک آیت پڑھنا فرض کی دونوں رکعتوں میں اور وتر ونوافل کی ہر رکعت میں امام ومنفرد پر فرض ہے اور مقتدی کو کسی نماز میں قرأت جائز نہیں نہ سورہ فاتحہ اور نہ آیت، نہ آہستہ والی نماز میں اور نہ جہر والی نماز میں کہ امام کی قرأت مقتدی کے لئے کافی ہے۔

(۳) چھوٹی آیت جس میں دو یا دو سے زائد کلمات ہوں پڑھ لینے سے فرض ادا ہوجائے گا اور اگر ایک ہی حرف کی آیت ہو جیسے ص، ن، ق وغیرہ کہ بعض قرأتوں میں ان کو آیت مانا ہے پھر بھی صرف اس کے پڑھنے سے فرض ادا نہ ہوگا اگرچہ اس کی تکرار کرے رہی ایک کلمہ کی آیت جیسے (مُدْ هَامَّتَانِ) تو اس میں اختلاف ہے اور بچنے میں احتیاط۔ واضح رہے کہ امام اسبیجابی نے شرح جامع صغیر وشرح مختصر امام طحاوی، امام علاء الدین نے تحفۃ الفقہاء اور امام ملک العلماء نے بدائع میں اس کے جواز پر جزم فرمایا اور خلاف کا اصلا نام نہ لیا اور یہی اظہر من حیث الدلیل ہے اور ظہیریہ، سراج وہاج، فتح القدیر و شرح المجمع لابن ملک اور درمختار میں عدم جواز کو اصح کہا۔ (بہار شریعت مع حاشیہ)۔

(۴) نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے یعنی اس کی ساتوں آیتیں کہ ہر ایک آیت مستقل واجب ہے ان میں ایک آیت بلکہ ایک لفظ کا ترک بھی، ترک واجب ہے، اسی طرح سورہ فاتحہ کے ساتھ ایک چھوٹی سورہ جیسے "اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" یا تین چھوٹی آیتیں، یا ایک یا دو آیتیں جو تین چھوٹی آیتوں کے برابر ہو واجب ہے۔ نماز فرض میں دو پہلی رکعتوں میں قرأت واجب ہے۔ الحمد اور اس کے ساتھ سورہ ملانا فرض کی دو پہلی رکعتوں میں اور نفل وتر کی ہر رکعتوں میں واجب ہے۔ الحمد کا سورہ سے پہلے پڑھنا واجب ہے۔ الحمد اور سورہ کے درمیان کسی اجنبی کا فاصل نہ ہونا واجب ہے، آمین تابع الحمد ہے اور بسم اللہ تابع سورہ پس یہ دونوں اجنبی نہیں ہوں گے سورہ پہلے پڑھ لیا اس کے بعد الحمد پڑھی یا الحمد وسورہ کے درمیان دیر تک یعنی تین بار سبحان اللہ کہنے کی مقدار چپ رہا سجدہ سہو واجب ہے۔ الحمد للہ میں سے ایک لفظ بھی پڑھنے سے رہ گیا تو سجدہ سہو واجب ہے۔

(۵) ایک آیت کا حفظ کرنا ہر مسلمان مکلف پر فرض عین ہے اور پورے قرآن مجید کا حفظ کرنا فرض کفایہ ہے اور سورہ فاتحہ اور ایک دوسری چھوٹی سورہ یا اس کے مثل مثلاً تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت کا پڑھنا واجب عین ہے۔

(۶) فرض کی پہلی رکعتوں میں سورہ فاتحہ بھول گیا تو پچھلی رکعتوں میں اس کی قضا نہیں اور رکوع سے پیشتر یاد آ گیا تو فاتحہ پڑھ کر پھر سورہ پڑھے یونہی اگر رکوع میں یاد آیا تو قیام کی طرف لوٹ آئے اور فاتحہ وسورت پڑھ کر رکوع کرے اگر دوبارہ رکوع نہ کرے گا نماز نہ ہوگی پھر آخر میں سجدۂ سہو کرے۔

(۷) اسی طرح اگر سورہ ملانا بھول گیا رکوع میں یاد آیا تو کھڑا ہوجائے اور سورہ ملائے پھر دوبارہ رکوع کرے اور آخر میں سجدہ سہو کرے اگر دوبارہ رکوع نہ کیا نماز نہ ہوگی۔

(۸) چار رکعتی فرض نماز کی پہلی دونوں رکعتوں میں سورت بھول گیا تو پچھلی رکعتوں میں پڑھنا واجب ہے اور ایک میں بھول گیا ہے تو تیسری یا چوتھی رکعت میں پڑھے اور اگر مغرب کی پہلی دونوں میں بھول گیا تو تیسری میں پڑھے لیکن ایک رکعت کی قرأت سورت پھر بھی فوت جائیگی ان سب صورتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھے، جہری نماز میں ہو تو فاتحہ وسورت جہراً پڑھے ورنہ آہستہ اور ان سب صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہے اگر قصداً چھوڑی ہے تو اعادہ کرے، سجدۂ سہو کافی نہیں۔

(۹) قرأت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں لفظ رب کو تشدید کے ساتھ نہ پڑھا، یا "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" میں تشدید نہ پڑھی تو نماز ہوجائے گی۔ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" میں ادغام کے ساتھ نہ پڑھا بلکہ لام کو ظاہر کرکے "اِهْدِنَا الْصِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" پڑھا، نماز ہوجائے گی "اِيَّاكَ" کو "نَعْبُدُ" کے ساتھ وصل کرکے پڑھا تو کوئی حرج نہیں نماز ہوجائے گی۔ "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" یا "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں ایک لفظ رب، یا مالک کا اضافہ کرکے رب "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" یا مالک "مَالِكِ يَوْمِ" پڑھ دیا اگر بقصد اضافت پڑھ دیا۔ یعنی رب کا رب یا مالک کا مالک تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ لیکن اگر بقصد تصحیح مخارج مکرر کیا یا کچھ بھی قصد نہیں کیا تو ان سب سورتوں میں نماز فاسد نہ ہوگی۔

(۱۰) نماز میں چھینک آئے تو سکوت کرے اور الحمد للہ کہہ لیا تو بھی نماز میں حرج نہیں اور اگر اس وقت حمد نہ کی تو فارغ ہوکر کہے۔ کسی کو چھینک آئی اس نے الحمد لله کہا، پھر اس کے جواب میں کسی نے یرحمک الله کہہ دیا تو جواب دینے والے کی نماز فاسد ہوگئی اور اگر خود اسی کو چھینک آئی اور اپنے کو مخاطب کرکے یرحمک الله کہا، نماز فاسد نہ ہوگی۔ اور اگر کسی اور کو چھینک آئی اس مصلی نے الحمد لله کہا نماز ہوگئی اگر جواب کی نیت سے کہا تو نماز جاتی رہی۔ خوشی کی خبر سن کر جواب میں الحمد لله کہا نماز فاسد ہوجائے گی البتہ اگر جواب کی نیت سے نہ کہا بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ نماز میں ہے تو فاسد نہ ہوگی۔

(۱۱) فرض کی پہلی دو رکعتوں میں اور نفل و وتر کی کسی رکعت میں سورہ الحمد کی ایک آیت بھی رہ گئی یا سورہ سے پیشتر دوبار الحمد پڑھی یا سورہ ملانا بھول گیا یا سورہ کو فاتحہ پر مقدم کردیا یا الحمد کے بعد ایک دو چھوٹی آیتیں پڑھ کر رکوع میں چلا گیا پھر یاد آیا اور لوٹا اور تین آیتیں پڑھ کر رکوع کیا تو ان سب صورتوں میں سجدہ سہو واجب ہے۔

(۱۲) الحمد کے بعد سورت پڑھی اس کے بعد پھر الحمد لله پڑھی تو سجدہ سہو واجب نہیں یونہی فرض کی پچھلی رکعتوں میں فاتحہ کی تکرار سے مطلقاً سجدہ سہو واجب نہیں اور اگر پہلی رکعتوں میں الحمد لله کا زیادہ حصہ پڑھ لیا تھا پھر اعادہ کیا تو سجدہ سہو واجب ہے الحمد پڑھنا بھول گیا اور سورت شروع کر دی اور بقدر ایک آیت کے پڑھ لی اب یاد آیا تو الحمد پڑھ کر سورت پڑھے اور سجدہ سہو واجب ہے یونہی اگر سورت کے پڑھنے کے بعد یا رکوع میں یا رکوع سے کھڑے ہونے کے بعد یاد آیا تو پھر الحمد لله پڑھ کر سورت پڑھے اور رکوع کا اعادہ کرے اور سجدہ سہو کرے۔ فرض نماز کی پچھلی رکعتوں میں الحمد نہ پڑھی تو سجدہ سہو لازم نہ ہوگا اور رکوع، سجدہ، یا قعدہ میں قرآن پڑھا تو سجدہ سہو واجب ہے۔ اگر بقدر فرض قرأت کر کے رکوع کیا مگر واجب قرأت ادا نہ کیا مثلاً الحمد لله نہ پڑھی یا سورت نہ ملائی تو حکم یہ ہے کہ لوٹے اور الحمد و سورت پڑھ کر رکوع کرے اور سجدہ سہو کرے اور اگر دوبارہ رکوع نہ کیا تو نماز جاتی رہی کہ پہلا رکوع جاتا رہا تھا۔ (بہار شریعت وغیرہ)

باب پنجم

تفسیر سورہ فاتحہ کے بیان میں

اس میں ایک مقدمہ اور چند فصلیں ہیں

سورۃ الفاتحۃ مکیۃ وھی سبع آیات

مقدمہ: تعارف سورہ، آیت، فاتحہ، مکی و مدنی کے بیان میں۔

سورت: سور سے بنا ہے اس کے معنی ہوتے ہیں گھیرنے والی چیز، اسی لئے شہر کے آس پاس کی دیوار (شہر پناہ) کو سور البلد کہتے ہیں کیونکہ وہ شہر کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ چونکہ سورہ بھی اپنے اندر کی آیتوں کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے اس لئے اسے سورہ کہتے ہیں۔ سورہ کے معنی عمارت کی ایک منزل کے بھی ہیں قرآن کریم کی سورتیں گویا ایک ایک منزلیں ہیں جو ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں، سورہ کے معنی اونچے مرتبہ کے بھی ہوتے ہیں چونکہ سورہ کے اندر کا سبھی کلام اتنا اونچا ہے کہ اس کی رفعت و بلندی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا نیز اس کا پڑھنے والا، نہ پڑھنے والے پر بلند و بالا اور بزرگ و برتر ہو جاتا ہے۔ نیز اس کے اندر کا کلام ایسا کامل ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ اس پر نقص کی انگلی نہیں رکھ سکتا۔

شریعت میں سورہ، قرآن کریم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس کا ایک آغاز اور ایک خاتمہ ہو، جس میں کم سے کم تین آیتیں ہوں، اور اس کا کوئی نام رکھ دیا گیا ہو جیسے سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ اور آل عمران وغیرہ۔ سورہ و آیات کی دو قسم ہوتی ہیں مکی و مدنی۔ سب سے چھوٹی سورہ، سورہ کوثر ہے اور سب سے بڑی سورہ، سورہ بقرہ ہے۔

تفسیر قرطبی میں ہے: ”معنی السورۃ فی کلام العرب الابانۃ لھا من سورۃ اخریٰ و انفصالھا عنھا و سمیت بذالک لانہ یرتفع فیھا من منزلۃ الی منزلۃ۔ وقیل سمیت لشرفھا و ارتفاعھا کما یقال لما ارتفع من الارض سور۔ وقیل سمیت بذالک لان قارئھا یشرف علی مالم یکن عندہ کسور البناء کلہ بغیر ھمزۃ۔ وقیل سمیت بذالک لانھا قطعۃ من القرآن علی حدۃ، من قول العرب للبقیۃ سور بالھمزۃ ثم خففت فابدلت واو الانضمام ما قبلھا۔ وقیل سمیت بذالک لتمامھا و کمالھا من قول العرب للناقۃ التامۃ ”سورۃ“ وجمع سورۃ سور۔ (صفحہ ۲۶/ج: ۱)

تفسیر جمل میں ھے: "والسورة طائفة من القرآن مترجمة باسم مخصوص تتضمن ثلاث آیات فاکثر۔ (صفحہ: ۶۱۳)

آیت: تفسیر نعیمی میں ہے آیت قرآن پاک کی اس عبارت کو کہتے ہیں جس میں بات پوری تو ہوجائے مگر اس کا کوئی علیحدہ نام نہ رکھا گیا ہو جیسے ہم لوگ جملہ یا کلام بولتے ہیں۔ اور اس کو آیت اس لئے کہتے ہیں کہ آیت کا معنی ہے نشانی، اور قرآن حکیم کا ہر جملہ قرآن پاک کی حقانیت، لانے والے کی حقانیت اور بھیجنے والے کی حقانیت کی نشانی ہے۔ قرآن حکیم کی سب سے چھوٹی آیت "مدھامتان" ہے اور سب سے بڑی آیت، آیت مداینہ ہے جو سورہ بقرہ کے آخری رکوع میں ہے۔ (نعیمی صفحہ: ۴۰۔۳۹/ ج:۱)

تفسیر قرطبی میں ہے: "واما الآیة فهی العلامة بمعنی أنها علامة لانقطاع الکلام الذی قبلها من الذی بعدها وانفصاله ای هی بائنة من اختها و منفردة و تقول العرب بینی و بین فلان آیة ای علامة و من ذالک قوله تعالیٰ ان آیة ملکه و قیل سمیت آیة لانها جماعة حروف من القرآن و طائفة منه، کما یقال خرج القوم بآیتهم أی بجماعتهم و قیل سمیت آیة لانها عجب یعجز البشر عن التکلم بمثلها۔

واختلف النحویون فی اصل آیة فقال سیبویة أیية علی فعلة مثل أکمة و شجرة، فلما تحرکت الیاء وانفتح ما قبلها انقلبت الفا فارت آیة بهمزة بعدها مدة و قال الکسائی اصلها آیية علی وزن فاعلة مثل آمنة فقلبت الیاء الفا لتحرکها وانفتاح ماقبلها، ثم حذفت لالتباسها بالجمع۔ و قال الفراء اصلها أیّیه بتشدید الیاء الاولیٰ فقلبت الفا کراهة للتشدید فصارت آیة جمعها آی، و آیات و آیاء۔ (ص: ۶۶/ج: ۱ ایضا)۔

اور آیت کی اصلیت کے بارے میں حضرات نحویوں کا اختلاف ہے سیبویہ کہتے ہیں کہ آیۃ، فعلۃ کے وزن پر أیيۃ، تھا جیسے اکمۃ و شجرۃ وغیرہ، چونکہ "یا" متحرک، اس کے ماقبل مفتوح تھا اس لئے الف سے بدل گئی۔ اور امام کسائی کے نزدیک آیت کی اصل آیيۃ، تھی فاعلۃ کے وزن پر جیسے آمنہ تعلیل سابق سے آیت ہوگئی، اس کے برخلاف فراء نحوی کا خیال یہ ہے کہ آیت اصل میں آیيۃ تھا، پہلی یاء مشدد کے ساتھ، چونکہ یاء مشدد ناپسندیدہ ہے اس لئے الف سے بدل گئی اور آیت ہوگئی اس کی جمع آی، آیات اور آیاء آتی ہے۔

الفاتحة: تفسیر روح المعانی میں ہے "الفاتحة فی الاصل صفة جعلت اسماً لاول الشئ لکونه واسطة فی فتح الکل و التاء للنقل أو للمبالغة و لااختصاص لها بزنه "علامة" او مصدر اطلقت علی الاول تسمیة

للمفعول بالمصدر اشعارا با صالته کانه نفس الفتح اذ تعلقه به او لاً ثم بو اسطته یتعلق با لمجموع لکو نه جز امنه"۔(صفحه:۳۶/ج:۱)

یعنی فاتحہ اصل میں ''فاعلۃ'' کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے لیکن اسے اسم کے معنی میں نقل کرلیا گیا ہے جس کا معنی، اول الشئ ہے اس لئے کہ اول شئ ہی کل کے کھولنے کا واسطہ ہوتا ہے اور اس وقت ''ۃ'' نقل یا مبالغہ کی ہوگی کیونکہ ''علامۃ'' کے وزن کے لئے تاء مبالغہ مخصوص نہیں ہے۔ پس اس کے آخر میں تاء تانیث نہیں ہے بلکہ صفت کے صیغہ سے اسم کی طرف نقل کرنے کے لئے تاء ناقلہ یا مبالغہ ملحق ہے۔

یا پھر یہ کہ فاتحہ ''فاعلۃ'' کے وزن پر مصدر ہے نفس فتح یعنی کھولنے کے معنی میں ہے۔ لیکن اس کا اطلاق بھی اول الشئ پر ہوتا ہے کہ مصدر بول کر مفعول مراد ہے یعنی وہ چیز جس کے ساتھ کلام کا افتتاح کیا گیا اس لئے کہ شئ کا تعلق پہلے، اول ہی سے ہوتا ہے اور پھر اس کے واسطہ سے مجموعہ سے تعلق ہوتا ہے کہ وہ مجموعہ کا جزء ہے۔

مختصر یہ کہ فاتحہ خواہ صفت کا صیغہ ہو یا اسم بمعنی اول شئ ہو یا مصدر بمعنی مفعول ہو بہر صورت اس کا معنی واضح ہے کہ اسی سورہ مبارکہ سے تلاوت، نماز، کتابت وغیرہ کا آغاز ہوتا ہے یہ سورہ ترتیب معہودی کے طور پر سب سے اول ہے یا لوح محفوظ یا نزول میں اول ہے اس لئے اسے سورہ فاتحہ کہتے ہیں فاتحہ نام رکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے روح البیان میں فرمایا۔

اس کو فاتحہ اس لئے کہتے ہیں کہ مصاحف وتعلیم وتلاوتِ قرآن اور نماز کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ حمد سے ہر کلام کی ابتدا ہوتی ہے۔ یا اس لئے کہ یہ تمام سورتوں سے پہلے نازل ہوئی۔ یا اس لئے کہ لوحِ محفوظ پر پہلے اسی کو لکھا گیا یا اس لئے کہ دنیا میں ابواب مقاصد کا افتتاح اور آخرت میں ابوابِ جنان کی ابتدا اسی سورہ سے ہے یا اس وجہ سے کہ کتاب اللہ کے ابوابِ خزائن اسرار کے کھلنے کا وسیلہ یہی سورت ہے۔ کیونکہ یہ سورت لطائفِ خطاب کے خزانوں کی کنجی ہے۔ یا اس لئے کہ اس کے انجلاء سے اہل بیان پر قرآن پاک کے مطالب منکشف ہوجاتے ہیں''۔ چنانچہ جسے اس کے معانی کی معرفت ہوجاتی ہے اس پر اس کے واسطے سے متشابہات کے تالے کھل جاتے ہیں اور آیات کے انوار وبرکات سے وہ منور ومبارک ہوجاتا ہے۔

اضافت سورہ وفاتحہ: رہی سورہ کی اضافت فاتحہ کی طرف، تو اضافت العام الی الخاص کے قبیل سے ہے کہ سورہ عام ہے اور فاتحہ خاص ہے جس طرح شجر کی اضافت اراک کی طرف کرکے شجر الاراک اور علم کی اضافت نحو کی

طرف کر کے علم النحو کہتے ہیں اور حضرت علامہ آلوسی نے کہا ہے کہ سورہ کی اضافت فاتحہ کی طرف ویسی ہے جیسی اسم کی اضافت مسمی کی طرف ہوتی ہے۔ اور یہی مشہور ہے۔ رہی فاتحہ کی اضافت کتاب کی طرف تو یہ اضافت لامیہ ہے کیونکہ مضاف الیہ یعنی کتاب، مضاف یعنی فاتحہ کے لئے ظرف نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کے جنس سے ہے۔

تفسیر جمل میں ھے:"واضافة السورة الى الفاتحة من اضافة العام الى الخاص كشجرة الاراک وعلم النحو، و اضافة الفاتحة الى الكتاب لامية لان المضاف اليه ليس ظرفا للمضاف ولا جنساله"۔(صفحہ:۶۱۳)

واضح رہے کہ فاتحہ کی اضافت کتاب کی طرف، اضافت لامیہ ہوگی یا اضافت منیہ ہوگی اضافت ظرفیہ نہیں ہوسکتی کیونکہ بتقدیر حرف جر اضافت کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

اضافت لامیہ: اس کو کہتے ہیں کہ مضاف الیہ سے پہلے حرف جر لام مقدر ہو، اس میں مضاف، مضاف الیہ کا جزء ہوتا ہے جیسے کہیں جزء الشئ یعنی جزء للشئ ہے پس فاتحۃ الکتاب اصل میں فاتحۃ للکتاب ہے کہ یہ بہت ظاہر کہ فاتحہ، کتاب کا جزء ہے۔

اضافت منیہ: جس مضاف الیہ سے پہلے حرف جر ''من'' مقدر ہو، اس میں مضاف، مضاف الیہ کے جنس سے ہوتا ہے یا مضاف الیہ مضاف کا بیان ہوتا ہے جیسے "خاتم فضة" جو اصل میں "خاتم من فضة" ہے۔ اسی طرح فاتحۃ الکتاب اصل میں فاتحۃ من الکتاب ہے۔ اس کو اضافت بیانیہ بھی کہتے ہیں۔

اضافت فیہ/ظرفیہ: جس مضاف الیہ سے پہلے حرف جر ''فی'' مقدر ہو اس میں مضاف الیہ، مضاف کا ظرف ہوتا ہے۔ جیسے "حاطب الليل" و"سارق الليل" وغیرہ جو اصل میں "حاطب فی الليل" و"سارق فی الليل" ہے اس میں لیل، حاطب و سارق کے لئے ظرف ہے۔ اس صورت میں فاتحۃ الکتاب کو فاتحة فی الكتاب نہیں کہہ سکتے کہ کتاب سورہ فاتحہ کے لئے ظرف نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ فاتحہ کی اضافت کتاب کی طرف، لامیہ ہے یا بیانیہ ہے۔

قرآن حکیم کی سورہ کے **مکی و مدنی** ہونے کے سلسلہ میں تین اصطلاحیں ہیں۔

اول: سب سے مشہور و معروف قول یہ ہے کہ **مکی** جو، آیت یا جو سورہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی مکی ہے۔ اور **مدنی** وہ ہے جو بعد ہجرت نازل ہوئی ہو خواہ مکہ میں نازل ہوئی ہو خواہ مدینہ میں، عام فتح میں نازل ہوئی ہو یا حجۃ

الوداع کے سال یا کسی سفر میں۔ چنانچہ عثمان بن سعد رازی نے یحی بن سلام سے تخریج کیا ہے کہ جو مکہ میں یا مدینہ کے راستہ میں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے پیشتر نازل ہوئی وہ مکی ہے۔ اور مدینہ تشریف لانے کے بعد جو سفر وحضر میں نازل ہوئی وہ مدنی ہے۔ اس اثر لطیف سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ سفر ہجرت میں جو نازل ہوئی وہ اصطلاحاً مکی ہیں۔

دوم: مکی وہ ہے جو مکہ معظّمہ میں نازل ہوئی ہو گرچہ ہجرت کے بعد ہو۔ اور **مدنی** وہ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہو اس اصطلاح کے مطابق مکی و مدنی کے درمیان واسطہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ جو آیات وسور اسفار میں نازل ہوئی ہیں ان پر مکی و مدنی کا اطلاق نہ ہو سکے گا۔ طبرانی نے کبیر میں ولید بن مسلم کے طریق سے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''اُنزِل القرآنُ فی ثلٰثة امکنة، مکة و المدینة و الشام''۔ یعنی قرآن تین جگہوں میں نازل ہوا ہے، مکہ، مدینہ اور شام میں، ولید بن مسلم نے کہا کہ شام سے بیت المقدس مراد ہے مگر شیخ عماد الدین بن کثیر نے کہا کہ شام کی تفسیر ''مقام تبوک'' سے کرنا زیادہ عمدہ ہے۔

علامہ سیوطی نے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''مکہ'' سے مکہ اور اس کے اطراف وجوانب اور اسی طرح مدینہ سے مدینہ اور اس کے اطراف وجوانب مراد ہیں اس لئے جو منی، عرفات اور حدیبیہ وغیرہا مقامات میں نازل ہوئیں مکی کہلائیں گی۔ اور بدر واحد اور سلح وغیرہا مقامات میں جو نازل ہوئیں مدنی کہلائیں گی۔

سوم: مکی وہ ہے جس میں اہل مکہ سے خطاب ہو۔ **مدنی** وہ ہے جس میں اہل مدینہ سے خطاب ہو۔ یہ تعریف حضرت عبد اللہ مسعود رضی اللہ عنہ کے قول پر منطبق ہے جو صحیح البخاری شریف میں ہے انہوں نے کہا ہے کہ ''والذی لا الہ غیرہ ما نزلت آیة من کتاب اللہ تعالیٰ الا وانا اعلم فیمن نزلت واین نزلت'' یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں قرآن حکیم کی ایک ایک آیت کے بارے میں بخوبی جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ قاضی ابوبکر نے ''الانتصار'' میں کہا ہے کہ مکی و مدنی کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قول وارد نہیں ہوا ہے کہ آپ اس کے مامور نہ تھے اور نہ ہی اس کا علم امت کے فرائض سے ہے گرچہ بعض اہل علم پر ناسخ ومنسوخ کا علم جاننا واجب ہے۔ اس لئے مکی و مدنی کے سلسلہ میں حضرات صحابہ وتابعین کی طرف رجوع کیا جائے گا اور انہیں کے حفظ وضبط پر اعتماد کیا جائے گا۔

فائد: خیال رہے کہ پچھلے رسول طالب تھے کلام الٰہی مطلوب اس لئے وہ کتاب لینے خاص جگہ جایا کرتے تھے موسیٰ علیہ السلام توریت لینے طور پر تشریف لے گئے مگر ہمارے حضور مطلوب ہیں اور کتاب اللہ طالب کہ جہاں حضور ہیں وہیں قرآن کی آیات آرہی ہیں حضور مکی ہیں تو آیات مکی، جب حضور مدنی ہو گئے تو آیات بھی مدنی ہوگئی۔علی العموم حضور، قرآن پاک کے متبع ہیں مگر بعض اوصاف میں قرآن پاک، حضور کا متبع چونکہ حضور عربی ہیں لہٰذا قرآن بھی عربی، ساری آیات عربی ہیں مگر حضور کے مکی مدنی ہونے سے آیات مکی مدنی بن گئی بہت سی آیتیں حضور کی مرضی کے مطابق اتریں جیسے تبدیلی قبلہ وغیرہ کی آیات۔(نعیمی صفحہ:۴۰/ج:۱)

فصل اول: تفسیر قولہ تعالیٰ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ : یہ سورہ مبارکہ مکیہ ہے، اس سورہ میں سات آیتیں، ستائیس کلمے اور ایک سو چالیس حروف ہیں اس کی کوئی آیت ناسخ ومنسوخ نہیں ہے۔

یہ فصل چند فوائد پر مشتمل ھے:

فائدہ (۱): اس مقام پر حضرات مفسرین کرام حمد کی تعریف اور تفسیر کے ساتھ مدح اور شکر کی بھی تعریف وتوضیح پیش کرتے ہیں اس لئے ذیل میں تینوں لفظوں کی تعریف وتوضیح پیش کی جاتی ہے۔

(الف) مدح کا اطلاق حی، غیر حی سب پر ہوتا ہے۔ چنانچہ موتی اور یاقوت کے حسن و جمال پر مدح کا اطلاق شائع و مشہور ہے لیکن اس پر حمد کا اطلاق محال ہے۔

(ب) مدح احسان سے پہلے بھی اور احسان کے بعد بھی ہوتی ہے برخلاف حمد کے کہ وہ احسان کے بعد ہی ہوتی ہے۔

(ج) مدح کبھی ممنوع و منھی عنہ بھی ہوتی ہے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے" احثوا التراب فی وجوہ المداحین" مداحین کے منھ میں مٹی بھر دو رہی حمد تو وہ مطلقاً مامور بہ ہے ارشاد رسول ہے "ومن لم یحمد الناس لم یحمد اللہ"۔

(د) مدح اس قول کو کہتے ہیں جو فضائل کے انواع میں سے کسی نہ کسی نوع کے ساتھ مختص ہونے کو بتائے حمد اس کو کہتے ہیں جو فضیلت معینہ کے ساتھ مختص ہونے پر دلالت کرے اور فضیلت معینہ فضیلت انعام واحسان ہے ان وجوہ سے ظاہر ہے کہ مدح، حمد سے عام ہے۔

حمد: (افعال اختیاریہ جمیلہ) اختیاری خوبی پر نعمت یا غیر نعمت کے بدلے تعریف کرنا۔

مدح: مطلقاً افعال جمیلہ پر تعریف کرنا (خواہ وہ اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ)۔

شکر: زبان یا غیر زبان سے نعمت کے بدلے تعریف کرنا۔

تفسیر البیضاوی میں ہے ''**الحمد هو الثناء على الجميل الاختياري من نعمة او غيرها و المدح هو الثناء على الجميل مطلقاً تقول حمدت زيدا على علمه و كرمه و لا تقول حمدته على حسنه وقيل هما اخوان، و الشكر في مقابلة النعمة قولا و عملا و اعتقاداً۔ قال افادتكم النعماء مني ثلثة يدي و لساني و الضمير المحجبا فهو اعم منهما من وجه و اخص من اخر**''۔

واضح رہے کہ حمد کی تعریف میں تین الفاظ، ثنا، جمیل اختیاری اور نعمت خاص طور سے قابل لحاظ ہیں۔ اس لئے ہم اس میں قدرے تفصیل سے کام لیں گے۔ ''ثنا'' کے تین معنی آتے ہیں ایک صفات کمالیہ کو ظاہر کرنا، حدیث شریف میں ہے ''لا احصیٰ ثناء علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک'' یعنی میں تیری ثنا کا احاطہ نہیں کرسکتا تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تو نے اپنی ثنا کی ہے۔ اس حدیث میں ثنا کا معنی صفات کمالیہ ظاہر کرنا ہے اس صورت میں حدیث کا معنی بایں طور ہوگا کہ اے مولا میں تیری صفات کمالیہ کا احاطہ نہیں کرسکتا جیسا کہ تو نے اپنی صفات کمالیہ بیان فرمائی ہے ثنا کا دوسرا معنی مطلقاً اوصاف بیان کرنے کے آتے ہیں خواہ خیر ہوں یا شر اس معنی کا بھی حدیث میں اطلاق ہے ارشاد ہے ''من اثنيتم عليه خيرا وجبت له الجنة و من اثنيتم عليه شرا وجبت له النار'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا جس کا تم بھلائی کے ساتھ ذکر کرو اس کے لئے جنت واجب ہے اور جس کا تم نے شر کے ساتھ ذکر کیا اس کے لئے جہنم واجب ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ''ثنا'' کا معنی مطلقاً اوصاف بیان کرنے کے آتے ہیں ثنا کا تیسرا معنی ''**ذكر الخير باللسان**'' یعنی زبان سے بھلائی کی تعریف کرنا ہے اس معنی کے اعتبار سے ثنا کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف درست نہ ہوگی کہ اس معنی میں لسان کی قید ہے اور اللہ تعالیٰ لسان و زبان سے پاک ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہاں لسان سے ہماری طرح کی زبان مراد نہیں ہے بلکہ قوت تکلم مراد ہے اور قوت تکلم سے بھی حقیقتاً قوت تکلم مراد نہیں ہے بلکہ اس سے اپنے علم و ارادہ کے معنی کا فیضان کرنا مراد ہے ظاہر ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے ثنا کا اطلاق رب تعالیٰ کے لئے درست ہے۔

حمد کی تعریف میں ایک قید جمیل اختیاری کی ہے جمیل ذات و وصف اور فعل تینوں کی صفت بن سکتا ہے چنانچہ ذات جمیل، وصف جمیل اور فعل جمیل ہر طرح استعمال ہوسکتا ہے۔ پس حمد کی تعریف میں جمیل اختیاری کا مفہوم یہ ہوگا کہ کسی کی وصف جمیل اختیاری یا فعل جمیل اختیاری پر تعریف کرنا مگر اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ تعریف حمد، فعل و وصف غیر اختیاری

پر صادق نہیں آئے گی کہ تعریف حمد میں جمیل اختیاری مذکور ہے حالانکہ حمد جمیل اختیاری پر جس طرح کی جاتی ہے جمیل غیر اختیاری پر بھی کی جاتی ہے چنانچہ ہم رب تعالیٰ کے افعال اختیاریہ جیسے ترزیق، احیاء اماتہ انزال وغیرہ کی تعریف و مدح کرتے ہیں اسی طرح رب تعالیٰ کی صفات ذاتیہ غیر اختیاریہ جیسے حیوۃ، سمع و بصر اور علم و قدرت کی بھی حمد و ثنا کرتے ہیں مگر حمد کی جو تعریف عام طور پر کی جاتی ہے وہ تعریف صفات ذاتیہ غیر اختیاریہ پر صادق نہیں آتی اس لئے حمد کی تعریف جامع نہ ہوئی۔ اس اعتراض کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں تمام جوابوں میں بہتر جواب یہ ہے کہ جمیل اختیاری کا معنی یہ ہے کہ جو افعال فاعل مختار سے صادر ہوں خواہ بالاختیار صادر ہوں یا بالاضطرار اور صفات ذاتیہ کا صدور، رب تعالیٰ سے گرچہ بالاختیار نہیں ہے لیکن بالاضطرار ضرور ہے اس تقریر سے حمد کا اطلاق صفات ذاتیہ پر بھی درست ہے۔ یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ حمد خاص ہے اور مدح عام ہے اور خاص بول کر عام مراد لیا گیا ہے یعنی حمد بول کر مدح مراد لیا گیا ہے اور مدح کا اطلاق اختیاریہ و غیر اختیاریہ دونوں پر درست ہے لہذا حمد کا اطلاق صفات ذاتیہ پر درست ہے۔

حمد کی تعریف میں تیسرا لفظ نعمت مذکور ہے۔ نعمت نون کے تینوں حرکتوں کسرہ، فتحہ اور ضمہ کے ساتھ مستعمل ہے نِعمت، نَعمتُ، نُعمتَ تینوں طرح بولتے ہیں کسرہ نون کے ساتھ انعام کے معنی میں، فتحہ نون کے ساتھ تنعیم خوشگوار بنانے کے معنی میں اور نون کے ضمہ کے ساتھ مسرت اور خوشی کے معنی میں آتا ہے یہاں نعمت بکسر نون ہے جو انعام کے معنی میں ہے اب حمد کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ حمد تعریف کرنا افعال اختیاریہ پر نعمت کے مقابلہ میں ہو یا غیر نعمت کے مقابلہ میں۔

مدح: مطلق افعال حسنہ پر تعریف کرنا خواہ افعال اختیاری ہوں یا غیر اختیاری

شکر: ایسے فعل کو کہتے ہیں جو منعم کی تعظیم کی خبر دے یعنی قول، فعل اور اعتقاد کے ذریعہ بالمقابل نعمت کے منعم کی تعظیم کرنا۔

حمد و مدح اور شکر کی تعریف معلوم ہونے کے بعد تینوں کے درمیان فرق مندرجہ ذیل ہے۔

حمد و مدح اور شکر کے درمیان نسبت: حمد اور مدح کے درمیان عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے یعنی حمد خاص ہے اور مدح عام ہے مطلب یہ ہے کہ جہاں حمد صادق آئے گی وہاں مدح بھی صادق آئے گی لیکن جہاں مدح صادق آئے ضروری نہیں کہ حمد بھی صادق آئے۔ جیسے "حمدتُ زیداً علیٰ علمه و کرمه" تو کہا جا سکتا ہے لیکن "حمدته علی حسنه" نہیں کہا جا سکتا البتہ "مدحت زیداً علیٰ حسنه" کہہ سکتے ہیں۔

حمد و مدح اور شکر کے درمیان عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے اور یہ معلوم کہ عموم وخصوص من وجہ میں تین مادے ہوتے ہیں ایک اجتماع کا دو افتراق کے پس حمد و مدح اور شکر میں تینوں مادے پائے جاتے ہیں چنانچہ حمد و مدح اپنے متعلق کے اعتبار سے عام ہے اور مورد کے اعتبار سے خاص ہے مگر شکر مورد کے اعتبار سے عام ہے لیکن متعلق کے اعتبار سے خاص ہے۔ مثال کے طور پر کسی دولتمند نے کسی غریب کو سو روپئے عنایت کئے غریب نے زبان سے کہا آپ کا شکریہ تو یہاں حمد بھی اور شکر بھی ہے حمد اس طور پر ہے کہ اختیاری خوبی پر زبان سے تعریف کی ہے اور شکر اس طور پر ہے کہ نعمت کے مقابلہ میں ہے لیکن اگر بغیر کسی احسان کے کسی نے کسی کی زبانی تعریف کی تو یہاں مدح تو ہے لیکن شکر نہیں کہ شکر نعمت کے مقابلہ میں پایا جاتا ہے اور یہاں بغیر نعمت تعریف ہے اور اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دی اس نے ہاتھ اٹھا کر واہب کی تعظیم کا اشارہ کیا تو یہاں شکر ہے حمد و مدح نہیں کہ یہ تعریف زبان سے نہیں۔ حمد و شکر کے درمیان ایک فرق یہ بھی کیا جاتا ہے کہ حمد کے مفہوم میں جس انعام کا اعتبار ہے یہ انعام عام ہے کہ حامد کو بھی پہنچے یا غیر حامد کو پہنچے اسی طرح مدح، حی (زندہ) غیر حی (جس میں زندگی نہ ہو) فاعل مختار، فاعل غیر مختار سب کو حاصل ہوتی ہے پس اگر کسی نے "المدح لله" کہا تو اس لفظ مدح سے تعریف کرنا گرچہ مدح ہے مگر رب تعالیٰ کے فاعل مختار ہونے پر دلیل نہیں بنتی ۔لیکن اگر "الحمد لله" کہا تو اس میں حمد بھی ہے اور رب تعالیٰ کے فاعل مختار ہونے پر دلیل بھی غرض ارشاد "الحمد لله" اس عقیدہ حقہ کا مظہر ہوتا ہے کہ اس طرح حمد کرنے والا اقرار کرتا ہے کہ کائنات کا پروردگار موجب بالذات نہیں ہے جیسا کہ فلاسفہ کا عقیدہ ہے بلکہ وہ فاعل مختار ہے۔ اسی طرح "الحمد لله ، الشكر لله" سے بھی اولیٰ وافضل ہے کہ "الحمد لله" میں رب تعالیٰ کی حمد وثنا ان تمام انعامات کے سبب سے ہے جس کا اس ذات سے صدور ہوا خواہ ان انعامات سے حامد کو کچھ ملے نہ ملے برعکس شکر کے کہ شکر اس انعام کے سبب ہوتا ہے جو شاکر کو ملتا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی شک نہیں کہ حمد سے تعریف کرنا شکر کے بہ نسبت افضل ہے چونکہ الحمد لله کہہ کر بندہ گویا یہ کہتا ہے اے مولا! تو مجھے عطا کر نہ کر تیرا انعام سارے جہاں والوں کو مل رہا ہے اسی لئے تو ہی حمد عظیم کا مستحق ہے۔ اس مقام پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ مصائب و آلام اور آفات و بلیات کے دفع ہونے پر رب تعالیٰ کی جو تعریف ہوتی ہے وہ حمد کہلاتی ہے اور نعمتوں کی عطا پر جو تعریف ہوتی ہے وہ شکر ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ نعمت دفع بلا کی بہ نسبت نعمت عطیات کہیں زیادہ ہے اور نعمت دفع بلا قلیل ہے تو آخر کثیر کو چھوڑ کر الحمد لله سے نعمت دفع بلا جو قلیل ہے کو کیوں ذکر کیا۔

جواب: اعتراض مذکور کے کئی جواب ہیں **(اول):** یہ کہ الحمد للہ سے حمد کرنے والا گویا یہ کہتا ہے کہ اے رب تعالیٰ تیری قلیل وکثیر دونوں نعمتوں میں سے جب میں قلیل نعمت، دفع بلا پر اس طرح حمد وثنا کر رہا ہوں تو کثیر نعمت کے اعطاء پر کس قدر مدح کرونگا۔ (**دوم**) یہ ہے کہ نعمت دفع بلا غیر متناہی ہے اور نعمت اعطاء متناہی ہے اور غیر متناہی نعمت پر حمد افضل ہے بہ نسبت متناہی نعمت پر شکر کے (**سوم**) یہ ہے کہ دفع مضرت بہ نسبت جلب منفعت کے اہم ہے اس لئے الحمد للہ سے دفع مضرت کی نعمت پر حمد کرنا اہم ہے۔ (رازی صفحہ ۱۷۹ ج:۱)

فائدہ (۲): ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' نحوی اعتبار سے جملہ اسمیہ ارشاد ہوا، جملہ فعلیہ ارشاد نہ ہوا، اس کی کئی وجہیں ہیں۔

(۱) ''احمد اللہ'' (میں اللہ کی حمد کرتا ہوں) سے ایسا شبہ ہوتا ہے کہ بندۂ حامد کے حمد سے حدوث حمد ہوا ہے اور بندہ اس کی حمد پر قادر ہے جب کہ الحمد للہ سے ایسا شبہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ حمد حامدین اور شکر شاکرین سے پیشتر ہی محمود ہے خواہ کوئی مخلوق اس کی حمد کرے نہ کرے وہ ازل سے ابد تک محمود ہے۔

(۲) ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کا مفہوم یہ ہے کہ حمد وثنا اللہ تعالیٰ کا حق اور اس کی ملک ہے چونکہ اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی انگنت انعامات اور بے شمار احسانات کے سبب سے حمد کا مستحق ہے پس جب بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ حمد رب تعالیٰ کا حق ہے جس کا وہ لذاتہ مستحق ہے اس کے برعکس بندہ جب احمد اللہ کہتا ہے تو یہ لفظ رب تعالیٰ کے لئے حمد لذاتہ کے استحقاق پر دلالت نہیں کرتا ہے اور یہ معلوم کہ جو لفظ رب تعالیٰ کے لئے حمد لذاتہ کے استحقاق پر دلالت کرے وہ بہر حال اولی وافضل ہوگا صرف شخص واحد کے حمد کرنے سے جس میں استحقاق حمد پر دلالت نہیں ہوتی۔

(۳) ''احمد اللہ'' کے لفظ سے گرچہ حمد ہو جائیگی لیکن ایسی حمد ہوگی جو اس کی شایان شان نہ ہوگی لیکن جب الحمد للہ سے حمد کرے تو یہ حمد اس کے شایان شان ہے کیونکہ بندہ جب ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کہتا ہے تو گویا یہ کہتا ہے کہ میں کیا ہوں کہ میں اس کی حمد کر سکوں وہ تو جملہ حامدین کی تمام حمدوں کے ساتھ محمود ہے مثال کے طور پر اگر کسی نے آپ سے پوچھا کہ کیا فلاں شخص کا آپ پر کوئی احسان ہے؟ آپ نے جواب میں کہا ہاں تو اس میں یقیناً اس کی حمد ہے لیکن یہ معمولی تعریف ہے اس کے برعکس مذکورہ سوال کے جواب میں اگر یہ کہا کہ میں ہی کیا اس کے احسانات تو جملہ خلائق پر ہیں تو اس لفظ سے حمد اکمل محامد کے ساتھ حمد ہے۔

(۴) حمد صفت قلب سے عبارت ہے اور وہ یہ کہ اعتقاد رکھنا اس بات کا کہ وہ ذات محمود کمال فضل فرمانے والا منعم حقیقی اجلال وتعظیم کا مستحق ہے۔ اب اگر قائل نے ''احمد اللہ'' سے تعریف کیا حالانکہ اس کا قلب ذات محمود کی شایان شان

تعظیم اور مناسب حمد سے خالی ہے یا کم از کم غافل ہے تو کاذب ہوگا کہ زبان سے تو تعریف کر رہا ہے لیکن اس کا قلب و اعتقاد تعریف سے خالی ہے اس کے برخلاف اگر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے حمد کیا تو خواہ اس کا قلب حمد سے غافل ہو خواہ اس کے قلب میں اجلال و تعظیم باری تعالیٰ مستحضر نہ ہو بہر صورت وہ اپنے قول میں صادق ہوگا کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کا معنی یہی ہے کہ حمد اللہ کا حق ہے اور اس کی ملک ہے اور یہ معنی قلب کے حمد کے معنی کے ساتھ مشغول ہونے کی صورت میں بھی حاصل ہے اور غافل ہونے کی صورت میں بھی حاصل ہے اس کی نظیر کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ'' ہے کہ اس کلمہ میں تکذیب کو کسی طرح دخل نہیں یعنی یہ جملہ کاذب نہیں ہوسکتا بخلاف قول ''اشھد ان لا الہ اللہ'' کے کہ کبھی بندہ اپنے قول ''اشھد'' میں کاذب ہوتا ہے چنانچہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے منافقین کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا ''وَاللّٰهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ'' اسی راز کی وجہ سے کہ بندہ ''اشھد'' کہنے میں جھوٹ بول سکتا ہے کلمات آذان میں اشھد کہنے کے بعد اختتام آذان صرف کلمہ لا الہ اللہ پر کیا گیا تا کہ ابتدا کی شہادت میں اگر وہ جھوٹا ہے تو انتہاے اذان میں جھوٹ کے بعد بھی حقانیت خود اسی کی زبان سے ادا ہو جائے غرض کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، احمد للہ'' کی بہ نسبت کئی وجوہ سے افضل و اعلیٰ ہے اس لئے کلام باری میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ارشاد ہوا۔

فائدہ (۳): ارشاد ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کے لام کے بارے میں چند اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ لام اختصاص کے لئے ہے جیسے ''الجل للفرس'' دوسرا یہ کہ لام ملک کے لئے ہے جیسے ''الدار لزید''، تیسرا یہ کہ لام قدرت و استعلاء کیلئے ہے جیسے ''البلد للسلطان'' ایسے ہی لِلّٰهِ میں لام اختصاص کا ہوسکتا ہے کیونکہ اللہ کثرت احسانات بے انتہا فضل و کرم اور غایت جلال کی وجہ سے لائق ہے کہ حمد صرف اسی کے ساتھ خاص ہو، لِلّٰهِ ممیں لام ملک کا بھی ہوسکتا ہے چونکہ معلوم ہے کہ اللہ کل کا مالک ہے جب کل کا مالک ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے لئے تمام مخلوقات کی حمد کا بھی مالک ہے۔ یونہی لام استعلاء اور قدرت کا بھی ہوسکتا ہے کہ قدرت و استعلاء حقیقت میں اسی کی شان کے لائق ہے کیونکہ وہ واجب لذاتہ ہے اور اس کے علاوہ سب ممکن لذاتہ ہیں اور واجب لذاتہ کو ممکن لذاتہ پر قدرت و استعلاء حاصل ہے پس تینوں صورتوں میں الحمد للہ کا معنی بایں طور کر سکتے ہیں کہ حمد اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے حمد اللہ کی مِلک اور اس کا مُلک ہے۔ اللہ حامدین کی حمد پر مستولی ہے کہ سب پر مستولی اور مستعلی ہے۔

فائدہ (۴): 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں آٹھ حروف ہیں اور جنت کے بھی آٹھ ہی دروازے ہیں پس جو خلوص قلب کے ساتھ الحمد للہ کے آٹھوں حروف کا ورد کرے گا وہ جنت کے آٹھوں دروازوں کا مستحق ہوگا۔

فائدہ (۵): الحمد لفظ مفرد ہے اس پر ال حرف تعریف کا داخل ہے اور یہ معلوم ہے کہ الف لام کی چار قسمیں ہیں۔عہد خارجی، عہد ذہنی، جنسی، استغراقی، پس الف لام کے ذریعہ سے اشارہ حقیقت کے حصہ معینہ کی طرف ہوگا یا حقیقت کی طرف اگر معین و مشخص کی طرف اشارہ ہو تو عہد خارجی کہلاتا ہے۔اور اگر حقیقت کی طرف اشارہ ہو تو اس کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ حقیقت من حیث ھی ھی کی طرف اشارہ ہوگا یا حقیقت من حیث وجودھا فی ضمن بعض افرادھا کی طرف (یعنی بعض افراد کے ضمن میں پائے جانے کی حیثیت سے) یا پھر من حیث وجودھا فی ضمن جمیع افرادھا کی طرف (یعنی جمیع افراد کے ضمن میں پائے جانے کی حیثیت سے) اشارہ ہوتا ہے۔اول کو جنسی، دوم کو عہد ذہنی اور سوم کو استغراقی کہتے ہیں۔ یہاں الحمد میں الف لام عہد ذہنی اور عہد خارجی کا نہیں ہوسکتا۔عہد خارجی کا اس لئے نہیں ہوسکتا کہ حمد کا کوئی فرد معین و مشخص مخاطب کے نزدیک موجود نہیں کہ اس کی طرف اشارہ کیا جائے یونہی عہد ذہنی کا بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ مقام حمد کے منافی ہے اس لئے کہ مقام حمد یہ ہے کہ جمیع حمد وثناء کو اللہ رب العزت کے لئے ثابت مانا جائے اور عہد ذہنی سے بعض افراد غیر معین کی طرف اشارہ ہوتا ہے لہٰذا جنسی ہونا یا استغراقی ہونا متعین ہوگیا۔ اگر جنسی ہے تو الف لام سے اشارہ اس حقیقت حمد کی طرف ہوگا جس کو ہر شخص جانتا ہے یعنی جنس ثنائے جمیل کا اختصاص باری تعالیٰ کے لئے ہے اور ظاہر ہے کہ جنس حمد سے حمد کثیر ہی ثابت ہوگی جو استغراقی کو بھی شامل ہوگا کہ حمد باری تعالیٰ میں قلیل کی گنجائش نہیں۔اور اگر الف لام استغراقی ہے تو معنی ظاہر ہے کہ تمام افراد حمد ذات باری تعالیٰ کے لئے خاص ہیں کیونکہ جتنی بھی نعمتیں اور خیرات ہیں سب کا عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے خواہ وہ نعمتیں بلا واسطہ ہوں یا بالواسطہ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے "وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" (النحل/53)

الحمدللہ کے ارشاد میں جہاں صراحتاً باری تعالیٰ کی ثنائے جمیل ہے وہیں رب تعالیٰ کے حی قادر، مرید اور عالم ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ جمیع محامد کا استحقاق صرف اسی ذات کے لئے ہوسکتا ہے جو ان صفات کا جامع ہو۔ چونکہ حمد کی تعریف گذر چکی کہ حمد محاسن اختیاریہ پر تعریف کرنا اور افعال اختیاریہ اسی سے صادر ہوسکتے ہیں جو حی، قدرت ارادہ اور علم کے اوصاف سے متصف ہو۔

فائدہ (۶): اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اصل کے اعتبار سے بعض اہل علم کے نزدیک منصوب تھا کہ اصل میں "حمداً لله" تھا بعض حضرات نے مفعول بہ ہونے کی وجہ سے اور بعض نے مفعول مطلق کی وجہ سے منصوب قرار دیا ہے مفعول بہ کی صورت میں "نوجد" مقدر ہے اصل عبارت "نوجد حمداً لله" ہے۔ اور مفعول مطلق کی صورت میں اصل عبارت "نحمد الله حمداً" ہے لیکن مفعول بہ کے بالمقابل مفعول مطلق ماننا انسب ہے مگر اس کے لئے مصدر کے ہم

معنی ایک فعل ناصب کا ہونا لازم ہے، اس مقام پر یہ فعل محذوف ہے اور مصدر کو فعل محذوف کے لفظاً ومعناً قائمقام مان لیا گیا ہے رہا یہ امر کہ یہاں آخر فعل ناصب کو مصدر کی وجہ سے کیوں حذف کر دیا گیا تو اس کا جواب قواعد نحو میں مذکور ہے وہ یہ کہ اگر مصدر کے بعد فعل کا فاعل یا مفعول بطور اضافت یا حرف جر کے ساتھ مذکور ہو اور وہ مفعول مطلق بیان نوع کے لئے نہ ہو تو اس صورت میں فعل کا حذف کرنا قیاساً واجب ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں بھی یہ صورت متحقق ہے کیونکہ اس جگہ لفظ اَللّٰه جو "نحمد" کا مفعول ہے وہ حمد کے بعد بطور حرف جر کے مذکور ہے لہذا فعل کو حذف کرنا ضروری ہوا۔ الغرض اصلی حالت اعرابی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی نصبی تھی اسی بنا پر بعض لوگوں نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کو الف لام داخل ہونے کے باوجود بھی منصوب پڑھا ہے مگر یہ قرأت شاذہ ہے البتہ اکثر علماے کرام اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کو جملہ اسمیہ مانتے ہیں بایں طور کہ لفظ الحمد مبتدا واقع ہے اور ل حرف جار اسم جلالت مجرور سے ملکر خبر ہوگی۔ غرض نصب سے رفع کی طرف عدول کر لیا کہ مرفوع اس مقام پر منصوب سے زیادہ بہتر ہے وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ جملہ اسمیہ ہوگا جو ثبوت و دوام پر دلالت کرتا ہے برخلاف منصوب کے کہ اس صورت میں فعلیہ ہوگا جو ثبوت و دوام نہیں بلکہ حدوث وتجدد پر دلالت کرتا ہے اور ثبوت و دوام حدوث وتجدد سے بہتر ہے۔ یہاں یہ بھی لکھنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں بعض لوگوں نے اَلْحَمْدُ کی دال کو لِلّٰهِ کے لام کے تابع کر کے اَلْحَمْدِ لِلّٰهِ بکسر دال پڑھا ہے اسی طرح لِلّٰهِ کے لام کو دال کے اعراب کے تابع کر کے اَلْحَمْدُ لُلّٰهِ بضم اللام پڑھا ہے۔ اول قول حضرت حسن بصری کی طرف منسوب ہے ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ دونوں گرچہ دو کلے ہیں مگر ظاہری استعمال میں کلمہ واحدہ کے منزلہ میں ہیں اس لئے ایک حرف کو دوسرے کے تابع مانکر اتباع کا حکم نافذ کر دیا گیا۔

فائدہ (۷): اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد "اَلْحَمْدُ لُلّٰهِ" جس طرح صراحتاً دال ہے کہ محمود حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح عقل بھی دال ہے کہ محمود درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ عقلی طور پر کئی وجہیں ہیں۔

۱: چونکہ کوئی بندہ اگر کسی پر انعام واکرام کرتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندہ منعم کے قلب میں اکرام کا داعیہ اور سخاوت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اگر انعام واکرام کا داعیہ پیدا نہ کرتا تو ہرگز وہ سخاوت نہ کرتا چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے مالدار دولتمند کو روپئے پیسے کا انبار ہوتا ہے لیکن وہ ایک حبہ کسی کو دینے کا روادار نہیں ہوتا اور بہت سے قلیل المال حضرات اپنا پورا اثاثہ لٹا دیتے ہیں اس کا صاف مطلب ہے کہ اس کے قلب میں جذبہ سخاوت اور داعیہ انعام کا فقدان ہے اس کے برخلاف اس غریب کے دل میں داعیہ بھرپور انداز میں موجود ہے پس بندہ منعم

میں جو اکرام کا داعیہ ہے وہ رب تعالیٰ کے خلق کرنے کے سبب سے ہے اس لئے حقیقی منعم اللہ تعالیٰ ہے۔لہذا حمد حقیقی صرف اسی کو سزاوار ہے۔

۲: اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو بھی کسی پر انعام کرتا ہے وہ اس انعام کے بدلے کسی نہ کسی عوض کا طلبگار ضرور ہوتا ہے۔خواہ وہ عوض اخروی ہو ثواب کی صورت میں یا دنیوی ہو کہ اس کی ثناء کی جائے گی یا حق کا ادا کرنے والا کہا جائے گا یا نفس کو بخل جیسی عادت قبیحہ سے آزاد کرنے والا ہوگا۔وغیرہ اور عوض کا طلب گار منعم نہیں ہوگا اس لئے طالب عوض درحقیقت مستحق حمد بھی نہ ہوگا مگر اللہ عز شانہ تعالیٰ کہ وہ کامل لذاتہ ہے اور جو کامل لذاتہ ہوتا ہے وہ کمال کو نہیں طلب کرتا کہ یہ تحصیل حاصل ہے غرض اس کی عطائیں بلاغرض وعوض جود محض اور احسان محض ہیں اس لئے یقیناً مستحق حمد حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

۳: موجودات میں جتنی نعمتیں ہیں سب ممکن الوجود ہیں اور ہر وہ چیز جو ممکن الوجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ایجاد کرنے سے ہے خواہ مستقلا ایجاد کرے یا کسی واسطہ سے چنانچہ ارشاد ہے ”وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ“(النحل: ۵۳) اور حمد کا معنی یہی ہے کہ انعام پر ثنا ہو اور انعام اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے تو ثنا و حمد کا بھی وہی مستحق ہے۔

۴: تین امور کے پائے جانے کے بعد ہی نعمت کامل ہوتی ہے۔ایک یہ کہ نعمت منفعت ہو اور انتفاع بالشئ مشروط ہے کہ وہ حی مدرک ہو اور اس کا حی مدرک ہونا اللہ تعالیٰ کی ایجاد ہی سے ہوسکتا ہے۔دوسرا امر یہ کہ نعمت منفعت کاملہ اسی وقت ہوسکتی ہے جب وہ ضرر اور غم کے شائبہ سے خالی ہو اور منافع کا ضرر سے خالی ہونا بغیر امر الٰہی کے نہیں ہوسکتا۔تیسرے یہ کہ منفعت، نعمت کاملہ اسی وقت کہی جائے گی جب وہ انقطاع کے خوف سے مامون ومحفوظ بھی ہو اور نعمتوں کا انقطاع کے خوف سے مامون ومحفوظ ہونا بغیر رب کے نہیں ہوسکتا پس نعمت کاملہ سوائے اللہ تعالیٰ کے حاصل نہیں ہوسکتی اس لئے لازم ہے کہ حمد کامل کا مستحق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہو

فائدہ (۸): حمد کی تعریف سے معلوم ہوا کہ حمد، غیر کی تعریف کرنا اس سبب سے کہ وہ فضل وانعام فرمانے والا ہے لیکن پھر یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو اس کی نعمتوں کا شعور بھی ہو کہ منعم کی طرف سے ہمیں یہ نعمتیں پہنچی ہیں ظاہر ہے کہ اگر نعمتوں کا شعور وادراک ہی نہ ہوگا تو پھر کوئی کیونکر حمد وشکر بجالائے گا بلکہ ایسوں کو حمد وشکر کی تکلیف دینا ہی ممتنع ہوجائے گا اور یہ بھی معلوم کہ انسان ساری نعمتوں کا اعداد وشمار نہیں کرسکتا اور جب اعداد وشمار نہیں کرسکتا تو حمد الٰہی بھی کما حقہ ادا نہیں کرسکتا اس لئے انسان کما حقہ حمد وشکر بجالانے میں عاجز ہے اس پر بھی کئی وجہیں دال ہیں۔

اول: انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ عقل انسانی اس کا ادراک واحاطہ نہیں کرسکتی ارشاد ربانی ہے "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (ابراہیم ۳۴) جب تمام نعمتوں پر اطلاع یابی ممتنع ہے تو حمد الٰہی پر کما حقہ قدرت بھی ممتنع ہے۔

دوم: بیشک انسان حمد وشکر کے لئے اسی وقت کمر بستہ ہوسکتا ہے جب اس کو رب محمود اس حمد وشکر کی قدرت اور توفیق ارزانی فرمائے پس جب اللہ تعالیٰ نے بندہ کے دل میں حمد وثنا کے بجالانے کا داعیہ پیدا فرمایا اور اس بندہ سے حمد وشکر کے روکنے والے (موانع اور عوائق) کو دور فرمایا تو یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات سے ہی ہیں غرض دوسری نعمتوں پر شکر بجانے لانے کے لئے اس عظیم نعمت داعیہ پر شکر کرنا واجب ہوا پھر اس نعمت داعیہ پر شکر کے لئے بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس داعیہ پر شکر کی قدرت پیدا فرمائے پھر یہ قدرت وداعیہ بھی نعمت الٰہی ہے اس طرح بندہ جب شکر کی توفیق وقدرت من اللہ اور داعیہ حمد جیسی نعمت کا شکر نہیں کرسکتا تو دیگر نعمتوں کا شکر کہاں سے بجالائے گا اگر کوئی دیگر نعمتوں پر شکر بجالانا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ غیر متناہی مرتبہ پہلے داعیہ شکر کی نعمت پر شکر بجالائے اور غیر متناہی مرتبہ شکر بجالانا محال ہے اور جو محال پر موقوف ہوگا وہ بھی محال ہوگا لہذا شکر وحمد باری تعالیٰ جو اس کی شان کے لائق ہے من جہۃ العباد محال ہے۔

سوم: حمد وشکر کا یہ معنی نہیں کہ بندہ صرف اپنی زبان سے الحمدللہ کہہ لے بلکہ حمد وشکر کا معنی یہ ہے کہ بندہ منعم حقیقی اللہ جل مجدہ تعالیٰ کو صفات کمال سے موصوف یقین کرے اور انسان کی عقل وفکر اور اس کا شعور وادراک اس قدر محدود ہے کہ صفات کمال وجلال کا ادارک وتصور ناممکن ہے بلکہ اللہ تعالیٰ شانہ کا کمال وجلال انسانی تخیل وادراک میں آنے سے پاک ہے۔ اور جب کمال وجلال کا تصور ناممکن تو حمد بھی ناممکن۔

چہارم: رب تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کے ذکر وشکر کے ساتھ مشغول ہونے کا معنی یہ ہے کہ منعم علیہ (جس پر رب کا انعام واکرام ہوا ہے) نے اپنے شکر وحمد اور ذکر وثنا کو رب کے عطا کردہ انعام کے مقابل کردیا ہے حالانکہ یہ تصور کئی وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) ایک یہ کہ اللہ کی نعمتیں اتنی کثیر ہیں جن کا شمار ناممکن ہے پس اللہ کی بے انتہا نعمتوں کا مقابلہ شخص واحد کے اعتقاد واحد اور اس کی مختصر سی حمد وشکر کے ساتھ کرنا بعید از قیاس ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ اگر کوئی یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کا حمد وشکر بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی بے انتہا عطا کردہ نعمتوں کے برابر

ہے تو گویا اس نے شرک کیا چنانچہ واسطی نے جو کہا ہے کہ شکر شرک ہے اس کا یہی مطلب ہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ انسان اپنی ذات وصفات اور جملہ احوال میں رب تعالیٰ کی نوازش وکرم اور اس کے انعامات کا محتاج ہے اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ حامدین کی حمد اور شاکرین کے شکر سے بے نیاز ہے لہذا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مقابلہ بندۂ شاکر کے اس شکر وحمد سے کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

مندرجہ بالا باتوں سے ظاہر ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی حمد وشکر کو بجالانے سے عاجز ہے غالباً انہیں باریکیوں کی بنیاد پر ''احمدوا اللہ'' (اللہ کی حمد کرو) نہ ارشاد ہوا بلکہ ارشاد فرمایا کیونکہ اگر ''احمدوا اللہ'' ارشاد ہوتا تو اس کا معنی یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو حمد حقیقی کا پابند ومکلف بنا دیا ہے حالانکہ ایسی حمد کی بندہ کو طاقت وقدرت نہیں اس وقت تکلیف ما لایطاق لازم آتی جو جائز نہیں لیکن جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فرمایا تو اس کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کمال حمد ہے جو اس کی ملک ہے اور اسی کے ساتھ خاص ہے خواہ بندہ اس قسم کی حمد بجالانے پر قادر ہو خواہ نہ ہو بہر حال وہ کمال حمد کا مستحق ہے۔منقول ہے کہ داؤد علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا ''یارب کیف اشکرک وشکری لک لایتم الا بانعامک علی وھو ان توفقنی لذالک الشکر فقال یاداؤد لما علمت عجزک عن شکری فقد شکرتنی بحسب قدرتک وطاقتک'' (رازی صفحہ ۱۸۲/ج:۱)۔

یعنی اے رب میں کیسے تیرا شکر ادا کرسکتا ہوں حالانکہ میرا تیری بارگاہ میں شکر پیش کرنا بغیر تیرے فضل واحسان کے ناممکن ہے اور وہ یہ کہ تو مجھے اپنے شکر کی توفیق ارزانی فرمادے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے داؤد جب تم نے یہ جان لیا کہ تم میرا شکر کرنے سے عاجز ہو یا تم نے میرا شکر ادا کرنے سے اپنی عاجزی کا اعتراف کرلیا تو درحقیقت عاجزی کے اعتراف سے اپنی وسعت وطاقت کے مطابق تم نے میرا شکر ادا کرلیا۔

فائدہ (۹): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے بیشک آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر کسی نعمت کا انعام فرماتا ہے اس وقت اگر بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ دیکھو میرے بندہ کو کہ میں نے اس کو ایسی چیز عطا کی جس کی کوئی حیثیت نہیں لیکن اس نے میری بارگاہ میں وہ چیز پیش کی ہے جس کی قیمت کی انتہا نہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جب بندہ پر انعام واکرام فرماتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ انعام اشیاء معتادہ میں سے ہوگا مثلاً بندہ بھوکا تھا رب تعالیٰ نے اس کے لئے کھانے کا انتظام کیا، پیاسا تھا اس کو سیراب کردیا یا اسے لباس کی ضرورت تھی اللہ پاک نے اس کے لئے لباس کا سامان مہیا کیا پھر کھانے پینے یا پہننے کے بعد جب بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ حامدین میں سے جو کوئی بھی جو حمد بیان کرتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یا ہر وہ حمد جس کو حامدین میں سے کسی نے بھی بجا نہیں لایا لیکن عقل حکم لگاتی ہے کہ وہ بھی وجود حمد میں داخل ہے پس وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے بلکہ تمام وہ حمد جو حاملین عرش و کرسی، فرشتے آسمانوں کے تمام درجات میں مکین ملائکہ قدس کر رہے ہیں اور تمام وہ حمد وثنا جو حضرت آدم سے لیکر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک جملہ گروہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام نے بیان فرمایا پھر تمام اولیائے کرام، علمائے دین، صلحائے امت، بزرگان دین اور شہداء و صالحین اور جملہ مخلوقات نے اب تک بیان کیا اور تا قیامت بلکہ دخول جنت تک بلکہ بعد دخول جنت، جنت میں جنتیوں کا رب تعالیٰ کے ارشاد "دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ان کی دعا اس میں یہ ہوگی کہ اللہ تجھے پاکی ہے اور ان کے ملنے کے وقت خوشی کا پہلا بول سلام ہے اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہے کہ سب خوبیوں کو سراہا اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ (یونس/10) کے مطابق حمد وثنا سب کے سب "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں داخل ہیں بلکہ ابدالآباد اور دھر الداہرین تک حمد وثنا کا غیر متناہی سلسلہ سب ارشاد "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں داخل ہے انہیں وجہوں سے بندہ جب روٹی کے ایک ٹکڑے پر رب تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہتا ہے تو اللہ عز شانہ تعالیٰ فرماتا ہے دیکھو میرے بندے کو کہ میں نے اسے ایک نعمت دی ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں لیکن وہ اس کے بدلے ایسی تعریف کر رہا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے اس عطائے الٰہی پر قلب و روح خوشی سے وجد میں آکر بزبان قال کہتے ہیں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔

نکتہ: یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بندوں پر دنیا میں گو کہ بیشمار ہیں تاہم محدود و متناہی ہیں اور بندہ کا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ذریعہ رب کی حمد بیان کرنا غیر متناہی ہے اور علم منطق سے یہ معلوم ہے کہ غیر متناہی سے جب متناہی ساقط ہوتی ہے تو بقیہ غیر متناہی بچتی ہے۔ اس قاعدہ کے بموجب گویا رب تعالیٰ فرماتا ہے اے بندہ! جب تم نے اس ایک نعمت کے مقابلہ میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا تو جو تمہارے لئے باقی بچا اس کلمہ سے وہ غیر متناہی ہے اس سبب سے بندہ دائمی ثواب اور سرمدی خیرات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ارشاد ربانی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے ایسی سعادتیں اور نیک بختیاں حاصل ہوتی ہیں جنکے بعد کوئی سعادت نہیں اور ایسے خیرات حاصل ہوتے ہیں جن کی نہایت نہیں۔

فائدہ (۱۰): یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ وجود عدم سے بہتر ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ ہر موجود حی ہے کیونکہ ہر موجود اپنی ذات کے عدم کو ناپسند کرتا ہے اگر وجود عدم سے بہتر نہ ہوتا تو عدم کی کراہیت نہ ہوتی۔ جب وجود عدم سے بہتر ہے تو اب یہ خیال کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا جتنی چیزیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہیں سب کے سب اللہ تعالیٰ کے ایجاد

کرنے سے اور اس کے فضل و احسان سے ہیں غرض کہ وجود اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے ارشاد ہے " قَدْ خَلَقْتُکَ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا" خواہ وجود انسان کا ہو یا ملائکہ قدس کا، جنات کا ہو یا حیوانات و بہائم کا، یا نباتات، جمادات کا بحر و برخشک وتر جس کسی کا ہو بہر کیف وجود ہر ایک کے لئے نعمت ہے اس لئے عالم ارواح و عالم اجسام، اور علویات و سفلیات ہیزدہ ہزار عالم میں جو بھی موجود ہے سب پر اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت اور فضل و احسان ہے۔ اور نعمت و رحمت اور فضل و احسان موجب حمد و شکر ہیں چنانچہ بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا ورد کرتا ہے تو اس کا یہ معنی نہیں ہوتا ہے کہ جو نعمتیں حامد کو پہنچی ہیں صرف انہیں نعمتوں پر رب تعالیٰ کا شکر ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ تمام عالمین میں رب تعالیٰ کی طرف سے جتنی بھی نعمتیں صادر ہوئی ہیں ان کی وجہ سے رب تعالیٰ کے لئے ساری تعریف ہے۔ غرض ہر شئ جس کو خلق فرمایا اور ہر معدوم جس کو پردہ عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر فرمایا جیسے نور و ظلمت، سکون و حرکت، عرش و کرسی، ارض و سما، جن و انس، ذات و صفت اور جسم و عرض وغیرہ یا ابدالآباد اور دہر داہرین تک اور تا قیام قیامت جتنی ان گنت اور نا معلوم نعمتیں پیدا فرماتا رہے گا ازل سے ابد تک کی ساری نعمتوں کے سبب تمام کے تمام حمد و ثنا صرف اللہ کے لئے ہے اس لئے میں زبان و قلم سے بلکہ ہر ہر رونگٹے سے گواہی دیتا ہوں کہ کل کی کل حمد و ثنا تیرا ہی حق ہے اور تیری ہی ملک ہے اس میں تیرے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔

فائدہ (۱۱): یہاں ایک سوال قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ تسبیح کا ذکر تحمید پر مقدم ہوتا ہے چنانچہ جہاں کہیں وارد ہوا ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ کے بعد ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وارد ہوا جب ایسا ہے تو مقام حمد میں سُبْحَانَ اللّٰہِ کی بجائے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے آغاز کیوں کیا؟

جواب: یہ ہے کہ تحمید کی دلالت تسبیح پر دلالت تضمنی کے طور پر ہو جاتی ہے وہ اس طرح کہ تسبیح کی دلالت اس پر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں تمام آفات و نقائص اور جملہ شائبہ امکانات سے پاک و منزہ ہے اور تحمید کی دلالت اس پر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ نقائص و عیوب سے پاک ہونے کے ساتھ تمام مخلوقات پر احسان فرمانے والا، ان پر انعام و اکرام کرنے والا اور ان پر بڑا مہربان ہے۔ غرض تسبیح سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے تام و کمال ہونے پر اشارہ ہے اور تحمید سے اشارہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام سے اتم اور کامل سے بھی اکمل اور بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع فرمایا اور سُبْحَانَ اللّٰہِ نہ ارشاد ہوا یہ وجہ قوانین حکمیہ سے ماخوذ ہے لیکن جو وجہ قوانین اصولیہ سے ماخوذ ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے محسن اور اس کا منعم حقیقی ہے مگر انعام و احسان سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کو تمام معلومات کا علم ہوتا کہ وہ بندوں کے جملہ حاجات کو جان سکے، پھر جملہ ممکنہ مقدورات پر قادر

ہونا بھی ضروری ہے تا کہ بندوں کو جس چیز کی ضرورت ہے یا بندے جن کے محتاج ہیں اس کے خلق و ایجاد پر وہ قادر ہو نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جملہ حاجات سے بے نیاز، غنی بھی ہو ظاہر ہے کہ وہ عالم قادر غنی نہ ہوگا تو بندوں کی حاجات کو کیوں کر پورا کرے گا اور بے نیاز نہ ہوگا بلکہ اگر خود معاذ اللہ محتاج ہو تو اپنی حاجتوں کی ہی تکمیل میں لگا رہے گا تو بندوں کی حاجت روائی کیسے کریگا پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا محسن ہونا اسی صورت میں تام ہوگا جب وہ جملہ نقائص و آفات، شائبہ امکانات اور احتیاجات سے پاک و منزہ ہو اس لئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کرنا زیادہ مناسب اور راجح ہے۔

فائدہ (۱۲): کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ گو کہ جملہ اسمیہ ہے مگر ایسا جامع ہے کہ ماضی و مستقبل دونوں زمان سے اس کا تعلق ہے اسکا تعلق ماضی سے ہونا بہت ظاہر ہے چونکہ نعمت سابقہ ہی پر بندہ الحمد للہ کہہ کر شکر ادا کرتا ہے اور یہی زمانہ مستقبل میں بھی اس کے لئے تجدد نعم کے حصول کا سبب بنتا ہے قرآن حکیم میں اس طرف اشارہ ہے "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" اگر احسان مانو گے تو میں تمہیں اور دونگا۔ (ابراہیم ۷) اور عقل سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے چنانچہ نعمت سابقہ منعم کی خدمت کے اقدام اور اسکی طاعت کی بجا آوری کا عقلا تقاضا کرتی ہے۔ پھر جب بندہ شکر میں مشغول ہوجاتا ہے تو حامد کی عقل و قلب پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی معرفت و محبت کے دروازے وا شگاف ہوجاتے ہیں یقینا یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے پس اس معنی کر کہ حمد کا تعلق زمانہ ماضی سے ہے بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتا ہے تو جہنم کے سارے دروازے اس کے لئے مقفل کر دیئے جاتے ہیں اور اس معنی کر کہ اس کا تعلق مستقبل سے بھی ہے تو اسی حمد سے اس کے لئے جنتوں کے سارے دروازے کھول دیئے جائیں گے غرض ماضی میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی تاثیر کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ بندہ حامد کے لئے اللہ تعالیٰ سے حجابات کے تمام دروازے مسدود اور موانع ختم ہوجاتے ہیں اور مستقبل میں اسکی تاثیر کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ معرفت الٰہی کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کے درجات کی کوئی انتہا نہیں تو جس بندہ سے حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں اس کے لئے بھی معرفت الٰہی کے معارج و درجات کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی۔ یہ مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب بندہ کی زبان رب تعالیٰ کی حمد و ثنا میں الحمد للہ سے رطب اللسان رہتی ہے غرض اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ معرفت الٰہی کے معارج و درجات تک پہنچنے کی کنجی ہے غالباً اس لئے بھی سورہ حمد کا نام سورہ فاتحہ رکھا گیا ہے۔

فائدہ (۱۳): گذشتہ تفصیلات سے کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی دینی و دنیاوی برکات و حسنات کا بہت کچھ اندازہ ہوا ہوگا ان

برکتوں کو دیکھ کر کون ایسا مسلمان ہوگا جو اس کلمہ مبارکہ سے رب کی حمد وثنا بیان کر کے سعادت دارین حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ مگر ان سب کے باوجود کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے ورد کے لئے نہایت مناسب مقام اور حسین موقع ضروری ہے، بے موقع و بے محل استعمال سے نہ کہ صرف اس لفظ کی برکات اور اس کے مقاصد فوت ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات ناجائز و گناہ بھی ہوجاتا ہے اس سلسلہ میں مشہور صوفی بزرگ حضرت سری سقطی کا واقعہ بہت مشہور ہے چنانچہ حضرت سری سقطی سے کہا گیا کہ طاعت کی بجا آوری کیسے ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ صرف ایک بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنے کی وجہ سے مسلسل تیس سال سے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ پڑھ رہا ہوں لوگوں نے پوچھا آخر ایسی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا بغداد میں زبردست آگ لگ گئی تھی بہت ساری دکانیں اور گھر و مکانات جل کر خاکستر ہو گئے تھے اس میں میری بھی ایک دوکان تھی لوگوں نے مجھے خبر دی کہ آپ کی دکان نہیں جلی ہے اس پر میں نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی دکانیں جل جانے کے وقت میری اپنی دکان کے محفوظ رہے جانے کی وجہ سے میں نے خوشی کا اظہار کیا حالانکہ دینداری اور مروت کا حق وتقاضا یہ تھا کہ میں خوشی کا اظہار نہ کرتا بلکہ لوگوں کے غم میں شریک ہوتا یہی وجہ ہے کہ میں تیس سال سے الحمد للہ کہنے کی وجہ سے استغفار کر رہا ہوں اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' گرچہ عظیم المرتبت اور جلیلۃ الشان حمد ہے مگر اس کے استعمال کے لئے موقع ومحل کی رعایت بہرحال لازم ہے۔

بیشک اللہ عزشانہ کی نعمتیں بے انتہا و بے شمار ہیں اس کے باوجود باعتبار قسمت دو نوع میں منقسم ہیں، نعمت دنیا، نعمت دین، ظاہر ہے کہ دنیاوی نعمتوں کے بالمقابل دینی نعمتیں ہزار ہا درجہ افضل ہیں اور یہ افضلیت کئی وجہوں سے ثابت ہے جب دینی نعمتیں دنیاوی نعمتوں کے بالمقابل افضل ہیں تو عاقل پر ضروری ہے کہ کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی جلالت شان وعلو مرتبت کے پیش نظر اس کلمہ شریفہ کو نعمت دنیا کے بالمقابل نعمت دین کے حصول کے لئے زیادہ ذکر کرے۔ پھر نعمت دینی کی دو قسمیں ہیں، اعمال جوارح، اعمال قلب، ظاہر ہے کہ اعمال قلب، اعمال جوارح سے افضل و اشرف ہیں۔ اسی طرح نعمت دنیا کی بھی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ دنیاوی نعمت کو اس حیثیت سے کہ وہ نعمت ہے دیکھا جاتا ہے دوسرا دنیاوی نعمت کو اس حیثیت کہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ منعم کا عطیہ ہے ظاہر ہے کہ دوسری افضل و اعلیٰ ہے غرضیکہ ان مقامات کا خیال ولحاظ ضروری ہے کہ کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا ذکر اپنے مناسب ولائق موقع ومحل پر ہو سکے۔

فائدہ (۱۴): حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کا جب جسد خاکی تیار ہوا اور اس میں روح ڈالی گئی تو روح سرہ (ناف) تک پہنچی تھی کہ آپ کو چھینک آئی اس وقت سب سے پہلے آپ کی زبان مبارک سے جو کلمہ ادا ہوا تھا وہ یہ تھا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" یہ انسان اول کے ابتدائے افرینش کا حال ہے پھر جب بعد قیامت مستحقین جنت، جنت میں جائیں گے تو ان کا آخری کلمہ بھی الحمدللہ رب العلمین ہوگا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اوران کی دعا کا خاتمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر ہوگا۔(یونس:۱۰) اس سے ظاہر ہے کہ عالم کی ابتدا بھی الحمدللہ کے ذکر سے ہے اوراس کی انتہا بھی ذکر الحمدللہ پر ہوگی۔

اس لئے اے انسان تو کوشش اس بات کی کر کہ تمہارے اعمال کا آغاز بھی اوراس کی انتہاء بھی اسی کلمہ کے ساتھ مقترن ہو کیونکہ انسان عالم صغیر ہے تو ضروری ہے کہ اس کے احوال عالم کبیر کے احوال کے مناسب ہو جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لاشعوری اور بے حسی کے عالم میں بھی پیدائش کے بعد آغاز حیات میں بچہ کے کان میں آذان و اقامت کے مبارک کلمات کہتے ہیں اور جب اس کی موت ہوتی ہے تو انتہاے حیات پر اس کے لئے نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ جب حیات کی ابتدا و انتہا تکبیر الٰہی سے ہے تو درمیانی مدتوں میں جب تیری عقل وشعور اور حواس کو کمال وپختگی آ چکی ہے تو ہر گز ان کلمات کے ورد سے غفلت نہ کرنا تا کہ تیری درمیانی مدت آغاز وانتہا کے برابر ہو جائے۔

فائدہ (۱۵): ارشاد باری تعالیٰ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" سے فرقہ جبریہ وقدریہ نے اپنے اپنے عقائد ونظریات کی صحت پر استدلال قائم کیا ہے۔ فرقہ جبریہ جو انسان کو پتھر کی طرح مجبور محض تصور کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ انسان پتھر کی طرح جماد ہے اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہر فعل حسن وقبیح کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے انسان کا سب بھی نہیں ہے۔ اس فرقہ غیر مرضیہ نے اپنے موقف پر مندرجہ ذیل وجوہ سے استدلال کیا ہے۔

دلائل جبریہ، اول: یہ عقلی بات ہے کہ جس کا فعل اشرف بزرگتر اور کامل ہو اور جس سے اعلیٰ وافضل نعمت کا صدور ہو ظاہر ہے کہ وہ حمد کا زیادہ مستحق ہوگا۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مخلوقات میں اشرف اور بزرگ ایمان ہے پس ایمان اگر بندہ کا فعل ہو جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے تو لازم آئے گا کہ بندہ رب تعالیٰ کی بہ نسبت حمد کا زیادہ مستحق ہو جائے اور یہ بداہتاً باطل تو معلوم ہو گیا کہ ایمان اللہ تعالیٰ کے خلق سے ہے نہ کہ بندہ کے خلق سے۔

دوم: نعمت ایمان پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہنا اس پر امت کا اجماع ہے اگر ایمان بندہ کا فعل ہو اللہ تعالیٰ کا فعل نہ ہو تو بندہ کا نعمت ایمان پر الحمدللہ کہنا باطل وقبیح ہوگا کیونکہ فاعل نے جو کام نہ کیا ہو اس پر اس کی حمد کرنا بداہتاً باطل ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے "وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا" وہ چاہتے ہیں کہ بے کئے پر ان کی تعریف

ہو۔(آل عمران:۱۸۸) پس اگر ایمان کو فعل الٰہی نہ مانیں فعل عبد مانیں تو نعمت ایمان پر رب کی حمد کرنا کیونکر درست ہوگا یہ تو ایسا ہی ہے کہ فاعل نے فعل کا وجود نہ بخشا پھر بھی اس فعل پر اس کی تعریف کر رہے ہیں جو اس نے نہ کیا یہ سراسر کذب ہے۔

سوم: ارشاد گرامی ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کل حمد اللہ کے لئے ہے جس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے قطعاً کوئی حمد نہیں ہے اور کل حمد اللہ تعالیٰ کے لئے اسی سبب سے ثابت ہے کہ کل نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس میں شک نہیں کہ تمام نعمتوں میں ایمان افضل ترین نعمت ہے تو واجب و لازم کہ ایمان اللہ ہی کی طرف سے ہو فعل عبد سے نہ ہو۔

چہارم: ارشاد رب العزت ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' سے ظاہر ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے خود سے اپنی حمد فرمائی ہے اور یہ معلوم کہ مخلوق کے درمیان مخلوق کی خودستائی معیوب ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن حکیم کا آغاز ہی اپنی ذات کی حمد و تعریف سے کیا ہے جس سے متبادر ہے کہ اللہ عز شانہ کا حال بندہ کے حال سے مختلف ہے چنانچہ جو چیز بندہ کے حق میں عیب ہے وہی رب تعالیٰ کے لئے حسن ہے پس یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ منزہ و مقدس ہے اس بات سے کہ اس کے افعال کو بندہ کے افعال پر قیاس کیا جائے۔ فرقہ جبریہ کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا مسلمہ ضابطہ ہے جس سے اعتزال کے نظریہ اساس پر کھڑی عمارت دھڑام سے منہدم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ تمام افعال کا خالق ہو تو اس کے حق میں کوئی قبح لازم نہیں آتا۔

پنجم: جبریہ نے معتزلہ کے خلاف اس طرح بھی استدلال کیا ہے کہ معتزلی نظریات کے مطابق اللہ تعالیٰ کے افعال کا حسن ہونا واجب ہے نیز یہ بھی واجب ہے کہ افعال باری کے لئے حسن کے علاوہ مزید ایک صفت زائد بھی لازم ہے ورنہ اس کا فعل عبث ہوگا اور وہ اس سے منزہ ہے کہ عبث اس کے حق میں محال ہے پس حسن پر جو زائد صفت ہے ہم اس کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ آیا وہ صفت بھی واجب ہے یا وہ از قبیل تفضّل و احسان ہے اگر واجب ہے جیسے مکلفین کو اس کے اعمال صالحہ کے بدلے اجر و ثواب کا عطا کرنا تو اس میں اس کے لئے استحقاق حمد نہیں کہ جس پر جو چیز واجب ہے اس کی ادائیگی پر اس کے لئے استحقاق حمد نہیں جیسا کہ اگر کسی کا کسی پر ایک دینار قرض آتا ہو اور مستقرض نے مقرض کو وہ دینار ادا کر دیا تو مستقرض حمد کا مستحق نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ صفت از قبیل تفضّل ہے تو بھی مستحق حمد نہیں کہ نقص ہوگا کیونکہ خصم (معتزلہ) کے نزدیک تفضّل و احسان زیادتی حمد کا استحقاق و افادہ کرتا ہے۔ پس اگر وہ تفضّل و احسان نہ

کرے تو وہ حمد کا مستحق نہ ہوگا۔اس صورت میں اس کا ناقص لذاتہ ہونا اور مستکمل بالغیر ہونا لازم آئے گا حالانکہ اللہ عز شانہ کے لئے محال ہے۔

دلائل معتزلہ: اس کے برخلاف معتزلہ کا کہنا ہے کہ ارشاد ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ہمارے ہی نظریہ کے مطابق درست ہے وہ اسطرح کہ حمد کا مستحق علی الاطلاق وہ ذات ہے جس کے فعل میں قبح نہ ہو اور جس کے قضیہ واحکام میں ظلم وجور نہ ہو اور ہمارے نزدیک ہی اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ہے لہذا وہ اعظم محامد واکبر مدائح کا مستحق ہے۔

مگر جبریہ کے مذہب کے مطابق تو رب تعالیٰ کے فعل کا قبیح ہونا اور اس کے قضیے احکام کا ظلم وجور ہونا لازم آتا ہے کیونکہ اس کے مذہب کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی کافر میں کفر کو پیدا بھی کرتا ہے اور پھر عذاب بھی دیتا ہے اور حیوانات کو بغیر عوض الم میں مبتلا کرتا ہے پس اس تقدیر پر کیونکر عقلا وہ حمد کا مستحق ہوگا۔ نیز اللہ عز شانہ تعالیٰ الوہیت کے سبب جس حمد کا مستحق ہے پس وہ اس حمد کا یا تو بندہ پر مستحق ہے۔ یا اپنی ذات پر مستحق ہے اگر بندہ پر حمد کا مستحق ہے تو لازم آئے گا کہ بندہ فعل پر قادر ہے جب تو اس سے جبر کا قول ہی باطل ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ خود اپنی ذات پر حمد کا مستحق ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ذات الٰہی پر خود اپنی تعریف واجب ہے اور یہ بدیہی البطلان ہے غرض ظاہر وثابت ہے کہ قول الحمدللہ مذہب جبر پر نہیں بلکہ نظریہ اعتزال پر ہی درست ہے۔

فائدہ (۱۶): اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا عقلا واجب ہے یا یہ سمعا وشرعاً بھی ثابت ہے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ وجوب شکر شرع سے ثابت ہے چنانچہ ارشاد رب العزت ہے ''وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا'' اور ہم عذاب کرنے والے نہیں جب تک رسول نہ بھیج لیں۔(الاسراء۱۵) اور ارشاد ہے ''رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ'' رسول خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے کہ رسولوں کے بعد اللہ کے یہاں لوگوں کو کوئی عذر نہ رہے۔(النساء:۱۶۵) اس کے برعکس کچھ علماء کا خیال ہے کہ قبل نزول شرع اور بعد نزول شرع مطلقاً شکر واجب ہے اس موقف پر کئی وجوہ سے دلیل قائم ہے۔

اول: ارشاد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے ظاہر ہے کہ یہ حمد علی الاطلاق اس کی ملک اور اس کا حق ہے اور یہ دلیل ہے کہ وہ اس حمد کا قبل نزول شرع مستحق ہے۔

دوم: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ پروردگار عالم رحمن ورحیم کے لئے سب حمد ثابت ہے اب اصول فقہ کا یہ ضابطہ ملحوظ نظر رکھئے وہ یہ کہ حکم جب کسی وصف مناسب پر مرتب ہو تو یہ اس

بات کی دلیل ہوتی ہے کہ حکم اس وصف کے ساتھ معلل ہے۔ پس اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے حمد کو ثابت فرمایا تو اس نے اپنے لئے رب العلمین، رحمن ورحیم اور مالک یوم الدین جیسے اوصاف کو بھی ذکر فرمایا جس کا مفاد یہ ہے کہ تمام حمد اس کے لئے اس لئے ثابت ہے کہ وہ رب العلمین ہے رحمن ورحیم ہے، جب ایسا ہے تو ثابت کہ حمد کا استحقاق اللہ رب العزت کے لئے کل اوقات میں ثابت ہے خواہ نبی کے آنے سے پہلے ہو یا بعد اس لئے کہ ربوبیت اور مخلوق کے ساتھ شان رحیمی کی جلوہ گری پیغمبروں کے آنے پر موقوف نہیں ہے اس لئے حمد بھی پیغمبروں کے آنے پر موقوف نہ ہوگی۔

فائدہ (۱۷): حقیقت حمد یہ نہیں ہے کہ بندہ صرف اپنی زبان سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ادا کرلے، کیونکہ ارشاد ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' حصول حمد کے لئے اخبار ہے اور شئی کی خبر دینا مخبر عنہ کے مغائر ہے اس لئے واجب ہے کہ تحمید الٰہی ہمارے قول الحمدللہ کے مغائر ہو۔ پس منعم کی حمد نام ہے ہر اس فعل کا جو منعم کی تعظیم واحترام کی طرف مشعر ہو اس سبب سے کہ وہ منعم ہو اور فعل تعظیم خواہ قلب سے یا فعل لسان سے یا فعل جوارح سے ہو سب کو عام ہے اس لئے ان تینوں طریق سے امتثال حمد ضروری ہے۔ فعل قلب یہ ہے کہ دل میں اس بات کا اعتقاد ویقین رکھے کہ وہ ذات محمود تمام صفات کمالیہ سے متصف اور جلالت شان کی مالک ہے، فعل لسان یہ ہے کہ زبان سے ایسے الفاظ ادا کرے جو اس کی عظمت شان اور کمال صفات پر دلالت کرنے والے ہوں اور فعل جوارح یہ ہے کہ ایسے اعمال وافعال بجالائے جو منعم کی ذات کی صفات کمال وجلال پر دلالت کرے غرضیکہ جہاں کہیں حمد مذکور ہے اس سے یہی مراد ہے۔

ایجاب حمد واشتغال حمد کے منکرین کے دلائل

اس مقام پر جاننا چاہئے کہ حمد کے بارے میں عقلا اور ارباب علم کا اختلاف ہے ایک فریق اس بات کا قائل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو اپنی حمد کا حکم دینا ہی جائز نہیں ہے انہوں نے اپنے نظریہ پر چند وجوہ سے استدلال کیا ہے۔

وجہ اول: یہ کہ یہ تحمید یا تو ان نعمتوں کے بدلے ہے جو منعم نے بندوں کی طرف ایصال فرمایا ہے یا پھر بغیر نعمت کے بدلے ہے اول صورت باطل ہے اس لئے کہ نعمتوں کے ایصال کے بدلے حمد کا مطالبہ گویا جزا اور بدلہ طلب کرنا ہے اور اللہ عز شانہ تعالیٰ طلب عوض سے منزہ ہے نیز یہ کمال کرم کے بھی منافی ہے کہ کریم بڑے سے بڑے کرم پر بھی عوض نہیں لیتا۔ اور اگر بغیر ایصال نعمت حمد کا مطالبہ ہے تو اس میں بندوں کو ابتداء تھکانا ہے جو ظلم ہے۔

وجہ دوم: یہ ہے کہ اس حمد میں اشتغال بندوں کو تھکانا ہے اور ذات محمود کا کوئی فائدہ نہیں کہ وہ از خود کامل لذاتہ ہے

اور کامل لذاتہ کا غیر سے استکمال محال ہے پس اس سے ثابت کہ یہ تحمید عبث وضرر ہے لہٰذا ضروری ہے کہ حمد مشروع نہ ہو۔

وجہ سوم: یہ کہ ایجاب کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کو نہ کرے تو عتاب کا مستحق ہوگا پس ایجاب حمد کا معنی یہ ہوگا کہ اگر بندہ حمد میں مشغول نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دے گا اور یہ معلوم کہ اس حمد میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں غرض حمد میں کسی کا کوئی نفع نہیں پھر بھی ترک حمد پر ابدالآباد تک عذاب دینا حکیم وکریم کی شان کے لائق نہیں۔

ایک دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ حمد الٰہی میں مشغول ہونے میں سوءادبی ہے اس فریق نے بھی اپنے موقف پر چند طرح سے استدلال کیا ہے۔

اول: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے احسان جزیل کے بالمقابل ہمارا حمد کرنا شکر قلیل ہے اور انعامات غیر متناہیہ کے مقابل شکر قلیل بے ادبی ہے۔

دوم: بندہ جب اپنے دل میں ان نعمتوں کا تصور کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا دل اس وقت منعم کی معرفت میں استغراق سے خالی ہوگا اور معرفت الٰہیہ سے دل کو فارغ کر لینا محرومی وسوءادبی ہے۔

سوم: اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا نعمتوں کے حصول کے وقت اس سے ظاہر ہے کہ بندہ نے اس نعمت کے حاصل ہونے کی وجہ سے اس کی تعریف کی ہے اگر نعمت نہ ہوتی تو تعریف نہ کرتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا مقصود حمد وعبادت سے اس نعمت کا حصول ہے تو گویا نعمت ہی بندہ کا معبود ومطلوب ہے اس لئے حمد وشکر سوءادبی ہے۔

فصل دوم: تفسیر قولہ تعالیٰ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: رب درحقیقت تربیت کے معنی میں ہے اور تربیت، شئ کو اس کے کمال تک آہستہ آہستہ پہنچانے کو کہتے ہیں پھر بطور مبالغہ لفظ رب کو اسم جلالت اللہ کی صفت بنایا گیا جس طرح صوم وعدل میں مبالغتاً محمول ہوتا ہے۔

لفظ رب کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ صفت مشبہ ہے ''رَبَّ یَرُبُّ'' باب نصر سے ہے جیسے ''نَمَّ ینم فھو نمٌّ'' میں نم صفت مشبہ ہے ایسے ہی رب بھی صفت مشبہ ہے۔

رب مالک کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ وہ اپنی مملوکہ شئ کی تربیت وحفاظت کرتا ہے مگر لفظ رب ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے غیر پر اس کا اطلاق بغیر اضافت درست نہیں چنانچہ قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا جو ارشاد مذکور ہے وہ اضافت کے ساتھ ہے آپ نے بادشاہ مصر کے قاصد سے فرمایا تھا ''اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ'' یعنی اپنے

آقا کے پاس واپس جاؤ، اسی طرح انہیں کا ارشاد "اَنَّهٗ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ" اور جیسے جیل خانہ میں دو قیدیوں کو تعبیر دیتے وقت کا یہ ارشاد "اَمَّآ اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا"، ان تینوں مثالوں میں لفظ رب اضافت کے ساتھ مذکور ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر اللہ کے لئے لفظ رب کا استعمال اضافت کے ساتھ جائز ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لفظ رب کا مذکورہ استعمال لغوی اعتبار سے ہے اور شرعی لحاظ سے لفظ رب کو مکلف کی طرف مضاف کر کے غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا مکروہ ہے لیکن غیر مکلف کی طرف مضاف کر کے استعمال کرنے میں حرج نہیں جیسے کہا جاتا ہے "رب الدار" یعنی گھر کا مالک، گھر والا، اور فقہ میں کتاب البیع کی بحث سلم میں "رب السلم" کا استعمال عند الفقہاء شائع ہے۔ مگر مکلف ذوی العقول کی طرف مضاف کر کے استعمال کرنے میں کراہت اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لا یقل احدکم اطعم ربک" یعنی اپنے آقا کو کھانا کھلانے کے وقت تم میں کا کوئی اطعم ربک نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا کھلاؤ۔

ارشاد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی تفسیر پہلے ہم تفسیر بیضاوی کی روشنی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں پھر حضرت رازی کے لطائف ونکات آفرینی کا ذکر کریں گے تفسیر بیضاوی میں ہے۔

"الرب فی الاصل بمعنی التربیة وھی تبلیغ الشئی الی کمالہ شیئا فشیئا ثم وصف بہ للمبالغة کالصوم والعدل وقیل ھو نعت من ربہ یربہ فھو رب کقولک نم ینم فھو نم ثم سمی بہ المالک لانہ یحفظہ مایملکہ ویربیہ ولا یطلق علی غیرہ تعالیٰ الا مقیدًا کقولہ تعالیٰ اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ۔"

اعتراض: "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں لفظ رب کو اسم جلالت لفظ اللہ کی صفت قرار دینے میں یہ مشہور اعتراض وارد ہوگا اعتراض کی تقریر یہ ہے کہ مشہور ومتواتر قرأت کے مطابق رب العلمین میں رب کو مکسور پڑھا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ اللہ کی صفت واقع ہے اور الحمد للہ میں اللہ مکسور ہے لہٰذا اس کی صفت رب کو بھی مکسور پڑھا جائے گا اس لئے بکسر رب پڑھتے ہیں لیکن رب کو صفت قرار دینا درست نہیں کیونکہ صفت وموصوف کے درمیان تعریف وتنکیر میں مطابقت ضروری ہے اور یہاں مطابقت نہیں پائی جاتی اس لئے کہ الحمد للہ میں اسم جلالت لفظ اللہ معرفہ ہے اور جب کہ رب العلمین نکرہ ہے، نکرہ اس لئے ہے کہ رب صفت مشبہ ہے جس کی اضافت عالمین کی طرف گئی ہے اور صفت کی اضافت جب معمول کی طرف ہوتی ہے تو اضافت لفظی کہلاتی ہے اور اضافت لفظی مفید تعریف نہیں ہوتی پس اضافت کے باوجود مضاف نکرہ ہی رہتا ہے اور جب لفظ رب نکرہ ہوا تو اسم جلالت لفظ اللہ جو معرفہ ہے کی صفت نہیں بن سکتا۔

جواب : اعتراض بالا کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں رب کی اضافت عالمین کی طرف لفظی نہیں ہے بلکہ اضافت معنوی ہے اس لئے کہ اضافت معنوی کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ صفت اپنے معمول کی طرف مضاف نہ ہو اور یہاں بھی لفظ رب اپنے معمول کی طرف مضاف نہیں ہے کیونکہ عالمین حالت نصبی میں ہے اور لفظ رب صفت مشبہ ہے جو لازم ہوتا ہے اور لازم نصب کا عمل نہیں کرتا اور جب عالمین رب کا معمول نہیں تو اضافت معنوی ہوئی اضافت لفظی نہ ہوئی۔ لہٰذا "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں لفظ رب معرفہ ہوا اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں لفظ اللہ بھی معرفہ ہے اس طرح موصوف وصفت میں مطابقت ہو جائے گی۔

قاضی بیضاوی نے عالمین کی تفسیر میں تین اقوال ذکر کئے ہیں قول اول کو ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

"والعالم اسم لما یعلم به کالخاتم والقالب غلب فیما یعلم به الصانع وهو کل ماسواه من الجواهر والاعراض" الخ

یعنی عالمین عالم کی جمع ہے اور عالم فاعل کے وزن پر اسم الہ ہے چونکہ اسم الہ کا وزن مِفعل ومفعال کی طرح فاعل بھی آتا ہے پس عالم کا معنی ہوگا جس کے ذریعہ شئی کو جانا جائے چنانچہ عالم کو عالم اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے صانع عالم کو جانا جاتا ہے جس طرح کہ خاتم آلہ ختم یعنی مہر لگانے کے آلہ اور قالب آلہ قلب کو کہتے ہیں اور عالم اللہ عز شانہ کے علاوہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو از قبیل جواہر واعراض ہیں اور یہ معلوم کہ کائنات کی ہر شئی یا تو از قبیل جواہر ہیں یا از قبیل اعراض ہیں لہٰذا عالم کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز پر ہوگا۔

رہا یہ امر کہ عالم سے صانع عالم کا علم کیسے ہوتا ہے تو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں **"فانها لا مکانها وافتقارها الی مؤثر واجب لذاته تدل علیٰ وجوده"** یعنی تمام جواہر واعراض سب ممکن ہیں اور ممکن اپنے وجود میں ایک موثر واجب لذاتہ کا محتاج ہوتا ہے اور جو چیز اپنے وجود میں واجب لذاتہ کا محتاج ہو تو ظاہر کہ محتاج الیہ اور واجب لذاتہ کا وجود پہلے ہوگا جس کی طرف وہ ممکن مفتقر محتاج ہے لہٰذا تمام ممکنات خواہ از قبیل جواہر ہوں یا اعراض سب کے سب دال ہیں صانع عالم کے وجود پر جو کہ واجب لذاتہ ہے۔ عالمین کو جمع استعمال فرمایا گیا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں **"وانما جمعه لیشتمل ماتحته من الاجناس المختلفة"** یعنی عالم کی جمع عالمین اس لئے ارشاد ہوا کہ تاکہ عالم کے تحت آنے والی تمام اجناس مختلفہ کو بھی شامل ہو جائے۔ درحقیقت بیضاوی کی یہ عبارت ایک اشکال کا جواب ہے۔

اشکال: اس مقام پر اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ جب عالم ماسوا اللہ کا نام ہے تو ماسوا اللہ عالم کے سارے اجناس کو شامل ہیں اور اگر اس پر الف لام داخل کر دیں تو سارے اجناس کے افراد کو بھی شامل ہوگا لہٰذا عالم کی جمع لائے بغیر صرف العالم کہہ دینے سے بھی سارے افراد عالم پر دلالت ہو جائے گی؟

جواب: اشکال کا جواب یہ دیا کہ گرچہ عالم کو مفرد لانے سے بھی عالم کے سارے افراد شامل ہوتے مگر اس میں یہ وہم ہو سکتا تھا کہ عالم کا اطلاق ایک جنس پر بھی صحیح ہے جیسے عالم انسان، عالم جن اور عالم ملائکہ وغیرہ پس اس اطلاق کی تقدیر پر مفرد لانے میں یہ وہم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عالم کی ایک جنس، جنس انسان یا جنس جن و ملائکہ وغیرہ پر ثابت ہے حالانکہ عالم کی ایک جنس پر ربوبیت ثابت کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ عالم کے تمام اجناس مختلفہ پر ربوبیت ثابت کرنا مقصود ہے غرض جمع اس لئے ارشاد ہوا تا کہ بطور قطعیت عالم کے ہر ہر جنس کے ہر ہر فرد پر ربوبیت الٰہیہ ثابت ہو کسی فرد کے خارج ہونے کا وہم بھی باقی نہ رہے۔

اب رہا یہ سوال کہ جمع ذوی العقول کی کیوں لائی گئی جب کہ عالم ذوی العقول وغیر ذوی العقول سب کو شامل ہے اور ذوی العقول کی بہ نسبت غیر ذوی العقول کی کثرت بھی ہے اس کا جواب قاضی صاحب نے بایں الفاظ دیا ہے۔

"وغلب العقلاء منهم فجمعه بالياء والنون كسائر اوصافهم"

یعنی یہاں عقلا کو غیر عقلا پر، اس کی کرامت و شرافت کی وجہ سے غلبہ دے دیا گیا ہے اس لئے عالم کی جمع یا اور نون کے ساتھ بطور جمع ذوی العقول لائی گئی جس طرح ذوی العقول کے دوسرے صفات کی جمع واو، نون کے ساتھ لائی جاتی ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں "المسلمون، الضاربون" وغیرہ عالم کی دوسری تفسیر بیان کرتے ہوئے قاضی صاحب نے فرمایا۔ "وقيل اسم وضع لذوى العلم من الملئكة والثقلين" یعنی اور کہا گیا ہے کہ عالم، ذوی العلم کے لئے وضع کیا گیا ہے اب خواہ وہ ارباب علم گروہ ملائکہ سے ہوں یا جن وانس کے قبیل سے ہوں، عالم کا اطلاق ان تینوں پر ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے عالم الملک، عالم الجن عالم الانس وغیرہ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عالم کا اطلاق جنس ہی پر ہوتا ہے فرد پر عالم کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ عالم زید، وعالم بکر وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔

اعتراض: لیکن اس مقام پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ عالم کی تفسیر ملائکہ اور جن وانس کے ساتھ کرنے کی صورت میں اللہ رب العلمین کی ربوبیت عامہ نہیں رہ جائے گی صرف ان تینوں جنسوں میں منحصر ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ اللہ رب العلمین نہ یہ کہ صرف ان تین کا بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا رب ہے۔

جواب: اس کا جواب بیضاوی نے اپنے قول "**وتناله لغیرهم علی سبیل الاستتباع**" سے دیا ہے یعنی اس تفسیر کے مطابق گرچہ علی سبیل الاستقلال غیر ذوی العقول کو ربوبیت شامل نہیں لیکن تبعا والتزاما تمام غیر ذوی العقول کو بھی شامل ہے اس لئے کہ جو ذات کریم تمام اشرف المخلوقات ذوی العقول رب ہے وہ لازمی طور پر تمام غیر ذوی العقول کا بھی رب ہے۔

عالم کی تفسیر میں تیسرا قول یہ ہے کہ عالم سے انسان مراد ہے۔ چنانچہ بیضاوی میں ہے

"**وقیل عنی به الناس ههنا فان کل واحد منهم عالم من حیث انه یشتمل علی نظائر مافی العالم الکبیر من الجواهر والاعراض**" الخ

یعنی عالم کا اصل وضع کے اعتبار سے گرچہ جمیع ماسوا اللہ پر اطلاق ہوتا ہے لیکن اس مقام پر عالم سے عالم انسان مراد ہے کہ انسان کو جمیع موجودات کی منزل میں اتار لیا گیا ہے اس وجہ سے کہ انسان اشرف المخلوقات اور خلاصہ موجودات ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ہے "**کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ**" پھر قرآن حکیم میں بھی عالم کا اطلاق انسان پر ہوا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے "**أَتَأْتُوْنَ الذُّکْرَانَ مِنَ الْعَالَمِیْنَ**" سورہ ۲۶ / ۱۶۵ یعنی تم انسانوں کی جنس کو چھوڑ کر صرف مردوں سے بدفعلی کرتے ہو۔ انسان پر عالم کا اطلاق اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان کا ہر فرد ایک عالم ہے کیونکہ اس عالم کبیر (بڑی دنیا) میں جتنے جواہر واعراض پائے جاتے ہیں ان سے صانع عالم کا علم ہوتا ہے ایسے ہی انسان بھی عالم کبیر کے نظام پر مشتمل ہے چنانچہ جب زمین پیدا کی گئی تو حرکت کرنے لگی پس اللہ تعالیٰ نے اس کے قیام کے لئے پہاڑوں کو میخ بنایا اس طرح زمین ساکن ہوگئی ایسے ہی انسانوں کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے جسموں میں ہڈیوں کو بنایا تاکہ انسان قیام کر سکے اسی طرح عالم کبیر میں بارش ہوتی ہے تو زمین شرابور ہو جاتی ہے ایسے ہی سخت گرمی کے موسم میں بدن انسانی سے پسینہ رواں رہتا ہے غرضیکہ عالم کبیر میں جتنی اہم چیز خاک، باد، آب وہوا، حرارت وبرودت اور جنگل وجبال وغیرہ موجود ہیں وہ سب تنہا عالم صغیر حضرت انسان میں موجود ہیں گویا سارا عالم کبیر ایک انسان عالم صغیر میں سمو دیا گیا ہے اس لئے اللہ عزشانہ تعالیٰ نے جہاں ارض وآفاق کو اپنی ذات کے وجود اور توحید کی نشانی قرار دیا ہے وہیں انسان کو اس کے اپنے نفس میں غور وفکر کا حکم دیا ہے ارشاد ربانی ہے **وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ** یعنی خود تم میں خالق کائنات کی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں تو کیا تمہیں سوجھتا نہیں۔

اس آیت مبارکہ کی ترجمانی کرتے ہوئے مخدوم الاولیاء، مجدد سلسلہ عالیہ اشرفیہ، قطب ربانی، حضرت مولانا شاہ

ابواحمد محمد علی حسین اشرفی الجیلانی، مسند نشین جادۂ اشرف السمنانی، قدس سرہ النورانی، کچھوچھہ شریف نے اپنے عارفانہ کلام حمد باری تعالیٰ میں کہا ہے۔

کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہو عالم میں، کیوں اس کی تلاش میں ہوتے ہو گم

وھو معکم وھو معکم وھو معکم وھو معکم

کوئی ہم سے جو اس کا پتہ پوچھے بتلائینگے ہم یہ پردہ سے

فی انفسکم فی انفسکم فی انفسکم فی انفسکم

وہ تو پاس تھے پر دیکھا ہی نہیں، لو چپکے سے ہم کو سنا بھی چلے

انا اقربکم انا اقربکم انا اقربکم انا اقربکم

جب من کان للہ ہوئے پھر کان اللہ لہ ٹھہرے

لا ریب لکم، لا ریب لکم، لا ریب لکم، لا ریب لکم

یہی کہتا ہے اشرفی مسکیں نہیں خالی ہے اس سے کوئی کہیں

احد منکم، احد منکم، احد من کم احد منکم

عالم کی تفسیر قاضی بیضاوی کی روشنی میں جاننے کے بعد ذیل میں حضرات امام رازی کے لطائف وفوائد کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔

فائدہ: (۱) موجود یا تو واجب لذاتہ ہوگا یا ممکن لذاتہ ہوگا اگر واجب لذاتہ ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اگر ممکن لذاتہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا ہر شئی ہے اسی کو عالم کہتے ہیں چنانچہ متکلمین نے عالم کی تعریف میں کہا ہے کہ اللہ کے ماسوا ہر موجود کا نام عالم ہے اور ممکن لذاتہ کو عالم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتا ہے اسی وجہ سے اللہ کے سوا ہر موجود کو عالم کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی یعنی عالم یا تو متحیز ہوگا یا متحیز کی صفت ہوگا، یا نہ متحیز ہوگا اور نہ متحیز کی صفت ہوگا۔ اس طرح کل تین قسمیں بنتی ہیں، قسم اول متحیز ہے پھر وہ یا تو قابل قسمت ہوگا یا قابل قسمت نہ ہوگا، اگر قابل قسمت ہے تو جسم ہے اور اگر قابل قسمت نہیں ہے تو وہ جوہر فرد ہے پھر جسم یا تو اجسام علویہ سے ہوگا یا اجسام سفلیہ سے ہوگا، اجسام علویہ میں افلاک وکواکب بہت مشہور ومشاہد اور سب کے نزدیک مسلم ہیں اور شرع شریف میں افلاک وکواکب کے علاوہ، کرسی، سدرۃ المنتہیٰ، لوح محفوظ، بیت المعمور، قلم اور جنت وجہنم

وغیرہ ثابت ہیں رہے اجسام سفلیہ تو وہ یا تو بسیطہ ہونگے یا مرکبہ ہوں گے، بسیطہ یہ عناصر اربعہ ہیں ان میں ایک کرہ ارض ہے جس میں بلاد معمورہ، جنگلات و پہاڑ اور میدان و بیابان داخل ہیں عناصر اربعہ میں دوسرا کرۂ ماء ہے اور وہ بحر محیط ہے اور بڑے بڑے دریے جو اس ربع معمورہ میں موجود ہیں اسکے علاوہ بڑی چھوٹی بے شمار ندیاں جن کی تعداد کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے سب کرۂ ماء میں شامل ہیں۔ تیسرا کرۂ ہوا ہے اور چوتھا کرۂ نار ہے رہے اجسام مرکبہ تو اس کے افراد بے شمار، ان گنت ہیں اور اس کی مختلف متضاد قسمیں ہیں اس کی مثالیں نباتات، حیوانات اور معدنیات وغیرہا ہیں۔

ممکن لذاتہ کی دوسری قسم جو متحیزات کی صفت بنتی ہے وہ اعراض ہیں حضرات متکلمین نے کچھ کم و بیش اجناس اعراض سے چالیس اعراض ذکر کئے ہیں تیسری قسم ممکن لذاتہ کی وہ ہے جو نہ متحیز ہو نہ متحیز کی صفت ہو اس کی مثالیں ارواح سے دی جاتی ہیں اور ارواح دو طرح کی ہوتی ہیں ارواح سفلیہ اور ارواح علویہ، پھر ارواح سفلیہ دو طرح کی ہیں ، خیرہ، شریرہ، ارواح خیرہ صالحین جنات ہوتے ہیں اور ارواح شریرہ سرکش شیطان کہلاتے ہیں۔ اور ارواح علویہ یا تو اجسام سے متعلق ہوں گے یا اجسام سے متعلق نہ ہوں گے وہ ارواح علویہ جن کا تعلق اجسام سے ہے وہ ارواح فلکیہ کہلاتے ہیں اور جو اجسام سے متعلق نہیں ہیں وہ سب ارواح مطہرہ مقدسہ کہلاتے ہیں غرضیکہ ارشاد رب العلمین میں موجودات عالم کی انہیں مذکورہ تقسیمات کی طرف اشارہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انسان صرف عالم کی تقسیمات کی تفصیل وتشریح کرنے میں لگ جائے تو ہزاروں لاکھوں جلدیں ہوسکتی ہیں پھر بھی انسان کی اس کے اقل مراتب تک رسائی نہیں ہوسکتی اس کے باوجود سب ممکنات لذاتہا ہیں اور واجب الوجود صرف ایک ذات ہے جس کی طرف سارے ممکنات اپنے وجود میں محتاج ہیں کہ امکان احتیاج کو مستلزم ہے پس ممکن لذاتہ جس طرح وجود میں محدث کا محتاج ہے اسی طرح بقاء میں بھی مبقی کا محتاج ہے چنانچہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کو الہ العالمین اس حیثیت سے کہتے ہیں کہ وہی وہ ذات ہے جس نے سارے عالم کو پردۂ عدم سے نکال کر منصۂ شہود پر جلوہ گر کیا نیز اس کو رب العلمین اس حیثیت سے کہتے ہیں کہ وہ ہر شئی کو دوام واستقرار کی حالت میں باقی رکھے ہوئے ہے بلکہ بقا واستقرار کے جملہ سامان واسباب کو بھی مہیا کئے ہوا ہے۔

ہماری اس مختصر سی تحریر سے قارئین کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ رب تعالیٰ کے صرف ارشاد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں معانی و مطالب کا ایک جہاں آباد ہے بلکہ معانی واسرار کا ایک ناپیدا کنار سمندر موجزن ہے۔

فائدہ: (۲) مربی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ مربی جو کسی کی اس لئے تربیت کرتا ہے کہ دنیا یا آخرت کہیں بھی خود

مربی کا فائدہ ہو دوسرا وہ مربی جو اس لئے تربیت کرتا ہے کہ اس سے صرف اس شئی کو فائدہ و نفع پہنچے مربی کا کچھ بھی فائدہ نہ ہو ساری مخلوقات میں جو بھی کسی کی کچھ تربیت کرتا ہے وہ تربیت قسم اول کے قبیل سے ہے کیونکہ مخلوقات میں جو مربی ہے وہ دوسرے کی تربیت اس لئے کرتا ہے تا کہ اس کو آخرت میں ثواب ملے یا دنیا میں ثناء ہو اس کے برخلاف رب تعالیٰ کی تربیت ایسی ہے کہ اس میں اسکا کچھ فائدہ نہیں بلکہ سارا نفع اور فائدہ مربّی ہی کا ہے غرض رب تعالیٰ کی تربیت اور اس کا احسان ساری کائنات کی تربیت و احسان سے الگ و ممتاز اور اعلیٰ ہے۔ رب تعالیٰ کی تربیت اور دوسرے مخلوق کی تربیت میں بچند وجوہ فرق ہے۔

اول: یہ کہ رب تعالیٰ کی تربیت بغیر کسی ذاتی غرض کے متعلق ہے اور دوسروں کی تربیت میں مربی کی ذاتی غرض وابستہ ہوتی ہے۔

دوم: غیر خدا جب کسی کی تربیت کرتا ہے تو اس کی تربیت کے مطابق اور بقدر احسان اس کے خزانہ اور مال سے اتنا حصہ ختم اور کم ہو جاتا ہے مگر رب تعالیٰ جتنا کچھ تربیت فرمائے حتی کہ عالمین و کائنات کے ہر شئی کی تربیت فرماتا ہے مگر اس کے خزانہ میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی اور نہ کوئی ضرر و نقصان ہوتا ہے چنانچہ ارشاد پروردگار ہے۔ ”وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ“ اور کوئی چیز نہیں جسکے، ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم اسے نہیں اتارتے مگر ایک معلوم انداز سے۔ (الحجر:۲۱)

سوم: خدا کے علاوہ احسان کرنے والوں کا طریقہ یہ ہے کہ فقیر جب اس کے سامنے طلب کے لئے الحاح و زاری کرتا ہے تو وہ غضب ناک ہوتا ہے اس کو محروم واپس کر دیتا ہے اور بھیک نہیں دیتا مگر رب تعالیٰ کی عطاء و تربیت کا یہ حال ہے کہ بندہ اس کی بارگاہ میں جتنا الحاح و زاری کرتا ہے وہ اس بندہ سے اتنا ہی زیادہ خوش ہوتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دعاء میں گریہ و زاری کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

چہارم: دوسرے احسان کرنے والوں کا طریقہ اور عادت یہ ہوتی ہے کہ جب تک اس سے مانگا نہ جائے وہ احسان نہیں کرتا لیکن حق تعالیٰ کی عطا اور احسان کا حال یہ ہے کہ وہ سوال و طلب سے پہلے ہی عطا فرما دیتا ہے کیا دنیا نہیں دیکھتی کہ وہ رب العلمین رحم مادر میں کس طرح جنین کی تربیت فرماتا ہے جب انسان جاہل غیر عاقل اور بے شعور ہوتا ہے وہ مانگنے کا طریقہ بھی نہیں جانتا ایسے وقت میں بھی وہ احسان و کرم نوازی کی انتہاء کر دیتا ہے حالانکہ بندہ نے اس سے مانگا ہی نہیں اور مانگتا کیسے جب کہ اس کو عقل ہے نہ ہی مانگنے کا سلیقہ۔

پنجم: غیر اللہ کے احسان کا سلسلہ کبھی نہ کبھی رک جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ خود محتاج ہوجاتا ہے وہ احسان کرنے کے لائق نہیں رہ جاتا یا وہ کبھی غائب ہوجاتا ہے یا پھر اس کی موت ہوجاتی ہے اس طرح اس کے احسان کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتا ہے لیکن حق سبحانہ تعالیٰ کے احسان کا سلسلہ کبھی رکتا نہیں۔

ششم: دوسرے محسنین کا احسان کسی نہ کسی خاص قوم کے ساتھ مختص ہوتا ہے زیادہ تر دوست، احباب اور اعزہ و اقربا کے ساتھ ہی اس کی ہمدردی ہوتی ہے اپنے دشمن کے ساتھ کبھی بھی وہ احسان کرنے کو سوچتا بھی نہیں اس کے برخلاف حق تعالیٰ کے احسانات کا معاملہ عالمین کی ہر شئی کو عام ہے سمندر کی گہرائیوں میں زندگی گذارنے والے کیڑے اور شاہق جبل پر رہنے والے پرندے سب کو رزق دیتا ہے اپنے ماننے والے ایماندار بندہ کو نہ ماننے والے کفار دشمن کو بھی رزق عطا فرماتا ہے غرض اس کی رحمت ہر شئی کو عام ہے ارشاد پاک ہے "وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ" (الاعراف:۱۵۶) مختصر یہ کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جو رب العلمین ہے اور تمام خلائق کی محسن ہے اس لئے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔

فائدہ: (۳) دنیا میں جس کی حمد وثنا، تعریف وتوصیف اور تکریم وتعظیم کی جاتی ہے اس کی کئی وجہیں ہوتی ہیں۔

(۱) یہ کہ ممدوح ومحمود اپنی ذات وصفات میں کامل ہے تمام عیوب ونقائص اور آفات سے پاک ومنزہ ہے جب ذات ایسی باکمال ہوتی ہے تو خواہ کچھ احسان نہ کرے مگر پھر بھی اس کی حمد ہوتی ہے۔

(۲) حمد وتعریف کرنے کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس ذات نے تم پر احسان کیا ہے اور بڑا انعام و اکرام فرمایا ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمانہ آئندہ میں اس کے احسانات وانعامات ملنے کی قوی امید ہو۔

(۴) حمد وتعریف کی چوتھی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس ذات کے قہر وغلبہ قدرت وکمال اور سطوت وجبروت سے خوف ہے پس یہی وہ وجہیں ہیں جو تعظیم وتحمید کو واجب کرتی ہیں۔ اب آیت میں ادنی تامل سے یہ سمجھ میں آتا ہے گویا رب تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر تم ان میں ہو جو کمال ذاتی کی وجہ سے حمد وتعظیم کرنے والے ہیں تو میری حمد کرو کیونکہ میں ہی الہ العلمین ہوں، اور یہی مراد ہے الحمدللہ سے، اور اگر تم ان میں سے ہو جو احسانات وانعامات کی وجہ سے تعظیم و تکریم کرنے والے ہیں تو بھی میری ثنا بیان کرو اس لئے کہ میں ہی رب العلمین ہوں اور اگر تم ان میں سے ہو جو زمانہ آئندہ میں انعامات واحسانات کی امید اور طمع رکھنے والے ہیں تو پھر بھی میری ہی حمد وثنا کرو کہ میں رحمن ورحیم ہوں

اور اگر تم ان میں سے ہو جو کسی خوف و ڈر اور قہر و غلبہ کی وجہ سے تعریف کرنے والے ہیں تو بھی میں ہی تعریف کا مستحق ہوں کہ میں ہی "مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" ہوں۔

فائدہ (۴): تربیت الٰہی کے طرق و کیفیات بے انداز و بے حساب ہیں جو انسان کے وہم و گمان سے باہر ہیں ہم ذیل میں چند مثالیں ذکر کر رہے ہیں جن سے تربیت الٰہیہ کے حیرت انگیز طریقہ کار کو دیکھ کر زبان سے دفعتاً سبحان اللہ اور الحمد للہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

مثال اول: ذرا غور تو کریں کہ جب قطرۂ منی صُلب پدر سے رحم مادر میں وقوع پذیر ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ کس طرح تغیر پذیر ہوتا ہے کہ وہ قطرۂ آب کس طرح بستہ خون میں تبدیل ہو جاتا ہے پھر چند دنوں میں وہی مضغہ یعنی گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے پھر اسی مضغہ سے کس طرح مختلف اعضاء جیسے ہڈیاں، شرائین، غضاریف، رباطات، اوتار اور اوردہ شرایین تیار ہو جاتی ہیں پھر جب بعض بعض سے ملتی ہیں تو ان میں سے ہر ایک میں ایک خاص قسم کی قوت پیدا ہوتی ہے چنانچہ آنکھ میں قوت باصرہ، کان میں قوت سامعہ اور زبان میں قوت ناطقہ اور ناک میں قوت شامہ پیدا ہو جاتی ہے یقیناً اس وقت دل میں تربیت الٰہیہ کی عظمت بیٹھ جاتی ہے اور زبان سے تسبیح ربانی ادا ہوتی ہے کہ تمام حمد و ثناء اور سب عبادتیں اس ذات رب العلمین کے لئے ہیں جس نے ہڈی میں سننے کی قوت کر دی، چربی کو دیکھنے اور گوشت کو بولنے اور چھینکنے کی قوت و صلاحیت عطا کر دی۔

مثال دوم: دیکھو کسان کھیت میں جب کوئی ایک دانہ بشکل بیج ڈالتا ہے تو وہ دانہ زمین کی تریوں سے پھول جاتا ہے پھر وہ دانہ پھٹ جاتا ہے لیکن ہر طرف سے یا کسی غیر مناسب جگہ سے بھی نہیں پھٹتا بلکہ اس دانہ کے اعلیٰ و اسفل اوپر اور نیچے کے حصہ سے شگاف پیدا ہوتا ہے حالانکہ پورا دانہ پھولا رہتا ہے اب اوپر کے شگاف سے باریک کونپل نکلتی ہے اور نیچے کے سوراخ سے زمین کے اندر ایک جڑ نکلتی ہے پھر اوپر کے شگاف سے نکلنے والی کونپل جب کچھ بڑی ہوتی ہے تو پنڈلی کی شکل بن جاتی ہے اب اس پنڈلی یا شگاف سے چاروں طرف بہت سی ڈالیاں نکلتی ہیں پھر ان ڈالیوں میں بہت سی پتیاں نمودار ہوتی ہیں شبنم کے قطروں اور دھوپ کی شعاؤں سے یہ پتیاں ہری بھری اور سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں۔ اب اس میں بالیاں اور گجورے نمودار ہوتے ہیں کچھ دن نہیں گذرنے پاتا کہ اسی ایک دانہ کے درخت میں سینکڑوں ہزاروں پھل لدے ہوئے دکھائی دیتے ہیں پھر یہ پھل بھی مختلف انواع کے کثیف و لطیف اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے اس میں چھلکا ہے گودا بھی ہے، ریشے بھی اور ایک یا چند بلکہ سینکڑوں بیج بھی ہیں اور تیل و مشروبات کے مادے بھی

ہیں اب اس دانہ کے نیچے کے شگاف سے نکلی جڑ کی طرف قدرے توجہ مبذول کیجئے اور دیکھئے وہ جڑ زمین کی چاروں طرف اندر ہی اندر بڑھ رہی ہے اور پھیل رہی ہے ابتدا میں ایک جڑ کو چھونے سے بال کی طرح باریک اور پانی کی طرح رقیق ونرم معلوم ہوتی ہے مگر قدرت الہیہ کی کاریگری سے اس میں عطا کردہ توانائی کا عالم یہ ہے کہ وہ باریک ریشہ وجڑ سخت سے سخت زمین کو اندر ہی اندر پھاڑتے ہوئے دور تک اپنی جگہ پکڑ لیتی ہے بلکہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اس جڑ میں ایسی قوت جاذبہ ودیعت کردی ہے کہ اندرونی مٹیوں کی لطافتوں کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے ان ساری تدبیرات میں حکمت، انسانی ضرورتوں کی تکمیل وتحصیل ہے ظاہر ہے کہ غذائیں سبزیاں، پھل ومیوے، مشروبات اور دوائیں سب اسی ایک دانہ کے اثرات ومظاہر ہیں جو رب العلمین نے اس میں ودیعت فرمادی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ ”اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا“ بیشک ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا پھر زمین کو خوب چیرا تو اس میں اگایا اناج۔ (عبس:۲۶) اس میں دعوت نظارہ ہے کہ آدمی، رب العلمین کی ربوبیت کاملہ کو دیکھنا چاہے تو کہیں اور نہ جائے بلکہ اسے چاہئے کہ اپنے کھانے کو دیکھے کہ کس طرح بنارب تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا، پھر زمین کو خوب چیرا تو اس میں اگایا اناج، انگور اور چارہ اور زیتون اور کھجور۔

مثال سوم: اب ذرا افلاک وسماوات اور اس میں مزین اور جڑے ہوئے ثوابت وکواکب اور تارے ستارے کو بھی دیکھئے کہ اس کی تخلیق وتزئین رب تعالیٰ کے وجود، قدرت، ربوبیت وغیرہا صفات کمالیہ پر جہاں مستحکم اور ناقابل انکار دلیل ہے وہیں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے ان افلاک وکواکب کو بھی بندوں کے مصالح اور قضاء حاجات کے لئے اسباب بنایا ہے چنانچہ سورج کے طلوع وغروب سے لیل ونہار، روز وشب یعنی رات ودن کا وجود ہوتا ہے مگر رات کو اللہ تعالیٰ نے راحت وسکون کے لئے بنایا اور جب کہ دن کو کسب معاش کے لئے بنایا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ“ وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند چمکتا اور اس کے لئے منزلیں ٹھہرائیں کہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جانو (یونس:۵) اور ارشاد عالیشان ہے ”وَ هُوَالَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ“ وہی ہے جس نے تمہارے لئے تارے بنائے کہ ان سے راہ پاؤ خشکی اور تری کے اندھیروں میں (الانعام ۹۷) اس آیت کریمہ کو بھی پڑھ کر قلوب کو منور کیجئے ارشاد ہے ”اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا“ الی

آخر الآیۃ کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہ کیا اور پہاڑوں کو میخیں، اور تمہیں جوڑے بنایا اور تمہاری نیند کو آرام کیا اور رات کو پردہ پوش کیا اور دن کو روزگار کے لئے بنایا اور تمہارے اوپر سات مضبوط چنائیاں چنیں (تعمیر کیں) اور ان میں ایک نہایت چمکتا چراغ رکھا اور پھر بدلیوں سے زور کا پانی اتارا کہ اس سے پیدا فرمائیں اناج اور سبزہ اور گھنے باغ۔(النبأ:۶)

مندرجہ متلوہ آیات کریمہ اور اس جیسی دوسری آیات بینات سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین و آسمان، سورج و چاند تمام مظاہر قدرت انسانی تربیت ہی کے لئے رونما ہوئے ہیں اگر انسان معدنیات و نباتات اور حیوانات کے احوال کے عجائبات میں اور انسان کی تخلیق میں اللہ رحمن کی حکمتوں کے آثار میں غور و خوض کرے تو اس کی عقل فیصلہ کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی تربیت کے اسباب بیشمار ہیں اور اس کی رحمتوں کے دلائل آفتاب نصف النہار سے زیادہ روشن و تابناک ہیں یقینا جو کوئی رب تعالیٰ کے عطا کردہ عجائبات و آثار کا گہرائی سے مطالعہ کر لیگا اسے ارشاد ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' کے معانی و اسرار کے ناپیدا کنار سمندر کا ایک قطرہ ضرور حاصل ہوگا۔

فائدہ: (۵) قرآن حکیم سورہ مدثر میں ہے ''وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ'' (آیت ۳۱) یعنی اور تمہارے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سوا بھی ایسی مخلوق کا مالک ہے جن کو صرف وہی جانتا ہے لیکن ہم انسان ہیں کہ اس کے علاوہ ہمارا کوئی رب نہیں اب ذرا اس کی تربیت پر غور کرو کہ سب اس کی مخلوق ہے وہ سب کا خالق و مالک اور رب ہے لیکن وہ تمہاری اس طرح تربیت فرماتا ہے کہ تمہیں صرف اس کے بندہ ہو لیکن تم ہو کہ اس کی عبادت اس طرح کرتے ہو جیسے لگتا ہے کہ اس کے سوا تمہارا کوئی رب دوسرا بھی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تربیت کا کمال حسن تو دیکھو کہ دن میں وہ تمہاری ہر قسم کی آفات و حادثات اور رات میں ہر قسم کی بلیات و مخافات (ڈر کی چیزوں، بلاؤں) سے بلا کسی بدل و عوض کے محافظت فرماتا ہے تم غور تو کرو تم رات میں بہت سے چوکیدار اور محافظ کو اپنے گھر کے دروازے پر تعینات کرتے ہو کہ چور، ڈاکو اور دشمن و قاتل سے تمہاری نگہبانی کریں رات بھر بیدار رہ کر چوکیدار نگہبانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں لیکن کیا وہ سانپ، بچھو اور دیگر حشرات الارض کی ایذا رسانی سے وہ تمہاری حفاظت کر سکتے ہیں؟ یا رات میں کوئی ناگہانی آفات و بلیات سماویہ نازل ہو جائے تو وہ تمہیں بچا سکتے ہیں؟ یقینا ہر ایک کا جواب نفی میں ہوگا لیکن حق تعالیٰ کی تربیت کا حال یہ ہے کہ وہ انسان کی ہر آفات و بلیات مخافات اور حشرات الارض سے محافظت فرماتا ہے جب کہ ابتدائی شب میں نہ جانے انسان کس قدر محرمات و منکرات شرعیہ کا

ارتکاب کرتا ہے یقیناً اس سے بڑھ کر عمدہ اور شاندار کسی کی کوئی تربیت نہیں ہوسکتی۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الآدمی بنیان الرب ملعون من ھدم بنیان الرب" آدمی رب کی عمارت ہے ملعون ہے وہ جس نے رب کی عمارت کو ڈھایا۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ" (الانبیاء:۴۲) یعنی تم فرماؤ شبانہ روز تمہاری کون نگہبانی کرتا ہے رحمن کے بالمقابل یقیناً صرف اور صرف وہی نگہبانی کرتا ہے جو بادشاہ جبار، واحد قہار، مقلب قلوب وابصار اور مطلع ضمائر واسرار اور رحمن ورحیم ہے۔

فائدہ: (۶) ارشاد کریم "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے جبریہ وقدریہ نے اپنے اپنے خیالات ونظریات پر استدلال قائم کیا ہے۔

قدریہ کہتے ہیں کہ بیشک اللہ رب العٰلمین ہے اور سارے جہان کا پروردگار ہے یہ اسی وقت درست ہوسکتا ہے جب یہ قول کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اور ان سے تکالیف کو دور فرمایا ہے لیکن یہ اگر کہا جائے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کافر میں کفر بھی پیدا کیا پھر وہ کافر کو کفر پر عذاب بھی دیگا حالانکہ وہ اسے ایمان کا حکم دیتا رہا ہے تو اس وقت رب و پروردگار نہیں ہوگا۔ جبریہ کہتے ہیں کہ جب ساری نعمتوں کا صدور اور سب الطاف اسی کی رحمت کے فیضان سے ہے تو ماننا واجب ہے کہ ایمان کا حصول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے کہ ایمان رب تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سب سے عظیم ترین نعمت ہے پس اللہ تعالیٰ رب العٰلمین اور سارے جہان کا محسن اسی وقت ہوگا کہ یہ قول کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین نعمت ایمان کو ان میں خلق فرمایا ہے۔

فائدہ: (۷) اسم جلالت لفظ اَللّٰه، لفظ رب سے کئی وجہوں سے افضل واشرف ہے جس کی تفصیل اسماء الٰہیہ کے بیان میں مذکور ہے اس کے باوجود دعا کرنے والے لوگ اَللّٰهُمَّ سے زیادہ رَبَّنَا دعا میں استعمال کرتے ہیں اس کے وجوہ ونکات بھی ماسبق میں بیان ہو چکے ہیں۔

فائدہ: (۸) العالمین عالم کی جمع ہے اور لفظ عالم ایسی جمع ہے کہ جس کا اپنے لفظ سے کوئی واحد نہیں۔ روح البیان میں ہے۔ "والعالمین جمع عالم والعالم جمع لا واحد له من لفظه" (ص 1/13)

فائدہ(9): حضرت وہب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور یہ دنیا ان میں سے ایک ہے، اور اس کی آبادی اس کے ویرانہ کے مقابلہ میں اتنی مقدار رکھتی ہے جتنی جنگل میں ایک خیمہ۔

اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔ کل عالم تین سو ساٹھ ہیں، ان میں تین سو ننگے پاؤں اور ننگے جسم

والے ہیں اور وہ ایسے ہیں جن کو اپنے خالق کا بھی علم نہیں، وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ اور باقی ساٹھ وہ ہیں جو کپڑے پہنتے ہیں۔ ذوالقرنین ان سے ملاقی ہوا، ان سے ہمکلام بھی ہوا۔ مگر حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عالم کا صحیح اندازہ کرنا محال ہے کما قال اللہ تعالیٰ۔ "وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ"۔ (اور تیرا رب اپنے لشکر کو خود جانتا ہے)

فائدہ: (10) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً مخلوق کو چار قسم بنایا:

۱۔ **ملائکہ**

۲۔ **شیاطین**

۳۔ **جنات**

۴۔ **انسان**

پھر ان سب کے دس اجزا بنائے، ان میں سے نو حصے سالم فرشتگان ہیں، باقی ایک جز انسان و جن و شیاطین ہیں۔ پھر اس کے دس اجزا ہوئے ان میں نو حصے شیاطین ہیں، باقی ایک حصہ انسان و جنات کا ہے۔ پھر ان دونوں کو دس اجزا پر منقسم فرمایا، ان میں سے نو حصے جنات کے، ایک حصہ انسان کا ہوا۔ پھر انسان کو ایک سو پچیس اجزا پر تقسیم فرمایا۔ ان میں سے پورا ایک سو بلاد ہند میں پیدا فرمایا، بعض ان میں ساطوح ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کے سر کتوں جیسے ہیں۔ بعض ان میں سے مالوخ ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کی آنکھیں سینہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ اور بعض ان میں ماسوخ ہیں یعنی وہ لوگ کہ جن کے کان ہاتھیوں کے کانوں جیسے ہیں، اور بعض ان میں مالوف ہیں یعنی وہ انسان کہ جن کے پاؤں اپنے قابو میں نہیں ان کا نام دوال پاَ ہے۔ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور ان پچیس سے بارہ اجزاء کو بلاد روم میں بھیجا جو کہ نسطوریہ، ملکانیہ، اسرائیلیہ کے نام سے موسوم ہیں۔ پھر ان ہر ایک کے چار گروہ ہیں، ان سب کا ٹھکانا بھی جہنم ہے اور باقی چھ بلادِ مشرق میں بھیجے جنہیں یاجوج ماجوج، ترک، خاقان، ترک حدخلخ، ترک خزر، ترک جریر کہا جاتا ہے۔ اور باقی چھ بلادِ مغرب میں بھیجے، جوزنج، زط، حبشہ، نوبہ، بربر، مشرکینِ عرب کے نام سے موسوم ہیں۔ ان سب کا ٹھکانا بھی جہنم ہے، باقی ایک حصہ بنی نوع انسان سے اہلِ توحید کا ہے باقی سب کے سب کافر و مشرک ہیں۔ پھر اہلِ توحید بھی تہتر فرقے ہو گئے، بہتر سب کے سب خسارہ میں یعنی اہلِ بدعت و ضلالت ہیں، صرف ایک ان میں ناجی ہے اور وہ اہل السنت والجماعت ہیں۔ اور گمراہ فرقوں کا حساب اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ جنہیں چاہے بخش دے جنہیں چاہے عذاب میں مبتلا کرے۔

حدیث شریف میں ہے سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بہتر گروہ ہوئے مگر میری امت تہتر گروہ ہوگی۔ان میں سے ایک کے سوا باقی تمام دوزخ میں جائیں گے۔صحابہ نے عرض کی حضور وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ لوگ ہیں جو میرے اور میرے صحابہ کے متبع ہیں یعنی جس اعتقاد اور قول وفعل کا میں اور میرے صحابہ پابند ہیں وہ بھی اس طرح ہوں گے۔یہی قول حق ہے اور فلاح تک پہنچانے والی یہی راہ ہے۔اس کے ماسوا باقی سب طریقے باطل اور دوزخ کی طرف کھینچ لے جانے والے ہیں۔اگر وہ لوگ ان طریقوں کو جائز وحق سمجھ کر عمل کرتے ہیں تو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ورنہ چند روز۔(روح البیان)

★★★

فصل سوم: تفسیر قولہ تعالی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (نہایت ہی مہربان رحمت والا)

رحمن ورحیم اسمائے الٰہیہ میں سے دو نام نہایت ہی متبرک ومقدس ہیں اس کے بارے میں دو قول ہیں ایک قول جمہور کا اور دوسرا سیبویہ کا جمہور یہ کہتے ہیں کہ دونوں صفت مشبہ کے صیغے ہیں لیکن مفید مبالغہ ہیں، رحمن فعلان کے وزن پر اور رحیم فعیل کے وزن پر ہے مفید مبالغہ دو طریقے سے ہے ایک تو اس لئے کہ صفت مشبہ دوام وثبوت پر دلالت کرتی ہے اور دوام وثبوت میں زیادتی معنی ظاہر ہے اس طرح مبالغہ کے معنی ملحوظ ہوئے۔دوسرا طریقہ وہ ہے جو زمخشری نے کہا ''کل ما ھو معدول عن اصلہ فھو ابلغ عن اصلہ'' یعنی جو صیغہ معدول ہوا پنی اصل سے تو وہ بمقابلہ اصل کے بلیغ ہوگا اور یہ دونوں معدول ہیں راحم سے سیبویہ کا قول یہ ہے کہ رحمن صفت مشبہ ہے لیکن رحیم اسم فاعل ہے جو مبالغہ کے لئے وضع کیا گیا ہے۔دونوں اسماء باب سمع سے فعل رحم سے مشتق ہیں جیسا کہ غضبان غضب سے اور علیم علم سے مشتق ہیں لیکن اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ جمہور کے نزدیک جب یہ دونوں صفت مشبہ ہیں اور صفت مشبہ لازم سے آتی ہے متعدی سے نہیں تو رحمن ورحیم کیونکر صفت مشبہ ہوگا جب کہ رحم متعدی ہے اس لئے رحمن، رحیم کو رحم متعدی سے مشتق ماننا درست نہ ہوگا اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ رحم گرچہ متعدی ہے لیکن لازم کی طرف منتقل کرلیا گیا ہے اور انتقال اس طرح ثابت ہے کہ باب کرم سے افعال خلقیہ آتے ہیں لہذا رحم جو باب سمع سے ہے بمنزلہ لازم کے ہوگیا لہذا رحمن ورحیم کو رحم سے مشتق ماننا درست ہے جیسا کہ زمخشری نے رفیع الدرجات کو اسی قاعدہ سے لازم گردانا ہے۔

رحمت کا لغوی معنی بہت مشہور ہے کہ لغت میں رحمت رقۃ القلب اور میلان طبعی کو کہتے ہیں جو فضل واحسان کا متقاضی ہے اور رحم مادر جو بچہ دانی کے معنی میں آتا ہے اسی سے ماخوذ ہے کیونکہ رحم مادر بھی اس کے اندر موجود شئی پر نرم

ہوتی ہے لیکن جب رب تعالیٰ کی طرف نسبت ہوتی ہے تو رقت قلب اور میلان نفس کے معنی سے تجرید کر کے معنی نتیجہ تفضّل واحسان مراد ہوتا ہے کیونکہ اللہ عزشانہ تعالیٰ قلب ونفس سے پاک ومنزہ ہے ورنہ ذات باری تعالیٰ کا ممکن ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے اسی وجہ سے رحمن ورحیم کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر باعتبار معنی مبدأ وسبب کے نہیں ہوسکتا بلکہ غایت وتاثیر کے اعتبار سے ہوگا کہ رقت قلب اور میلان نفس کی غایت ونہایت انعام واحسان پر ہوتی ہے پس رحمن ورحیم منعم کے معنی میں ہوگا یاد رہے کہ رحمت سے انعام مراد لینا یونہی نہیں ہے بلکہ بلاغت کے مشہور ومعروف قاعدہ مجاز مرسل اور استعارہ تمثیلیہ پر مبنی ہے۔

مجاز مرسل: اصطلاح میں سبب بولکر مسبب مراد لینے کو کہتے ہیں اور یہاں یہ صورت متحقق ہے کیونکہ رحمت یعنی رقت قلب یقیناً احسان وانعام کا سبب ہوتی ہے کہ کسی مجبور و پریشان حال، اپاہج کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اولاً دل میں رقت طاری ہوتی ہے اور یہی رقت اس پر انعام کا سبب بنتی ہے اس طرح انعام رحمت کا سبب بنتا ہے اور اس مقام پر یہی مراد ہے۔

استعارۂ تمثیلیہ: اصطلاح میں ایک ہیئت منتزعہ کو دوسری ہیئت منتزعہ کے ساتھ تشبیہ دینے کو کہتے ہیں۔پس جولفظ ہیئت مشبہ بہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی کو ہیئت مشبہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔اس مقام پر یہ صورت بھی متحقق ہوسکتی ہے وہ اس طرح کہ بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملہ انعام واحسان اور دفع مضرات کو سخی رحم دل بادشاہ کے معاملہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو وہ اپنی رعایا کے ساتھ بطور انعام واحسان کرتا ہے اور ان کی تکالیف کو دور کرتا ہے۔پس مشبہ بہ کے لئے جولفظ رحمت استعمال کیا گیا وہ مشبہ یعنی معاملہ ذات باری تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا اس لئے اس تاویل سے بھی اس پر رحمن ورحیم کا اطلاق صحیح ہے۔

رحمٰن ورحیم کے معنی میں فرق: یہ دونوں صیغے گرچہ نفس مبالغہ میں شریک ہیں تاہم لفظ رحیم کے معنی کی بہ نسبت رحمن کے معنی میں زیادتی مبالغہ پائی جاتی ہے کیونکہ یہ قاعدہ مشہور ہے کہ زیادتی مبانی زیادتی معانی پر دلالت کرتی ہے پس لفظ رحیم کے مقابلہ میں رحمن میں حروف زیادہ ہیں کہ رحیم میں چار ہیں تو رحمن میں پانچ حروف ہیں تو رحیم کے مقابلہ رحمن کے معنی میں بھی زیادتی ہوگی جیسا کہ قَطَعَ کے معنی اگر کاٹنا ہے تو قَطَّعَ بالتشدید کے معنی بار بار کاٹنے کے ہیں اسی طرح کبار بغیر تشدید کا معنی ''بڑا'' ہوتا ہے مگر کبار مشدد کا معنی بہت بڑا کے آتا ہے غرض اس سے بہت واضح ہے کہ کثرت حروف کثرت معانی پر دال ہے۔اس لئے رحمن کا معنی رحیم کے معنی کے مقابل بہرحال زیادہ

ہوگا۔رحمن کے معنی میں معنی رحیم کے بالمقابل زیادتی دوطرح سے ہے۔ایک زیادتی باعتبار کمیت کے، دوسری زیادتی باعتبار کیفیت کے، کمیت کی زیادتی سے مراد کثرت افراد ہے اور کیفیت کی زیادتی سے مراد قوت افراد ہے اگر کمیت (کثرت افراد) کے لحاظ سے زیادتی کا معنی مراد لیں تو "یارحمٰنَ الدنیا و رحیمَ الآخرۃ" کہا جائے گا کہ وہ ذات دنیا کے اعتبار سے رحمن اور آخرت کے اعتبار سے رحیم ہے کہ دنیا میں رحمت کے افراد زیادہ ہیں بہ نسبت آخرت کی رحمت کے افراد کے کیونکہ دنیا کی رحمت مومن، کافر دوست، دشمن، انسان، حیوان، نباتات، جمادات، جن وملٰئکۃ اور زمین وآسمان بلکہ اس میں موجود ہر فرد مخلوق کے لئے عام ہے اس کے برعکس آخرت میں مصداق وافراد رحمت کم ہوگی کہ آخرت میں رحمت صرف اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہوگی۔اسی زیادتی کے سبب بعض حضرات نے رحمن کی نسبت دنیا کی طرف اور رحیم کی نسبت آخرت کی طرف کرکے یوں ترجمہ کیا ہے "یارحمٰنَ الدنیا و رحیمَ الآخرۃ"لیکن بعض مفسرین نے زیادتی باعتبار کمیت سے صرف نظر کرکے زیادتی باعتبار کیفیت مراد لیا ہے کمیت سے انکار اس لئے کیا ہے کہ زیادتی کمیت کو ثابت کرنے کیلئے رحمٰن الدنیا کہا جائے اور رحیم کی نسبت آخرت کی طرف کی جائے تو باعتبار کیفیت رحیم میں زیادتی ہوگی اور رحمن میں کمی ہوگی پس اگر رحمن ورحیم ہر ایک صیغہ میں کثرت وقلت دونوں ثابت ہوگی تو صیغہ رحمن، رحیم سے ابلغ نہ ہوگا۔اسی وجہ سے زمخشری نے اس وجہ کو چھوڑ دیا اور صرف وجہ دوم کو ذکر کیا۔اس شبہ کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ رحمن ورحیم ہر ایک میں زیادتی وکمی دوحیثیت سے ہوگی جب لفظ رحمن ورحیم باعتبار کمیت استعمال کریں گے تو نظر کمیت پر ہوگی کیفیت پر نہیں اور جب باعتبار کیفیت دونوں کا استعمال ہوگا تو نظر کیفیت پر ہوگی کمیت پر نہیں۔غرض ہر اعتبار سے رحمن ہی ابلغ ہوگا۔

رہی زیادتی باعتبار کیفیت تو وہ اس طرح ہے کہ رحمن کی نسبت دنیا وآخرت دونوں طرف ہو اور رحیم کی اضافت صرف دنیا کی طرف ہو پھر آخرت کی نعمتیں سب بڑی بڑی دائمی اور عظیم الشان ہیں جب کہ دنیا کی نعمتیں چھوٹی بڑی دونوں ہیں اور عارضی بھی ہیں پس باعتبار کیفیت رحمن کا ترجمہ ہوگا کہ دنیا وآخرت دونوں جگہ بڑی بڑی عظیم الشان اور دائمی نعمت عطا فرمانے والے اور رحیم کا ترجمہ ہوگا اے دنیا کی ہر چھوٹی سے چھوٹی نعمتیں عطا فرمانے والا، اس طرح رحمن رحیم سے کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے زیادہ بلیغ ہوگا۔

تقدیم رحمن کے وجوہ: اس مقام پر مشہور ومعروف اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے جب رحمن ابلغ واعلیٰ ہے اور لفظ رحیم اس کی بہ نسبت بلیغ وادنی، اور مقام ذکر میں ضابطہ یہ ہے کہ ادنی سے اعلیٰ

کی طرف اور بلیغ سے ابلغ کی طرف انتقال ہوتا ہے نہ کہ ابلغ سے بلیغ کی طرف کیونکہ یہ قاعدہ فصاحت کے خلاف ہے ۔ پھر تقاضہ عقل بھی یہی ہے کہ ادنی جب اعلیٰ میں شامل ہے تو اعلیٰ کے ذکر کے بعد ادنی کے ذکر کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے لیکن اگر ترتیب وار ادنی پھر اعلیٰ ذکر کیا جائے تو نیا معنی اور جدید فائدہ حاصل ہوتا ہے تو ادنی پر اعلیٰ کو اور بلیغ پر ابلغ کو کیوں مقدم کیا گیا؟ اس کے کئی جوابات ہیں۔

اول: لفظ رحمٰن کی دلالت باعتبار کمیت رحمت دنیا کی زیادتی پر ہوتی ہے اور رحمت دنیا وجود کے اعتبار سے رحمت آخرت سے مقدم ہے لہذا رحمت دنیا پر لفظ دال یعنی رحمن کو مقدم کیا تا کہ دال کا وجود ذکری، مدلول کے وجود طبعی کے موافق ہو جائے۔

دوم: لفظ رحمٰن کو اسم جلالت لفظ اَللّٰہ سے زیادہ مشابہت ہے کیونکہ اللہ کے علاوہ، غیر اللہ پر اس کا بالکل اطلاق نہیں ہوسکتا جس طرح کہ اللہ کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہوتا اس مناسبت سے رحمن علم کی طرح ہو گیا اور یہ معلوم کہ علم وصف سے مقدم ہوتا ہے پس رحمن کو رحیم پر مقدم کیا کہ رحیم کا اطلاق وصف کی طرح غیر اللہ پر بھی ہوسکتا ہے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ارشاد فرمایا "وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" غیر اللہ پر رحمن کا اطلاق اس لئے نہیں ہوتا کہ رحمن اس منعم حقیقی کو کہتے ہیں جو انعام کے انتہائی کمال کے درجہ کو پہنچا ہوا ہو۔ (بیضاوی) اور یہ معنی غیر اللہ پر صادق نہیں آتا اس لئے رحمن کا اطلاق غیر خدا پر نہیں ہوسکتا اور غیر اللہ پر یہ معنی اس لئے صادق نہیں آتا کہ منعم حقیقی اور انعام کے درجہ کمال کا معنی سوائے خدائے تعالیٰ کے کسی میں نہیں پایا جاسکتا چونکہ منعم حقیقی اس ذات منعم کو کہتے ہیں جو خالص اپنی ذاتی نعمتیں عطا فرماتا ہو انعام کرنے میں واسطہ وذریعہ نہ ہو اور انعام کا درجہ کمال یہ ہے کہ بعد انعام اس کے عوض و بدل کا خواہاں نہ ہو اور بندہ کا حال یہ ہے کہ لطف و انعام کر کے اس کے عوض و بدل کا خواہاں ہوتا ہے ۔ یاد رہے کہ بدل دو طرح کا ہوتا ہے ایک جلب منفعت دوم دفع مضرت، پھر جلب منفعت کی دو صورتیں اور دفع مضرت کی دو صورتیں کی جاسکتی ہیں۔

یعنی دنیا میں جلب منفعت و دفع مضرت اور آخرت میں جلب منفعت و دفع مضرت، آخرت میں جلب منفعت اور دفع مضرت کا مفہوم واضح ہے وہ یہ کہ بندہ انعام واکرام اس امید پر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں ثواب کثیر اور جنت نعیم عطا فرمائے گا اور آخرت کی مضرت و پریشانی کو دور فرمائے گا اور دنیا میں جلب منفعت اس طور پر حاصل کرتا ہے کہ دنیا میں وہ اپنی تعریف کا خواہاں ہوتا ہے اور دفع مضرت اس طور پر کرتا ہے کہ رقیت جنسیت کو زائل کرتا ہے اور

اپنے دل سے مال کی محبت کو ختم کرنا ہوتا ہے اور اپنے سے بخالت جیسے عیب کو دور کرتا ہے۔ غرض کہ بندہ ہر حالت میں اپنے انعام واکرام پر عوض و بدل کا طالب ہوتا ہے اس لئے اس پر منعم حقیقی کا اطلاق نہیں ہوسکتا علاوہ ازیں بندہ انعام و اکرام جتنا بھی کرے بہر حال وہ واسطہ ہی ہوتا ہے کیوں کہ خود تمام نعمتوں کا پیدا کرنا سب کو منصۂ شہود و وجود پر لانا، پھر بندہ کو مستحقین تک پہنچانے کی توفیق رفیق عطا فرمانا اور جذبہ ایثار اور شوق تہدیہ اور داعیہ احسان وغیرہا عادات خیرات پر ابھارنا ساری نعمتوں پر اسے لطف اندوز ہونے کی قوتیں پیدا ہونا بلکہ انگنت بے شمار غیر متناہی نعمتیں سب خدائے تعالیٰ ہی کے خلق وایجاد سے ہیں بغیر رب تعالیٰ کے عطا کئے کوئی ان چیزوں پر قادر نہیں ہوسکتا۔

سوم: تقدیم رحمن کی تیسری وجہ یہ ہے کہ رحمن کے معنی میں زیادتی باعتبار کیفیت ملحوظ ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ معنی رحمن کی دلالت عظیم وجلیل نعمتوں پر ہوتی ہے اور یہ مقام، مقام حمد ہے جس میں اللہ عز شانہ تعالیٰ کے اوصاف کمالیہ کا ذکر ہے لہٰذا رحمن کو مقدم کیا تا کہ اول نگاہ میں اللہ عز شانہ کی بڑی بڑی نعمتیں ظاہر ہوں لیکن چھوٹی چھوٹی نعمتیں جو اس سے رہ گئیں ان کی طرف لفظ رحیم سے دلالت ہوگئی لہٰذا لفظ رحیم کو بطور تکملہ وتتمہ ذکر کیا گیا گویا رحیم مکمل ہوا اور مکمل شئ بعد میں ہوتا ہے اس کے ذکر سے اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ رب العزت کی عظمت وجلالت شان کے پیش نظر اس سے بڑی ہی نعمتیں نہ مانگو بلکہ چھوٹی سے چھوٹی نعمتوں کو بھی اس سے مانگو اس لئے رب تعالیٰ سے دنیا کی سلطنت اور عقبیٰ کی جنت ہی نہ مانگو بلکہ جوتا کا تسمہ اور نمک کے دانہ کی بھی حاجت ہو تو بے نیاز رب ذوالجلال سے مانگو!

لفظ رحمن کی نحوی تحقیق: لفظ رحمن نحوی اعتبار سے منصرف ہے یا غیر منصرف اس بارے میں اولاً نحو کا ایک ضابطہ ذہن نشین کر لینا چاہئے وہ ضابطہ یہ ہے کہ الف ونون زائدتان کبھی اسم میں ہوتے ہیں اور کبھی وصف میں ہوتے ہیں اگر اسم میں زیادتی ہو تو اس کے غیر منصرف ہونے کے لئے علمیت شرط ہے اور اگر وصف میں الف ونون زائد ہوں تو اس کے غیر منصرف ہونے کے لئے بعض نحویوں کے یہاں انتفاء فعلانہ شرط ہے جب کہ بعض نحویوں کے نزدیک وجود فعلی شرط ہے یہی وجہ ہے کہ سکران کو غیر منصرف پڑھا گیا کہ اس کی مؤنث فعلی کے وزن پر آتی ہے اور فعلانہ کے وزن پر نہیں آتی اس کے برعکس ندمانہ کو منصرف پڑھا گیا ہے کہ اس کی مؤنث فعلانہ کے وزن پر ندمانہ آتی ہے۔

اس تمہید کے بعد لفظ رحمن کی اعرابی حیثیت واضح ہے وہ یہ کہ لفظ رحمن غیر منصرف ہوگا کہ اس کی مؤنث فعلانہ کے وزن پر نہیں آتی البتہ وہ لوگ جو وجود فعلیٰ کی شرط لگاتے ہیں ان کے نزدیک منصرف ہوگا کیونکہ لفظ رحمن کا، ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونے کی وجہ سے کوئی صیغۂ مؤنث نہیں آتا چہ جائے کہ فعلیٰ آئے۔

اس مقام پر امام رازی نے تفسیر کبیر میں رحمن ورحیم کی تعریف اور دونوں اسموں کے درمیان فرق ظاہر کرتے ہوئے چند دلنشین اور ایمان افروز حکایات بیان فرمائے ہیں فوائد کے ضمن میں ذیل کے سطور میں اس کا خلاصہ پیش ہے۔

فائدہ (۱): رحمن وہ ذات منعم ہے جو ایسی نعمتیں انعام فرمائے جس کا صدور بندوں سے متصور نہ ہو اور رحیم وہ ذات منعم جو ایسی نعمتیں عطا فرمائے جس کے مثل کا صدور بندوں سے ہوسکتا ہے۔

حکایت (۱): سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادہم سے یہ ایمان افروز حکایت مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں کسی قوم کا مہمان بنا تھا انہوں نے میرے لئے دسترخوان بچھایا اور کھانے چنے اتنے میں ایک کوا اترا اور ایک روٹی اچک کر اڑ گیا حضرت خواجہ فرماتے ہیں میں حیرت وتعجب سے اس کے پیچھے چلا میں نے دیکھا کہ وہ کوا ایک ٹیلے میں اترا جہاں ایک شخص پیر سے بیڑیوں میں جکڑا ہوا اور ہاتھ میں ہتھکڑی لگا مقید ومحبوس پڑا ہے کوے نے اس روٹی کو اس مقید ومحبوس انسان کے منھ پر ڈال دیا اس طرح اس نے اپنی بھوک مٹائی۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ رحمن ورحیم کی رحمتوں اور رزق کی وسعتوں کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

حکایت (۲): حضرت ذوالنون مصری سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں گھر میں تھا کہ اچانک میرے قلب میں ایک ولولہ اٹھا اور میری کیفیت ایسی ہوگئی کہ میں اپنے آپ کا بھی مالک نہ تھا چنانچہ اسی بیخودی کے عالم میں، میں گھر سے نکلا یہاں تک کہ میں دریائے نیل کے کنارے آگیا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک طاقتور بچھو دوڑا جارہا ہے میں اس کے پیچھے چلا وہ بچھو بالکل لب دریا پہنچ گیا اور لب دریا میں پڑے ہوئے ایک مینڈک کی پشت پر اچھل گیا پھر مینڈک تیرنے لگا حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ میں کشتی پر بیٹھا اور اس مینڈک کے پیچھے چلا کہ دیکھیں یہ کہاں جارہا ہے مینڈک دریائے نیل کے اس پار پہنچا، مینڈک کی پشت پر بیٹھا ہوا بچھو اچھل کر خشکی پر آگیا اور تیزی سے دوڑنے لگا میں بھی اس کے پیچھے چلا یہاں تک کہ ایک ایسے درخت کے پاس پہنچا جس کے سایہ میں ایک جوان سویا تھا اس کے قریب ہی ایک بھاری اژدھا جوان کو ڈسنے بڑھ رہا تھا جونہی اژدہا جوان کے قریب پہنچا کہ بچھو نے اچھل کر اژدھا پر حملہ کرکے اس کو ڈس لیا اور اژدہا نے جوابی کاروائی کرتے ہوئے بچھو کو ڈنک مار دیا بالآخر سانپ اور بچھو دونوں کی موت ہوگئی اور جوان سانپ اور بچھو دونوں کے شر سے محفوظ رہ گیا۔ (رازی صفحہ ۸۹)

حکایت (۳): حیٰوۃ الحیوان میں علامہ دمیری فرماتے ہیں میں نے بہت سی کتابوں میں یہ روایت دیکھی ہے، جس کو زید بن اسلم نے اپنے والد کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے لوگوں

سے مخاطب تھے تو ایک شخص اپنا لڑکا ساتھ لئے ہوئے حاضر مجلس ہوا اس کو دیکھ کر حضرت فاروق اعظم نے فرمایا میں نے ایسی مشابہت کوؤں میں بھی نہیں دیکھی جیسی کہ تجھ میں اور تیرے لڑکے میں ہے اس شخص نے جواب دیا امیر المؤمنین اس لڑکے کو اس کی والدہ نے اس وقت جنم دیا جب کہ وہ مر چکی تھی یہ سن کر حضرت فاروق اعظم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اس بچہ کا واقعہ مجھ سے بیان کرو۔

اس شخص نے کہا امیر المومنین! ایک مرتبہ میں نے سفر کا ارادہ کیا اس وقت اس کی والدہ مجھ سے حاملہ تھی اس کی والدہ نے کہا تم اس حال میں چھوڑ کر سفر پر جا رہے ہو کہ میں حمل کے بار سے بوجھل ہو رہی ہوں میں نے کہا میں اس بچہ کو جو تیرے حمل میں ہے اللہ کے سپرد کرتا ہوں یہ کہہ کر میں سفر پر روانہ ہو گیا اور کئی سال تک گھر سے باہر رہا پھر جب گھر واپس آیا تو گھر کا دروازہ مقفل دیکھ کر میں نے پڑوسیوں سے پوچھا کہ میری بیوی کہاں ہے انہوں نے بتایا کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے میں نے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا اس کے بعد میں اپنی بیوی کی قبر پر گیا میرے چچا زاد بھائی میرے ساتھ تھے میں کافی دیر تک قبر پر رکا روتا رہا میرے بھائیوں نے مجھے تسلی دی اور واپسی کا ارادہ کیا اور مجھے واپس لانے لگے چند گز ہی ہم آئے ہوں گے کہ مجھے قبرستان میں ایک آگ نظر آئی میں نے اپنے بھائیوں سے پوچھا کہ یہ آگ کیسی ہے انہوں نے جواب دیا کہ روزانہ رات کے وقت بھابھی مرحوم کی قبر سے یہ آگ نمودار ہوتی ہے ۔میں نے یہ سن کر ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا اور کہا کہ یہ عورت تو بہت نیک اور تہجد گذار تھی تم مجھے دوبارہ اس کی قبر پر لے چلو چنانچہ وہ لوگ مجھے قبر پر لے گئے جب میں قبرستان میں داخل ہوا تو میرے چچا زاد بھائی وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے اور میں تنہا اپنی مرحومہ بیوی کی قبر پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قبر کھلی ہوئی ہے اور میری بیوی بیٹھی ہے اور یہ لڑکا اس کے چاروں طرف گھوم رہا ہے ابھی میں اسی طرف متوجہ تھا کہ ایک غیبی آواز آئی کہ اے اللہ کو اپنی امانت سونپنے والے اپنی امانت واپس لے لے اور اگر تو اس کی والدہ کو بھی اللہ کے سپرد کرتا تو وہ بھی تجھکو مل جاتی یہ سن کر میں لڑکے کو اٹھا لیا میرے لڑکے کو اٹھاتے ہی قبر بند ہو گئی امیر المومنین میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ سچا واقعہ ہے ۔(صفحہ ۲۲۵ / ۳)

حکایت (۴): اسی طرح عبید بن واقد لیثی بصری فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حج کے لئے روانہ ہوا تو اتفاقاً میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جسکے ساتھ اس کا لڑکا تھا جو نہایت ہی خوبصورت اور تیز رفتار تھا میں نے اس شخص سے پوچھا یہ لڑکا کس کا ہے اس شخص نے جواب دیا یہ میرا ہی لڑکا ہے اس کے متعلق ایک عجیب وغریب واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ

ایک مرتبہ میں حج کے لئے گیا میرے ہمراہ میری بیوی یعنی اس لڑکے کی ماں تھی اور یہی لڑکا اس کے بطن میں تھا دوران سفر اسکی والدہ کو دردزہ شروع ہوا اور یہ لڑکا پیدا ہوا لیکن اس کی والدہ عسرت ولادت کی وجہ سے انتقال کر گئی چنانچہ میں اس کی والدہ کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گیا اور جب تکفین وغیرہ سے فارغ ہوا اور روانگی کا وقت قریب آیا تو میں اس لڑکا کو ایک پارچہ میں لپیٹ کر ایک غار میں رکھ دیا اور اس کے اوپر پتھر رکھ دیا اور یہ خیال کرتا ہوا قافلہ کے ساتھ روانہ ہو گیا کہ یہ بچہ کچھ دیر بعد مر جائے گا حج سے فارغ ہو کر جب ہم لوٹے اور اس منزل پر پہنچے تو میرے ہمراہیوں میں سے ایک شخص دوڑ کر فوراً اس غار پر پہنچا اور پتھر ہٹایا تو کیا دیکھتا ہے کہ لڑکا زندہ ہے اور اپنی انگلی چوس رہا ہے اور اس میں سے دودھ جاری ہے چنانچہ میں نے اس کو اٹھا لیا اور اب یہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ (حیوۃ الحیوان) ص ۲۲۵۔۲۶ / ج ۳)

رب تعالیٰ کی بے عدیل و بے مثیل شان کریمی اور رحمتوں کا غیر متناہی سلسلہ صرف تربیت انسان ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق بلکہ جملہ حیوانات و بہائم اور چرند و پرند کے ساتھ بھی رب کائنات کی ایسی حیرت انگیز رحمتیں جڑی ہیں کہ اسے دیکھ سن کر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ جیسے کلمات طیبات نکلتے ہیں۔ پرندوں میں صرف ایک پرندہ کوا، اور اس کی دلادت و تربیت کو دیکھئے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ کس انداز سے ایک چھوٹے سے بند انڈا میں اس کی تخلیق فرماتا ہے اس میں کیسے زندہ رہتا ہے اور پھر جب انڈا کے چھلکا سے وہ بچہ باہر نکلتا ہے تو اس کے بدن پر ایک رواں نہیں ہوتا وہ لال گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے، اس وقت کوا اپنے بچہ کو چھوڑ کر اپنے گھونسلہ سے فرار ہو جاتا ہے قطعاً اس کی پرورش نہیں کرتا مگر اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اس کی تربیت کا ایسا انتظام فرمایا کہ چھوٹے چھوٹے مچھر اور مچھر کے مثل کیڑے اس کوا کے بچے کے جسم سے جو ایک مردہ گوشت کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے لپٹ جاتے ہیں انھیں مچھروں کو وہ بچہ اپنی چونچ سے چوگ چوگ کر کھاتا رہتا ہے بچہ اسی طرح غذا حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ طاقتور ہو جاتا ہے اور اس کے بال و پر نکل جاتے ہیں اب اس کی ماں اس کے پاس آتی ہے اسی سبب سے اہل عرب اپنی دعاؤں کے الفاظ میں یہ کہتے ہیں۔ ''یارزاق النعاب فی عشہ'' ان مثالوں سے واضح ہے کہ بیشک اللہ عزشانہ تعالیٰ کا فضل و احسان سب پر عام، تام اور شامل و کامل ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ رحمت کا مفہوم و مقصود وہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں چنانچہ ہم جب وقائع و حوادث پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ وہ دو طرح کے ہیں ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کو ہم رحمت گمان کرتے ہیں حالانکہ وہ رحمت نہیں ہوتے بلکہ عذاب و مصیبت ہوتے ہیں اور بعض ان میں سے وہ ہوتے ہیں جو بظاہر عذاب و مصیبت معلوم ہوتے ہیں

حالانکہ وہ حقیقت میں فضل واحسان اور رحمت وانعام ہوتے ہیں۔

قسم اول کی مثال اس والد کی ہے جو اپنے لڑکا کو چھوڑ دیتا ہے کہ جو چاہے کرے اس کو ادب نہیں سکھاتا اور نہ تعلیم حاصل کرنے کو کہتا وہ لڑکا بالکل آزاد گھوم رہا ہے پس والد کا یہ طریقہ لڑکا کے حق میں بظاہر رحمت ہے لیکن حقیقت میں اس کے لئے عذاب ہے اس کے برعکس دوسری قسم کی مثال اس والد کی ہے جو اپنے لڑکا کو ہر وقت تعلیم پر ابھارتا ہے اچھی تعلیم وتربیت دیتا ہے اور برے افعال پر اسے تنبیہ بھی کرتا ہے پس اس والد کا یہ طریقہ کار بظاہر اس کے حق میں عذاب ہے لیکن حقیقت میں اس کے لئے رحمت اور فضل واحسان ہے اسی طرح وہ انسان جس کے ہاتھ میں مرض آکلہ ہو جائے یہ مرض ایسا ہے جس میں موضع مرض مثلاً ہاتھ کاٹا جاتا ہے ورنہ یہ بیماری پورے بدن میں سرایت کر جاتی ہے پس آکلہ کے مریض کے ہاتھ کو کاٹنا اس کے حق میں بظاہر بڑی مصیبت بلکہ عذاب ہے لیکن حقیقت میں اس کے لئے راحت و رحمت ہے کہ بقیہ جسم کی ہلاکت سے محفوظ ہونے کا ذریعہ ہے جو بیوقوف ہوتا ہے ظواہر کی تکالیف سے دھوکہ کھا کر پریشان ہو جاتا ہے لیکن جو عقلمند ہوتا ہے اس کی نگاہ سرائر پر ہوتی ہے اس لئے وہ ظاہری تکلیف پر مطمئن رہتا ہے۔

ظاہری رحمت اور حقیقی رحمت کو تمثیلی طور پر سمجھنے کے بعد یہ یقین کرنا چاہئے کہ اس دارالتکلیف میں رنج ومحن، آفات و بلیات اور تکالیف ومشقتیں درپیش ہوتی ہیں وہ گرچہ بظاہر مصیبت وعذاب معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں رحمت وحکمت ہیں اس لئے حکمت میں کہا گیا ہے کہ شر قلیل کی وجہ سے خیر کثیر کو ترک کرنا شر کثیر ہے۔ یہ یقین کیجئے کہ اس دارالتکلیف میں انسان کو احکام واوامر کی تکالیف سے مکلف بنانے سے مقصود ارواح کو علائق جسمانیہ اور وساوس شیطانیہ سے منزہ اور پاک وصاف رکھنا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ ''اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ''(الاسرائ) یعنی اگر تم بھلائی کروگے تو اپنے بھلے کے لئے کروگے۔ جہنم یقیناً سخت تکلیف دہ آگ سے بھرا گھر ہے مگر اس کی تخلیق سے اشرار کو ابرار کے اعمال کی طرف پھیرنا اور انکو دارالفرار سے دارالقرار کی طرف کھینچنا مقصود ہے۔ قرآن حکیم میں فرمان الٰہی ہے ''فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ'' (الذاریات:۵۰) اللہ کی طرف دوڑ پڑو۔

جو ظاہر میں مصیبت ہے اور باطن میں رحمت ہے اس کی قریب ترین اور واضح مثال حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا واقعہ ہے جو قرآن حکیم میں مذکور ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی بنیاد امر ظاہر پر رکھی اس لئے بیچ دریا میں حضرت خضر علیہ السلام کے کشتی کے پٹرے کو اکھاڑنے کو، کھیلتے ہوئے بچے کے قتل کو اور گرتی ہوئی دیوار کے سیدھی کر دینے پر اعتراض وارد فرمایا مگر حضرت خضر علیہ السلام نے احکام کی بنا حقائق واسرار پر رکھی تھی اس لئے

فرمایا ''اَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَھَا وَ کَانَ وَرَآءَھُمْ مَّلِکٌ یَّاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَۃٍ غَصْبًا، وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰہُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَآ اَنْ یُّرْھِقَھُمَا طُغْیَانًا وَّکُفْرًا فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَھُمَا رَبُّھُمَا خَیْرًا مِّنْہُ زَکٰوۃً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ، وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیْنِ یَتِیْمَیْنِ فِی الْمَدِیْنَۃِ وَ کَانَ تَحْتَہٗ کَنْزٌ لَّھُمَا وَ کَانَ اَبُوْھُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنْ یَّبْلُغَآ اَشُدَّھُمَا وَ یَسْتَخْرِجَا کَنْزَھُمَا ۖ رَحْمَۃً مِّنْ رَّبِّکَ'' (الکھف ۷۹) یعنی وہ جو کشتی تھی کچھ محتاجوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کردوں اور ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو ہر ثابت کشتی کو زبردستی چھین لیتا اور وہ جو لڑکا تھا اس کے ماں باپ مسلمان تھے تو ہمیں ڈر ہوا کہ وہ انکو سرکشی اور کفر پر چڑھا دے تو ہم نے چاہا کہ ان دونوں کا رب اس سے بہتر ستھرا اور اس سے زیادہ مہربانی میں قریب عطا کرے، رہی وہ دیوار تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا اور ان کا باپ نیک آدمی تھا تو آپ کے رب نے چاہا کہ وہ دونوں جب اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکالیں آپ کے رب کی رحمت سے اور یہ جو کچھ میں نے کیا اپنے حکم سے نہ کیا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حکیم و محقق وہ ہے جو اپنے امر کی بنیاد حقائق پر رکھتا ہے ظواہر پر نہیں لہذا اے رب تعالیٰ کے فرمانبردار بندو! جب تم کو کسی ایسے حادثہ سے سابقہ پڑ جائے جس کو تمہاری طبیعت ناپسند کرے اور عقل متنفر ہو جائے تو بیقراری نہ ظاہر کرنا بلکہ صبر کا دامن تھامے رہنا اور یقین کرنا کہ ان مصائب کے پردہ میں اسرار خفیہ، حکمت بالغہ اور رحمت واسعہ مضمر ہے بیشک اس کی رحمت و حکمت اسی کی متقاضی ہے بیشک اگر تم اسی عادت پر قائم رہے تو اس وقت ارشاد ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کے اسرار کے سمندر کا ایک قطرہ تمہیں بھی مل جائے گا۔

فائدہ: (۲) سورہ فاتحہ میں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کو رحمن و رحیم سے متصف فرمایا، بندۂ مومن نماز میں سورہ فاتحہ کے ضمن میں رب تعالیٰ کے ان دونوں وصف مبارک کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ ان دونوں اوصاف مبارکہ کی تلاوت میں بندۂ مومن کو کتنا فیض اور کیسی عظیم برکت حاصل ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو صرف ایک رحمت عطا کیا ارشاد ہے ''وَ رَحْمَۃً مِّنَّا ۚ وَ کَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا'' (مریم ۲۱) یہی ایک رحمت حضرت مریم کے لئے کفار و فجار کی زجر و توبیخ سے نجات کا ذریعہ اور سبب بن گئی اور نمازی بندہ شب و روز کی صرف فرض کی سترہ رکعتوں میں ۳۴ مرتبہ کہتا ہے کہ اللہ رحمن ہے اللہ رحیم ہے۔ چونکہ ہر رکعت میں کم از کم دو مرتبہ تسمیہ والحمد میں ان دونوں مبارک الفاظ کی تلاوت کرتا ہے جب ایک مرتبہ رحمت کا ذکر حضرت مریم رضی اللہ

تعالیٰ عنہا کے لئے مکروہات سے نجات کا ذریعہ ہوگیا تو کیا زندگی بھر جو بندۂ مومن اللہ رحمن ہے اللہ رحیم ہے کا وظیفہ ہر ساعت کرتا رہے گا وہ ناروعار سے محفوظ نہ رہے گا یقینا رہے گا ان شاء اللہ الرحمن الرحیم۔

فائدہ: (۳) بیشک اللہ عزشانہ تعالیٰ رحمن ہے اس لئے کہ اللہ اس چیز پر قادر ہے جس پر بندہ قادر نہیں ہوسکتا اور اللہ رحیم ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ وہ فعل کرتا ہے کہ اس جیسے فعل پر بندہ قادر نہیں ہوسکتا گویا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے میں رحمن ہوں دیکھو تم اپنی طرف سے حقیر وقلیل نطفہ چھوڑتے ہو لیکن میں اس کو حسین وجمیل صورت میں ڈھال دیتا ہوں تم میری بارگاہ میں ناقص طاعت پیش کرتے ہو لیکن میں تمہیں خوبصورت جنت عطا کرتا ہوں۔

فائدہ: (۴) روایت ہے کہ ایک نوجوان کی وفات کا وقت قریب ہوا لیکن اس کی زبان پر کلمہ شہادت جاری نہیں ہورہا تھا لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نوجوان کے بارے میں خبر دی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس نوجوان کے پاس تشریف لائے اور کلمہ شہادت پڑھانے لگے وہ نوجوان حرکت کرتا بڑا مضطرب تھا لیکن زبان پر کلمۂ شہادت جاری نہیں ہورہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار فرمایا کیا یہ نماز پڑھتا تھا؟ کیا روزہ رکھتا تھا؟ کیا زکوٰۃ دیتا تھا لوگوں نے عرض کیا ہاں پھر ارشاد فرمایا کیا اس نے اپنے والدین کی نافرمانی کی ہے لوگوں نے بتایا ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کی ماں کو بلاؤ ان کی ماں آئی اور وہ ایک آنکھ کی کانی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے اسے معاف نہیں کیا اس نے عرض کیا میں معاف نہیں کرونگی کیونکہ اس نے مجھے ایسا طمانچہ مارا ہے کہ میری ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لکڑیاں لاؤ اور آگ جلاؤ بوڑھی خاتون نے عرض کیا آپ آگ سے کیا کریں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں تمہارے سامنے آگ میں جلادونگا تاکہ تم کو تکلیف دینے کا بدلہ ہوجائے اتنا سننا تھا کہ وہ بوڑھی خاتون بولی میں نے معاف کیا میں نے معاف کیا، کیا میں نے اسی آگ کے لئے اسے نو ماہ حمل میں رکھا، کیا میں اسے جلنے کے لئے دوسال اپنا دودھ پلایا تھا پس ماں کتنی مہربان ہوتی ہے اب اس وقت اس جوان کی زبان کھلی اور کلمہ طیبہ ''اشهد أن لا اله الا الله محمد رسول الله'' جاری ہوا۔

ماں رب کے فضل سے اپنے بچوں پر بڑی مہربان ہوتی ہے پھر بھی اسے زیادہ سے زیادہ رحیمہ مشفقہ کہہ سکتے ہیں، رحمانہ کا اس پر اطلاق نہیں ہوسکتا لیکن اس قدر اقل قلیل عطائی رحمت کے باوصف اس نے آگ میں جلانے کو گوارہ نہیں کیا تو وہ ذات کریم رحمن ورحیم جسے بندوں کے جرم وجنایات سے کوئی ضرر ونقصان نہیں پہنچتا بلکہ مسلسل جرم وجنایات کے باوجود اس پر اپنی بخشش ونوازشات کا سلسلہ جاری رکھتا ہے ایسی ذات کریم اس مومن بندہ پر جو تقریباً ستر برس تک کلمہ

طیبہ پڑھتا رہا اور رحمن ورحیم کا وظیفہ ہر ساعت کرتا رہا کیسے اس کو آگ میں جلانے کی اجازت دے گا۔

فائدہ (۵): میدان احد میں جب حضور رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے تو بھی دشمنوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا نہ دی بلکہ ارشاد فرمایا اے اللہ میری قوم کو ہدایت عطا فرما بیشک وہ لوگ مجھے نہیں جانتے پھر قیامت کے دن ارشاد فرمائیں گے امتی امتی اے اللہ میری امت کا معاملہ میرے سپرد فرما دنیا و آخرت میں نبی کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت کے ساتھ یہ عظیم کرم نوازی اس لئے ہے کہ اللہ رحمن ورحیم نے آپ کو رحمۃ للعلمین بنا کر مبعوث فرمایا ہے ارشاد رب العلمین ہے "وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ" جب رسول رؤف ورحیم کی عطائی رحمت کا یہ حال ہے تو اس رب العلمیں کی ذاتی رحمتوں کی وسعتوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جو رحمن ورحیم ہے۔

نیز مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللّٰھُمَّ اجعل حساب امتی علیٰ یدی" اے اللہ میری امت کا حساب میرے ہاتھ میں کر دے دوسری طرف نبی کریم کا یہ فعل بھی منقول ہے کہ دو درہم کے قرض دار میت کی نماز جنازہ پڑھنے سے احتراز فرمایا حالانکہ آپ رحمۃ للعلمین تھے لیکن آپ کی رحمت عطائی ہے اور رب کی رحمت ذاتی ہے اس لئے ایسے مجرمین کے لئے بھی یہ ارشاد ہوتا ہے "فذرنی وعبیدی واترکنی وامتک فانی الرحمن الرحیم" یعنی میرے بندوں کو اور مجھے چھوڑ دو اور اپنی امت کو میرے حوالہ کر دو بیشک میں رحمن ورحیم ہوں بیشک میری رحمت غیر متناہی ہے اور میرے بندے کا گناہ متناہی ہے اور غیر متناہی کے سامنے متناہی ہلاک وفنا ہو جاتا ہے پس بیشک تمام مخلوقات کے معاصی میری رحمت کے سمندر میں غرق ہو کر ہلاک ہو جائیں گے اس لئے کہ میں ہی رحمن ورحیم ہوں۔

★★★★

فصل چہارم: تفسیر قولہ تعالیٰ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (روز جزا کا مالک)

فائدہ: (۱) یعنی اللہ رب العلمین رحمن ورحیم روز جزا اور یوم حشر کا مالک ہے روز جزا کی مالکیت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے ہوا کہ نیکوکار، بدکار، فرماں بردار نافرمان اور موافق ومخالف کے درمیان تفریق روز جزا ہی میں ہوگا چنانچہ ارشاد ہے "لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی" (النجم ۳۱) یعنی بروں کو ان کی برائی کا اور نیکوں کو نیکی کا بدلہ عطا کرے اور ارشاد ہے "اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ" کیا ہم انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان جیسا کر دیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو شریر بے حکموں کے برابر

ٹھہرادیں (ص:۸) اور فرمان ہے "اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى" بیشک قیامت آنے والی ہے قریب تھا کہ میں اسے سب سے چھپاؤں کہ ہر جان اپنی کوشش کا بدلہ پائے (طہ:۱۵)

یاد رہے کہ وہ شخص جو مظلوم پر ظلم وزیادتی کرنے والے ظالم وجابر انسان پر مسلط ہوجائے اور ہر طرح قابو پا جائے مگر وہ پھر بھی اس ظالم سے انتقام نہیں لے رہا ہے۔ پس اس حاکم وغالب شخص کا اس ظالم سے انتقام نہ لینا یا تو اس وجہ سے ہے کہ وہ حاکم اس سے انتقام لینے سے عاجز ہے یا اس ظالم کے ظلم وزیادتی سے ناواقف جاہل ہے یا پھر اس ظالم کے ہر کرتوت اور جبر وظلم سے راضی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں اوصاف یعنی عجز، جہالت اور رضا، رب تعالیٰ کے حق میں محال ہے لہذا ظالمین سے مظلومین کا بدلہ دلانا ضروری ہوگا اور یہ انتقام دنیا میں نہیں ہوسکتا بلکہ دار دنیا کے بعد آخرت میں ہوگا چنانچہ ارشاد ربانی "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" اور "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" جیسی آیات کا یہی مفہوم ومراد ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ روز قیامت ایک شخص کو لایا جائے گا وہ شخص اپنے احوال کا جائزہ لے گا تو پائے گا کہ اس کے نامہ اعمال میں کوئی نیکی نہیں ہے۔ اس کے پاس ندا آئے گی اے فلاں اپنے عمل کے بدلے جنت میں داخل ہوجا وہ عرض کریگا اے میرے معبود! میں نے تو کوئی نیکی نہیں کی ہے رب تعالیٰ فرمائے گا کہ ایک رات تو سویا ہوا تھا اور سونے کی حالت میں تو نے اپنی کروٹ بدلی تھی اور کروٹ بدلتے وقت تمہاری زبان پر میرا اسم جلالت اللہ جاری ہوا تھا، تم پر نیند کا غلبہ تھا تمہیں یاد نہ رہا لیکن میں وہ ذات ہوں جسے اونگھ ونیند نہیں آتی نہ بھول وچوک طاری ہوتی ہے۔ (رازی صفحہ ۱۹۲: ج۱)

اسی طرح یہ بھی مروی ہے کہ ایک ایسا شخص بھی لایا جائے گا جس کے حسنات وسیئات وزن کئے جائیں گے تو اس کے حسنات کا پلڑا بالکل ہلکا ہوگا اور بداعمالیوں کا پلڑا بھاری ہوگا اس مایوسی کی حالت میں ایک پرچی اس کی نیکی کے پلڑا میں ڈالی جائے گی جس کے سبب نیکی کا پلڑا بھاری ہوجائے گا، اس پرچی میں کلمہ طیبہ "لا اله الا الله محمد رسول الله" تحریر ہوگا۔

اسی طرح کے بیشمار ان گنت واقعات ہوں گے جو روز جزا میں اللہ رحمن مالک روز جزا کے حضور ظہور پذیر ہوں گے۔

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ واجبات دو طرح کے ہوتے ہیں حقوق اللہ، حقوق العباد، حقوق اللہ کی بنا مسامحت ومساہلت پر ہوتی ہے کہ اللہ عزشانہ عالمین سے بے نیاز وبے پرواہ ہے رہے حقوق العباد تو اس سے احتراز واجب ہے۔

حکایت: مروی ہے کہ امام الائمہ سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا ایک مجوسی کے اوپر قرض تھا حضرت

امام اپنے قرض کے مطالبہ کے لئے اس کے گھر کی طرف تشریف لے گئے جب اس کے گھر کے دروازہ کے قریب پہنچے آپ کے جوتا میں نجاست لگ گئی حضرت امام نے جوتا جھاڑا کہ نجاست گر جائے مگر نجاست جوتا سے چھٹک کر مجوسی کے گھر کی دیوار پر چسپاں ہوگئی۔ حضرت امام اس کی دیوار میں نجاست لگ جانے کی وجہ سے سخت پریشان ہوئے اور اس کی دیوار سے نجاست صاف کرنے کے معاملہ میں الجھ کر رہ گئے اور فرمایا اگر اس کی دیوار پر نجاست چھوڑ دیتا ہوں تو اس مجوسی کی دیوار نجاست سے داغدار ہو کر قبیح ہو جائے گی اور اگر کھرچتا ہوں تو مٹی گرنے کی وجہ سے دیوار عیب دار ہو جائے گی حضرت امام کے سامنے یہ مسئلہ ایسا پیچیدہ ہو گیا جس کا حل آپ کے دماغ میں نہ آیا اسی شش و پنج میں آپ نے مجوسی کے دروازہ پر دستک دی، مجوسی کی باندی باہر نکلی حضرت امام نے فرمایا اپنے مولیٰ سے کہہ دو کہ ابوحنیفہ تمہارے دروازہ پر کھڑا ہے مجوسی باہر آیا اس نے سمجھا کہ ابوحنیفہ اپنے قرض کے مال کا مطالبہ کریں گے اس لئے معذرت کرنے لگا۔ حضرت امام نے فرمایا قرض کی ادائیگی کی بات بعد میں کرنا پہلے میری اس الجھن کو دور کرو جس میں میں مبتلا ہوں پھر دیوار میں نجاست لگ جانے کا واقعہ بتایا اور اس سے پاک کرنے کی سبیل پوچھی۔ یہ سن کر مجوسی کے حجابات اٹھ گئے اس نے کہا ابوحنیفہ! میری دیوار کی نجاست، صاف کرنے سے پہلے میرے دل کی نجاست کو صاف کر دے میں سمجھ گیا کہ مسلمانوں کے امام اعظم کی بلندی اخلاق کا یہ عالم ہے تو مسلمانوں کے رسول اعظم کا اخلاق کتنا بلند ہوگا۔ فی الحال کلمہ طیبہ پڑھ کر وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مجوسی بندہ کے حق کو ادا کرنے کے سبب وہ بندہ کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہو گیا تو کیا جو تا حیات حقوق اللہ کی کما حقہ پابندی کرتا رہے وہ دار التکلیف سے دار الجنۃ کی طرف نہ جائے گا۔

فائدہ: (۲) لفظ مالک کے بارے میں چار قرائتیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ لفظ یا تو فعل ہوگا یا اسم ہوگا، اگر فعل ہوگا تو ملک کے وزن پر ہوگا اگر اسم ہے تو فاعل کے وزن پر مالک ہوگا یا فعل کے وزن پر بکسر عین ملک ہوگا یا بسکون عین ملک ہوگا۔ حضرات مفسرین کے نزدیک ان چاروں صورتوں میں مالک و ملک دو صورت زیادہ قابل توجہ ہے اس لئے ان دونوں وجہوں کو دلائل کی روشنی میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

حضرت امام عاصم، امام کسائی اور یعقوب "مالک" پڑھتے ہیں اور بقیہ قراء حضرت "ملک" پڑھنے کو راجح قرار دیتے ہیں جو لوگ مالک پڑھتے ہیں وہ کئی وجوہ سے استدلال کرتے ہیں۔

اول: ارشاد باری تعالیٰ ہے "یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۚ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ" یعنی جس دن کوئی جان کسی جان کا کچھ اختیار نہ رکھے گی اور سارا حکم اس دن اللہ کا ہے (انفطار:۱۹) اس آیت مبارکہ سے "مالک" کی

تائید ہوتی ہے وہ اس طور پر کہ تملک باب ضرب سے ملک سے مشتق ہے مُلک سے مشتق نہیں ہے اس لئے کہ تملک شیئاً کی طرف متعدی ہے اگر ملک سے مشتق ہوتا متعدی نہ ہوتا کہ ملک لازم ہے اور اگر حرف جار کے ذریعہ متعدی کیا بھی جائے تو علیٰ کے ذریعہ متعدی ہوتا ہے لام کے ذریعہ نہیں لہذا تملک ملک سے لازم نہیں بلکہ ملک سے متعدی ہوگا اسی طرح مالک یوم الدین میں لفظ مالک بھی ملک متعدی سے مشتق ہوگا کیونکہ "یَوْمَ لَا تَمْلِكُ" میں جس دن کے اندر غیر سے مالکیت کی نفی کی گئی ہے اسی دن کے اندر میں ارشاد مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں رب تعالیٰ کے لئے مالکیت کا ثبوت ہے۔غرض ملک سے مالک افضل ہے۔

دوم: ملک کی بہ نسبت مالک میں ایک حرف زائد ہے لہذا اس کی قرأت میں زیادہ ثواب ہے۔

سوم: روز قیامت دنیا کے ہزاروں مجازی بادشاہ تو موجود ہوں گے لیکن روز قیامت مالک حقیقی سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہ ہوگا۔

چہارم: مالک، کبھی بادشاہ ہوتا ہے اور کبھی بادشاہ نہیں ہوتا جس طرح بادشاہ کبھی مالک ہوتا ہے اور کبھی مالک نہیں ہوتا غرض مالکیت وملکیت دونوں ایک دوسرے سے منفک ہو سکتے ہیں تاہم مالکیت اطلاق تصرف کا سبب ہوتا ہے مگر ملکیت تصرف کا سبب نہیں ہوتا اس لئے مالکیت، ملکیت سے اولیٰ ہے۔

پنجم: ملک و بادشاہ اپنی رعیت کا بادشاہ ہوتا ہے لیکن مالک مملوک عبید اور غلام کا مالک ہوتا ہے اور رعیت کی بہ نسبت مملوک وغلام کی حالت زیادہ خستہ ہوتی ہے اسلئے واجب کہ مالکیت کے مفہوم میں قہر وغلبہ، ملکیت کے بالمقابل زیادہ ہوتا ہے پس مالک، ملک و بادشاہ کی بہ نسبت بلند حال ہوگا۔

ششم: رعیت کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ بادشاہ کے تسلط سے الگ ہو کر خود مختار ہو جاتی ہے لیکن مملوک کبھی بھی اپنے آپ کو مالک کی ملکیت سے خود مختار و آزاد نہیں کر سکتا اس سے ظاہر ہے کہ مالکیت میں قہر وغلبہ ملک سے زیادہ ہے۔

ہفتم: ملک و بادشاہ پر رعایا کے احوال کی خبر گیری لازم ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته" تم میں کا ہر شخص ذمہ دار ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی لیکن رعیت پر بادشاہ کی خدمت لازم نہیں ہے۔اس کے برعکس مملوک کا حکم یہ ہے کہ اس پر مالک کی خدمت واجب ہے اس کا مستقل کوئی حکم نافذ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مالک کے حکم کے تابع ہوتا ہے یہاں تک کہ قضاء، امامت اور شہادت جیسے اہم امور مملوک سے صحیح نہیں، جب مولیٰ سفر کی نیت کر لے تو مملوک خود بخود مسافر ہو جاتا ہے

۔اور اگر وہ اقامت کی نیت کر لے تو غلام خود بخود مقیم ہو جاتا ہے۔ان وجہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مملوک میں اطاعت و فرماں برداری بہ نسبت رعیت کہیں زیادہ ہوتی ہے مندرجہ بالا وجوہات اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ ملک کی بہ نسبت مالک اعلیٰ واولیٰ ہے۔

جنہوں نے ملک کو مالک سے افضل قرار دیا ان کی مندرجہ ذیل دلیلیں ہیں۔

اول: پورے شہر بلکہ پورے ملک میں ہر شخص مالک تو ہوتا ہے لیکن ملک و بادشاہ صرف وہی ہوتا ہے جو تمام لوگوں میں باعظمت اور بلند تر ہوتا ہے اس لئے بادشاہ بہر حال مالک سے زیادہ مشرف ومکرم ہوتا ہے۔

دوم: ارشاد باری تعالیٰ ہے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ. مَلِکِ النَّاسِ "میں لفظ ملک متعین ہے اگر ملک مالک سے باعظمت نہ ہوتا تو آیت مذکورہ میں ملک کا ذکر نہ ہوتا۔

سوم: مالک کی بہ نسبت ملک لفظاً مختصر ہے اور مختصر لفظ کے تکلم میں مختصر وقت صرف ہوگا پس ایسا ہوسکتا ہے کہ اس کا تکلم کرنے والا اتنا وقت نہ پا سکے کہ مالک کا تکلم کرے اور اتنا وقت پالے کہ ملک کا تکلم کر لے اس لئے ملک تکلم کے لحاظ سے بھی اولیٰ ہے۔

مالک وملک پر متفرع احکام

"ملک پڑھنے کی تقدیر پر چند احکام متفرع ہوتے ہیں"

اول: سیاستیں چار قسموں کی ہوتی ہیں:

(۱) سیاسۃ الملاک، مالکوں کی سیاست، (۲) سیاسۃ الملوک، بادشاہوں کی سیاست، (۳) سیاسۃ الملائکہ، فرشتوں کی سیاست، (۴) سیاسۃ ملک الملوک، تمام بادشاہوں کے بادشاہ کی سیاست۔

ان چاروں سیاستوں میں سب سے اضعف و کمزور مالکوں کی سیاست ہوتی ہے اور سب سے اقوی ومضبوط تر ملک الملوک کی سیاست ہے اور ملک الملوک کی سیاست کے بعد ملائکہ کی سیاست اس کے بعد بادشاہوں کی سیاست پھر سب سے کمتر مالکوں کی سیاست ہوتی ہے چنانچہ مالکوں کا ایک جہاں اکٹھا ہو جائے تو وہ ایک بادشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے یہ مسئلہ مذہب احناف میں متحقق ہے کہ مالک ومولیٰ اپنے غلام ومملوک پر حد قائم نہیں کر سکتے لیکن سب کا اجماع واتفاق ہے کہ بادشاہ حد قائم کر سکتا ہے۔اس کے باوجود ملائکہ کی سیاست بادشاہوں کی سیاست سے اقوی ومضبوط تر ہے اس لئے کہ اگر ہزاروں ہزار بڑے بڑے بادشاہوں کا جم غفیر اکٹھا ہو جائے تو بھی وہ ایک فرشتہ کی سیاست کو دفع نہیں کر سکتے، رہی ملک

الملوک کی سیاست تو وہ تمام مالکوں، تمام ملوک وسلاطین اور تمام ملائکہ کی سیاستوں سے افضل واعلیٰ، اقوی واعظم ہے ارشاد ربانی ہے۔ ''یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ۙ لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا'' جس دن جبرئیل کھڑا ہوگا اور سب فرشتے پرا باندھے (صفیں بنائے) کوئی نہ بول سکے گا مگر جسے رحمن نے اذن دیا اور اس نے ٹھیک بات کہی (النباء:۳۸) اور ارشاد ہے ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ'' اور کون ہے جو سفارش کرے بغیر اس کے حکم کے (البقرۃ:۲۵۵) ملائکہ کی صفت کے بارے میں فرمایا ''وَ لَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَ ھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ'' اور شفاعت نہیں کرتے مگر اس کے لئے جسے وہ پسند کرے اور وہ اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔ (الانبیاء:۲۸)

پس اے بادشاہو! اپنے مال ودولت اور سلطنت و بادشاہت کو دیکھ کر فرعون کی طرح دھوکہ نہ کھا جانا اس لئے کہ تم اور تمہاری سلطنت سب مالک روز جزا کی قدرت کے قبضہ میں ہے۔ اور اے رعایا تم بھی سن لو کہ جب تم دنیاوی مجازی بادشاہ کی سیاست سے اس قدر خوف زدہ ہوتے ہو تو ملک الملوک جو مالک روز جزاء ہے کی سیاست سے تمہیں کس قدر خوف زدہ رہنا چاہئے۔

دوم: اللہ عزشانہ تعالیٰ کے ملک ہونے کی تقدیر پر دوسرا حکم یہ ثابت ہوگا کہ بیشک وہ ایسا بادشاہ ہے کہ کوئی بادشاہ اس کے مشابہ نہیں کہ دنیاوی بادشاہ جب اپنی ملک سے کوئی شی تصدق کرتے ہیں تو اس کی ملکیت میں نقص اور خزانے میں کمی واقع ہوتی ہے اس کے برعکس حق سبحانہ تعالیٰ کی ملکیت کا حال یہ ہے کہ بے انتہا عطا اور مسلسل نوازش وکرم کے باوجود اس کی ملکیت میں کمی اور نقصان پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کی ملکیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر رب تعالیٰ نے ایک انسان کو ایک لڑکا عطا کیا تو اب اس کا حکم صرف اس لڑکے پر متوجہ ہوگا لیکن اگر اس نے اسی انسان کو دس اولادیں عطا کیں تو اب اس کا حکم اور تکلیف دسوں پر متوجہ ہوگی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جتنی زیادہ عطا ہوگی اتنی زیادہ اس کی ملکیت میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اللہ عزشانہ تعالیٰ کی بادشاہت کی عظمت سلطنت کی وسعت بے غایت تصور وہم وگمان سے بالاتر ہے ہم ذیل میں جامع ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ سے ایک ایمان افروز حدیث قدسی نقل کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں اسے پڑھ کر جہاں قلب میں جلاء پیدا ہوگی وہیں اس بات کا یقین ہوگا کہ خالق کائنات کی حقیقی بادشاہت اور اس کی ملکیت بے نہایت دنیا کے تمام بادشاہوں سے اعلیٰ وافضل ہے اور زمین وآسمان اور اس کے درمیان ہر شئی پر بے انتہا کرم نوازی کے باوجود ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ہے۔

"عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ تعالیٰ یا عبادی کلکم ضال الا من ھدیت" الخ یعنی روایت ہے حضرت ابوذر سے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوا اس کے جسے میں ہدایت دوں لہٰذا مجھ سے ہدایت مانگو تمہیں ہدایت دونگا، اور تم سب فقیر ہو سوا اس کے جسے میں غنی کردوں لہٰذا مجھ سے مانگو میں تمہیں روزی دونگا، اور تم سب مجرم ہو سواء اس کے جسے میں عافیت عطا کروں، تو تم میں سے جو یہ جان لے کہ میں بخشش دینے پر قادر ہوں پھر مجھ سے معافی مانگے "غفرت لہ و لا ابالی" تو میں اسے بخش دونگا اور پرواہ بھی نہ کرونگا اور اگر تمہارے اگلے پچھلے، زندے مردے، تر، خشک میرے نیک ترین بندے کے دل پر جمع ہو جائیں (یعنی کائنات کا ہر فرد بڑے سے بڑا متقی و پرہیزگار ہو جائے کوئی فاسق و فاجر نہ رہے) "مازاد ذالک فی ملکی جناح بعوضۃٍ" تو یہ میرے ملک میں مچھر کے پر کے برابر بھی کچھ اضافہ نہیں کر سکتے۔ اور یونہی اگر تمہارے اگلے پچھلے زندے مردے، تر، خشک، میرے بندوں میں سے بدبخت ترین دل پر متفق ہو جائیں (یعنی سب بدبخت اور فاسق و فاجر ہی ہو جائیں) "مانقص ذالک من ملکی جناح بعوضۃٍ" تو انکا یہ جرم میرے ملک میں مچھر کے پر برابر بھی کمی نہیں کر سکتے۔ "ولو أن اولکم و آخرکم و حیکم و میتکم ورطبکم ویابسکم اجتمعوا فی سعید واحد فسأل کل انسان منکم مابلغت امنیتہ فاعطیت کل سائل منکم مانقص ذالک من ملکی الا کما لو أن احدکم مر بالبحر فغمس فیہ ابرۃ ثم رفعھا ذالک، بانی جواد ماجد" اور اگر تمہارے اگلے پچھے، زندے مردے تر و خشک ایک میدان میں جمع ہوں اور پھر تم میں سے ہر شخص اپنی انتہائی تمنا آرزو مجھ سے مانگے پھر میں ہر منگتے کو اس کی خواہش کے مطابق دے دوں تو اس سے میرے ملک میں کوئی کمی نہ ہوگی مگر ایسا جیسے تم میں سے کوئی سمندر سے گذرے، اس میں سوئی ڈبوئے پھر اٹھالے یعنی اگر تمام مخلوق کی خواہشات پوری کردی جائیں اور ان کی تمنائیں دے دی جائیں تو یہ عطیہ ہمارے خزانوں کے سامنے ایسا ہوگا جیسے بھیگی سوئی کی تری سمندر کے مقابل، رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں ہم اندازے سے ہی اتارتے ہیں۔

یہ تمثیلی نسبت بھی سمجھانے کے لئے ہے ورنہ محدود و متناہی کو غیر محدود لامتناہی سے نسبت کیسی (مرأت) یہ اس لئے کہ بیشک میں جواد ہوں بہت دینے والا ہوں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، میری عطا صرف فرمادینا ہے اور میرا عذاب صرف فرمادینا ہے میرا حکم کسی شئی کے متعلق یہ ہے کہ جب کچھ چاہتا ہوں فرمادیتا ہوں کہ ہو جا تو ہو جاتی ہے"۔ (مشکوٰۃ، باب

الاستغفار)

سوم: ملک ہونے کے احکام میں ایک عظیم حکم کمال رحمت ہے اس پر چند آیات شاہد ہیں اسی سورہ مبارکہ میں اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اپنے اوصاف میں رب، رحمن اور رحیم ذکر فرمایا ہے۔ سورہ حشر میں ارشاد ربانی ہے "هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ "(الحشر:۲۲) اور ارشاد فرمایا "هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ" یعنی وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہر نہاں اور عیاں کا جاننے والا وہی ہے بڑا مہربان رحمت والا وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، نہایت پاک، سلامتی دینے والا غالب (الحشر: ۲۳) پھر ظلم و جور جیسے صفت قبیحہ سے منزہ اور قدوس ہونے کو بیان فرمایا پھر اپنے سلام ہونے کا ذکر فرمایا جس کا مفاد یہ ہے کہ اپنے بندہ کو ظلم و جور سے سلامتی عطا کرے پھر رب تعالیٰ نے اپنے کو مومن فرمایا جس کا مطلب یہ ہے جو اپنے بندہ کو ظلم و جبر سے امن و امان عطا فرما دینے والا ہے۔ بالجملہ، رحمن و رحیم کے بعد ملک کا ذکر بعدہ علی الترتیب سلام و مومن جیسے اسماء حسنیٰ مبارکہ کا ذکر اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بادشاہ بغیر کمال رحمت کے ناممکن ہے۔

سورہ فرقان میں ارشاد عز وجل شانہ ہے "اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ "(۲۶) یعنی اس دن سچی بادشاہی رحمن کی ہے چنانچہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے جب اپنی بادشاہی ذکر فرمائی تو اس کے ساتھ اسم خاص رحمن ذکر فرمایا تاکہ ظاہر ہو کہ روز جزاء میں گرچہ رب تعالیٰ کی بادشاہی قہر و غلبہ کے ساتھ کافروں پر ہوگی لیکن رحمن ہونا اہل ایمان کیلئے اس دن بھی اھوال قیامت سے بے خوفی اور حصول رحمت پر دال ہے۔ اسی طرح سورہ ناس میں ارشاد ہے "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ" اس آیت میں اولاً بیان ہوا کہ اللہ رب الناس ہے پھر فرمایا کہ جو رب الناس ہے وہی ملک الناس (انسانوں کا بادشاہ) ہے بعدہ جن و انس کے شر سے بچنے اور محفوظ رہنے کے لئے بندۂ مومن کو اپنی بارگاہ کی طرف رہنمائی فرمائی غرض کہ یہ تمام آیتیں اس بات پر شاہد ہیں کہ بادشاہت بغیر رحمت و احسان کے تام نہیں ہوتی پس اے دنیا کے مجازی بادشاہو! ان آیات مبارکہ کو خوب بغور سنو پڑھو اور سمجھو اور اس پر عمل کرو کہ ان مساکین رعایا پر رحم کرو اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی بادشاہی میں اپنی مجازی بادشاہت پر زائد مرتبہ کے طلب گار نہ بنو۔

چہارم: اس دنیا میں رعایا پر بادشاہ کی اطاعت لازم ہوتی ہے اگر رعایا بادشاہ کی مخالفت کریں اور اس کی اطاعت سے منھ موڑ لیں تو دنیا میں سخت بحران اور شدید حرج واقع ہوگا بادشاہ غضبناک ہو کر رعایا کی ہلاکت و بربادی کے لئے

اقدام کرے گا۔اس مشاہدہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب دنیاوی مجازی بادشاہ کی مخالفت اور اس کے حکم سے سرتابی دنیا والوں کی ہلاکت و بربادی، عالم کی تخریب کاری کا باعث وسبب بنتی ہے تو ملک الملوک اللہ رب العلمین کے احکام کی مخالفت کس قدر رب تعالیٰ کے غضب، ناراضگی پھر زوال مصالح اور نظام عالم کے فساد کا سبب ہوگا۔چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ کفر فساد عالم کا سبب ہے ارشاد ہے ''تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا'' قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہوجائے اور پہاڑ گر جائیں ڈہ کر اس پر کہ انہوں نے رحمن کے لئے اولاد بتائی (مریم:۹۰) اس کے برعکس اس کی اطاعت وفرماں برداری میں مصالح کا حصول اور نظام عالم کی اصلاح ہے۔ارشاد ہے '' وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى '' اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور خود اس پر ثابت رہ کچھ ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے ہم تجھے روزی دیتے ہیں اور انجام کا بھلا پرہیز گاری کے لئے (طٰہٰ:۱۳۲)

مختصر یہ کہ اے دنیا کی رعایا! جائز باتوں میں اپنے دنیاوی بادشاہوں کی اطاعت کرو اور اے بادشاہو! تم بادشاہوں کے بادشاہ کی اطاعت کرو تا کہ مصالح عالم درست رہیں۔

پنجم: جب اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے آپ کو روز جزاء کا بادشاہ ہونے سے موصوف فرمایا تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ عالمین کے لئے کمال عدل کا اظہار کریگا چنانچہ ارشاد ہے ''وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ'' پھر کیفیت عدل بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ''وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا'' اور ہم عدل کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن تو کسی جان پر کچھ ظلم نہ ہوگا اور اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کو (الانبیاء:۴۷) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالق کائنات کا بادشاہ حقیقی ہونا روز قیامت خوب خوب ظاہر ہوگا اور اس ظہور کی وجہ اس کی غایت کمال عدل کا اظہار ہے پس اگر دنیا کے بادشاہ مجازی بھی عادل وانصاف پسند ہوجائیں اور وہ دوست دشمن اور امیر وغریب اور وزراء ورعایا کے درمیان حق وعدل کا فیصلہ کرنے لگیں تو یقیناوہ بادشاہ حق عادل ہوں گے اور ان کی بادشاہت صحیح ودرست ہوگی لیکن اگر وہ غلط فیصلے کرنے لگیں تو وہ بادشاہ ظالم اور اس کی بادشاہت ناحق وباطل ہوگی۔ غرض کہ بادشاہ اگر عادل اور حق پسند ہے تو اس کے عدل کی برکت سے پوری سلطنت خیرات وبرکات کا گہوارہ بن جاتی ہے اور اگر بادشاہ ظالم ہے تو اس کے جور وظلم اور نا انصافی کی نحوست کے سبب دنیا سے برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور فتنہ وفساد برپا

ہونے لگتا ہے۔

حکایت: مروی ہے کہ بادشاہ نوشیرواں ایک روز شکار کے لئے نکلا دوران شکار، ایک شکاری جانور کو پانے کے لئے اس نے دوڑ لگائی دوڑنے میں بادشاہ ایسا مشغول ہوا کہ اپنے لشکریوں سے جدا ہوگیا اور اس کو سخت پیاس لگی، پیاس بجھانے کے لئے بادشاہ ایک باغ میں پہنچا اس میں انار کے بہت سے درخت تھے اور اس باغ میں ایک بچہ تھا بادشاہ نے بچہ سے کہا اے بچہ! مجھے ایک انار دے دو بچہ نے انار دے دیا بادشاہ نے انار سے اس کے دانے نچوڑے اس کے دانوں سے بہت ڈھیر سا شیریں رس نکلا بادشاہ کو انار کی کثرت اور لذت نے حیرت زدہ کر دیا دل ہی دل میں اس نے ارادہ کرلیا کہ اس انار کے باغ کو وہ اس کے مالک سے لے لیگا پھر اس نے اس بچہ سے کہا اے بچہ ایک دوسرا انار دے دو بچہ نے بادشاہ کو دوسرا انار دے دیا اس نے پہلے کی طرح اس کے دانے نکال کر نچوڑے تو اس سے بہت کم رس نکلا پھر اس نے پیا تو بہت ہی ترش بلکہ نقصان دہ تھا بادشاہ نے متعجب ہوکر اس لڑکا سے پوچھا کہ آخر اس انار کا جوس اتنا قلیل اور اس کا مزہ ایسا ترش کیوں ہے؟ بچہ نے بڑی ہی سنجیدگی سے جواب دیا کہ لگتا ہے کہ اس ملک کے بادشاہ کی نیت خراب ہوگئی ہے اور اس نے ظلم کا ارادہ کیا ہے پس اس کے ظلم کی نحوست کی وجہ سے انار ایسا ترش مزہ ہوگیا یہ سنکر نوشیرواں نے دل ہی دل میں توبہ کرلیا پھر اس نے بچہ سے مزید ایک انار کی فرمائش کی بچہ نے ایک تیسرا انار دے دیا اس نے حسب سابق نچوڑ کر پیا اس کا جوس پہلے سے بہت کثیر اور مزہ بھی پہلے انار سے زیادہ شیریں تھا نوشیرواں نے بچہ سے دریافت کیا کہ آخر اس انار کی کیفیت یکلخت کیسے بدل گئی! بچہ نے بھولے پن سے جواب دیا لگتا ہے اس ملک کے بادشاہ نے اپنے ظلم سے توبہ کرلیا ہے اور اس کی نیت بدل گئی ہے جب نوشیرواں نے اس بچہ سے پورا واقعہ سنا تو یقین کرلیا کہ یہ اس کے قلبی احوال کے مطابق ہے اس لئے اس نے ہر قسم کے ظلم سے بالکلیہ توبہ کرلیا اور تاحیات عدل وانصاف پر قائم رہا حتی کہ رہتی دنیا تک اس کا نام عدل و انصاف کرنے والوں میں شمار کیا جائے گا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں انصاف کرنے والے بادشاہ (نوشیرواں) کے زمانہ میں پیدا ہوا۔

مندرجہ بالا بیان اس تقدیر پر تھا کہ مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ پڑھیں اب ذیل میں مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ پڑھنے کی ترجیحی صورتیں ذکر کی جارہی ہیں۔

اول: ملک کی بہ نسبت مالک پڑھنا زیادہ راجح وانسب ہے کیونکہ ملک و بادشاہ سے زیادہ سے زیادہ عدل وانصاف کی امید کی جاتی ہے اور یہ کہ انسان اس سے بالکل نجات اور چھٹکارا پا جائے مگر جو مالک ہوتا ہے اس سے مملوک کو صرف عدل

وانصاف اورنجات ہی کی امید نہیں ہوتی بلکہ مملوک اپنے مالک سے روٹی، کھانا کپڑا، مکان، رحم وکرم بلکہ بقااور تربیت زندگانی کے متعلق تمام امور کوطلب کرتا ہے اور مالک پران چیزوں کا پورا کرنا لازم ہے اور وہ پورا بھی کرتا ہے مگر بادشاہ رعایا کے لئے ان چیزوں کے دینے کا مکلف نہیں ہوتا پس ہم بندوں کے لئے ملک کی بہ نسبت مالک ہی پڑھنے میں بھلائی ہے اس تقدیر پر گویا رب تعالیٰ یہ فرماتا ہے اے میرے بندو! بیشک میں تمہارا مالک ہوں اورتم سب میرے مملوک ہو لہذا میرے ذمہ کرم پرتمہارا کھانا، کپڑا، مکان، تربیت کا سارا سامان بلکہ آخرت کا ثواب اور جنت ہے۔

دوم: ملک بہ نسبت مالک کے گرچہ زیادہ غنی ہوتا ہے مگرغنی ہونے کے باوجود بادشاہ کو رعایا میں طمع ہوتا ہوتی ہے برخلاف مالک کے کہ مالک مملوک میں طمع نہیں رکھتا بلکہ خود مملوک کو مالک میں طمع ہوتی ہے جب مالک کا حال یہ ہے تو ہم اعمال وخیرات سے تہی دامن بندوں سے کل روز قیامت ہمارا مالک پروردگار کسی عمل خیر کی طمع نہیں فرمائے گا بلکہ ہمارا مالک تو یہ چاہے گا کہ ہمارے بندے ہم سے روز قیامت، عفو ومغفرت، اور جنت کا سوال کریں چنانچہ اسی وجہ سے امام کسائی نے کہا "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" پڑھا کروکہ یہ قرأت رب تعالیٰ کے فضل کثیر اور رحمت واسعہ پر دال ہے۔

سوم: ملک وبادشاہ کے سامنے جب لشکر پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان میں انہیں افراد کا انتخاب کرتا ہے جونہایت ہی طاقتور، توانا اور صحیح وسالم اور تندرست ہوتا ہے لیکن ان میں جولاغر وکمزور اور مریض وبیمار ہوتا ہے بادشاہ ایسوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا ہے بلکہ ایسوں کو اپنے لشکریوں سے نکال دیتا ہے اور اس کا وظیفہ بھی بند ہوجاتا ہے اس کے برعکس مالک کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا مملوک جب بیمار ہوتا ہے تو مالک بے چین ہوجاتا ہے۔ اور فوراً اس کا علاج کراتا ہے، کمزور ہوجائے تو امداد کرتا ہے اور کسی بلاء ومصیبت میں گرفتار ہوجائے تو اسے چھٹکارا دلانے کی کوشش کرتا ہے پس گنہگار ومساکین کے لئے مالک ہی پڑھنا اوفق وانسب ہے۔

چہارم: بادشاہ کی ہیبت وسیاست بہت مشہور ہے اس سے ہر آدمی دور ونفور ہی رہنا چاہتا ہے اس کے برعکس مالک کی مہربانی وکرم نوازی عام ہوتی ہے جس کو ہر آدمی پسند کرتا ہے اس لئے بہرحال ملک کی بہ نسبت مالک ہی ہمارے احوال کے مناسب وموافق ہے۔

تفسیر روح البیان میں ہے "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" عرب میں یوم اس وقت کو کہتے ہیں جو مابین طلوعِ شمس تا غروب واقع ہو۔ اور شریعت میں طلوعِ فجر یعنی صبح صادق اور غروبِ شمس کے مابین کا نام ہے اور یہاں مراد مطلق وقت ہے کیونکہ قیامت میں شمس نہیں ہوگا۔ معنی یہ ہوا کہ وہ قیامت میں مالک ہے اور مالک کی یوم کی طرف اضافت ادنی مناسبت کی وجہ

سے ہے جیسے تمام ظروف کی اضافت ان مظروف فیہ (کہ جن میں حوادثات واقع ہوئے ہیں) کی طرف ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ ''یوم الاحزاب، یوم الفتح'' اور مالک کی اضافت یوم کی طرف، یوم کے عظیم الشان ہونے اور اس کی سختی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یا اس کو علیحدہ کرنے میں یہ راز ہے کہ اس میں صرف احکام جاری ہوں گے۔ باقی جمیع تعلقات مابین مالک ومملوک کے بالکلیہ منقطع ہوجائیں گے۔ (مُلک و مِلک میں رابط) سختی قوت کے لئے مِلک کہتے ہیں۔ درحقیقت قوت کاملہ اور ولایت نافذہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور حکم کا نفوذ اور تصرف کا حق اگر بندگان کو حاصل ہے تو مجازاً۔ کیونکہ ان کی ملک کی ابتدا وانتہا ہے، اور بعض پر نہ کہ کل پر اس طرح جسم پر نہ کہ عرض پر۔ اسی طرح نفس پر نہ کہ روح پر۔ اسی طرح ظاہر پر نہ کہ باطن پر، زندہ پر نہ کہ مردہ پر، بخلاف معبودِ حق کے کہ نہ اس کے ملک کو زوال ہے نہ انتقال۔

مسئلہ: مالک کو الف کے ساتھ پڑھنے میں الف کے سوا (ملک) پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے کیونکہ مالک میں ایک لفظ زائد ہے۔ (اور ایک حرف پر دس نیکی کے ثواب کا وعدہ ہے)

حکایت: ابوعبداللہ محمد بن شجاع رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میری عادت تھی کہ میں ہمیشہ مالک کو الف کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک دن کسی ادیب سے سنا کہ ملک (الف کے سوا) مالک (الف کے ساتھ) سے زیادہ بلیغ ہے۔ میں نے سن کر ملک (الف کے سوا) پڑھنا شروع کردیا۔ نیند میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ تو نے اپنی دس نیکیاں کیوں کم کردی ہیں، کیا تجھے معلوم نہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن مجید کا ایک حرف پڑھا تو اسے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں ملیں گی اور اس کے دس گناہ معاف ہوں گے اور دس درجے بلند ہوں گے۔ پھر میں نے برسم سابق مالک کو الف کے ساتھ پڑھنا شروع کردیا۔ پھر مجھے نیند میں کسی کہنے والے نے کہا کہ تو نے ملک (الف کے سوا) کو کیوں ترک کردیا؟ کیا تو نے حدیث شریف نہیں سنی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ قرآن کو عظیم الشان کرکے اور بلیغ الفاظ سے پڑھو۔ پس میں نے امام قطرب (لغت کے ماہر) کی خدمت میں آکر مالک اور ملک کا فرق پوچھا۔ انہوں نے فرمایا ان کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔ فرمایا: مالک وہ ہے جو دنیا میں کسی چیز کا مالک ہو، اور ملک وہ ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ ہو۔ تفسیر ارشاد میں ہے کہ اہل حرمین محترمین ملک کو الف کے بغیر پڑھتے ہیں اور ملک سے مشتق کرتے ہیں۔ جس کا معنی ہے سلطان قاہرہ استیلائے جابر، غلبۂ کامل، امورِ عامہ اور اوامر ونواہی میں تصرف کلی۔ اور یوم کی طرف اضافت کی وجہ یہی یعنی ملک (الف کے بغیر) زیادہ مناسب ہے۔

فائدہ (۳): شبہ۔ مالکُ مَلِکُ کی بحث کے ذیل میں ایک قوی شبہ وارد کیا جاتا ہے۔ شبہ کی تقریر یہ ہے کہ ملک نام ہے قدرت کا، اس معنیٰ کے اعتبار سے مالک ہونے یا مَلِکُ ہونے کا مطلب ہے اس پر قادر ہونا اب سوال یہ ہے کہ وہ موجودات پر قادر ہے یا معدومات پر، بلفظ دیگر وہ موجودات کا مالک بادشاہ ہے یا معدومات کا۔ اول باطل ہے اس لئے کہ موجودات کی ایجاد محال و باطل ہے پس موجودات پر اللہ تعالیٰ کی قدرت صرف اس لحاظ سے ہوگی کہ وہ موجودات کو معدوم کرسکتا ہے لہٰذا اس صورت پر اس کی قدرت صرف عدم پر ثابت ہوگی اور وہ عدم ہی کا مالک ہوگا۔ اور صرف عدم کا مالک ہونا بداہتاً باطل یونہی شق دوم کہ وہ معدومات کا مالک اور اس پر قادر ہے باطل ہے کیونکہ اس صورت میں بھی اس کی قدرت وملکیت صرف عدم پر ثابت ہوگی جس کا مقتضی یہ ہے کہ وہ موجودات کا مالک نہیں ہے اور نہ ہی اس میں اس کی ملکیت ثابت ہے غرضیکہ دونوں شقیں باطل ہیں اس لئے اس کی ملکیت وقدرت باطل ٹھہرتی ہے۔

جواب: شبہ مذکور کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ بیشک اللہ عز شانہ تعالیٰ تمام موجودات کا حقیقی مالک اور بادشاہ ہے لیکن موجودات کے مالک ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ تمام موجودات کو وجود سے عدم کی طرف پھیرنے والا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ موجودات کو ایک صفت سے دوسری صفت کی طرف نقل کرنے پر قادر ہے۔ اور ایسی قدرت کاملہ وتامہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہے لہذا بادشاہ حق اور مالک حقیقی وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہونے کے بعد کہ وہی حقیقی بادشاہ اور قادر مطلق ہے یہ مفہوم ازخود ثابت ہوتا ہے کہ وہی روز جزا کا مالک و بادشاہ ہے اس لئے کہ مخلوق کی موت کے بعد بار دیگر اس کے احیاء پر قادر ہونا یہ اللہ ہی کی شان ہے نیز بدن انسانی کے متفرق بکھرے اجزاء کا علم اللہ ہی کو ہے بلکہ حشر ونشر اور بعث وقیامت اور معاد کے تمام واقعات جمیع معلومات کے علم اور جمیع ممکنات پر قدرت کے بعد ہی واقع ہوسکتے ہیں اور ایسا علم اور ایسی قدرت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے پس روز جزاء کا صرف وہی مالک ہوسکتا ہے۔

شبہ: یہاں ایک شبہ یہ بھی وارد کیا جاتا ہے کہ کسی چیز کا کوئی مالک اسی وقت ہوتا ہے جب شئ مملوک موجود ہو اگر شئ موجود نہ ہو تو وہ مملوک نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی اس کا مالک ہوسکتا ہے۔ جب امر واقعہ یہ ہے تو مالک یوم الدین یعنی اللہ روز جزا کا مالک ہے کیسے کہنا صحیح ہوگا کیونکہ روز جزا ابھی موجود نہیں۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے مالک یوم الدین یعنی روز جزا کا مالک ہوگا جیسے کوئی اضافت کے ساتھ کہے انا قاتلُ زیدٍ میں زید کا قاتل ہوں تو یہ اقرار ہے لیکن اگر تنوین کے ساتھ انا قاتل زیداً یعنی میں زید کو قتل کرنے والا ہوں کہے تو یہ تہدید ووعید ہے۔

جواب: شبہ اپنی جگہ پر درست ہے۔ مگر چونکہ قیام قیامت امر واقعی یقینی ہے اس کے ٹل جانے کا ہرگز امکان نہیں ہے

اس لئے وجود قیامت کو فی الحال موجود شئی کی منزل میں قائم کرلیا گیا۔ نیز جس کی موت ہوجاتی ہے گویا اس کی قیامت واقع ہوجاتی ہے اس اعتبار سے قیامت فی الحال پائی گئی لہذا مالک یوم الدین ، ارشاد فرمانا بالکل درست ہے۔

فائدہ (۴): اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اس سورہ مبارکہ میں اپنے پانچ اسمائے حسنیٰ کو ذکر فرمایا ہے جو یہ ہیں ''الله، الرب، الرحمن، الرحیم، المالک'' اس کی وجہ اور اس کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ پانچ اسمائے مبارکہ میں اللہ عز شانہ تعالیٰ نے انسانوں پر اس کی ابتدائے آفرینش سے لیکر تا روز قیامت جو معاملہ رحم وکرم کیا اور کریگا ان سب کی طرف انہیں پانچ اسمائے حسنیٰ مبارکہ سے اشارہ فرمایا گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے اے انسانو! میں نے تمھیں پہلے پیدا کیا پس بیشک میں ہی اللہ ہوں، پھر قسم قسم کی نعمتوں سے میں نے تمہاری تربیت فرمائی پس بیشک میں ہی تمہارا رب ہوں پھر تم نے نافرمانی کی تو میں نے تمہاری ستر پوشی کی کیونکہ میں رحمن ہوں پھر تم نے توبہ کیا تو تمہیں بخش دیا کہ بیشک میں رحیم ہوں پھر دنیا کے اعمال کی جزا بھی میں ہی دونگا کیونکہ میں ہی روز جزا کا مالک ہوں۔

اعتراض: اس مقام پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پانچ اسمائے مبارکہ میں دو اسم رحمن ورحیم کو تسمیہ میں ذکر کرنے کے بعد بار دیگر سورہ فاتحہ میں اعادہ کیوں کیا گیا جبکہ بقیہ تین اسمائے مبارکہ کو صرف ایک بار ذکر کیا گیا۔

جواب: تسمیہ وتحمید دونوں میں خصوصیت کے ساتھ ان دونوں ناموں کا ذکر اس لئے ہوا کہ بندۂ مومن یہ سمجھے کہ تمام امور سے زیادہ اللہ رب العزت بندہ کی طرف اپنی رحمت سے متوجہ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس کی رحمت اس کے عتاب پر غالب ہے پھر دوبار رحمن ورحیم ذکر کرنے کے بعد مالک یوم الدین ذکر فرمایا تاکہ بندہ اس کی رحمت ہی رحمت کو دیکھ کر عمل سے غافل نہ ہوجائے بلکہ یہ خیال بھی رہے کہ وہ روز جزاء کا مالک ہے ہماری بدعملی اور عصیاں شعاری پر وہ سزا بھی دے سکتا ہے۔ غرض کہ اس میں اشارہ ہے کہ ایمان صرف رحمت کے امیدوار رہنے کا نام نہیں بلکہ اس کے خوف سے متاثر ہونے کا نام بھی ہے اسی لئے کہا گیا کہ ایمان خوف ورجاء کے درمیان ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں انہیں دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ارشاد ہوا ''غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ'' گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا سخت عذاب کرنے والا بڑے انعام والا (المومن: ۳)

فائدہ (۵): ''مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے ارشاد مبارک سے قدریہ وجبریہ نے اپنے اپنے نظریات پر استدلال قائم کیا ہے قدریہ نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہو تو ثواب وعتاب اور جزا کا قول باطل ٹھہریگا کیونکہ آدمی نے جس کام کو نہ کیا اس پر ثواب دینا عبث ہے اور یونہی جو کام نہ کیا اس پر عذاب دینا ظلم ہے پس اس صورت میں مالک

یوم الدین ہونا ہی باطل ہوجائے گا۔اسلئے ماننا پڑے گا کہ بندہ اپنے اعمال وافعال کا خالق ہے۔

جبریہ کہتے ہیں کہ بندہ کے افعال واعمال اگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر وترجیح سے نہ ہوں تو وہ ان کے اعمال کا مالک ہی نہ ہوگا حالانکہ تمام مسلمانوں کا اجماع واتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ اور بندہ کے اعمال وافعال سب کا مالک ہے پس جس طرح وہ بندہ کا مالک ہے تو خالق بھی ہے اسی طرح جب اس کے اعمال کا مالک ہے تو اس کا خالق بھی ہے۔

اس مقام پر قاضی بیضاوی نے اللہ تعالیٰ کے لئے چار اوصاف کمالیہ یعنی اللہ تعالیٰ کا موجد عالمین ہونا، انکا مربی ہونا، ان پر نعمت ظاہرہ، نعمت باطنہ اور نعمت موجودہ اور نعمت مستقبلہ سے انعامات فرمانا اور یوم قیامت میں انکے امور کا مالک ہونا، بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ چاروں اوصاف کا اسم جلالت پر محمول ہونا اس کے استحقاق حمد کی دلیل ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے ان میں پہلا وصف ''رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ'' ہے جو دو وصف کو متضمن ہے ایک موجد ہونا دوسرا مربی ہونا۔چونکہ تربیت کہتے ہیں شئ کو وجود کے بعد کمال تک پہنچانا۔گویا رب ایسا جامع لفظ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عالمین کا موجد بھی ہے اور اس کا مربی ومبقی بھی ہے۔تیسرا وصف ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' ہے جس میں دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام انعامات فرمانے والا ہے خواہ ان انعامات کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے یا یہ انعامات وقتی ہوں یا بعد میں ہوں، ان میں چوتھا وصف مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہے جس کا مفہوم ظاہر ہے کہ وہ عالمین کے سارے امور کا مالک حقیقی ہے ان چاروں وصفوں کا اسم ذات پر محمول ہونا دلیل ہے کہ صرف وہی مستحق حمد ہے اس سے زیادہ کوئی حمد کا مستحق نہیں ہوسکتا۔استحقاق حمد صرف اس کی ذات میں منحصر اس لئے ہے کہ یہ چاروں اوصاف اسم جلالت پر محمول ہیں یا استحقاق حمد ان چاروں اوصاف پر مرتب ہے اور یہ معہود کہ کسی حکم کا اوصاف پر مرتب ہونا بتاتا ہے کہ اوصاف حکم مذکور کی علت ہیں گویا مجموعہ اوصاف اربعہ استحقاق کی علت یعنی اللہ تعالیٰ ہی حمد کا مستحق اس لئے ہے کہ وہ ان چاروں اوصاف کا جامع ہے اور پر ظاہر کہ غیر اللہ چاروں اوصاف تو درکنار ذاتی وحقیقی طور پر ایک وصف کے ساتھ بھی متصف نہیں لہٰذا کوئی غیر ذاتی وحقیقی طور پر مستحق حمد بھی نہیں ہوسکتا اور جب غیر، مستحق حمد نہیں ہوسکتا تو غیر، مستحق عبادت بدرجہ اولیٰ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ درجہ معبودیت رتبہ محمودیت سے اعلیٰ ہے جب کوئی ادنی کا مستحق نہیں ہوسکتا تو اعلیٰ کا مستحق کیونکر ہوسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ وصف اول اس چیز کو بیان کرنے کے لئے ہے جو موجب حمد ہے اور وہ ایجاد وتربیت ہے اور دوسری و تیسری صفت اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ انعامات اپنے ارادہ واختیار سے تفضّل واحسان کے طور پر کرتا ہے۔یہ انعامات اس سے اضطراراً یعنی بغیر ارادہ واختیار نہیں صادر ہوتے جیسا کہ فلاسفہ کی رائے ہے اور نہ ہی

یہ انعامات اس سے وجوباً صادر ہوتے جیسا کہ معتزلہ کی رائے ہے کہ وہ فاعل واجب ہے بلکہ وہ مختار ہے اپنے ارادہ و اختیار سے جو چاہتا ہے کرتا ہے مضطر و موجب کسی حمد کا مستحق نہیں ہوتا پھر چوتھی صفت مالک یوم الدین ذات باری کے لئے اختصاص حمد کو ثابت کرنے کے لئے ہے کیونکہ یوم جزاء کی بادشاہت مطلقا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس میں قطعاً کسی کی کسی طرح شرکت نہیں ہوگی جب مطلقاً بادشاہت اسی کی ہے تو حمد بھی اس کے ساتھ مختص ہوگی۔ نیز اس صفت کے اندر حامدین کے لئے وعدہ ہے اور معرضین کے لئے وعید ہے اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ روز جزاء کا مالک ہے تو ظاہر ہے کہ جو حمد کریگا تو وہ اسے ثواب عطا فرمائے گا اور جو اس کی حمد سے اعراض کریگا تو وہ اسے عتاب وعذاب میں مبتلا کرے گا۔

فصل پنجم: تفسیر قولہ تعالیٰ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم تجھی کو پوجیں)

التفات کے وجوہ: (فائدہ: ۱) طرز سابق کے برعکس خطاب کے اسلوب کے ساتھ ارشاد ہوا حالانکہ کلام سابق ظاہر کا تقاضا تھا کہ حسب سابق غیبو بت کے طرز پر ارشاد ہوتا کیونکہ ماسبق میں غیبو بت کا صیغہ مذکور ہے اس لئے کہ اوصاف کو اسمائے ظاہرہ کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسمائے ظاہرہ غائب کے حکم میں ہوتے ہیں مگر طرز کلام کو یکسر بدل دیا اور خطاب سے ارشاد ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو استحقاق حمد کے اختصاص کے لئے بڑی عظیم صفات کے ساتھ متصف فرمایا ہے چنانچہ وہ صفات ایسی عظیم الشان ہیں کہ جن کی وجہ سے ذات باری تعالیٰ غیر سے ممتاز ہوگئی اور وہ خوب معلوم و متعین ہوگئی غرضیکہ اس تعین علمی کو اس تعین کے منزل میں اتار لیا گیا جو مشاہدہ سے حاصل ہو گویا وہ ذات معلوم متعین اور مشاہد کی طرح ہوگئی اس لئے اب صیغہ خطاب کا ذکر ضروری ہوا اور ایاک نعبد ارشاد ہوا جسکا معنی یہ ہے اے وہ ذات جس کا یہ حال ہے کہ وہ عظیم الشان صفات کے ساتھ متصف ہے ہم تجھے عبادت اور استعانت کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں تیرے علاوہ ہم غیر کی عبادت نہیں کرتے۔ عبادت واستعانت کا اس کی ذات کے اختصاص کا معنی صیغہ غیبو بت سے بھی حاصل ہوجاتا کہ "**تقدیم ماحقه التاخیر یفید الحصر و الاختصاص**" کا مفاد یہی ہے مگر کمال اختصاص صیغہ خطاب سے حاصل ہوتا ہے اس لئے خطاب ہی انسب ہے۔

التفات اور اس کے وجوہ: واضح رہے کہ طرز سابق کے خلاف کلام کے استعمال کرنے کو اصطلاح میں التفات کہتے ہیں اس کی کئی وجہیں ہوتی ہیں۔

(1) غیبت سے خطاب کی طرف التفات کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس میں برہان سے عیان کی طرف یعنی دلائل سے مشاہدہ کی طرف ترقی کرنا ہے وہ اس طرح کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے اسم ذاتی کو بیان فرمایا بعدہ مالک یوم الدین تک ایسے اوصاف کمال کو ذکر فرمایا جن میں ہر صفت وجود ذات باری تعالیٰ پر دلالت کرتی

ہے غرض کہ یہ اوصاف وجود باری تعالیٰ کے دلائل و براہین ہوئے بعدہ ایاک نعبد سے عیان ومشاہدہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اب تم اپنے آپ کو اس طرح سمجھو کہ تم خدائے کریم کے روبرو ہو مشاہدہ حق میں مستغرق ہو اگر غیبت ہی استعمال ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی۔

(2) غیبت وخطاب دو طرز کلام اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ غیبت کا ذکر علمائے ظواہر کے لئے ہے اور خطاب کا ذکر علمائے باطن کے لئے ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح کر سکتے ہیں کہ جو بندہ مخلوق سے منہ موڑ کر رو گرداں ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تین طرح کے ہوتے ہیں۔

اول: سالک، **دوم:** عارف، **سوم:** واصل

اول: سالک وہ شخص ہے جو اپنے ظاہر کو افعال ذمیمہ سے مہذب کرے اور باطن کو اخلاق رذیلہ سے مہذب کرے۔ غرضیکہ سالک کا ابتدائی حال شریعت ظاہرہ پر عمل کرنا ہے اور انتہائی حال اخلاق حسنہ سے آراستہ ہونا ہے۔

دوم: عارف وہ شخص ہے جو معرفت باری کا قصد کرے۔

سوم: واصل اس شخص کو کہتے ہیں جن کو مقام مشاہدہ حاصل ہو اور مشاہدہ اس حالت کو کہتے ہیں جو بندہ کو ساری مخلوق سے اعراض کر کے باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے غرضیکہ عارف کا انتہائی درجہ، واصل کا ابتدائی درجہ ہوتا ہے رہا واصل کا انتہائی درجہ تو اس کا سلسلہ غیر متناہی ہے۔ اس لئے کہ معرفت کے اندر سیر الی اللہ ہوتی ہے یعنی تمام مخلوق کو چھوڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور یہ معلوم کہ مخلوقات متناہی ہیں اس لئے معرفت اور عارف کا درجہ بھی متناہی ہوگا۔ بخلاف وصول کے کہ وصول میں سیر فی اللہ سے ابتدا ہوتی ہے یعنی اللہ عز شانہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور اس کے مشاہدہ میں منہمک ہونا، اور یہ معلوم کہ اللہ تعالیٰ کی صفات واسماء غیر متناہی ہیں لہذا سیر فی اللہ بھی غیر متناہی ہوگی۔ یہ احوال وکوائف ارباب مکاشفہ اور اہل مشاہدہ کو ہی حاصل ہوتے ہیں جن کے لئے خطاب ہی موزوں و مناسب ہے۔

التفات کی تعریف: التفات کی تعریف کے بارے میں مشہور عالم معانی و بیان جناب سکاکی اور جمہور کا اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک التفات کی تعریف یہ ہے کہ تعبیر کے تین طریقوں غیبت، خطاب اور تکلم میں سے کسی ایک طریقہ سے کلام کو تعبیر کرنے کے بعد دوسرے طریقہ کو اختیار کرنا اور اس کے نزدیک محض مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام کو استعمال کرنا التفات کہلاتا ہے۔ غرض سکاکی کے نزدیک التفات عام ہے اور جمہور کے نزدیک خاص۔

التفات کی چھ صورتیں نکلتی ہیں:

(۱) غیبت سے خطاب کی طرف۔(۲) غیبت سے تکلم کی طرف۔(۳) خطاب سے غیبت کی طرف۔(۴) خطاب سے تکلم کی طرف۔(۵) تکلم سے غیبت کی طرف۔(۶) تکلم سے خطاب کی طرف۔

یادرہے کہ اہل عرب کلام میں تفنن کو پسند کرتے ہیں یعنی ایک اسلوب سے دوسرے طرز اسلوب کو اختیار کرنا اہل عرب کا پسندیدہ طریقہ ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کلام میں جدت ولذت پیدا ہوتی ہے مثل مشہور ہے ''کل جدید لذیذ'' قرآن حکیم میں کئی مقامات پر التفات کے طرز پر کلام فرمایا گیا ہے ارشاد ربانی ہے۔''حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ'' یعنی یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے اور وہ انہیں کو لیکر چلیں۔اور ارشاد ہے ''وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيْرُ سَحَاباً فسقناہ'' اور اللہ ہے جس نے چلائیں ہوائیں پھر ابھارتی ہیں وہ ہوائیں بدلی پھر ہانکا ہم نے۔الخ

ارشاد ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' میں لفظ ''نَعْبُدُ'' عبادت سے ماخوذ ہے اور عبادت ایسے فعل کو کہتے ہیں جو غیر کی تعظیم کی غرض سے لایا جائے یہ طریق معبد یعنی طریق مذلل سے ماخوذ ہے۔''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' کا مفہوم پہلے معلوم ہو چکا ہے وہ یہ کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔یعنی عبادت و بندگی صرف اور صرف تیری ذات کے لئے منحصر اور مخصوص ہے۔عبادت صرف اللہ رب العالمین کیلئے خاص ہے اس کی ذات کے ساتھ عبادت کے اختصاص اور انحصار کی کئی وجہیں ہیں

وجہ اول: عبادت انتہائے تعظیم کا نام ہے اس لئے یہ اسی ذات کے لئے لائق ومناسب ہونی چاہئے جس سے نہایت انعام صادر ہوئی اور تمام انعامات میں سب سے اہم واعظم انعام،نعمت حیات ہے اور پھر نفع بخش چیزوں کی تخلیق علیحدہ نعمت چنانچہ حیات سے ہی انتفاع پر قدرت ہوتی ہے غرضیکہ اس مقام پر دو مرتبہ ہے۔

مرتبہ اولیٰ وہ حیات ہے جس سے انتفاع پر قدرت کا افادہ ہوتا ہے اس کی طرف اس آیت سے اشارہ ہے۔''وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا'' اور میں نے تو اس سے پہلے تجھے اس وقت بنایا جب تو کچھ بھی نہ تھا (مریم:۹) اور ارشاد ہے ''كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ'' تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا (البقرۃ:28) مرتبہ دوم اشیاء منتفعہ یعنی نفع بخش چیزوں کی تخلیق ہے اسکی طرف اشارہ ہے ارشاد باری تعالیٰ سے ''هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' (البقرۃ:۲۹) اور اس عالم سفلی کے

مصالح و مقاصد کے حصول کا زیادہ تر انحصار آسمانی افعال اور فلکی حرکات پر ہے اس لئے اس کے بعد ارشاد ہوا "ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف استوا (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے (البقرۃ:۲۹) اس سے بہت ظاہر کہ تمامی زمینی و آسمانی نعمتیں سب کی سب صرف اور صرف اللہ رب العزت ہی کی ایجاد و تخلیق کرنے سے ہے لہذا واجب و فرض ہے کہ عبادت بھی صرف اسی کی ہو اسی لئے اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں اِيَّاكَ کی تقدیم کے ساتھ وارد ہوا تا کہ افادۂ حصر ہو۔

وجہ دوم: عبادت رب تعالیٰ کے لئے منحصر و متعین ہونے کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ رب العلمین نے سورہ فاتحہ میں اسمائے ذات وصفات میں سے پانچ اسمائے مبارکہ ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہیں۔ اللہ، رب، رحمن، رحیم، مالک یوم الدین۔

اور بندہ کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ماضی، حال، مستقبل

زمانہ ماضی میں بندہ معدوم محض تھا چنانچہ ارشاد ہے "وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا" (البقرۃ:۲۹) یا یہ کہیں کہ زمانہ ماضی میں انسان مردہ تھا اسی رب نے اسے حیات کی نعمت عطا فرمائی ارشاد ہے "كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ" (البقرۃ:۲۸) پھر انسان جاہل تھا اسی رب نے اسے علم کی دولت عطا فرمائی ارشاد ہے "وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا کہ کچھ نہ جانتے تھے اور تمہیں کان، آنکھ اور دل دیئے کہ تم احسان مانو (النحل:۷۸) غرضیکہ انسان جو عدم سے وجود کی طرف، موت سے حیات کی طرف، عجز سے قدرت کی طرف اور جہل سے علم کی طرف منتقل ہوا ہے اس کی علت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازلی قدیم ہے پس اس نے اپنی قدرت ازلیہ اور علم ازلی سے انسان کو عدم سے وجود بخشا لہذا وہ اس معنی کر یعنی زمانہ ماضی کی طرف نظر کرتے ہوئے بھی الہ و معبود ہے۔

رہا زمانہ حال و حاضر تو یہ امر محسوس و مشاہد ہے کہ ہر انسان اس دنیا میں سخت محتاج ہے اور پھر کیوں نہ محتاج ہو کہ جب وہ معدوم تھا تو نیستی سے ہستی میں آنے کے لئے رب، رحمن و رحیم ہی کا محتاج تھا پس جب اس ذات پروردگار نے اسے وجود بخشا اور وہ پردہ عدم سے منصۂ شہود پر آیا تو چاروں طرف سے حاجتوں اور ضرورتوں نے اسے گھیر لیا اور وہ بالکل

لاچار و مجبور تھا کہ رب نے فرمایا اے انسان! تو گھبرا نہیں کہ میں ہی تمہارا الہ برحق ہوں جبھی تو میں نے تمہیں عدم سے وجود کی طرف نکالا اور اب جب تم موجود ہو گئے تو حاجتوں نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تو بھی نہ گھبراؤ کہ بیشک میں ہی رب، رحمن و رحیم ہوں۔ جب تک تم زندہ رہو گے میری شان رحیمی سے تمہاری ہر حاجتیں پوری ہونگی اور تمہاری ہر طرح تربیت ہوتی رہے گی۔

آخری حالت انسان کی آئندہ کی حالت ہے (حالِ مستقبل) اور یہ مابعد الموت کی حالت ہے۔ انسان کی اس حالت آئندہ سے رب تعالیٰ کی صفت "مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" متعلق ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کے اوصاف میں سے مذکورہ پانچوں اوصاف، انسان کی تینوں حالتیں ماضی، حال و مستقبل سے متعلق ہیں جس کا مفاد یہ ہے کہ زمانہ ماضی، زمانہ حال اور زمانہ مستقبل ہر زمانہ میں انسان کے جملہ مصالح اور تمام حاجات بغیر فضل الٰہی اور اسکے احسان و کرم کے ممکن نہیں۔ اور جب واقعہ یہ ہے تو بندہ پر واجب و لازم ہے کہ صرف اسی کی عبادت میں مشغول رہے چنانچہ اسی حقیقت کا اعتراف بندہ کرتے ہوئے کہتا ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔

وجہ سوم: صرف اللہ عز شانہ تعالیٰ ہی واجب لذاتہ ہے اور اس کے ماسوا سب ممکن لذاتہ ہے اور ممکن لذاتہ خود فقیر اور غیر کا محتاج ہوتا ہے اور جب محتاج خود اپنی حاجت برآری میں مشغول رہتا ہے اور غیر کا محتاج رہتا ہے تو وہ غیر کی حاجتوں کو کیا دفع کر سکتا ہے؟ چونکہ ذات جب تک واجب لذاتہ نہ ہو وہ غیر سے حاجات کو دفع نہیں کر سکتی اور غنی لذاتہ وہ اللہ تعالیٰ ہے تو دافع الحاجات بھی اور قاضی الحاجات بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لہٰذا مستحق عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اسی سبب سے ارشاد ہوا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"

وجہ چہارم: یہ کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کی قدرت، قدرت حقیقیہ کاملہ عظیمہ ہے کائنات کی ہر شئی اسی کی قدرت کا مظہر ہے کیا نہیں دیکھتے بلند و بالا آسمان بغیر علاقہ کے قائم ہے۔ وسیع و عریض زمین بغیر کسی ٹیک کے بچھی ہوئی ہے۔ آسمانی منازل میں شمس و قمر سیر کرتے ہیں اور قطبین سکون پذیر ہیں، وہ ایسا قدیر ہے کہ کبھی پتھر سے پانی نکالتا ہے موسیٰ علیہ السلام کے پتھر سے بارہ چشموں کا نکلنا متواتر ہے بلکہ آج کوہساروں اور پہاڑوں سے چشمے ابلنے کا نظارہ دنیا کر رہی ہے اور کبھی پانی سے پتھر نکالتا ہے اور وہ جمد ہے۔ وہی بادل سے کبھی آگ نکالتا ہے اور وہ برق ہے اسی بادل سے کبھی ہوا، پھر اسی بادل سے کبھی پانی و بارش نازل کرتا ہے پھر یہ زمین جس پر تم بسیرا کئے ہو میں ذرا غور کرو کہ اس نے اس میں ایسے

اجسام پیدا کئے جو چلتے نہیں بلکہ ٹھہرے ہوئے ہیں جیسے پہاڑ وغیرہ اسکے برخلاف کچھ ایسے اجسام ہیں جو ٹھہرتے نہیں بلکہ چل رہے ہیں جیسے نہریں۔

ذرا اس ذات کریم کی قدرت کا کمال تو دیکھو کہ قارون کو زمین کے اندر دھنسا دیا اور زمین کو اس کے اوپر کر دیا لیکن اپنے حبیب مکرم حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا بلند و بالا فرمایا کہ قاب قوسین کو ان کے نیچے کر دیا۔ فرعون اور اسکی قوم کو پانی میں ڈبو یا گیا تھا لیکن پانی کو آگ بنا دیا چنانچہ ارشاد ہے۔ ''اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا'' لیکن اسکے برعکس ابراہیم علیہ السلام پر نار نمرود کو پانی بنا دیا ارشاد ہے۔ ''یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ'' بلکہ وہ پانی سے آگ پیدا کرتا ہے سورہ یسین میں ارشاد ہے۔ ''اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ'' وہ ذات شجر اخضر سے آگ پیدا کیا وہ اس طرح کہ شجر اخضر کی شاخوں کو کاٹنے کے بعد پانی گرتا ہے اور ایک شاخ کے پانی کو دوسری شاخ کے پانی کے ساتھ ملانے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔

مزید دیکھو کہ موسیٰ علیہ السلام کو کبھی طور پہاڑ کے اوپر کیا چنانچہ ارشاد ہے ''فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ'' لیکن یہ بھی دیکھو کہ طور پہاڑ کو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے اوپر اٹھا دیا ارشاد ہے ''وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ''۔

نوح علیہ السلام کے عہد میں پوری دنیا کو خشک تنور سے غرق کر دیا ارشاد ہے ''وَفَارَ التَّنُّوْرُ'' پھر موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریائے قلزم کو خشک راستہ بنا دیا پس جس ذات قدیر کی قدرت کا یہ عالم ہو تو اس کی مخلوقات میں سے جمادات و نباتات یا حیوان و انسان یا فلک و ملک یا اور کوئی کیونکر عبادت میں اسکے مقابل ہو سکتا ہے جو کوئی اس کے مقابل کسی کو عبادت میں اس کے مساوی یا شریک ٹھہراتا ہے یقیناً وہ پرلے درجہ کا خسیس جاہل و سفیہ ہے کہ وہ ناقص و کامل اور خسیس و نفیس کے درمیان فرق کی تمیز نہیں رکھتا۔ اسی لئے ارشاد ہوا ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ''۔

فائدہ (۲): ارشاد پاک ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' کی دلالت ''لا معبود الا اللہ'' پر ہوتی ہے جس کا مفہوم ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہی مفہوم ہے ''لا الہ الا اللہ'' کا غرض ارشاد الٰہی اِیَّاكَ نَعْبُدُ کی دلالت، توحید خالص پر بھی ہو رہی ہے۔

یاد رہے کہ کفار و مشرکین جو اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں وہ کئی گروہ میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ انہوں نے جس کو خدائے وحدہٗ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے وہ شریک کئی قسموں کے ہیں۔ یا تو وہ اجسام سفلیہ سے ہے یا اجسام علویہ سے۔ جنہوں نے اجسام سفلیہ میں سے شرکاء ٹھہرائے ہیں وہ

جسم مرکب ہے یا بسیط ہے پھر جسم مرکب یا تو معادن سے ہے یا نباتات سے ہے یا حیوان سے ہے پس جنہوں نے اجسام معدنیات سے شرکاء ٹھہرائے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے احجار یا سونا یا چاندی کے اصنام بنائے اور ان کی پرستش کی۔ اسکے برخلاف کچھ مشرکین وہ ہیں جنہوں نے اجسام نباتیہ کو شریک ٹھہرایا چنانچہ انہوں نے کسی معین درخت کو اپنا معبود بنالیا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے حیوان میں سے شریک ٹھہرایا پس ان میں کچھ وہ ہیں جنہوں نے بچھڑا کو معبود بنایا اور ان میں کچھ وہ ہیں جنہوں نے انسانوں میں معبود بنالئے چنانچہ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ گمان کیا اسی طرح اہل ہنود نے رام، کرشن اور شنکر جیسے لوگوں کو بھگوان بتا کر شریک ٹھہرایا۔ یہ ان شرکاء کا بیان تھا جو اجسام مرکبہ سے تھے رہے اجسام بسیطہ مفردہ تو ان میں سے بھی بہت سے نادانوں نے جسم بسیط کو نشریک ٹھہرایا چنانچہ مجوسی آتش پرست نے آگ کو معبود بنایا اہل ہنود پانی کو بھی پوجتے ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ مشرکین اجسام علویہ کی پرستش کرتے ہیں چنانچہ صابی اور اکثر منجمین شمس وقمر اور تمام ستاروں کو پوجتے ہیں اور سعد ونحس کی نسبت انہیں سیاروں کی طرف کرتے ہیں۔

کچھ مشرکین وہ ہیں جنہوں نے غیر اجسام کو شریک بنائے ان میں بھی کئی گروہ ہیں ایک گروہ وہ ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ مدبر عالم وہ نور وظلمت ہے اور وہ مانویہ وثانویہ ہیں دوسرا گروہ ایسا نظریہ رکھتا ہے کہ ملائکہ ارواح فلکیہ کا نام ہے اور ہر اقلیم کے لئے ایک روح معین ہے جو اس میں مدبر ہے بلکہ اس عالم کے انواع میں سے ہر نوع ایک فلکی روح ہے جو اس کے لئے مدبر ہے یہ گروہ ان ارواح فلکیہ کے نام کی صورت وتماثیل بنا کر اس کی پوجا کرتے ہیں یہ ملائکہ پرست ہے۔ ان میں کا تیسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ عالم کے دو معبود ہیں ایک خیر دوسرا شر پس انہوں نے کہا کہ اس عالم کا مدبر اللہ تعالیٰ ہے اور ابلیس اور وہ دونوں معاذ اللہ بھائی ہیں اور مدبر عالم میں شریک ہیں۔ البتہ عالم میں جو خیرات اور بھلائیاں پائی جاتی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں اور جو اس میں برائیاں اور شر پائے جاتے ہیں وہ ابلیس شیطان کی طرف سے ہیں اس طرح وہ خالق خیر کو یزدان اور خالق شر کو اہرمن کا نام دیتے ہیں۔

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کے ساتھ معبودان باطل کو شریک ٹھہرانے والے کوئی معمولی درجہ کے لوگ نہیں ہیں بلکہ روم ویونان کے فلسفی، ریاضی داں یوروپ کے سائنس داں اور ہندوچین کے دانشور ہیں جنہوں نے اپنی عقل ودانش کی بنیاد پر کائنات کی وسعتوں کو سمیٹ لیا، سورج کی روشنی کو مسخر کرلیا آسمانوں پر کمندیں ڈالیں آسمانوں کی مسافتوں کو طے کر کے چاند پر پہنچنے کے مدعی ہوئے مگر افسوس عظیم مخلوق کے خالق کی معرفت حاصل نہ کر سکے صرف ظاہری نفع ونقصان کے مدنظر غیر اللہ کو خدائے وحدہٗ لاشریک لہ کا شریک ٹھہرالیا۔

ان کے برخلاف جنہوں نے عقل سلیم سے کام لیا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو بسر وچشم قبول کیا وہ توحید خالص کے عقیدہ پر رہے شرکاء واضداد کی نفی کی اور صرف اور صرف اللہ ہی کی عبادت کی غیر اللہ کی طرف ملتفت بھی نہ ہوئے انہوں نے امیدیں باندھیں تو اللہ سے، خوف کیا تو اللہ کا، رغبت رکھی تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں اور ڈرے تو اللہ سے ڈرے اس لئے انہوں نے عبادت کی تو اللہ کی اور استعانت چاہی تو اللہ سے چاہی یہی وجہ ہے کہ اس کے مخلص بندے کہتے ہیں ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' لا الہ الا اللہ کے قائم مقام ہے۔

فائدہ (۳): ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' میں ترکیب نحوی کے اعتبار سے اِیَّاکَ مفعول بہ ہے اور مفعول کا مقام فعل وفاعل کے بعد ہوتا ہے پس نَعْبُدُکَ ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ارشاد ہوا بلکہ اِیَّاکَ کو نَعْبُدُ سے مقدم کر کے بیان فرمایا اس کی کئی وجہیں ہیں پہلے تقدیم کی کئی وجہیں بیان ہو چکی ہیں ذیل میں چند وجہیں مزید رقم ہیں۔

وجہ اول: اِیَّاکَ سے ذات وحدہٗ لاشریک لہ مراد ہے پس اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اس میں اپنی ذات کو مقدم فرمایا تاکہ عبادت کرنے والا متنبہ ہو جائے کہ ہم جس ذات کی عبادت کر رہے ہیں وہ معبود اللہ تعالیٰ ہے اس لئے اب عبادت کرنے والا اس کی تعظیم اور عبادت میں سستی نہ کریگا اور نہ دائیں بائیں متوجہ ہوگا۔ جیسا کہ دنیا میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی باعظمت شخص کا تصور ذہن ودماغ میں جب سما جاتا ہے تو وہ اس سے فطرتاً مرعوب ہو جاتا ہے۔

یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک بہت بڑا پہلوان جو پہلوانوں کا استاذ تھا اس کی ایک رستاقی سے کشتی ہوگئی رستاقی نے پہلوان استاد کو کئی مرتبہ بچھاڑ دیا اب اس رستاقی کو بتایا گیا کہ وہ پہلوان فلاں استاذ ہے جونہی فلاں استاذ پہلوان کا نام سنا اس کے نام کے خوف سے فوراً چت ہوگیا۔ اور یہ اسی لئے ہوا کہ اس کے نام کی دہشت اس کے دل میں بیٹھ گئی اور وہ مرعوب ہوگیا۔

بلاتمثیل عبادت کرنے میں جب اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کی ذات پر دلالت کرنے والے لفظ کا تکلم پہلے کریگا تو اس کی عظمت ذات اور جلال باری سے ایسا مرعوب ہوگا کہ غیر کی طرف دھیان نہ جائے گا۔

وجہ دوم: اِیَّاکَ کو مقدم کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ عبادات وطاعات بندہ پر جب ثقیل ودشوار لگیں تو پریشان نہ ہو بلکہ گویا ارشاد ہوتا ہے اے میرے بندے مجھے یاد کر اور اپنے قلب میں میری معرفت حاصل کر جب میری عزت وجلال اور عظمت وکبریائی کو یاد کریگا اور یقین کریگا کہ میں تیرا مولیٰ وآقا ہوں اور تو میرا بندہ ہے تو تم پر عبادات وطاعات

آسان ہوجائیں گی مثال کے طور پر جو کوئی بہت بھاری بوجھ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ ایسی غذائیں استعمال کرتا ہے جس سے اس کے جسم میں طاقت وقوت پیدا ہوتی ہے اسی طرح جو بندہ عبادات وطاعات کی تکالیف کا بوجھ اٹھانا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ معرفت ربوبیت کے معجون کو کھالے جو معرفت کہ اس کو ''ایاک'' سے حاصل ہوگی۔ دوسری مثال سے اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ معشوق کی موجودگی میں جب عاشق پر ضرب لگائی جاتی ہے تو وہ ضرب اس پر آسان ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی جب بندۂ عابد ''اِیَّاکَ'' کے جمال کا مشاہدہ کریگا تو اس پر بار عبودیت کا اٹھانا آسان ہوجائے گا۔

وجہ سوم: ارشاد ربانی ہے ''اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ''۔ (الاعراف:۲۰۱) بیشک وہ جو ڈرنے والے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے ہوشیار ہوجاتے ہیں اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ جب کسی متقی بندہ کو شیطانی خیال یا وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو وہ حضرت جلال باری کو یاد کرتے ہیں اور وسوسہ اور شیطانی خیال دور ہوجاتا ہے۔ پس عبادت ونماز میں بندہ کو شیطان کی طرف سے جب غفلت وسستی طاری ہوتی ہے تو وہ ارشاد ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' سے اولاً جلال باری کو یاد کرتا ہے اس طرح اس سے غفلت وسستی دور ہوجاتی ہے اور بندہ عبادات وطاعات کے لئے کمربستہ ہوجاتا ہے۔

وجہ چہارم: اِیَّاکَ کو مقدم کرنے کی بجائے اگر نَعْبُدُ کو مقدم کردیا جاتا تو اولاً اپنی طرف سے عبادت کرنے کا ذکر ذہن میں آتا لیکن یہ ذہن میں نہ آتا کہ یہ عبادت کس کے لئے ہے اس وقت احتمال ہوسکتا ہے کہ ابلیس شیطان یہ کہے کہ یہ عبادت اصنام واجسام کے لئے ہے یا شمس وقمر کے لئے ہے وغیرہ۔ لیکن اِیَّاکَ پہلے ذکر کرے گا اور نَعْبُدُ بعد میں تو گذشتہ واہمہ ختم ہوجائے گا چونکہ اس صورت میں صراحۃً اولاً اس ذات معبود کا ذکر ہے جو عبادت کا مستحق ہے اس حیثیت سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ بیان توحید میں ابلغ اور احتمال شرک سے ابعد ہے۔

وجہ پنجم: بعض محققین نے کہا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنکی نگاہ نعمت پر نہیں بلکہ منعم پر ہوتی ہے ایسے ہی بلاء و مصیبت کے موقع پر بھی وہ بلاء ومصیبت کی طرف نگاہ نہیں کرتے بلکہ اس کی نگاہ نعمت وبلا ہر موقع پر منعم ومبتلی کی طرف ہوتی ہے جب بندہ اس مقام پر ہوتا ہے تو ہر وقت حق سبحانہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق رہتا ہے اور جس کی یہ حالت ہوجاتی ہے یقینا وہ ابدی سعادتوں کے بلند ترین مرتبہ پر فائز ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جنکی نگاہ منعم پر نہیں بلکہ ہر وقت اس کی نگاہ صرف نعمت پر ٹکی رہتی ہے ایسے ہی بلا ومصیبت کے موقع پر اسکی نگاہ مبتلی پر نہیں بلکہ بلا ومصیبت پر ہوتی ہے غرضیکہ نعمت وبلا ہر وقت میں ایسے لوگ غیر خدا کی طرف اشتغال رکھتے ہیں اس طرح وہ

ہمیشہ شقاوت و بدبختی میں پڑا رہتے ہیں کیونکہ نعمت ملنے کے وقت بھی وہ زوال نعمت کی فکر و اندیشہ سے خائف و ترساں رہتے ہیں اور جب نعمت فوت ہوجاتی ہے تو وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا رہتا ہے چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی امت کی نگاہ صرف نعمت پر تھی اس لئے ان کو خطاب ربانی اس طرح ہوا "یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ "اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا (سورہ بقرہ آیت: ۴۰) لیکن اس کے برخلاف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ نعمت کے پیدا فرمانے والے خالق کائنات کی طرف تھی۔ تو ان کو خطاب ربانی اس طرح ہوا "فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ "تو میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کرونگا (بقرہ: آیت: ۱۵۲)

اس تمہید کے بعد لفظ "اِیَّاکَ "کی نَعۡبُدُ پر تقدیم کی وجہ ظاہر ہے وہ یہ کہ بندہ اِیَّاکَ کے نور جلال کے مشاہدہ میں اولاً مستغرق رہے تاکہ اداء عبادت کے وقت میں اپنے کو عین فردوس میں مستقر محسوس کرے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں اور جس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں میں اس کے لئے سمع و بصر اور ید ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا، دیکھتا اور پکڑتا ہے۔

وجہ ششم: اگر نعبد کا ذکر ہوتا تو غیر اللہ کی عبادت کی نفی نہ ہوتی کیونکہ اس طرز کلام سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ غیر اللہ کی عبادت کا تصور محال سمجھ میں نہیں آتا بلکہ اس سے تو غیر اللہ کی عبادت کا تصور بھی ہوتا ہے جیسا کہ مشرکین کا طریقہ ہے لیکن جب اِیَّاکَ نَعۡبُدُ فرمایا تو مطلب یہ ہوا صرف اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے ہم غیر اللہ کی عبادت کا تصور بھی نہیں کرسکتے

وجہ ہفتم: نعبد میں نون، نون عظمت کا ہے نون لاکر گویا یہ کہا گیا کہ اے میرے بندو! جب تم نماز سے باہر رہو تو نحن (ہم) نہ کہو گرچہ تم ہزاروں ہزار کی تعداد میں ہو اس لئے کہ "ہم" میں کبر ہے جو عبودیت کے لائق نہیں لیکن جب تم نماز میں مشغول ہو اور میرے لئے اپنی عبودیت ظاہر کرو تو نعبد صیغہ جمع کے ذریعہ ظاہر کرو اگرچہ تم تنہا ہی نماز میں رہو تاکہ کل کے نزدیک یہ ظاہر ہوجائے کہ جو رب العلمین کا بندہ ہے وہ دنیا و آخرت کا بادشاہ ہوتا ہے۔

وجہ ہشتم: نعبد کی بجائے اعبد نہ ارشاد ہوا گرچہ ایک آدمی تنہا عبادت کرے کہ اعبد یعنی میں عبادت کرتا ہوں، میں انا اور تکبر ہے لیکن جب ایک شخص نعبد کہتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے رب تیری عبادت کرنے والوں میں سے میں بھی ایک ہوں دونوں تعبیر میں فرق ظاہر ہے کہ اول میں تکبر ہے تو دوسری میں تواضع ہے اور جو تواضع

کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتا ہے لیکن جو کبر کرتا ہے اسے نیست و ذلیل کر دیتا ہے۔ اس لئے ارشاد نبوی ہے کہ بندہ سجدہ میں رب تعالیٰ سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔

اعتراض: "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کی تقدیم و تاخیر کے وجوہ کے بیان سے یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" میں اَلْحَمْدُ پر لِلّٰہِ کو مقدم کیوں نہیں فرمایا تا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی طرح نور جلال ذات الٰہی کا ذکر پہلے ہو اور حمد کا ذکر بعد میں ہو؟

جواب: یہ ہے کہ حمد گو کہ اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے مگر حمد غیر اللہ کے لئے بھی جائز ہے جب بندہ اَلْحَمْدُ کے بعد لِلّٰہِ کہتا ہے تو حمد کو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص و مقید کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حمد اللہ تعالیٰ کے لئے ہے غیر کے لئے نہیں۔ اس کے برعکس اگر حمد کی طرح نَعْبُدُ کو اِیَّاکَ پر مقدم کر دے تو احتمال ہوگا کہ یہ عبادت اللہ کے لئے ہے اور غیر اللہ کے لئے بھی جائز ہے جب کہ یہ کفر ہے۔

لہٰذا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" میں اِیَّاکَ کو مقدم کرنے، نَعْبُدُ کو مؤخر کرنے اور 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں لِلّٰہِ کو مؤخر کرنے اور اَلْحَمْدُ کو مقدم کرنے میں نکتہ یہی ہے کہ ظاہر امر میں حمد جب غیر اللہ کے لئے جائز ہے جیسا اللہ کے لئے ثابت ہے پس اس لحاظ سے الحمد کو مقدم کرنا ہی احسن ہے لیکن اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں عبادت جب غیر اللہ کے لئے جائز ہی نہیں ہے تو اِیَّاکَ کو نَعْبُدُ پر مقدم کرنا ہی ضروری ہوا تا کہ کلام میں غیر اللہ کی عبادت کا احتمال ہی ختم ہو جائے۔

فائدہ چہارم: (اعتراض) اس مقام پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ نَعْبُدُ میں نون، نون جمع ہے یا نون تعظیم ہے نون جمع نہیں ہو سکتا کہ شخص واحد جمع نہیں ہو سکتا اسی طرح نون تعظیم بھی نہیں ہو سکتا کہ عبادت کی ادائیگی کے موقع پر ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہایت ہی عاجز اور کامل ذلیل سمجھے کہ عبادت نام ہی ہے اپنی عاجزی کے اظہار کا اور رب کی کبریائی کے اظہار کا اگر بندہ دوران عبادت خود اپنی عظمت کا تصور کر لے تو مفہوم عبادت ہی کا فقدان ہو جائے گا اس لئے نَعْبُدُ میں نون تعظیم کا بھی نہیں ہو سکتا۔

جواب: مندرجہ بالا اعتراض کا جواب کئی وجوہ سے ممکن ہے یہ سب وجوہ حکمت بالغہ پر مشتمل ہیں۔

وجہ اول: یہ ہے کہ یہ نون، نون جمع ہے اس میں اشارہ ہے کہ انسان کے لئے باجماعت نماز پڑھنا اولیٰ بلکہ مسنون مؤکدہ ہے اور باجماعت نماز پڑھنے کے فوائد سے اوراق حدیث لبریز ہیں چنانچہ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ باجماعت نماز کی تکبیر اولیٰ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اس مقام پر یہ نکتہ خیال رہے کہ اگر کوئی لہسن یا پیاز کھالے تو اسکو جماعت

میں حاضر ہونا منع ہے کہ اس کے منہ کی بو سے نماز میں شامل ملائکہ اور انسانوں کو اذیت نہ ہو گویا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ نماز کا یہ ثواب عظیم اس شخص کو نہیں مل سکتا جو لہسن و پیاز کی بو سے مسلمانوں کو اذیت دے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان و ہاتھ سے ضرب و شتم اور غیبت و چغلی کے ذریعے تکلیف دینے سے ثواب کا کیوں کر مستحق ہو سکتا ہے۔

وجہ دوم: بیشک انسان جب باجماعت نماز پڑھتا ہے تو کہتا ہے "نَعْبُدُ" اور مراد اس سے جمع ہے ظاہر ہے کہ باجماعت نماز پڑھنا تعداد افراد کے بغیر ممکن نہیں اسلئے نَعْبُدُ کا جمع ہونا ظاہر ہے اور اگر تنہا نماز پڑھتا ہے تو نَعْبُدُ اس لئے کہتا ہے کہ میں اور میرے ساتھ ملائکہ نماز میں شامل ہیں گویا نَعْبُدُ میں وہ اور نماز میں شامل تمام فرشتے مراد ہیں اس لئے نَعْبُدُ جمع ہی لانا ضروری ہوا۔

وجہ سوم: قرآن و حدیث میں آیا ہے سب مومن بھائی بھائی ہیں پس اگر "ایاک اعبد" واحد متکلم کے ساتھ ذکر ہو تو عبادت کرنے والا صرف اپنی عبادت کا ذکر کر رہا ہے اور دوسرے مسلمان بھائی کی عبادت کا ذکر تک نہ کیا لیکن جب بندہ نَعْبُدُ کہتا ہے تو اپنی عبادت کے ساتھ شرق و غرب بلکہ زمین و آسمان میں عبادت کرنے والے سب کی عبادت کو شامل کر لیتا ہے اس طرح وہ تمام مومنین کے مقاصد و مہمات کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور جو غیروں کے مہمات کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مقاصد کو پورا فرماتا ہے چنانچہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو کسی مسلمان کی حاجت کو پوری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی تمام حاجتوں کو پورا فرمائے گا۔

وجہ چہارم: نَعْبُدُ صیغہ جمع کے ساتھ ارشاد ہوا چونکہ جب بندہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کہہ کر اللہ تعالیٰ کے تمام محامد و کمالات اور قدرت و اختیارات ثابت مان کر ثنا کرتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ اے میرے بندہ تو نے دنیا و آخرت کے تمام محامد و کمالات ثابت کر کے تو نے میری بارگاہ عزت میں اپنی قدر و منزلت بڑھالی ہے اس لئے اب صرف اپنے مقاصد کی اصلاح کے لئے کوشش نہ کر بلکہ تمام مسلمین کی اصلاح کی کوشش کر اور کہہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ"۔

وجہ پنجم: تنہا عبادت کرنے والا نَعْبُدُ صیغہ جمع کے ساتھ اس لئے بھی پڑھتا ہے کہ منفرد عبادت گذار گویا یہ کہتا ہے اے میرے معبود میری عبادت اس لائق نہیں کہ میں اسے تنہا ذکر کروں چونکہ میری تنہا کی عبادت تقصیرات و نقصانات کی جہات سے مخلوط ہے اس لئے میں تمام عابدین جس میں حضرات انبیاے کرام، ملائکہ عظام اور تمام اولیاے کاملین، شہداے اسلام و صالحین سب شامل ہیں کی کامل عبادتوں کے ساتھ اپنی ناقص عبادت کو ملا کر ایک عبارت کے ساتھ پیش

کرتا ہوں تا کہ کاملین کی عبادتوں کے زمرہ میں مجھ ناقص کی ناقص عبادت بھی شرف قبولیت کو پہنچ جائے ۔ چنانچہ مسئلہ شرعیہ بھی یہی ہے کہ کوئی بائع ایک ٹوکرا پھل بھر کر مثلاً سیب فروخت کرنا چاہتا ہے تو مشتری پر لازم ہے کہ خریدے تو پورا ٹوکرا خریدے ورنہ نہ خریدے اس کو یہ جائز نہیں ہوگا کہ ایک صفقہ (بیع) سے کچھ خریدے اور کچھ نہ خریدے کہ تعدد صفقہ منع ہے۔ بلا تمثیل یہ سمجھو کہ جب بندہ ایاک نعبد کہتا ہے تو اپنی عبادت کو تمام صالحین کی عبادتوں کے ساتھ ملا کر بارگاہ رب العزت میں پیش کرتا ہے تا کہ سب بزرگوں کے ساتھ اس کی عبادت بھی قبول ہو جائے کیونکہ جب دنیا کے مشتری کا یہ حکم ہے کہ قبول کرے تو سب کو اور نہ کرے تو ایک بھی نہیں کرے یہ نہیں کر سکتا کہ بعض قبول کرے اور بعض نہ کرتے تو اکرم الاکرمین ارحم الراحمین کے کرم بے انتہا سے یہ کیونکر تصور ہو سکتا کہ بعض کو قبول کر لے اور بعض کو رد کر دے بلکہ وہ ذات کریم تو سب کو قبول کرتا ہے اس کی ذات کریم سے یہ مستبعد ہے کہ سب کو رد کر دے کیونکہ کہ اس کے قول ایک نَعْبُدُ میں تمام انبیاء و ملائکہ اور اولیاء و صالحین کی عبادتیں داخل ہیں پس جب وہ ان سب کی قبول فرمائے گا تو سبھوں کے ساتھ قائل کی بھی قبول فرمالے گا غرضیکہ عبادت کرنے والا یہ کہتا ہے

اے میرے معبود گرچہ میری عبادت تیری بارگاہ میں قبولیت کے لائق نہیں ہے پھر بھی اسے رد نہ فرما اس لئے کہ اس عبادت میں میں تنہا نہیں ہوں بلکہ میرے ساتھ تیرے ان گنت محبوب بندے شامل ہیں اس لئے میں اپنی اس عبادت کی قبولیت کے لئے تیری بارگاہ میں تیرے محبوبین کی عبادتوں کا وسیلہ و سہارا لیتا ہوں تا کہ ان کے وسیلہ سے میری بھی قبول کر لے۔

فائدہ (۵) : عبادت الہیہ میں فائدے ہی فائدے ہیں ان فوائد کی جس کو معرفت ہو جاتی ہے ان کو عبادت میں بڑی لذت ملتی ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ ہر وقت عبادت ہی میں لگا رہے غیر عبادت میں اشتغال اس کے نفس پر شاق گذرتا ہے اس کی بھی کئی وجہیں ہیں۔

وجہ اول : یہ کہ کمال، بالذات محبوب شئی ہے اور انسان کے احوال میں سب سے زیادہ کامل اور قوی تر حالت انسان کا عبادت الہیہ سے مشغول ہونے کی سعادت ہے کیونکہ اس وقت اس کا قلب نور الٰہی سے پرنور ہو جاتا ہے ذکر و قرأت کے شرف سے اس کی زبان مشرف ہو جاتی ہے اور خدمت الہیہ کے جمال سے اس کے اعضاء حسین و جمیل ہو جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ مراتب انسانیہ اور درجات بشریہ کے یہ بزرگ ترین احوال ہیں پس جب ان احوال کا حصول زمانہ حال میں انسانی سعادت میں سب سے زیادہ باعظمت ہے تو یقیناً زمانہ مستقبل میں بھی کامل ترین سعادتوں

کے حصول کا موجب ہوگا لہذا جوان احوال پر مطلع ہوجاتا ہے اس سے عبادت کا ثقل ختم ہوجاتا ہے اور اس کے قلب میں عبادت کی حلاوت ہی حلاوت محسوس ہوتی ہے۔

وجہ دوم: عبادت امانت ہے ارشاد ربانی ہے "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" (الاحزاب: ۷۲) اور امانت کی ادائیگی عقلاً وشرعاً واجب ہے۔ ارشاد ربانی ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا" اور امانت کی ادائیگی صفات کمال سے ایک صفت ہے جو بالذات محبوب ہے۔ اور جانبین میں سے ایک جانب سے اگر امانت کی ادائیگی ہوتی ہے تو یہ دوسری جانب سے امانت کی ادائیگی کا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض صحابی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو دیکھا کہ دروازہ مسجد پر آیا اپنی اونٹنی سے نیچے اترا اور اسے چھوڑ دیا مسجد میں داخل ہوا اطمینان وسکون اور وقار وطمانیت سے نماز ادا کیا پھر جو چاہا دعا کیا صحابہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس کے عمل سے تعجب ہو رہا تھا جب باہر نکلا تو دیکھا کہ اونٹنی غائب ہے اس نے اپنی اونٹنی کو نہ پا کر کہا اے میرے معبود میں نے تیری امانت ادا کر دی میری امانت کہاں ہے راوی کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا وہ اعرابی تھوڑی دیر نہیں ٹھہرا کہ ایک آدمی جس کا ہاتھ کٹا تھا اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور اسکو سپرد کر دیا۔

اس میں نکتہ یہ ہے جب بندہ اللہ کی امانت کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ اس کی امانت کی حفاظت فرماتا ہے۔ یہی مراد ہے اس حدیث سے بھی جو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "یا غلام احفظ اللہ فی الخلوات یحفظک اللہ فی الفلوات"۔ اے نوجوان تنہائیوں میں حدود اللہ کی محافظت کرو، اللہ تعالیٰ بیابانوں میں تمہاری حفاظت فرمائے گا۔

وجہ سوم: جب بندہ عبادت الٰہی میں مشغول ہوتا ہے تو اس میں اشتغال کے سبب وہ عالم غرور سے نکلکر جہان سرور میں داخل ہوجاتا ہے۔ اور خلق کی مشغولیت سے کنارہ کشی کر کے درگاہ حق میں جبیں سائی کرتا ہے اس وقت اسے کمال لذت وسرور حاصل ہوتا ہے کہ درگاہ حق میں ایسا مستغرق ہوجاتا ہے کہ اپنے بیگانے کی خبر نہیں رہتی جیسا کہ امام الائمہ سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہٗ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے چھت سے سانپ گرا سب لوگ منتشر ہو گئے مگر حضرت امام نہایت وقار وسکون کے ساتھ نماز میں رہے حتی کہ آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ سانپ گرا تھا۔

اسی طرح غوث الاغواث حضور سیدنا ومرشدنا فی الدارین حضرت غوث اعظم محبوب سبحانی قدس سرہٗ النورانی کے بارے

میں منقول ہے کہ شیطان بشکل سانپ بن کر مصلیٰ پر کھڑا ہو گیا لیکن آپ کی نماز میں کچھ فرق نہ آیا پھر وہ مردود گود میں آ کر جبہ مبارکہ میں داخل ہو گیا مگر حضور غوث اعظم کے خشوع وخضوع میں کچھ فرق نہ آیا۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعض اعضاء میں مرض آکلہ لاحق ہو گیا عضو کاٹنے کی نوبت آ گئی مگر اس زمانہ میں انسان کے جسم کے کسی حصہ کو کاٹنا کس قدر مشکل، تکلیف دہ اور جان سوز ہوگا اندازہ کیا جا سکتا ہے پس عضو کا کاٹنا ممکن نہ ہوسکا جب آپ نماز میں مشغول ہوئے تو لوگوں نے اس حصہ عضو کو کاٹ لیا لیکن حضرت عروہ کو پتہ بھی نہ چلا کہ میرا عضو کاٹا گیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو آپ کے سینہ مبارک سے صحابہ دیگچی کی طرح گھر گھراہٹ کی آواز سنتے تھے۔

ان سب سے ظاہر ہے کہ بندہ جب عبادت الٰہیہ میں مستغرق ہوتا ہے تو مشاہدۂ جمال الٰہی میں ایسا کھو جاتا ہے کہ خود اس کو اپنے وجود کی خبر نہیں ہوتی جس نابالغ معرفت کو اس میں تردد واقع ہوا سے جمال یوسفی میں نازل شدہ آیت کو پڑھنا چاہئے۔ ارشاد الٰہی ہے "فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ" (یوسف:۳۱) یعنی زنان مصر نے جب جمال یوسفی کا نظارہ کیا تو ان کے قلوب واذہان پر جمال یوسفی کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھیں چنانچہ انہوں نے پھلوں کے بدلے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں اور اس کا انہیں شعور بھی نہ ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب جمال بشر میں کھو جانے سے اعضا کٹنے پر احساس نہیں ہوتا تو جس کے قلب پر عظمت حق جل وعلا کا غلبہ ہو جائے، خشیت ربانی سے قلوب لبریز ہو جائیں مشاہدۂ جمالِ جلوۂ حق میں بندہ کھو جائے تو اعضا ٹکڑے ٹکڑے بھی ہو جائیں تو احساس نہ ہوگا۔ پھر عقل وتجربہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جب کوئی سخت مزاج ہیبت ناک بادشاہ کے دربار میں داخل ہوتا ہے تو اس کی عظمت وہیبت اس کے ذہن ودماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ اس کا اپنا پرایا بلکہ باپ بھائی اسکے سامنے سے گذر جاتا ہے وہ اس کو دیکھتا بھی ہے لیکن اس کے گذرنے کا اس کو شعور نہیں ہوتا اس کی وجہ یہی ہے اس کے ذہن ودماغ پر بادشاہ کا خوف ایسا طاری ہوتا ہے کہ اس کے قلب کو شعور وادراک سے روک دیتا ہے۔ جب دنیاوی بادشاہ مجازی کے خوف وہیبت سے آدمی کا شعور وادراک اس طرح سلب ہو جاتا ہے تو خالق کائنات بادشاہ حقیقی کے دربار میں کھڑا ہونے کے سبب حواس وعقول اور ادراک وشعور ناکام ہو جائیں تو جائے تعجب نہیں۔

عبادت کے درجات

''اہل تحقیق اور صوفیاے کرام کے نزدیک عبادت کے تین درجات ہیں''

پہلا درجہ: عبادت کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے یہ عبادت تو ہے لیکن یہ عبادت کا ادنی درجہ کہلاتا ہے۔صوفیاء کے نزدیک عبادت کا یہ درجہ نہایت ہی ساقط الاعتبار ہے کیونکہ عابد نے ثواب یا عتاب کو مقصود اہم سمجھ لیا ہے جبھی تو اس نے حصول مقصود کے لئے حق کو وسیلہ بنایا اور جس نے مطلوب بالذات کسی مخلوق کو بنالیا اور حق کو اپنے مقصود تک پہنچنے کا وسیلہ بنالیا یقیناوہ بہت ہی خسیس ہے۔

درجہ دوم: یہ ہے کہ آدمی اس نیت سے عبادت کرے کہ وہ اس عبادت کے ذریعہ یا اس کے احکام تکلیفیہ کو قبول کر کے یا اس کی طرف منسوب ہوکر مشرف ہوجائے یہ درجہ گو کہ ادنیٰ سے اعلیٰ ہے تاہم یہ درجہ بھی کامل نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی مقصود غیر اللہ ہے۔

درجہ سوم: یہ ہے کہ بندہ صرف اللہ خالق کائنات کی رضا کے لئے عبادت کرے کہ وہی اس کا معبود حقیقی ہے اور وہی اس کا خالق و مالک ہے اور اس لئے کہ وہ اسی کا بندہ ہے جب بندہ خالق کائنات کی عبادت صرف اس کے لئے اس کو معبود حقیقی سمجھ کر کرتا ہے تو بندہ کے دل میں اس کی ہیبت وعظمت اور خشیت وعزت بیٹھ جاتی ہے اور اپنے آپ کو اس کا بندہ گردانتا ہے تو بندہ میں خضوع اور ذلت اور کسر نفسی کامل ہوجاتی ہے چنانچہ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کی کمال کبریائی کا اظہار کرے اور اپنی انتہاے عاجزی اور غایت ذلت کا اظہار کرے یہ اعلیٰ ترین مقام اور بزرگ ترین درجہ ہے۔اسی کو عبودیت سے تعبیر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آغاز نماز میں بندہ اصلی لِلّٰہِ میں اللہ کے لئے نماز پڑھتا ہوں کہتا ہے یہ نہیں کہتا کہ میں اللہ کے ثواب وعتاب کے لئے نماز پڑھتا ہوں ورنہ نماز نہ ہوگی۔

مقام عبادت و عبودیت: جاننا چاہئے کہ مقام عبادت وعبودیت نہایت معزز مکرم و بزرگ مقام ہے اس پر بہت سی آیات قرآنیہ شاہد ہیں سورہ حجر کے آخر میں ارشاد ربانی ہے

آیت اول: ''وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ''اور بیشک ہمیں معلوم کہ ان کی باتوں سے تم دل تنگ ہوتے ہو تو اپنے رب کو سراہتے ہوئے اس کی پاکی بولو اور سجدہ والوں میں ہو اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو(الحجر:۹۷)اس آیت سے دو طرح استدلال کیا جاسکتا ہے۔ایک یہ کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم سے ارشاد فرمایا ''وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ'' اس میں اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت پر مواظبت کا حکم دیا یہاں تک کہ وصال فرما جائیں اسکا مفہوم یہ ہے کہ اوقات میں سے کسی وقت بھی عبادت سے خلل جائز نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ عبادت نہایت ہی عظیم الشان امر ہے۔

دوسرا یہ کہ آیت متلوہ کے آغاز میں ارشاد ہوا ''وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ'' پھر چار باتوں کا حکم ہوا، تسبیح کا ارشاد گرامی ''فَسَبِّحْ'' سے، تحمید کا ارشاد پاک بِحَمْدِ رَبِّكَ سے سجود کا ارشاد الٰہی ''وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ'' سے اور عبادت کا ارشاد ربانی ''وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ'' سے اس میں دلیل ہے کہ عبادت تنگی قلب کو دور کرتی ہے اور انشراح صدر پیدا کرتی ہے اور یہ اس لئے کہ عبادت خلق سے منہ موڑ کر حق کی طرف پھیر دیتی ہے اور جب ایسا ہوگا تو یقیناً ضیق قلب دور ہو جائے گا۔

آیت دوم: شرف عبودت کے بیان میں دوسری آیت سورہ اسراء کے آغاز کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا'' پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا۔ (الاسریٰ:۱) اس آیت کریمہ سے بہت روشن ہے کہ عبودیت اشرف مقامات ہے چونکہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے معراج کے بلند ترین مقامات کے لئے صفت عبودیت کے ساتھ اپنے محبوب کو متصف فرمایا اسی وجہ سے عرفاء نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت عبودیت، صفت رسالت سے افضل و اعلیٰ ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم کو عبودیت سے متصف فرمایا تو خلق سے حق کی طرف (اپنے پاس) بلایا جیسا کہ آیت اسراء سے ظاہر ہے اور جب اپنے محبوب کو صفت رسالت سے متصف فرمایا تو حق نے (اپنے پاس) سے خلق کی طرف مبعوث فرمایا ارشاد ہے ''هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ'' وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا۔ (توبہ آیت: ۳۳)

نیز یہ کہ بندہ عبودیت کے پیش نظر تصرفات سے خالی ہو جاتا ہے لیکن رسالت کے سبب قابل تصرفات ہو جاتا ہے۔ اور بندہ کے لئے تصرفات سے خالی ہونا ہی شان بندگی ہے۔ نیز یہ کہ بندہ اپنے مولیٰ کے مہمات کی اصلاح کا کفیل ہوتا ہے لیکن رسول اپنی امت کے مہمات کی اصلاح کا کفیل ہوتا ہے دونوں کفیل میں فرق ظاہر ہے۔

آیت سوم: شرف عبودیت کے بیان میں تیسری آیت سورہ مریم کی ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سب سے اول تکلم کیا تو فرمایا ''اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ'' (مریم: ۳۰) اس کلمہ کا ذکر ہی ان کی والدہ حضرت مریم کی عفت و

طہارت کا ذریعہ اور طعن و تشنیع سے برأت کے اظہار کا سبب بنا بلکہ ان کے لئے ان کے وجود سے ہر قسم کی خیرات و برکات کے دروازے کھلے اور تمام آفات کے دفعیات کے لئے سبب بن گیا۔ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اول کلمہ ذکر عبودیت یعنی اظہار بندگی صادر ہوا تو اس کا صلہ ان کو رفعت و بلندی سے ملا ارشاد الٰہی ہوا "وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" (آل عمران: ۵۵) اس سے درس ملتا ہے کہ جس نے زبان سے عبودیت کا اظہار کیا اس کی رفعت و بلندی جنت تک ہوتی ہے پس جو اپنے قول و فعل دونوں سے زندگی بھر مثلاً ستر برس تک عبودیت کا اظہار کرتا رہا وہ جنت سے کیوں کر محروم رہ سکتا ہے۔

آیت چہارم: شرف عبودیت کے بیان میں چوتھی آیت سورہ طہٰ کی ہے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا "اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ" بیشک میں ہی ہوں اللہ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری بندگی کر (طہٰ: آیت ۱۴)۔ اس آیت میں توحید کے بعد عبودیت کا حکم دیا گیا، اس لئے کہ توحید اصل ہے اور عبودیت فرع ہے بلفظ دیگر توحید شجر ہے اور عبودیت ثمر ہے اور اصل و فرع یا شجر و ثمر دونوں میں سے کسی کا بغیر دوسرے کے قوام نہیں ہو سکتا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عبودیت کتنا عظیم الشان مرتبہ ہے۔ علاوہ ازیں عقل سلیم بھی اس کی متقاضی ہے چونکہ بندہ، حادث ہے اسکا وجود ممکن لذاتہ ہے اگر حق تعالیٰ کی قدرت کی تاثیر اس میں نہ ہوتی تو وہ عدم کی تاریکی اور فناء کی گھاٹی میں ہوتا قطعاً اس کو وجود حاصل نہ ہوتا چہ جائے کہ وجود سے کمالات حاصل ہوتے پھر جب اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی قدرت متعلق ہوئی بایں طور کہ اس پر اس کے وجود و ایجاد کے آثار کا فیضان ہوا تو دولت وجود اور کمالات وجود سے مالا مال ہو گیا۔ اور حق تعالیٰ کی قدرت کے مقدور ہونے اور اس کی ایجاد کے متعلق ہونے کا مطلب، اس کی عبودیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

غرضیکہ ہر شرف و کمال، فضیلت و بزرگی اور مسرت و منقبت جو بھی بندہ کو حاصل ہے تو بیشک وہ عبودیت کے سبب حاصل ہے بہر حال اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عبودیت خیرات کی کنجی، سعادات و نیک بختی کا عنوان، کرامات کا سرچشمہ اور مطلع درجات ہے اسی سبب سے بندہ کہتا ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔

حضرت مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے تھے "کفی بی فخرا أن اکون لک عبداً و کفی بی شرفا أن تکون لی ربا، اللھم انی وجدتک الھا کما أردت فاجعلنی عبداً کما اردت" یعنی میرے لئے یہ فخر کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے لئے یہی شرف بہت کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے۔ اے اللہ میں نے تجھے ایسا معبود پایا جیسا میں نے چاہا پس اے میرے اللہ تو مجھے اپنا ایسا بندہ بنا دے جیسا تو چاہ۔

فائدہ ششم: جان لو کہ مقامات دو میں منحصر ہیں معرفت ربوبیت، معرفت عبودیت جس سعادت مند روح میں یہ دونوں معرفت جمع ہوجاتی ہیں اس کو ارشاد ربانی "وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ" (البقرۃ:۴۰) میں مذکور عہد ربانی حاصل ہوجاتا ہے۔

رہا خاص معرفت ربوبیت کا ذکر تو ارشاد الٰہی " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ "میں کمال معرفت مذکور ہے چنانچہ بندہ کا عدم سابق سے وجود کی طرف یا پردہ عدم سے منصۂ شہود کی طرف منتقل ہونا اللہ کے معبود ہونے کی دلیل ہے پھر وجود کے بعد اس کے لئے نعمت خیرات وسعادات کا حصول اللہ تعالیٰ کے رب، رحمن اور رحیم ہونے کی دلیل ہے۔ اور بندہ کے احوال معاد، اللہ تعالیٰ کے مالک یوم الدین ہونے کی دلیل ہے پس جب بندہ کو اللہ تعالیٰ کی مذکورہ صفات کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے تو اسے اعلیٰ درجہ کی معرفت ربوبیت حاصل ہوجاتی ہے۔ اب اس کے بعد معرفت عبودیت کا مرتبہ آتا ہے اور اس کے لئے بھی مبدا ومنتہا اور اول وآخر ہے۔ معرفت عبودیت کی ابتدا وآغاز عبودیت میں مشغول ہوجانا ہے چنانچہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" سے اسی طرف اشارہ ہے اور کمال معرفت عبودیت یہ ہے کہ بندہ اس بات کا یقین کامل کرلے کہ وہ معصیت وگناہ سے ہرگز نہیں بچ سکتا جب تک عصمت ربانی شامل حال نہ ہو اسی طرح اس کو طاعت وعبادت پر قوت نہیں حاصل ہوسکتی جب تک توفیق الٰہی اس کی تائید نہ کرے پس اس لئے وہ تمام مطالب کی تحصیل میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے کہتا ہے "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" اب جب از ابتداء "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" تا "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" معرفت ربوبیت اور معرفت عبدیت کا عہد پورا ہوجاتا ہے اس وقت ثمر وفائدہ کی طلب مرتب ہوتی ہے جسکی طرف "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" میں اشارہ ہے غرضیکہ یہ ترتیب شریف بہت عمدہ بلند اور شاندار اور فصاحت وبلاغت کے عروج کمال پر فائز ہے عقول میں اس سے بہتر اور عمدہ ترتیب کا تصور محال ہے۔

فائدہ ہفتم: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تک کلام لفظ غیبت سے مذکور ہوا لیکن اِيَّاكَ نَعْبُدُ اور وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے خطاب کی طرف انتقال کلام ہوا اس کی وجہیں ماسبق میں بیان ہوچکی ہیں ذیل میں مزید چند باقی وجہوں کو ذکر کیا جاتا ہے۔

وجہ اول: ابتدائے نماز میں نمازی اجنبی رہتا ہے اس لئے اولاً صیغہ غیبت سے تکلم ہی انسب واولیٰ ہے اتنی تعریفیں کرنے کے بعد رب تعالیٰ بندہ سے راضی ہوکر گویا فرماتا ہے اے میرے بندے! تو نے میری تعریف کی اور

میرے الہ، رب، رحمن، رحیم اور مالک یوم الدین ہونے کا اقرار کیا تو میرا کتنا اچھا بندہ ہے میں نے حجابات کو تمہارے لئے اٹھادیا اور بعد کو قرب سے بدل دیا اس لئے اب تم بطور خطاب کلام کرو اور کہو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

وجہ دوم: دعا وسوال کا احسن طریقہ یہ ہے کہ بالمشافہ کیا جائے اس لئے حضرات انبیاے کرام علیہم السلام نے جب اپنے رب سے دعا وسوال کیا تو ایسے صیغے استعمال فرمائے جو بالمشافہ پر دلالت کرتے ہیں۔ ارشاد ہے "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا" (اعراف: ۲۳) "رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا" (حشر:۱۰) "رَبِّ هَبْ لِیْ" (الشعراء:۸۳) "رَبِّ اَرِنِیْ" (اعراف: ۱۴۳) اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات کریم سے بالمشافہ آمنے سامنے دست سوال دراز کیا جاتا ہے تو منگتے کو محروم اور سائل کو نامراد نہیں واپس کیا جاتا۔

نیز عبادت، خدمت ہے اور خدمت کے لئے خادم کا مخدوم کی بارگاہ میں حاضر و موجود ہونا ضروری ہے اس لئے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" میں خطاب ہی اولیٰ ہے۔

وجہ سوم: اول سورہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ تک رب تعالیٰ کی حمد اور ثنا کا بیان ہے اور یہ معلوم کہ کسی کی تعریف غائبانہ ہی محمود و پسندیدہ ہے کہ سامنے میں تعریف چاپلوسی کا احتمال رکھتی ہے ہے اس لئے حمد و ثنا کے لئے غیبت کا لفظ ہی بہتر ہوا اس کے برعکس "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" سے آخر سورہ تک حمد نہیں بلکہ سوال و دعا ہے اور گذرا کہ سوال و دعا میں حضوری ضروری ہے اس لئے خطاب سے ارشاد ہوا۔

وجہ رابع: یہ ہے کہ بندہ جب نماز کی نیت اس طرح کرتا ہے کہ "نویت ان اصلی تقربا الی اللہ" نیت کی میں نے نماز پڑھنے کی اللہ کی بارگاہ میں تقرب کے لئے تو وہ تقرب الی اللہ کی نیت کرتا ہے پھر اس کے بعد مختلف انداز میں رب کے لئے ثناء جمیل اور حمد جزیل پیش کرتا ہے اس وقت رب تعالیٰ کی کرم نوازی اس کے دعاء کو قبول کرنے کی متقاضی ہوتی ہے پس اس کو مقام غیبت سے منتقل کر کے مقام حضوری میں پیش کر دیتی ہے تب بندہ کہتا ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔

فائدہ ہشتم: (**عبادت و تعظیم کے درمیان فرق**) گذشتہ اوراق میں اسم جلالت اللہ، الہ اور عبادت کا معنی و مفہوم، اور مستحق حمد و مستحق عبادت کے وجوہ و دلائل تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ان سب سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ عبادت و تعظیم اور معبود و معظم، معنی و مصداق کے لحاظ سے ایک نہیں ہیں بلکہ ان میں زمین و آسمان کا سا فرق ہے وہ یہ کہ عبادت، لغت میں انتہاء درجہ کے تذلل اور غایت خضوع کا نام ہے اس معنی کا اطلاق صرف معبود پر ہوتا ہے کہ معبود ہی

مستحق ہے کہ بندہ اس کے لئے کمال خضوع، اپنی غایت تذلل کا اور اس کی انتہائی تعظیم وغایات کبریائی کا اظہار کرے۔
منجد میں ہے۔ ''عبد، عبادةً، عبودیة'' اللہ کو ایک جاننا، عبادت کرنا، خدمت کرنا، ذلیل ہونا، خشوع وخضوع کرنا۔
معجم العرب میں ہے ''عبد، مصدر عبادة، وعبودیة، عبدالله، او الفرائض، انقادله، خضع له''۔ اور تعظیم کا معنی بہت ہی ظاہر واضح ہے وہ یہ کہ کسی کو بڑا جاننا، تعظیم وتوقیر کرنا۔ اسی میں ہے ''عظم، مصدر تعظیم، عظمه امام الحاضرین، فخمه، بجله، کبره، تعظیم مصدر عظم، تعظیم الرجل، الله هو المعبود بحق، الا له الذی یعبد'' اور معظم کا معنی بتاتے ہوئے کہا۔ ''مفعول من عظم، رجل معظم، مؤقر، مبجل، محترم'' یعنی عبادت کا معنی خشوع وخضوع کرنا، تعظیم کا معنی بڑائی ظاہر کرنا اور عزت وتوقیر کرنا ہے۔ اور معظم، عظیم المرتبہ اور محترم شخص کو کہتے ہیں اور اللہ وہی معبود حقیقی ہے اور معبود وہ ہے جس کی عبادت کی جائے۔

درج بالا لغوی تشریح سے واضح ہے کہ عبادت کا تعلق معبود کے ساتھ خاص ہے اب خواہ عبادت کرنے والا اپنی عبادت کو معبود حقیقی کے لئے خاص کرے یا اپنے زعم باطل میں معبودان باطل کے لئے کردے حالانکہ بنی آدم سے صرف معبود حقیقی کی عبادت کا معاہدہ تھا ارشاد ہے۔ اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ وَّ اَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ''(یٰسین آیت: ۶۰+۶۱) اے اولاد آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا کہ شیطان کو نہ پوجنا بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی بندگی کرنا یہ سیدھی راہ ہے، لیکن بہت سے بنی آدم اس معاہدہ کو فراموش کر کے غیر اللہ کی عبادت میں لگ گئے۔

عبادت کے برخلاف، تعظیم کا تعلق، معبود کے سوا، ہر محترم، مکرم، مؤقر اور عظیم المرتبت شخصیت مقدس مقامات، اور متبرک اشیاء کے ساتھ ہوسکتا ہے اور ہر معظم اشخاص واشیاء کی تعظیم کی جاتی ہے ہاں تعظیم میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے ایک یہ کہ معظم کے لئے انتہاء درجہ کی تعظیم اور غایت کبریائی کا تصور نہ ہو دوسرے معظم کے سامنے غایت درجہ کا تذلل اور انتہاء درجہ کے خشوع وخضوع کے اظہار سے اجتناب کرے کہ یہ دو باتیں معبود کے ساتھ خاص ہیں اور یہی عبادت کا مفہوم بھی ہے۔

لیکن اگر غایت خضوع اور کمال کبریائی کا اظہار نہ ہو بلکہ معظم اشخاص واشیاء کا دل سے احترام کرتا ہے اور اپنے اعضاء سے اکرام وتعظیم بجالاتا ہے تو اس کے جواز واستحباب میں کوئی شک نہیں، کوئی اہل ایمان معظم اشخاص ومحترم اشیاء کی تعظیم وتوقیر میں کیونکر شک وشبہ کرسکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نہ یہ کہ اسے جائز ومباح قرار دیا بلکہ محترم شخصیتوں کے لئے تعظیم کو واجب وفرض قرار دیا اور نہ کرنے والوں کو راندۂ درگاہ کردیا۔

(۱) ارشاد ہے ''وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (البقرۃ: آیت: ۳۴) اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین کریمین کا اور ان کے برادران کا سجدۂ تعظیمی کرنا قرآن حکیم میں منصوص ہے ارشاد ہے ' وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا' (سورہ یوسف: ۱۰۰) اور اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدہ میں گرے اور یوسف نے کہا اے میرے باپ یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے اور بیشک اسے میرے رب نے سچا کیا۔ پہلے خواب کا ذکر سورہ یوسف کے آغاز میں ہو چکا ہے ارشاد ہے۔

''اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ'' (یوسف: ۴) یاد کرو جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ میں نے گیارہ تارے اور سورج و چاند دیکھے انہیں اپنے لئے سجدہ کرتے دیکھا۔

(۳) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مقام عظمت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ''وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى'' (بقرہ: ۱۲۵) تم مقام ابراہیم کو جائے نماز مقرر کرلو۔ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ معظّمہ کی بنا فرمائی تھی اور اس میں آپ کے قدم مبارک کا نشان تھا، اس پتھر کو مقام نماز بنانے کا حکم استحبابی، اظہار تعظیم کے لئے ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی متبرک چیزوں کی تعظیم و توقیر کا بیان آیت تابوت سکینہ میں موجود ہے، ارشاد ہے ''وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (بقرہ: ۲۴۸) اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے تمہارے پاس تابوت جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کا چین ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں معزز موسیٰ اور معزز ہارون کے ترکہ کی، اٹھاتے لائیں گے اسے فرشتے، بیشک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں خازن و روح البیان و تفسیر مدارک اور جلالین وغیرہم نے لکھا ہے کہ تابوت ایک شمشاد کی لکڑی

کا صندوق تھا جس میں انبیاء کی تصاویر، ان کے مکانات شریفہ کے نقشے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ان کے کپڑے اور آپ کے نعلین شریفین، اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور ان کا عمامہ وغیرہ تھا۔ بنی اسرائیل جب دشمن سے جنگ کرتے تو برکت کے لئے اس کو سامنے رکھتے تھے جب خدا سے دعاء کرتے تو اس کو سامنے رکھ کر دعاء کرتے تھے ۔اس سے بخوبی ثابت ہوا کہ بزرگان دین کے تبرکات سے فیض لینا ان کی عظمت کرنا طریقہ انبیاء ہے اور اسے تعظیم کے ساتھ اٹھانا فرشتوں کی سنت ہے۔

(۵) مقامات مقدسہ کی تعظیم کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا "وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ" (بقرہ:۵۸) اور یاد کرو جب ہم نے کہا اس قریہ میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے داخل ہو اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کہ نیکی والوں کو اور زیادہ دیں۔

لیکن ان ظالموں نے ان مقامات کا ادب نہ کیا، اس کی بے توقیری کی، سجدہ کرنے کی بجائے سرین پر گھسیٹتے گئے اور حکم الٰہی سے نکل گئے جس کی پاداش میں غضب الٰہی کے مستحق اور غضب جبار کے سزاوار ہوئے۔ چنانچہ ارشاد ہوا "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ" (بقرہ:۵۹) تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا بدلہ ان کی بے حکمی کا۔

(۶) مقامات مقدسہ اور اشیائے متبرکہ کی تعظیم و توقیر کے بیان میں یہ آیت بھی بہت واضح نص ہے جس میں تعظیم کرنے والوں کو دل کا متقی فرمایا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ" (حج:۳۲) بات یہ ہے اور جو اللہ کے نشانوں کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے۔ اس آیت کی تفسیر، قرطبی میں یہ ہے۔ "عن ابن عباس فی قوله (وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ) قال استعظامها واستحسانها واستسمانها وعن محمد بن ابی موسیٰ قال الوقوف بعرفة من شعائر الله وبجمع من شعائر الله ورمی الجمار من شعائر الله والبدن من شعائر الله فمن يعظمها فانها من تقوى القلوب وحق على عباده المومنين به تعظيم جميع ذالک"۔

یعنی آیت کریمہ ”وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ“میں شعائر کی تعظیم سے مراد قربانی کے جانور کا موٹا فربہ عمدہ اور قیمتی ہونا ہے۔اور محمد بن موسیٰ سے مروی ہے کہ وقوف عرفہ، قیام مزدلفہ رمی جمار اور قربانی کے جانور سب شعائر اللہ ہیں پس جو ان سب کی تعظیم کریگا وہ دل کا متقی ہے۔قرطبی کہتے ہیں کہ اللہ کے مومن بندوں پر مناسک حج میں سے سب کی تعظیم ضروری ہے۔

پیش کردہ آیات متلوہ میں، حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کی تعظیم وتوقیر اور ان کی طرف منسوبات مقامات مقدسہ اور مناسک حج کی عظمت واحترام کا ایسے شاندار طریقے پر بیان ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضور سید الانبیاء والمرسلین، محبوب رب العلمین مصداق رحمۃ للعلمین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات کریم ورحیم آپ کی ولادت گاہ مبارکہ، ہجرت گاہ مدینہ طیبہ، منبر شریف، مسجد نبوی شریف، روضہ انور شریف، آپ کے ملبوسات وجملہ منسوبات کی تعظیم وتکریم کا کس قدر تاکیدی حکم ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کو سمجھنے کے لئے یہی ایک آیت کافی ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے ”اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا“(فتح:۸+۹)بیشک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر وناظر اور خوشی اور ڈر سناتا تاکہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور رسول کی تعظیم وتوقیر کرو اور صبح وشام اللہ کی پاکی بولو۔اس لئے شفاء شریف میں فرمایا۔”ومن اعظامه واکباره اعظام جمیع اسبابه واکرام مشاهده وامکنته ومعاهده ومالمسه علیه السلام او عرف به“یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر میں سے یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اسباب آپ کے مکانات، مشاہد ومعاہد اور جو جسم شریف سے مس ہوئے بلکہ جس چیز کے متعلق بھی یہ مشہور ہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے ان سب کی تعظیم وتوقیر کرے۔

چنانچہ بموجب حکم رب العلمین، حضرات صحابہ کرام، تابعین، ائمہ ومحدثین اور بزرگان دین نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی طرف منسوب تمام اشیاء، ملبوسات، مقامات مقدسہ، آب وضو، غسالہ مبارکہ، مشک بار پسینہ مبارکہ، غسالہ طیبہ بلکہ خون مبارک بلکہ تمام فضلات کی ایسی تعظیم وتوقیر کی ہے جس کی مثال پیش کرنے سے عشق ومحبت کی دنیا قاصر ہے ملاحظہ کیجئے یہ روایت بہت مشہور ہے کہ

(۱) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یکم ذیقعدہ ۶ھ میں ایک ہزار چار سو اصحاب کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لئے مکہ

معظّمہ روانہ ہوئے جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو کفار قریش کی طرف سے حال معلوم کرنے کے لئے کئی شخص بھیجے گئے۔ سب نے جا کر یہی بیان کیا کہ حضور عمرہ کے لئے تشریف لائے ہیں جنگ کا ارادہ نہیں ہے لیکن انہیں یقین نہ آیا آخر کار انہوں نے عروہ بن مسعود ثقفی کو جو طائف کے بڑے سردار اور عرب کے نہایت متمول شخص تھے تحقیق حال کے لئے بھیجا انہوں نے آ کر دیکھا کہ حضور دست مبارک دھوتے ہیں تو صحابہ تبرک کے لئے غسالہ شریف حاصل کرنے کے لئے ٹوٹے پڑتے ہیں اگر کبھی تھوکتے ہیں تو لوگ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس کو وہ حاصل ہوجاتا ہے وہ اپنے چہروں اور بدن پر برکت کے لئے ملتا ہے، کوئی بال جسم اقدس کا گرنے نہیں پاتا اگر احیانا جدا ہوا تو صحابہ اس کو ادب کے ساتھ لیتے اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں جب حضور کلام فرماتے ہیں تو سب ساکت ہوجاتے ہیں، حضور کے ادب و تعظیم سے کوئی شخص نظر اوپر کو نہیں اٹھا سکتا۔ عروہ نے قریش سے جا کر یہ سب حال بیان کیا اور کہا کہ میں بادشاہان فارس و روم و مصر کے درباروں میں گیا ہوں، میں نے کسی بادشاہ کی یہ عظمت نہیں دیکھی جو محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے اصحاب میں ہے مجھے اندیشہ ہے کہ تم ان کے مقابل کامیاب نہ ہوسکو گے قریش نے کہا ایسی بات مت کہو ہم اس سال انہیں واپس کردیں گے وہ اگلے سال آئیں، عروہ نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں کوئی مصیبت پہنچے یہ کہہ کر وہ معہ اپنے ہمراہیوں کے طائف واپس چلے گئے اور اس واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں مشرف باسلام کیا۔ (خزائن العرفان/سورہ فتح)

اسی طرح صحیح البخاری اور صحیح مسلم کے حوالے سے مشکوٰۃ المصابیح باب الستر ۃ میں ہے۔

ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ معظّمہ کے مقام ابطح میں چمڑے کے سرخ خیمے میں دیکھا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انھوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کا پانی یعنی غسالہ لیا اور صحابہ کے پاس آئے تو صحابہ کو دیکھا کہ اس پانی پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں، جس نے اس میں سے کچھ پالیا اور جس نے نہ پایا تو اس نے اپنے ساتھی کے ہاتھ سے تری لے لی۔ الفاظ حدیث یہ ہیں

"ورایت بلا لا اخذ وضوء رسول اللہ ﷺ ورایت الناس یبتدرون ذالک الوضوء فمن اصاب منہ شیئا تمسح بہ ومن لم یصب منہ اخذ من بلل ید صاحبہ"

(۲) مشکوٰۃ المصابیح شروع کتاب اللباس میں ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جبہ مبارکہ تھا مدینہ طیبہ میں جب کوئی بیمار ہوتا تو آپ اسے دھو کر اس کو پلاتی تھیں۔

(۳) اسی میں کتاب الاطعمہ میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت کبشہ رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف فرما ہوئے اور ان کے مشکیزہ سے منہ مبارک لگا کر پانی نوش فرمایا انہوں نے برکت کے لئے مشکیزہ کا منہ کاٹ کر رکھ لیا۔

(۴) اسی میں باب المصافحہ والمعانقہ میں ہے جو حضرت ذراع سے مروی ہے اور یہ وفد عبدالقیس میں شامل تھے فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ منورہ آئے تو اپنی سواریوں سے اترنے میں جلدی کرنے لگے پس ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ و پاؤں چومتے تھے۔ باب الکبائر والنفاق میں حضرت صفوان بن عسال سے مروی ہے کہ دو یہودی بارگاہ رسالت میں آئے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آیات بینات کے بارے میں پوچھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے اتنا خوش ہوئے کہ دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک اور قدم مبارک کو بوسہ دیا۔ الفاظ یہ ہیں

قال فقبلا یدیه و رجلیه و قالا نشهد انک نبی

(۵) شفا شریف میں ہے "کان ابن عمر یضع یده علی المنبر الذی یجلس علیه رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الخطبة ثم یضعها علی وجهه" یعنی جس منبر شریف پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لئے بیٹھتے تھے اس پر حضرت عبداللہ بن عمر اپنا ہاتھ رکھتے پھر اسے منہ سے لگاتے تھے (چومتے تھے)۔ صحابہ کی تعظیم وتوقیر کے یہ چند نمونے ہیں طوالت کے خوف سے ہم نے صرف پانچ روایتوں پر اکتفا کیا ہے ورنہ وہ اس کثرت سے ہیں کہ احادیث و سیر کی ایک دنیا منور ہے۔ پھر جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلقات کی عظمتوں کا حال یہ ہے تو خود بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتوں و رفعتوں کا کیا مقام ہوگا جہاں ستر ہزار فرشتے صبح و شام حاضری دیتے ہوں۔ امام عشق و محبت اعلیحضرت قدس نے سچ فرمایا۔

ستر ہزار صبح ہیں ستر ہزار شام
کچھ بندگی زلف و رخ آٹھوں پہر کی ہے

اس بارگاہ کا مقام یہ ہے:

معراج کا سماں ہے کہاں پہنچے زائرو
کرسی سے اونچی کرسی اسی پاک گھر کی ہے
ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

خلاصہ بحث: حضرات انبیاے کرام علیہم السلام، ان کی طرف منسوب مقامات مقدسہ اور اشیاے متبرکہ کی تعظیم وتوقیر کے حوالہ سے بہت ساری صریح آیات قطعیہ اور احادیث و روایات صحیحہ پیش کی گئیں جن سب سے ظاہر و باہر ہے کہ تعظیم وتوقیر نہ یہ کہ جائز و درست ہے بلکہ واجب وضروری ہے۔ مگر بعض مدعیان توحید ناعاقبت اندیشوں نے تعظیم و

توقیر کی ساری آیتوں کواوران سے متعلق ساری روایتوں کو پس پشت ڈال دیا اور تعظیم کو عبادت کا جامہ پہنا کر محترم شخصیات، مقدس مقامات اور متبرک اشیاء کے احترام و تعظیم کو شرک قرار دیا۔

چنانچہ انہوں نے کہا ''کسی کے گھر یا جنگل کا ادب کرنا، کسی کی یادگار منانا، کسی کی قبر پر جھاڑو دینا وغیرہ غرضیکہ کسی کی کچھ تعظیم کرنا غیر اللہ کی عبادت ہے اور شرک ہے''

یہ سب ہفوات وضلالات کی باتیں کہہ کر وہ خود گمراہ ہوئے اور بہت سارے اہل ایمان کو، ضلالت وگمرہی کے جال میں پھنسا ڈالا، اور انبیا واولیا کا گستاخ بنا ڈالا، ایسے لوگ کہیں نہ جا کر آیت کریمہ ''وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ'' (حج/32) کا معنی ومفہوم وشان نزول دیکھتے اور اس سے اوپر والی سابقہ آیت میں غور کرتے تو ہرگز تعظیم کو عبادت اور شرک نہ قرار دیتے۔ ارشاد ہے ''حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ'' (حج 31) ایک اللہ کے ہو کر کہ اس کا ساجھی کسی کو نہ کرو اور جو اللہ کا شریک کرے وہ گویا گرا آسمان سے کہ پرندے اسے اچک لے جاتے یا ہوا اسے کسی دور جگہ پھینکتی ہے۔

ملاحظہ ہو اس آیات میں کس قدر شرک کی قباحت وشناعت کو اور مشرکین کی ہلاکت وبربادی کو بیان فرمایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود معاشعائر اللہ کی تعظیم کا حکم دیا اور اسے دل کا تقویٰ قرار دیا جس کا صاف مطلب ہے کہ تعظیم عبادت نہیں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ ہرگز تعظیم کا حکم نہ فرماتا، شرک سے منع کرنا اور تعظیم کا حکم کرنا بین دلیل ہے کہ تعظیم نہ ہی عبادت ہے اور نہ ہی شرک ہے بلکہ تعظیم وتوقیر دینی ودنیاوی خیرات وبرکات کے حصول کا ذریعہ ہے۔

نام پر توحید کے انکار تعظیم رسول
کیا غضب ہے کفر کو کہتے ہیں جا
ہلا حتیاط

(شیخ الاسلام کچھوچھوی)

فصل ششم: تفسیر قولہ تعالیٰ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم تجھی سے مدد چاہیں)

یعنی دینی ودنیاوی تمام امور میں خواہ عبادت کی بجا آوری ہو یا معصیت سے کنارہ کشی یا کوئی دنیاوی امور سب میں تجھی سے مدد چاہتے ہیں چنانچہ دلائل عقلیہ سے بھی ثابت ہے کہ معصیت وگناہ سے دوری وکنارہ کشی بغیر عصمت ربانی کے، اور طاعت الٰہی کی بجا آوری بغیر توفیق خداوندی کے ممکن نہیں اس پر عقلی ونقلی دلیلیں موجود ہیں۔

عقلی دلیلیں (۱): یہ متحقق ہے کہ انسان فعل وترک دونوں پر برابر برابر قادر ہے پس جب تک فعل وترک کے لئے مرجح نہیں پایا جائے گا دونوں میں سے کسی کا تحقق نہیں ہوسکتا اس لئے اس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی مرجح ہو اور یہ مرجح بندہ کی طرف سے نہیں ہوسکتا ورنہ کلام پھر اس مرجح میں ہوگا اس طرح تسلسل لازم آئے گا اور یہ محال اس لئے یہ لازماً ثابت کہ یہ مرجح اللہ کی طرف سے ہے اور جب فعل کا مرجح منجانب اللہ ہے تو عقلا ثابت ہوتا ہے کہ بندہ فعل پر اقدام بغیر اعانت الٰہی نہیں کرسکتا۔

(۲): تمام خلائق جو مکلف ہیں سب دین حق، اعتقاد صادق کے طلب گار ہیں وہ سب قدرت، عقل، کوشش اور طلب میں برابر اور یکساں ہیں پھر بھی سب کو حق وہدایت نصیب نہیں ہوتی بلکہ ان میں بعض ہی کو ہدایت ملتی ہے تمام میں بعض کا ہدایت یافتہ ہونا ظاہر ہے کہ بغیر کسی ناصر ومعین کے ممکن نہیں ہے اور ناصر ومعین صرف اللہ تعالیٰ ہے اس لئے کہ وہ معین وناصر اگر غیر اللہ میں سے ہوگا تو وہ یا تو بشر ہوگا یا فرشتہ ہوگا دونوں نہیں ہوسکتے ورنہ کلام پھر ان دونوں کے بارے میں جاری ہوگا کہ طلب ہدایت میں ان دونوں کا کون معین وناصر ہے اگر اللہ ہی ہے تو مدعا ثابت ہے اگر غیر اللہ میں بشر یا فرشتہ کو مانیں تو پھر اس میں کلام جاری ہوگا اس طرح تسلسل لازم آئے گا۔

(۳): انسان ایک زمانہ دراز تک کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چیز اس کو حاصل نہیں ہوتی پھر کسی حال یا کسی وقت میں وہی چیز اسے حاصل ہوجاتی ہے یہ چیز اس حالت یا وقت میں اسی لئے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اس حالت یا وقت میں اس کے قلب میں اس کام کے کرنے کا داعیہ جازمہ پیدا کردیتا ہے، دوسرے دواعی وعوامل کو چھوڑ کر صرف ایک ایسے داعیہ کو اختیار کرنا جس سے کام بن گیا یقینا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی اعانت فرمانے سے ہے غرضیکہ ہر شئی کا وجود یا ہر فعل کا صدور بغیر اعانت الٰہی کے ممکن نہیں ہوسکتا اس لئے قرآن حکیم میں فرمایا۔ ”وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ“ اور ارشاد ہے ”وَاسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ“ (اعراف:۱۲۸)

اس آیت میں جبریہ وقدریہ مضطرب ہوگئے ہیں چنانچہ ہر ایک نے اپنے اپنے موقف ونظریہ پر اسی آیت سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبریہ جو بندہ کو مجبور محض مثل جماد مانتا ہے کا کہنا ہے کہ اگر بندہ فعل پر مستقلاً قادر ہوتا تو فعل پر استعانت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا حالانکہ قرآن میں استعانت کا حکم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بندہ مجبور ہے۔ اس کے برعکس قدریہ کا خیال یہ ہے کہ استعانت اسی وقت ہوسکتی ہے جب بندہ نفس فعل پر قادر ہو اگر بندہ اصل فعل پر قادر نہ ہو تو استعانت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ غیر کی طرف سے اعانت ہی باطل ہوگی۔ ان دونوں کے خلاف اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ بندہ پتھر کی طرح مجبور نہیں اور رب کی طرح افعال کا خالق نہیں بلکہ وہ کاسب ہے۔

پس بندہ کی قدرت فعل میں مستقلاً ثابت نہیں ہوتی بلکہ داعیہ جازمہ یا داعیہ صارفہ کے ساتھ مؤثر ہوتی ہے اور داعیہ جازمہ وصارفہ رب تعالیٰ کے ہی خلق وازالہ سے ہوتا ہے۔

چنانچہ اعانت مطلوبہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے اندر داعیہ جازمہ پیدا فرمادے کہ وہ عبادت وطاعت بجالا سکے اور بندہ کے اندر کی داعیہ صارفہ زائل کردے کہ وہ برے افعال کا ارتکاب نہ کرے مختصر یہ کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں عبادت کی نسبت بندہ کی طرف کی گئی ہے جس میں فرقہ جبریہ کی تردید ہے بایں طور کہ فعل عبادت کی نسبت بندہ کی طرف ہے اور ایاک نستعین میں اعانت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہے اس سے ظاہر ہے کہ بندہ خالق نہیں بلکہ رب کی عطا سے کاسب ہے گویا" اِیَّاکَ نَعْبُدُ "میں جبریہ کی تردید، اور "وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "میں قدریہ کے نظریہ کا بطلان ہے۔

آیت کریمہ "وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "سے متعلق ذیل میں چند لطائف وفوائد مذکور ہیں۔

فائدہ اول: عمل پر استعانت عمل شروع کرنے سے پیشتر بہتر ہے مگر یہاں پہلے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ "ذکر ہوا پھر اس کے فوراً بعد "وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "ارشاد ہوا یعنی عمل عبادت شروع کرنے کے بعد استعانت کا حکم ہوا اس کی کئی وجہیں ہیں۔

وجہ اول: یہ ہے کہ نمازی گویا یہ کہتا ہے کہ اے میرے رب ہم نے نماز وعبادت شروع کردی ہے اس لئے اب اس عبادت کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ دوران عبادت بغیر تام کئے ہوئے موت آجائے، یا ایسے مہلک مرض میں مبتلا ہوجائیں کہ نماز مکمل نہ کرسکیں، یا عبادت کے دواعی اور اسباب متغیر ہوجائیں کہ تکمیل عبادت نہ کرسکیں۔ لہذا ہم اس کی تکمیل کے لئے تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

وجہ دوم: یہ ہے کہ نمازی گویا یہ کہتا ہے اے میرے معبود میں اپنی ذات ووجود کے ساتھ ہمہ تن تیری عبادت کے لئے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں مگر میرا دل ہے کہ ٹھہرتا نہیں بلکہ ادھر، ادھر فرار ہوجاتا ہے پس میں تجھ سے احضار قلب کے لئے استعانت کرتا ہوں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمن "اس کا واضح مطلب ہے کہ انسان از خود اپنے قلب کو حاضر نہیں کرسکتا جب تک کہ استحضار قلب پر رب تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو۔

وجہ سوم: ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں یعنی اس اعانت میں ہم تیرے علاوہ کسی غیر جن وبشر بلکہ ملائکہ حتی کہ

حضرت جبرئیل ومیکائل علیہما السلام سے بھی مدد نہیں لینا چاہتے بلکہ ہم صرف اور صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں اس راہ میں ہم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مسلک پر چلنا چاہتے ہیں چنانچہ جب نمرود نے حضرت خلیل کے دست و پا کو بیڑیوں میں جکڑ کر آگ میں ڈالا تو اس وقت حضرت جبرئیل آمین تشریف لائے اور حضرت خلیل سے عرض کیا "ھل لک من حاجۃ" کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ حضرت خلیل نے فرمایا، ہے لیکن آپ سے نہیں حضرت جبرئیل نے فرمایا تب آپ اپنے رب سے عرض کیجئے فرمایا "حسبی من سوالی علمہ بحالی" یعنی میری حالت کا اس کو علم ہے اس لئے سوال کی ضرورت نہیں۔ عبادت کرنے والا "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کہہ کر حضرت خلیل کی راہ پر چلنا چاہتا ہے بلکہ اس باب میں ہم مزید اضافہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ حضرت خلیل کا ہاتھ و پیر دشمنوں نے جکڑ دیا تھا لیکن ہم نے نماز میں از خود پاؤں میں بیڑی ڈال لیا ہے اس لئے میں چل نہیں سکتا، ہاتھ کو مقید کر رکھا ہے اس لئے میں حرکت نہیں کر سکتا۔ آنکھ پر گویا پٹی باندھ لی ہے اس لئے کہیں ادھر ادھر دائیں بائیں دیکھ نہیں سکتا کان کو بند کر لیا ہے اس لئے ان دونوں سے سن نہیں سکتا اور زبان کو روک لیا ہے اس لئے اس سے کلام نہیں کر سکتا اے میرے رب تیرا خلیل آتش نمرود کے دہانے پر کھڑا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں آتش جہنم کے دہانے پر ٹھہرا ہوں پس جس طرح تیرا خلیل تیرے سوا غیر سے مدد لینے پر راضی نہ ہوا میں بھی انہیں کی راہ پر چل کر تیرے سوا کسی غیر کی اعانت پر راضی نہیں ہو سکتا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ اب اس وقت اللہ تعالیٰ گویا یہ فرماتا ہے اے میرے بندے! تو نے میرے خلیل کی طرح عمل کیا بلکہ اس پر اضافہ بھی کیا اس لئے میں تمہیں جزا دینے میں بھی اضافہ کرونگا پس جس طرح ہم نے اپنے خلیل کے لئے "یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْداً وَّسَلَاماً عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ" کا مژدۂ جانفزا سنایا اسی طرح ہم تمہیں نار جہنم سے آزادی کا مژدۂ جانفزاء سنائیں گے بلکہ تم کو جہنم سے آزاد کر کے جنت نعیم میں پہنچا دیں گے بلکہ اس پر بھی اضافہ کریں گے کہ اپنے کلام قدیم کی سماعت کی سعادت اور اپنے دیدار پر انوار کی دولت لازوال سے مالا مال کر دیں گے بلکہ نار نمرود کو جیسے ہم نے کہا "یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْداً وَّسَلَاماً" تمہیں نار جہنم کہے گا اے مومن بندہ تو جلدی سے مجھ سے دور ہو جا کیونکہ تمہارے نور ایمان سے میری لپٹ دھیمی ہوتی جا رہی ہے۔

وجہ چہارم: اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں یعنی ہم تیرے غیر سے مدد نہیں چاہتے کیونکہ تیرے علاوہ کوئی غیر میری اعانت اسی وقت کر سکتا ہے جب تو اس اعانت پر اعانت فرمائے گا غرضیکہ تیری اعانت کے بغیر کوئی اعانت کر ہی نہیں سکتا نہ بغیر تیری اعانت کے کوئی اعانت تام ہو سکتی ہے۔ تو پھر ہم غیر سے جو

تیری اعانت کا واسطہ ہے کیوں اعانت طلب کریں واسطہ کو ختم کر کے بلا واسطہ تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔

وجہ پنجم: ارشاد "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" مقتضی ہے کہ رب تعالیٰ کی عبادت سے نفس کو رتبہ عظیم حاصل ہوتا ہے اور نفس کو مرتبہ عظیمہ کا حُصول، عجب وتکبر کا باعث بنتا ہے اس لئے زوال عجب وتکبر کے لئے فوراً ارشاد ہوا "وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" تا کہ دلیل ہو کہ بندہ کو عبادت کے سبب جو مرتبہ بلند ملا وہ بندہ کی قوت کے سبب نہیں بلکہ صرف فضل الٰہی اور اعانت ربانی کے سبب سے حاصل ہوا ہے۔ غرض اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے مقصود عجب وتکبر اور نفسانی نخوت کو زائل کرنا ہے۔

قاضی بیضاوی نے اپنی مشہور تفسیر میں اس مقام پر استعانت کا معنی اور معونت کی قسموں کو بیان کیا ہے۔ ذیل میں اس کی مختصر تفصیل مذکور ہے وہ یہ ہے کہ استعانت طلب معونت کا نام ہے یعنی مدد طلب کرنا۔ اور معونت کی دو قسمیں ہیں معونت ضروریہ، معونت غیر ضروریہ۔ ضروریہ وغیر ضروریہ سمجھنے سے پہلے استطاعت کا مفہوم ومعنی سمجھنا ضروری ہے۔ استطاعت صحت آلات واسباب کو کہتے ہیں۔ اہل اصول، استطاعت کی جگہ قدرت کی تعریف وتقسیم کرتے ہیں چنانچہ قدرت کی دو قسمیں ہیں ایک قدرت میسرہ، دوم قدرت ممکنہ، قدرت ممکنہ کی تعریف یہ ہے۔ "ادنی مایتمکن المرء بہ من اداء مالزمہ" یعنی قدرت ممکنہ، شئی کا وہ ادنیٰ حصہ جس کی وجہ سے انسان مامور بہ کی ادائیگی پر قادر ہو اور قدرت میسرہ کی یہ تعریف کی جاتی ہے۔ "ماتیسر علی المرء اداء المامور بہ" یعنی جس کی وجہ سے مامور بہ کا ادا کرنا آدمی پر آسان ہو جائے۔ یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ اہل کلام کی تعریف استطاعت یا اہل اصول کی تعریف ممکنہ، بیضاوی کی تعریف معونت ضروریہ کے مطابق ہے۔ چنانچہ بیضاوی نے کہا کہ "الضروریۃ مالا یتاتی الفعل دونہ کاقتدار الفاعل وتصورہ وحصول آلۃ ومادۃ یفعل بھا فیھا وعند استجماعھا یوصف الرجل بالاستطاعۃ ویصح ان یکلف بالفعل" یعنی معونت ضروریہ وہ ہے جس کے بغیر فعل کا وجود نہ ہو۔ جیسے فاعل کا قادر ہونا، اور فاعل کو اس فعل کا علم وتصور ہونا، نیز آلہ ومادہ کا پایا جانا تا کہ اس آلہ کے ذریعہ فعل اس مادہ میں انجام پائے۔ جب یہ سب چیزیں فاعل میں پائی جاتی ہیں تو اسے فعل کی استطاعت یا قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور اس وقت وہ فعل کا مکلف ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس معونت غیر ضروریہ نام ہے ان چیزوں کو حاصل کرا دینا جس کے ذریعہ فعل آسان ہو جائے یا فاعل کو فعل کے قریب کر دے اور فاعل کو فعل پر ابھارے جیسے چلنے پر قدرت رکھنے والے کے لئے سواری اور تبشیرات و

ترغیبات وغیرہا جن کے سبب فعل پر رغبت بڑھتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ معونت غیر ضروریہ پر صحت تکلیف موقوف نہیں، صحت تکلیف کے لئے معونت ضروریہ ضروری ہے۔

ضمیر اِیَّاکَ دومرتبہ ارشاد ہوا تا کہ صراحت ہوجائے کہ جس طرح مستحق عبادت خدا تعالیٰ کی ذات ہے اسی طرح قابل استعانت بھی خدا ہی کی ذات ہے غیر خدا نہیں۔ یہاں استعانت پر عبادت کو مقدم فرمایا باوجودیکہ استعانت کو عبادت پر مقدم ہونا چاہئے کہ نَسْتَعِیْنُ سے دین ودنیا کی تمام مہمات میں رب تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے اوران میں عبادت بھی ایک مہم ہے اس لئے عبادت کے لئے طلب معونت ضروری ہے اس وجہ سے نَسْتَعِیْنُ، نَعْبُدُ پر تقدم چاہتا ہے نیز یہ عبادت فعل عبد ہے اور معونت فعل باری تعالیٰ ہے اور فعل باری تعالیٰ کا اشرف ہونا ظاہر ہے اس لئے اسے اقدم بھی ہونا چاہئے۔

قاضی بیضاوی نے عبادت کو استعانت پر مقدم کرنے کی تین وجہیں بیان کی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) اول رؤس آیت سے موافقت کی وجہ سے چونکہ اس آیت سے پیشتر "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"، "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" آیتوں کا آخری حرف "ین" پر ختم ہے اس لئے نَسْتَعِیْنُ، نَعْبُدُ کے بعد ذکر ہوا تا کہ پیشتر آیات کی طرح اس کا بھی آخری حرف "ین" پر ختم ہو، اگر نَسْتَعِیْنُ پہلے اور نَعْبُدُ بعد میں ذکر ہوتا تو رؤس آیات کی رعایت نہ رہ جاتی۔

(۲) دوم اس میں اشارہ ہے کہ سائل کو سوال کرنے سے پہلے مسؤل عنہ کی بارگاہ میں کوئی ہدیہ بطور وسیلہ پیش کرنا چاہے یعنی ایسی شئ بھیج دے جس سے مسؤل عنہ راضی اور خوش ہوجائے کیونکہ ہدیہ کو پہلے بھیجنا حصول مراد کا باعث اور مقبولیت کا موجب ہوتا ہے پس یہاں پر بھی بندہ عبادت کو بطور وسیلہ وہدیہ پہلے پیش کرتا ہے پھر مدد طلب کرتا ہے تا کہ طلب معونت میں عبادت وسیلہ وذریعہ ہو اور ہدیہ کا کام کرے۔

(۳) تیسری وجہ وہ ہے جو تفسیر رازی کے حوالہ سے پہلے ذکر ہوا کہ نَعْبُدُ میں بندہ فعل عبادت کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس سے ایک قسم کا زعم اور عجب پیدا ہوتا ہے پس اس عجب وزعم کو ختم کرنے کے لئے نَسْتَعِیْنُ ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر رہنمائی ہوجائے کہ عبادت بھی انہیں امور میں سے ہے جو بغیر اعانت خداوندی اور تائید الٰہی کے ادا نہیں ہوسکتی۔

غیر اللہ سے استعانت: اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے مفہوم ومعنی اور اس کی تفسیر سے بعض اذہان میں یہ خیال

گذرتا ہے کہ غیر اللہ سے مدد واستعانت ناجائز وحرام بلکہ شرک ہے۔اس لئے اولیاے کرام حتی کہ انبیاے کرام علیھم السلام سے بھی استعانت ناجائز وگناہ بلکہ شرک ہے۔اس طرح کا خیال وہابیہ،اور غیر مقلدین وغیرہم فرقہ ضالہ کا ہے۔ان اوہام باطلہ کے خلاف اہل سنت و جماعت کا موقف ونظریہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ اور حضرات انبیاے کرام علیہم السلام سے بلکہ غیر اللہ سے استعانت جائز ودرست ہے۔چنانچہ غیر اللہ سے مدد مانگنے کا ثبوت قرآنی آیات،احادیث مبارکہ،اقوال فقہاومحدثین حتی کہ مخالفین ومنکرین کے اقوال سے بھی ثابت ہے،قرآن حکیم میں ہے۔

(۱)"وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"(البقرۃ/23)۔یعنی اور اللہ کے سوا اپنے سارے حمایتوں کو بلالو۔اس میں کفار کو دعوت دی گئی ہے کہ قرآن کی مثل ایک سورہ بنا کر لے آؤ اور اپنی امداد کے لئے اپنے حمایتوں کو بلالو۔اس میں غیر اللہ سے مدد لینے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) "قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ"(آل عمران/52) حضرت مسیح نے کہا کون ہے جو میری مدد کرے اللہ کے دین میں حواریوں نے کہا ہم مدد کریں گے اللہ کے دین کی۔اس آیت میں صاف واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حوارین کو مدد کے لئے پکارا۔

(۳)"وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ"(الاعراف/2) مدد کرو ایک دوسرے کی نیکی اور تقویٰ پر اور نہ مدد کرو ایک دوسرے کی گناہ اور زیادتی پر۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے میثاق کے دن حضرات انبیاء کرام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے فرمایا "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ"(آل عمران/81) کہ تم ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا اس آیت میں بندوں کو بندۂ خاص کی مدد کا حکم دیا گیا ہے۔

(۵) بہت ہی مشہور ومعروف آیت کریمہ ہے۔"وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ"یعنی صبر ونماز سے مدد طلب کرو،اس آیت میں صبر ونماز جو غیر اللہ ہیں سے مدد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۶)"فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ"(التحریم/4)یعنی رسول کے مددگار،اللہ اور جبرئیل اور متقی مسلمان ہیں آیت میں جبرئیل امین اور متقی مسلمان کو رسول کا مددگار قرار دیا گیا۔اس طرح بہت سی آیات کریمہ ہیں جن سے غیر اللہ سے مدد لینے دینے اور مدد مانگنے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔اس باب میں احادیث اور اقول سلف صالحین اس کثرت سے ہیں کہ سب کا احاطہ ممکن نہیں۔ذیل میں دو چند مذکور ہیں۔

(۱) مشکوٰۃ شریف باب السجود وفضلہ میں حضرت ربیعہ ابن کعب اسلمی کی حدیث بہت مشہور ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ربیعہ "سل فقلتُ اسئلک مرافقتک فی الجنۃ قال او غیر ذالک قلت ھو ذالک قال فاعنی علی نفسک بکثرۃ السجود"۔

یعنی مانگو! میں نے عرض کیا میں آپ سے جنت میں آپ کی ہمراہی مانگتا ہوں نبی پاک نے ارشاد فرمایا کچھ اور مانگنا ہے؟ میں نے کہا صرف یہی آپ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے نفس پر کثرت نوافل سے میری مدد کرو۔

یہ حدیث پاک ہمارے مدعیٰ پر آفتاب نیمروز سے زیادہ روشن دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ربیعہ سے خود فرمایا مانگو حسب ارشاد انہوں نے جنت بھی اور جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت اور غلامی بھی مانگی ظاہر ہے کہ اگر غیر اللہ سے مانگنا شرک ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز اس کی تعلیم نہ فرماتے اگر صحابہ کرام از خود مانگتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سختی سے منع فرمادیتے کہ غیر اللہ سے مدد نہ مانگو کہ یہ شرک ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود مانگنے کی ترغیب دی جس سے ظاہر ہے کہ مدد مانگنا طریقہ صحابہ ہے۔ اس حدیث کے تحت اشعۃ اللمعات میں ہے۔ واز اطلاق سوال کہ "فرمود سل" وتخصیص نہ کرد بمطلوبے خاص معلوم می شود کہ کار ہمہ بدست ہمت وکرامت اوست ہر چہ خواہد ہر کرا خواہد باذن پروردگار خود بدہد:

فان من جودک الدنیا و ضرتھا
ومن علومک علم اللوح والقلم
اگر خیریت دنیا و عقبیٰ آرزو داری
بدرگاہش بیا وہرچہ می خواہی تمنا کن

یعنی سوال کو مطلق فرمایا کسی خاص چیز سے مقید نہ فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے امور ومعاملات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست کریمانہ میں حاصل ہیں جو چاہیں جس کو چاہیں اپنے رب کے حکم سے دے دیں کیونکہ دنیا و آخرت آپ ہی کی سخاوت سے ہے اور لوح وقلم کا علم آپ کے علوم کا حصہ ہے اگر دنیا وآخرت کی بھلائی چاہتے ہو تو ان کے آستانہ پر آجاؤ اور جو چاہو مانگ لو کہ:

بخدا خدا کا یہی در نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آکے ہو جو یہاں تو وہاں نہیں
آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ ان سے
کل نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا
(اعلیحضرت)

مرقات شرح مشکوٰۃ میں حدیث مذکور کے تحت ہے۔ ''فیعطی لمن شاء ماشاء''یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کو جو چاہیں دے دیں۔

(۲) تفسیر کبیر سورہ انعام پ،۷ میں زیر آیت ''وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'' ہے ''وثالثها الانبياء وهم الذين اعطاهم الله تعالىٰ من العلوم والمعارف مالا جله يقدرون على التصرف فى بواطن الخلق وارواحهم وايضا اعطاهم من القدرة المكنة مالا جله يقدرون على التصرف فى ظواهر الخلق''یعنی تیسرے ان میں انبیاے کرام ہیں یہ وہ حضرات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر علوم ومعارف عطا فرمائے ہیں جن سے وہ مخلوق کی اندرونی حالات اوران کی ارواح پر تصرف کر سکتے ہیں نیز ان کو اس قدر قوت وقدرت عطا فرمائی ہے کہ مخلوق کے ظاہر پر وہ تصرف کر سکتے ہیں۔

(۳) تفسیر مذکور میں زیر آیت ''وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ''حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جو کوئی جنگل میں پھنس جائے تو کہے ''اعينونى عباد الله يرحمكم الله''اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔

(۴) اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ، باب زیارت القبور کے آغاز میں ہے۔

''امام غزالی گفتہ ہر کہ استمداد کردہ شود بوے در حیات استمداد کردہ میشود بوے بعد از وفات یکے از مشائخ گفتہ دیدم، چہار کس را از مشائخ کہ تصرف می کنند در قبور خود مانند تصرفہا ایشاں در حیات خود یا بیشتر قومے می گویند کہ امداد حی قوی تر است ومن می گویم کہ امداد میت قوی تر، واولیاء را تصرف در اکوان حاصل است وآں نیست مگر ارواح ایشاں را در ارواح باقی است''۔

ترجمہ: امام غزالی کہتے ہیں کہ جن سے ان کی زندگی میں مدد مانگی جاتی ہے ان سے ان کی وفات کے بعد بھی مدد مانگی جاسکتی ہے ایک بزرگ نے فرمایا کہ ہم نے چار بزرگوں کو قبروں میں تصرف کرتے ہوئے دیکھا جس طرح زندگی میں تصرف کرتے تھے یا زیادہ، ایک جماعت کہتی ہے کہ زندہ کی مدد زیادہ قوی ہے اور میں کہتا ہوں کہ مردہ کی مدد زیادہ قوی ہے اولیا کی حکومت جہانوں میں ہے اور یہ نہیں ہے مگر یہ کہ ان کی روحیں ارواح میں باقی ہیں۔

(۵) قلائد الجواہر میں ہے۔''جمہور علما وفقرا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کتب قوم اس سے بھری ہوئی ہیں کہ جو اولیاء اللہ کہ صاحب تصرف تام ہوتے ہیں جن کو خدائے تعالیٰ منتخب کر کے اپنے بندگان خاص میں شامل فرماتا ہے جس طرح

سے کہ ان سے تصرفات وخوارق عادات زندگی میں صادر ہوتے ہیں اسی طرح ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے سیدنا مولانا قدوتنا الی اللہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، اور شیخ الشیوخ معروف بہ ابن محفوظ فیروز بن مرزبان الکرخی رحمۃ اللہ علیہ وشیخ واصل الی اللہ عقیل منجی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ کامل حیات بن قیس الحرانی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ سادات وقواد اولیاے کرام سے ہیں اور چار پانچ مشائخ سادات صلحا سے ہیں چونکہ باذن اللہ مردے کو زندہ اور اندھے کو بینا اور مبروص کوڑھی کو اچھا کرتے تھے وہ القطب الربانی والغوث الصمدانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی موصوف الصدر، اور شیخ جلیل القدر سیدی احمد رفاعی، وقدوۃ السالکین شیخ علی بن ہیتی رحمۃ اللہ علیہ کہ قدوۃ الصلحاء شیخ بقابن بطو ہیں۔

(۶) حاشیہ مشکوٰۃ باب زیارۃ القبور میں ہے۔ ”**واما الا ستمداد باھل القبور فی غیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم او الانبیاء فقد انکرہ کثیر من الفقھاء واثبتہ المشائخ الصوفیہ و بعض الفقھاء، قال الامام الشافعی قبر موسیٰ الکاظم تریاق مجرب لاجابۃ الدعاء وقال الامام الغزالی من یستمد فی حیاتہ یستمد بعد وفاتہ**“

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ودیگر انبیاے کرام کے علاوہ اور اہل قبور سے دعا مانگنے کا بہت سے فقہا نے انکار کیا ہے البتہ مشائخ صوفیہ اور بعض فقہا نے اسے ثابت مانا ہے چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کاظم کی قبر قبولیت دعا کے لئے آزمودہ تریاق ہے اور امام غزالی نے فرمایا کہ جس سے زندگی میں مدد مانگی جاسکتی ہے ان سے بعد وفات بھی مدد مانگی جاسکتی ہے۔

اس عبارت کا مطلب ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاے کرام علیہم السلام سے بعد وصال مدد مانگنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ البتہ حضرات اولیاے کرام سے مدد مانگنے کے بارے میں اختلاف ہے اکثر فقہا مدد مانگنے کو ثابت نہیں مانتے لیکن حضرات صوفیاے کرام اور بعض فقہاے کرام اولیا سے مدد مانگنے کو جائز کہتے ہیں صوفیا ہوں یا فقہا ان میں حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کا مقام کس قدر بلند ہے کسی ذی علم سے پوشیدہ نہیں ان جیسے عبقری فقیہ اور امام حضرت موسیٰ کاظم کی قبر کو قبولیت دعاء کے لئے تریاق فرمارہے ہیں بلکہ ان کا بارہا کا تجربہ ہے اسی طرح امام الائمہ سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی قبر کے بارے میں حضرت امام شافعی ہی سے منقول ہے آپ فرماتے ہیں کہ جب مجھے کوئی حاجت پیش آتی ہے تو میں بغداد شریف امام اعظم کے مزار شریف پر حاضر ہوتا ہوں، دو رکعت نفل پڑھ کر

امام اعظم کی قبر شریف کی برکت سے دعا کرتا ہوں تو بہت ہی جلد حاجت پوری ہوجاتی ہے بلکہ حضرت امام شافعی جب حضرت امام اعظم کی قبر شریف پر حاضر ہوتے تو حنفی مسلک کے مطابق نماز پڑھتے تھے قنوت نازلہ نہیں پڑھتے بعض بزرگوں نے کہا کہ نماز میں آپ بسم اللہ کو جہر سے نہیں پڑھتے تھے جبکہ آپ کا مذہب جہر سے پڑھنا ہے۔ کسی نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا اس قبر والے کا ادب واحترام کرتا ہوں۔ (شامی)

(۷) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز صفحہ پر فرماتے ہیں:

''باید فہمید کہ استعانت از غیر بوجہے کہ اعتماد برآں غیر واورا مظہر عون الٰہی نداند حرام ست واگر التفات محض بجانب حق است واورا یکے از مظاہر عون دانستہ ونظر بکارخانہ اسباب وحکمت اوتعالیٰ در آں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید دور از عرفان نخواہد بود ودر شرع نیز جائز ورواست انبیا واولیاء ایں نوع استعانت تعبیر کردہ اند ودر حقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لاغیر''۔

یعنی سمجھنا چاہئے کہ کسی غیر سے مدد مانگنا بھروسہ کے طریقہ پر کہ اس کو مدد الٰہی نہ سمجھے حرام ہے اور اگر توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہے اور اس کو اللہ کی مدد کا ایک مظہر اور اللہ کی حکمت اور کارخانہ اسباب جانکر اس سے ظاہری طور پر مدد مانگے تو عرفان سے دور نہیں ہے۔ اور شریعت میں بھی جائز ہے اور اس قسم کی استعانت بالغیر انبیا واولیا نے بھی کی ہے لیکن حقیقت میں یہ حق تعالیٰ کے غیر سے مانگنا نہیں ہے بلکہ استعانت حضرت حق تعالیٰ سے ہے نہ کہ غیر سے اس کی مدد ہے۔

تفسیر عزیزی میں سورہ بقرہ صفحہ ۶۴۰ میں شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''افعال عادی الٰہی را مثل بخشیدن فرزند وتوسیع رزق وشفاء مریض وامثال ذالک را مشرکان نسبت بارواح خبیثہ واصنام می نمایند وکافر می شوند وموحدان از تاثیر الٰہی باخواص مخلوقات اومی دانند از ادویہ وعقاقیر یا دعاء صلحاء بندگان او کہ ہمہ از جناب او درخواستہ انجاح مطلب می کنانند می فہمند در ایمان ایشاں خلل نمی افتد''

یعنی اللہ کے کام جیسے لڑکا دینا، رزق بڑھنا، بیمار کو اچھا کرنا اور اس کی مثل کو مشرکین خبیث روحوں اور بتوں کی طرف نسبت کرتے ہیں اور کافر ہوجاتے ہیں اور مسلمان ان امور کو حکم الٰہی یا اس کی مخلوق کی خاصیت سے جانتے ہیں جیسے کہ دوائیں یا عقاقیر یا اس کے نیک بندوں کی دعائیں کہ وہ بندے رب کی بارگاہ سے مانگ کر لوگوں کی حاجت روائی کرتے اور ان مومنین کے ایمان میں اس سے خلل نہیں آتا۔

تفسیر کبیر، روح البیان و خازن میں سورہ یوسف کی آیت "فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ" کی تفسیر میں ہے۔ "الاستعانة بالناس فی دفع الضرر والظلم جائزة" اور خازن میں زیر آیت "فَأَنْسَاهُ الشَّيْطٰنُ" ہے "الاستعانة بالمخلوق فی دفع الضرر جائز"۔ یعنی مصیبت دور کرنے کے لئے مخلوق سے استعانت جائز ہے۔ درمختار باب اللقط کے آخر میں گم شدہ چیز کو تلاش کرنے کے لئے ایک عمل مذکور ہے۔ وہ یہ ہے "ان الانسان اذا ضاع له شئ واراد أن یرده الله علیه فلیقف علی مکان عال مستقبل القبلة ویقرأ الفاتحة ویهدی ثوابها للنبی علیه السلام ثم یهدی ثوابها لسیدی احمد ابن علوان یقول یا سیدی یا احمد ابن علوان ان لم ترد علی ضالتی والا نزعتک من دیوان الاولیاء فان الله یرد ضالته ببرکته"

یعنی جس کسی کی کوئی چیز گم ہوجائے اور وہ چاہے کہ خدا وہ چیز واپس لا دے تو کسی اونچی جگہ پر قبلہ کو منہ کر کے کھڑا ہو اور سورہ فاتحہ پڑھ کر اس کا ثواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ کرے، پھر سیدی احمد علوان کو پھر یہ دعاء پڑھے اے میرے آقا اے احمد ابن علوان اگر آپ نے میری چیز نہ دی تو میں آپ کو دفتر اولیا سے نکال دونگا پس خدائے تعالیٰ اس کی گمشدہ چیز کو ان کی برکت سے لا دیگا اس دعا میں سید احمد بن علوان کو پکارا بھی اور ان سے مدد بھی طلب کی گئی۔ اور یہ کسی معمولی عالم کا قول نہیں بلکہ حنفیوں کے فقیہ صاحب درمختار نے تعلیم کی ہے۔

امام الائمہ سراج الامت حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدۂ نعمانیہ اہل علم کے نزدیک بہت مشہور ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں

یا اکرم الثقلین یا کنز الوریٰ
جدلی بجودک ارضنی برضاک
انا طامع بالجود منک لم یکن
لابی حنیفة فی الانام سواک

یعنی اے موجودات میں سب سے مکرم اور نعمت الہیہ کے خزانہ آپ اپنے جود وعنایات سے مجھے بھی عنایت فرمائیں اور اللہ نے آپ کو راضی کیا ہے مجھے بھی راضی فرمایئے میں آپ کی سخاوت کا امیدوار ہوں آپ کے سوا مخلوقات میں ابو حنیفہ کا کوئی نہیں۔ اس میں حضرت ابوحنیفہ جیسے ثریا کی بلندیوں سے ایمان وحکمت کے گل بوٹے توڑنے والے امام نے ذات مصطفیٰ کریم سے مدد طلب کی ہے۔

اہل سنت و جماعت کے عوام وخواص یوں تو جملہ اولیاء اللہ سے استغاثہ کو نہ یہ کہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ ان سے اپنی حاجات کو طلب بھی کرتے ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ جس ذات کریم کو مسلمان مشکل کے موقع پر یاد کر کے ان سے استغاثہ کرتے ہیں وہ حضور محبوب سبحانی پیران پیر دستگیر غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ النورانی کی ذات بابرکات ہے حضور محبوب سبحانی نے اپنے مریدین ومتوسلین سے خود ارشاد فرمایا "**من استغاث بی فی کربۃ کشفت عنہ و من نادانی باسمی فی شدۃ فرحت عنہ و من توسل الی اللہ فی حاجۃ قضیت**" یعنی جو کوئی رنج وغم میں مجھ سے استغاثہ کرے مدد مانگے تو اس کا رنج وغم دور ہوگا اور جو سختی کے وقت میرا نام لیکر مجھے پکارے تو میں اس کے رنج وکلفت کو دور کر دونگا اور جو کوئی حاجت میں رب کی طرف مجھے وسیلہ بنائے تو اس کی حاجت پوری ہوگی۔

مندرجہ بالا شواہد و دلائل کی روشنی میں یہ عقیدہ دن کے اجالے کی طرح روشن ہوجاتا ہے کہ استمداد و استغاثہ جائز و درست ہے۔ ان حقائق کے باوجود اب بھی کسی کو اس امر میں شک وتردد واقع ہو تو وہ اپنے عمائدین وقائدین علما کے اقوال پڑھ کر قلب میں اطمینان پیدا کر کے جادۂ مستقیم پر آجائے۔

(۱) دیوبندیوں کے شیخ الہند محمود حسن صاحب کے ترجمہ قرآن میں زیر آیت اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہے 'ہاں اگر کسی مقبول بندے کو واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے"

(۲) فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کتاب الحظر والاباحۃ صفحہ ۶۴ پر ایک سوال وجواب مذکور ہے۔

سوال: اس مضمون کو پڑھئے۔

یارسول کبریا فریاد ہے
یا محمد مصطفی فریاد ہے
مدد کر بہر خدا حضرت محمد مصطفی
میری تم سے ہر گھڑی فریاد ہے

کیسے ہیں؟

الجواب: ایسے الفاظ پڑھنے خلوت اور جلوت میں بایں خیال کہ حق تعالیٰ آپ کی ذات کو مطلع فرمادیوے یا محض محبت سے بلا کسی خیال کے جائز ہیں۔ اسی طرح۔

یارسول اللہ انظر حالنا
یارسول اللہ اسمع قالنا

اننی فی بحر غم مغرق
خذ یدی سھل لنا اشکالنا

جیسے اشعار کو بطور وظیفہ یا ورد پڑھنا کیسا ہے؟
اس کے جواب میں رشید احمد گنگوہی صاحب نے لکھا۔
''ایسے کلمات کو نظم ہو یا نثر ورد کرنا مکروہ تنزیہی ہے کفر و فسق نہیں۔(رشیدیہ صفحہ:۵)
(3) قصائد قاسمی میں مولوی قاسم صاحب کا درج ذیل شعر بہت مشہور و معروف ہے۔

مدد کرائے کرم احمدی کہ تیرے سوا
نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار

(4) جناب حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

جہاز امت کا حق نے کر دیا ہے آپ کے
ہاتھوں
تم اب چاہے ڈباؤ یا تراؤ یا رسول اللہ

(5) امداد الفتاویٰ مصنفہ مولوی اشرف علی تھانوی جلد ۴ کتاب العقائد والکلام صفحہ ۹۹ میں ہے۔
''جو استعانت و استمداد باعتقاد علم و قدرت مستقل ہو وہ شرک ہے اور جو باعتقاد علم و قدرت غیر مستقل ہو اور وہ علم و قدرت کسی دلیل سے ثابت ہو جائے تو جائز ہے خواہ مستمد منہ حی ہو یا میت''۔
اور شم الطیب ترجمہ شم الحبیب میں جناب اشرف علی تھانوی ترجمہ کرتے ہوئے اس طرح مدد مانگتے دکھائی دے رہے ہیں۔

یا شفیع العباد خذ بیدی	☆	**انت فی الاضطرار معتمدی**
دستگیری کیجئے میرے نبی	☆	کشمکش میں تم ہی ہو میرے ولی
لیس لی ملجا سواک أغث	☆	**مسنی الضر سیدی سندی**
جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ	☆	فوج کلفت مجھ پہ آغالب ہوئی
غشنی الدھر ابن عبداللہ	☆	**کن مغیثا فانت لی مددی**
ابن عبداللہ زمانہ ہے خلاف	☆	اے میرے مولیٰ خبر لیجئے میری
نام احمد چوں حصار شد حصین	☆	پس چہ باشد ذات آں روح الامین

(بحوالہ جاء الحق)

غرضیکہ اس طرح سینکڑوں شواہد ودلائل اس باب میں صرف منکرین کے ملیں گے جن سے آفتاب نیمروز سے زیادہ روشن ہوتا ہے کہ انبیاواولیا سے استعانت نہ یہ کہ صرف جائز ومستحب ہے بلکہ ان کے قول وعمل سے استمداد ثابت ہے اس لئے آیت کریمہ ''اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' کے حجاب میں استمداد واستعانت کو کفر وشرک کہنا خود اپنی زبان وقلم سے اپنے آپ کو کافر و مشرک کہنا ہوگا ''نعوذ باللہ من ذالک''۔

لہٰذا آیت کریمہ ''اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ''میں استعانت سے استعانت حقیقیہ ذاتیہ مراد لینا بہر حال ضروری ہوگا یعنی حقیقی کارساز سمجھ کر صرف اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں یہ استعانت اللہ کے سوا کسی سے جائز نہیں رہی مجازی استعانت تو وہ غیر اللہ سے نہ یہ کہ صرف جائز ہے بلکہ امور دنیا انجام دینے کے لئے ضروری ہے ورنہ کوئی انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا چونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک دوسرے کا محتاج بنایا ہے چنانچہ بادشاہ ہو کر بھی اپنی رعایا، خدام ونوکر کا محتاج ہے اور غریب وفقیر حصول مال وزر کے لئے امیر اور دولت مند کا محتاج ہے یہی وجہ ہے کہ سب ایک دوسرے سے اپنے اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لئے مدد لیتے ہیں اور اس میں کسی کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ کفار ومشرکین حتی کہ اہل ایمان وموحدین سب برابر کے شریک ہیں اور ایک دوسرے سے مدد لینے کے محتاج ہیں تو اگر استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے ہی جائز ہو غیر اللہ سے مجازی استعانت بھی ناجائز ہو جائے تو اس روئے زمین پر کوئی مومن نہ بچے گا سب کافر و مشرک ٹھہریں گے ''معاذاللہ من ذالک''جب عوام الناس سے استعانت جائز ہوا تو اولیاء اللہ جن کے دست وبطش اور سمع وبصر کو اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنا دست وبطش اور سمع وبصر قرار دیا ہے ان سے استمداد کیونکر جائز نہ ہوگا جو فیض الٰہی کے واسطہ اور ذریعہ ہیں حضرت امام غزالی کے حوالہ سے گذرا کہ جس سے زندگی میں مدد لی جاسکتی ہے بعد موت بھی اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اتنے دلائل وشواہد کے باوجود بھی اگر کوئی بدعقیدہ استعانت بالغیر کو ناجائز وحرام اور کفر وشرک سمجھ رہا ہو تو اسے پہلے اپنے ان پیشواؤں کو کافر ومشرک گرداننا چاہئے جنھوں نے استعانت بالغیر کو کسی نہ کسی طرح جائز قرار دیا ہے پھر وہ دنیا میں کسی ڈاکٹر، طبیب اور وکیل واجیر کسی سے بھی ہرگز کوئی مدد نہ لے بلکہ انسانی دنیا سے الگ کہیں سنسان وادی میں جا کر توکل کرے حتیٰ کہ اکل وشرب اور آب وہوا تک کو ترک کر دے کہ آب وہوا اور خورد ونوش کے سامان سے استفادہ کرنا بھی استعانت بالغیر ہے بلکہ ایسے مریضوں کو وصیت کر جانا چاہئے کہ اس کے مرجانے کے بعد اس کی میت کو کوئی ہاتھ نہ لگائے اور نہ اس کی تجہیز وتکفین کرے تاکہ بعد مردن استعانت بالغیر کے سبب کفر وشرک نہ ہو جائے۔ اگر استعانت بالغیر مطلقا ناجائز وحرام اور کفر وشرک ہو جیسا کہ وہابیہ الاپتے ہیں تو نظام عالم میں جو اختلال

وانتشار، جمود وتعطل اور فتنہ وفساد پیدا ہوگا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اگر کوئی دنیا میں غیر اللہ سے مدد لینے کا قائل نہیں تو اس کو اپنے اس عقیدے پر سختی کے ساتھ قائم بھی رہنا چاہئے اور اسے ہر حاجت میں وہی کہنا چاہیے جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے نارنمرود میں ڈالے جانے کے وقت حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے الک حاجۃ پوچھنے پر فرمایا تھا تاکہ اسے حقیقت استعانت کے معنی سے قدرے لذت آشنائی ہوجائے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن پر کامل طور پر عمل پیرا ہوسکے ورنہ درگاہ رب العلمین میں کھڑے ہوکر کذب بیانی ہوگی، جیسا کہ حضرت سفیان ثوری قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ ایک بار نماز کے اندر حالت قیام میں ایاک نستعین کی تلاوت کے وقت آپ کو استعانت حقیقیہ کے معنی کا تصور ہوگیا تو بیہوش ہوکر گر پڑے چنانچہ مروی ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ایک دن نماز پڑھا رہے تھے جب سورہ فاتحہ کی اس آیت پر پہنچے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) روتے روتے بیہوش ہوگئے جب افاقہ ہوا تو لوگوں نے حال دریافت کیا فرمایا اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر غیب سے ندا ہو، اے جھوٹے خموش! کیا ہماری ہی سرکار تجھے جھوٹ بولنے کو رہ گئی؟ رات دن رزق کی تلاش میں گلی گلی پھرتا ہے اور بیماری کے وقت طبیبوں سے التجا کرتا ہے اور ہم سے کہتا ہے کہ ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں، تو میں اس بات کا کیا جواب دونگا۔ مختصر یہ کہ آیت کریمہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن میں نہ یہ مراد ہے کہ انسان دنیا کے تمام آلات واسباب اور عوامل وذرائع سے مدد لئے بغیر اللہ تعالی سے استعانت کرے اور نہ اس کا کوئی قائل ہے اور نہ ہی عامل ہے۔ آخر میں تفسیر صاوی کا ایک اقتباس پیش کرکے اس عنوان کا سدباب کررہے ہیں شاید کہ کسی کو ہدایت نصیب ہوجائے۔

آخر سورہ قصص "وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً اٰخَرَ" کی تفسیر میں درج بالا حقیقت کو بایں الفاظ پیش فرمایا ہے۔

'وحینئذ فلیس فی الآیۃ دلیل علی مازعمہ الخوارج من أن الطلب من الغیر حیاً او میتا شرک فانہ جھل مرکب لان سوال الغیر من اجراء اللہ النفع او الضر علی یدہ قدیکون واجبا لانہ من التمسک بالاسباب ولاینکر الاسباب الاجحود او جھول" یعنی یہاں "لَا تَدْعُ" کے معنی ہیں نہ پوجو لہٰذا اس آیت میں ان خارجیوں کی دلیل نہیں جو کہتے ہیں غیر خدا سے خواہ زندہ ہو یا مردہ کچھ مانگنا شرک ہے۔ خارجیوں کی یہ بکواس جہل مرکب ہے کیونکہ غیر خدا سے مانگنا اس طرح کہ رب ان کے ذریعے سے نفع ونقصان دے کبھی واجب ہوتا ہے کہ یہ طلب اسباب کا حاصل کرنا ہے اور اسباب کا انکار وہی کرسکتا ہے جو بہت بڑا منکر ہے یا جاہل ہے۔

فصل ہفتم: تفسیر قولہ تعالیٰ: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (یعنی ہم کو سیدھا راستہ چلا)

اس ترجمہ پر مفہوم بہت واضح ہے لیکن کچھ مترجمین نے اس کا اس طرح ترجمہ کیا ''ہمیں سیدھی راہ دکھا'' (محمد جونا گڑھی) ہمیں سیدھا راستہ دکھا (ابوالاعلیٰ مودودی)

فائدہ اول: پس ان ترجموں پر بہت مشہور اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ نمازی یا کوئی مسلمان جب اس سورہ یا اس آیت کو نماز میں یا خارج نماز پڑھتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ پہلے ہی سے مومن اور ہدایت یافتہ ہے اور جب وہ پہلے ہی سے صاحب ایمان اور ہدایت یافتہ ہے تو آیت ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ'' میں طلب ہدایت کی دعا تحصیل حاصل ہے اور تحصیل حاصل محال ہوتی ہے۔

جواب: اس اعتراض کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے عظیم ترین مشقتوں کے برداشت کرنے کی صلاحیت ہے جو سابقین اولین کا راستہ ہے معنی یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں اپنے راستہ میں سخت ریاضت اور مجاہدہ شاقہ کی توفیق عطا فرما جو سابقین اولین کا طریقہ و راستہ ہے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول حضرت نوح علیہ السلام کو ہر دن اتنی زیادہ زدوکوب کی جاتی کہ آپ بیہوش ہوجاتے پھر بھی آپ ہر مرتبہ یہی کہتے ''اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون'' اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما کہ وہ نہیں جانتی۔ اس واقعہ کے ضمن میں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ہم سب کے رسول حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی دعاء منقول ہے مگر صرف ایک بار کسی خاص واقعہ سے متعلق ہے مگر حضرت نوح علیہ السلام روزانہ جب کبھی قوم کی زدوکوب کی وجہ سے آپ پر غشی طاری ہوتی تو یہی دعا کرتے اس لئے حضرت نوح علیہ السلام کی افضلیت ثابت ہوتی ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاے کرام سے حتما اجماعا افضل ہیں۔

جواب: یہ ہے کہ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ سینکڑوں مرتبہ سورہ فاتحہ کی تلاوت فرماتے تھے اور سورہ فاتحہ میں ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' بھی مذکور ہے جس میں سارے جہاں کے انسانوں کے لئے طلب ہدایت کی دعا ہے غرضیکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار نہیں بلکہ لاتعداد مرتبہ صرف اپنی قوم کے لئے نہیں بلکہ اقوام عالم کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی ہے۔ اس لئے حضرت نوح علیہ السلام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

(۲) حضرات علماے دین نے بیان کیا ہے کہ اخلاق میں سے ہر خلق کے دو طرف ہوتے ہیں ایک افراط، دوسری تفریط، اور یہ دونوں صورت مذموم ہے حق وسط اور درمیانی صورت ہے اس کی تائید اللہ عزشانہ تعالیٰ کے ارشاد ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا

كُمْ أُمَّةً وَّسَطاً" (البقرۃ: ۱۴۲) سے ہوتی ہے۔ اور وسط عدل وصواب کو کہتے ہیں پس انسان دلیل سے معرفت الٰہیہ حاصل کر لینے کے بعد ہدایت یافتہ مومن ہوجاتا ہے لیکن اس حالت کے حاصل ہونے کے بعد اس پر ضروری ہے کہ وہ اس عدل وصواب کی معرفت حاصل کرے جو اعمال شہوانیہ، غضبیہ اور انفاق مال کی کیفیت میں افراط وتفریط کے دونوں طرفوں کے درمیان خط متوسط ہے گویا مومن "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہہ کر تمام اخلاق واعمال میں افراط وتفریط کے مابین درمیانی راہ یا راہ وسط کو طلب کرتا ہے۔

(۳) بیشک مومن کو کسی ایک دلیل سے خدائے تعالیٰ کی معرفت ہوجاتی ہے لیکن اقسام ممکنات میں جتنی چیزیں موجود ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے وجود اس کے علم وقدرت، جود وسخاوت اور رحمت وحکمت پر انگنت دلیلیں موجود ہوتی ہیں، بسا اوقات انسان کا دین ایک دلیل کی معرفت سے حاصل ہوجاتا ہے اور بقیہ دلیلوں سے وہ غافل رہتا ہے پس بندہ جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہتا ہے تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اے ہمارے معبود کائنات کی ہر شئی میں تیری ذات وصفات اور علم وقدرت پر دلالت کرنے والی چیزوں کی کیفیت کی ہمیں معرفت عطا فرمادے۔

(۴) قرآن حکیم میں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا "[۱] وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" اور بیشک تم ضرور سیدھی راہ بتاتے ہو، اللہ کی راہ کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں۔ (الشوریٰ ۵۲۔ ۵۳) دوسرے مقام پر اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ" اور یہ کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ تو اس پر چلو۔ (الانعام: ۱۵۳) صراط مستقیم یہ ہے کہ انسان ماسوی اللہ سے کنارہ کشی کر لے اور عمیق قلب اور فکر ونظر کی گہرائی سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجائے۔ پس بندہ جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہتا ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اے رب العالمین وہ صراط مستقیم عطا فرما جو کائنات کی ہر شئی سے کنارہ کش کر کے تیری طرف متوجہ کردے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بندہ ایسا ہوجائے کہ اگر اسے ولد عزیز کو ذبح کرنے کا حکم دے تو بلا توقف ذبح کرنے پر آمادہ ہوجائے جیسا کہ ابراہیم خلیل اللہ نے کیا، یونہی وہ ایسا اطاعت شعار فرماں بردار بن جائے کہ کوئی غیر اسے ذبح کرے تو فوراً گردن جھکادے جیسا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کیا اسی طرح اگر حکم ہو کہ اپنے آپ کو شعلہ زن آتش نمرود میں یا سمندر میں پھینک دے تو فوراً اطاعت کرے جیسا کہ ابراہیم خلیل اللہ اور یونس علیہما السلام نے کیا، ایسے ہی نبوت ورسالت جیسے منصب جلیل پر فائز ہونے کے باوجود، علم باطن یا اسرار الٰہیہ کے حصول کے لئے اپنے سے اعلم کے پاس جانے کا حکم ہو تو

بلا تامل چلا جائے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس تشریف لے گئے۔ یونہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دشوار گذار راہوں میں قتل کئے جانے بلکہ نصفا نصف آرا سے چر جانے پر صبر کا حکم ہو تو آہ نہ کرے جیسا کہ حضرت یحیٰ وزکریا علیہما السلام نے صبر کیا۔

پس "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے نزول بلا کے وقت ثبات قدمی اور شدائد پر صبر کرنے میں حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کی اطاعت واقتدا کی طلب ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نہایت ہی کٹھن راہ ہے جس کی اکثر مخلوق کو طاقت نہیں ہے تاہم ہم یہ کہتے ہیں اے ایمان والو خوف زدہ اور غمزدہ نہ ہو کیونکہ اللہ کے دین میں کوئی ایسا امر نہیں جو تنگ ومشکل ہو اور پھر وہ آسان نہ ہو گیا ہو ارشاد ہے "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" چنانچہ اس آیت میں یسر و سہولت اور وسعت و آسانی پر دلالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا "صِرَاطَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا وَضُرِبُوْا" بلکہ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" فرمایا، پس اس آیت کے پڑھنے کے وقت خلوص نیت سے یہ کہے کہ ہمارے معبود بیشک ہم نے اپنے والد یا بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے جیسا کہ میں مرتکب ہوں اور انہوں نے معاصی پر اقدام کیا ہے۔ جیسا کہ میں معاصی پر اقدام کرتا ہوں پھر میں نے دیکھا کہ جب ان کی موت کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے مصیبت و گناہ سے توبہ کر لی اور تیری طرف رجوع کر لیا پس تو نے ان کے لئے جہنم سے نجات کا اور جنت میں داخلہ کا حکم دے دیا غرضیکہ تو نے ان پر انعام فرمایا کہ تو نے اسے توبہ کی توفیق عطا فرمادی، مزید انعام فرمایا کہ تو نے ان کے توبہ کو قبول فرمایا بلکہ انعام بالائے انعام یہ کیا کہ جہنم سے نجات کا اور دخول جنت کا حکم صادر فرمادیا اسی طرح اے میرے معبود ہمیں وہ صراط مستقیم عطا فرما جو تائبین کے درجات پر فائز کردے۔

(۵) جب بندہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہتا ہے تو گویا رب تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے کہ مولیٰ ہمیں صراط مستقیم ہی پر قائم رکھنا اس لئے کہ راستے بہت ہیں دوست احباب ایک راستہ کی طرف لیجانا چاہتے ہیں اور اعداء دوسرے راستہ کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور شیطان تیسرے راستہ کی طرف بلا رہا ہے کوئی شہوت وغضب کی طرف تو کوئی حسد وحقد کی طرف بلا رہا ہے، کوئی مذہب تعطیل کی طرف تو کوئی مذہب تشبیہ کی طرف، کوئی جبریہ کی طرف، تو کوئی قدریہ کی طرف کھینچ رہا ہے۔ کوئی امید ورجاء کے سبز باغ دکھا کر گمراہ کرنا چاہتا ہے اور کوئی وعید ودھمکیوں کا خوف دلا کر بیزار کرنا چاہتا ہے اسی طرح کوئی رفض کی طرف تو کوئی خروج کے تاریک بھنور میں داخل کرنا چاہتا ہے۔

مولائے کریم ایسے حالات میں تیرا بندہ متحیر و پریشان ہے کہ کدھر جائے پھر عقل ضعیف ہے حق و باطل کے درمیان

امتیاز کرنے سے قاصر ہے اور عمر قصیر ہے قناعت طویل ہے اور تجربہ خطرہ سے خالی نہیں اس لئے فیصلہ دشوار ہے پس اے میرے رب مجھے ایسے راستہ پر گامزن کردے جو مستقیم ہو، سیدھا جنت کی طرف جاتا ہو جس میں کجی اور نشیب وفراز نہ ہو۔

حکایت: حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ بیت اللہ شریف تشریف لے جارہے تھے راہ میں اونٹنی پر سوار ایک اعرابی سے ملاقات ہوگئی، آپ سے اعرابی نے پوچھا اے شیخ کہاں کا ارادہ ہے شیخ ابراہیم ادہم نے فرمایا بیت اللہ کو جارہا ہوں، اعرابی نے کہا آپ پاگل ومجنون تو نہیں ہوگئے ہیں آپ کے پاس نہ کوئی سواری ہے نہ کچھ زادراہ ہے اور سفر اتنا طویل ہے آپ کیونکر جائیں گے۔ حضرت ابراہیم ادہم نے فرمایا اے اعرابی میرے پاس ایک نہیں بلکہ بہت سی سواریاں ہیں لیکن تمہیں نظر نہیں آرہی ہیں، اعرابی نے پوچھا وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا میرے اوپر جب کوئی بلا یا مصیبت نازل ہوتی ہے تو صبر کی سواری پر سوار ہوتا ہوں، جب نعمت نازل ہوتی ہے تو شکر کی سواری پر سوار ہوتا ہوں، جب قضا نازل ہوتی ہے تو رضا کی سواری پر سوار ہوجاتا ہوں، اور جب نفس کسی چیز کی طرف مجھے بلاتا ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ جو عمر بچی ہے وہ بہت ہی قلیل ہے بہ نسبت اس عمر کے جو گذر گئی ہے۔ اعرابی نے یہ سن کر کہا بحکم الٰہی اپنا سفر جاری رکھئے یقیناً آپ ہی سوار ہیں اور میں پیدل ہوں۔

(۶) بعض علما نے کہا "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے اسلام مراد ہے اور دوسرے بعض نے کہا قرآن مراد ہے۔ لیکن صراط مستقیم سے اسلام یا قرآن مراد لینا غیر صحیح ہے اس لئے کہ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" صراط مستقیم سے بدل ہے اب اس کا مطلب یہ ہوگا ہمیں ان متقدمین کے راستہ پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا اور اس امت سے متقدمین پیش رو امم سابقہ ہیں جنکا دین نہ دین اسلام کہلایا اور نہ ان کی کتاب کا نام قرآن ہوا، اس لئے صراط مستقیم سے اسلام یا قرآن مراد لینا قطعاً مناسب نہیں ہے پس صراط مستقیم سے مراد ان اہل حق کا راستہ ہے جو جنت کے حقدار ہیں۔

اس مقام پر "صراط" ارشاد ہوا سبیل یا طریق نہ فرمایا جب کہ تینوں کا معنی راستہ آتا ہے وجہ یہ ہے کہ بندہ مومن کو الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تلاوت کے وقت ہی صراط جہنم کی یاد دہانی مقصود ہے تاکہ مزید خوف وخشیت پیدا ہو یاد رہے کہ صراط جہنم یعنی پل صراط، پشت جہنم پر ایک پل ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ جنت میں جانے کا یہی راستہ ہے سب سے پہلے حضور سرور دو جہاں نبی کون ومکان صلی اللہ علیہ وسلم گذر فرمائیں گے پھر اور انبیا ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم پھر یہ امت پھر اور امتیں گذریں گی اور حسب اختلاف اعمال پل صراط پر لوگ مختلف طرح سے گذریں گے بعض تو ایسی تیزی کے ساتھ گذریں گے جیسے بجلی کا کوندنا کہ ابھی چمکی اور ابھی غائب ہوگئی اور بعض تیز ہوا کی طرح کوئی

ایسے جیسے پرندہ اڑتا ہے اور بعض جیسے گھوڑا دوڑتا ہے اور بعض جیسے آدمی دوڑتا ہے یہاں تک کہ بعض شخص سرین پر گھسیٹتے ہوئے اور کوئی چیونٹی کی چال جائے گا اور پل صراط کے دونوں جانب بڑے بڑے آنکڑے (اللہ ہی جانے کہ وہ کتنے بڑے ہوں گے) لٹکتے ہوں گے جس شخص کے بارے میں انھیں حکم ہوگا اسے پکڑ لیں گے مگر بعض تو زخمی ہوکر نجات پاجائیں گے اور بعض کو جہنم میں گرادینگے۔ اور جو گر جائے گا ہلاک ہوا معاذ اللہ یہ تمام اہل محشر تو پل پر سے گذرنے میں مشغول ہوں گے مگر وہ معصوم و بے گناہ رؤف رحیم رسول گنہگاروں کا شفیع، رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پل کے کنارے کھڑا کمال گریہ وزاری کے ساتھ اپنی امت عاصی کی نجات کی فکر میں اپنے رب سے دعا کررہا ہوگا ''رَبِّ سَلِّمْ، رَبِّ سَلِّمْ'' الٰہی ان گنہگاروں کو بچالے بچالے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ نے اسی موقع کے لئے کہا ہے

رضاؔ پل سے اب وجد کرتے گذریئے
کہ ہے رب سلم صدائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ'' کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے ''ثَبِّتْنَا عَلَى الْهِدَايَةِ الَّتِيْ وَهَبْتَهَا لَنَا'' یعنی مولا ہمیں اس ہدایت پر ثابت قدم رکھ جو تو نے ہمیں عطا فرمائی ہے اس کی نظیر ارشاد باری تعالیٰ میں ہے ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا'' (ال عمران:۸) اس کا معنی یہی ہے اے اللہ ہمیں ہدایت پر ثبات و استحکام عطا فرما کہ بہت سے ایسے عالم گذرے جن کے اذہان وقلوب میں عقائد وایمانیات کے تعلق سے ادنی شبہ پیدا ہوگیا وہ گمراہ بددین ہوگئے بلکہ کفر وارتداد کے دہانے پر پہنچ کر صراط مستقیم سے یکسر منحرف ہوگئے۔

فائدہ دوم: ''اِهْدِنَا'' کی تفسیر میں کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ''نا'' عربی گرامر کے اعتبار سے جمع کے لئے آتا ہے اگر باجماعت نماز پڑھ رہے ہوں تب تو مناسب ہے کہ ضمیر جمع استعمال کرے تاکہ تمام مجتمعین کو دعاے ہدایت شامل ہوجائے لیکن اگر کوئی نماز میں یا خارج نماز تنہا تلاوت کررہا ہو تو اس وقت ضمیر جمع کیونکر درست ہے حسب موقع تو جمع کی بجائے واحد یعنی ''اهدنی'' ہونا چاہئے اس شبہ کا دو طرح جواب ہے۔

جواب: اول یہ ہے کہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' دعا ہے اور دعا جتنی عام ہوتی ہے اتنی ہی اجابت کے قریب ہوتی ہے چنانچہ بعض علما اپنے تلامذہ سے فرماتے تھے کہ جب تم خطبہ میں ''رضی اللہ عنک وعن جماعۃ المسلمین'' (یعنی اللہ تم سے اور جماعت مسلمین سے راضی ہوجائے) کہتے ہو تو اگر تم نے اپنے قول ''رضی اللہ

عنک" میں اگر میری نیت کرلی ہے تو اچھی بات ہے ورنہ کوئی حرج نہیں لیکن اپنے دوسرے قول "وعن جماعة المسلمین" میں مجھے ہرگز فراموش نہ کرنا کیونکہ تمہاری پہلی دعا میں تخصیص ہے اور دعا تخصیص میں قبول نہ ہونے کا امکان باقی رہتا ہے لیکن تمہاری دعا کے دوسرے جز پر یعنی "عن جماعة المسلمین" کی قبولیت کی زیادہ امید ہے کیونکہ جمیع مسلمین میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے حق میں دعا قبول ہوتی ہے کہ وہ قبول کئے جانے کے مستحق ہوتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ بعض کے حق میں دعا کو قبول کریگا تو سب کے حق میں بھی قبول کرلے گا کہ اس کی شان کریمی سے بہت بعید ہے کہ بعض کے حق میں رد کردے چنانچہ انہیں وجہوں سے علما نے کلمات دعا کے اول وآخر میں درود شریف پڑھنے کو مسنون ومحبوب اور ذریعہ قبول جانا ہے۔

پس جو کوئی رب تعالیٰ سے دعا کرے تو اسے چاہئے کہ کلمات دعا سے پہلے بھی درود شریف پڑھے اور دعا کے بعد بھی درود شریف پڑھے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کو ضرور قبول فرماتا ہے تو جب وہ کلمات دعا کے دونوں طرف درود شریف کو قبول کرلیتا ہے تو بالیقین وہ دونوں کے وسط وبیچ میں موجود کلمات دعا کو بھی قبول کریگا کہ اس کی شان کریمی سے بہت بعید ہے کہ اول وآخر کو قبول کرلے اور وسط کو چھوڑ دے غرض دعا میں عمومیت افضل اور اجابت کے قریب ہے فقط خصوصیت پر اختتام رحمت الہیہ میں تنگی کرنا ہے جو قبولیت کے منافی ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز ایک اعرابی مسجد شریف میں داخل ہوا سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں تشریف فرما تھے اس نے دو رکعت نماز نفل پڑھی اس کے بعد دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور یوں دعاء کی "اللھم ارحمنی ومحمدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ولا ترحم معنا احدا" اے اللہ! مجھ پر رحم کر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیکر کہا ان پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ اور کسی پر رحمت نہ فرما حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا "لقد تحجرت واسعا" تو نے بڑی کشادہ چیز کو بہت محدود کردیا ہے تھوڑی دیر کے بعد وہ اعرابی اٹھا اور مسجد کے ایک کونہ میں جا کر پیشاب کرنے لگا لوگ اسے روکنے کے لئے دوڑے اللہ کے کریم نبی نے لوگوں کو سختی کے منع کیا اور فرمایا لا تزرموہ "اس کو مت روکو چنانچہ اس نے اطمینان سے پیشاب کیا جب وہ فارغ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنے صحابہ سے فرمایا "انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین" اے میرے صحابہ تمہیں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے تم لوگوں کو مشقت میں ڈالنے کے لئے نہیں بھیجا گیا پھر ارشاد فرمایا "علموا ویسروا ولا تعسروا" لوگوں کو علم سکھاؤ ان پر آسانیاں کرو اور ان پر سختی مت کرو پھر فرمایا جہاں اس نے پیشاب کیا ہے وہاں پانی کا ایک ڈول بہادو۔

اعرابی نے جب رسول عالی وقار صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کریمانہ برتاؤ دیکھا تو بول پڑا۔ میرے ماں باپ اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول پر قربان ہوں اس ناشائستہ حرکت پر حضور نے نہ مجھے جھڑکا نہ برا بھلا کہا بلکہ اپنے من موہنے انداز میں صرف اتنا فرمایا "ان هذا المسجد لا يبال فيه انما بنى لذكر الله و للصلوٰة" بیشک یہ مسجد ہے اس میں پیشاب نہیں کیا جاتا اس کو اس لئے تعمیر کی گئی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اور نماز پڑھی جائے۔

حدیث بالا سے جہاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کی ادائیں اور آپ کی تعلیم و تربیت کا اچھوتا نرالا من موہنہ انداز معلوم ہوتا ہے وہیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا میں قطعاً تحدید و تخصیص جائز و مناسب نہیں۔

(۲) "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ" میں، نا ضمیر جمع لانے کی دوسری وجہ یہ ہے حدیث شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ادعوا الله بالسنة ما عصيتموه بها" یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ایسی زبان سے دعا کرو جس سے تم نے نافرمانی نہ کی ہو، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کس کے پاس ایسی زبان ہے کہ اس زبان سے نافرمانی نہ ہوئی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "يدعو بعضكم لبعض" بعض، بعض کے لئے یا ایک دوسرے کے لئے دعا کرے کیونکہ تم نے دوسرے کی زبان سے نافرمانی نہیں کی ہے اور اس نے تمہاری زبان سے نافرمانی نہیں کی ہے۔ یہ اسی وقت ہوگا جب دعا عام ہو اس لئے "اِهْدِنَا" فرمایا۔

(۳) "اِهْدِنَا" کہنے میں گویا بندہ کو رب کی طرف سے یہ بشارت ہے اے میرے بندے! اول سورہ میں جس طرح تو نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا جو تمام حامدین کے حمد کو شامل ہے تو نے اَحْمَدُ اللّٰهَ نہ کہا جو صرف تیری حمد کو شامل ہوتا اس لئے وقت دعا بھی ان سارے حامدین کو شریک کر لے اور کہہ "اِهْدِنَا"۔

(۴) "اِهْدِنَا" میں جمع کی ضمیر کا ذکر کیا۔ اس وقت گویا بندہ کہتا ہے کہ اے میرے رب میں نے تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "الجامعة رحمة" اجتماعیت رحمت ہے "و الفرقة عذاب" اور فرقت و جدائیگی عذاب ہے اس لئے مولیٰ جب ہم نے تیری حمد و ثنا کا ارادہ کیا تو تمام حامدین کی حمد کے ساتھ حمد کیا یہی وجہ ہے کہ اَحْمَدُکی بجائے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا اسی طرح جب تیری عبادت کو ذکر کیا تو تمام عابدین کی عبادتوں کے ساتھ ذکر کیا اس لئے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" پڑھا اور جب استعانت ذکر کرنا ہوا تو مستعینین کی استعانت کے ساتھ ذکر کیا اور "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" پڑھا۔

پس جب حمد و ثنا اور عبادت و استعانت ہر موقع پر اجتماعیت کے ساتھ ادا کیا تو یقینی طور پر جب ہدایت طلب کیا تو سبھی

کے لئے ہدایت طلب کیا اور کہا "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اور جب صالحین کی اقتدا طلب کیا تو بھی جمیع صالحین کی اقتدا طلب کیا اور کہا "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" اسی طرح جب مردودان بارگاہ سے دوری و کنارہ کشی طلب کرنا ہوا تو جملہ مردودوں سے فرار طلب کیا اور کہا "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ" غرضیکہ جب ہم دنیا میں انبیا و صالحین اور اولیا و بزرگان دین سے الگ نہیں ہوئے تو قیامت و آخرت میں بھی تو ان نفوس قدسیہ اور مقبولان بارگاہ سے الگ نہ کریگا۔ تیرا ارشاد عالیشان ہے "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ" (نساء:۶۹)۔

فائدہ سوم: اہل ہندسہ اور ریاضی داں کہتے ہیں کہ خط مستقیم سب سے چھوٹا خط کہلاتا ہے جو دو نقطوں کے درمیان ملتا ہے پس اس اعتبار سے کہ خط مستقیم تمام خطوط غیر مستقیمہ معوجہ سے چھوٹا اور قصیر ہوتا ہے صراط مستقیم فرمانا کئی وجہوں سے بہتر ہے۔

اول: یہ کہ خط مستقیم، تمام خطوط میں سب سے چھوٹا اور اقرب ہوتا ہے لہذا ہم بندۂ عاجز کے لئے سب سے چھوٹا قریب والا ہی راستہ چاہئے وہ صراط مستقیم ہے۔

دوم: یہ کہ راہ مستقیم ایک ہے اور اس کے علاوہ تمام راستے تیڑھے میڑھے ہیں کجی میں سب ایک دوسرے کی طرح ہیں سب راستے ہم پر مشتبہ ہو گئے لیکن راہ مستقیم تو وہ سب سے الگ تھلگ، خوف و ہلاکت اور آفات و بلیات سے دور اور حفظ و امان سے زیادہ قریب ہے۔

سوم: یہ طریق مستقیم اپنے چلنے والے کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے لیکن غیر مستقیم پر چلنے والے کو راستہ ہی سے بھٹکا سکتا ہے تو منزل مقصود تک پہنچانا کہاں ضروری ہوا۔

چہارم: یہ کہ مستقیم متغیر نہیں ہوتا اور معوج و غیر مستقیم متغیر ہوتا رہتا ہے ان وجہوں سے صراط مستقیم پر چلنے کا سوال کرایا گیا۔

خلاصہ تفسیر بیضاوی: آیت "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی تفسیر میں قاضی بیضاوی نے طویل بحثیں کی ہیں ذیل میں انکی تفسیر کا خلاصہ مذکور ہے۔ قاضی صاحب نے "اِهْدِنَا" کا آیت سابقہ "نَسْتَعِيْنُ" سے پہلے ربط و تعلق دکھاتے ہوئے کہا ہے کہ آیت "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" ترکیب نحوی کے اعتبار سے جملہ مستانفہ ہو سکتی ہے اور جملہ مستقلہ بھی۔ اگر جملہ مستانفہ مانا جائے تو اس کی تقریر اس طرح ہوگی

کہ بندہ نے جب اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر رب تعالیٰ سے مدد طلب کی خواہ ادائے عبادت میں مدد طلبی ہو یا جمیع امور و مقاصد میں مدد طلب کی ہو تو اب گویا اللہ تعالیٰ بندہ سے سوال کر رہا ہے کہ اے میرے بندے میں تمہاری کس طرح مدد کروں پس بندہ نے کہا "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" یعنی اے اللہ ہمیں صراط مستقیم دکھا کر یا صراط مستقیم پر قائم رکھ کر میری مدد فرما۔ اس صورت میں صراط مستقیم معونت مطلوبہ کا بیان ہوگا اور جب ماقبل کا بیان ہے تو ماقبل کے جملہ کے ساتھ کمال اتصال ہوگا کیونکہ بیان کو مبین کے ساتھ کمال اتصال ہوتا ہے اور جہاں دو جملوں کے درمیان کمال اتصال ہوتا ہے وہاں حرف عطف "واؤ" نہیں لایا جاتا اس لئے نَسْتَعِیْنُ" کے بعد اور "اِهْدِنَا" کے پہلے واو نہیں ارشاد ہوا۔

اور اگر "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کو جملہ مستقلہ مانیں تو اس طرح تقریر ہوگی کہ بندہ نے نَسْتَعِیْنُ سے تمام مہمات و مقاصد میں رب تعالیٰ سے مدد طلب کر کے خبر دے دی کہ تمام امور میں لائق استعانت اللہ عزشانہ تعالیٰ کی ذات کریم ہے پھر "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مستقلاً اس چیز کو طلب کیا جو تمام مقاصد میں سب سے زیادہ مقصود اہم ہے اور وہ صراط مستقیم کی ہدایت ہے گویا ماقبل کا جملہ خبر ہے اور "اِهْدِنَا" انشاء ہے اور جب ایک جملہ خبر ہے اور دوسرا انشاء تو ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان کمال انقطاع ہوگا پس اس لئے دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف "واؤ" نہیں ارشاد ہوا۔

"اِهْدِنَا" ہدایت سے ماخوذ ہے ہدایت فعل ناقص باب ضرب سے "ھدیٰ یھدی" آتا ہے اصل وضع کے اعتبار سے ہدایت کو لام یا الیٰ کے ذریعہ متعدی ہونا چاہئے لیکن اس کے صلہ کو حذف کر کے فعل ھدیٰ کو براہ راست مفعول کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے جس طرح کہ ارشاد "وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ" میں کیا گیا ہے کہ اصل میں "وَاخْتَارَ مُوْسٰى مِنْ قَوْمَهٗ" تھا مگر "مِنْ" کو حذف کر کے فعل "اخْتَارَ" کو بلا واسطہ اس کے مفعول "قَوْمَهٗ" کی طرف متعدی کر دیا گیا۔

ہدایت کا لغوی معنی راستہ دکھلانا ہے اور اصطلاح میں لفظ ہدایت "دلالة بلطفٍ" کے معنی میں آتا ہے۔ دلالت راہ نمودن کو کہتے ہیں اور لطف "خلق ما یقرب العبد الی الطاعة من غیر الجاء" سے عبارت ہے یعنی لطف ان چیزوں کا پیدا کرنا جو بندے کو بلا جبر طاعت کے قریب کر دے اس اعتبار سے ہدایت کا معنی ہوگا، اسباب طاعت کو پیدا کر کے رہنمائی کرنا۔ اب وہ رہنمائی خواہ صرف راستہ دکھلانے تک ہو یا منزل مقصود تک پہنچانا ہو دونوں طرح کی راہنمائی پر ہدایت کا اطلاق درست ہے مگر یہ یاد رہے کہ ہدایت کا استعمال خیر ہی کے لئے ہوتا ہے شر یا برائی کے راستہ دکھلانے کو

ہدایت نہیں کہہ سکتے اور جہاں قرآن حکیم میں شر کی طرف راستہ دکھانے کو ہدایت سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے "فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ" وغیرہا آیت میں تو وہاں ہدایت کا معنی اصطلاحی نہیں مراد ہے بلکہ بطور تہکم واستہزاء استعمال ہوا ہے۔ جیسے بخیل کے لئے سخی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ "فَاهْدُوْهُمْ" (الخ) جیسی آیات میں ہدایت تقدیم کے معنی میں ہے یعنی جہنم کی طرف ان کو بڑھاؤ یا ہکاؤ۔ غرض کہ ہدایت کا معنی **دلالۃ الی اسباب الخیر** ہے پس اس وجہ سے کہ ہدایت کے معنی میں دلالت ملحوظ ہے **ھدیہ** اور **ھوادی الوحش** بھی ہدایت سے ماخوذ ہے ہدیہ تحفہ کو کہتے ہیں جو محبت کی دلیل سمجھی جاتی ہے اور **ھوادی الوحش** ان جانوروں کو کہتے ہیں جو وحشی ریوڑوں کے آگے آگے ہوتے ہیں جو پچھلے جانوروں کی سربراہی کرتے ہیں بھیڑ اور بکریوں کے ریوڑوں کو بارہا گذرتے دیکھا ہوگا جس میں اگلے جانور پچھلوں کی رہنمائی کرتے چلتے ہیں۔

ھدایت کے معنی میں علماء کا اختلاف: ہدایت کا معنی متعین کرنے میں معتزلہ اور اشاعرہ کا اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ہدایت ایصال الی المطلوب کا نام ہے یعنی منزل مقصود تک پہنچانا، اس معنی کے اعتبار سے ہدایت صرف ذات باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگی کیونکہ منزل مقصود تک پہنچانا صرف اسی کا خاصہ ہے لیکن اس معنی پر آیت کریمہ "وَ اَمَّا ثَمُوْد فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى" سے اعتراض وارد ہوتا ہے وہ اس طرح کہ آیت کا معنی یہ ہوتا ہے اور رہے ثمود تو ہم نے انہیں ہدایت دے دی پھر بھی انہوں نے ہدایت پر گمرہی کو اختیار کیا۔ آیت کے معنی سے واضح ہے کہ قوم ثمود کو اللہ تعالیٰ نے منزل مقصود تک پہنچادیا لیکن انہوں نے گمراہی کو اختیار کیا، اللہ رب العزت جیسی ذات کریم کسی کو ہدایت دے اور منزل مقصود تک پہنچادے پھر بھی وہ بہک جائے ناممکن ہے اس لئے ہدایت کا معنی صرف ایصال الی المطلوب مراد لینا صحیح نہیں۔

اشاعرہ کہتے ہیں کہ ہدایت کا معنی "اراءۃ الطریق" ہے یعنی منزل مقصود کے راستہ کا پتہ بتا دینا۔ ایصال الی المطلوب اور اراءۃ الطریق دونوں معنوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اول میں منزل تک پہنچنا لازم ہوتا ہے اور دوم میں منزل تک پہنچنا ضروری نہیں چونکہ جس راستہ کا پتہ بتایا گیا ہے جب اس راستہ ہی پر پہنچنا ضروری نہیں تو منزل تک پہنچنا کیونکر ضروری ہے چنانچہ بہت ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی اجنبی راہی مسافر کو راستہ بتادیتے ہیں کہ اس اس راستہ سے چلے جاؤ منزل تک پہنچ جاؤ گے وہ اجنبی بتائے راستہ کو بھول جاتا ہے اور دوسرے تیسرے راستہ کو اختیار کرلیتا ہے اس طرح وہ راستہ کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ جاتا ہے مگر منزل نہیں ملتی۔ غرض یہ کہ اراءۃ الطریق میں صرف راستہ دکھلانا ہوتا ہے منزل تک پہنچانا نہیں ہوتا اس لئے اس میں اندیشہ لگا رہتا ہے کہ چلنے والا کہیں راستہ سے ہی بھٹک نہ جائے۔

ہدایت کے اس معنی پر بھی آیت ''اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ'' سے اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ اراءۃ الطریق کی تقدیر پر آیت کا معنی ہوگا کہ آپ اپنے پیاروں کو ہدایت کا راستہ نہیں دکھلا سکتے۔ظاہر ہے کہ یہ معنی بعثت نبوت کے منشاء کے خلاف ہے کہ نبی کی بعثت کا مقصود اہم یہ ہے کہ اپنا پرایا خواہ کوئی ہو ہر کسی کو ہدایت کا راستہ دکھلائیں مگر اراءۃ الطریق کی تقدیر پر واضح ہے کہ ہدایت وارشاد سے روکا جارہا ہے۔اس لئے ہدایت کا معنی صرف اراءۃ الطریق لینا بھی صحیح نہیں۔

دونوں فرقوں نے اپنے اپنے نظریہ پر ہونے والے اعتراض کو یہ کہہ کر دفع کردیا کہ ''وَ اَمَّا ثَمُوْد فَھَدَیْنٰھُمْ'' میں ہدایت سے اراءۃ الطریق مراد ہے۔اور ''اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ''میں ہدایت سے ایصال الی المطلوب مراد ہے پس دونوں قول مذکور پر دونوں آیتوں سے اعتراض وارد نہ ہوگا۔مگر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایصال الی المطلوب کا قول کرنے والوں نے جو اراءۃ الطریق مراد لیا ہے اور اراءۃ الطریق کا قول کرنے والوں نے ایصال المطلوب مراد لیا ہے یہ مراد معنی حقیقی کے اعتبار سے ہے یا مجازی کے اعتبار سے۔اگر حقیقی کے اعتبار سے ہے تو لفظ ہدایت معنی واحد میں محدود ومحصور نہ رہا بلکہ ایصال واراءۃ کے درمیان مشترک ہوگیا جو موقف کے خلاف ہے اور اگر مجاز کے اعتبار سے ہے تو ہدایت کے معنی میں مجاز کا ارتکاب ہوا جو اصل کے خلاف ہے۔

اس قسم کے اعتراض سے بچنے کے لئے بعض محققین نے فرمایا کہ لفظ ہدایت دونوں معنوں میں مشترک ہے ایک ایصال الی المطلوب، دوسرے اراءۃ الطریق، اور ہدایت اگر مفعول دوم کی طرف بلا واسطہ متعدی ہو تو ایصال الی المطلوب مراد ہوگا جیسے ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ''اور لام والی وغیرہا کے واسطہ سے متعدی ہوگا تو اراءۃ الطریق مراد ہوگا جیسے ''اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ''مگر اس محاکمہ میں بھی نظر ہے کیونکہ قرآن حکیم کی بعض آیت کریمہ پر یہ محاکمہ صادق نہیں آتا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔''وَھَدَیْنَاہُ النَّجْدَیْنِ''یعنی ہم نے انسان کو خیر وشر کی دونوں راہ دکھلائی اس آیت کریمہ میں ہدایت بلا واسطہ مفعول دوم کی طرف متعدی ہے محاکمہ مذکورہ کے مطابق اس میں ایصال الی المطلوب مراد ہونا چاہئے جیسے حالانکہ ایصال الی المطلوب مراد نہیں ہے کیونکہ اس کے آگے ''فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَۃَ''ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہدایت دینے کے بعد بھی انسان اسلام کی گھاٹی میں داخل نہ ہوسکا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ایصال الی المطلوب مراد نہیں ہے ورنہ انسان گھاٹی اسلام میں ضرور داخل ہوجاتا۔ اسی طرح دوسری آیت ''اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيْمٍ ''میں دوسرا والا ''يَهْدِيْ'' بواسطہ ''اِلیٰ'' متعدی ہے، محاکمہ مذکورہ کے مطابق یہاں اراءۃ الطریق مراد ہونا چاہئے حالانکہ ایصال الی المطلوب مراد ہے کیونکہ اللہ عزشانہ تعالیٰ لفظ لٰکِنَّ سے اپنے لئے اس ہدایت کو خاص فرمایا جس ہدایت کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی فرمائی ہے اور یہ متفق علیہ ہے کہ ''اِنَّکَ لَا تَهْدِيْ'' میں ایصال الی المطلوب کی نفی ہے اور جب سابق میں ایصال الی المطلوب کی نفی ہے تو لٰکِنَّ کے بعد اس کا اثبات ہوگا لہٰذا ''يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ'' میں ایصال الی المطلوب متعین ہے جب کہ وہ اِلیٰ کے واسطہ سے متعدی ہے پس بعض محققین کا محاکمہ مذکورہ دونوں آیتوں کی روشنی میں محل نظر ہوگیا غرضیکہ ہدایت کے معنی کے بیان میں کوئی قول خدشہ سے خالی نہیں ہدایت کا ایک معنی ایصال الی المطلوب مراد لیں یا اراءۃ الطریق مانیں یا پھر دونوں کے درمیان مشترک بہرحال حقیقت ومجاز کا قول کہیں نہ کہیں کرنا ہوگا۔

ھدایت کے اقسام: اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی بیشمار قسمیں ہیں کوئی اس کا احاطہ نہیں کرسکتا البتہ اجناس کے اعتبار سے ترتیب وار چار قسمیں ہوسکتی ہیں۔یعنی مقصود کی طرف ایصال کے اعتبار سے چار صورتیں ہیں۔

(۱) ہدایت کا سب سے پہلا مرتبہ بندہ پر ان قوتوں کا فیضان کرنا ہے جن کے ذریعہ بندہ اپنے مصالح کو سمجھنے پر قادر ہوسکے جیسے قوت عقلیہ اور حواس ظاہرہ وباطنہ کا فیضان الٰہی۔

(۲) ہدایت کا دوسرا مرتبہ ان دلائل کا قائم کرنا ہے جو مصالح ومفاسد اور حق وباطل کے درمیان امتیاز پیدا کریں یعنی حق وباطل کے درمیان اعتقادی اعتبار سے اور صلاح وفساد کے درمیان عملی اعتبار سے ممتاز کردے قرآن حکیم میں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اسی کی طرف اپنے ارشاد پاک ''وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ'' اور ''فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى'' میں اشارہ فرمایا کیونکہ ''هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ'' کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے انسان کو خیر وشر دونوں راستے کی ہدایت کردی یعنی ایسے دلائل قائم فرمادیئے جو خیر وشر کے درمیان کامل امتیاز کرنے والے ہیں، اسی طرح ''فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى'' کی تفسیر قاضی بیضای نے بایں طور کی ہے ''**فدللناھم علی طریق الحق بالحجج وارسال الرسل**'' یعنی ہم نے قوم ثمود کو اس طرح ہدایت دی کہ دلائل عقلیہ قائم کردیئے اور رسولوں کو بھیجا۔

(۳) ہدایت کا تیسرا مرتبہ انبیاومرسلین کی بعثت اور کتب الٰہیہ کا نزول ہے۔چونکہ اسلامیات کے باب میں خصوصاً مبدأ ومعاد سے متعلق عقائد کے بیان میں بہت ایسے امور ہیں جن کا ادراک عقل کو نہیں ہوسکتا اس لئے حضرات انبیائے کرام ورسولان عظام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور اپنی مقدس کتابیں نازل فرمائی تاکہ عقل جس امر کی حقانیت و

بطلان اور صحت وفساد کو سمجھنے سے قاصر ہو حضرات انبیاے کرام اور کتب الٰہیہ ان کی صحیح سمت کی رہنمائی کر دیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا" یعنی اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی راہ نمائی کرتے ہیں (سورہ سجدہ آیت ۲۴) اور ارشاد ہے "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ" یعنی بیشک یہ قرآن اس (راستے) کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ (بنی اسرائیل:۹) آیت اولیٰ میں ہدایت بذریعہ رسل کی طرف اشارہ ہے جب کہ آیت دوم میں ہدایت بذریعہ قرآن کی طرف واضح الدلالہ ہے۔

(۴) ہدایت کا چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ اپنے محبوب و برگزیدہ بندوں کے قلوب پر اسرار و رموز کی باتیں آشکارا فرمادے اور ان کو اشیاء کی حقیقتیں دکھادے اب ان رموز سربستہ کا اظہار اور حقائق اشیاء کا انکشاف خواہ وحی کے ذریعہ ہو یا الہام اور رویاے صادقہ کے ذریعہ ہو ان میں سے کسی ذریعہ سے ہوسکتا ہے مگر ایسی اعلیٰ درجہ کی ہدایت ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتی بلکہ ہدایت کا یہ مرتبہ حضرات انبیاے کرام اور اولیاے عظام کے ساتھ مخصوص ہے۔ حضرات انبیاے کرام کو وحی، الہام اور رویاے صادقہ تینوں طرق سے انکشاف حقائق ہوسکتا ہے اور اولیائے کرام کو وحی کے سوا الہام اور رویائے صادقہ کے ذریعہ انکشاف ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ" (سورہ انعام:۹۰) یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو۔ اور "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ (عنکبوت ۶۹) ہدایت کے اسی مرتبہ چہارم کی طرف اشارہ ہے۔

اعتراض: ہدایت کے چاروں مراتب جاننے سے وہ اعتراض بھی دفع ہوجاتا ہے جو پہلے کیا گیا کہ بندہ جب پہلے سے ہی ہدایت یافتہ ہے تو پھر "اِهْدِنَا" ہمیں ہدایت دے کا کیا مطلب!

جواب: کا حاصل یہ ہے ہدایت کی طلب سے مراد زیادتی ہدایت ہے یعنی بندہ ہدایت کی جس منزل پر اس وقت ہے اس سے مزید بالائی منزل پر پہنچنے کا خواستگار ہے پس اگر وہ ہدایت کے پہلے مرتبہ پر ہے تو اِهْدِنَا سے ہدایت کے دوسرے مرتبہ پر پہنچنے کا طلبگار ہے۔ دوسرے مرتبہ پر ہے تو تیسرے کا خواستگار ہے اور تیسرے پر ہے تو ہدایت کی چوتھی اور آخری منزل پر پہنچنے کی دعا کر رہا ہے اور اگر چوتھے مرتبہ والا اِهْدِنَا کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس مرتبہ پر ثبات قدمی کی دعا کر رہا ہے۔

پس جب عارف باللہ واصل الی الحق جیسے نفوس قدسیہ "اِهْدِنَا" کہتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے "خدایا مجھے سیر فی

اللہ'' کی راہ پر لگا دے تا کہ ہم سے ہمارے اعمال کی تاریکیاں محو ہو جائیں اور ہمارے جسمانی حجابات اور بدنی کثافتیں ختم ہو جائیں تا کہ ہم تیرے نور قدس سے روشنی حاصل کریں اور تجھے دیکھیں تو تیرے ہی نور سے دیکھیں۔ صوفیہ کی زبان میں اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک کو سیر الی اللہ، کہتے ہیں اور دوسری کو سیر فی اللہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

سیر فی اللہ: اللہ تعالیٰ کی صفات جمال و جلال میں منہمک ہونا سیر فی اللہ ہے۔ یعنی اللہ عز شانہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جتنی قوتیں عطا کی ہیں ان میں سے ہر ایک قوت کے اندر صفات الہیہ کی تجلیات میں سے کسی نہ کسی صفت کی تجلی کا ظہور ہو پس صفات الہیہ میں منہمک ہونے کا معنی یہ ہے کہ بندہ کی ان قوتوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات تجلیات کا اظہار ہو۔

سیر الی اللہ، اور سیر فی اللہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ سیر الی اللہ متناہی ہے اور سیر فی اللہ غیر متناہی ہے، سیر الی اللہ کا منتہا وصول ہے کیونکہ وصول فنا عن مشاہدۃ الغیر کا نام ہے یعنی غیر کے مشاہدہ سے بالکل صرف نظر کر لیا جائے بلکہ غیر کو معدوم سمجھتا ہو چنانچہ ابن عربی نے کہا ''**من شهد الخلق لا فعل لهم فقد فاز و من شهد الخلق لا حيوة لهم فقد جاز و من شهد الخلق عين العدم فقد وصل و هذا مرتبة عين اليقين و عندهذا يتم السير الى الله**'' یعنی جس نے مخلوق پر اس حیثیت سے نظر ڈالی کہ اس کو کسی فعل کا فاعل ہی نہیں سمجھا بلکہ سارے افعال کا اللہ سے صادر ہونا سمجھا تو وہ درجہ کامرانی کو پہنچ گیا۔ اور جس شخص نے مخلوق پر اس حیثیت سے نظر ڈالی کہ اس کو موجود تو سمجھتا ہے مگر اس کی حیات کو حیات نہیں سمجھتا تو وہ پہلے مرتبہ سے تجاوز کر گیا اور جو مخلوق کو عین عدم سمجھا تو وہ درجہ وصول پر فائز ہو گیا اور یہ مرتبہ عین الیقین کا ہے اس مقام پر سیر الی اللہ کی انتہا ہو جاتی ہے اور سیر فی اللہ کا آغاز ہوتا ہے غرض سیر الی اللہ کا جو منتہا ہے وہ سیر فی اللہ کا مبدأ ہوتا ہے اور سیر فی اللہ غیر متناہی ہے کہ سیر فی اللہ صفات الہیہ میں غرق ہو جانے کو کہتے ہیں اور صفات الہیہ غیر متناہی ہیں اس لئے سیر فی اللہ بھی غیر متناہی ہو گی۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھئے کہ جب کوئی عارف واصل ''اِهْدِنَا'' کہتا ہے تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ ہمیں سیر الی اللہ سے بالاتر سیر فی اللہ کی ہدایت فرما تا کہ ہم سے ہمارے احوال کی تاریکیاں چھٹ جائیں اور حجابات دور ہو جائیں اور ہم تیری پاکیزگی کے نور سے ایسا روشن و منور ہو جائیں کہ تیرے نور سے صرف تجھی کو دیکھیں اور تیرے اوصاف کی تجلیات میں ایسا گم ہو جائیں کہ اس بشارت کے مصداق ہو جائیں جو تو نے ارشاد فرمایا کہ بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے

قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے ایسی محبت کرتا ہوں کہ اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں، میں اس کا کان ہو جاتا ہوں اور میں اس کی نگاہ ہو جاتا ہوں پس وہ کوئی چیز پکڑتا ہے تو میرے ہاتھ سے پکڑتا ہے، سنتا ہے تو میری سماعت سے سنتا ہے اور دیکھتا ہے تو میری نگاہ سے دیکھتا ہے مختصر یہ کہ مومن ہدایت یافتہ کا ''اِهْدِنَا'' کہنا تحصیل حاصل نہیں بلکہ اس میں بیشمار بھلائیاں مضمر ہیں۔

واقعہ علقمہ: یہی شبہ حضرت علقمہ کو ہو گیا تھا اس سے متاثر ہو کر وہ مرتد ہو گئے تھے حضرت مولا علی مشکل کشا نے مشکل کشائی فرمائی جس سے ان کا وسوسہ زائل ہوا اور دوبارہ مشرف بہ اسلام ہوئے ذیل میں ہم ان کا پورا واقعہ علامہ سید محمد شاہ قطب الدین کی تفسیر سورہ فاتحہ سے نقل کر رہے ہیں۔

''ایک صحابی علقمہ کو یہ وسوسہ گذرا کہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ''مسلمان دعا کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کو اپنے دین کے سچے سیدھے ہونے کا یقین نہیں ہے۔ ایسے دین میں جس کے متعلق خود اس کے پیرو تک یقین نہیں رکھتے ہیں میں رہنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ وہ مرتد ہو گئے اور روم کے عیسائیوں میں جا ملے۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کا دور تھا۔ حضرت ابوبکر نے باب العلم سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے خواہش کی کہ آپ علقمہ کے اس شک اور وسوسہ کو حل فرمائیے۔ ''مظهر العجائب والغرائب'' نے علقمہ کے نام ایک خط لکھا جس کی ابتدا یوں فرمائی ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۙ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ'' (المومن:۱) یعنی اس خط کو اس ہستی کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن اور رحیم ہے۔ یہ کتاب (قرآن) نازل فرمائی گئی اس اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو غالب ہے اور ہر چیز کا جاننے والا اور گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ سخت سزا دینے والا ہے۔ اور قدرت والا ہے اس کے بعد مشکل کشا نے علقمہ کی یوں عقدہ کشائی فرمائی کہ ''اِهْدِنَا ''کے معنی ہم کو ثابت قدم رکھ اور انبیا کے طریقہ پر رہنے کے لئے ہمارے دلوں کی حفاظت فرما کے ہیں۔ یہ خط لکھ کر حضرت مولیٰ علی نے حضرت ابوبکر کے پاس بھیج دیا۔ حضرت ابوبکر نے من وعن اس خط کو سرکاری آدمی کے ذریعہ علقمہ کے پاس روم روانہ کر دیا۔ علقمہ اس وقت گرجا میں مصروف بہ عبادت تھے۔ جب فارغ ہوئے تو قاصد نے خط حوالے کیا جس کو علقمہ نے پڑھا اور رو پڑے اور کہنے لگے ''ایسے خدا کی نافرمانی کس طرح کی جائے جو ایک بار ڈراتا ہے تو تین بار قصور معاف کرنے کا وعدہ فرماتا ہے۔ علقمہ دوبارہ مشرف با اسلام ہوئے یہ واقعہ اس آیت کی تشریح کے لئے کافی ہے ''اِهْدِنَا ''استعانت عطا کرنے کے لئے دعا ہے جیسے ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ

اِذْ هَدَیْتَنَا'' کا مفہوم ہے۔اشیاے عالم (جوان کے لئے بنائے گئے ہیں) کوحسب ضرورت اور بہ طریقہ جائز استعمال کرکے یا انسان اپنے اسباب معیشت فراہم کرکے پھر حقوق العباد اور حقوق اللہ کی تکمیل کرے تو ساری زندگی کا شمار عبادت میں ہوگا جو مقصود آفرینش ہے۔جس کے بعد ہی رضوان حق نصیب ہوتا ہے۔جو عبد کی منزل مقصود ہے''۔

صراط: صراط صاد کے ساتھ، اصل میں سراط سین سے تھا اس لئے کہ اس کا ماضی ''سرط'' سین کے ساتھ آتا ہے مگر سین کو صاد سے بدل دیا گیا ہے۔ابدال کی وجہ یہ ہے کہ، طا حروف مہجورہ مستعلیہ میں سے ہے جب کہ سین حروف مہموسہ مخفضہ میں سے ہے اور دونوں طرح کی صفات کے درمیان تضاد ظاہر ہے گویا دونوں کی صفات متضادہ ہیں لہٰذا ان کا جمع ہونا موجب ثقل ہے اس لئے صاد کو سین سے بدل دیا کیونکہ صاد کو طاء اور سین دونوں سے مناسبت حاصل ہے طاء سے حروف مطبقہ ہونے میں اور سین سے مہموسہ ہونے میں مناسبت ہے بعض حضرات صاد سے بدلنے کے بعد اشمام کا بھی قول کرتے ہیں۔اصطلاح میں ایک حروف کو دوسرے حروف کے ساتھ ملانے کا نام اشمام ہے اس مقام پر صاد کو زاء کے ساتھ یہ ملا دیتا ہے۔اس کی ادائیگی اس طور پر ہوگی کہ ہونٹوں کے درمیان کشادگی رکھ کر ان کو ملنے نہ دیا جائے رہا یہ کہ زاء کی آواز کا اشمام کیوں کیا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے تاکہ صاد اپنے مبدل منہ سے زیادہ قریب ہوجائے چونکہ سین اور زاء منخفضہ اور منفتحہ میں سے ہے اور صاد مستعلیہ مطبقہ میں سے ہے پس جب صاد کے اندر زاء کی آواز کا اشمام ہوگا تو صاد قریب سے اقرب الی سین ہوجائے گا۔اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''صراط'' میں تین حالتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) حالت اصلیہ سین کے ساتھ: سراط ہو

(۲) حالت منقلبہ صاد کے ساتھ: صراط ہو

(۳) حالت بالاشمام یعنی صاد کے ساتھ زاء کی آواز ملانا۔

چنانچہ قاضی بیضاوی نے کہا کہ قنبل سے روایت ہے کہ ابن کثیر نے اصل یعنی سین کے ساتھ پڑھا ہے اور رویس نے یعقوب سے بھی ایسا ہی روایت کیا ہے۔البتہ حمزہ نے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے۔اس کے علاوہ باقی قراء نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی قریش کی بھی لغت ہے جو صحیفہ عثمانی میں مرقوم ہے۔

سراط: سراط الطعام سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کہ کھانے کو نگل لے، سراط کو سراط اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ قافلہ کو نگل جاتا ہے اور اس کو لقم بھی کہتے ہیں کہ وہ راہگیروں کو لقمہ بنالیتا ہے۔سراط واحد ہے اس کی جمع سرط آتی ہے جیسے کتاب کی جمع کتب آتی ہے لفظ سراط مذکر و مؤنث دونوں طریقے پر مستعمل ہے۔

صراط مستقیم: سے مراد کے بارے میں مفسرین کے دوقول ہیں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ طریق حق مراد ہے اس اعتبار سے حضرات انبیاے سابقین اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے طریق کو شامل اور عام ہوگا، اس کے برعکس بعض کا قول ہے کہ خاص کر ملت اسلام مراد ہے۔ مگر قاضی بیضاوی کے نزدیک خاص ملت اسلام مراد لینا ضعیف ہے اس لئے انہوں نے "وقیل ھو ملۃ الاسلام" سے تعبیر کیا ہے تاکہ اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ ہو وجہ ضعف یہ ہے کہ بعد کی آیت "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" صراط مستقیم سے بدل کل ہے اور یہ قرآن سے ثابت کہ جن پر رب تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوا ہے وہ نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں پس جب الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے انبیا، صدیقین اور صالحین مراد ہوں گے تو صراط مستقیم سے خاص ملت اسلام مراد لینا درست نہ ہوگا کیونکہ صراط مستقیم مبدل منہ خاص ہوجائے گا اور بدل عام ہے اور یہ معلوم کہ عام، خاص کا بدل الکل نہیں ہوسکتا کیونکہ بدل الکل اور مبدل منہ ذاتا ومصداقا متحد ہوتے ہیں۔

فصل ہشتم: تفسیر قولہ تعالیٰ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا)

ارشاد کریم "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" صراط مستقیم سے بدل الکل ہے بدل الکل اس تابع کو کہتے ہیں جو مقصود بالنسبۃ ہو اس کا مفہوم بعینہ متبوع کا مفہوم ہوتا ہے اور یہ حکم میں تکرار عامل کے ہوتا ہے لیکن بدل الکل ماننے کی تقدیر پر ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ جب بدل الکل اپنے مبدل منہ کے مفہوم اور ذات میں متحد ہوتا ہے تو "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" اور صراط مستقیم دونوں ذات ومفہوم کے اعتبار سے متحد ہوگئے لہٰذا دونوں میں سے ایک بے فائدہ رہا لہٰذا "صراط مستقیم" ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، استقلالا "اِھْدِنَا صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" ذکر ہونا چاہئے۔ اس اشکال کا جواب قاضی بیضاوی نے بایں الفاظ دیا ہے۔ "وفائدتہ التوکید والتنصیص" (الخ) جواب کا حاصل یہ ہے کہ "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" کو بدل بنا کر ذکر کرنے میں دو فائدہ ہے۔ اول تاکید، دوم تنصیص تاکید کی وجہ یہ ہے کہ بدل مقصود بالنسبۃ ہوتا ہے یعنی جس فعل کی نسبت اس کے متبوع کی طرف کی گئی ہے مقصود اس کی طرف کرنا نہیں ہوتا بلکہ مقصود بدل کی طرف ہوتا ہے پس جب مقصود بدل ہوتا ہے تو نسبت براہ راست فعل کی اسی طرف ہونی چاہے اور براہ راست نسبت اسی وقت ہوگی جب فعل مکرر ہو کیونکہ نسبت فعل کا مدلول تضمنی ہے۔ اور جب فعل مکرر ہوگیا تو تاکید حاصل ہوگئی۔

دوسرا فائدہ تنصیص کا ہے تنصیص ،صراحۃ بیان کرنے کو کہتے ہیں گویا صراحۃً اس بات کو بیان کرنا ہے کہ اہل ایمان ہی کا راستہ مشہود بالاستقامۃ ہے اور یہ تنصیص وتصریح بڑے ہی بلیغ اور موکد انداز میں ارشاد ہوا ہے اور وہ اس طرح کہ مبدل منہ کبھی مبہم ہوتا ہے مگر بدل کو ذکر کر کے اس کے ابہام کو دور کر دیا جاتا ہے تب مبدل منہ واضح ہوجاتا ہے جب مبدل منہ بدل کی وجہ سے واضح اور روشن ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ بدل، مبدل منہ سے زیادہ واضح اور روشن ہوگا اور لوگوں کے نزدیک معروف ومشہور بھی ہوگا۔ جیسے آیت کریمہ ”فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى“ تو شیطان نے اس وسوسہ دیا، بولا اے آدم! کیا میں تمھیں بتادوں ہمیشہ جینے کا پیڑ اور وہ بادشاہی کہ پرانی نہ پڑے (طٰہٰ/120) میں جو وسوسہ مذکور ہے اس میں ابہام تھا کہ کس چیز کا وسوسہ ڈالا اور کیا کہا تو اس ابہام وخفا کو اس کے بدل یعنی ”قَالَ يٰٓاٰدَمُ“ (الخ) نے دور کر دیا اور شیطان نے جس طرح وسوسہ ڈالا تھا اس کو واضح کر دیا، اسی طرح صراط مستقیم میں ابہام تھا کہ صراط مستقیم کیا ہے تو اس ابہام کو اس کے بدل ”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ نے دور کر دیا غرض کہ ”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ صراط مستقیم کا بیان اور اس کی تفسیر ہے۔ اور بیان وتفسیر کا واضح وروشن ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے اور نیز یہ معلوم کہ مفسر کے اندر مفسر کا معنی ملحوظ ہوتا ہے پس اس لئے ”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ اپنے بدل صراط مستقیم سے جہاں زیادہ روشن وواضح ہوگا وہیں اس کے اندر صراط مستقیم کا معنی بھی ملحوظ ہے۔ لہٰذا ”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ میں معنی استقامت ملحوظ ہوگا پس جب بدل میں مبدل منہ کا معنی استقامت ملحوظ ہے تو معنی یہ ہوگا کہ طریق مومنین جو منعم علیہ ہے وہی مشہود بالاستقامۃ ہے مختصر یہ کہ ”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ میں مشہود بالاستقامۃ پر تصریح وتنصیص ہے۔

”اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ سے کون مراد ہیں؟ اس بارے میں تین اقوال ہیں۔

پہلا قول: جمہور مفسرین کا ہے۔ ان کے نزدیک ”اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ سے حضرات انبیاے کرام، صدیقین، شہداے اسلام اور صالحین مراد ہیں اس کی تائید قرآن حکیم کی آیت اور حدیث پاک سے ہوتی ہے آیت کریمہ میں صراحتاً ارشاد ہے ”فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ“ آیت متلوہ میں انہیں چار قسم کے لوگوں کو منعم علیہم فرمایا ہے اس لئے ”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ میں بھی وہی چار قسم کے لوگ مراد ہوں گے کہ قرآن کا بعض، بعض کی تفسیر ہوتا ہے۔

حدیث میں وارد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ کے بارے میں ارشاد فرمایا ”ھم

الملئکۃ و الصدیقون و الشھداء و من اطاعھم ''یعنی مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ ، ملائکہ، صدیقین، شہداء اوران کی اطاعت کرنے والے صالحین ہیں۔

مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ میں جب ملائکہ، صدیقین اور شہداء وصالحین داخل ہیں تو حضرات انبیاے کرام بدرجہ اولیٰ داخل ہونگے ۔غرض حدیث پاک سے بھی یہی ظاہر ہے کہ مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ سے یہی چار قسم کے لوگ مراد ہیں۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِم سے حضرات انبیاے کرام مراد ہیں انکا طریق استدلال یہ ہے کہ یہاں مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ مطلق ذکر کیا گیا ہے اور جب مطلق ذکر ہوتا ہے تو اس کا فرد کامل مراد ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ حضرات انبیاے کرام کی جماعت مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ کے جملہ افراد میں، افراد کاملہ ہیں۔

تیسرا قول: یہ ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِم سے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیھما السلام کے وہ اصحاب مراد ہیں جو تحریف ونسخ سے پہلے تھے۔اس قول کی دلیل یہ ہے کہ ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ''، میں مغضوب وضالین سے مراد وہ نصاریٰ اور یہود ہیں جو تحریف ونسخ کے بعد تھے اور جب مَغْضُوْبُ عَلَیْھِمْ اور ضَالِّیْن سے نسخ و تحریف کے بعد والے یہود ونصاریٰ مراد ہیں تو ان کے بالمقابل ''اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِم'' سے وہ یہود ونصاریٰ مراد ہوں گے جو نسخ وتحریف سے قبل تھے۔

مندرجہ بالا ان تینوں اقوال میں قول اول ہی زیادہ راجح ،قوی اور قرآن وحدیث کے مطابق ہے اس لئے جمہور مفسرین نے اسی کو پسند فرمایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ''اَنْعَمْتَ عَلَیْھِم ''انعام سے ماخوذ ہے اور انعام تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اول ''معنی ایصال النعمۃ''، یعنی نعمت کا پہنچانا، دوم آنکھ روشن کرنا اور سوم نعم کہنے کے معنی میں آتا ہے۔بعض لوگوں نے انعام کا ''معنی ایصال الاحسان الی العقلاء''، یعنی عقلا کے ساتھ بھلائی کرنا بیان کیا ہے اسی سے نعمۃ نرمی کرنے کے معنی میں آتا ہے اور جلد ناعم نرم کھال کو کہتے ہیں اور اسی لفظ نعمۃ بالفتح سے نعمۃ بالکسر ماخوذ ہے چونکہ یہ فعلۃ کے وزن پر ہے اور فعلۃ کا وزن کیفیت وحالت کے بیان کے لئے آتا ہے اس لئے اصل وضع کے اعتبار سے نعمت کے معنی وہ حالت ہے جس کو انسان لذیذ محسوس کرتا ہے چنانچہ قاضی بیضاوی نے کہا ''و الانعام ایصال النعمۃ و ھی فی الاصل الحالۃ التی یستلذ بھا الانسان''، پھر مجاز انعمت کا اطلاق اس چیز پر ہونے لگا جس سے انسان لذت حاصل کرتا ہے جیسے مطعومات ومشروبات وغیرہ۔

نعمت کے مفہوم کو جاننے کے بعد اب یہ معلوم کرنا ہے کہ ارشاد "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِم "میں جس نعمت کا ذکر ہے اس سے کونسی نعمت مراد ہے اس کے لئے نعمتوں کے اقسام کا جاننا ضروری ہے۔ یاد رہے اللہ عزشانہ کی نعمتیں ان گنت بیشمار ہیں کوئی شمار نہیں کرسکتا ارشاد رب العالمین ہے "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" یعنی اگر اللہ کی نعمتوں کو تم شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کرسکتے پس زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنسی اعتبار سے نعمت کی دو قسمیں ہیں۔

(۱)دنیوی (۲)اخروی

دنیوی نعمت سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو اس دنیا میں ہم کو حاصل ہیں اور اخروی نعمت سے مراد وہ نعمتیں جو اہل ایمان کو آخرت میں ملیں گی پھر دنیوی کی دو قسمیں ہیں۔

(۱)موھبی (۲)کسبی

موہبی نعمت وہ ہیں جس میں بندہ کے کسب کو کچھ دخل نہ ہو اور کسبی نعمت وہ ہے جو بندہ اپنے کسب سے حاصل کرتا ہے پھر موہبی نعمت کی دو قسمیں ہیں۔

(۱)روحانی (۲)جسمانی

روحانی نعمت میں بندہ کے اندر روح کا پھونکنا اور پھر عقل دیکر اس روح کو صیقل و منور کرنا اور عقل دینے کے بعد بندہ میں قوت فہم، قوت فکر، اور قوت نطق ودیعت کرنا شامل ہے۔

عقل اس قوت کا نام ہے جو من جانب اللہ کلیات کے ادراک کے لئے نفس انسانی میں ودیعت ہوتی ہے جس کو عقل جیسی بے بہا دولت حاصل ہوجاتی ہے اس کو تین چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ فہم، فکر اور نطق، مبادی سے مطلوب کی طرف جلدی منتقل ہوجانا فہم ہے اور نفس سے ذہول شدہ چیزوں کو جان لینا فکر ہے رہا نطق تو مافی الضمیر کو تعبیر کرنے کا نام ہے یہ تینوں قوتیں وہبی ہیں چنانچہ حضرت قاضی بیضاوی نے ان مثالوں کو موہبی میں ذکر کیا ہے مگر ان تینوں اسماء کا اطلاق کسبی پر بھی ہوتا ہے چنانچہ کلمات کا ادراک کرنا نطق کہلاتا ہے۔ اس لئے نفس کو نفس ناطقہ کہتے ہیں یعنی ادراک کرنے والا نفس۔ اسی طرح کلیات مدرکہ کو ترتیب دیکر مجہولات کو حاصل کرنا فکر کہلاتا ہے اس لئے اسے قوت مفکرہ کہتے ہیں۔ اور ترتیب دیکر جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان کو جاننا فہم کہلاتا ہے غرضیکہ نطق وفکر اور فہم کا اطلاق موہبی و کسبی دونوں پر ہوتا ہے مگر الگ معنو ں کے ساتھ، موہبی نعمت کی دو قسموں میں روحانی نعمت کی قدرے تفصیل گذری اب رہی دوسری قسم یعنی جسمانی نعمت تو یہ بھی وہبی وعطائی ہے چنانچہ بدن کو پیدا کرنا، اور ان قوتوں کو پیدا کرنا جو بدن میں حلول کی ہوئی ہوتی ہیں جیسے قوت ذائقہ،

قوت لامسہ، قوت شامہ، قوت باصرہ اور قوت سامعہ اور ان کیفیات کا پیدا کرنا جو بدن کو عارض ہوتی ہیں مثلاً صحت اور اعضاء کا صحیح وسالم ہونا وغیرہ موہبی کی مثالیں ہیں اس کے برعکس نفس کو رذائل سے پاک کرنا، اخلاق حسنہ سے مزین و آراستہ کرنا، عمدہ صلاحیتوں سے مالا مال ہونا، اور بدن کو اچھے اور خوبصورت کمالات کے زیور سے زینت دینا، مال ومتاع اور جاہ ومرتبہ حاصل کرنا وغیرہ کسبی کی مثالیں ہیں جن سب کا تعلق دنیوی نعمتوں سے ہے۔

رہی اخروی نعمتیں تو اس کی بھی انتہا نہیں جب رب کی ایک رحمت سے دنیا کی ان گنت نعمتیں ظہور پذیر ہوئیں تو آخرت میں تو اس کی ننانوے رحمتوں کا ظہور ہوگا اس وقت اس کی ننانوے نعمتوں کا کوئی اندازہ وشمار نہیں کرسکتا ہے مختصر یہ کہ اس کے احکام کی بجا آوری میں بندہ سے جو افراط وتفریط واقع ہوجائے وہ اپنی شان کریمی سے اسے بخش دیگا اس سے راضی ہوگا اور اس کو اعلیٰ علیین میں ہمیشہ ہمیش کے لئے جگہ دیگا اسی وجہ سے بعض لوگوں نے کہا کہ آخرت کی تمام نعمتیں وہبی ہیں کسی کو کسبی کہنا صحیح نہیں کہ آخرت کی نعمتوں کے حصول میں بندہ کے کسب کو دخل نہیں بلکہ سب صرف اور صرف رب تعالیٰ کے فضل واحسان سے ہوگی حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام سے فرمایا ''اَلَا لن ینجی منکم احد بعمله'' سن لو تم میں سے کوئی اپنے عمل کی بدولت نجات نہیں پائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اعمال نجات ومغفرت کے لئے علت نہیں ہیں بلکہ وہ صرف رب تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہوگا غرض نعم اخروی سب وہبی ہیں اس کے برعکس کچھ لوگوں نے نعم دنیوی کی طرح نعم اخروی کی بھی تفصیل کی ہے چنانچہ انہوں نے کہا کہ نعم اخروی وہبی ہونگی یا کسبی وہبی کی مثال مغفرت اور عفو باری تعالیٰ ہے کسبی کی مثال جزاء اعمال ہے پھر کسبی کی دو قسمیں ہیں روحانی، جسمانی، روحانی جیسے رضاء الٰہی، جسمانی جیسے جنت اور اس کی نعمتیں ''اَنْعَمْتَ عَلَیْهِم'' میں نعمت سے مراد نعم اخروی اور اس کے وسائل ہیں وسائل سے مراد وہ دنیوی نعمتیں جو اخروی نعمتوں کے لئے وسیلہ وذریعہ بنیں۔

اَنْعَمْتَ عَلَیْهِم کی تفسیر میں تفسیر رازی نے اولاً نعمت کی تعریف کی ہے پھر اس پر فوائد متفرع فرمائے ہیں ذیل میں ان کی تفسیر کا خلاصہ پیش ہے۔

فائدہ اول:

نعمت کی تعریف: نعمت کی تعریف میں اختلاف ہے بعض نے کہا۔ ''انها عبا رة عن المنفعة المفعولة علیٰ جهة الاحسان الی الغیر'' یعنی نعمت یعنی نعمت اس منفعت کو کہتے ہیں جو غیر کی طرف بطور احسان کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف بعض لوگوں نے منفعت کو حسنہ کی قید سے مقید کرکے بایں الفاظ تعریف کیا ہے۔

"المنفعة الحسنة المفعولة علیٰ جهة الاحسان الی الغیر" یعنی نعمت اس منفعت حسنہ کا نام ہے جو غیر کی طرف بطور احسان کی جاتی ہے۔ ان حضرات نے حسنہ کی قید اس لئے لگائی ہے کہ منفعت پہنچانے والا اس کے سبب شکر کا مستحق ہوتا ہے اگر نعمت، حسنہ نہ ہو کر قبیحہ ہو تو وہ شکر کا مستحق نہیں ہوگا۔ اس مقام پر حضرت رازی نے کہا ہے کہ حق یہ ہے کہ حسنہ کی قید غیر معتبر ہے۔ کیونکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی احسان کے سبب شکر کا مستحق ہو اگر چہ اس کا فعل محظور ہو اس لئے کہ شکر کے مستحق ہونے کی جہت، ذنب وعقاب کی جہت سے مختلف ہوسکتی ہے۔ پس شکر وعقاب کے اجتماع میں استحالہ نہیں ہے۔ جیسے کہ فاسق کسی پر احسان کرتا ہے تو انعام واکرام کے سبب وہ شکر کا مستحق ہے لیکن چونکہ فاسق ہے اس لئے رب کی معصیت کے سبب ذم کا بھی مستحق ہے۔ الغرض شکر وذم کا اجتماع ہوسکتا ہے اسی طرح یہاں بھی نعمت کا حسن وقبح کے ساتھ اجتماع ہوسکتا ہے۔

نعمت کی تعریف میں منفعت مذکور ہے لہٰذا مضرت محضہ نعمت نہ ہوگی پھر منفعت بھی جو بطور احسان کی جائے وہ نعمت ہے لیکن اگر ایسا نفع ہو کہ فاعل نے نفع پہنچا کر خود اپنے فائدہ کا قصد کیا جیسے کہ مالک نے اپنی لونڈی پر اس لئے احسان کیا کہ اس سے مزید فائدہ حاصل کرے وغیرہ جیسی صورت نعمت کے زمرہ میں داخل نہ ہوگی کہ مفعول بہ کو نفع پہنچانے کا قصد نہیں کیا گیا ہے۔

{تفریعات}

فرع اول: نعمت کی مذکورہ تعریف سے ظاہر ہے کہ خلق کو جو نفع یا دفع ضرر ہوتا ہے وہ سب اللہ رب العزت کی طرف سے ہے چنانچہ ارشاد ہے "وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" اور تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے۔ (النحل: ۵۳) پھر نعمت کی، ملنے کے لحاظ سے تین قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ نعمت جس کی ایجاد میں اللہ تعالیٰ مستقل یکتا وتنہا ہے جیسے خلق ورزق۔

(۲) دوسری وہ نعمت جو بظاہر غیر اللہ کی طرف سے پہنچے اور حقیقت میں یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے۔ کیونکہ اللہ ہی اس نعمت کا خالق ہے بلکہ اس منعم کا بھی خالق ہے بلکہ منعم کے قلب میں اس نعمت کے دینے کا جو داعیہ اور جذبہ ہوتا ہے اس داعیہ کا پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بندہ کے ذریعہ نعمت دلوائی اس لئے وہ بندہ بھی مشکور ہوگا حالانکہ حقیقی مشکور وہ اللہ تعالیٰ ہے اسی لئے ارشاد ہوا "اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ" یہ کہ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا آخر مجھی تک آنا ہے۔ (لقمان: ۱۴) اس آیت میں اللہ عزشانہ تعالیٰ نے پہلے اپنے شکر کا حکم دیا تاکہ تنبیہ ہوجائے کہ خلق کا انعام بغیر انعام الٰہی کے ناتمام ہے۔

(۳) تیسری وہ نعمت ہے جو ہمیں رب تعالیٰ کی طاعت کی وجہ سے ملتی ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے ظاہر ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے ہمیں طاعات کی توفیق رفیق بخشی، اس پر ہماری مدد فرمائی اس کی بجا آوری کی ہدایت فرمائی اور اس راہ میں ہم سے تمام اعذار و مشکلات کو دور فرمایا جبھی ہم طاعت و عبادات کے لائق ہو سکے اگر اس کی توفیق، مدد اور راہنمائی شامل حال نہ ہوتی تو کوئی طاعت بجا نہ لا سکتے غرضیکہ نعمتیں ملنے کی تینوں صورتیں درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔

فرع دوم: بندے پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے اول نعمت یہ ہے کہ اس نے اس کو نیستی سے ہستی اور عدم سے وجود میں لایا یعنی اس کو زندگی عطا فرمائی اس پر عقل و نقل شاہد و ناطق ہے۔ عقلی طور پر اس طرح کہ کوئی شئی اس وقت تک نعمت نہیں ہو سکتی جب تک کہ قابل انتفاع نہ ہو اور اس سے انتفاع اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ باحیات ہو چنانچہ جماد اور میت وغیرہ کسی شی سے انتفاع اسی لئے حاصل نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ باحیات نہیں ہیں علاوہ ازیں شرعی طور پر بھی ثابت ہے کہ حیات اول نعمت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے "كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ "(البقرۃ:۲۸) یعنی بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گئے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی اس کے بعد ارشاد فرمایا "هُوَالَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا" (البقرۃ:۲۹) یعنی وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے۔ اولاً اللہ عز شانہ تعالیٰ نے حیات دینے کا ذکر فرمایا، بعدہ نفع بخش چیزوں کی پیدائش کا ذکر کیا پس اس سے ظاہر ہے کہ تمام نعمتوں میں اصل حیات ہے۔

فرع سوم: اس بارے میں علما کا اختلاف ہے کہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے یا نہیں۔ بعض علما کا خیال ہے کہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے۔ معتزلہ کا خیال ہے کہ اہل ایمان کی طرح کافروں پر بھی اللہ تعالیٰ کی دینی و دنیوی نعمتیں ہیں دونوں فریق نے اپنے اپنے نظریہ پر عقل و نقل سے استدلال کیا ہے۔

دلیل منقول: قرآن حکیم میں بہت سی آیتیں ہیں ان میں ایک "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ " ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس میں کفار داخل نہیں ہیں اگر داخل ہوتے تو کفار کے راستہ کو طلب کرنے کا حکم ہوتا اور اس کا راستہ صراط مستقیم ہوتا اور یہ بداہتاً باطل ہے پس اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار پر انعام نہیں ہے یا نعمت الٰہیہ کا فیضان نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری آیت ہے "وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ" (آل عمران:۱۷۸) اور ہرگز کافر اس گمان میں نہ رہیں کہ وہ جو

ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں کچھ ان کے لئے بھلا ہے ہم تو اسی لئے انہیں ڈھیل دیئے ہیں کہ اور گناہ میں بڑھیں۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ دنیاوی دولت وثروت بھی کفار کے لئے نعمت نہیں ہے بلکہ عذاب مہین کا سبب ہے۔

دلیل معقول: عقلی طور پر بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ کفار پر نعمت کا فیضان نہیں ہے کہ دنیاوی مال ومتاع تو اخروی عذاب دائمی کے مقابلہ میں ایسا ہی حقیر وقلیل ہے جیسا کہ ایک قطرہ سمندر کے مقابلہ میں، ظاہر ہے کہ ایسا حقیر وقلیل نعمت میں شمار نہیں ہوسکتا جیسے کوئی حلوہ میں سم قاتل ڈال دے تو حلوہ نعمت نہیں رہ جاتا کیونکہ حلوہ سے حاصل شدہ نفع سم کے ضرر کثیر کے بالمقابل حقیر ہے اسی طرح کفار کی دنیاوی نعمتوں کا حال ہے کہ وہ ان کے حق میں سم قاتل کی طرح ہیں اس لئے انہیں نعمت نہیں کہا جاسکتا ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ کفار پر بھی اللہ تعالیٰ کی بے انتہا نعمت ہے انہوں نے بھی کئی آیات کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ ارشاد ہے "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً "(البقرۃ:۲۱۔۲۲)اے لوگوں اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کل انسان پر واجب ہے کہ اسکی نعمتیں مسلم وکافر سب پر یکساں ہیں۔

(۲) اور ارشاد ہے "كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ "(البقرۃ:۲۸) بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہوگے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں جلائے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔اس آیت کریمہ کو معرض امتنان میں اور شرح نعمت کے مقام میں ذکر کیا جس سے ظاہر ہے کہ کافروں پر بھی نعمت کا فیضان ہے۔

(۳) اور ارشاد ہے "یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ "(البقرۃ:۴۰) اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو۔

(۴) سورہ سباء میں ہے "وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ "(سباء:۱۳) میرے بندوں میں کم ہیں شکر والے۔

(۵) سورہ اعراف میں ہے۔"وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ "(۱۷) ابلیس نے کہا تھا اور تو ان میں اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا۔مذکورہ تینوں آیات میں، شکر کا مطالبہ، شکر گذار بندوں کی قلت بلکہ اکثریت کے ناشکرا ہونے کا بیان

ہے جن سے خوب ظاہر ہے کہ کفار پر بھی نعمتیں ہیں کیونکہ اگر نعمت نہ ہوتی تو شکر لازم نہ ہوتا اور پھر شکر نہ کرنے پر کوئی مخذور لازم نہ ہوتا حالانکہ شکر نہ کرنے پر مخذور لازم ہے تو لازماً شکر واجب ہے اور شکر کا تصور بغیر نعمت نہیں ہوسکتا۔

فائدہ دوم: آیت کریمہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت پر دلیل ہے وہ اس طرح کہ صراط مستقیم سے انہیں کا راستہ مراد ہے جن پر انعام ہوا ہے۔ اور جن پر انعام ہوا ان کا بیان دوسری آیت میں مذکور ہے کہ وہ کون لوگ ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ "(النساء:۵۹) اس آیت میں صریح مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انعام حضرات انبیا علیہم السلام کے ساتھ صدیقین، شہدا اور صالحین پر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صدیقین کے سردار اور امام ہیں، اس اعتبار سے آیت کا مفہوم گویا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اس ہدایت کو طلب کریں جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور تمام صدیقین تھے غرض کہ حضرت صدیق اکبر صراط مستقیم ہیں اور ان کے طریق ہدایت پر چلنے والا صراط مستقیم پر چلنے والا ہے رافضیوں کی بکواس اور ہذیانات کے اعتبار سے اگر وہ (معاذ اللہ) ظالم ہوتے تو کبھی ان کی اقتداء جائز نہ ہوتی اور انہیں صدیقین کے زمرہ میں شامل نہ کیا جاتا تواتر سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالیقین صدیق تھے اور اس پر آج تک امت کا اجماع ہے، تاریخ الخلفاء میں ہے "قال مصعب بن الزبیر وغیرہ واجمعت الامة علیٰ تسمیته بالصدیق لانه بادر الیٰ تصدیق رسول الله صلی الله علیه وسلم ولازم الصدق "اور صدیق ان منعم علیهم میں سے ہیں جن کے راستہ پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ سوم: ارشاد الٰہی " اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "شامل ہے ان سب لوگوں کو جن پر انعام الٰہی ہے مگر یہ متعین کہ انعام اور نعمت سے دنیوی نعمت مراد نہیں ہے بلکہ دینی نعمت مراد ہے اور ہر دینی نعمت کے حصول کے لئے نعمت ایمان کا حصول شرط ہے بغیر نعمت ایمان کے کوئی دینی نعمت حاصل نہیں ہوسکتی البتہ ایمان دوسری تمام دینی نعمتوں کے بغیر بھی حاصل ہوسکتا ہے اس تقدیر پر یہ دلیل ہے کہ ارشاد "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "میں نعمت سے نعمت ایمان مراد ہے پس جب بندہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "پڑھتا ہے تو بندہ رب تعالیٰ سے نعمت ایمان کو طلب کرتا ہے۔

جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ "میں نعمت ایمان مراد ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان جیسی نعمت

عظمی کا عطا فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے بلکہ وہی اس کا خالق بھی ہے۔اس سے معتزلہ کے قول کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے پس وہ اپنے ایمان کا بھی خالق ہوا۔معتزلہ کا یہ نظریہ بداہۃً باطل ہے چونکہ متلوہ آیت میں نعمت عطا کرنے کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہے اور نعمت سے نعمت ایمان مراد ہے لہذا ثابت کہ ایمان دینے والا اللہ ہے، بندہ نہیں ۔علاوہ ازیں اس اعتبار سے بھی کہ تمام نعمتوں میں سب سے عظیم نعمت نعمت ایمان ہے۔تو اگر سب سے عظیم ترین نعمت ایمان کا فاعل بندہ ہو تو لازم آئے گا کہ بندہ اور مخلوق کا انعام اللہ خالق کائنات کے انعام سے زیادہ معظم ومشرف ہو حالانکہ یہ بداہۃً باطل ہے ورنہ اللہ عزشانہ تعالیٰ اپنے اس انعام کا ذکر مقام تعظیم میں نہ فرماتا۔غرض معتزلہ کا نظریہ عقل ونقل سے مردود وباطل ہے۔ارشاد ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ مومن گرچہ بڑے سے بڑا گنہگار ہو ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا اسلئے کہ ارشاد ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ''اس انعام (نعمت ایمان) کی تعظیم کے اظہار کی جگہ میں مذکور ہے اگر دائمی عذاب کے دفع کرنے میں یہ انعام اثر انداز نہ ہو تو اس کا فائدہ قلیل ہوگا اور رب تعالیٰ کی طرف سے مقام تعظیم میں اس نعمت کا ذکر نہ ہوتا لیکن مقام تعظیم میں اس کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان والا مخلود فی النار نہ ہوگا اس پر قرآن وحدیث ناطق ہے۔

اس آیت سے معتزلہ کے دوسرے نظریہ کا بھی ابطال ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ پر بندہ کے حق میں صلاح اور اصلح کی رعایت واجب ہے معتزلہ کا یہ نظریہ بھی عقل ونقل سے مردود ہے یہی آیت کریمہ ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ''اس کے بطلان کے لئے کافی ہے ۔ وہ اس طرح کہ آیت میں ایمان کو رب تعالیٰ کا انعام فرمایا گیا ہے۔اگر ایمان وارشاد اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتا تو انعام نہ کہا جاتا کیونکہ واجب کی ادائیگی انعام نہیں کہلاتی حالانکہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اسے اپنا انعام قرار دیا ہے جس کا واضح مطلب ہے کہ وہ اس پر واجب نہیں ہے ۔ پھر عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو ورنہ اس کا مضطر ومجبور ہونا لازم آئے گا اور یہ محال وباطل ہے۔

معتزلہ کے عقیدہ ایجاب علی اللہ، اور نظریہ اصلح للعبد کی تردید میں حضرت ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ الرحمہ کا مناظرہ جو ابوعلی جبائی معتزلی کے ساتھ ہوا بڑا لاجواب، مسکت اور دندان شکن ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ اشعری نے ابوعلی جبائی معتزلی سے فرمایا کہ ان تین بھائیوں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جن میں سے ایک رب کا مطیع وفرماں بردار ہو کر مرا، دوسرا نافرمان وگنہگار مرا اور تیسرا بچپن میں مر گیا جبائی نے اپنے من گھڑت نظریہ کے مطابق جواب دیا کہ پہلا بھائی جو مطیع ہو کر مرا وہ جنت میں ثواب دیا جائے گا دوسرا بھائی جو عاصی ونافرمان مرا جہنم میں عذاب دیا جائے گا اور تیسرا بھائی جو بچپن میں مرا وہ نہ ثواب دیا جائے گا اور نہ عذاب، اس پر حضرت شیخ اشعری نے معتزلی سے کہا اگر تیسرے چھوٹے بھائی نے ر

ب سے یہ کہا اے میرے رب تو نے مجھے بچپن میں کیوں موت دے دی مجھے بڑا ہونے تک زندہ کیوں نہ رکھا اگر میں زندہ رہتا تو تجھ پر ایمان لاتا اور تیرا مطیع وفرماں بردار ہوتا پس میں جنت میں داخل ہوتا تو رب تعالیٰ اس تیسرے چھوٹے کو کیا کہے گا؟ جبائی نے کہا اس سے کہے گا کہ میں تمہارے بارے میں جانتا تھا کہ اگر تو بڑا ہوتا تو میری نافرمانی کرتا پس تو جہنم میں جاتا اس لئے تمہارے لئے بچپن میں مرجانا تمہارے حق میں اصلح تھا، پھر حضرت امام اشعری نے معتزلی جبائی سے پوچھا کہ اگر دوسرے نافرمان بھائی نے رب تعالیٰ سے یہ پوچھ لیا کہ اے میرے رب تو نے مجھے بچپن ہی میں کیوں نہیں موت دے دی کہ نہ میں بڑا ہوتا نہ تیری نافرمانی کرتا تو رب تعالیٰ کیا فرمائے گا اب جبائی لاجواب ہوکر مہبوت ہوگیا ۔اس طرح معتزلہ کا عقیدہ اصلح وایجاب دونوں باطل ہوگیا۔(شرح العقائد)

فصل نہم: تفسیر قولہ تعالیٰ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ

(نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا)

آیت ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ''ترکیب نحوی کے اعتبار سے ماقبل کی آیت سے بدل ہے یا صفت ہے۔ بصورت بدل معنی یہ ہوگا کہ جو مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ ہیں وہی لوگ سالمین من الغضب والضلال ہیں وجہ یہ ہے کہ بدل سے بدل الکل مراد ہے کہ جب مطلق بولا جاتا ہے تو اسکا فرد کامل مراد ہوتا ہے اور یہ معلوم کہ فرد کامل، بدل الکل ہے۔ اور جب مراد بدل الکل ہے تو بدل مبدل منہ سے ذات ومصداق میں متحد ہوگا اور دونوں میں سے ایک کا اطلاق وحمل دوسرے پر صحیح ہوگا اس لئے سالمین من الغضب والضلال کا حمل منعم علیھم پر صحیح اور درست ہوگا اور معنی ہوگا کہ جو مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ ہیں وہی سالمین غضب وضلال ہیں۔آیت ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ''اپنے قبل کی صفت بھی واقع ہوسکتی ہے اس تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ منعم علیھم وہ لوگ ہیں جو غضب وضلال سے محفوظ ہیں صفت اس تابع کو کہتے ہیں جو اپنے متبوع کے معنی پر دلالت کرے وہ تین طرح کی ہوتی ہیں۔

صفت مقیدہ، صفت کاشفہ، صفت مادحہ

صفت کاشفہ: اس صفت کو کہتے ہیں جو موصوف کے ابہام کو دور کرنے کے لئے اور اس کی توضیح کرنے کے لئے لائی جاتی ہے۔

صفت مقیدہ: اس صفت کو کہتے ہیں جو موصوف عام کی تخصیص کے لئے ذکر کی جائے۔

صفت مادحہ: اس کو کہتے ہیں جسے متبوع وموصوف کی مدح سرائی اور اظہار خوبی کے لئے لائی جائے،

قاضی بیضاوی نے کہا ہے کہ اس مقام پر "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ "صفت کاشفہ بھی ہوسکتی ہے اور صفت مقیدہ بھی بن سکتی ہے۔

اگر ایمان سے ایمان مطلق یعنی تصدیق بالجنان اور اقرار باللسان مراد ہو تو آیت "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ "صفت مقیدہ ہوگی کیونکہ ایمان مطلق کی صورت میں آیت اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ،مومنین وفاسقین کو بھی شامل ہوگی پس آیت "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ "نے مومنین فاسقین کو خارج کر دیا اور مومنین کاملین کے ساتھ خاص کر دیا اور معنی یہ ہوگا کہ مطلقاً ہر مومن انعام کا مستحق نہیں بلکہ وہ مومن مستحق ہوگا جو غضب وضلال سے محفوظ ہے اور وہ مومن کامل ہے اس اعتبار سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ صفت مقیدہ ہوگی البتہ اگر ایمان سے ایمان مطلق نہیں بلکہ ایمان کامل مراد ہو جو تصدیق بالجنان اقرار باللسان کے ساتھ اس کے جملہ مقتضیات پر عمل کرنے کا نام ہے۔تو اس صورت میں آیت "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ "صفت کاشفہ ہوگی وہ اس طور پر کہ ایمان کامل مراد لینے کی صورت میں غضب وضلال سے سلامتی و کنارہ کشی اس کے مفہوم میں از خود ملحوظ ہے مگر چونکہ یہ مفہوم غیر واضح تھا اس لئے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ "سے اس مفہوم کی توضیح بیان کردی گئی اس اعتبار سے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ "صفت کاشفہ ہوگی اسی مفہوم کو قاضی بیضاوی نے اپنے الفاظ "او صفة له بينة او مقيدة "(الخ) سے بیان کیا ہے۔

اعتراض: "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ "کو "الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "کی صفت ماننے کی صورت میں یہ اعتراض وارد ہوگا کہ الَّذِيْنَ موصوف تو معرفہ ہے لیکن "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ "مضاف ہونے کے باوجود نکرہ ہے۔تو نکرہ، معرفہ کی صفت کیونکر ہوگی جب کہ موصوف وصفت میں تعریف و تنکیر میں بھی مطابقت ضروری ہے۔

جواب: اس اعتراض کا قاضی بیضاوی نے یہ جواب دیا ہے کہ دو تاویلوں میں سے ایک تاویل کر کے صفت موصوف بنانا درست ہے۔وہ یہ کہ یا تو موصوف کو صفت کے یا صفت کو موصوف کے تابع بنا دیا جائے۔یعنی جس طرح موصوف معرفۃ ہے اسی طرح صفت بھی معرفۃ ہے یا جس طرح صفت نکرہ ہے موصوف بھی نکرہ ہے۔اس کی تفصیل اس طرح سمجھیں کہ موصول "الَّذِيْنَ "الف لام کے ساتھ مستعمل اسم یعنی معرف باللام کی طرح ہوتا ہے جس طرح معرف باللام اسم میں الف لام کی چار صورتوں عہد خارجی، ذہنی، جنسی اور استغراقی، میں سے موقع ومقام کے لحاظ سے کوئی ایک ہوتا ہے ایسے ہی "الَّذِيْنَ "اسم موصول بھی موقع ومقام کے لحاظ سے چار صورتوں میں سے کسی ایک کی طرح ہوتا ہے،

اس تمہید کے بعد قاضی کا جواب بہت واضح ہوجاتا ہے وہ یہ کہ "صِرَاطَ الَّذِیْنَ "میں الَّذِیْنَ الف لام عہد ذہنی کی طرح ہے اور یہ معلوم کہ اس کا معہود ذہن میں نکرہ کی طرح غیر متعین ہوتا ہے۔ جب موصوف نکرہ کی طرح غیر متعین ہوا تو "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ "کا اس کی صفت بننا صحیح ہے کہ اس وقت موصوف بھی صفت کی طرح منکر ہوگیا جیسا کہ شاعر کے شعر:

ولقد امر علی اللئیم یسبنی
فمضیت ثمه قلتُ لا یعنینی

میں "اللئیم" ہے۔ اور جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کا ارشاد "أَخَافُ اَنْ یَّاْ كُلَهُ الذِّئبُ "میں الذِّئبُ ہے کہ ان دونوں مثالوں میں الف لام عہد ذہنی ہے جو نکرہ کے حکم میں ہے ظاہر ہے کہ لئیم و ذئب سے کوئی خاص معین لئیم و ذئب مراد نہیں ہے اور نہ ہی کل لئیم اور تمامی ذئب ہی مراد ہوسکتے ہیں اسی طرح ان دونوں مثالوں میں الف لام جنسی بھی نہیں ہوسکتا کہ مرور واکل کا تعلق جنسیت سے نہیں ہوتا بلکہ فرد سے ہوتا ہے اور اس کے لئے فرد عین وخاص بھی ضروری نہیں بلکہ غیر متعین کافی ہے اور یہی عہد ذہنی کا معنی ہے پس جس طرح اللئیم والذِّئبُ میں الف لام عہد ذہنی کا ہے اسی طرح "الَّذِیْنَ "بھی عہد ذہنی کی طرح غیر متعین ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ الَّذِیْنَ موصوف غیر متعین نکرہ ہے اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ بھی نکرہ ہے اس لئے "الَّذِیْنَ "نکرہ، غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ نکرہ کا موصوف بن سکتا ہے۔ یہ ایک تاویل ہے جو "الَّذِیْنَ "موصوف میں کی گئی۔

اور دوسری تاویل غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ صفت میں کی گئی ہے وہ یہ کہ "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ "جو صفت ہے معرفہ ہے اس لئے کہ اضافت کی وجہ سے غَیْرِ، معرفہ ہوگیا اس لئے "الَّذِیْنَ "موصوف معرفہ کی صفت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ ہوسکتا ہے رہا یہ شبہ کہ غَیْرِ مضاف ہونے کے باوجود بھی نکرہ رہتا ہے۔ تو "الَّذِیْنَ "موصوف معرفہ کی صفت نکرہ کیسے ہوسکتا ہے۔

شبہ مذکور کا جواب یہ ہے کہ غَیْرِ اضافت کے باوجود ہر جگہ علی الاطلاق نکرہ نہیں رہتا بلکہ وہ ایک قید سے مقید ہے وہ یہ کہ غَیْر جب ضدین کے درمیان واقع نہ ہو تو اضافت کے باوجود نکرہ ہوگا لیکن اگر غَیْر ضدین کے درمیان واقع ہو تو اس وقت غَیْر نکرہ نہ ہوگا بلکہ معرفہ ہوگا جیسے کسی نے کہا ما النقلة، نقله کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا وهی الحرکة غیر السکون، اس مثال میں لفظ غیر دو ضد کے درمیان واقع ہے حرکت وسکون کا ایک دوسرے کی ضد ہونا ظاہر ہے پس

یہاں پر غیر معرفۃ ہوگا کہ ضدین کے درمیان واقع ہے جب غیر کی نسبت سکون کی طرف کی گئی تو اس کی ضد آخر یعنی حرکت متعین ہوگئی کہ غیر سکون، ہی حرکت کا نام ہے۔ اسی طرح "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" میں لفظ غَيْرِ ضدین کے درمیان واقع ہے وہ اس طرح کہ منعم علیھم اور مغضوب علیھم دونوں متضاد ہیں اور دونوں ضدین کے درمیان لفظ غَيْرِ واقع ہے لہذا لفظ غَيْرِ معرفہ ہوگا اس طرح "الَّذِيْنَ" معرفہ موصوف کی صفت بنانا درست ہے معنی یہ ہوگا کہ منعم علیھم جو "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ" ہیں کے راستہ کی ہدایت فرما۔

"غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" کو ابن کثیر نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ نصب ہونے کی تین وجہ ہے۔ حال ہونے کی وجہ سے، غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ کے پہلے اَعْنِیْ فعل مضارع مقدر ہونے کی وجہ سے، استثناء کی وجہ سے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ"، "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی ھم ضمیر سے حال ہے۔ اور حال منصوب ہوتا ہے اس لئے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" منصوب ہوگا لیکن اس صورت میں یہ اعتراض وارد ہوگا کہ "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی ھم ضمیر سے حال بنانا درست نہیں کیونکہ ذوالحال فاعل ہوتا ہے یا مفعول اور اس مقام پر عَلَيْهِمْ "کی ھم ضمیر فاعل ہے نہ مفعول بلکہ مجرور ہے تو ذوالحال کیونکر بن سکتی ہے پھر یہ اعتراض بھی ہوگا کہ عَلَيْهِمْ "کی ھم ضمیر جس کو ذو الحال بنایا ہے اس کا عامل عَلٰی حرف جار ہے اور غَيْرِ جو حال ہے کا عامل، اَنْعَمْتَ ہے۔ غرض ذوالحال وحال کا عامل علیحدہ علیحدہ ہوا حالانکہ حال وذوالحال کا عامل ایک ہی ہوتا ہے۔

جواب: یہ ہے کہ "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں دراصل اَنْعَمْتَ کا مفعول عَلَيْهِمْ کا ھم ہے جسمیں اَنْعَمْتَ عامل ہے رہا علیٰ حرف جار تو یہ زائد محض بطور صلہ مستعمل ہے پس جب ھم، اَنْعَمْتَ کا مفعول ہوا تو اس کا ذوالحال بننا اور اَنْعَمْتَ کا ذوالحال ھم، اور حال غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ دونوں کے لئے عامل واحد ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

غَيْرِ کے منصوب ہونے کی ایک وجہ فعل اعنی کی تقدیر ہے یعنی اس سے پہلے فعل مضارع اعنی محذوف ہے اور "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ" اس کا مفعول ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی "اَعْنِیْ غَيْرَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ" لیکن یہ اس صورت میں درست ہوگا جب اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں منعم علیھم سے مومنین کاملین مراد لئے جائیں کیونکہ اَعْنِیْ کے بعد مفعول لاکر یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ جو اَعْنِیْ کا مفعول ہے وہی ماقبل سے مراد ہے۔ اور "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" ماقبل کی مراد اسی وقت بن سکتا ہے جب "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" میں منعم علیھم سے مومنین کاملین مراد لئے جائیں۔

''غَيْرِ'' کے منصوب ہونے کی ایک وجہ استثنا بھی ہے کہ غَيْرِ کو استثنا کے معنی میں لے لیا جائے لیکن استثنا کی صورت میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں نعمت سے نعمت عامہ مراد لی جائے کہ وہ مومنین پر ہو یا کافروں پر ہو یا کاملین پر ہو یا فاسقین پر سب کو عام ہوتا کہ جب مستثنیٰ منہ عام ہو جائیگا تو پھر اس سے بعض کا استثنا صحیح ہو سکے گا۔

معنی غضب: غضب کا معنی بیان کرتے ہوئے قاضی بیضاوی نے کہا''والغضب ثوران النفس عندارادۃ الانتقام''یعنی غضب، ارادہ انتقام کے وقت خون دل کے جوش مارنے کا نام ہے غضب کا یہ معنی بندہ کے لحاظ سے ہے لیکن رب تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے وقت غضب کا معنی حقیقی مراد نہیں ہوتا کہ غضب کے معنی میں قلب، خون، جوش کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اللہ عز شانہ تعالیٰ ان باتوں سے منزہ اور پاک ہے لہذا جب غضب کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے تو اس سے اس کا معنی منتہا و نتیجہ مراد ہوتا ہے یعنی سزا و عذاب مراد ہوتا ہے ۔ اس صورت میں ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ''کا معنی ہوگا وہ جن پر رب تعالیٰ کا عذاب ہوا۔

ضلال: سیدھے راستہ سے عدول کرنا ضلال کہلاتا ہے خواہ عمداً اعراض ہو یا خطأً ۔ اور ضلال کا بہت ہی وسیع اور کشادہ میدان ہے یعنی اس کے بہت مراتب و درجات ہیں اس کا اعلیٰ درجہ کفر ہے اور ادنی درجہ ترک اولیٰ ہے اور ان دونوں کے درمیان بہت سے درجات ہیں جن سب کا استقصاء نہیں ہو سکتا۔

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْن سے مراد: اس سے کون لوگ مراد ہیں اس بارے میں مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْن ''سے کفار مراد ہیں کیونکہ منعم علیھم کی تفسیر مومنین سے کی گئی ہے اور اس کے مقابلہ میں ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْن ''واقع ہے جو اس کی ضد ہے اس لئے مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ اور ضَّآلِّيْن سے غیر مومنین یعنی کفار مراد ہوں گے۔ اگر یہی مراد ہیں تو آیت کا مفہوم ظاہر ہے وہ یہ کہ کفار جو غضب و ضلال سے متصف ہیں کے علاوہ کا راستہ دکھا۔ اس قول کی تائید قرآن حکیم کی اس آیت سے ہوتی ہے ارشاد ہے ''قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْه'' (مائدہ:۶۰) یہ آیت دربارہ کفار وارد ہے چنانچہ مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ کیا میں تم کو ان لوگوں کی خبر دوں جو اس سے زیادہ بدتر ہیں اللہ کے نزدیک جزاء کے اعتبار سے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہوئی اور غضب نازل ہوا دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا''(نساء:۱۶۷) یعنی جنہوں نے کفر کیا اور راہ خدا سے روکا تحقیق وہ لوگ گمراہ ہوئے بہت دور کے۔

(۲) جمہور مفسرین کا قول ہے کہ مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ سے یہود مراد ہیں اللہ عز شانہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا "مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ" اور ضَّآلِّيْن سے نصاریٰ مراد ہیں ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے "قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا" پہلی آیت میں یہود کو ملعون و مغضوب اور دوسری آیت میں نصاریٰ کو ضال و مضل فرمایا اس سے ظاہر ہے کہ مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ یہود ہیں اور ضَّآلِّيْن نصاریٰ ہیں۔ حدیث شریف سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "المغضوب عليهم اليهود و الضالون النصاریٰ" مسند احمد میں ہے "سأل رجل النبی صلی اللہ علیه و سلم فقال یا رسول اللہ من هولاء المغضوب عليهم فقال اليهود و من هولاء الضالون فقال النصاریٰ" یعنی ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ وہ کون لوگ ہیں جن پر غضب فرمایا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ یہود ہیں۔ پھر عرض کیا وہ کون لوگ ہیں جو ضالون ہیں فرمایا وہ نصاریٰ ہیں۔ علاوہ ازیں حقائق و واقعات اور تقاضائے عقل سے بھی یہود کا مغضوب ہونا اور نصاریٰ کا ضال ہونا ظاہر ہوتا ہے چنانچہ نصاریٰ نے باری تعالیٰ کی الوہیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم کو شریک ٹھہرا کر کس قدر گمراہ ہوئے معلوم ہے رہے یہود تو ان کا مغضوب ہونا اس لئے کہ وہ ہر زمانہ میں بڑی سرکش قوم رہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور مسلمان سے عداوت و دشمنی کرنے میں یہ قوم سب سے آگے ہے۔ بلکہ ان ظالموں نے حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کے قتل کا وبال اپنی گردنوں پر لیا، ہر کتاب الٰہی میں تحریف کے مجرم ہوئے حتی کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سخت گستاخیاں کیں وغیرہ ان وجہوں سے ان پر غضب الٰہی نازل ہوا۔

اس قول کو حضرت رازی نے بھی مشہور کہا ہے اور اس پر آیات کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے وجہ ضعف یہ ہے کہ صانع تعالیٰ کے منکرین اور مشرکین تو یہود و نصاریٰ کی بہ نسبت دین میں زیادہ خبیث ہیں اسلئے کفار و مشرکین سے احتراز بہ نسبت یہود و نصاریٰ کے اولیٰ ہوگا۔

اس لئے امام رازی نے فرمایا کہ مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ سے ایسے لوگوں کو مراد لینا بہتر ہے جو اعمال ظاہرہ کے اعتبار سے خطا کار ہیں اور وہ فساق ہیں اور ضَّآلِّيْن سے وہ لوگ مراد ہیں جو اعتقادیات میں خطا پر ہیں گویا حضرت امام رازی نے مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ کو ہر مخطی فی العمل میں اور ضَّآلِّيْن کو ہر مخطی فی الاعتقاد میں عام مانا ہے اس لئے مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ بے عمل فاسق مسلمان کو بھی شامل ہوگا اسی طرح "ضَّآلِّيْن" بھی کلمہ گو بدعقیدہ مسلمان کو عام ہوگا۔ حضرت رازی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اَلْمَغْضُوْب عَلَيْهِمْ اور ضَّآلِّيْن دونوں عام و مطلق ہیں اس لئے یہ اپنے اطلاق و

عموم پر رہے گا اسے کسی خاص فرقہ کے ساتھ مخصوص کرنا خلاف اصل ہے۔ حضرت رازی نے یہ بھی کہا ہے کہ **اَلمَغْضُوْب عَلَيْهِم** سے کفار اور **ضَّآلِّيْن** سے منافقین مراد ہو سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ شریف کے آغاز میں پانچ آیات کریمہ میں مومنین کی حمد وثنا بیان کی ہے پھر اس کے بعد ارشاد "اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے کفار کا ذکر کیا پھر کفار کے ذکر کے بعد ارشاد "مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ" سے منافقین کو ذکر فرمایا۔

غرض کہ سورہ بقرہ میں اول، مومنین کا ذکر ہوا درمیان میں کفار کا اور آخر میں منافقین کا ایسے ہی سورہ فاتحہ میں اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں مومنین کا ذکر پہلے فرمایا، اور درمیان میں کفار کا ذکر اپنے قول غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے فرمایا پھر سب سے آخر میں اپنے ارشاد وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے منافقین کا ذکر فرمایا۔ ان سب باتوں کو حضرت رازی نے فائدہ اولیٰ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔ قاضی بیضاوی نے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ **اَلمَغْضُوْب عَلَيْهِم** سے عصاۃ و نافرمان مراد ہیں اور الضَّآلِّيْنَ سے نابالغان معرفت الٰہی مراد ہیں۔ قاضی صاحب کی بات سمجھنے سے پہلے مندرجہ ذیل اصطلاحات ذہن نشین رہیں جنہیں قاضی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

حق: سے مراد وہ احکام نظریہ ہیں جو مطابق للواقع ہوں۔

معرفت کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) **معرفت لذاتہ** (۲) **معرفت للعمل بہ**

معرفت لذاتہ: اس علم کو کہتے ہیں جس سے مقصود صرف جاننا ہو۔

معرفت للعمل بہ: اس علم کو کہتے ہیں جس سے مقصود عمل ہو۔

مخل فی العمل: سے وہ نافرمان لوگ مراد ہیں جنہوں نے ان احکام پر عمل کو ترک کر دیا جن اوامر ونواہی کا انہیں مکلف بنایا گیا۔

مخل فی الاعتقاد: وہ لوگ ہیں جو ان باتوں سے جاہل ہوں جن کا جاننا اور اعتقاد رکھنا ان پر واجب ہے۔

اس کے بعد قاضی صاحب کا مقصود جاننا آسان ہو جاتا ہے چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ **مغْضُوْب عَلَيْهِم** سے عاصی و نافرمان مراد ہیں اور ضَآلِّيْن سے وہ لوگ مراد ہیں جو رب تعالیٰ سے ناآشنا اور جاہل ہیں یہ مراد ان کے نزدیک اوجہ ہے چونکہ **منعم علیھم** سے مراد وہ لوگ ہیں جنکو دونوں نعمتیں عطا کی گئی ہوں، ایک نعمت، احکام نظریہ کی معرفت لذاتہ یعنی ان عقائد کی معرفت جن سے مقصود صرف عرفان ہو۔ دوسری نعمت، احکام عملیہ کی معرفت تاکہ ان پر عمل کر سکے۔ غرض کہ **منعم**

علیھم وہ ہیں جو عقائد حقہ اور اعمال صالحہ دونوں کی معرفت بھی رکھتے ہوں اور اس سے مزین و آراستہ بھی ہوں۔ پھر اس کے بالمقابل مغْضُوْب عَلَيْهِم اور ضَّآلِّيْن کا ذکر ہوا جس سے دو باطل فرقے کی طرف اشارہ ہے ایک وہ فرقہ جس کی قوت عاقلہ یعنی معرفت لذاتہ مختل ہوگئی ہو یعنی اس کے اعتقادات فاسد اور خراب ہو گئے ہوں، دوسرا وہ فرقہ جس کے اعمال خراب ہو گئے ہوں یہ فرقہ فاسق ہے اور یہی مغضوب علیہ ہے چنانچہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے عمداً قتل کرنے والے کے بارے میں فرمایا "وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ" اور حدیث شریف میں تو فاسق نہیں بلکہ فاسق کی مدح و تعظیم کرنے والے کے بارے میں فرمایا" اذا مدح الفاسق اھتز العرش و غضب الرب او کما قال" رہا پہلا فرقہ جس کی قوت عاقلہ یعنی عقائد خراب ہوں وہ جاہل وضال ہے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا "فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ"۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں ایک عالم باعمل یا عارف و عامل، دوم عارف بے عمل یا عالم بے عمل اور سوم جاہل جو نا بالغان معرفت اور عقائد سے نا آشنا ہوان میں اول مُنْعَم عَلَيْهِمْ کا مصداق ہے، دوم پر مغْضُوْب عَلَيْهِم کا اطلاق ہوگا اور سوم ضَآلِّيْن کے زمرہ میں آئے گا پھر یہ پہلے معلوم ہو گیا کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی مُنْعَم عَلَيْهِمْ کے مصداق میں بیک وقت دو صفتیں ملحوظ ہیں اور وہ عقائد حقہ کی معرفت اور اعمال صالحہ کی زینت ہیں دونوں سے آراستہ و پیراستہ ہونے والا ہی مستحق انعام ہے۔

مگر اس کے بالمقابل "مغْضُوْب عَلَيْهِم اور ضَآلِّيْن" میں ایک ایک صفت مفقود تھی کسی میں عقائد کی معرفت کا فقدان تھا تو کسی کا دامن اعمال صالحہ سے یکسر خالی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مقبولین یا منعم علیھم کا ایک فرقہ ذکر کیا اور ملعونین کے دو شمار فرمائے۔

واضح رہے کہ قاضی بیضاوی نے اپنی اس تفسیر کو اوجہ و انسب قرار دیا ہے حالانکہ یہ تفسیر نہ یہ کہ جمہور مفسرین کی تفسیر کے خلاف ہے بلکہ حدیث مرفوع کے بھی بظاہر خلاف ہے۔ مگر ادنیٰ تامل سے تفسیر قاضی کے اوجہ ہونے کی وجہ ظاہر ہو جاتی ہے وہ اس طرح کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغْضُوْب عَلَيْهِم اور ضَآلِّيْن کی تفسیر میں یہود و نصاریٰ کو ذکر تو فرمایا ہے مگر تخصیص کا قصد نہیں فرمایا کیونکہ قرآن حکیم میں جمیع کفار کے لئے ایسے الفاظ ہوئے ہیں چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔"وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" یعنی جو کفر کے لئے سینہ کھول دیگا تو ان پر اللہ کا غضب اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے (سورہ نحل:۱۰۶) نیز

ارشاد ہے ''اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِیْدًا'' بیشک وہ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے (سورہ نساء:۱۶۷) دونوں آیات متلوہ سے بہت ظاہر ہے کہ غضب وضلال جمیع کفار کے لئے ثابت ہے جب واقعہ یہ ہے تو تسلیم کرنا ہوگا کہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہود و نصاریٰ کے ذکر سے مقصود تخصیص نہیں ہے بلکہ مَغْضُوْب عَلَیْھِم سے بے عمل فاسق و فاجر اور ضَآلِّیْن سے جاہل، عقائد سے نا آشنا اور نا بالغان معرفت مراد ہیں۔ اور چونکہ ان بے عملوں میں سے یہود کا بھی ایک گروہ ہے بلکہ اس کی بدعملی تو انتہاء درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔

اسی طرح ضَآلِّیْن میں سے ایک نصاریٰ کی بھی جماعت تھی جس کی ضلالت و گمرہی کفر و شرک کی حدوں کو پار کر چکی تھی اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر انہیں دونوں فرقوں کا ذکر فرمایا۔ پھر یہ دونوں فرقے اہل کتاب تھے انہیں عقائد و اعمال کی معرفت خوب اچھی طرح تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے فسق و فجور اور بدعملی و بدعقیدگی کو اختیار کیا اسلئے کفار عرب کے بالمقابل یہود و نصاریٰ غضب وضلال کے زیادہ مستحق قرار پائے یہی وجہ ہے کہ انہیں دونوں کا ذکر فرمایا ورنہ صحیح یہی ہے کہ ہر کافر و مشرک غضب وضلال کا مستحق ہے۔

فائدہ دوم: ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ'' میں دلیل ہے کہ حضرات انبیاے کرام اور ملائکہ سب معصوم ہیں کہ ان میں سے کسی نے منعم علیہم کے کسی عقیدہ و عمل کے خلاف کبھی کوئی اقدام نہیں کیا معاذ اللہ ان میں سے کسی سے اگر کوئی ایسا عقیدہ و عمل سرزد ہوتا تو حق سے ہٹ جاتے اور گمراہ ہو جاتے، ارشاد ہے ''فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ'''' معاذ اللہ اگر وہ ایسے ہوتے تو ان کی اقتدا و پیروی جائز نہ ہوتی نہ ان کے طریقے پر عمل کرنا صحیح ہوتا اور وہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی مُنْعَم عَلَیْھِمْ کے زمرہ سے خارج ہوتے بلکہ سارے انبیا کا دین ہی بے اعتبار ہو جاتا اور جب یہ سب باطل و محال ہے تو اسی ایک آیت سے ثابت ہے کہ حضرات انبیا و ملائکہ علیہم السلام معصوم ہیں۔

فائدہ سوم: اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں انعام کی نسبت رب تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے لیکن '' الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ اور الضَّآلِّیْنَ ''میں غضب وضلال کی نسبت اپنی طرف نہ کی یہ بتانے کے لئے کہ خیر و شر اور ہدایت وضلالت سب گرچہ اللہ تعالیٰ ہی کی ایجاد سے ہے مگر بارگاہ صمدیت کے ادب کا تقاضا یہی ہے کہ خیر کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کی جائے اور شر کی نسبت اپنے نفس اور شیطان کی طرف کی جائے چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے ''وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ'' میں مرض کی نسبت اپنی طرف کی ہے جب کہ شفاء کی نسبت رب العالمین کی طرف فرمائی

ہے اسی طرح حضرت یوشع علیہ السلام نے مچھلی کا ذکر بھولنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا "وَمَا اَنْسَانِيْهُ اِلَّا الشَّيْطَانُ" مختصر یہ کہ قرآن حکیم کا اشارہ بھی ہے اور حضرات انبیاے کرام کا طریقہ بھی یہی رہا کہ اللہ رب العزت کی طرف خیر کی نسبت کی جائے اور شر وضرر کی نسبت اپنی طرف کی جائے۔

فائدہ چہارم: اس آیت سے معتزلہ نے اپنے نظریہ کی تائید میں استدلال کیا ہے ان کا مذہب معلوم ہے کہ وہ بندہ کو اپنے افعال کا فاعل وخالق مانتے ہیں وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ان پر غضب فرمانا دلیل ہے کہ وہ قبائح ومعاصی کے فاعل ہیں اگر وہ فاعل نہ ہوتے تو ان پر اللہ کی جانب سے غضب فرمانا ظلم ہوتا اور یہ محال ہے۔ اہل سنت کی طرف سے جواب دیا گیا ہے کہ آیت متلوہ سے بندہ کی فاعلیت پر استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ جب ان پر اللہ کا غضب ذکر کیا گیا تو اس کے فوراً بعد ان کے ضالین ہونے کا ذکر کیا گیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غضب الٰہی ان کے ضالین ہونے کی علت ہے اور جب غضب علت ہے اور علت معلول میں مؤثر ہوتی ہے تو اس وقت صفت الٰہی صفت عبد میں مؤثر ہوگی اور جب صفت الٰہی مؤثر ہے تو بندہ فاعل وخالق نہ ہوگا لیکن اگر یہ کہیں کہ انکا ضالین ہونا، ان پر غضب الٰہی کو واجب کرتا ہے تو لازم آئے گا کہ صفت عبد، صفت الٰہی میں مؤثر ہے اور یہ محال ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا عقیدہ بہت واضح ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کی طرح فاعل مختار نہیں اور پتھر کی طرح مجبور نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو یک گونہ اختیار دیا ہے کہ وہ ایمان وکفر، خیر وشر، ہدایت و ضلالت میں جسے چاہے اختیار کرے ارشاد ہے "مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ" پس بندہ اپنے ارادہ و اختیار سے جو چاہتا ہے کسب کر لیتا ہے اگر ایمان کے بالمقابل کفر کو خیر کے مقابل شر کو اور ہدایت کے مقابل ضلالت کسب کرے گا تو غضب خداوندی کا مستحق ہوگا اس اعتبار سے اس کا فاعل وخالق ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ کاسب ہونا ثابت ہوتا ہے قرآن حکیم میں ارشاد ہے "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"۔

فائدہ پنجم: یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کا آغاز اللہ عز شانہ تعالیٰ کی حمد وثنا پر مشتمل ہے جب کہ سورہ مبارکہ کا آخر حصہ ایمان واقرار اور طاعت سے اعراض کرنے والوں کی مذمت پر مشتمل ہے۔ اس سے اس بات کی طرف دلالت ہے کہ مطلع خیرات اور عنوان سعادات اللہ رب العالمین کی حمد وثنا اور اس کی بارگاہ میں حضوری ہے۔ اور مطلع آفات و بلیات اور راس آلام اللہ عز شانہ تعالیٰ سے اعراض، اس کی طاعت سے دوری اور اس کی عبادت سے کنارہ کشی کا نتیجہ ہے۔

فائدہ ششم: سورہ فاتحہ کی آیتوں سے ظاہر ہے کہ مکلفین کے تین فرقے ہیں پہلا فرقہ اہل طاعت کا ہے

اس کی طرف اشارہ ہوا اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ سے۔ دوسرا فرقہ اہل معصیت کا ہے جس کی طرف غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ سے اشارہ ہے۔ تیسرا فرقہ اہل جہالت یعنی کفار ومشرکین کا ہے جس کی طرف وَلَا الضَّآلِّيۡنَ سے اشارہ ہے۔

شبہ: اس مقام پر کسی کے ذہن میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ عصاۃ وفساق کو کفار ومشرکین پر مقدم کیوں کیا گیا ہے حالانکہ کفار ومشرکین، عصاۃ وفساق کے بالمقابل زیادہ شنیع وقبیح ہیں۔

جواب: یہ دیا گیا ہے کہ کفر سے تو ہر کوئی بچتا ہے لیکن فسق سے ہر آدمی نہیں بچتا بلکہ بہت سے مومنین بھی فسق کا ارتکاب کر لیتے ہیں اس اعتبار سے فسق زیادہ اہم ہوا لہذا فساق وعصاۃ کو مقدم کیا۔ علاوہ ازیں مکلفین کے تین درجات ہیں درجہ فسق کا متوسط ہونا ہی تقاضائے عقل کے مطابق ہے اس لئے اولیٰ واعلیٰ درجہ مومنین کا پہلے بیان ہوا، اور اشنع واقبح درجہ کفر کا سب سے بعد میں بیان ہوا اور فسق ان دونوں کے درمیان ہے اس لئے وسط میں یا کفر سے پہلے فسق کا بیان ہوا۔

فائدہ ہفتم: آیت ''غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ'' میں ایک دوسرا سوال یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ قبیح اور جنایت کے صدور کے سبب اللہ تعالیٰ کا غضب ہوتا ہے تو اس کا مفاد یہ ہے کہ قبیح اور جنایت کے صدور کا علم رب تعالیٰ کو پہلے سے ہے ظاہر ہے کہ بغیر علم کے وہ غضب نازل نہیں کرسکتا پس اس علم کے بارے میں سوال ہے کہ وہ علم قدیم ہے یا حادث اگر قدیم ہے تو سوال ہوگا کہ اس نے اسے پیدا ہی کیوں کیا اور کیوں اسے پردہ عدم سے صفحہ ہستی میں لایا جب کہ وہ ازل سے جانتا تھا کہ اس کو وجود دینے سے وہ دائمی عذاب کا مستحق ہوگا علاوہ ازیں یہ بھی معقول ہے کہ جو کسی شئی پر غضبناک ہوگا وہ اس کی ایجاد وتکوین پر اقدام کا ارادہ کیونکر کرسکتا ہے۔ اور اگر وہ علم حادث ہے تو باری تعالیٰ کا محل حوادث ہونا لازم آتا ہے اور یہ محال ہے علاوہ ازیں اس علم حادث کے بارے میں سوال ہوگا کہ جب وہ حادث ہے تو سابق میں علم وارادہ کا مقتضی ہوگا کہ ہر حادث سے پہلے علم وارادہ چاہئے پس اب علم حادث سے پہلے علم سابق کے بارے میں سوال ہوگا کہ وہ علم سابق علم حادث کا عین ہے یا غیر اگر عین ہے تو دور لازم آتا ہے اور غیر ہے تو تسلسل اور دور وتسلسل محال ہے۔

جواب: ''يَفۡعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيَحۡكُمُ مَا يُرِيۡدُ'' یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اس کے فعل وامر میں کسی کو مجال دم زدن نہیں۔

فائدہ ہشتم: آیت میں ایک یہ بھی سوال ہے کہ جو "مُنْعَم عَلَيْهِمْ "ہیں ان کا "مغْضُوْب عَلَيْهِم اور ضَالِّيْن "ہونا ممتنع ومحال ہے پس جب ارشاد "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "ذکر کیا تو اس کے بعد "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ "کے ذکر کی ضرورت نہ تھی آخر کار اس میں کیا فائدہ ہے۔؟

جواب: یہ ہے کہ ایمان خوف ورجاء یعنی امید وبیم سے کامل ہوتا ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالیشان ہے "لو وزن خوف المومن و رجاءہ لاعتد لا"یعنی مومن کے خوف ورجاء کو وزن کیا جائے تو دونوں ہم پلہ ہوں گے۔ جب کمال ایمان خوف و رجاء کے مجموعہ سے حاصل ہوتا ہے پس اس لحاظ سے ارشاد "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "رجاء کامل کو ثابت کرتا ہے جب کہ ارشاد "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ "خوف کامل کو واجب کرتا ہے اس وقت ایمان اپنے دونوں رکن کے پائے جانے کے سبب قوی اور کامل ہوجاتا ہے۔

فائدہ نہم: ایک سوال مزید یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ مقبولین کا صرف ایک گروہ قرار دیا جب کہ مردودین کا دوگروہ ذکر ہوا، مقبولین کا وہ گروہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا اور مردودین کے دوگروہ وہ ہیں جن پر غضب نازل ہوا اور جو بہکے ہوئے ہیں۔؟

جواب: یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر نعمت الہیہ تام اور کامل ہوئیں وہ وہ ہیں جو ذات حق تعالیٰ کی معرفت اور خیر عمل دونوں کے جامع ہوں ارشاد "الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "سے یہی نفوس انعام یافتہ مراد ہیں پس اگر قید عمل مختل ہوجائے تو وہ فاسق ہوں گے جن پر غضب نازل ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہے "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ "اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور اس پر لعنت کی (النساء: ۹۳) اور اگر قید علم و معرفت مختل ہوجائے تو وہ ضالون ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ "(یونس: ۳۲) اس لئے اہل حق مُنْعَم عَلَيْهِمْ کا ایک فرقہ ہوا اور مغْضُوْب عَلَيْهِم اور ضَالِّيْن کے دوگروہ شمار ہوئے۔

فائدہ دہم: "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ "کی تفسیر آج کے حالات کے تناظر میں،

یہ تفسیر شیخ طریقت، قائد ملت حضرت علامہ مولانا سید شاہ محمد محمود اشرف اشرفی الجیلانی سجادہ نشین آستانہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ کی ایک تقریر سے ماخوذ ہے جشن حفظ حدیث کے موقع پر یہ تقریر آپ نے شعبان ۱۴۴۰ھ میں مالیگاؤں مہاراشٹر میں کیا تھا، اس جشن میں راقم السطور بحیثیت ممتحن وخطیب خود موجود تھا۔

حضرت قائد ملت نے اپنی تقریر میں فرمایا'' آپ نماز میں سورہ فاتحہ روزانہ پڑھتے ہیں چونکہ نماز میں اس کا پڑھنا واجب ہے، جب آپ پوری سورہ فاتحہ پڑھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ'' بھی پڑھتے ہیں اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر آپ اپنے علما وخطبا سے خوب سن چکے ہیں کہ مُنْعَم عَلَيْهِمْ سے حضرات انبیاے کرام علیہم السلام، صدیقین، شہدا اور صالحین مراد ہیں لیکن آیت کے دوسرے جزء اور آخری حصہ کی تفسیر اور اس سے متعلق بیانات بہت کم سننے کو ملتے ہیں البتہ حضرات جمہور مفسرین نے اپنی کتابوں میں فرمایا ہے کہ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہود اور الضَّآلِّيْنَ سے نصاریٰ مراد ہیں، مگر جس زمانہ اور جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اور جس ملک میں بود و باش رکھتے ہیں وہاں دور دور تک کہیں یہود و نصاریٰ نظر نہیں آتے تو پھر نماز میں ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے''(یہود) اور الضَّآلِّيْنَ (نصاریٰ) سے دور ونفور رہنے اور ان سے بچنے کی دعا کا فائدہ کیوں کر مرتب ہوسکتا ہے لیکن جب ہم یہود پر غضب الٰہی ہونے اور نصاریٰ کے گمراہ ہونے کی علتوں پر غور کریں کہ آخر یہود پر غضب الٰہی کیوں ہوا؟ اور نصاریٰ گمراہ کیوں ہوئے؟ تو یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ یہود شان الوہیت اور بارگاہ رسالت کے گستاخ ہیں چنانچہ یہود یوں نے اللہ عزوجل اور حضرات انبیاے کرام کی شان میں پے در پے گستاخیاں کی ہیں حتی کہ حضرات انبیا کے قتل کے مجرم ہوئے اس لئے غضب الٰہی کے مستحق ہوئے قرآن حکیم میں ایک مقام پر یہودیوں کی شان الوہیت وشان رسالت میں گستاخیوں کا ذکر اس طرح ہوا۔''لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ''۔(آل عمران آیت:۱۸۱) یعنی بیشک اللہ نے سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی، اب ہم لکھ رکھیں گے ان کا کہا اور انبیا کو ان کا ناحق شہید کرنا اور فرمائیں گے کہ چکھو آگ کا عذاب۔

اور رہے نصاریٰ تو وہ گمرہی کی حدوں کو پار کر گئے چنانچہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے بارے میں اس حد تک غلو کیا کہ ان کو خدا، خدا کا بیٹا اور ان کی ماں کو خدا کی بیوی تک کہہ ڈالا (معاذ اللہ) اس لئے ضلالت وگمرہی کے قعر مذلت میں گر گئے۔

اب آپ تواریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہودی گستاخوں نے مسلمانوں میں ایک گستاخ فرقہ پیدا کیا جنہوں نے اللہ ورسول جل وعلا وصلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں زبردست گستاخیاں کیں چنانچہ انہوں نے امکان کذب

باری تعالیٰ کا قول کیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جیسا بشر، بڑا بھائی کہا، رسول اللہ کے علم کو جاہل، پاگل، بچوں اور جانوروں کے علم سے تشبیہ دی، نماز میں ان کے خیال آنے کو، بیل و گدھا کے خیال سے بدتر بتایا، یہاں تک کہا محمد یا علی جس کا نام ہے وہ کسی چیز کا مالک ومختار نہیں، وغیرہ جیسے گستاخانہ نظریات مسلمانوں میں پھیلائے، یہ گستاخ فرقہ وہابی ہے اسی طرح عیسائیوں نے اپنی طرح ایک غالی فرقہ جنم دیا، جنہوں نے مولیٰ علی مشکل کشا رضی اللہ عنہ کی محبت میں اتنا غلو کیا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو کافر ومرتد کہہ ڈالا، ان کی شان میں گستاخیوں کی انتہا کردی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ودیگر انبیاے کرام پر فضیلت دی بلکہ ان کے بعض جاہلوں نے تو انہیں خدا تک کہہ ڈالا جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہا وغیرہ

غرض کہ جو یہود کی فطرت تھی وہ آج وہابیوں میں پائی جاتی ہے اور جو عیسائیوں کی فطرت تھی وہ آج رافضیوں میں پائی جاتی ہے۔ پس آج کے اعتبار سے آیت " صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ " کا مطلب یہ ہوگا، اے اللہ! ہمیں ان کے راستہ پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا نہ ان کے راستہ پر جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ بہکے ہوؤں کا، یعنی نہ یہودی ووہابی گستاخوں کے راستہ پر اور نہ عیسائی ورافضی گمراہوں کے راستہ پر چلا۔ قرآن حکیم میں ان کی ضلالت وگمرہی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا "یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۫ۚ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ "۔(النساء آیت:۱۷۱)

یعنی اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو مسیح عیسی ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول ہیں اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں، پس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور تثلیث (تین معبود ہونے) کا دعویٰ نہ کرو باز آجاؤ، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ مختصر یہ کہ یہود کے "مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ" ہونے کی علت ان کی گستاخیاں ہیں اور عیسائیوں کی گمرہی کی علت ان کا دین میں غلو ہے اور آج یہ دونوں باتیں اور دونوں علتیں وہابیوں اور رافضیوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں اس لئے "الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ" میں وہابی "الضَّآلِّیْنَ" میں رافضی بھی داخل ہوں گے۔

★★★★

★★

قسم ثانی

سورہ فاتحہ کی مجموعی تفسیر کا بیان

اس میں چند فصلیں ہیں:۔

فصل اول: اس سورہ سے مستنبط اسرار عقلیہ کے بیان میں۔

یاد رہے کہ یہ عالم رنگ و بو مادی دنیا ہے اور عالم آخرت عالم صفا اور روحانی دنیا ہے۔ اس لحاظ سے آخرت دنیا کی طرف نسبت کرتے ہوئے اصل کی طرح ہے اور دنیا فرع ہے۔ یا جس طرح جسم وظل کو نسبت ہے کہ جسم اصل ہے اور ظل اس کا عکس، ظل کا وجود بغیر جسم کے محال ہے ایسے ہی دنیا کا وجود بغیر آخرت کے تصور کے محال ہے۔ اور جب آخرت اصل ہے اور دنیا اس کی فرع ہے تو جو چیز دنیا میں پائی جائے گی وہ بطور فرعیت ہوگی اور اس کی اصل آخرت میں ضرور ہوگی ورنہ سراب باطل اور خیال عاطل کی طرح ہو کر رہ جائے گی۔ اسی طرح جو چیز آخرت میں ہوگی اس کی مثال وظل یا فرع و عکس دنیا میں ضرور پائی جائے گی ورنہ بے پھل کے درخت اور بغیر دلیل کے مدلول کی طرح ہوگی۔

غرض کہ عالم آخرت، عالم روحانیات، عالم انوار و برکات ہے بہجت وسرور، اور فرحت وشادمانی کی دنیا ہے تاہم عالم روحانیات کمال ونقصان کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں پس ضروری ہے کہ اس میں ایک ایسا فرد ہو جو سب سے اشرف و اعلیٰ اور بزرگ واکمل ہو جو سب کا مطاع ہو اور اس کے ماسوا سب اس کے مطیع ہوں اور سب اس کے امر ونہی کے تحت ہوں اور تابع فرمان ہوں جیسا کہ ارشاد ہے ”ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ“ یعنی جو قوت والا ہے مالک عرش کے حضور عزت والا وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے۔ (التکویر:۲۱) اسی طرح اس دنیا میں بھی ایک شخص منفرد و بے مثال کا وجود ضروری ہوگا جو اس عالم میں سب سے اشرف واعلیٰ اور بزرگ واکمل ہوگا جو سب کا مطاع ہوگا اور سب اس کے مطیع وفرماں بردار ہوں گے۔ اس عالم کا سب اس کے امر ونہی کے تحت ہوگا اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عالم روحانیت میں ایک مطاع ہوگا اور عالم جسمانیت میں ایک مطاع ہوگا بلفظ دیگر ایک عالم بالا کا مطاع ہوگا اور ایک عالم اسفل کا مطاع ہوگا۔

اور جب مذکورہ بالا سطور سے معلوم ہو گیا کہ عالم جسمانیات، عالم روحانیات کے لئے ظل وفرع کی طرح ہے تو ضروری ہے کہ ان دونوں مطاع کے درمیان مقارنت اور مجانست بھی ہو کیونکہ فرع واصل کے درمیان مقارنت ومناسبت ضرور

ہوتی ہے پس عالم ارواح میں مطاع مصدر کہلاتا ہے اور عالم اجسام میں مطاع مظہر ہوتا ہے مصدر رسول ملکی ہوتے ہیں اور مظہر رسول بشری ہوتے ہیں انہیں دونوں سے دارین کی سعادتیں پائے تکمیل کو پہنچتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد معلوم رہے کہ رسول بشری کے احوال کا کمال دعوت الی اللہ کے وقت ظاہر ہوتا ہے اور دعوت رسالت سات امور سے تام ہوتی ہے جن کو اللہ عز شانہ تعالیٰ نے سورہ البقرۃ کے خاتمہ میں ذکر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تُحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ" یعنی رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اس پر اترا اور ایمان والے، سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے۔ اور عرض کی کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا تیری معافی ہو اے رب ہمارے اور تیری ہی طرف پھرنا ہے۔ اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر، اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر بھولیں یا چوکیں اے رب ہمارے اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا اے رب ہمارے ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم برداشت نہ کر سکیں اور ہمیں معاف فرما دے اور بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولیٰ ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔ (البقرۃ: ۲۸۵) سورہ بقرہ شریف کی آخری مندرجہ دونوں آیات سے مفہوم احکام بھی احکام رسول میں داخل ہیں۔ پس یہ چاروں ایمانیات جن کا ذکر ابتداء آیت میں ہے معرفت مبدا سے متعلق ہے اور وہ معرفت ربوبیت ہے، پھر اس کے بعد اسکو ذکر کیا جس کا تعلق معرفت عبودیت سے ہے۔

اس کی بنیاد دو باتوں پر ہوتی ہے ایک مبدأ دوسرا کمال، مبدأ وہ ارشاد باری تعالیٰ "وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫" ہے اس لئے کہ جو اللہ عز شانہ تعالیٰ کی طرف رجوع چاہتا ہے اس کے لئے ابتداءً سمع وطاعت واجب ہے۔ رہا کمال تو وہ اللہ پر توکل اور بالکلیہ بارگاہ الوہیت میں سپردگی سے حاصل ہوتا ہے ارشاد "غُفْرَانَكَ رَبَّنَا" سے اس طرف

اشارہ ہے چنانچہ اعمال بشریہ اور طاعات انسانیہ سے قطع نظر، بالکلیہ اللہ رب العزت کی طرف ملتجی ہونا اسی کی رحمت کا امیدوار ہونا اور اسی سے مغفرت طلب کرنا، توکل کا کمال ہے۔ پس جب بندہ کو یہ دونوں معرفت، یعنی معرفت ربوبیت و معرفت عبودیت بطور اصول مذکورہ حاصل ہوجاتی ہیں تو معرفت تام ہوجاتی ہے اب اس وقت بندہ کو ملک وہاب کی درگاہ تک رسائی ہوجاتی ہے اور معاد تک پہنچنے کی استعداد ہوجاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ "وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ" سے اس طرف اشارہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات میں تین قسم کے مراتب و درجات ہیں مبداء، وسط، معاد۔

(۱) مبدأ: اسکی معرفت چار چیزوں کی معرفت کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ اللہ رب العزت کی معرفت، ملائکہ کی معرفت، کتب الہیہ کی معرفت اور رسول کی معرفت ہے۔

(۲) مرتبہ وسط: اس کی معرفت دو امر کی معرفت کے بعد حاصل ہوتی ہے ایک "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" اور دوسرا "غُفْرَانَكَ رَبَّنَا" اول سے عالم اجساد کی معرفت ہوتی ہے اور دوم سے عالم ارواح کی معرف ہوتی ہے۔ رہا مرتبہ نہایت یا معاد تو وہ ایک امر سے حاصل ہوتا ہے اور وہ ارشاد "وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ" ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مبدأ کے لئے چار امور، وسط کے لئے دو امر اور نہایہ کے لئے ایک امر کی معرفت ضروری ہے۔

پس جب معرفت کے یہ ساتوں مراتب حاصل ہوجاتے ہیں تو رب تعالیٰ سے دعا اور اس سے تضرع کرنے میں سات مراتب متفرع ہوتے ہیں۔

اول: ارشاد باری تعالیٰ "رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِینَا اَوْ اَخْطَانَا" (البقرۃ:۲۸۶) آیت میں بھول و چوک میں پکڑ نہ کرنے کی دعا ہے۔ اور یہ معلوم کہ نسیان (بھول) کی ضد ذکر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا (الاحزاب:۴۱)، اور ارشاد ہے "وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ" (الکھف:۲۴) نیز یہ بھی ارشاد ہے "تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ" (الاعراف:۲۰۱) اور ارشاد ہے "وَاذْكُرِاسْمَ رَبِّكَ" (المزمل:۸)۔ ان آیات میں جس ذکر کا مطالبہ ہے وہ ارشاد الٰہی "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" سے حاصل ہوجاتا ہے۔

دوم: "رَبَّنَا وَلَا تُحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا" (البقرۃ:۲۸۶) اس آیت میں دفع اصر کی دعا ہے چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ اس موقع پر حضرت جبرئیل امین نے عرض کیا اے اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی اور آپ کے تابعدار امت کی یہاں ثناوصفت بیان ہورہی ہے آپ اس موقع پر دعا کیجئے قبول کی جائے گی مانگئے کہ اللہ کسی کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دے پھر فرمایا اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا یہ اس کا لطف وکرم اور غایت انعام واحسان ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے رب کے کلام سے دعا فرمایا اور یہ دعا قبول ہوئی اس لئے امم سابقہ کی طرح تکلیف با مشقت کے ساتھ اس امت کو مکلف نہ بنایا گیا جب رب تعالیٰ کی کرم نوازی ایسی ہے تو وہ حمد الٰہی کو واجب کرتا ہے۔ اور جب بندہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کہتا ہے تو حمد رب العلمین ادا ہوجاتی ہے۔

سوم: ارشاد رب العالمین "رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ" میں بھی رب کے کمال رحمت کی طرف اشارہ ہے ظاہر ہے کہ جب دینے والا خود ہی مانگنے کا ڈھنگ بتائے تو ملنے کا یقین خود بخود پیدا ہوجاتا ہے بلکہ رب عالم کی طرف سے اس دعا کی بھی قبولیت کا اعلان ہوا ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم" ہے۔

چہارم: ارشاد ہے "وَاعْفُ عَنَّا" اس دعا میں اللہ غفور رحیم سے عفو ودرگزر کی درخواست ہے کیونکہ روز جزا اور یوم حساب میں وہی قضا وفیصلے کا مالک ہے جیسا کہ فاتحہ میں ہے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"۔

پنجم: ارشاد ہے "وَاغْفِرْ لَنَا" اس میں مغفرت وبخشش کی دعا ہے اس لئے کہ بندہ دنیا میں اسی کی عبادت کرتا ہے اور اسی سے ہر امور ومقاصد میں مدد چاہتا ہے جیسا کہ سورہ فاتحہ میں ارشاد ہوا "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ"۔

ششم: ارشاد باری تعالیٰ "وَارْحَمْنَا" میں بندہ نے رب تعالیٰ سے رحم وکرم کی دعا کی ہے کہ بندہ نے اسی سے ہدایت بھی طلب کی ہے جیسا کہ سورہ فاتحہ میں "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے منصوص ہے۔

ہفتم: ارشاد باری تعالیٰ "اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ" اس میں رب تعالیٰ کے آقا و مولیٰ اور حامی وناصر ہونے کا پہلے اقرار ہے پھر کفار ومشرکین کے بالمقابل حمایت ونصرت کی دعا ہے جو بعینہ ارشاد "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کے ہم مراد ہے۔

سورہ بقرہ کے اواخر میں جو ساتوں مراتب مذکور ہوئے ان کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عالم روحانیت میں معراج شریف میں عروج فرماتے وقت پڑھا تھا پھر جب معراج سے نزول فرمایا تو مصدر کے اثر کا فیضان مظہر پر ہوا پس اس کی تعبیر سورہ فاتحہ سے ہوئی لہذا جو کوئی نماز میں اس کی قرأت کرتا ہے تو یہ انوار مظہر سے مصدر کی طرف صعود کرتے

ہیں جیسے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات طیبہ میں ان انوار کا نزول مصدر سے مظہر کی طرف ہوا اسی سبب سے حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "الصلوٰۃ معراج المومنین"۔

فصل دوم: مداخل شیطان کے بیان میں۔

واضح رہے کہ جن راہوں سے شیطان کا داخلہ ہوتا ہے اصل میں وہ تین ہیں:

(۱) شہوت، (۲) غضب، (۳) ھویٰ

شہوت بہمیہ کہلاتی ہے، غضب سبعیہ کہلاتا ہے اور ھویٰ شیطانیہ کہلاتی ہے۔ غرض کہ شہوت و غضب اور ھویٰ تینوں آفات ہیں لیکن غضب، شہوت کی بہ نسبت بڑی آفت ہے اور غضب سے بڑھ کر آفت ھویٰ کی ہے۔ ارشاد رب العلمین "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ" (العنکبوت: ۴۵) میں فحشاء سے مراد آثار شہوت ہے۔ منکر سے مراد، آثار غضب ہے اور البغی سے مراد آثار ھویٰ ہے شہوت کے سبب انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے جب کہ غضب کے سبب انسان دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ اور ھویٰ تو ایسی قبیح ہے کہ اس کا ظلم درگاہ جلال باری تک متعدی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ظلم تین قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) ایک قسم ظلم کی، وہ ہے جو بخشا نہ جائے گا۔

(۲) دوسری قسم ظلم کی، وہ ہے جو چھوڑا نہ جائے گا۔

(۳) تیسری قسم ظلم کی، وہ ہے جس کے چھوڑے جانے کی امید ہے۔

(۴) جو ظلم نا قابل مغفرت و نا قابل معافی ہے یا جو بخشا نہ جائے گا وہ شرک باللہ ہے۔ اور وہ ظلم جو چھوڑا نہ جائے گا وہ ایک بندہ کا دوسرے پر ظلم کرنا ہے رہا تیسری قسم کا ظلم جس کی معافی کی امید ہے وہ بندہ کا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ وہ ظلم جو نا قابل مغفرت ہے اس کا منشاء ھویٰ ہوتا ہے۔ وہ ظلم جو چھوڑا نہ جائے گا اس کا مبدأ غضب ہوتا ہے اور وہ ظلم جس کے بارے میں رب تعالیٰ سے ترک کی امید ہے اس کا مبدأ شہوت ہے پھر ان تینوں مذکورہ آفات کے نتائج بڑے بھیانک ہوتے ہیں چنانچہ حرص و بخل شہوت کا نتیجہ ہے، عجب و کبر غضب کا نتیجہ ہے اور کفر و بدعت، ھویٰ کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کل چھ مذموم و مقبوح صورتیں ہوئیں یہ چھ مقبوح و مذموم باتیں جس کسی انسان میں مجتمع ہو جاتی ہیں تو ساتویں نہایت مذموم حالت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حسد ہے جو اخلاق ذمیمہ میں نہایت ہی بدترین صفت کہلاتی ہے جس طرح کہ شیطان، شریر اشخاص میں نہایت ہی بدترین سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے جب انسانی شرور کو یکجا

بیان فرمایا تو سورہ کو سب سے آخری شر حسد کے ذکر پر ختم فرمایا ارشاد ربانی ہے "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ" (الفلق:۵) اور شیطانی خباثتوں کو ذکر کیا تو شیطانی وسوسہ پر ختم فرمایا ارشاد ہوا "الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" (الناس:۶)

غرض کہ بنی آدم میں حسد سے زیادہ کوئی شر نہیں جیسا کہ شیاطین میں وسوسہ سے زیادہ کوئی شر نہیں بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ حاسد، ابلیس سے زیادہ شر والا ہے جیسا کہ روایت ہے کہ ابلیس فرعون کے دروازہ پر آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا، فرعون بولا کون؟ ابلیس بولا میں ابلیس، اگر تو خدا ہوتا تو مجھ سے جاہل نہ رہتا، جب ابلیس اندر داخل ہوا تو فرعون نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ مجھ سے اور تجھ سے زیادہ شر والا کون ہے ابلیس نے جواب دیا ہاں مجھ سے اور تجھ سے زیادہ شر والا حاسد ہے حسد ہی کا نتیجہ ہے کہ میں گرفتار بلا ہوا۔

اس تمہید کے بعد یہ خیال رہے کہ رذائل اخلاق کے بنیادی اصول وہ تین ہیں جو پہلے مذکور ہوئے اور بعد کے سات رذائل اخلاق اس تین کے نتائج وثمرات ہیں۔ پس اللہ رب العالمین نے ان ساتوں آفات ورذائل کے ازالہ کے لئے سات آیات والی بابرکت سورہ مبارکہ، سورہ فاتحہ نازل فرمائی کہ جو بندہ اس سورہ مبارکہ کی تلاوت کریگا اس سے رذائل اخلاق دور ہو جائیں گے۔

نیز سورہ فاتحہ میں اصل تسمیہ ہے یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور اس میں تین اسماء الٰہیہ ہیں۔ اللہ، الرحمن، الرحیم یہ تینوں اسمائے مبارکہ مذکورہ تینوں اخلاق اصلیہ رذیلہ کے مقابل وارد ہوئے ہیں اور سورہ فاتحہ کی سات آیتیں مذکورہ سات اخلاق رذیلہ فرعیہ کے مقابل میں وارد ہوئیں۔ گویا کہ پورا قرآن حکیم سورہ فاتحہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے نتائج وثمرات کی طرح ہے۔ اسی طرح تمام اخلاق ذمیمہ مذکورہ ساتوں اخلاق رذیلہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کے ثمرات ونتائج ہیں غرض کہ پورا قرآن حکیم جملہ اخلاق رذیلہ اور اوصاف ذمیمہ کے لئے علاج ودوا ہے۔

رہا یہ بیان کہ سورہ فاتحہ کے آغاز میں تسمیہ میں مذکورہ تین اسماء الٰہیہ اصلیہ تین اخلاق ذمیمہ اصلیہ کے مقابل میں ہیں تو اس کی مختصر تفصیل کچھ یہ ہے کہ جس کو خدائے تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ بھی معرفت ہو جائے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس سے شیطان اور ھویٰ دور ہو جاتے ہیں چونکہ کچھ لوگوں نے خدائے حقیقی کے سوا اپنی ھویٰ کو معبود ٹھہرالیا جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے "اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ" یعنی بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرایا لیا (الجاثیۃ: ۲۳)

اور روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ارشاد فرمایا کہ اے موسیٰ اپنی ھوی اور خواہش نفس کی مخالفت کرو کیونکہ میں نے جتنی مخلوق کو پیدا کیا کسی نے بھی میرے ملک میں مجھ سے منازعت نہیں کی سوائے ھویٰ کے۔ پھر جس کو اس بات کی معرفت ہو جاتی ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ رحمن ہے وہ غضبناک نہیں ہوتا کیونکہ غضب کا منشا، طلب ولایت ہوتا ہے اور ولایت اللہ رحمن کے لئے ہے ۔ ارشاد ربانی ہے "اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ" (الفرقان:۲۶) اسی طرح جس کو یہ معلوم ہے کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ رحیم ہے اور اس نے اپنے بندہ کو بھی اپنے فضل سے رحیم فرمایا ہے اس بندہ کو لازمی طور پر چاہئے کہ وہ اپنے کو صفت رحیمی سے متصف کرلے اور جو اپنے لئے رحیم ہوگا وہ اپنے آپ پر ظلم نہیں کرے گا اور اپنے نفس کو افعال ذمیمہ، اور حیوانیت و درندگی جیسی حرکتوں سے بیکار نہیں کریگا۔

اب رہی وہ سات بری خصلتیں جو تین اوصاف قبیحہ اصلیہ کے بطن سے جنم لیتی ہیں وہ ساتوں، ساتوں آیات فاتحہ کے مقابل میں ہیں اس کے بیان سے پیشتر ایک دقیق نکتہ ملحوظ نظر رہے۔

نکتہ یہ ہے کہ تسمیہ میں جو تین اسماء الٰہیہ اصلیہ مذکور ہیں بعینہا وہ تینوں اسماء حسنیٰ، نفس سورہ فاتحہ میں بھی ہیں اس کے ساتھ مزید دو اسمائے مقدسہ الرب اور المالک بھی مذکور ہیں، پس اسم باری تعالیٰ "اَلرب" اسم باری تعالیٰ "الرحیم" سے قریب المعنی ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "سَلٰمٌ ۣقَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" (یٰسین: ۸۵) اور اسم الٰہی "المالک" اسم جلالت "الرحمن" کے قریب المعنی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے "اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ" اس دن سچی بادشاہی رحمن کی ہے (الفرقان:۲۶) اس طرح تین اسمائے مبارکہ ہوئے۔ ایک الرب، دوسرا المالک اور تیسرا الاله، جب آغاز قرآن حکیم میں تین اسماء الٰہیہ ہیں تو اختتام قرآن میں بھی اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اپنے تین اسماء حسنیٰ کے ساتھ آخری سورہ کو ختم فرمایا گویا کہ یہ فرمایا گیا کہ اگر شیطان تمہارے پاس شہوت کے اور سے آئے تو تم کہو "اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اگر تمہارے پاس غضب کی طرف سے شیطان داخل ہونے لگے تو تم پڑھو "مَلِكِ النَّاسِ" اور اگر شیطان ھویٰ کی طرف سے آئے تو تم کہو "اِلٰهِ النَّاسِ"۔

مذکورہ نکتہ ذہن نشین کرنے کے بعد یہ سمجھیں کہ سات خصائل ذمیمہ کے مقابلہ و معارضہ میں سات آیات فاتحہ ہیں پس جس نے ایمان و اخلاص کے ساتھ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کی ساتوں آیات قرأت کر لی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرلیا اور وہ اس سے حاصل برکات کے سبب دوسری چیزوں سے بے نیاز ہو گیا۔ اس وقت اس کی شہوت زائل ہو جاتی

ہے اور جس کو معرفت ہوگئی کہ وہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے اس سے حرص ولالچ دور ہوجاتی ہے ان چیزوں کی جو اس کے پاس نہیں ہے اور جو اس کے پاس ہے اس سے بخل کی عادت جاتی رہتی ہے۔ اس طرح اس سے شہوت اور اس کے لذات مندفع ہوجاتے ہیں پھر جس کو اس ذات کریم کے رحمن ورحیم ہونے کی معرفت کے ساتھ یہ یقین ہوجائے کہ وہ "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" ہے اس سے غضب کا خاتمہ ہوجاتا ہے پھر اگر اس نے یہ کہا "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" تو اس کے حصر عبادت کے اقرار کرنے سے اس سے کبر ونخوت اور طلب معونت کے اقرار سے عجب وگھمنڈ کا ازالہ ہوتا ہے۔ غرض کہ اس کی قرأت سے غضب اور دونوں ثمرات یکسر ختم ہوجاتے ہیں۔ اب اس کے بعد بندہ جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" پڑھتا ہے تو اس سے شیطان ھویٰ کوسوں دور بھاگ جاتا ہے۔ اسی طرح جب "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" پڑھتا ہے تو اس سے کفر اور اس کے شبہات زائل ہوجاتے ہیں اور جب "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ" پڑھتا ہے تو اس سے خرافات بدعت جاتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سورہ فاتحہ کی ساتوں آیات مبارکہ، ساتوں اخلاق ذمیمہ قبیحہ کے دفع وازالہ کے لئے شافی علاج ہیں۔

فصل سوم: مبدا ومعاد اور وسط کی معرفت میں۔

یعنی اس بیان میں کہ مبدا، معاد اور وسط کی معرفت میں انسان کو جن باتوں کی طرف احتیاج ہے سورہ فاتحہ ان تمام باتوں کی طرف نشاندہی فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" میں صانع مختار کے اثبات کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ قرآن حکیم میں صانع کے اثبات پر خلقت انسان سے استدلال فرمایا گیا ہے ملاحظہ ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ "رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ" میرا رب وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے (سورہ بقرہ :۲۵۸) دوسری جگہ فرمایا "الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ" وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہ مجھے راہ دے گا (سورۃ الشعرأ:۷۸) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى" ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے لائق صورت دی پھر راہ دکھائی (طہ:۵۰) ایک دوسرے مقام پر فرمایا "قَالَ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ" موسیٰ نے فرمایا رب تمہارا اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا (الشعرأ:۲۶) سورہ بقرہ کے آغاز میں ارشاد ربانی ہے "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" اے لوگوں! اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا فرمایا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے (البقرۃ:۲۱) اسی طرح قرآن حکیم کے اول سورہ، سورہ اقرأ کی ابتداء میں ارشاد ہوا "اِقْرَاْ بِاسْمِ

رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ" پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا۔(العلق:۱)

مندرجہ بالا متلوہ چھ آیات مبارکہ سب صریح ناطق اور واضح دلیل ہیں کہ اللہ عز شانہ تعالیٰ نے اپنی ذات کریم کے صانع ہونے پر خلقت انسانی سے استدلال فرمایا ہے بلکہ قاری قرآن پر یہ پوشیدہ نہیں کہ صرف یہ چھ آیات ہی نہیں بلکہ سینکڑوں آیات کریمہ میں اللہ عز شانہ تعالیٰ نے انسان کی ابتدائی پیدائش اور آغاز خلقت کا حال بیان فرما کر اپنی قدرت وصناعیت اور قیامت میں حشر اجساد ہونے پر انسانی افکار کو دعوت فکر وتدبر دی ہے۔رب تعالیٰ کے صانع ہونے پر خلقت انسانی سے استدلال میں ادنیٰ تأمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دلیل کی دو حیثیت ہے۔

ایک دلیل ہونے کی حیثیت، دوسری اس کے انعام عظیم ہونے کی حیثیت، اس حیثیت سے کہ بندہ کو اس سے صانع کے وجود کی معرفت حاصل ہوتی ہے یہ دلیل ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ ایسا نفع عظیم ہے جو بندہ کو رب سے ملا ہے انعام ہے۔غرض دلیل کی یہ نوع من وجہ دلیل ہے اور من وجہ انعام ہے اور جب یہ انعام عظیم ہے تو انعام فرمانے والا مستحق حمد ہوگا کیوں نہ ہو کہ بدن انسان کی خلقت اور اس کا حدوث رب تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے کیونکہ ایک قسم کے پانی کے چند قطروں سے مختلف الطبائع اعضاء اور انواع واقسام کے اشکال وصور کا پیدا ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب خالق کائنات صانع عالم اسی اشکال وصور اور طبائع پر پیدا فرمانے کا قصد کرے بلکہ اس صانع عالم نے ایسا ہی کیا ارشاد ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ"۔

پس مختلف اعضا وطبائع اور انواع واقسام کے اشکال وصور کا حدوث یقیناً واضح دلیل ہے ایسے صانع کے وجود پر جو تمام معلومات کا عالم اور جملہ مقصودات پر قادر ہے جس نے صرف اور صرف اپنے فضل وکرم اور رحمت واحسان سے ان اعضاء کو ایسے مناسب طریق پر پیدا فرمایا جو انسانی مصالح ومنافع کے مطابق ہیں۔جب واقعہ یہ ہے تو یقیناً وہی کل حمد اور جمیع ثنا کا مستحق ہے پس ارشاد الٰہی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" صانع کے وجود، اس کے علم وقدرت، رحمت واحسان اس کے کمال حکمت اور اس کے مستحق حمد وثنا اور لائق تعظیم ہونے پر دلیل ہے۔

رہا ارشاد "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پس وہ دلیل ہے کہ الٰہ ایک ہے اور سارا جہان اس کا مُلک اور اس کی مِلک ہے اس کے سوا کوئی الٰہ ومعبود نہیں ظاہر ہے کہ جو سارے جہاں کے ذرے ذرے کا خالق وموجد اور ان سب کا مربی ہے وہی معبود ہوسکتا ہے یونہی ارشاد "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" دلیل ہے کہ وہ الٰہ واحد جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی کمال رحم وکرم اور

بے انتہا فضل واحسان سے موصوف ہے اس کا فضل وکرم قبل موت، وقت موت اور بعد موت ہر حال میں شامل ہے۔ اور ارشاد "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" دال ہے اس بات پر کہ اس کی رحمت وحکمت کا لازمہ اور تقاضہ ہے کہ اس دن کے بعد ایک یوم آخر ہو جس میں نیکوکار کا بدکار سے اور مومن کا کافر سے امتیاز ہو جائے اور ظالمین سے مظلوموں کا بدلہ لیا جا سکے اگر حشر ونشر نہ ہو تو اس کے رحمن ورحیم ہونے کا اظہار تام نہ ہو سکے گا اس بیان سے ثابت ہو گیا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" صانع مختار کے وجود پر "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اس کی وحدانیت پر "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" دنیا وآخرت میں اس کی رحمت کاملہ کے اظہار پر اور "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" دار آخرت کے پیدا کرنے کے سبب اس کے کمال حکمت، غایت رحمت پر روشن دلیل ہے غرضیکہ ارشاد اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک میں وہ سب باتیں موجود ہیں جن کی طرف بندہ معرفت ربوبیت میں محتاج ہے۔

اور "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" سے آخر سورہ تک ان امور کی طرف اشارہ ہے جن کی معرفت، تقریر عبودیت میں ضروری ہے اور یہ دونوع میں محصور ہے ایک وہ اعمال جسے بندہ ادا کرتا ہے، دوسری ان اعمال کے آثار جو بندہ کے کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے دو رکن ہوتے ہیں۔ ایک بندہ کا عبادت کا بجالانا، اس کی طرف ارشاد ربانی "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" سے اشارہ ہے دوسرا بندہ کا جاننا کہ وہ اللہ کی عبادت بغیر اس کی اعانت کے نہیں کر سکتا اس کی طرف "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" سے اشارہ کیا گیا ہے رہے اس کے آثار وبرکات جو عبادت الٰہی پر متفرع ہوتے ہیں وہ ہدایت وارشاد اور کشف وانوار کا حصول ہے اس کی طرف ارشاد ربانی "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے اشارہ ہے۔

پھر یہ معلوم کہ دنیا میں بسنے والے تین قسم کے لوگ ہیں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اللہ کے مخلص سچے بندے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں حق تعالیٰ کی معرفت ہونے کے ساتھ عمل صالح کرنے کے سبب خیر کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے یعنی دونوں کے جامع ہوتے ہیں۔ انہیں مقدس نفوس قدسیہ کی طرف "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" سے اشارہ ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو معرفت الٰہی تو رکھتے ہیں لیکن اعمال صالحہ سے تہی دامن ہوتے ہیں وہ فاسقین کا گروہ ہے اس کی طرف اشارہ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" سے کیا گیا ہے۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو عقائد حقہ صحیحہ سے ہی خالی وعاری ہیں وہ کفار ومشرکین اور اہل بدع کی جماعت ہے۔ اس کی طرف اشارہ "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" سے ہے۔

مذکورہ اشاریہ کے بعد یہ خیال رہے کہ نفس انسانی کو کمال، علوم ومعارف سے حاصل ہوتا ہے اور اس کی دو صورت

ہوتی ہے ایک یہ کہ فکر ونظر اور استدلال کے ذریعہ بندہ علوم ومعارف کے حصول کا قصد کرے۔ دوسرا یہ کہ سلف صالحین اور بزرگان دین کی سیرت طیبہ اور ان کی پاکیزہ حیات کا خلاصہ نگاہوں کے سامنے رکھے پھر اس پر چل کر انسان اپنے نفس کو کامل بنالے۔ ارشاد "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے پہلی صورت کی طرف اشارہ ہے جب کہ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" سے دوسری صورت کی طرف اشارہ ہے اس میں بندہ کو ہدایت ہے کہ وہ ایسے حق پرست جماعت کی پیروی کرلے جو عقائد حقہ اور اعمال صالحہ دونوں سے مزین وآراستہ ہوں ان کی اقتدا ہرگز نہ کریں جو اعمال صالحہ سے خالی ہوں کہ وہ جماعت فاسقین ومغضوب علیھم کی ہے اور نہ اس کے راستے پر چلے جو عقائد حقہ سے پھر کر ضلالت گمرہی اور بدعقیدگی کی تاریک بھنور میں اوندھے چلے جارہے ہیں کہ وہ لوگ ضالون کی جماعت ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سورہ فاتحہ، ربوبیت وعبودیت کی معرفت کے بیان میں جو مقامات ومنازل معتبر ہیں ان سب کو جامع ہے۔

فصل چھارم: حدیث قدسی اور اس کے فوائد کے بیان میں۔

حدیث قدسی ہے حضور نبی کونین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے رب تعالیٰ سے حکایت کرکے بیان فرمایا "قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی نصفین" (الخ) یعنی اللہ عزشانہ نے ارشاد فرمایا کہ سورہ فاتحہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان نصفا نصف تقسیم کردی گئی ہے چنانچہ بندہ مومن جب "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے مجھے یاد کیا، جب "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "حمدنی عبدی" میرے بندے نے میری حمد بیان کی ہے جب بندہ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہتا ہے تو اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے "عظمنی عبدی" میرے بندے نے میری تعظیم بجالائی، جب بندہ "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کہتا ہے تو رب فرماتا ہے "مجدنی عبدی" میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، ایک دوسری روایت میں ہے "فوض الی عبدی" میرے بندے نے اپنے کو مجھے سونپ دیا، پھر جب بندہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "عبدنی عبدی" میرے بندے نے میری عبادت کی اور جب بندہ "وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "توکل علی عبدی" میرے بندے نے مجھ پر توکل کیا، دوسری روایت میں ہے کہ جب بندہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ھذا بینی وبین عبدی" یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور جب بندہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہتا ہے تو رب کریم فرماتا ہے "ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل" یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو سوال کرے۔

واضح رہے کہ یہ روایت حضرت امام رازی نے اپنی تفسیر میں اسی طور پر نقل کیا ہے اس سے ان کا مقصود اپنے مذہب شافعی کے مسائل کا اثبات ہے ورنہ صحیح روایت جو ابتدائے اوراق میں باب فضائل سورہ میں مذکور ہے اس میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "نہیں ہے۔اس روایت کے مطابق ان کا مذہب تسمیہ کا جزء فاتحہ وسورہ ہونا کسی طور پر ثابت نہیں ہوگا۔حضرت امام رازی کی ذکر کردہ روایت کے مطابق حدیث مذکور سے مندرجہ ذیل فائدے مستفاد ہوتے ہیں۔

فائدہ اول: ارشاد رب العالمین "قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین" دلیل ہے کہ شرائع کا مدار مصالح خلق کی رعایت پر ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا" اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا"یعنی اگر تم بھلائی کروگے اپنا بھلا کروگے اور اگر برا کروگے تو اپنا (الاسرا:۷) چونکہ بندہ کے اہم ترین مقاصد میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے قلب کو معرفت ربوبیت اور معرفت عبدیت سے منور ومجلی کرلے کیونکہ بندہ کی تخلیق کا مقصود اسی عہد کی رعایت ہے جیسا کہ ارشاد ہے"وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" (الذاریات:۵۶) اور ارشاد ہے "اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا "بیشک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی مٹی سے کہ ہم اسے جانچیں تو اسے سنتا دیکھتا کردیا (الدھر:۲) اور ارشاد ہے "يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ "اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کرونگا (البقرۃ:۴۰) پس جب واقعہ یہ ہے تو اس لئے اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سورہ مبارکہ کو نازل فرمائی اور اس میں سے نصف اول کو معرفت ربوبیت کے لئے اور نصف آخر کو معرفت عبودیت کے لئے قرار دیا یہاں تک کہ یہ سورہ مبارکہ تمام ان باتوں کو جامع ہے جس کا انسان اس عہد کے ایفاء میں محتاج ہے۔

فائدہ دوم: حدیث "قسمت الصلوٰۃ" میں سورہ فاتحہ کو الصلوٰۃ سے موسوم کیا گیا ہے جس کا معنی مشہور و معروف نماز ہے سورہ فاتحہ کا نام "نماز" دینے سے چند احکام مستفاد ہوتے ہیں۔

احکام (۱): یہ کہ سورہ فاتحہ کی قراءت نہ کرنے کی صورت میں نماز حاصل نہ ہوگی کہ قرأت فاتحہ ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے جیسا کہ شوافع کہتے ہیں اس مسئلہ پر شوافع نے بہت سی دلیلیں دی ہیں۔(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فاتحہ کی قرأت پر مواظبت فرمائی ہے۔اس لئے ہم امتیوں پر بھی اس کی قرات واجب ہے چنانچہ قرآن حکیم میں

ارشاد ہے "فَاتَّبِعُوْهُ"(انعام:۱۵۳) حدیث شریف میں ہے حضور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا"صلوا کما رأیتمونی اصلی"

(۲) حضرات خلفاے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سورہ فاتحہ کی قرأت پر مواظبت فرمائی ہے اس لئے اس کی قرأت ہم پر واجب رہے گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔"علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین"۔

(۳) شرق وغرب کے تمام مسلمان ہر ادوار وازمان میں سورہ فاتحہ کی قرأت کرتے رہے غرض کہ سورہ فاتحہ پڑھنے پر جمیع مسلمین کا عملی اجماع ہے اس اعتبار سے اس کی قرأت واجب ہوگی کہ اتباع مسلمین واجب ہے قرآن حکیم میں حکم رب العلمین ہے۔"وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا"اور جو مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ چلے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کر دیں گے اور کیا ہی بری جگہ پلٹنے کی (سورہ نساء:۱۱۵)

(۴) حدیث پاک میں ہے"لا صلوٰة الا بفاتحة الکتاب"یعنی بغیر سورہ فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی۔

(۵) قرآن حکیم میں اللہ رب العلمین کا ارشاد ہے۔"فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ"(المزمل:۲۰) آیت"فاقرءوا"فعل امر ہے جس کا ظاہر وجوب ہے، اس اعتبار سے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو قرآن سے میسر ہو اس کی قرأت واجب ہے اور یہ معلوم کہ غیر فاتحہ کی قرأت واجب نہیں ہے لہذا سورہ فاتحہ کی قرأت واجب ہوگی تا کہ صیغہ "فَاقْرَءُوْا" کے ظاہر پر عمل کیا جا سکے۔

(۶) سورہ فاتحہ کی قرأت احوط ہے لہذا اس کی طرف رجوع واجب ہوگا اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا"دع ما یریبک الی ما لا یریبک"۔

(۷) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فاتحہ کی قرأت پر مواظبت فرمائی ہے لہذا اس کا ترک ناجائز وحرام ہوگا قرآن حکیم میں ہے"ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ"(النور:۶۳)۔

(۸) اس بارے میں اہل اسلام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا غیر نماز میں پڑھنے سے افضل واکمل ہے۔ جب یہ ثابت ومحقق ہے تو ہم کہیں گے کہ بندہ پر نماز قائم کرنے کا حکم تکلیفی سورہ فاتحہ کی قرأت کے ساتھ متوجہ ہوگا لہٰذا جس نے سورہ فاتحہ سے نماز قائم کر لی وہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے سبب اس عہدۂ تکلیفی سے

بری الذمہ ہوگیا۔ چونکہ یہ متفق علیہ ہے کہ جونماز سورہ فاتحہ کے ساتھ ادا کی گئی وہ بہرحال افضل ہے اس نماز سے جو بغیر سورہ فاتحہ کے ادا کی گئی۔ اور عمل کامل کے سبب عہدۂ تکلیف سے بری الذمہ ہوجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ عمل ناقص کے سبب بھی عہدہ سے بری ہوجائے لہذا جونماز بغیر سورہ فاتحہ کے ادا کی گئی وہ ناقص ہوگی اور عہدۂ تکلیف کی ادائیگی ذمہ میں باقی رہے گی۔

(۹) نماز سے مقصود ذکر قلب کا حصول ہے ارشاد رب العلمین ہے "وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ" (طہ:۱۴) اور یہ سورہ مبارکہ مختصر ہونے کے باوجود، مقامات ربوبیت وعبودیت کی معرفت کی جامع ہے اور تمام احکام تکلیفیہ سے مقصود انہیں معارف کا حصول ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اس سورہ کو پورے قرآن حکیم کے معادل ومساوی فرمایا ہے ارشاد ہے "وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ" (الحجر:۸۷) اس سے واضح ہے کہ کوئی دوسری سورہ سورہ فاتحہ کے ہم پلہ نہیں ہے۔

(۱۰) حدیث مذکور سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی صورت میں نماز نہ ہوگی۔

مندرجہ بالا دسوں دلیلیں حضرت رازی نے لاکر یہ ذہن دینے کی کوشش کی ہے کہ نماز میں ہر کسی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے حالانکہ ان دلیلوں میں سے کسی ایک بھی دلیل سے ہر ایک کے حق میں وجوب کا بھی ثبوت نہیں ہوتا چہ جائے کہ فرضیت کا ثبوت ہوالبتہ اگر امام ہوتو صرف امام کے حق میں یا منفرد ہوتو منفرد کے لئے قرأت فاتحہ کا ثبوت ہوتا ہے جس کے ہم احناف منکر نہیں بلکہ ہم اسی کے قائل ہیں تاکہ اس باب میں مروی تمام احادیث پر عمل ہوسکے ظاہر ہے کہ اگر ہر ایک کے لئے سورہ فاتحہ لازم قرار دی جائے تو "قراۃ الامام قرأۃ له اور اذا کبر فکبروا واذا رکع فارکعوا واذا سجد فاسجدوا واذا قرأ فاسکتوا" جیسی تمام ہم معنی احادیث صحاح کا ترک لازم آئے گا بلکہ آیت قرآنیہ "اِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَ اَنۡصِتُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ" کے بھی خلاف ہوگا۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت صدر الافاضل علامہ سید نعیم الدین علیہ الرحمہ مرادآبادی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس وقت قرآن کریم پڑھا جائے خواہ نماز میں یا خارج نماز اس وقت سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اس طرف ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے سننے اور خاموش رہنے کے باب میں ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس میں خطبہ سننے کے لئے گوش برآواز ہونے اور خاموش رہنے کا حکم ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے نماز و خطبہ دونوں میں بغور سننا اور خاموش رہنے کا وجوب ثابت ہوتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے

آپ نے کچھ لوگوں کو سنا کہ وہ نماز میں امام کے ساتھ قرأت کرتے ہیں تو نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم اس آیت کا معنی سمجھو، غرض اس آیت سے قرأت خلف الامام کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اور کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس کو اس کے مقابل حجت قرار دی جا سکے، قرأت خلف الامام کی تائید میں سب سے زیادہ اعتماد جس حدیث پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" مگر اس حدیث سے قرأت خلف الامام کا وجوب تو ثابت نہیں ہوتا صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز کامل نہیں ہوتی جب کہ حدیث "قرأۃ الامام له قرأۃ" سے ثابت ہے کہ امام کا قرأت کرنا ہی مقتدی کا قرأت کرنا ہے تو جب امام نے قرأت کی اور مقتدی ساکت رہا تو اس کی قرأت حکمیہ ہوئی اس کی نماز بے قرأت کہاں رہی تو امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے سے قرآن وحدیث دونوں پر عمل ہو جاتا ہے اور قرأت کرنے سے آیت کا اتباع ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ وغیرہ کچھ نہ پڑھے۔ (تفسیر ذیل سورہ اعراف ۲۰۴) اس لئے احوط وارجح مذہب امام اعظم ہی ہے

فائدہ سوم: فائدہ دوم میں مذکور حدیث میں ہے کہ جب بندہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتا ہے تو اللہ پاک فرماتا ہے "ذکرنی عبدی" میرے بندے نے میرا ذکر کیا۔ اس میں بھی چند احکام ہیں۔

(۱) بیشک اللہ عزشانہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ" (البقرۃ: ۱۵۲) اس سے ظاہر ہے کہ بندہ جب خدائے تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندہ کا ذکر کرتا ہے اور وہ بھی اس بندۂ ذاکر کا ذکر اللہ تعالیٰ ایسی جماعت میں فرماتا ہے جو ذاکر کی جماعت سے افضل ہوتی ہے۔

(۲) اس حدیث میں دلیل ہے کہ مقام ذکر مقام عبودیت میں نہایت ہی بلند مقام ہے اس لئے کہ اسی سے شروعات ہوئی ہے اور اس کے کمال کی دلیل یہ ہے کہ اللہ عزشانہ نے ذکر کا حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا "فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ" (البقرۃ: ۱۵۲) پھر ارشاد ہوا "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا" اے ایمان والو! اللہ کو خوب زیادہ یاد کرو (الاحزاب: ۴۱) ایک مقام پر یہ ارشاد ہوا "الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ" جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے (آل عمران: ۱۹۱) ایک دوسرے مقام پر یوں فرمان ہوا "اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ" بیشک وہ جو ڈرنے والے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ (الاعراف: ۲۰۱) ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ مقامات عبودیت میں سے کسی شئی کی تقریر واثبات میں اتنا مبالغہ نہیں فرمایا گیا جتنا مقام ذکر کے بیان میں مبالغہ کیا گیا ہے۔

(۳) ارشاد ''ذکرنی عبدی'' میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اسم جلالت ''اَللّٰہ'' اس کی ذات مخصوصہ کا علم ہے اس لئے کہ اگر اسم مشتق ہوتا جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے تو اس کا مفہوم، مفہوم کلی ہوتا اور اگر مفہوم کلی ہوتا تو اس کی ذات مخصوصہ معینہ کا ذکر اس لفظ ''**ذکرنی**'' سے نہ ہوتا البتہ ''**الرحمن الرحیم**'' دو اسماء مبارکہ اسمائے مشتقہ ہیں جنکا مفہوم مفہوم کلی ہے غرض کہ ''**ذکرنی عبدی**'' اس کی ذات کے علم ہونے پر دال ہے۔ رہا یہ ارشاد ''اذا قال اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یقول اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی'' یعنی جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتا ہے تو رب فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد بیان کی پس اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقام حمد مقام ذکر سے اعلیٰ وافضل ہے۔ اس پر دلیل بھی ہے وہ یہ کہ خلق عالم کے آغاز میں جو کلام سب سے پہلے ذکر کیا گیا تھا وہ حمد تھا چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے فرشتوں نے عرض کیا تھا ''وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ'' (البقرۃ:۳۰) پھر آخری کلام جو فنائے عالم کے بعد ذکر کیا جائے گا وہ حمد ہی ہوگا جیسا کہ جنتیوں کی صفت میں قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ''وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' (یونس:۱۰)۔

اس پر عقل بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں غور وفکر غیر ممکن، اور محال ہے اسی وجہ سے حضور سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''تفکروا فی الخلق و لا تفکروا فی الخالق'' یعنی مخلوقات میں غور وفکر کرو لیکن خالق کے بارے میں غور وفکر نہ کرو۔ ذات باری تعالیٰ میں غور وفکر محال اس وجہ سے بھی ہے کہ کسی شئی کی فکر مسبوق ہوتی ہے اس شئی کے تصور سے اور اس شئی کا تصور سابق ہوتا ہے اور جب تصور سابق ہوا تو لازم کہ اس کی ذات کا تصور پہلے ہو اور اس کی ذات وحقیقت کا تصور محال و ناممکن ہے لہذا اس کی ذات کے بارے میں فکر بھی نا ممکن ہوا البتہ اس کے افعال ومخلوقات کے بارے میں غور وخوض اور فکر وتدبر ممکن ہے۔ بلکہ ان افعال ومخلوقات میں فکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے حدیث شریف میں ہے ''**ویل**'' (خرابی) اس زبان کے لئے جو ارشاد ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَالآیۃ'' پڑھے اور مناظر قدرت میں غور وفکر نہ کرے۔ پس جو بندہ اس کی مصنوعات ومخلوقات میں غور وفکر کرتا ہے اسے اس بات کی واقفیت ہو جاتی ہے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور بے شمار فضل واحسان ہے جب بندہ کو رب تعالیٰ کے فضل واحسان کا علم ہوگا تو کثرت سے اس کی زبان اس کی حمد وشکر میں مشغول رہے گی اور بندہ بے ساختہ کہے گا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' اس وقت رب تعالیٰ فرماتا ہے ''حمدنی عبدی'' یہ گویا کہ حق سبحانہ تعالیٰ کی اپنے بندہ کے حق میں شہادت ہے کہ میرے بندے نے

اپنے فکر ونظر سے میرے فضل واحسان اور میری رحمت عام وتام کو نہ یہ کہ جانا بلکہ یقین کیا کہ عالم بالا اور عالم اسفل کی ترتیب وتربیت صرف اور صرف اللہ رب العلمین کے رحم وکرم کا نتیجہ ہے۔ نیز "حمدنی عبدی" کے ارشاد سے اس بات کی بھی شہادت ہے کہ میرے بندے کی حامد وشاکر زبان اس کی عقل کے بالکل موافق ومطابق ہے غرضیکہ بندہ کا ایمان کے سمندر میں غرق ہوکر اپنے قلب وزبان اور عقل وبیان سے اس کی کرم نوازیوں کا اقرار کرنا نہایت ہی عظیم الشان اور جلیل المرتبت حالت ہے۔ رہا یہ ارشاد کہ جب بندہ "الرحمن الرحیم" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "عظمنی عبدی" میرے بندے نے میری تعظیم بجالائی۔

شبہ: اس مقام پر کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب بندہ شروع میں "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کہتا ہے تو اس وقت بھی "اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کہتا ہے لیکن اس موقع پر رب کی طرف سے "عظمنی عبدی" ارشاد نہیں ہوتا ہے مگر یہی بندہ یہی اسماء رحمن رحیم سورہ فاتحہ کے ضمن میں قرأت کرتا ہے تو رب تعالیٰ کی طرف سے "عظمنی عبدی" کی نوید ہوتی ہے آخر دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: یہ ہے کہ بندہ جب "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ" کہتا ہے تو وہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں کامل ہے اور غیر کا مکمل ہے پھر اس کے بعد جب "رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ" کہتا ہے تو گویا یہ کہتا ہے کہ وہ معبود جو اپنی ذات میں کامل اور غیر کا مکمل ہے واحد ہے عالمین کی تربیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے پھر جب "اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کہتا ہے تو اس کا یہ کہنا دلیل ہے کہ وہ معبود جو اپنی ذات میں کامل، غیر کا مکمل ہے وہ اپنے بندوں پر بے انتہا رحم وکرم اور فضل واحسان فرمانے پر شریک ونظیر اور مندود سے پاک ومنزہ ہے اس طرح اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ سے اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ تک معبود حقیقی کے کمال وجلال کی اس غایت وانتہا کا اظہار ہے جہاں تک عقل وفہم اور وہم وگمان کی رسائی ہوسکتی ہے اور ایسے انتہا درجہ کے کمال وجلالت شان کا اظہار صرف بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ میں نہیں ہوسکتا، اس لئے صرف بسم اللہ پڑھنے کے وقت "عظمنی عبدی" نہیں فرماتا بلکہ "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ" کے بعد "اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" پڑھنے کے بعد "عظمنی عبدی" کی اعزازی سند عطا ہوتی ہے۔

اب جب بندہ "مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مجدنی عبدی" میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اس کا معنی یہ ہے کہ بندہ نے ان باتوں سے مجھے منزہ اور پاک سمجھا جو میرے شایان شان نہیں، اس کی واضح تقریر یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ظلم وستم کرنے والے مظلوموں پر ظلم وستم ڈھا رہے

ہیں۔طاقتور کمزوروں کو ستا رہے ہیں، عالم دین متقی و پرہیزگار بندۂ مومن سخت معاشی تنگی میں مبتلا ہے اللہ کے مخلص بندے نان شبینہ کے محتاج ہیں اس کے برخلاف کافر ومشرک فاسق وفاجر اور ظالم وغاصب کو دیکھتے ہیں کہ وہ دنیا کی ہزارہا قسم کی نعمتوں میں عیش وعشرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔کافر ومشرک اور فاسق وظالم کو اس قدر نعمت دنیا اور مومن ومخلص بندوں کا حسرت وتنگدستی میں مسلسل پریشان رہنا، اللہ ارحم الراحمین، احکم الحاکمین کی رحمت وفیصلے کے نامناسب معلوم ہوتا ہے لیکن جب بندہ ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ''کہتا ہے تو اقرار کرتا ہے کہ اس عارضی دنیا میں کفار ومشرکین کا نعمتوں میں عیش کرنا اور مخلص مومن کا حسرت وتنگدستی کی زندگی گذارنا ظالموں کا غالب ہونا، مظلوموں کا مغلوب ہونا، ارحم الراحمین کی رحمت اور احکم الحاکمین کے حکم وفیصلہ کے نامناسب نہیں ہے کیونکہ وہ روز جزاء کا مالک ہے۔پس اس لئے اللہ عز شانہ تعالیٰ معاد اور حشر ونشر قائم فرمائے گا تاکہ ظالموں کو مظلوموں پر ظلم کرنے کا بدلہ دے، کفار ومشرکین کو عذاب دے اور اہل طاعت کو ہمیشگی کا ثواب اور جزائے خیر عطا فرمائے۔اس وجہ سے اللہ عز شانہ تعالیٰ نے فرمایا ''لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَاعَمِلُوْ وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى'' تاکہ برائی کرنے والے کو ان کے کئے کا بدلہ دے اور نیکی کرنے والوں کو نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔(النجم:۳۱) رب تعالیٰ کے ارشاد ''مجدنی عبدی'' سے یہی مراد ہے کہ بندہ نے مجھے ظلم اور اس کے شائبہ سے منزہ اور پاک جانا اس کے بعد پھر بندہ جب ''اِيَّاكَ نَعْبُدُوَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنِ ''کہتا ہے تو اللہ عز شانہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ھذا بینی وبین عبدی ''اس ارشاد میں مسئلہ جبر وقدر کی طرف اشارہ ہے چونکہ ارشاد ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ ''میں طاعت وعبادت کا عمل بجالانے کی نسبت بندہ کی طرف ہے چنانچہ بندہ کہتا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اب اس وقت مسئلہ جبر وقدر کی بحث متوجہ ہوتی ہے وہ اس طور پر کہ بندہ فعل عبادت کے بجالانے میں مستقل ہے یا غیر مستقل ہے۔حق اور مجمع علیہ یہ ہے کہ بندہ فعل عبادت وغیرہ کے بجالانے میں غیر مستقل ہے اور وہ اس لئے کہ بندہ کی قدرت، فعل وترک کی صالح ہوگی یا صالح نہ ہوگی اگر پہلی شق متحقق ہو یعنی بندہ کی قدرت فعل وترک دونوں کی صالح ہو تو اس قدرت کا، ترک کو چھوڑ کر فعل کے لئے مصدر ہونا بغیر مرجح کے نہیں ہوسکتا ورنہ محال ہوگا اس لئے مرجح ہونا ضروری ہے اب اس مرجح پر کلام جاری ہوگا کہ وہ مرجح اگر بندہ کی طرف سے ہے تو پھر اس مرجح پر کلام سابق جاری ہوگا اس طرح تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے لہذا یہ متعین ہے کہ وہ مرجح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے پس اللہ عز شانہ تعالیٰ نے بندہ میں اس فعل کے لئے ایسے داعیہ کو پیدا فرمایا جو موانع ومعارض سے خالی ہے اور وہ طلب اعانت ہے ارشاد پاک ''وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنِ ''سے یہی مراد ہے اور

ارشاد ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا'' سے بھی یہی مراد ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے اے رب ہمارے تو ہمارے قلوب میں ایسا داعیہ نہ پیدا فرما جو ہمیں عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ تک پہنچانیوالا ہو۔ اور ہمارے لئے اپنی طرف سے رحمت عطا فرما۔ یہ رحمت وہی داعیہ کی تخلیق ہے جو ہمیں عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کی طرف لیجائے اعانت واستعانت کا یہ مطلب ہے اب جو اس کے سوا توضیح کرے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' ؕ کا معنی نہیں سمجھا ہے۔

چونکہ ہماری ذکر کردہ توضیح سے رب تعالیٰ کے ارشاد ''ھذا بینی وبین عبدی'' کا مفہوم خوب واضح ہوجاتا ہے وہ اس طرح کہ رب کی طرف سے داعیہ جازمہ کا خلق ہے اور بندہ کی طرف سے، قدرت وداعیہ کے مجموعہ کے پائے جانے کے وقت اثر یعنی فعل کے کسب کا صدور ہوتا ہے یہ نکتہ نہایت دقیق وباریک ہے اس لئے بغور پڑھنا چاہئے۔

پھر جب بندہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کہتا ہے تو رب تعالیٰ فرماتا ہے ''ھذا لعبدی ولعبدی ماسأل'' اس کی تقریر یہ ہے اہل علم ودانش پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ الوہیت کے جمیع مسائل میں اور نبوت کے جملہ مسائل میں اسی طرح معاد کے تمام مسائل میں علما کے درمیان اثبات ونفی میں اختلاف ہے اس اختلاف سے باب عقائد میں شبہات راہ پاتے ہیں ظلمتوں کا غلبہ ہوتا ہے ایسے حالات میں کثیرین میں سے اقل قلیل ہی راہ حق کی کنہ و حقیقت تک پہنچ پاتے ہیں باوجود یکہ عقول وادراکات، افکار وافہام، کثرت بحث، دقت نظر، اور شدت تأمل میں سب مساوی ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے اعلیٰ اور برتر ہیں مگر پھر بھی حق کی کنہ تک نہیں پہنچ سکے اگر پہنچے تو بہت تھوڑے، جس کا صاف مطلب یہ کہ وہ اقل قلیل اپنی عقل ودرایت اور فکر ونظر کے بل بوتے پر حق تک نہیں پہنچے بلکہ اللہ کریم کی ہدایت و اعانت اور اس کے فضل وکرم سے حق تک رسائی ہوئی ہے وہ اس طرح کہ طالب کی نگاہ عقل میں وہ حق کو منور ومجلی فرما دیتا ہے اور باطل کے قبح کو اس کی نگاہ میں ظاہر کردیتا ہے جیسا کہ ارشاد کریم ہے۔ ''وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ'' لیکن اللہ نے تمہیں ایمان پیارا کردیا اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کردیا اور کفر اور حکم عدولی اور نافرمانی تمہیں ناگوار کردی ایسے ہی لوگ راہ پر ہیں (الحجرات: ۷) بالیقین اگر اللہ عزشانہ تعالیٰ کا فضل واحسان اور اس کی اعانت وہدایت نہ ہوتی تو حق تک رسائی محال ہوجاتی۔ اسی حالت کی طرف ارشاد ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' سے اشارہ ہے، ہدایت اور حق تک رسائی اگر بندہ کے اپنے اختیار سے ہوتی تو کوئی بھی گمراہ نہ ہوتا

حالانکہ ہم بہتوں کو ضلالات کے سمندر میں غرق اور ورطہ ظلمات میں اوندھے گرے دیکھ رہے ہیں اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ وصول الی الحق بغیر ہدایت الٰہی کے ناممکن ہے۔اس نظریہ کی تائید تمام ملائکہ اور سبھی انبیاے کرام کے اتفاق سے بھی ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرات ملائکہ نے فرمایا"سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ "پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بیشک تو ہی علم وحکمت والا ہے۔(البقرۃ:۳۲)حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا تھا"وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ "اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والوں میں ہوئے۔(الاعراف:۲۳)حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا"لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ' اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی انہیں گمراہوں میں ہوتا۔(الانعام:۷۷)حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا"تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ "مجھے مسلمان اٹھا اور ان سے ملا جو تیرے قرب خاص کے لائق ہیں۔(یوسف:۱۰۱)موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا"قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ "اے میرے رب میرے لئے میرا سینہ کھول دے اور میرے لئے میرا کام آسان کر۔(طہ:۲۵)اور حضور سرور دو جہاں خاتم پیغمبراں صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا تھا۔"رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ "اے رب ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر بیشک تو ہے بڑا دینے والا(آل عمران:۸)ان آیات متلوہ میں آفتاب نیمروز سے زیادہ روشن بیان ہے کہ علم وحکمت، رحمت ومغفرت اور ایمان وہدایت سب ہی رب تعالیٰ کے حکم سے ہے۔

فائدہ چھارم: خبر مذکور کے چند فائدے ہیں سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور نماز میں اعمال محسوسہ بھی سات ہیں(۱)قیام،(۲)رکوع،(۳)انتصاب(رکوع کے بعد قیام)،(۴)سجدہ اولیٰ،(۵)سجدہ اولیٰ میں انتصاب(سجدہ اولیٰ کے بعد جلوس)،(۶)سجدہ ثانیہ،(۷)قعدہ۔

غرض کہ سورہ فاتحہ کی سات آیتیں،نماز کے ان سات اعمال محسوسہ کی عدد کے موافق اور مساوی ہیں پس یہ اعمال شخص کی طرح ہیں اور فاتحہ اس کے لئے روح کے مثل ہے۔اور یہ معلوم کہ جب روح کا اتصال جسم کے ساتھ ہوتا ہے تبھی کمال پیدا ہوتا ہے اس لئے ارشاد"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "قیام کے مقابل ہے دیکھو بسم اللہ کی

''با'' جب اسم اللہ سے ملتی ہے تو کھڑی اور بلند لکھی جاتی ہے۔ نیز تسمیہ سے تمام امور کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے ''کل امر ذی بال لم یبدأ فیه ببسم الله فهو ابتر'' ہر اچھا کام جو بسم اللہ سے نہیں شروع کیا جاتا وہ ناقص رہتا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى'' بیشک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لیکر نماز پڑھی۔ (الاعلیٰ: ۱۴) اور قیام سے اعمال کی ابتداء ہوتی ہے، ان باتوں سے ظاہر و واضح ہے کہ تسمیہ اور قیام کے درمیان یک گونہ مناسبت ہے۔ بعد تسمیہ ارشاد الٰہی ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' رکوع کے مقابل ہے وہ اس طور پر کہ مقام تحمید میں بندہ کی نگاہ خالق (رب) اور خلق دونوں کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انعام صادر ہونے کے سبب اس پر ثنا کرنے کا نام تحمید ہے اس وقت بندہ کی نگاہ منعم اور نعمت دونوں طرف ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی حالت متوسطہ ہے جو اعراض و استغراق کے درمیان پائی جاتی ہے اور رکوع بھی قیام و سجود کے درمیان حالت متوسطہ کا نام ہے۔ نیز حمد کرنا دلیل ہے کہ حمد کرنے والے کو اتنی نعمت کثیرہ حاصل ہوئی ہے کہ اس کی پیٹھ ایسی بوجھل ہوگئی ہے کہ رکوع کے لئے جھک گئی ان دو وجہوں سے ظاہر ہے کہ الحمد للہ کو رکوع سے مناسبت ہے۔

ارشاد ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' رکوع سے انتصاب یعنی رکوع سے سیدھا کھڑا ہونے کے مناسب ہے۔ وہ اس طرح کہ رکوع میں بندہ جب اللہ تعالیٰ سے تضرع کرتا ہے۔ تو اللہ عزشانہ اس کو رکوع سے اٹھا کر اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ بندہ جب ''سمع الله لمن حمده'' کہتا ہے تو اللہ عزشانہ تعالیٰ اس کی طرف اپنی نظر رحمت فرماتا ہے۔ ارشاد ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' سجدہ اولیٰ کے لئے مناسب ہے وہ اس طور پر کہ کلام مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، کمال قہر و جلال اور اس کی کبریائی پر دلالت کرتا ہے اور قہر و جلال رب تعالیٰ کے خوف شدید کو واجب کرتا ہے۔ اور خوف شدید کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ غایت درجہ کا خشوع و خضوع بجالائے۔ اور یہ سجدہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

ارشاد ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' دو سجدوں کے درمیان قعدہ کے مناسب ہے کیونکہ ایاک نعبد میں سجدہ اولیٰ جو بندہ کر چکا اس کی اطلاع ہے اور ایاک نستعین میں اللہ تعالیٰ سے استعانت ہے کہ اس کو دوسرا سجدہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے رہا ارشاد ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' تو تمام اشیاء میں سب سے اہم ترین چیز صراط مستقیم پر قائم رہنے کا سوال ہے پس اس کے لئے سجدہ ثانیہ لائق ہے جو غایت خضوع کی دلیل ہے۔ پھر اس کے بعد ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' سے آخر تک قعدہ اخیرہ کے مناسب ہے وہ اس طور پر کہ بندہ نے جب رب تعالیٰ کے حضور غایت خضوع اور انتہا درجہ کی تعظیم و کامل تواضع بجالایا۔ تو رب تعالیٰ نے اس کی غایت تواضع کا بدلہ بے انتہا کرم

نوازی سے عطا فرمایا چنانچہ فرمایا اب میرے حضور بیٹھو پس یہ رب تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر ایسا انعام عظیم ہے جس کا بندہ شکر نہیں کرسکتا۔ نیز اپنے حبیب مکرم حضور سید الانبیاء و المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اللہ عز شانہ تعالیٰ نے انعامات کی انتہا فرمادی بایں طور کہ آپ کو عرش اور مقام قاب قوسین تک عروج وارتقاء عطا فرمایا اس وقت معراج میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا "التحیات للہ و الصلوٰتُ و الطیبات" (الخ) اور حدیث میں "الصلوٰۃ معراج المومنین" ارشاد ہے یعنی نماز مومن کی معراج ہے پس جب نمازی بندہ اپنی نماز یا معراج میں غایت اکرام کی منزل تک یعنی نماز کے قعدہ اخیرہ میں رب کے حضور بیٹھتا ہے تو اس پر بھی واجب ہے کہ وہ وہی کلمات طیبات پڑھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منزل قاب وقوسین میں ادا فرمایا تھا لہٰذا وہ بھی اس وقت التحیات پڑھتا ہے اس وقت گویا اسے تنبیہ ہے کہ نماز میں اسے جو معراج ہوئی وہ معراج مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے سورج کی ایک شعاع اور آپ کے سمندر کا ایک قطرہ ہے اس میں ارشاد "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ" الآیۃ کے معنی کی تحقیق ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ سورہ فاتحہ کی ساتوں آیات مبارکہ، ان ساتوں اعمال کے لئے روح کی طرح ہیں اور پھر یہ ساتوں اعمال بھی خلقت انسان میں مذکورہ ساتوں مراتب کے لئے روح کی طرح ہیں اور وہ یہ آیات ہیں "وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ" اور بیشک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا پھر اسے پانی کی بوند کیا ایک مضبوط ٹھہراؤ میں پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹک کیا، پھر خون کی پھٹک کو گوشت کی بوٹی پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں پھر ان ہڈیوں پر گوشت پہنایا پھر اسے اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا۔ (المومنون: ۱۲، ۱۳، ۱۴) اس وقت منکشف ہوتا ہے کہ اجساد کے مراتب، اسی طرح ارواح کے مراتب بہت کثیر ہیں۔ اور روح الارواح ونور الانوار کی انتہا اللہ عز شانہ تعالیٰ کی طرف ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا "وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى" (النجم: ۴۲)

فصل پنجم: اس بیان میں کہ نماز عارفین کی معراج ہے۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معراج جسمانی ہوئی وہ دو حصے پر مشتمل تھی۔ ایک مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اس کا ثبوت قرآن حکیم کی آیت قطعیہ سے ہے۔ دوم مسجد اقصیٰ سے ملکوت اعلیٰ تک اول قسم کا تعلق ظاہر سے ہے لیکن دوم جس کا تعلق

عالم ارواح سے ہے اس میں بھی دو طرح کی معراج ہے ایک عالم شہادت سے عالم غیب کی طرف دوم عالم غیب سے غیب کے عالم غیب کی طرف۔ یہ دونوں معراج علی سبیل الاتصال دو قاب قوسین کے منزلہ میں تھے جو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر قدم آئے اور قدوم میمنت لزوم نبوت سے سرفراز ہوئے ارشاد پاک "فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى" سے اس طرف اشارہ ہے اور یہی مراد ہے اور ارشاد "اَوْ اَدْنٰى" سے اشارہ ہے کمال قرب اور شدت اتصال کی طرف بلکہ امام رازی نے یہاں تک فرمایا "و قوله اَوْ اَدْنٰى اشارة الى فنائه فى نفسه" (صفحہ ۲۲۱/ج:۱ تفسیر فاتحہ)

اب رہا عالم شہادت سے عالم غیب کی طرف انتقال تو اس کی معلومات سے پہلے یہ باتیں ذہن نشین رہیں کہ جن امور کا تعلق جسم و جسمانیات سے ہے وہ عالم شہادت یا عالم مشاہدہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ ہم ان امور کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں پس روح کا عالم اجساد سے عالم ارواح کی طرف انتقال، وہ عالم شہادت سے عالم غیب کی طرف سفر کہلاتا ہے اور عالم ارواح ایسا عالم ہے جس کی کوئی نہایت نہیں ہے اور وہ اس لئے کہ جب ارواح کے مراتب و درجات میں سب سے آخری درجہ ارواح بشریہ کا ہے پھر ارواح بشریہ جب کمالات و سعادات کے منازل و مقامات طے کر لیتی ہیں تو ان کی رسائی ان ارواح تک ہو جاتی ہے جو آسمانی دنیا سے متعلق ہیں پھر وہ ترقی پذیر ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ ارواح سماء دوم، سوم، چہارم وغیرہا کے مدارج طے کرتی ہوئی ان ارواح تک پہنچ جاتی ہیں جو کرسی کے درجات کے باشندگان ہیں پھر درجات کرسی بھی استعلاء کے اعتبار سے مختلف ہیں پھر وہ مزید بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہیں اور وہ ارواح ملائکہ ہیں جن کی طرف کلام ربانی کی اس آیت میں اشارہ ہے "وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ" اور تم فرشتوں کو دیکھو گے عرش کے آس پاس حلقہ کئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بولتے۔ (الزمر:۷۵) یہیں تک انتہا نہیں بلکہ مزید اعلیٰ ترین منزل تک رسائی ہوتی ہے اس کی طرف رب العزت کے کلام کی اس آیت میں اشارہ ہے۔ "وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهٖ ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ" اور فرشتے اس کے کناروں پر کھڑے ہوں گے اور اس دن تمہارے رب کا عرش اپنے اوپر آٹھ فرشتے اٹھائیں گے۔ (الحاقۃ:۱۷) پھر ترقی کرتے ہوئے ان ارواح تک رسائی ہوتی ہے جو اجسام کے متعلقات سے پاک اور منزہ ہیں یہ وہ ارواح ہیں جن کی غذا ذکر الٰہی، جن کا پینا حب الٰہی، انکا انس حمد و ثناء الٰہی اور ان کی لذت رب العلمین کی خدمت و عبادت میں ہوتی ہے اس طرف اشارہ ہے مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے۔ "ؕ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ" اور اس کے پاس والے اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ تھکیں رات دن اس کی پاکی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے (الانبیاء:۱۹۔۲۰)

پھر یہیں تک محدود نہیں بلکہ ترقی وتصاعد کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٍ" (یوسف:۷۶) یہاں تک کہ یہ امر نور الانوار، مسبب الاسباب، مبدأ الکل ینبوع الرحمۃ، مصدر کل خیر یعنی اللہ رب العلمین تک منتہی ہوتا ہے اس مختصر سی تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم ارواح عالم غیب ہے اور جلال ربوبیت کی بارگاہ غیب الغیب ہے حضور سید عالم و عالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "ان للہ سبعین حجابا من النور لو کشفھا لا حرقت سبحات وجھہ کل ماادرک البصر" یعنی بیشک اللہ عز شانہ تعالیٰ کے نورانی ستر حجابات ہیں اگر وہ ان حجابات نورانی کو کشف فرمادے تو اس کی ذات کی تجلیات سے تا حد بصر خاکستر ہو جائیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حضرت جلال ربوبیت کے لئے نور کے ستر حجابات کی تعیین وتحدید کا علم اور اس کی معرفت سوا نور نبوت کے کسی کو نہیں ہوسکتی کہ یہ غیب کے عالم غیب کے احوال سے ہے۔ ہمارے ذکر کردہ بیان سے یہ ظاہر ہوگیا کہ معراج کی دو قسمیں ہیں اول عالم شہادت سے عالم غیب کی طرف، دوم عالم غیب سے غیب کے عالم غیب کی طرف۔ اس تفصیل کے بعد ہم پھر اپنے مقصود کی طرف لوٹ رہے ہیں وہ یہ کہ حضور سید عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم جب شرف معراج سے مشرف ہوئے اور واپسی کا ارادہ فرمایا تو عرض فرمایا اے رب العزت مسافر جب اپنے وطن واپسی کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے احباب واقرباء کے لئے کچھ نہ کچھ تحفہ تحائف لے کر جاتا ہے (تیری بارگاہ رحمت سے واپس جارہا ہوں میری امت اور احباب کے لئے کیا تحفہ ہے؟) رب تعالیٰ نے فرمایا تیری امت کا تحفہ نماز ہے۔ اور وہ اس طرح کہ نماز معراج جسمانی اور معراج روحانی کا مجموعہ ہے اور سنگم ہے، افعال نماز سے معراج جسمانی کا ظہور ہوتا ہے اور اذکار نماز سے معراج روحانی کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس لئے بندہ جب نماز پڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو رب العلمین کا حکم ہوتا ہے کہ اے میرے بندے جب تم نماز کے ذریعہ میری معراج حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے خوب اچھی طرح طہارت و پاکیزگی حاصل کرلو کہ یہ مقام، مقام قدس ہے حدیث میں ہے کہ نمازی اور اس کے قبلہ کے درمیان جلوۂ رب العلمین ہوتا ہے لہذا تمہارا کپڑا پاک ہو، پورا بدن طاہر ہو گویا یہ سمجھو کہ اب تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو نیز یہ بھی خیال رکھو کہ تمہارے ساتھ فرشتوں کا نورانی گروہ جلوہ افروز ہے ساتھ ہی شیطان بھی تم پر پھندا ڈالنے کی کوشش کررہا ہے اب یہ تم پر ہے کہ تم ان دونوں گروہوں میں کس کی صحبت اختیار کرتے ہو۔ ساتھ ہی تمہارے سامنے دین ودنیا دونوں ہے اب یہ تمہاری مرضی پر ہے کہ تم دین ودنیا میں کس کو ترجیح دیتے ہو، نیز عقل ونفس، خیر وشر، صدق وکذب، حق وباطل، حلم وطیش اور قناعت وحرص بلکہ تمام اخلاق مرضیہ کے ساتھ اخلاق غیر مرضیہ سرابھارے کھڑے ہیں اس لئے تم خوب اچھی طرح غور وخوض کرلو کہ ان دونوں گروہوں میں کس گروہ کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہو اس لئے کہ تم جس گروہ کے ساتھ بھی رہنا پسند

کرو گے اس کے ساتھ صحبت و ملازمت ایسی پختہ ہو جائے گی کہ دنیا سے قبر بلکہ حشر تک باقی رہے گی اگر صحبت اچھوں کے ساتھ ہو گی تو دنیا سے آخرت بلکہ جنت تک برقرار رہے گی کیا نہیں دیکھتے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و ملازمت دنیا میں اختیار کی تو روضۂ انور میں بھی ساتھ رہے اور میدان قیامت، مقام حوض اور میزان بلکہ جنت میں بھی ساتھ ہوں گے یہ تو افضل البشر بعد الانبیاء کی بات ہے ایک کتا جو حضرات اصحاب کہف کی صحبت میں رہا، دنیا کے غار میں ملازمت اختیار کی پس آخرت میں بھی ان کے ساتھ ہو گا۔ حضرت سعدی نے کہا ہے۔

سگ اصحاب روزے چند
پئے نیکاں گرفت مردم شد

اسی راز سربستہ کے اظہار کے لئے ارشاد ہوا یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ'' اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچو کے ساتھ ہو۔ (التوبۃ:۱۱۹)۔

اب جب تم نے مکمل طور پر طہارت حاصل کر لی تو اب نماز یعنی حصول معراج کے لئے تیار ہو جاؤ لہذا اپنے دونوں ہاتھوں کو کان کی لو تک لے جاؤ تا کہ اشارہ ہو کہ تم دنیا و مافیہا اور امور آخرت سے مکمل طور پر بے نیاز اور الگ تھلگ ہو کر صرف اور صرف اللہ رب العلمین کی طرف متوجہ ہو گئے ہو اور اپنے قلب و روح، ظاہر و باطن، عقل و فہم اور ذکر و فکر کے ساتھ رب کی طرف متوجہ ہو گئے ہو اور اب کہو ''اَللّٰهُ اَكْبَر'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تمام موجودات سے اکبر، تمام معلومات سے اعلیٰ، اعظم اور اعز ہے۔ بلکہ وہ اکبر ہے اس بات سے کہ اس کی طرف کسی چیز کا قیاس کیا جائے یا کہا جائے کہ وہ اکبر ہے۔ اب تکبیر تحریمہ کے بعد کہو ''سبحانک اللھم و بحمدک'' تمہارے لئے اس مقام پر تجلیات ربانی کے نور کی تجلی ہو گی اور تسبیح سے تحمید کی طرف تمہاری ترقی ہو گی۔

پھر تم کہو ''تبارک اسمک'' اس وقت تمہارے لئے نور ازل و ابد روشن اور منکشف ہو گا۔ اس لئے کہ ''تبارک'' سے اس دوام کی طرف اشارہ ہے جو افناء و اعدام سے منزہ ہے۔ اور اس کا تعلق عدم میں حقیقت ازل اور بقاء میں حقیقت ابد کے مطالعہ سے متعلق ہے۔ یعنی جسے حقیقت معنی ازل و ابد کی معرفت حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ اسم الٰہی کی برکت سے ازل و ابد روشن ہیں اس کے بعد بندہ جب ''و تعالیٰ جدک'' کہتا ہے تو وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ اس کی صفات جلال و نعوت کمال، مقدار مذکورہ میں محصور ہونے سے بہت بلند اور اعلیٰ ہیں۔ اور جب اس ثناء جمیل کا آخری کلمہ ''و لا الہ غیرک'' کہتا ہے تو گویا وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ تمام صفات جلال و کمال صرف اسی کے لئے ثابت ہیں کسی غیر کے لئے

نہیں۔ اس لئے کہ وہ ایسا کامل ہے کہ اس کے سوا کوئی ایسا کامل نہیں، وہ ایسا مقدس ہے جس کے سوا کوئی مقدس نہیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی نہیں ہے بلکہ صرف وہ ہی وہ ہے اور کوئی معبود نہیں مگر وہی، یہ ایسا مقام ہے جہاں عقل گم ہو جاتی ہے، زبان گونگ ہو جاتی ہے، فہم وحواس بیکار اور خیال متحیر ہو جاتا ہے۔ اب پھر اپنے نفس وحال کی طرف عود کرو اور کہو "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" پس تمہارا "سبحانک اللھم و بحمدک" کہنا ملائکہ مقربین کی معراج کی نقل ہے جیسا کہ ارشاد "وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ" (البقرۃ:۳۰) میں مذکور ہے اور یہی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا آغاز ہے چنانچہ آپ نے فرمایا "سبحانک اللھم وبحمدک" اور "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ" کہنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی معراج ہے، اسی طرح تمہارا "اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ" پڑھنا حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہے غرضیکہ بعد ثنا تمہارا یہ دونوں ذکر کا ورد کرنا حضرات اکابر ملائکہ مقربین اور اولوالعزم انبیاو مرسلین علیہم السلام کی معراجوں کا مجموعہ ہے۔

اب جب اس سے فارغ ہو گئے تو کہو "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" تاکہ تمہارے نفس کا عجب و کبر زائل ہو جائے اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے مکمل پاکیزہ ہو کر سورہ فاتحہ کی تلاوت کرو کیونکہ جان لو کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اس وقت تمہارے لئے جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ "باب المعرفۃ" مفتوح ہو چکا ہے۔ دوسرا دروازہ "باب الذکر" ہے اور وہ تمہارا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کہنا ہے۔ تیسرا دروازہ باب الشکر ہے اور وہ تمہارا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" پڑھنا ہے۔ چوتھا دروازہ باب الرجاء ہے اور وہ تمہارا "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھنا ہے۔ پانچواں دروازہ "باب الخوف" ہے اور وہ تمہارا مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہنا ہے۔ چھٹا دروازہ "باب الاخلاص" ہے جو معرفت عبودیت اور معرفت ربوبیت کا ثمرہ و نتیجہ ہے اور وہ تمہارا "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" کہنا ہے۔ ساتواں دروازہ "باب الدعاء والتضرع" ہے جیسا کہ ارشاد ہے "اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ" (النمل: ۶۲) اور ارشاد ہے۔ "اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" (غافر:۶۰) اور وہ یہاں تمہارا کہنا "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" ہے آٹھواں دروازہ "باب الاقتداء" یعنی ارواح طیبہ طاہرہ کی اقتدا کرنا اور ان کے انوار سے ہدایت یاب ہونا ہے اور وہ تمہارا "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ" کہنا ہے۔

اس طریق سے جو کوئی سورہ فاتحہ کی قرأت کرے اور اس کے اسرار اور راز سربستہ سے مطلع ہو جائے تو کوئی شک نہیں

کہ اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائیں گے اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ" (ص:۵۰) پس معارف ربانیہ کی جنتوں کے دروازے روحانی کنجیوں سے ہی کھولے جاسکتے ہیں اور روحانی کنجیاں وہی روحانی معراج ہے جو نمازی کو نماز میں حاصل ہوتی ہے۔

رہا معراج جسمانی تو اول درجہ یہ ہے کہ تم نماز میں خدا کے حضور ایسا کھڑے ہو جیسا کہ حضرات اصحاب کہف کھڑے تھے چنانچہ ان کے قیام کے بارے میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے "اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" جب کھڑے ہوکر بولے کہ ہمارا رب وہ ہے جو آسمان وزمین کا رب ہے۔ (الکھف: ۱۴) بلکہ ایسا لرزاں و ترساں کھڑے ہو جیسے روز قیامت اہل محشر کھڑے ہوں گے ارشاد ہے "يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" جس دن سب لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے (المطففین:۶) اب "سبحانک اللھم" پڑھ کر سورہ فاتحہ کی تلاوت کرو اور قرآن سے جو میسر ہو ایک چھوٹی سورہ، یا تین آیت یا کم از کم ایسی ایک آیت جو تین چھوٹی آیتوں کے مساوی ہو پڑھو۔ اس میں تم کوشش کرو کہ تمہاری نگاہ اپنی عبادت گاہ پر رہے تاکہ تم اپنی عبادت کو رب العالمین کے احسان کے بالمقابل حقیر سمجھو ایسا ہرگز نہ سوچنا کہ تم اپنی حقیر عبادت سے خدائے تعالیٰ کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگو ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔ ارشاد "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کا یہ راز سربستہ ہے جس پر بالغان معرفت ہی واقف ہوتے ہیں۔

اب جب قرأت سے فارغ ہوچکو تو رکوع کے لئے جھک جاؤ اور رب ذوالجلال کے خوف سے ایسا مڑ جاؤ جیسا کہ ایک سیدھی کچی لکڑی جب آگ پر رکھی جاتی ہے تو وہ مڑ جاتی ہے اب اس کی عظمت جلال کے خوف سے لبریز ہوکر "سبحان ربی العظیم" پڑھ کر "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتے ہوئے سیدھا کھڑے ہوجاؤ اور اب نہایت تواضع کے ساتھ زمین کی طرف جھکتے ہوئے اپنے رب کو غایت علو کے ساتھ یاد کرو پس "سبحان ربی الاعلیٰ" کہو پھر سیدھا بیٹھ کر اب دوسرا سجدہ اسی کمال تواضع کے ساتھ رب تعالیٰ کی غایت علو کا اظہار کرتے ہوئے ادا کرو۔ جب بندہ دوسرا سجدہ ادا کرلیتا ہے تو اسے تین قسم کی طاعتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک رکوع، دو سجدے، جن کے سبب بندہ تین ہلاکت خیز گھاٹیوں سے نجات پاجاتا ہے۔ چنانچہ رکوع کے سبب عقبہ شہوات سے نجات پاتا ہے اور سجدہ اول سے اس عقبہ غضب سے محفوظ ہوتا ہے جو تمام موذیات کا سرغنہ ہے۔ اور دوسرے سجدہ کے سبب اس عقبہ ھویٰ سے محفوظ رہتا ہے جو ہر قسم کے مہلکات اور مضلات کی طرف داعی ہے۔ غرض کہ رکوع اور دو سجدے کی ادائیگی سے جب تم ان

ہلاکت خیز گھاٹیوں اور ورطۂ ظلمات وضلالات سے صحیح وسالم عبور کر گئے تو تحقیق درجات عالیہ تک تمہاری رسائی ہو چکی اور تم باقیات صالحات کے مالک ہو گئے بلکہ مدبر السموٰت والارض کی درگاہ جلال قدس تک تم پہنچ چکے ہو۔ پس اس وقت کہو "التحیات للہ و الصلوٰۃ و الطیبات" یعنی قولی عبادتیں، بدنی عبادتیں اور مالی یا جنانی عبادتیں اور مالیات سب عبادتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

اس مقام پر جب تم تحیات میں قعود کرتے ہو اور التحیات للہ و الصلوٰت و الطیبات پڑھتے ہو اس وقت تمہاری روح کا نور صعود کرتا ہے اور حضور سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا نور پاک نزول اجلال فرماتا ہے اور تمہارے روح کو روح مصطفی کریم سے شرف لقاء ہوتا ہے جس سے تمہیں فرحت وسرور اور روح ایمان حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ضروری ہے کہ تم حضور سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حمد وتحیت کا نذرانہ پیش کرو اور یوں کہو "السلام علیک أیھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ" اس میں تم یہ سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس تشریف فرما ہیں اور تمہیں بارگاہ رسالت میں حضوری کا شرف حاصل ہوا ہے اس لئے یا حرف ندا اور ک ضمیر خطاب کے ذریعہ سلام وتحیت پیش کرو اس وقت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کرم فرمائیں گے اور یوں ارشاد فرمائیں گے "السلام علینا و علیٰ عباد اللہ الصالحین" پھر یہ سمجھو کہ یہ خیرات و برکات اور منصب و مقام یعنی درگاہ رب ذوالجلال میں حاضری اور بارگاہ رسالت میں حضوری کی نعمت وسعادت تمہیں وسیلہ وذریعہ سے حاصل ہوئی تو یہ کہو "اشھد أن لا الہ الا اللہ و أشھد أن محمدا رسول اللہ" پھر تم سے گویا یہ کہا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی وہ ذات کریم ہے جس نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی فرمائی اور ایمان کا نایاب ہدیہ عطا کیا تو تم نے کیا عطا کیا تو کہو "اللھم صل علی سیدنا محمد و علیٰ آل سیدنا محمد" پھر تم سے اگر یہ کہا جائے کہ بیشک حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی، مابین انبیائے کرام وہ ذات ہے جنہوں نے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے رسول رحمۃ لعلمین کی بعثت کے لئے دعا فرمائی تھی چنانچہ انہوں نے رب سے بایں الفاظ دعا کی تھی۔ "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا" اس لئے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا عیسیٰ کی بشارت اور اپنی والدہ محترمہ کی خواب کی تعبیر ہوں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو دخل ہے تو پھر تم نے اس دعا کا کیا بدل پیش کیا تو کہو "کما صلیت علیٰ ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم" پھر تم سے کہا جائے گا کہ سارے خیرات و برکات جو تمہیں حاصل ہوئے یہ سب کہاں سے ہوئے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوئے یا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو تم کہو یہ سب اللہ حمید مجید کی طرف سے ہے اس لئے تم کہتے ہو "انک حمید مجید"۔

بیشک اللہ کے بندے، اللہ عزشانہ تعالیٰ کی جب اسی طرح حمد وثنا بیان کرتے ہیں تو اللہ عزشانہ تعالیٰ اپنے اس بندہ کا ذکر ملائکہ کی محفلوں میں فرماتا ہے چنانچہ حضور سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے رب تعالیٰ سے حکایت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ مجھے جب کسی گروہ میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس بندہ کا ذکر اس سے افضل وبہتر گروہ میں کرتا ہوں جب فرشتے دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندہ کا ذکر خیر فرمارہا ہے تو فرشتے اس بندہ سے ملاقات کی خواہش کرتے ہیں فرشتوں کی اس خواہش کو پوری کی جاتی ہے پس فرشتے اس نمازی بندہ ذاکر وحامد کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ اب اس بندہ سے رب تعالیٰ کا فرمان ہوتا ہے کہ اے میرے بندے آسمان کے فرشتے تمہاری زیارت کے مشتاق ہیں اور وہ تمہارے قرب کو پسند کرتے ہیں اس لئے میرے حکم سے وہ فرشتے تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں لہٰذا تم ان کو سلام کرو تا کہ تمہیں سابقین کا مرتبہ حاصل ہوجائے اس لئے اس وقت بندہ داہنے اور بائیں دونوں طرف اپنے چہرہ کو گھما کر کہتا ہے۔"السلام علیکم ورحمة الله" یاد رہے کہ دنیا میں بندہ نماز کے اختتام پر فرشتوں کو سلام وتحیت کرتا ہے۔لیکن آخرت میں جب یہی بندہ جنت میں داخل ہوگا تو فرشتے جنت کے ہر دروازے سے اس کے پاس داخل ہوکر اس کو سلام کہیں گے ارشاد ہے "وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ "سلامتی ہوتم پر تمہارے صبر کا بدلہ تو پچھلا گھر کیا خوب ملا۔(سورہ الرعد:۲۴)

فصل ششم: عظمت وکبریائی کے بیان میں۔

اللہ عزشانہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سے زمان ومکان دو عظیم ترین مخلوق ہیں۔

مکان: اس فضا وخلا کو کہتے ہیں جس کی نہایت وغایت نہیں اور **زمان:** اس امتداد متوہم کا نام ہے جو عالم ازل کی ظلمات کے غار سے خارج ہو اور عالم ابد کی ظلمات کی گھاٹی تک ممتد ہو، بلفظ دیگر زمان اس نہر کا نام ہے جو ازل کے پہاڑ کی گھاٹی سے خارج ہو اور ممتد ہو یہاں تک کہ ابد کے پہاڑ کی گھاٹی میں داخل ہو پس اس کے بہنے کا کوئی مبدأ اور اس کے ٹھہرنے کی کوئی منزل جانی نہیں جاسکتی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول وآخر زمان کی صفت ہے اور ظاہر وباطن مکان کی صفت ہے۔حالانکہ یہ چاروں، اللہ رحمن ورحیم کی صفات کمال سے ہیں۔تاہم اللہ عزشانہ تعالیٰ نے مکان کو ظاہر وباطن سے وسعت دی ہے اور زمان کو اول وآخر سے وسعت دی ہے اور جب اللہ عزشانہ تعالیٰ زمان ومکان کا مدبر ہے تو وہ زمان ومکان سے منزہ ہوگا۔

زمان ومکان کے اس تعارف کے بعد یہ سمجھئے کہ بیشک حق سبحانہ تعالیٰ کا ایک عرش ہے اور ایک کرسی ہے اللہ عزشانہ

تعالیٰ نے مکان کو کرسی کے ساتھ جوڑ دیا ہے چنانچہ ارشاد رب العلمین ہے۔ ''وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ''(البقرۃ: ۲۵۵) اور زمان کو عرش کے ساتھ متعلق کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے ''وَ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ''(ھود: ۷) چونکہ زمانہ کا چلنا پانی کے بہنے کی طرح ہے۔ پس مکان، کرسی کے سوانہیں اور زمان عرش کے علاوہ نہیں ہے اور کرسی اس کی صفت علو و بلندی ہے ارشاد ہے ''وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ''(البقرۃ:۲۵۵) اور عرش اس کی صفت، عظمت ہے ارشاد ہے ''فقل فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ''تو تم فرمادو کہ مجھے اللہ کافی ہے اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے۔(التوبۃ:۱۲۹)

یہاں یہ بات بھی خیال رہے کہ علو و عظمت کمال کے درجات میں سے دو درجے ہیں مگر درجہ علو بہ نسبت، درجہ عظمت زیادہ قوی اور زیادہ کامل ہوتا ہے۔ اور ان دونوں درجات سے بالاتر درجہ کبریاء ہوتا ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔''الکبریاء ردائی، والعظمة ازاری ''یعنی کبریائی میری رداہے اور عظمت میری ازار ہے اور اس میں کسی کو شک نہیں کہ ازار کی بہ نسبت ردا افضل اور بہتر ہے۔ پھر ان تمام شرف و رتبہ والے صفات میں، صفت جلال سب سے بالاتر ہے۔

اور صفت جلال کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت مخصوصہ اور ہویت معینہ میں، ممکنات میں سے کسی شئی کی مناسبت سے منزہ اور پاک ہے۔ پس وہ اسی ہویت مخصوصہ کے سبب صفت الٰہیت کا مستحق ہے۔ حدیث پاک میں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''ألظوا بیاذا الجلال والاکرام ''یعنی ذوالجلال والاکرام کی درگاہ سے چمٹ جاؤ۔ قرآن حکیم میں اللہ عز شانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ''اور تیرے جلالت و کرم والے رب کی ذات باقی رہے گی۔ اور ارشاد ہے ''تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ''تیرے جلالت و اکرام والے رب کا نام بڑی برکت والا ہے۔ اس طرح ہم روزانہ بعد نماز دعاء میں یہ الفاظ کہتے ہیں ''تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ یَاذَا الجلَالِ وَالْاِکْرَام ''اب یہ سمجھئے کہ بندہ جب رب ذوالجلال والاکرام کی درگاہ میں حضوری کا قصد کر کے نماز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہوجاتا ہے جن کی تعریف میں اللہ عز شانہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ''يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ''(الکھف: ۲۸) اور یہ معلوم اور مشاہد ہے کہ جو عظیم بادشاہ کے دربار میں حاضری کا ارادہ کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر طرح کی گندگی اور نجاست سے پاک و صاف کر کے منزہ اور طاہر ہوجائے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ اس تطہیر کے کئی مراتب ہیں۔

تطہیر کے مراتب: ذنوب وخطایا کی گندگیوں سے توبہ کے ذریعہ طہارت حاصل کرنا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا" اے ایمان والو اللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جو آگے کو نصیحت ہوجائے۔ (التحریم:۸) جو مقام زہد پر فائز ہے اس کی طہارت یہ ہے کہ دنیا اور اس کے حلال وحرام سے کنارہ کشی کرلے۔ جو مقام اخلاص میں ہے اس کی طہارت یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کی طرف التفات نہ کرے جو مرتبہ محسنین میں داخل ہے اس کی طہارت یہ ہے کہ اپنے حسنات کی طرف توجہ نہ کرے اور جو زمرۂ صدیقین میں ہے اس کی طہارت یہ ہے کہ اللہ کے سوا سب چیزوں سے منہ پھیر لے۔ مختصر یہ کہ مقامات ومراتب بہت ہیں بلکہ بیشمار ہیں جیسا کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" تو اپنا منہ سیدھا کرو اللہ کی اطاعت کے لئے ایک اکیلے اسی کے ہوکر، اللہ کی ڈالی ہوئی بنا جس پر لوگوں کو پیدا کیا اللہ کی بنائی چیز نہ بدلنا۔ (روم:۳۰)

پس جب تم چاہو کہ تم ان لوگوں میں سے ہوجاؤ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ" (الکھف:۲۸) تو سیدھے نماز کے لئے کھڑے ہوجاؤ اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات سے عالم اجسام و عالم ارواح کو اپنے نفس میں استحضار کرلو وہ اس طور پر کہ پہلے اپنے نفس سے ابتدا کرو یعنی اپنی عقل میں اپنے تمام اعضائے بسیطہ و اعضائے مرکبہ کو اور تمام قوائے طبعیہ، حیوانیہ اور انسانیہ کو مستحضر کرلو، اس کے بعد اس عالم کی تمام مختلف اشیاء یعنی معدنیات ونباتات اور حیوانات وانسان وغیرہ کو اپنی عقل میں مستحضر کرو اس کے ساتھ تمام دریا وسمندر، بلند وبالا پہاڑ، اونچے ٹیلے تمام جنگلات و بیابان اور کشادہ میدان اور جو اس میں عجیب وغریب قسم کے نباتات وحیوانات بلکہ فضاؤں میں گردش کررہے ذرات ہیں سب کو خیال میں رکھو۔

پھر اس جہان رنگ و بو سے ترقی کرکے نیلگوں آسمان اس کی وسعتوں اور عظمتوں کو نظر میں رکھو پھر اسی طرح ایک آسمان سے دوسرے آسمان اور دوسرے آسمان سے تیسرے آسمان یہاں تک سدرۃ المنتہیٰ، رفرف، لوح محفوظ، قلم، جنت ودوزخ اور عرش وکرسی تک جاؤ پھر عالم اجسام سے عالم ارواح کی طرف منتقل ہوجاؤ اور اپنی عقل میں تمام ارواح ارضیہ، سفلیہ بشریہ وغیر بشریہ کو مستحضر کرلو اس کے ساتھ ان سب ارواح کو بھی مستحضر کرلو جو جبال و بحار سے متعلق ہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک جبال و بحار کے بارے میں فرمایا ہے، پھر آسمان دنیا اور ساتوں آسمانوں میں جلوہ افروز فرشتوں کا استحضار کرلو جیسا کہ حضور نبی کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آسمانوں میں کہیں ایک بالشت

بھی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ قیام وقعود میں نہ ہو۔ نیز ان فرشتوں کا بھی استحضار کرو جو عرش عظیم کے چاروں طرف صف بستہ کھڑے ہیں اور جو حاملین عرش وکرسی ہیں پھر ان سے ان کی طرف منتقل ہو جاؤ جو اس عالم سے خارج ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَ مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ'' اور تمہارے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا (المدثر:۳۱) بلکہ وہ اس بات سے بھی پاک اور منزہ ہے کہ عقل، اس کا اشیاء کے ساتھ قیاس کرنے اور اشیاء کی طرف نسبت کرنے کے جواز کا حکم دے، چہ نسبت خاک را با ذات پاک اب جب کہ روحانیات وجسمانیات کے تمام اقسام تمہارے نزدیک مستحضر ہو گئے تو اب کہو ''اَللّٰهُ اَكْبَر''۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اسم جلالت ''اَللّٰهُ'' سے مسمیٰ اور وہ ذات مراد ہے جس ذات کریم کی ایجاد سے تمام اشیاء کا وجود وشہود ہوا ہے۔ اور ان اشیاء کو جو صفات وکمالات حاصل ہیں سب اسی ذات کے پیدا کرنے سے حاصل ہیں اور 'اَكْبَر" سے مراد یہ ہے کہ وہ ذات الٰہی، اشیاء کی طرف مشابہت اور مشاکلت سے منزہ ہے مختصر یہ کہ ابتداء نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت جو اللہ اکبر کہتے ہیں اس کی مندرجہ بالا جو مراد بیاں ہوئی اس کے تصورات نمازی کے ملحوظ خاطر رہنے چاہئے۔

تکبیر تحریمہ کی تفسیر میں دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''الاحسان أن تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك'' یعنی احسان یہ ہے کہ تم عبادت کرو اللہ کی گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے ہو تو بیشک وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ پس اس وقت بندہ جب اَللّٰهُ اَكْبَر کہتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے ''الله اكبر من أن لا يراني ومن أن لا يسمع كلامي'' یعنی اللہ اس بات سے بہت بلند ہے کہ وہ مجھے نہ دیکھے اور میرے کلام کو نہ سنے۔ اَللّٰهُ اَكْبَر کا ایک معنی یہ بھی ہے ہوسکتا ہے کہ اللہ بلند ہے اس بات سے کہ مخلوق کی عقلیں، اس کے اوہام وخیالات اور اس کے افہام واذہان کی اس تک رسائی ہو۔

چوتھی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ اکبر ہے یعنی بلند ہے اس بات سے کہ مخلوق اس کی عبادت کا حق ادا کر سکے بلکہ حق یہ ہے کہ انسان کی ساری طاعات، خدمت الٰہی کی بجا آوری سے اس کی زبان حمد وثناء الٰہی سے اور اس کے علوم اس کی کنہ صمدیت کے فہم سے قاصر اور عاجز ہیں اس لئے کوئی انسان قادر نہیں کہ کما حقہ اس کی عبادت کا حق ادا کر سکے۔ اسی اعتراف عجز کے لئے بندہ کہتا ہے ''اَللّٰهُ اَكْبَر''۔

اب یہ خیال رکھو اے نمازیو! کہ جب تم اس مقام پر پہنچ جاؤ جہاں تمہاری عقل عالم اجسام وعالم ارواح کے تمام

عجائبات کا احاطہ کرلے پھر بھی تمہارا نفس ہرگز یہ بھی نہ سمجھے کہ میں اللہ عزشانہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کی وادیوں کے آغاز اور مبدأ تک پہنچ گیا چہ جائے کہ وہ خیال کرے کہ میں منتہا تک پہنچ گیا۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رب تعالیٰ کی حمد وثناء اور دعاؤں میں فرماتے "لا ینالک غوص الفکر و لا ینتھی الیک نظر ناظر، ارتفعت عن صفۃ المخلوقین صفات قدرتک و علا عن ذالک کبریاء عظمتک" (الخ) اے اللہ! فکر کے سمندر میں غوطہ زن ہونے والے کی فکر تجھ تک پہنچ نہیں سکتی، کسی ناظر کی نگاہ کی تجھ تک انتہا نہیں ہوسکتی، تمام مخلوقات کی صفات سے تیری قدرت کی صفات نہایت ہی برتر و بالا ہیں اور تیری کبریائی وعظمت مخلوقات کی بڑائی سے بے انتہا بلند ہے پس جب تم "اَللّٰہُ اَکْبَر" سے نماز شروع کرنے لگو تو اپنی نگاہ عقل کو جلالت الٰہیہ کی لامحدود دنیا میں کردو اور پڑھو "سبحانک اللھم و بحمدک" (الخ) پھر عالم امر و تکلیف کی طرف منتقل ہوجاؤ اور سورہ فاتحہ شریف کو اپنی نگاہوں کے سامنے ایک روشن آئینہ کی طرح سمجھو جس میں تمہیں دنیا و آخرت کے عجائبات کا مشاہدہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے انوار، اس کی صفات علیا کی برکات، ادیان سابقہ، گذشتہ مذاہب، کتب الٰہیہ کے اسرار و رموز اور شرائع نبویہ کے اصول وفروع کا مطالعہ کرو اس سے تمہاری رسائی شریعت تک ہوگی پھر وہاں سے طریقت تک پہنچ جاؤ گے جب اس میں کامل ہوجاؤ گے تو حقیقت تک رسائی ہوجائے گی پھر اس میں تم حضرات انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے درجات ومراتب کا بھی مشاہدہ کروگے اور ان کے برخلاف گم گشتگان راہ ہدایت ضالین ومردودین اور ملعونین کے درکات کا بھی تصور کروگے اب ثناء الٰہی کے بعد جب تم نے "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھا تو اس سے تم نے گویا تمام دنیا اور کائنات کا مشاہدہ کرلیا اس لئے کہ اللہ عظمت وجلالت والے رب کے نام کی برکتوں سے زمین وآسمان اور دنیا کی تمام نعمتیں قائم ہیں۔ تسمیہ کے بعد اب جب کہ تم نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی قرأت کیا تو گویا تم نے آخرت کا مشاہدہ کرلیا اس لئے کہ کلمہ حمد سے آخرت کا قیام ہے ارشاد رب العلمین ہے "وَاٰخِرُ دَعْوٰىھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (یونس:۱۰) جب "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم" تم نے کہا تو عالم جمال یعنی رحمت اور فضل واحسان کا مشاہدہ کیا اور جب "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ" پڑھا تو عالم جلال اور اس میں ہونے والے احوال واہوال کا مشاہدہ کرلیا اور جب "اِیَّاكَ نَعْبُدُ" پڑھا تو جہان شریعت تمہاری نگاہوں کے سامنے آگئی جب "وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ" کہا تو تم نے طریقت جان لی پھر جب "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کہا تو حقیقت تک تمہاری رسائی ہوگئی پھر جب "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" کہا تو ارباب سعادات وبرکات اور اصحاب کرامات یعنی انبیاء ومرسلین اور

شہداوصالحین کے مراتب ودرجات کوجان لیااور جب ''غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ ''کہاتو آفاق میں پھیلے فساق کے مرتبوں کو دیکھ لیااور ''وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ'' کے بعد، کفار ومشرکین، شقاوت وبدبختی کے مستحقین، دنیاوآخرت میں ذلت و رسوائی کے حقدار اور نفاق کے علمبردار کے مختلف درکات وحالات جان لئے۔

حمد وثنااور سورہ فاتحہ کی قرأت کے بعد جومقامات بلنداور علودرجات کے احوال تمہیں منکشف ہوئے اس پر یہ گمان نہ کرنا کہ تم انتہا کو پہنچ گئے بلکہ اپنی ذلت وناداری اور عاجزی وانکساری کا اعتراف کرتے ہوئے حق تعالیٰ کی کبریائی کے اقرار کی طرف لوٹ آؤ اور کہو''اللہ اکبر'' بعدہ صفت عظمت کی طرف لوٹو اور کہو''سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡعَظِیۡم ''صفت عظمت کیا ہے؟ اگر چاہو کہ تمہیں صفت عظمت کے ایک ذرہ کی معرفت حاصل ہوجائے تو یہ جان لو کہ عظمت، عرش کی صفت ہے کوئی مخلوق اپنی عقل سے عرش کی عظمت کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتی گرچہ دنیا کے ایام میں سے آخری دن تک زندہ رہے۔ جب عرش اعظم کی عظمت وبزرگی کا یہ حال ہے تو عرش والے رب مجید کی عظمت کا کیا حال ہوگا یاد رہے کہ عظمت حق تعالیٰ کے مقابل میں عرش کی عظمت ایسی ہے جیسے قطرہ کی حیثیت سمندر کے مقابلہ میں جب واقعہ یہ ہے تو عظمت الٰہی کی کنہ تک کیونکر رسائی ہوسکتی ہے؟

اس مقام پر ایک سرعجیب ہے وہ یہ کہ رکوع کی تسبیح میں ''سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡاَعۡظَم ''نہیں کہا جاتا بلکہ ''سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡعَظِیۡم '' کہتے ہیں۔ اس کے برعکس سجدہ کی تسبیح میں العظیم کی مناسبت سے ''سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡعَالِیۡ یا رَبِّیَ الۡعَلِی ''نہیں کہتے بلکہ ''سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡاَعۡلٰی'' کہتے ہیں۔ دونوں تسبیحوں کے درمیان جوفرق ہے ان میں اسرار و عجائب پوشیدہ ہیں ان کا ذکر اس مقام پر مناسب نہیں کچھ ذیل میں آرہا ہے۔

پس جب رکوع کی تسبیح سے فارغ ہولوتو بار دیگر قیام کی طرف عود کرو اور جو تمہاری طرح قیام میں ہیں اور حمد الٰہی بجا لارہے ہیں ان کے حق میں دعا کرو اور کہو''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ''کیونکہ جب تم دوسروں کے بارے میں رب سے سوال کروگے تو تمہارا بھلا ہوگا چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ حضور سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اس بندہ کی مدد میں ہوتا ہے جو اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔

اعتراض: اس مقام پر یہ اعتراض قائم ہوسکتا ہے کہ رکوع سے قیام کی طرف عود کرتے وقت اَللّٰہُ اَکۡبَر کی بجائے''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ''کیوں کہتے ہیں۔؟

جواب: یہ ہے کہ تکبیر، کبریاء سے ماخوذ ہے اور وہ ہیبت وخشیت کا مقام ہے اور یہ مقام، مقام شفاعت ہے اور یہ دونوں متبائن ہیں۔ اس لئے رکوع سے قیام کی طرف عود کرتے وقت تکبیر مناسب نہیں۔

اب پھر تکبیر کہتے ہوئے سجدہ میں جاؤ اور رب تعالیٰ کی صفت علو کو بیان کرتے ہوئے کہو "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی"، "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" اس لئے کہتے ہیں کہ رکوع کی بہ نسبت سجود میں زیادہ تواضع ہے اس لئے جو ذکر سجدہ میں مذکور ہے اس میں مبالغہ کے ساتھ ہونا ضروری تھا، برعکس رکوع کے، کہ رکوع کے اندر جو ذکر مذکور ہے وہ لفظ تعظیم ہے جس میں مبالغہ نہیں ہے اس لئے رکوع میں الْعَظِیْم، اور سجدہ میں الْاَعْلٰی کا حکم ہوا۔ مروی ہے کہ زیر عرش اللہ تعالیٰ کا ایک ملک مقرب ہے جن کا اسم مبارک حزقیل ہے رب تعالیٰ نے ان کو الہام کیا کہ اے میرے فرشتہ! پرواز کرو انہوں نے تیس ہزار سال تک پرواز کیا، پھر تیس ہزار سال پرواز کیا، بعدہ پھر تیس ہزار سال پرواز کیا مگر وہ عرش کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک نہ پہنچ سکے پس اللہ عز شانہ تعالیٰ نے انکو الہام کیا کہ اگر نفخ صور یعنی صبح قیامت تک پرواز کرتے رہو گے تو بھی عرش کے دوسرے کنارہ تک نہیں پہنچ سکتے اس پر اس ملک مقرب نے کہا "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" رکوع و سجود کی تسبیحات میں الْعَظِیْم و الْاَعْلٰی کے اسرار و عجائب تلاش کئے بغیر وہ حدیث پاک ذہن نشین رہے جو ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب آیت "فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کو اپنے رکوع میں کرو اور جب "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے اپنے سجدہ میں کرو (مشکوٰۃ صفحہ: ۸۲) اس حدیث کی شرح میں مرقات میں ہے "قال ابن حجر و جه التخصيص ان الاعلیٰ ابلغ من العظیم فجعل للا بلغ فی التواضع و هو السجود الا فضل من الرکوع" یعنی حضرت ابن حجر نے کہا ہے کہ تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ الاعلیٰ، العظیم سے ابلغ ہے (اور رکوع و سجود میں رکوع کی بہ نسبت سجود افضل کہ اس میں کمال تواضع ہے) پس ابلغ یعنی الاعلیٰ کو افضل یعنی سجود کے لئے خاص کیا۔

اعتراض: اگر اعتراض کیا جائے کہ نماز میں دو سجدہ کیوں ہے اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اس کی چند حکمتیں ہیں۔ اول یہ کہ پہلا سجدہ ازل کے لئے اور دوسرا سجدہ ابد کے لئے اور ان دونوں سجدوں کے درمیان اٹھنا اشارہ ہے دنیا کے وجود کی طرف جو ازل و ابد کے درمیان قائم ہے۔ وہ اس طور پر کہ اس کے ازلی ہونے کی وجہ سے تم جانتے ہو کہ وہی اول ہے اس سے پہلے کوئی اول نہیں پس تم اس کو ایک سجدہ کرتے ہو پھر اس کے ابدی ہونے کی وجہ سے تم یہ جانتے ہو کہ وہی آخر ہے اس کے بعد کوئی آخر نہیں پس اس کے لئے دوسرا سجدہ کرتے ہو۔

دوم: دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ سجدہ اولیٰ سے آخرت میں دنیا کے فنا ہونے کو اور سجدہ ثانیہ سے نور جلال الٰہی کے ظہور کے وقت عالم آخرت کے فنا کو جانو۔

سوم: سجدہ اولیٰ سے فی نفسہا کل کے فنا ہونے کی طرف اور سجدہ ثانیہ سے بابقاء الٰہی کل کی بقا کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (القصص:۸۸)

چہارم: سجدہ اولیٰ دلالت کرتا ہے کہ عالم شہادت اطاعت الٰہی میں ہے اور سجدہ ثانیہ دلالت کرتا ہے کہ عالم ارواح اطاعت الٰہی میں ہے جیسا کہ ارشاد رب العلمین ہے "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ"۔

پنجم: سجدہ اولیٰ، سجدہ شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنی ذات وصفات کی یک گونہ معرفت عطا کی ہے اور سجدۂ ثانیہ سجدہ عجز وخوف ہے کہ اللہ کی جلالت وکبریائی کے حقوق کی ادائیگی تک رسائی نہ ہوسکی۔

ششم: سجدہ خضوع اعظم ہے۔ سجدہ میں انسان اپنی مقدس پیشانی کو جوتے اور قدموں سے روندی جانے والی زمین پر رکھ کر خدائے وحدہٗ لاشریک لہ کی الوہیت وکبریائی اور اپنی عبودیت اور عاجزی کا اظہار کرتا ہے پس اس میں تکرار ہی انسب ہے کہ اس میں حصول مقصود یعنی رب تعالیٰ کی کبریائی کا اظہار اور اپنی ذلت وعاجزی کا اظہار زیادہ ہے چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ بندہ اس وقت رب سے بہت قریب ہوجاتا ہے جب وہ اسے سجدہ کرتا ہے۔

ہفتم: دوسجدہ میں اشارہ ہے کہ انسان زمین سے پیدا کیا گیا ہے اور بعد موت اسی میں لوٹا دیا جائے گا۔ اور پھر روز محشر اسی زمین سے نکالا جائے گا جیسا کہ ارشاد رب العالمین ہے "مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى" ہم نے زمین ہی سے تمہیں بنایا اور اسی میں تمہیں پھر لے جائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔ (طہ: ۵۵) پس نمازی سجدہ اولی میں گویا یہ کہتا ہے "مِنْهَا خَلَقْتَنِیْ" اور سجدہ ثانیہ میں کہتا ہے "وَفِيْهَا تُعِيْدُنِیْ" اور دوسرے سجدہ سے جب اٹھتا ہے تو گویا کہتا ہے "مِنْهَا تُخْرِجُنِیْ تَارَةً اُخْرٰى"۔

ہشتم: تکرار سجدہ کی آٹھویں وجہ وہ ہے جو بہت ہی مشہور ہے وہ یہ کہ جب فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو انہوں نے سجدہ کرلیا سجدہ کے بعد دیکھا کہ ابلیس لعین سجدہ نہ کرکے برطرف کھڑا ہے پس حضرات ملائکہ نے فوراً دوسرا سجدہ بطور سجدۂ شکر ادا کیا کہ اللہ عزوجل نے ان کو سجدہ اولیٰ کی توفیق رفیق عطا فرمائی (مرقات)۔

فصل ہفتم: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے لطائف، اور اس میں مذکور اسمائے حسنیٰ خمسہ کے فوائد کے بیان میں۔

ارشاد 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ' کے لطائف میں چار نکتے ہیں:

نکتہ اول: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ بیشک ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب سے عرض کیا اے میرے رب اس آدمی کا تیری بارگاہ میں کیا اجر وثواب ہے جس نے تیری حمد بیان کی اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاتِحَةُ الشُّكْرِ وَ خَاتِمَتُهٗ" یعنی الحمدللہ شکر کا آغاز اور اس کی انتہا ہے۔

اہل تحقیق نے کہا ہے کہ جب یہ کلمہ فاتحۃ الشکر ہے تو اللہ نے اسے اپنے کلام قرآن مجید کا فاتحہ قرار دیا ہے اور جب یہ خاتمۃ الشکر بھی ہے تو اس لئے اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اسے جنتیوں کے کلام کا خاتمہ قرار دیا چنانچہ ارشاد ہے "وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (یونس:۱۰)

حضرت مولا علی مشکل کشا کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنے علم سابق کے مطابق خزانہ الٰہی میں مخفی نور سے عقل کو پیدا فرمایا پس علم کو اس کی ذات، فہم کو اس کی روح، زہد کو اس کا سر، حیاء کو اس کی آنکھ حکمت کو اس کی زبان، خیر کو اس کی کان، رافت کو اس کا قلب رحمت کو اس کا ارادہ اور صبر کو اس کا شکم بنایا پھر عقل سے کہا گیا کلام کرو تو عقل یوں گویا ہوئی "الحمد للہ الذی لیس لہ ندو لا ضد و لا مثل و لا عدل، الذی ذل کل شئ لعزتہ" یعنی تمام تعریف اس اللہ کے لئے جس کا کوئی شریک مقابل، مثل اور برابر نہیں، وہ ذات جس کی عزت کے سامنے ہر شئ حقیر ہے اس پر رب تعالیٰ نے فرمایا قسم ہے میری عزت وجلال کی کہ میں نے تم سے زیادہ معزز کسی مخلوق کو نہ پیدا فرمایا نیز منقول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جسم میں جب روح ڈالی گئی تو آپ کو چھینک آئی آپ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہا پس آپ کا اول کلام جو زبان مبارک سے نکلا وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" تھا اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مخلوقات کے مراتب میں اول عقل ہے اور مخلوقات کے مراتب میں آخر حضرت آدم ہیں اور یہ گذشتہ سے معلوم ہوگیا کہ عقل کا اول کلام "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" تھا یونہی حضرت آدم علیہ السلام کا اول کلام بھی "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ محدثات کے آغاز کا اول کلام بھی اَلْحَمْدُ تھا اور محدثات کے خاتمہ اور انتہا کا اول کلام بھی اَلْحَمْدُ تھا اس وجہ سے اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید کے فاتحہ کا اسی کلمہ سے آغاز فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ کلمات الٰہیہ میں اول کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہے اور اللہ کے انبیا میں آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اول و آخر کے درمیان مناسبت ہے پس اس لئے اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کو اپنے آخری رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب قرآن حکیم کی اول آیت قرار دیا۔ جب قرآن کی اول آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور آخری نبی محمد رسول اللہ کے درمیان ایسی مناسبت ہے تو اللہ عزشانہ تعالیٰ نے کلمہ حمد سے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دو اسم بنائے۔ ایک احمد، دوسرا محمد چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انا فی السماء احمد و فی الارض محمد" سرکار کے دونوں اسم مبارک قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول قرآن حکیم میں ہے "وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ

رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ''اور یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوا اور ان رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے (الصّف:٦) اور دوسرا نام مبارک کئی مقام پر ارشاد ہوا ارشاد ہے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ''محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل (۔۲۹ سورہ فتح) اور ''مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں، ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے پچھلے (الاحزاب:۴۰) غرضیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں اسم مبارک جو کلمہ حمد سے ماخوذ ہیں۔ قطعی ہیں اسم مبارک احمد سے مراد یہ ہوگا کہ اہل سماء سب اللہ کی تحمید میں ہوں گے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب میں احمد ہوں گے۔

اور دوسرا اسم مبارک کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اہل ارض کی تحمید فرماتا ہے چنانچہ فرماتا ہے ''فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ''(الاسرار:۱۹) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب میں اللہ تعالیٰ کے خوب خوب سراہے ہوئے تعریف کئے ہوئے ہیں اس لئے محمد ہیں۔

نکتہ دوم: حمد وثنا اسی وقت ہوتی ہے جب نعمت ورحمت، کا حصول ہو اور بیان سابق سے معلوم ہو گیا کہ حمد، اول کلمات ہے تو واجب ہے کہ نعمت و رحمت افعال و احکام میں سب سے اول ہو اسی سبب سے ارشاد ہوا ''سبقت رحمتی غضبی ''میرے غضب پر میری رحمت مقدم ہے۔

نکتہ سوم: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اسم شریف احمد ہے جس کا معنی ہے احمد الحامدین یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والوں میں سب سے زیادہ اور عمدہ حمد کرنے والے۔ اور جب سب سے زیادہ حمد کرنے والے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بھی آپ پر سب سے زیادہ ہوں گی کہ کثرت حمد کثرت نعمت ورحمت کے اعتبار سے کی جاتی ہے جب واقعہ یہ ہے تو لازم ہے کہ اللہ کی رحمتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام عالمین کے بالمقابل زیادہ ہوں گی اسی سبب سے ارشاد فرمایا ''وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ''(الانبیاء:۱۰۷)

نکتہ چہارم: بیشک اللہ رب العلمین، انبیاو مرسلین کا مرسل ہے اور اس کے دو اسماء حسنیٰ ایسے ہیں جو رحمت سے

ماخوذ ہیں۔ایک رحمن دوسرا رحیم، دونوں اسم مبالغہ کا فائدہ دیتے ہیں۔اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی دو اسماء ایسے ہیں جن میں رحمت کا معنی ملحوظ ہے اور وہ دو اسم محمد اور احمد ہیں۔محمد و احمد میں معنی رحمت اس طور پر ملحوظ ہے کہ حصول حمد، حصول رحمت سے مشروط ہے پس اسم محمد، و اسم احمد گویا معنی مرحوم و معنی ارحم کے قائم مقام ہیں۔ بلکہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء میں سے الحمد، الحامد اور المحمود بھی ہیں اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچ اسماء مبارکہ ایسے ہیں جو رحمت پر دال ہیں۔

جب یہ باتیں محفوظ ہوگئیں تو اب یہ سمجھئے کہ اللہ رب العلمین نے فرمایا ہے "نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" خبر دو میرے بندوں کو کہ بیشک میں ہی بخشنے والا مہربان ہوں۔(الحجر:۴۹) ارشاد نَبِّئْ میں اشارہ اور خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو "عِبَادِ" سے پہلے مذکور ہے اور "عِبَادِيْٓ" میں "یا" ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور "اَنِّيْٓ" کی یاء متکلم بھی رب تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور پھر "اَنَا" سے بھی اللہ غفور رحیم مراد ہے۔ پھر ارشاد "الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" اللہ تعالیٰ کی دو صفت ہے اس طرح صرف اس ایک آیت "نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" میں پانچ الفاظ ایسے ہیں جو اللہ کریم و رحیم پر دلالت کرنے والے ہیں۔حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے گنہگار مومن بندے قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چلیں گے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پانچوں اسماء رحمت کے ساتھ امت کے آگے آگے ہوں گے اس کے ساتھ ہی پانچ الفاظ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے رحمت پر دلالت کرنے والے شامل حال ہوں گے۔غرضیکہ اللہ تعالیٰ کے پانچ اسمائے مبارکہ کی رحمت غیر متناہیہ بحسب ارشاد "وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ" (الاعراف:۱۵۶) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچ رحمت والے ناموں کی رحمت کثیرہ بحسب ارشاد "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" گنہگار مومنوں کے شامل ہوں گی تو کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ دس دس رحمتوں سے لبریز و موجزن سمندر میں گنہگار رضائع ہوجائیں۔فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ

سورہ فاتحہ میں اسمائے الٰھیہ کے فوائد:۔

فائدہ:(۱): بیشک سورہ فاتحہ میں دس اشیاء ہیں ان میں سے پانچ صفت ربوبیت سے متعلق ہیں۔اور وہ اللہ، الرب، الرحمن، الرحیم اور المالک ہے اور پانچ صفات عبد سے متعلق ہیں وہ العبودیت الاستعانت، طلب ہدایت، طلب استقامت اور طلب نعمت ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" پس یہ پانچوں اسمائے مبارکہ بندہ کے مذکورہ پانچ احوال پر منطبق ہوتے ہیں۔

گویا کہ بندہ یہ کہتا ہے ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ لِاَنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ''یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اس لئے کہ بیشک تو ہی اللہ ہے۔اور کہتا ہے ''وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنِ لِاَنَّکَ اَنْتَ الرَّبُّ ''یعنی ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اس لئے کہ بیشک تو ہی رب ہے۔اور کہتا ہے ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ لِاَنَّکَ اَنْتَ الرَّحْمٰنُ ''یعنی ہمیں صراط مستقیم پر چلا اس لئے کہ بیشک تو رحمن ہے اور کہتا ہے ''وَارْزُقْنَا الْاِ سْتِقَامَۃَ لِاَنَّکَ اَنْتَ الرَّحِیْمُ ''یعنی ہمیں استقامت عطا فرما اس لئے کہ بیشک تو رحیم ہے۔اور بندہ کہتا ہے ''وَأَفِضْ عَلَیْنَا سِجَالَ نِعَمِکَ وَکَرَمِکَ لِاَنَّکَ مَالِکُ یَوْمِ الدِّیْنِ ''یعنی ہم پر اپنی نعمتوں اور کرم وبخشش کا فیضان فرما اس لئے کہ تو مالک یوم الدین ہے۔

فائدہ(۲): انسان پانچ اشیاء سے مرکب ہے(۱)بدن،(۲)نفس شیطانیہ،(۳)نفس شہوانیہ،(۴)نفس غضبیہ،(۵)جوہر ملکی عقلی،پس حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنے پانچ اسمائے حسنی سے انسان کے پانچوں مراتب ترکیبیہ پر تجلی فرمائی۔ چنانچہ اسم جلالت اللہ کی روح ملکیہ،عقلیہ،فلکیہ،قدسیہ پر تجلی ہوئی تو وہ متواضع اور تابع فرمان ہوگیا۔جیسا کہ ارشاد ہے۔''اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ''(الرعد:۲۸)۔

اور نفس شیطانیہ پر اسم رب یعنی بروا حسان کی تجلی ہوئی تو اس نے عصیان کو ترک کیا اور اللہ کی طاعت وفرماں برداری میں لگ گیا پھر جب نفس غضبیہ سبعیہ پر اسم رحمن سے تجلی فرمائی اور یہ اسم مرکب ہے قہر ولطف سے۔جیسا کہ ارشاد ہوا''اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ''(الفرقان:۲۶)یعنی اس دن حقیقی بادشاہی صرف رحمان کی ہوگی۔پس اس نے خصومت ترک کردی اور نفس شہوانیہ بہیمیہ پر اسم رحیم سے تجلی فرمائی پس مباحات وطیبات کی اجازت دے دی گئی جیسا کہ کہا''اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبَاتُ''پس اس کی شہوانی طاقت نرم پڑ گئی اور عصیان کو ترک کر دیا۔اور اجساد وابدان پر اپنے ارشاد مَالِکُ یَوْمِ الدِّیْنِ کے قہر سے تجلی فرمائی کیونکہ بدن غلیظ وکثیف ہوتا ہے اس کے لئے قہر شدید کی ضرورت ہے۔قہر وہ ہے جو روز قیامت کے خوف سے پیدا ہوگا۔

غرض جب اللہ عزشانہ تعالیٰ نے اپنے پانچ اسمائے مبارکہ سے انسان کے ان پانچ مراتب پر تجلی فرمائی تو اس کے لئے جہنم کے دروازے بند ہوگئے اور جنت کے دروازے کھل گئے۔پھر انسان کے یہ پانچوں مراتب رجوع ہونا شروع ہوئے پس بدنوں نے اطاعت کی تو کہا''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' اور نفوس شہوانیہ نے اطاعت کی تو کہا''وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنِ ''یعنی شہوات سے اعراض اور لذات کے ترک پر ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔اسی طرح نفوس غضبیہ نے اطاعت کی تو کہا''اِھْدِنَا''یعنی ہمیں ہدایت فرما ہماری راہنمائی فرما اور اپنے دین پر ثابت قدم رکھ اور نفس شیطانیہ نے

اطاعت کی اور اللہ سے استقامت طلب کی اور راہ حق سے روگردانی سے حفاظت طلب کی تو اس نے کہا "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ "اور ارواح قدسیہ ملکیہ نے تواضع اختیار کیا تو اس نے اللہ سے سوال کیا کہ اسے ارواح قدسیہ عالیہ مطہرہ معظّمہ کے ساتھ لاحق کردے پس اس نے کہا "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ"۔

فائدہ(۳): حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "بنی الاسلام علیٰ خمس، شهادة ان لا اله الا الله وأن محمدا رسول الله، واقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة وصوم رمضان وحج البيت" یعنی اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔

پس کلمہ طیبہ کی شہادت اللہ کے نام پاک کے نور کی تجلی سے حاصل ہوتی ہے، نماز کا قیام اسم رب کی تجلی سے ہوتا ہے اس لئے کہ رب تربیت سے مشتق ہے پس بندہ نماز کی مدد سے اپنے ایمان کی تربیت کرتا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی اسم رحمن کی تجلی کی برکت سے ہوتی ہے اس لئے کہ رحمن مبالغہ کا صیغہ ہے جو رحمت کے معنی میں زیادتی کا فائدہ دیتا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے فقراء و مساکین پر رحمت کی جاتی ہے اسی طرح روزۂ رمضان کا وجوب اسم رحیم کی تجلی سے ہے کیونکہ روزہ دار کو جب شدت بھوک و پیاس کا احساس ہوتا ہے تو اسے فقراء و مساکین کی بھوک یاد آتی ہے اس طرح روزہ دار کے دل میں فقراء و مساکین کو ان چیزوں کے دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے وہ محتاج ہوتے ہیں نیز بندہ جب روزہ سے ہوتا ہے تو اس کو محسوسات سے لذت حاصل کرنا ممتنع ہوجاتا ہے بھوک و پیاس کے باوجود، مطعومات و مشروبات ہونے کے ساتھ ساتھ روزہ دار ان چیزوں سے قطع تعلق کرلیتا ہے اس سے اس کو موت کے وقت فائدہ پہنچتا ہے کہ ان اشیاء سے مفارقت اور علیحدگی سے اس کے نفس پر بار نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں کو چھوڑنا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے نفس مطمئن رہتا ہے ایسے لوگوں کے لئے ارشاد ہوا "يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" اے اطمینان والی جان اپنے رب کی طرف واپس ہو یوں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ (فجر: ۲۷+۲۸) اور رہا حج کا وجوب تو اسم مالک یوم الدین کی تجلی سے ہے۔ اس لئے کہ حج کے لئے اپنے وطن عزیز کو چھوڑنا پڑتا ہے، اہل و عیال کو داغ مفارقت دینا ہوتا ہے پھر وہ ننگے قدم ننگے بدن صرف ایک چادر و تہبند میں مثل کفن ملبوس ہوکر اپنے خطیات کی بخشش اور مغفرت کی خاطر سرگرداں پھرتا رہتا ہے جیسا کہ میدان قیامت میں ہوگا غرض کہ حج اور احوال قیامت کے درمیان کمال مشابہت اور زیادتی مناسبت ہے۔

فائدہ(۴): قبلہ کی پانچ قسمیں ہیں:(۱) بیت المقدس، (۲) کعبہ معظّمہ، (۳) بیت المعمور، (۴) عرش اعظم، (۵) درگاہ حضرت جلال رب العلمین۔

گویا اس سورہ مبارکہ میں مذکورہ پانچوں اسمائے مبارکہ ان پانچوں اقسام قبلہ کے اعتبار سے ہیں۔

فائدہ(۵): حواس پانچ ہیں۔

(۱) باصرہ، (۲) سامعہ، (۳) ذائقہ، (۴) شامہ، (۵) لامسہ

ان پانچوں حواس کو حدود شرع میں رکھنا، اور مہذب و آراستہ کرنا فرض ہے۔ باصرہ کے لئے ارشاد ہے ''فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ'' توعبرت لو اے نگاہ والو۔(الحشر:۲) سامعہ کے لئے ارشاد ہوا 'الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہ'' جوکان لگا کر بات سنیں پھر اس کے بہتر پر چلیں۔(زمر:۱۸) ذائقہ کے تعلق سے ارشاد فرمایا گیا۔''یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا'' اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھا کام کرو۔(المومنون:۵۱) قوت شامہ کے بارے میں فرمان حضرت یعقوب علیہ السلام بایں الفاظ مذکورہ ہے۔''اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ بیشک میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے یہ نہ کہو کہ سٹھ گیا ہے۔(یوسف:۹۴) حاسۂ لامسہ کے بارے میں فرمایا گیا''وَ الَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ'' اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔(المومنون:۵) پس سورہ فاتحہ میں مذکور اسماء خمسہ کے انوار و برکات سے ان پانچوں حواس کے شر و فساد سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

فائدہ(۶): گذشتہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ شریف کا نصف اول، پانچ اسمائے الٰہیہ مبارکہ پر مشتمل ہے۔ جن کے انوار و برکات کا نزول اسرار و بواطن پر ہوتا ہے اور سورہ فاتحہ کا نصف آخر بندہ کے پانچ صفات پر مشتمل ہے۔ جن کے اسرار، ان انوار کے مقام مرتفع تک صعود کرتے ہیں پس ان دونوں حالتوں کے سبب سے بندہ کو اس کی نماز میں معراج کا حصول ہوتا ہے اول نزول ہے اور ثانی صعود ہے اور دونوں قسموں کے درمیان حد مشترک وہ حد ہے جو ارشاد، مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ، اور ارشاد ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' کے درمیان فاصل ہے۔اس کلام کی تقریر یہ ہے کہ بندہ کی حاجت یا تو طلب دنیا میں ہے یا طلب آخرت میں، اگر طلب دنیا میں محتاج ہے تو اس کی دو قسمیں ہیں اول دفع ضرر، دوم جلب منفعت اور اگر وہ طلب آخرت میں محتاج ہے تو اسکی بھی دو قسمیں ہیں اول دفع ضرر اور وہ جہنم سے دور و نفور رہنا ہے۔ دوم طلب خیر اور وہ حصول جنت ہے۔اس طرح مجموعہ چار ہوئے اور پانچواں ان سب میں افضل و اشرف

ہے اور وہ خدمت واطاعت الٰہی کی طلب اور اس کی عبادت صرف اس لئے ہو کہ وہی معبود ہے اس میں کوئی غرض شامل نہ ہو نہ جہنم کا خوف ہو اور نہ جنت کی لالچ ہو بلکہ صرف خوشنودی رب اور رضائے معبود مقصود ہو پس جب تمہیں اسم جلالت لفظ اَللّٰہ کے نور کا مشاہدہ ہو جائے تو تمہیں اللہ کے سوا کسی چیز کی طلب نہ ہوگی۔ اور اگر تمہیں اسم رب کے نور کا مطالعہ ہو جائے تو تم جنت کی خیرات کے طالب ہو گے۔ اور اگر تمہیں اسم الٰہی لفظ الرحمن کے نور کی جلوہ نمائی ہو جائے تو تم اس عالم رنگ و بو کی خیرات کے طلبگار ہو گے البتہ اگر اسم مبارک الرحیم کی نور افشانی ہوئی تو تمہیں آخرت کی مضرتوں سے حفاظت کی طلب ہوگی۔ اور تم کو اسم پاک "مَالِكُ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے جلوۂ نورانی کی ضیاباری ہو جائے تو گویا تم اللہ تعالیٰ سے اس دنیا کی آفات و بلیات سے حفاظت اور اس میں اعمال کی قباحتوں میں پڑنے سے محفوظ رہنے کے طالب ہو گے تا کہ تم آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ ہو۔

فائدہ (۷): سورہ فاتحہ میں مذکور پانچ اسماء مبارکہ کو مشہور ذکر الٰہی کے پانچ مراتب پر مرتب کرنا ممکن ہے۔ اور مشہور ذکر یہ ہے جسے عرف میں تیسرا کلمہ کے نام سے جانتے ہیں۔

(۱) سُبْحَانَ اللّٰهِ، (۲) وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، (۳) وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، (۴) وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، (۵) وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ یاد رہے قول "سُبْحَانَ اللّٰهِ" سے قرآن حکیم کے ایک سورہ مبارکہ کا آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ اسراء میں ارشاد ہوا "سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا" **(الاسریٰ:۱)**۔

اور قول "الحمدللہ" سے پانچ سورہ قرآن کی ابتداء ہوئی ہے۔

(۱) سورہ فاتحہ میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" **ارشاد ہے۔**

(۲) سورہ انعام میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ" **ارشاد ہوا۔**

(۳) سورہ کہف میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ" **ارشاد ہے۔**

(۴) سورہ سبا میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ" **ارشاد ہوا۔**

(۵) سورہ فاطر میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" **ارشاد ہوا۔**

رہا کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" تو اس سے ایک سورہ قرآن کا آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے آغاز میں فرمایا "الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" اور کلمہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ قرآن حکیم میں دو جگہ ارشاد ہوا ہے لیکن با لتصریح ابتداء نہیں بلکہ ایک مقام پر ذکر کی طرف اضافت کر کے ارشاد ہوا چنانچہ ارشاد ہوا۔ "وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ

اَکْبَرُ" (العنکبوت: ۴۵) اور دوسرے مقام پر رضوان کی طرف اضاف کرکے فرمایا "وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ" (التوبۃ72) البتہ کلمہ "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِا اللّٰهِ الْعَلِی الْعَظِیْمِ" قرآن حکیم میں صراحتاً مذکور نہیں ہے۔ کیونکہ اسے کنوز جنت میں سے کہا گیا ہے اور کنز مخفی ہوتا ہے ظاہر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کررہے تھے کہ لوگ بلند آواز سے "اَللّٰهُ اَکْبَرُ" پڑھنے لگے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! اپنے آپ پر آسانی کرو کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ تم تو سننے دیکھنے والی ذات کو پکار رہے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے اور جس ذات کو تم پکارتے ہو وہ تو تمہاری سواری کی گردن سے بھی تمہارے زیادہ قریب ہے ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ میں آپ کے پیچھے اپنے دل میں "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِا اللّٰهِ" پڑھ رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عبداللہ بن قیص "الا أدلک علی کنز من کنوز الجنة فقلت بلی یا رسول الله، قال لا حول و لا قوة الا بالله" یعنی کیا میں تمہیں جنت کے خزانے کا پتہ نہ بتاؤں، میں نے عرض کیا کیوں نہیں، اللہ کے رسول! ضرور بتائیں آپ نے فرمایا وہ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِا اللّٰهِ" ہے۔ (متفق علیہ) پس سورہ فاتحہ میں پانچوں اسماء الٰہیہ ان پانچوں اذکار کے لئے مبادی ہیں۔ چنانچہ اسم جلالت "اَللّٰهُ" کلمہ سبحان اللہ کے لئے مبدأ ہے۔ اسم دوم رب، کلمہ الحمد للہ کے لئے مبدأ ہے۔ اسم سوم "الرحمٰن" کلمہ "لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهَ" کے لئے مبدأ ہے کیونکہ کلمہ "لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهَ" بیشک اسی کو لائق ہے جو کمال قدرت وکمال رحمت کا جامع ہے۔ اور جو کمال رحمت وقدرت کا جامع ہے یقیناوہی رحمن ہے۔ "الرحیم" کلمہ "اَللّٰهُ اَکْبَرُ" کے لئے مبدأ ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اکبر ہے اس بات سے کہ وہ اپنے ناتواں بندوں پر رحم نہ کرے۔ اور "مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کلمہ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِا اللّٰهِ الْعَلِی الْعَظِیْمِ" کے لئے مبدأ ہے۔ کیونکہ مالک اور ملک وہ ذات کہلاتی ہے جس کی مشیت وارادہ کے خلاف اس کا بندہ کوئی عمل نہ کرے، وھوتعالیٰ اعلم۔

فصل ھشتم: سورہ فاتحہ میں پانچ اسمائے مبارکہ ذکر کئے جانے کے اسباب۔

احوال خلق کے مراتب پانچ ہیں:۔

اول: خلق۔

دوم: مصالح دنیا میں تربیت۔

سوم: تعریف مبدأ میں تربیت۔

چہارم: معرفت معاد میں تربیت۔

پنجم: عالم اجساد سے دار معاد کی طرف ارواح کا انتقال۔

پس اسم جلالت "اللّٰہِ" خلق وایجاد، تکوین اور ابداع کا منبع ہے۔ اسم مبارک "رب" فضل واحسان کے طرق سے تربیت پر دلالت کرتا ہے۔

اسم رحمن: مبدأ کی معرفت میں تربیت کرتا ہے۔

اسم رحیم: معاد کی معرفت میں تربیت فرماتا ہے۔ تاکہ غیر مشروع سے پرہیز کرے اور مستحبات کے امتثال پر اقدام کرے۔ اور اسم ملک دلالت کرتا ہے کہ وہ مالک حقیقی ان سب کو دار دنیا سے دار جزا کی طرف منتقل فرمائے گا۔

مذکورہ پانچوں مراتب میں بندہ ان اسمائے مبارکہ خمسہ کے فیضان سے جب فیضیاب ہوتا ہے تو گویا وہ دار فنا سے دار جزا کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور بندہ اس طرح ہوجاتا ہے جیسے وہ رب تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اس لئے اس کو حکم ہوتا ہے کہ اب بطور غیبت نہیں بلکہ بطور مشاہدہ کلام کر پس بطور خطاب کہتا ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنِ" گویا کہ بندہ یہ کہتا ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اس لئے کہ تو اللہ خالق ہے۔ "وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنِ" ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اس لئے کہ تو رب رزاق ہے۔ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں کہ بیشک تو رحمن ہے اور بیشک ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اس لئے کہ تو رحیم ہے۔ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اس لئے کہ تو ہی حقیقی بادشاہ ہے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اسلئے کہ تو مالک ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی خیال رہے کہ ارشاد "مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کی دلالت اس پر ہوتی ہے کہ بندہ دار دنیا سے دار آخرت کی طرف اور دار شرور سے دار سرور کی طرف منتقل ہونے والا ہے۔ لہٰذا اس دن کے لئے زاد واستعداد ضروری ہے اور وہ عبادت ہے پس کہا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" پھر بندہ کہتا ہے کہ اے میرے رب جو میں نے اپنی طاقت و قوت سے حاصل کیا ہے وہ نہایت ہی قلیل ہے جو روز جزا جیسے طویل دن کے لئے کافی نہیں ہے اسلئے اس نے اپنے رب سے مدد چاہی کہ میرے رب جو میرے پاس ہے وہ قلیل ہے پس اپنے خزانہ رحمت سے وہ عطا فرما جو روز طویل کے لئے کافی ہو چنانچہ بندہ کہتا ہے "وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنِ"، اب جب روز معاد کے لئے زاد راہ حاصل ہوگیا تو پھر بندہ عرض گذار ہوتا ہے کہ یہ سفر طویل دشوار گذار ہے اور راستے مختلف ہیں ساری مخلوق اس وادی میں حیران و پریشان اور سرگرداں ہے ان راستوں میں سے راہ حق تک رسائی سوائے سالکین کی راہنمائی کے ممکن نہیں۔ اس وقت بندہ کہتا ہے "اِھْدِنَا

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' مگراس کے لئے بھی کوئی ایسا رفیق ومحافظ، مددگاراور رہنما سفر ضروری ہے جوسفر میں مہارت اور تجربہ رکھتا ہو ورنہ راستہ میں بھٹک جانے کا قوی اندیشہ ہے اس لئے کہا''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ''یعنی اس طویل سفر میں ان کو ہم سفر بنا جن پر تیرا انعام ہوا ہے اور وہ جن پر انعام ہوا وہ حضرات انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کی مقدس جماعتیں ہیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اس راستہ کے مرشد وراہنما ہیں، صدیقین اس سفر کے نگراں محافظ ہیں اور حضرات شہداء وصالحین رفقاء سفر ہیں۔ اور جب بندہ کہتا ہے''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ'' تو بندہ حجاب ناریہ یعنی عالم دنیا اور حجاب نوریہ یعنی عالم ارواح سے رب تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہے یعنی دنیاوی واخروی موانع سے پناہ طلب کرتا ہے۔

فصل نہم:

اس سورہ مبارکہ میں دو کلمے ہیں جو اسم جلالت اللہ کی طرف مضاف ہیں اور دو کلمے غیر اللہ کی طرف مضاف ہیں۔ جو دو کلمے اسم الٰہی اللہ کی طرف مضاف ہیں ان میں ایک بسم اللہ ہے اور دوسرا کلمہ الحمد للہ ہے۔ ارشاد''بِسْمِ اللّٰهِ'' بدایت امور کے لئے ہے۔ جب کہ ارشاد''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ''خواتیم امور کے لئے ہے کہ بسم اللہ ذکر ہے اور الحمد للہ شکر ہے۔ پس جب کوئی بسم اللہ پڑھتا ہے تو رب تعالیٰ کے فضل سے ایک رحمت کا مستحق ہوتا ہے اور پھر جب الحمد للہ پڑھتا ہے تو دوسری رحمت کا حقدار ہو جاتا ہے۔ وہ اس طور پر کہ کلمہ بسم اللہ پڑھنے کے سبب اسم رحمن کی برکت سے رحمت کا مستحق ہوا، اور الحمد للہ کہنے کے سبب، اسم رحیم کے فیضان سے دوسری رحمت کا مستحق ہوا۔ اسی وجہ سے رحمن ورحیم کی تفسیر میں کہا گیا یا رحمن الدنیا ورحیم الآخرۃ، رہا ارشاد''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ''تو اس میں ربوبیت مخلوق کی ابتداء حال کی طرف نظر کرتے ہوئے ہے اس دلیل سے جو ارشاد''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ''میں مذکور ہے (الاعراف:172) صفت ربوبیت کے بعد صفت رحمن، ان کے درمیانی اور وسط حال کے لحاظ سے ارشاد ہے اور صفت ملک، ان کے آخری حالات یعنی احوال اخرویہ کے اعتبار سے ہے چنانچہ ملک قہار کا ارشاد ہے۔''لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ آج کس کی بادشاہت ہے؟ فقط اللہ واحد قہار کی۔ (سورہ غافر: ۱۶) واللہ تعالیٰ اعلم بمعانی کلامہ واسرارہ وھو الھادی الی الرشاد والصواب''۔

فصل دہم: احکام سورہ فاتحہ کے بیان میں۔

- نماز میں پوری سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے یعنی اس کی ساتوں آیتیں کہ ہر ایک آیت مستقل واجب ہے۔

ان میں ایک آیت بلکہ ایک لفظ کا ترک بھی، ترک واجب ہے۔

- پنج وقتہ نمازوں میں ہر فرض کی پہلی دو رکعتوں میں اور وتر و نفل اور سنتوں کی ہر رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔
- الحمد للہ کو ہر رکعت میں سورہ سے یا تین آیات یا ایک بڑی آیت جو مساوی تین آیات کے ہو، کے پہلے پڑھنا واجب ہے اس لئے سورہ فاتحہ اور ایک دوسری چھوٹی سورت یا اس کے مثل تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت کا حفظ واجب عین ہے۔
- الحمد للہ کو سورہ سے پہلے ایک ہی بار پڑھنا واجب ہے۔
- الحمد للہ اور سورہ کے درمیان کسی اجنبی کا فاصل نہ ہونا رہے آمین تو وہ تابع الحمد ہے اور بسم اللہ تابع سورہ ہے اس لئے یہ فاصل اجنبی نہیں۔
- کوئی سورہ پہلے پڑھ لی اس کے بعد الحمد للہ پڑھا، یا الحمد اور سورت کے درمیان دیر تک، تین بار سبحان اللہ کہنے کی مقدار تک چپ رہا تو سجدہ سہو واجب ہوگا۔
- الحمد للہ کا ہر لفظ پڑھنا واجب ہے ایک لفظ بھی قرأت کرنے سے چھوٹ گیا تو سجدہ سہو واجب ہوگا۔
- کسی کو چھینک آئی اس کے جواب میں نمازی نے یرحمک اللہ کہا، نماز فاسد ہوگئی اور خود اسی کو چھینک آئی اور اپنے کو مخاطب کر کے یرحمک اللہ کہا تو نماز فاسد نہ ہوئی اور کسی اور کو چھینک آئی اس مصلی نے الحمد للہ کہا نماز نہ گئی اور جواب کی نیت سے کہا تو جاتی رہی۔
- نماز میں چھینک آئے تو سکوت کرے اور الحمد للہ کہہ لیا تو بھی نماز میں حرج نہیں اور اگر اس وقت حمد نہ کی تو فارغ ہو کر کہے۔
- خوشی کی خبر سن کر جواب میں الحمد للہ کہا نماز فاسد ہوگئی اور اگر جواب کی نیت سے نہ کہا بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ نماز میں ہے تو فاسد نہ ہوئی۔
- کسی نے آنے کی اجازت چاہی اس نے یہ ظاہر کرنے کو کہ نماز میں ہے زور سے الحمد للہ یا اللہ اکبر، یا سبحان اللہ پڑھا نماز فاسد نہ ہوئی۔
- فرض کی پہلی دو رکعتوں میں اور نفل و وتر کی کسی رکعت میں سورہ الحمد کی ایک آیت بھی رہ گئی یا سورت سے پیشتر دو

بار الحمد پڑھی یا سورت ملانا بھول گیا، یا سورہ کو فاتحہ پر مقدم کیا یا الحمد کے بعد صرف ایک یا دو چھوٹی آیتیں پڑھ کر رکوع میں چلا گیا پھر یاد آیا اور لوٹا اور تین آیتیں پڑھ کر رکوع کیا تو ان سب صورتوں میں سجدہ سہو واجب ہے۔

● الحمد کے بعد سورت پڑھی، اس کے بعد پھر الحمد پڑھی تو سجدہ سہو واجب نہیں، یونہی فرض کی پچھلی رکعتوں میں فاتحہ کی تکرار سے مطلقاً سجدہ سہو واجب نہیں اور اگر پہلی رکعتوں میں الحمد کا زیادہ حصہ پڑھ لیا تھا پھر اعادہ کیا تو سجدہ سہو واجب ہے۔

● الحمد للہ پڑھنا بھول گیا اور سورت شروع کر دی اور بقدر ایک آیت کے پڑھ لی اب یاد آیا تو الحمد پڑھ کر سورت پڑھے اور سجدہ سہو واجب ہے۔ یونہی اگر سورہ کے پڑھنے کے بعد یا رکوع میں یا رکوع سے کھڑے ہونے کے بعد یاد آیا تو پھر الحمد للہ پڑھ کر سورت پڑھے اور رکوع کا اعادہ کرے اور سجدہ سہو کرے۔

● فرض کی پچھلی رکعتوں میں سورہ ملائی تو سجدۂ سہو نہیں اور قصداً ملائی جب بھی حرج نہیں مگر امام کو نہ چاہئے، یونہی اگر پچھلی میں الحمد نہ پڑھی جب بھی سجدہ سہو نہیں اور رکوع و سجود و قعدہ میں قرآن پڑھا تو سجدہ سہو واجب ہے۔

● جو فعل نماز میں مکرر ہیں ان میں ترتیب واجب ہے لہذا خلاف ترتیب فعل واقع ہو تو سجدہ سہو کرے۔ مثلاً قرأت سے پہلے رکوع کر دیا اور رکوع کے بعد قرأت نہ کی تو نماز فاسد ہو گئی کہ فرض ترک ہو گیا اور اگر رکوع کے بعد قرأت تو کی مگر پھر رکوع نہ کیا تو فاسد ہو گئی کہ قرأت کی وجہ سے رکوع جاتا رہا اور اگر بقدر فرض قرأت کر کے رکوع کیا مگر واجب قرأت ادا نہ ہوا مثلاً الحمد نہ پڑھی یا سورہ نہ ملائی تو حکم یہی ہے کہ لوٹے اور الحمد و سورت پڑھ کر رکوع کرے اور سجدہ سہو کرے اور اگر دوبارہ رکوع نہ کیا تو نماز جاتی رہی کہ پہلا رکوع جاتا رہا تھا۔

● پہلی دو رکعتوں کے قیام میں الحمد کے بعد تشہد پڑھا، سجدہ سہو واجب ہے اور الحمد سے پہلے پڑھا تو نہیں۔

● تشہد کی جگہ الحمد پڑھی، سجدہ سہو واجب ہے۔

● مسبوق نے جب امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی شروع کی تو حق قرأت میں یہ رکعت اول قرار دی جائے گی اور حق تشہد میں پہلی نہیں بلکہ دوسری تیسری چوتھی جو شمار میں آئے مثلاً تین یا چار رکعت والی نماز میں ایک اسے ملی تو حق تشہد میں یہ جو، اب پڑھتا ہے دوسری ہے لہٰذا ایک رکعت فاتحہ و سورت کے ساتھ پڑھ کر قعدہ کرے اور اگر واجب یعنی فاتحہ یا سورت ملانا ترک کیا تو اگر عمداً ہے اعادہ واجب ہے اور سہواً ہو تو سجدۂ سہو، پھر اس کے بعد والی میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملائے اور اس میں نہ بیٹھے، پھر اس کے بعد والی میں فاتحہ پڑھ کر رکوع کر دے دو ملی ہیں دو جاتی رہیں تو ان دونوں میں قرأت

کرے، ایک میں بھی فرض قرأت ترک کیا نماز نہ ہوئی۔

● لاحق مسبوق کا حکم یہ ہے کہ جن رکعتوں میں لاحق ہے ان کو امام کی ترتیب سے پڑھے اور ان میں لاحق کے احکام جاری ہوں گے، ان کے بعد امام کے فارغ ہونے کے بعد جن میں مسبوق ہے، وہ پڑھے اور ان میں مسبوق کے احکام جاری ہوں گے، مثلاً چار رکعت والی نماز کی دوسری رکعت میں ملا پھر دو رکعتوں میں سوتا رہ گیا تو پہلے یہ رکعتیں جن میں سوتا رہا بغیر قرأت ادا کرے، صرف اتنی دیر خاموش کھڑا رہے جتنی دیر سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ پھر امام کے ساتھ جو کچھ مل جائے اس میں متابعت کرے، پھر وہ فوت شدہ مع قرأت پڑھے۔

● اداوقضا دونوں میں مقیم مسافر کی اقتداء کرسکتا ہے اور امام کے سلام کے بعد اپنی باقی دو رکعتیں پڑھ لے اور ان رکعتوں میں قرأت بالکل نہ کرے بلکہ بقدر فاتحہ چپ کھڑا رہے۔

نماز خوف میں چونکہ سورہ فاتحہ وسورہ کی قرأت کرنے نہ کرنے کا مسئلہ پیچیدہ ہے اس لئے ذیل میں نماز خوف کا طریقہ مذکور ہے۔

● نماز خوف کا طریقہ یہ ہے کہ جب دشمن سامنے ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ سب ایک ساتھ نماز پڑھیں گے تو دشمن حملہ کردیں گے ایسے وقت امام جماعت کے دو حصے کرے ایک گروہ کو دشمن کے مقابل کرے اور دوسرا امام کے پیچھے نماز پڑھے جب امام اس گروہ کے ساتھ ایک رکعت پڑھ چکے یعنی پہلی رکعت کے دوسرے سجدے سے سر اٹھائے تو یہ لوگ دشمن کے مقابل چلے جائیں اور جو لوگ دشمن کے مقابل تھے وہ امام کے پیچھے چلے آئیں اب ان کے ساتھ امام ایک رکعت پڑھے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے مگر مقتدی سلام نہ پھیریں بلکہ یہ لوگ دشمن کے مقابل چلے جائیں اور وہ لوگ آئیں اور ایک رکعت بغیر قرأت پڑھ کر تشہد کے بعد سلام پھیریں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ گروہ یہاں نہ آئے بلکہ وہیں اپنی نماز پوری کرلے اور دوسرا گروہ اگر نماز پوری کرچکا ہے فبہا ورنہ اب پوری کرے خواہ وہیں یا یہاں آکر اور یہ لوگ قرأت کے ساتھ اپنی ایک رکعت پڑھیں اور تشہد کے بعد سلام پھیریں۔ یہ طریقہ دو رکعت والی نماز کا ہے۔ اور چار رکعت والی نماز ہو تو ہر گروہ کے ساتھ امام دو

دو رکعت پڑھے اور مغرب میں پہلے گروہ کے ساتھ دو اور دوسرے گروہ کے ساتھ ایک پڑھے۔ اگر پہلے کے ساتھ ایک پڑھی اور دوسرے کے ساتھ دو تو نماز جاتی رہی۔ یہ سب احکام اس صورت میں ہیں جب امام ومقتدی سب مقیم ہوں یا سب مسافر یا امام مقیم ہے اور مقتدی مسافر، اور اگر امام مسافر ہو اور مقتدی مقیم تو امام ایک گروہ کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور

دوسرے کے ساتھ ایک پڑھ کر سلام پھیر دے پھر پہلا گروہ آئے اور تین رکعتیں بغیر قرأت کے پڑھے پھر دوسرا گروہ آئے اور تین پڑھے پہلی میں فاتحہ وسورت پڑھے۔اور اگر امام مسافر ہے اور مقتدی بعض مقیم ہیں بعض مسافر،تو مقیم مقیم کے طریقہ پر عمل کریں اور مسافر مسافر کے طریقہ پر عمل کریں۔

آمین کا بیان

تفسیر قرطبی میں ہے۔قاری قرآن کے لئے،سورہ فاتحہ کی تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد وَ لَا الضَّآلِّیْنَ'' کے نون پر سکتہ کرنے کے بعد آمین کہنا مسنون ہے تا کہ قرآن، غیر قرآن سے ممتاز ہوجائے۔اکثر اہل علم کے نزدیک ''آمین'' کا معنی ''اللھم استجب لنا'' یعنی اے اللہ ہماری دعاء قبول فرما، ہے جیسا کہ بیضاوی کے حوالہ سے آئے گا۔کچھ لوگوں نے کہا کہ آمین اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے یہ قول جعفر بن محمد،مجاہد اور ہلال بن یساف سے مروی ہے۔جوہری نے کہا کہ آمین کا معنی ''کذالک فلیکن'' ہے یعنی ایسا ہی ہوجائے۔کلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''آمین'' کا معنی دریافت کیا تو حضور نے فرمایا ''رب افعل'' اسی کو بیضاوی نے بیان کیا ہے۔مقاتل نے کہا ''ھو قوۃ للدعاء و استنزال للبرکۃ'' یعنی آمین سے دعا میں قوت پیدا ہوتی ہے اور نزول برکات کا ذریعہ ہے۔ترمذی نے کہا کہ اس کا معنی ہے ''لاتخیب رجاءنا'' اے اللہ ہماری امیدوں کو نامراد نہ کر۔

تفسیر بیضاوی کے الفاظ یہ ہیں۔'' اٰمین اسم الفعل الذی ھو استجب وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن معناہ فقال افعل '' یعنی آمین اسم فعل استجب کے معنی میں ہے۔چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا معنی پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا ''افعل'' یعنی،''افعل فعل الاستجابۃ''۔

اور اسم فعل مبنی ہوتا ہے جیسا کہ معلوم ہے اور مبنی میں سکون اصل ہے مگر آمین کے نون کو سکون کی بجائے مبنی علی الفتح پڑھتے ہیں تا کہ التقاء ساکنین لازم نہ آئے جیسے این وغیرہ ہے۔لفظ آمین کے ہمزہ (الف) کو بعض حضرات نے ممدودہ

کہا ہے اور بعض نے مقصورہ قرار دیا ہے۔ مگر دونوں صورت میں وزن فعیل ہی رہے گا۔ البتہ ممدودہ کی صورت میں الف اشباع کا ہوگا۔ ممدودہ ہونے کی صورت میں محل استشہاد مجنون ابن لوح کا یہ شعر ہے۔

ویر حم اللہ عبدا قال آمینا

اس مصرع میں آمین ممدود استعمال ہوا ہے اور آخر کا الف اشباع کا ہے اور مقصورہ کی صورت میں محل استشہاد یہ مصرع ہے۔

اٰمین فزاداللہ ما بیننا بعدا

اس مصرع میں آمین بالف مقصور آیا ہے۔ یہاں یہ یاد رہے "آمین" بالاتفاق قرآن حکیم کا جز نہیں ہے کیونکہ صحابہ وتابعین سے اس کی جزئیت قرآن کی روایت منقول نہیں ہے۔ اور نہ ہی مصحف عثمانی میں مرقوم ہے اور جو سورہ فاتحہ کے آخر میں اسے لکھا دیکھتے ہیں وہ بعد کی بدعت ہے ہاں البتہ سورہ فاتحہ شریف کے ختم پر آمین کہنا مسنون ہے حضور سرور عالم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "علمنی جبرئیل آمین عند فراغی من قرأۃ الفاتحۃ وقال انہ کالختم علی الکتاب" یعنی مجھ کو جبرئیل امین نے سورہ فاتحہ کی قرأت سے فراغت کے بعد لفظ آمین کہنے کی تعلیم فرمائی پس انہوں نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنے کی حیثیت وہی ہے جو خط کی تحریر کے بعد مہر کی ہوتی ہے۔

یعنی مہر لگا دینے سے جس طرح خط، شر وفساد اور خیانت سے محفوظ ہوجاتا ہے اسی طرح آمین کہہ دینے کی وجہ سے سورہ فاتحہ جو ایک دعاء ہے کے انوار وبرکات اور مضامین ومعانی برباد ہونے سے محفوظ ہوجاتے ہیں۔ اور پھر چونکہ یہ دعاء ہے اور دعاء کا فساد یہ ہے کہ قبول نہ ہو رد ہوجائے لیکن امین کہہ لینے سے رد وفساد کا خدشہ ختم ہوجاتا ہے اور دعاء درجہ قبولیت پر پہنچ جاتی ہے۔ اسی معنی میں مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے آپ نے فرمایا۔ "آمین خاتم رب العٰلمین ختم بہ دعاء عبدہ" یعنی آمین رب العلمین کی مہر ہے جس کو لگا کر اللہ رب العلمین نے اپنے بندہ کی دعا کو مہر بند کر دیا۔

اقوال ائمہ در بارۂ آمین

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ منفرد کے لئے آمین کہنا مسنون ہے دلیل وہ روایت ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو صحیحین میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نماز کے اندر آمین کہتا ہے اس وقت آسمان کے فرشتے بھی آمین کہتے ہیں پس اگر ایک دوسرے کی آمین موافق ہوجاتی ہے تو اس کہنے

والے کے تمام صغائر گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔اس حدیث میں لفظ ''احد کم'' ارشاد ہے۔جومنفرد، امام مقتدی سب کو شامل ہے لیکن باجماعت نماز میں امام ومقتدی دونوں کے لئے آمین کہنا مسنون ہے یا ان میں سے کسی ایک کے لئے ہے اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔حضرت امام مالک کا فرمان یہ ہے کہ صرف مقتدیوں کے لئے آمین مسنون ہے امام کے لئے نہیں۔

المدونہ میں ہے۔ ''**قال مالک ویخفی من خلف الامام امین ولا یقول الامام آمین ولا باس للرجل اذا صلی وحدہ أن یقول آمین**''۔یعنی امام کے پیچھے والے آہستہ آمین کہیں اور امام آمین نہ کہے اور منفرد کے لئے آمین کہنے میں حرج نہیں۔

حضرت امام مالک کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد''اذا قال الامام ولا الضالین قولوا آمین، فان الملائکۃ تقول آمین فمن وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفر لہ ماتقدم من ذنبہ'' یعنی جب امام ولا الضالین کہے تو اے مقتدیو! تم آمین کہو اس لئے کہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگی اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔اس حدیث سے ظاہر ہے کہ آمین صرف مقتدی کہیں گے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام ومقتدی دونوں کے درمیان دو کام تقسیم فرما دیئے ہیں امام کے لئے ولا الضالین کہنا اور مقتدیوں کو آمین کہنا اس لئے امام کو آمین کہنا مسنون نہ ہوگا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مشہور ومعروف قول کے مطابق، امام ومقتدی دونوں کے لئے آمین مسنون ہے۔چنانچہ ان کی مشہور زمانہ کتاب کتاب الام میں ہے۔ ''**فاذا فرغ الامام من قرأۃ ام القرآن قال آمین ورفع بھا صوتہ لیقتدی بہ من کان خلفہ فاذا قالھا قالوا واسمعوا انفسھم ولا احب ان یجھروا بھا فان فعلوا فلا شئ علیھم وان ترکھا الامام قالھا من خلفہ واسمعہ لعلہ یذکر فیقولھا ولا یترکونھا لترکہ کما لو ترک التکبیر والتسلیم لم یکن لھم ترکہ فان لم یقل ولا من خلفہ فلا اعادۃ علیھم ولا سجود للسھو**''

یعنی سورہ فاتحہ کی قرأت سے فراغت کے بعد امام بآواز بلند آمین کہے تاکہ ان کے مقتدی ان کی اقتداء کریں پس جب امام آمین کہے تو مقتدی بھی آمین کہیں اور اتنی آواز میں کہیں کہ وہ خود سن سکیں کہ میں بلند آواز سے آمین کہنے کو پسند نہیں کرتا اگر مقتدیوں نے بلند آواز سے آمین کہا تو کوئی حرج وگناہ نہیں ہاں اگر امام آمین نہ کہے تو مقتدی زور سے آمین کہیں تاکہ امام کو یاد آجائے پس وہ آمین کہہ لے۔امام کے چھوڑنے کی وجہ سے مقتدی نہ چھوڑے جیسے کہ امام کے تکبیر و

تسلیم چھوڑنے کی وجہ سے مقتدی کو چھوڑنا جائز نہیں اور اگر امام اور پیچھے والے مقتدی میں سے کسی نے آمین نہیں کہا تو ان پر نماز کا نہ اعادہ لازم ہے اور نہ ہی سجدہ سہو واجب ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا اس بارے میں موقف یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام ومقتدی دونوں بلند آواز سے آمین کہیں گے اور سری نمازوں میں آہستہ کہیں چنانچہ مشہور حنبلی عالم دین ابن قدامہ فرماتے ہیں "**ویسن ان یجھر بہ الامام والماموم فیما یجھر بہ القرأۃ واخفائھا فیما یخفی فیہ**"

امام الائمہ سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا مذہب یہ کہ نمازی امام ہو یا مقتدی یا منفرد ہر ایک کے لئے آہستہ آمین کہنا مسنون ہے۔ عام کتب حنفیہ واللفظ للبدائع۔ "**فاذا فرغ من الفاتحۃ یقول آمین اماماً کان او مقتدیا او منفردا و ھذا قول عامۃ العلماء**" اسی میں ہے۔ "**ثم السنۃ فیہ المخافتۃ عندنا**" یعنی نمازی جب فاتحہ سے فارغ ہو جائے تو آمین کہے امام ہو خواہ مقتدی یا منفرد ہو یہی عام علماے حنفیہ کا قول ہے پھر ہمارے نزدیک آہستہ آمین کہنا سنت ہے۔

ہدایہ میں ہے۔ (**واذا قال الامام ولا الضالین قال آمین ویقولھا الموتم**)

لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام "**اذا امن الامام فأمنوا**" **ولا متمسک لما لک رحمہ اللہ فی قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اذا قال الامام ولا الضالین فقولوا آمین**" **من حیث القسمۃ لانہ قال فی آخرہ فان الامام یقولھا قال (ویخفونھا) لما رویناہ من حدیث ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ولانہ دعاء فیکون مبناہ علی الاخفاء والمد والقصر فیہ وجھان، والتشدید فیہ خطاء فاحش**" یعنی، اور جب امام "**ولا الضالین**" کہے تو آمین کہے اور مقتدی بھی آمین کہیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد گرامی کہ "جب امام "**ولا الضالین**" کہے تو تم آمین کہو" میں حضرت امام مالک کی (امام ومقتدی کے درمیان) تقسیم والی دلیل نہیں بن سکتی کہ حدیث کے آخر میں ہے کہ بیشک امام اسے کہتے ہیں۔ اور سب آمین آہستہ کہیں گے جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس لئے بھی کہ وہ دعاء ہے اور دعاء کی بنیاد اخفاء پر ہے اور آمین میں مد اور قصر دونوں وجہ جائز ہے لیکن تشدید کے ساتھ پڑھنا فحش غلطی ہے۔

ائمہ اربعہ کے مذکورہ بیانات سے ظاہر ہے کہ حضرت امام مالک کے سوا تینوں ائمہ کے نزدیک امام ومقتدی دونوں کے لئے آمین کہنا مسنون ہے۔ ائمہ ثلاثہ کا مستدل وہ حدیث پاک ہے جس کو خود حضرت امام مالک نے اور ایک جماعت

محدثین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''اذا امن الامام فامنوا'' یعنی جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ اس حدیث میں امام ومقتدی دونوں کے لئے آمین کہنے کی صراحت ہے۔ اور جس حدیث میں یہ ہے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو تم بھی آمین کہو، اس حدیث کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے۔ ''فان الامام یقولہ'' اس لئے یہ نظریہ کہ امام کے لئے آمین کہنا مسنون نہیں ہے، محل نظر ہے۔

اہم اختلاف: اس باب میں یہ اختلاف بہت ہی اہم ہے کہ آمین بالسر مسنون ہے یا آمین بالجہر مسنون ہے۔ ائمہ اسلام کے ذکر کردہ نظریہ سے ظاہر ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور حضرت امام مالک اور مشہور ومعروف روایت کے مطابق حضرت امام شافعی علیہم الرحمۃ کے پسندیدہ قول کے مطابق آمین بالسر ہی مسنون ہے۔ ہاں امام احمد کے نظریہ کے مطابق آمین بالجہر مسنون ہے۔ واضح رہے کہ ائمہ کا یہ اختلاف صرف مسنون ہونے بلکہ استحباب میں ہے اور استحباب کا واضح مطلب ہے کہ جہر وسر کیوجہ سے نماز میں کوئی فساد ونقص لازم نہیں آتا اس لئے اہل سر، قائلین جہر کی یا اہل جہر، قائلین سر کی تفسیق نہیں کرتے بلکہ تارک سنت تک نہیں کہتے مگر برا ہو غیر مقلدین وہابیہ زمانہ کا کہ انہوں نے مسئلہ آمین کو بھی فرض قطعی بلکہ عقیدہ توحید کی طرح قطعی سمجھ کر آسمان پر اٹھالیا اور چند ظاہری حدیث کی بنیاد پر آمین بالسر کے قائلین ائمہ اسلام پر زبان لعن وطعن دراز کرنے سے بھی باز نہ آئے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ جہر وسر کا یہ اختلاف صرف سنیت واستحباب میں ہے۔ اور یہ اختلاف اس لئے ہوا کہ احادیث مبارکہ سے جہر وسر دونوں کی تائید ہوتی ہے پس جن کے نزدیک آمین بالسر کی حدیثیں اسناد ومتون دونوں حیثیتوں سے زیادہ قوی تھیں انہوں نے ان احادیث کو اپنا مستدل بنا کر آمین بالسر کا نظریہ پیش کیا اور جن کے نزدیک آمین بالجہر کی روایتیں زیادہ معتبر تھیں انہوں نے ان کو اپنا مستدل بنا کر آمین بالجہر کا نظریہ پیش کیا اس میں آج کے آمین بالجہر کے عاملین غیر مقلدین کو قطعا پڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں اتنا تو ضرور خیال کرنا چاہئے کہ آمین بالسر کے قائلین کوئی معمولی درجہ کے لوگ نہیں ہیں بلکہ یہ نظریہ بہت سارے صحابہ تابعین، ائمہ مجتہدین، فقہا ومحدثین کا ہے جن کی بارگاہ میں ائمہ قائلین بالجہر دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہم ذیل میں چند احادیث مبارکہ درج کرتے ہیں جن سے آمین بالسر کا ثبوت آفتاب نصف النہار سے زیادہ روشن ہے۔

حدیث نمبر۔ ۱ تا ۸: بخاری، مسلم، احمد، مالک، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا امن الامام فامنوا فانہ من وافق تامینہ تامین الملئکۃ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام آمین کہے تو تم

بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگی اس کے گذشتہ گناہوں کی بخشش ہوجائے گی۔اس حدیث کے مفہوم سے ظاہر ہے کہ جس نمازی کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگی اس کے گناہ کی بخشش ہوگی اور یہ متفق علیہ ہے کہ فرشتوں کی آمین آہستہ ہوتی ہے۔لہذا جو آمین آہستہ کہتے ہیں انہیں کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوئی اور وہی قابل بخشش ہوئے لیکن جو زور سے آمین کہتے ہیں ان کا عمل فرشتوں کے عمل کے مخالف ہوا پس وہ اس بشارت کے مستحق نہ ہوسکیں گے اس سے ان لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہئے جو چیخ چیخ کر آمین کہنا عبادت تصور کرتے ہیں۔تفسیر قرطبی میں ہے۔حدیث کی امہات الکتب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "اذاامن الامام فامنوا فانه من وافق تامينه تامين الملائكة غفرله ماتقدم من ذنبه" اس حدیث کی روشنی میں ہمارے علمانے فرمایا ہے کہ ذنب وگناہ کی مغفرت چار مقدمات پر مرتب ہے۔

(۱)امام کا آمین کہنا۔ (۲) امام کے پیچھے والوں کا آمین کہنا۔
(۳)فرشتوں کا آمین کہنا۔ (۴)ملائکہ کی آمین کے موافق ہونا۔

اب پھر موافقت کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ ملائکہ کی آمین سے موافقت کس چیز میں ضروری ہے تو بعض نے کہا کہ اجابت میں موافقت مراد ہے۔کسی نے کہا زمانہ میں موافقت مراد ہے اور کسی نے کہا صفت یعنی اخلاص دعاء میں موافقت مراد ہے۔حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ادعوا الله وانتم موقنون بالاجابة واعلموا أن الله لا يستجيب دعاء من قلب غافل لاه"۔یعنی تم اللہ تعالیٰ سے دعاء کرو تو دعاء کی قبولیت کا یقین رکھو،جان لو کہ اللہ غافل لاپرواہ کی دعاء قبول نہیں فرماتا ہے۔

حدیث نمبر۔ ۹ /تا ۱۳ : اسی معنی کی دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے۔جن کو بخاری،نسائی،ابوداؤد،مالک وشافعی نے روایت کیا ہے "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قال الامام غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ فقولوا آمين فانه من وافق تامينه قول الملٰئكة غفرله ما تقدم من ذنبه" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام " غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ " کہے تو تم آمین کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہوگا اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

حدیث نمبر۔ ۱۴ رتا ۱۸ : امام احمد، ابوداؤد طیالسی، ابویعلی، موصلی طبرانی، دارقطنی، اور حاکم نے مستدرک میں حضرت وائل بن حجر سے روایت کی اور حاکم نے فرمایا کہ اس کی اسناد نہایت صحیح ہے۔ "عن وائل بن حجر انه صلی مع النبی صلی الله علیه وسلم فلما بلغ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ قال آمین واخفیٰ بها صوته" یعنی حضرت وائل بن حجر سے مروی ہے کہ بیشک انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ" پر پہنچے تو آپ نے آمین فرمایا اور آمین میں آواز آہستہ تھی۔

حدیث نمبر۔ ۱۹ رتا ۲۱ : ابوداؤد، ترمذی، ابن ابی شیبہ نے حضرت وائل بن حجر سے بایں الفاظ روایت کی "قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم قرأ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ فقال آمین وخفض به صوته" میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے کہ آپ نے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ" پڑھا تو آمین کہا اور اس میں آواز آہستہ رکھی۔

حدیث نمبر۔ ۲۲ رتا ۲۳ : طبرانی نے تہذیب الآثار میں اور امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں حضرت وائل بن حجر سے روایت کیا "قال لم یکن عمر و علی رضی الله عنهما یجهر ان بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ولا بآمین" یعنی حضرت عمر و علی رضی اللہ عنہما نہ تو بسم اللہ الرحمن الرحیم بآواز بلند پڑھتے اور نہ آمین۔

حدیث نمبر۔ ۲۴ : عینی شارح ہدایہ نے حضرت ابو معمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا "عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه قال یخفی الامام اربعاً التعوذ و بسم الله و آمین وربنا لک الحمد" یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کہ امام چار چیزیں آہستہ کہے۔ اعوذ باللہ، بسم اللہ، آمین، اور ربنا لک الحمد۔

حدیث نمبر۔ ۲۵ : امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حماد سے انہوں نے حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا "قال اربع یخفیهن الامام التعوذ وبسم الله، وسبحانک اللهم و آمین رواه محمد فی الآثار، وعبد الرزاق فی مصنفه" یعنی آپ نے فرمایا کہ امام چار چیزیں آہستہ کہے "اعوذ باللہ، بسم اللہ، سبحانک اللہم" اور آمین اس کو امام محمد نے آثار میں اور عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں بیان فرمایا ہے۔

مندرجہ بالا احادیث و آثار سے بہت واضح اور روشن ہے کہ آمین آہستہ کہنا نہ یہ کہ حضرات صحابہ و تابعین کا معمول

ہے بلکہ خلفاے راشدین بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی معمول یہی تھا۔ رہیں بعض وہ روایتیں جن سے بآواز بلند آمین کہنے کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔ ہم ان روایتوں کے منکر نہیں یقیناً بعض روایتوں میں ہے "قال اٰمین و رفع بھا صوتہ" یعنی سرکار نے آمین کہا اور اپنی آواز کو بلند فرمایا ایک روایت میں "قال آمین و مدبھا صوتہ" یعنی آمین کہا اور اپنی آواز کو کھینچا۔ ابن ماجہ میں ہے "قال آمین حتی یسمعھا اھل الصف الاول فیرتج بھا المسجد" یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم آمین فرماتے تو پہلی صف والے سن لیتے پس مسجد گونج اٹھتی۔ صحیح البخاری میں ہے "وقال عطاء آمین دعاء امن ابن الزبیر ومن وراءہ حتی أن للمسجد للجۃ" یعنی حضرت عطا کا کہنا ہے کہ آمین دعا ہے ابن زبیر اور ان کے پیچھے والوں نے آمین کہی یہاں تک کہ مسجد میں گونج پیدا ہوگئی۔ مگر یہ روایتیں یا تو ضعیف ہیں یا مؤول ہیں یا منسوخ ہیں ورنہ احادیث بالسر اور روایت بالجھر کے درمیان زبردست تضاد لازم آئے گا۔ ہم آمین بالجھر والی ہی مرویات کو مؤول و منسوخ اس لئے مانتے ہیں کہ آمین بالسر کی روایتوں کو قرآن حکیم، اور عقل و قیاس سے تائید و تقویت حاصل ہے۔

اول: یہ کہ آمین دعا ہے اور دعا کے آداب میں سے تضرع و خفیہ یعنی گڑگڑانا اور آہستہ کہنا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ہے "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ" (الاعراف: ۵۵) یعنی اپنے رب کو گڑگڑا کر اور آہستہ پکارو بیشک وہ حد سے بڑھنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا۔ ایک مقام پر اس طرح ارشاد ہے "وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ" (ایضا: ۲۰۵) یعنی اپنے رب کو گڑگڑا کر اور خوف سے یاد کرو صبح و شام نہ کہ زور سے اور غافلوں میں سے مت بنو۔ قرآن کریم کی دونوں متلوہ آیتوں سے معلوم ہوا کہ دعاء آہستہ افضل ہے اور آمین بالاتفاق دعاء ہے بیضاوی کے حوالہ سے گذرا کہ آمین استجب یعنی قبول کرنے کے معنی میں ہے لہٰذا آمین بھی آہستہ کہنا افضل ہوگا کہ روایات سریہ سے بھی اسی کا ثبوت ہوتا ہے۔

دوم: آمین سورہ فاتحہ کا جز ہے نہ قرآن حکیم کا لہٰذا تعوذ و تسمیہ و ثنا وغیرہ سنن و مستحبات کی طرح اس کا پڑھنا مسنون ہوگا۔ اور جن چیزوں کا پڑھنا نماز میں مسنون ہے وہ سب سوائے تکبیرات انتقال و تسمیع کے آہستہ ہی مسنون ہے۔ لہٰذا آمین بھی آہستہ ہی مسنون ہوگا۔

سوم: قطع نظر مرویات سے نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے کہ اگر آمین بآواز بلند کہنے کا حکم ہو تو نماز میں

زبردست انتشار اور خلل پیدا ہوگا وہ اس طرح کہ بآواز بلند آمین کہنے والے غیر مقلدین کے نزدیک ہر مقتدی کے لئے نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی فرض ہے اس تقدیر پر اب ہر مقتدی پر لازم ہوگا کہ وہ اپنی سورہ فاتحہ ختم کرنے کے بعد آمین بھی کہے اور جس امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے اس کی ولا الضالین کے بعد بھی آمین کہے اس طرح ہر مقتدی پر غیر مقلدین کے نزدیک دو مرتبہ آمین کہنا مسنون ہوگا حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں پھر سینکڑوں مقتدیوں اور امام میں کوئی ضروری نہیں کہ ہر ایک کی فاتحہ بیک وقت ہی ختم ہو ظاہر ہے کہ کسی کی اول ہوگی کسی کی بعد میں ہوگی اسی طرح کسی کی امام کے ساتھ ہوگی کسی کی امام کے بعد ہوگی کسی کی امام کے پہلے ہوگی اب جیسے جیسے مقتدی فاتحہ ختم کرتا جائے وہ بر مذہب غیر مقلدین آمین بآواز بلند کہتا جائے تو ایسی صورت میں نماز میں عجیب انتشار اور خلل پیدا ہوگا۔ پھر خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا کہ امام ولا الضالین تک پڑھ لے اور متقدی ابھی درمیان قرأت فاتحہ ہی میں اٹکا ہے تو اس بیچارے غیر مقلد کے لئے بڑا پیچیدہ مسئلہ ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ وہ یا تو اپنی قرأت فاتحہ واجب کو چھوڑ کر امام کے ولا الضالین کے بعد آمین کہے تا کہ سنت کا ترک لازم نہ آئے۔ یا پھر قرأت فاتحہ میں مشغول رہے اگر قرأت میں مشغول ہوگا تو ترک آمین لازم آئے گا اور آمین کہتا ہے تو ترک فاتحہ لازم آئے گا۔ لہٰذا غیر مقلدین اس الجھن و پیچیدگی سے اگر نکلنا چاہتے ہیں تو انہیں قرأت خلف الامام اور آمین بالجہر دو میں سے کسی ایک سے بہر حال رجوع کرنا پڑے گا۔

چہارم: جن مرویات سے بآواز بلند آمین کہنے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے وہ ابتدا کا حکم تھا بطور تعلیم بآواز بلند ارشاد ہوا جب سب لوگوں کو آمین کہنے کا موقع و محل معلوم ہو گیا تو آمین بالسر کا حکم ہمیشہ کے لئے ہو گیا۔ چنانچہ حدیث حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی تصریح سے ظاہر ہے۔ ”عن ابی السکن حجر بن عنبس الثقفی قال سمعت وائل بن حجر الحضر می یقول رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین فرغ من الصلوٰۃ رأیت خدہ من ھذا الجانب و من ھذا الجانب و قرأ غیر المغضوب علیھم و لا الضالین فقال آمین یمد بھا صوتہ ما اراہ الا یعلمنا“ یعنی ابوسکن حجر بن عنبس ثقفی سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت وائل بن حجر کو فرماتے ہوئے سنا ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو ادھر سے اور ادھر سے آپ کے رخسار مبارک کو دیکھا اور آپ نے ”غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ“ پڑھا تو آواز کھینچ کر آمین کہا میرا خیال ہے کہ آپ ہمیں تعلیم دے رہے تھے۔

حضرت وائل بن حجر کی اس حدیث سے بہت ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زور سے آمین کہنا تعلیم کے لئے تھا۔

اگر یہ بھی نہ مانیں تو زیادہ سے زیادہ جواز کا حکم ہوگا ورنہ احادیث پر عمل کے دعویدار، آمین بالسر کی چھتیس روایات صحیحہ معتمدہ کو کہاں لے جائیں گے۔

احادیث فضائل آمین

آمین کہنے کی فضیلت میں بہت ساری حدیثیں بیان ہو چکی ہیں ذیل میں مزید چند احادیث مذکور ہیں:۔

حدیث نمبر۔ ۱: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''رکن یمانی پر اس وقت سے ایک فرشتہ آمین کہنے پر مقرر ہے جب کہ آسمان وزمین کی تخلیق ہوئی ہے لہذا جب تم رکن یمانی سے گذرو تو یہ دعا کرو'' ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و قنا عذاب النار ''(حلیۃ الاولیاء)۔

حدیث نمبر۔ ۲: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے تھے آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے تین خصوصیات عطا فرمائی ہیں اہل مجلس سے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ وہ خصوصیات کیا ہیں آپ نے فرمایا مجھے صفوں میں (جماعت) میں نماز پڑھنے کا حکم دیا اور تحیت یعنی السلام علیک عطا فرمائی جو جنتیوں کی تحیت ہے اور مجھے آمین عطا فرمائی، مجھ سے پہلے کسی نبی کو آمین نہیں دی گئی سوائے حضرت ہارون علیہ السلام کے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے ۔(صحیح ابن خزیمہ)۔

حدیث نمبر۔ ۳: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہود یوں کو تمہارے سلام اور آمین سے جتنا حسد ہے اتنا کسی اور چیز سے نہیں۔(سنن ابن ماجہ) اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہودیوں کو تم لوگوں کے کسی چیز سے اتنا حسد نہیں جتنا تمہاری آمین سے ہے اس لئے آمین بہت زیادہ کہا کرو۔

ہمارے علما نے فرمایا ہے کہ یہودیوں کا ہم لوگوں سے حسد کی وجہ یہ ہے کہ فاتحہ کا آغاز اللہ کی حمد وثنا سے ہے پھر اس کی عبادت اور بندہ کی غایت ذلت وخضوع کا بیان ہے پھر ہم لوگوں کے لئے صراط مستقیم پر ہدایت کی دعا کا طریقہ ہے پھر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ، آمین کے ذریعے یہودیوں کے لئے بددعا ہے۔(قرطبی)

حدیث نمبر۔ ۴: ابوداؤد میں ابو مصبح المقرائی سے مروی ہے کہتے ہیں ہم لوگ حضرت ابوزہیر نمیری کی بارگاہ

میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ صحابہ میں تھے ان کا نام یحی بن نضر تھا جیسا کہ ابن عبدالبر نے کہا وہ حدیث بیان کر رہے تھے کہ جب ہم میں سے کوئی آدمی دعا کرے تو دعا کو آمین پر ختم کرے کہ آمین صحیفہ وخط پر مہر کے مثل ہے۔ بیشک ہم لوگ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے پس ہم لوگ ایک ایسے آدمی کے پاس آئے جو رب سے سوال کرنے میں بڑا اصرار کر رہا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر سننے لگے پھر فرمایا (او جب ان ختم) قبول ہو جائے گی اگر اس نے ختم کیا، ایک شخص نے پوچھا کس چیز سے ختم کرے تو فرمایا آمین سے اگر آمین سے ختم کرے گا تو قبول ہو جائے گی، وہ شخص یہ پوچھ کر چلا گیا اور اس دعا کرنے والے آدمی کے پاس آیا اور کہا اے فلاں اپنی دعا آمین سے ختم کرو اور تمہیں بشارت ہے کہ دعا قبول ہوگی۔

حدیث نمبر۔ ۵: ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آمین جنت کا ایک درجہ ہے، آمین کہنے والا اس کے سبب جنت کا وہ درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

حدیث نمبر۔ ۶: وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ آمین میں چار حروف ہیں، اللہ تعالیٰ ہر حرف کے بدلہ ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے جو دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ آمین کہنے والے کو بخش دے۔

مسائل آمین: آمین کو تین طرح پڑھ سکتے ہیں مد کے ساتھ یعنی الف کو کھینچ کر پڑھیں اور قصر کے ساتھ یعنی الف کو دراز نہ کریں اور امالہ کے ساتھ یعنی مد کی صورت میں الف کو یا کی طرف مائل کریں۔ اگر مد کے ساتھ میم کو تشدید پڑھی یا یا کو گرا دیا تو بھی نماز ہو جائے گی مگر خلاف سنت ہے اور اگر مد کے ساتھ میم مشدد پڑھی اور یا کو حذف کر دیا یا قصر کے ساتھ تشدید یا حذف یا ہو تو ان صورتوں میں نماز فاسد ہو جائے گی۔ امام کی آواز اس کو پہنچی مگر اس کے برابر والے دوسرے مقتدی نے آمین کہی اور اس نے آمین کی آواز سن لی اگرچہ اس نے آہستہ کہی ہے تو یہ بھی آمین کہے، غرض یہ کہ امام کا ولا الضالین کہنا معلوم ہو تو آمین کہنا سنت ہو جائے گا امام کی آواز سنے یا کسی مقتدی کے آمین کہنے سے معلوم ہوا ہو۔ سری نمازوں میں امام نے آمین کہی اور یہ اس کے قریب تھا کہ امام کی آواز سن لی تو یہ بھی کہے

نماز میں چھینک آئی کسی دوسرے نے یرحمک اللہ کہا اور اس نے جواب میں کہا آمین نماز فاسد ہوگئی۔ (بہار شریعت)

★★★

★★

خاتمہ

در بیان عملیات وازالۂ شبہات

اس میں دو باب ہیں:۔

باب اول: سورہ فاتحہ کے عملیات کے بیان میں۔

حضرات صوفیائے کرام و بزرگان دین سے سورہ فاتحہ کے بہت سے ایسے عملیات منقول ہیں جن میں دین و دنیا کی بھلائی مضمر ہے۔ بہت سے عاملین حضرات ان عملیات پر عمل پیرا ہو کر دارین کی سعادتوں اور اس کے خیرات و برکات سے مالا مال ہو چکے ہیں، عوام و خواص کے استفادہ کی غرض سے خانوادۂ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ کے عظیم بزرگ شیخ المشائخ مجدد سلسلہ اشرفیہ قطب ربانی اعلیحضرت سید شاہ علی حسین اشرفی الجیلانی سجادہ نشین آستانہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ کی تصنیف لطیف ''وظائف اشرفی'' سے سورہ فاتحہ کے چند مجرب و آزمودہ عملیات ہم نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

عمل اول: جو شخص کہ اس دعاء بزرگ کو ایک مرتبہ پڑھے گا ثواب چالیس حج کا پائے گا گویا کہ چالیس حج ادا کئے اور اگر بیس بار پڑھے جلوۂ حضرت رب العالمین کو خواب میں دیکھے اور پچیس بار پڑھے تو حضرت نبی کریم علیہ السلام کو خواب میں دیکھے بوجہ برکت اس دعا کے دعا یہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ عَرْشُه ۔ تمام حمدیں اس اللہ کو جس کا عرش آسمان میں ہے۔ اور تمام
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی الْاَرْضِ قُدْرَتُهٗ۔ حمدیں اس اللہ کو جس کی قدرت زمین میں عام ہے اور تمام حمد
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی الْقِیٰمَةِ هَیْبَتُه۔ یں اس اللہ کو جس کی ہیبت قیامت میں ظاہر ہوگی اور تمام
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی الْقُبُوْرِ قَضَائُهٗ۔ حمدیں اس اللہ کو جس کا حکم قبروں میں نافذ ہے اور تمام حمدیں
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی الْجَنَّةِ رَحْمَتُهٗ۔ اس اللہ کو جس کی رحمت جنت میں زیادہ ہوگی اور تمام حمدیں
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی جَهَنَّمَ سُلْطَانُهٗ۔ اس اللہ کو جس کی حکومت جہنم میں ہے۔ اور تمام حمدیں اس
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بُرْهَانُهٗ۔ اللہ کو جس کی برہان خشکی و تری میں نمایاں ہے اور تمام حمدیں
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فِی الْهَوَاءِ رِیْحُهٗ۔ اس اللہ کو جس کا حکم ہواؤں میں جاری ہے۔ اور تمام
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَامَقَرَّ وَلَا مَلْجَأَ اِلَّا اللّٰهُ حمدیں اس اللہ کو جس سے بھاگنے اور پناہ پانے کی کوئی جگہ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ نہیں مگر اللہ ہی کی طرف اور تمام حمدیں اس اللہ کو جو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔

عمل دوم: حضرت شیخ المشائخ مرشدی وجدی مدظلہ العالی نے فرمایا کہ غریب خانہ پر مولانا مفتی عزیز الحسن صاحب بریلوی اپنے آخر زمانہ حیات میں اس غرض سے تشریف لائے کہ عمل سورہ فاتحہ اس فقیر کو عنایت فرمائیں میں اس وقت دہلی میں تھا مفتی صاحب اپنے وطن کو واپس ہوئے اتفاق سے اس زمانہ میں فقیر وہیں سے بریلی آیا مفتی صاحب نے دعوت کی اور حاضرین کو ہٹا کر تخلیہ میں اس عمل کی اجازت بخشی یہ عمل بہترین اعمال سے ہے مفتی صاحب فرماتے تھے کہ یہ عمل خاص ودیعت الٰہی ہے ہر مرض کے لئے دوا ہے سوائے موت کے فتوح غیب بھی اس سے حاصل ہوتے ہیں جلب منفعت اور سلب امراض اور انشراح صدر اور کشف انوار درویشی احوال ودفع اہوال اور دفع حزن وملال اور مصقلۂ قلب اور بہت سے فائدے اس کے متعلق ہیں یہ عمل مستغنی عن التوصیف ہے چاہئے کہ ہر ماہ ثابت کے عروج میں اول روز کو بعد طلوع صبح اس عمل کو شروع کرے اس طرح کہ جمعہ کے دن ایک سو ستاسی مرتبہ پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اول وآخر درود شریف گیارہ مرتبہ، یوم شنبہ کو اسی وقت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ایک ہزار چار سو مرتبہ پڑھے اول وآخر درود ملحوظ رکھے، یوم یکشنبہ کو اسی وقت، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ایک ہزار ایک سو گیارہ مرتبہ اول و آخر درود کے ساتھ پڑھے یوم دوشنبہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ایک ہزار گیارہ مرتبہ پڑھے اول وآخر درود شریف پڑھے، یوم سہ شنبہ کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ایک ہزار سات سو گیارہ مرتبہ اول وآخر درود شریف کے ساتھ پڑھے، یوم چہار شنبہ کو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ایک ہزار مرتبہ اول وآخر درود کے ساتھ پڑھے، یوم پنجشنبہ کو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ آمین ایک ہزار دو سو اکیس مرتبہ پڑھے اول وآخر درود شریف اس طرح ہر ماہ ثابت کے نوچندی جمعہ سے شروع کر کے عمل میں لاوے اس میں مظہر العجائب والغرائب ہے ایام قراءت عمل میں ترک جلالی اور مکروہات اور محرمات اور لزوم عزلت اور صوم اور نظافت وطہارت اور غسل اور استعمال عطر اور بخور ملحوظ رکھے شروع ماہ ثابت واسطے حصول جاہ وحشمت وترقی درجات بھادوں اگہن پھاگن، جیٹھ اور ماہ ذوحمتین برائے فلاح وتسخیر ومحبت وجذب القلوب کنوار پوس چیت اساڑھ اور ماہ منقلب برائے تخریب اعداء کاتک، ماگھ، بیساکھ، ساون ہیں۔ اس عمل کے لئے اجازت استاد ضرور ہے بغیر اجازت جو پڑھے گا بجائے فائدہ کے نقصان اٹھاوے گا۔

عمل سوم: حضرت شاہ عبدالغفور صاحب قدس سرہ سے مروی ہے یہ عمل بعد سیر عظیم اور سرگردانی بسیار حاصل ہوا یہ نسخہ سورہ فاتحہ واسطے فلاح دارین بہت مجرب ہے اور بزرگوں نے آزمایا ہے چاہئے کہ بعد عشاء شب جمعہ عروج ماہ میں دو رکعت نفل پڑھے بعد اس کے سو مرتبہ یہ درود پڑھے۔ اَلْحَمْدُ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْن۔ بعد اس کے دو ہزار مرتبہ اس درود کو پڑھے اَلْحَمْدُ صَلِّ عَلٰى بَارِكْ بَرْ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ اَجْمَعِيْن۔

پڑھے بعدۂ قبلہ رو ہوکر پانچ ہزار مرتبہ سورہ فاتحہ شریف باتسمیہ پڑھے۔اور بروح پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحضرت شاہ عبدالغفور رحمۃ اللہ علیہ کوثواب بخشے اس کے بعد جو مطلب دلی ہو بحضور رب العزت عرض کرے یہ تعویذ صبح لکھ کر پیوے واسطے دفع ہر بلا و وبا و ہر نحوست یہ عمل اکیس روز تک پڑھے اور اس مقدار میں کہ اوپر لکھا گیا اور آخر میں بھی درود پڑھا جائے گا۔

نوٹ:۔ بزرگوں سے جو کلمات منقول ہیں خواہ وہ قواعد کے موافق ہوں یا نہ ہوں انہیں میں برکت واثر ہے۔

۷۸۶ نقش یہ ہے۔

۲۸۱۸	۲۸۲۱	۲۸۲۵	۲۸۱۱
۲۸۲۴	۲۸۱۲	۲۸۱۷	۲۸۲۲
۲۸۱۳		۲۸۱۹	۲۸۱۶
۲۸۲۰	۲۸۱۵	۲۸۱۴	۲۸۲۶

عمل چہارم: فوادالفواد شریف میں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ العزیز سے یہ عمل منقول ہے کہ جب کوئی حاجت مشکل پیش آوے تو سورہ فاتحہ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی میم کو لام الحمد سے ملا کر شروع کرے اور درمیان میں الرحمن الرحیم تین مرتبہ پڑھے بعد ختم سورہ، آمین تین مرتبہ پڑھ کر دعا مانگے انشاء اللہ تعالیٰ دعا اس کی مستجاب ہوگی۔

عمل پنجم: سورہ فاتحہ وقت فجر درمیان سنت وفرض کے اکتالیس بار اس طرح پڑھے کہ میم کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے لام الحمد سے ملاوے شفاء امراض اور رفع حاجات کے لئے بہت مفید ہے اور اسی وقت بغیر میم بسم اللہ کے لام الحمد کے ملائے ہوئے پڑھے اور پڑھ کر آنکھ کے درد والے کی آنکھ میں اپنا لعاب دہن لگا دے فوراً درد جاتا رہے گا اور تھوڑے پانی پر دم کر کے مریض کو پلائے انشاء اللہ تعالیٰ شفا حاصل ہوگی اس عمل کی اجازت حضرت حافظ شاہ عبدالعزیز الملقب شاہ مقبول احمد عرف اخوند صاحب دہلوی قدس سرہ سے حاصل ہوئی۔

عمل ششم: یہ عمل کشائش رزق اور حصول دولت وغنا اور تسخیر قلوب کے لئے مفید ہے بعد نماز عشاء یا صبح اکتالیس بار یا اکیس بار اور بعد حصول مراد ہر روز برابر پڑھتا رہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ يَاوَدُوْدُ يَا وَهَّابُ اِفْتَحْ عَلَيْنَا اَبْوَابَ الرِّزْقِ وَالْفُتُوْحَاتِ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا فَاللّٰهُ خَيْرٌ الْفَاتِحِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ يَابَاسِطُ يَافَتَّاحُ يَا رَزَّاقُ يَا عَزِيْزُ عَزِّزْنِيْ بِحُصُوْلِ مُرَادِيْ وَمَطْلُوْبِيْ مِنَ الرِّفْعَةِ وَالْعِزَّةِ وَالدَّوْلَةِ وَالْاِقْبَالِ وَبِارْتِفَاعِ الْمَنْزِلَةِ وَالْحَشْمَةِ وَالشَّوْكَةِ وَالْجَلَالِ بِاَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَلْمَلِكِ الْمُتَعَالِ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ يَامُنْعِمُ يَاكَافِيْ يَا مُعْطِيْ اَعْطِنِيْ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْقِمَاشِ وَطَعَامِ الْاِقْسَامِ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مِنَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ يَا قَوِيُّ يَامَتِيْنُ يَا غَنِيُّ اَغْنِنِيْ بِلُطْفِكَ اَلْخَفِيْ يَا لَطِيْفُ الْطُفْنِيْ يَا مُحِيْطُ يَا سُبْحَانَ فَاِنَّكَ قُلْتَ وَقَوْلُكَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ اللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ۔

یا رب درود نازل فرما ہمارے آقا محمد مصطفی پر اور ہمارے آقا محمد مصطفی کی آل پر اور برکت اور سلام ،تمام تعریفیں اللہ کو پروردگار تمام جہانوں کا اے زندہ توانا اے ودود اے وہاب ہم پر روزی کے دروازے کھول اور فتوحات کے (جیسا تو نے فرمایا)ہم نے تمہارے لئے فتح کی فتح ظاہر پس اللہ بہتر فتح فرمانیوالا ہے نہایت مہربان رحم والا اے باسط اے فتاح اے رزاق اے عزیز مجھے عزت دے میری مراد اور میرے مطلب کے حصول کے ساتھ رفعت اور عزت اور دولت اور اقبال اور بلندی مرتبہ وحشمت وشوکت وجلال کے ساتھ بامر خدائے برتر اور اللہ اپنے امر پر غالب ہے لیکن بہت لوگ جانتے نہیں مالک روز جزا کا اے منعم اے کافی اے دینے والے مجھے دے سونا اور چاندی اور لباس اور قسم قسم کی خوراک ہر روز غیب وشہادت سے اور وہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔خاص تیری عبادت کرتے ہیں ہم اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اے قوی اے زبردست اے غنی مجھے اپنے لطف خفی کے ساتھ غنی کر وا ے لطیف مجھ پر لطف فرما تو نے فرمایا اور تیرا قول حق ظاہر ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے جسے چاہے روزی دیتا ہے۔

وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ وَسَخِّرِ الْاِنْسَ وَالْجِنَّ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَائِ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَ زَیِّنِیْ بِزِیْنَةِ الدُّنْیَا بِحَقِّ جُوْدِکَ لَاُزَیِّنَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَا اُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ یَا وَاجِدُ یَا مَاجِدُ یَا وَاهِبُ یَا مُجِیْبُ یَا سَرِیْعُ سَخِّرْ لَنَا کُلَّ شَیْئٍ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ یَا بَدِیْعَ الْعَجَائِبِ وَالْبُدُّوْحُ وَابْسُطْ عَلَیَّ رِزْقًا وَاقْضِ کُلَّ قَرْضٍ وَاقْضِ کُلَّ حَاجَةٍ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِکُلِّ شَیْئٍ قَدْرًا اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَاالضَّالِّیْنَ یَا قَاضِیَ الْحَاجَاتِ یَا کَافِیَ الْمُهِمَّاتِ یَا رَافِعَ الدَّرَجَاتِ یَا دَافِعَ الْبَلِیَّاتِ یَا جَامِعَ الشَّتَاتِ اَنَا مُحْتَاجٌ اَنَا ذَلِیْلٌ اَنْتَ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ رَؤُفٌ رَحِیْمٌ فَارْحَمْنِیْ وَ اَغِثْنِیْ یَا رَبِّ اٰمِیْنَ اٰمِیْنَ اٰمِیْنَ۔وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

اور وہ قوی وغالب ہے اور مطیع کر انسانوں کو اور جنوں کو مردوں اور عورتوں سے اور مجھے زینت دے دنیا کی زینت طفیل اپنی جود کا تا کہ میں زمین میں سبھوں کو دین سے مزین کروں اور ان میں کسی کو ہرگز گمراہ نہ کروں۔ ہمیں سیدھی راہ دکھا اے واجد اے ماجد اے واہب اے مجیب اے سریع الاجابۃ ہمارے لئے ہر چیز مسخر کر جیسا تو نے فرمایا کہ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے نجات دی اور ہم ایسے ہی ایمانداروں کو نجات دیتے ہیں راہ ان کی جن پر تو نے انعام کیا اے بدیع العجائب اے بدوح اور مجھ پر روزی وسیع کر اور ہر قرض کو ختم کر اور ہر حاجت کو روا فرما بیشک اللہ پہنچانے والا ہے اپنی امر کا بیشک اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کیا اس کا امر یہی ہے کہ جب وہ کچھ چاہے فرمائے ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے نہ ان کا جن پر غضب ہوا نہ گمراہوں کا اے قاضی الحاجات اے مشکلوں میں کفایت کرنے والے اور درجے بلند کرنے والے اور بلاؤں کو دفع کرنے والے اے بکھرے ہوؤں کو جمع فرمانیوالے میں محتاج ہوں میں ذلیل ہوں تو غنی کریم رؤف رحیم ہے مجھ پر رحم فرما اور میری فریاد رسی کر اے رب آمین آمین آمین۔ اور اللہ کا درود بہترین خلق ہمارے آقا محمد مصطفی اور ان کی آل واصحاب پر سب پر صدقہ اپنی رحمت کا اے سب سے زیادہ رحم فرمانے والے۔

باب دوم

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے سورہ فاتحہ کے قرآن سے نہ ہونے کا شبہ اور ازالہ

بعض کتابوں میں یہ روایت در آئی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو سورہ فاتحہ اور معوذتین کے قرآن ہونے سے انکار تھا مگر یہ روایت بے بنیاد، باطل اور غلط ہے۔ حضرت امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں۔

"نقل فی الکتب القدیمة ان ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه کان ینکر کون المعوذتین من القرآن۔ واعلم انه هذا فی غایة الصعوبة لانا ان قلنا ان النقل المتواتر کان حاصلا فی عصر الصحابة بکون سورة الفاتحة من القرآن فح کان ابن مسعود عالماً بذالک فانکاره یوجب الکفر او نقصان العقل۔ وان قلنا ان النقل المتواتر فی هذاالمعنی ماکان حاصلا فی ذالک الزمان فهذا یقتضی ان یقال ان نقل القرآن لیس بمتواتر فی الاصل، وذالک یخرج القرآن عن کونه حجة یقینیة۔ والاغلب علی الظن ان نقل هذا المذهب عن ابن مسعود رضی اللہ عنه نقل کاذب باطل وبه یحصل الخلاص عن هذه العقدة۔ (تفسیر رازی صفحہ: ۲۱۸، ج: ۱)

یعنی پرانی کتابوں میں منقول ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورہ فاتحہ اور معوذتین کے قرآن ہونے سے انکار کرتے تھے۔ جان لو کہ یہ انتہائی مشکل مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کے جزو قرآن ہونے پر عہد صحابہ میں نقل متواتر حاصل تھی تو حضرت ابن مسعود اس سے باخبر ہوں گے پھر ان کے انکار سے کفر یا کم عقلی لازم آتی ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ اس بارے میں اس وقت نقل متواتر نہ تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں قرآن کی نقل متواتر نہیں جب تو قرآن یقینی حجت نہ رہ جائے گا اور زیادہ غالب گمان یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس مذہب کی نقل جھوٹی اور باطل نقل ہے۔ یہی ماننے سے یہ عقدہ حل ہو سکے گا۔

اسی طرح حضرت ملا علی قاری شرح شفا میں فرماتے ہیں **"قال النووی فی شرح المهذب اجمع المسلمون علی أن المعوذتین والفاتحة وسائر السور المکتوبة فی المصحف قرآن وأن من جحد شیئا منها کفر، وما نقل عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه فی الفاتحة والمعوذتین باطل لیس بصحیح۔ قال ابن حزم فی**

اول کتابہ المحلی ھذا کذب علی ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (شرح شفاء صفحہ ۵۵، ج:۲) یعنی حضرت امام نووی نے شرح مہذب میں کہا ہے کہ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ معوذتین، فاتحہ اور مصحف میں لکھی ہوئی تمام سورتیں قرآنی ہیں اور جو ان میں سے کسی کا منکر ہو کافر ہے اور جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فاتحہ و معوذتین کے بارے میں منقول ہے وہ باطل ہے غیر صحیح ہے چنانچہ ابن حزم نے اپنی کتاب محلی کے شروع میں کہا ہے یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کذب افترا ہے۔

حضرت علامہ ملا محب اللہ بہاری علیہ الرحمہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف مسلم الثبوت میں رقمطراز ہیں:۔

"و ما نقل عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ من انکار المعوذتین و الفاتحۃ فلم یصح انما صح"

یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے معوذتین اور فاتحہ کا جو انکار منقول ہے وہ صحیح نہیں۔

اس باب میں نہایت ہی محقق اور قول فیصل کلام، میرے استاذ کریم صدر العلماء حضرت علامہ مولانا محمد احمد مصباحیؔ اعظمی نے فرمایا ہے آپ نے اس باب کی تمام روایتوں کو یکجا کر کے اقوال علما و مفسرین کی روشنی میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سورہ فاتحہ اور معوذتین کی قرآنیت کے انکار کی نسبت غلط ہے ہاں البتہ انکا مصحف کچھ وجوہ سے ان سورتوں سے خالی تھا چنانچہ حضرت صدر العلماء دربارہ سورہ فاتحہ فرماتے ہیں۔

''سورہ فاتحہ سے متعلق حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ وہ اسے مصحف میں نہ لکھتے ابوعبید نے بسند صحیح ابن سیرین سے روایت کی ہے۔

"قال کتب ابی ابن کعب فی مصحفه فاتحة الکتاب والمعوذتین واللهم انا نستعینک واللهم ایاک نعبد وترکهن ابن مسعود وکتب عثمان منهن فاتحة الکتاب والمعوذتین"۔(اتقان: ج:۱،ص:۶۵)

ابن سیرین نے فرمایا ابی بن کعب نے اپنے مصحف میں فاتحۃ الکتاب معوذتین "**اللھم انا نستعینک** اور **اللھم ایاک نعبد**" لکھیں اور حضرت ابن مسعود نے یہ سب نہ لکھیں، اور حضرت عثمان نے ان میں سے صرف فاتحۃ الکتاب اور معوذتین لکھیں۔

عبد بن حمید نے ابراہیم سے روایت کی: "قال کان عبداللہ لا یکتب فاتحة الکتاب فی المصحف و قال

لو کتبتھا لکتبت فی اول کل شیء" (درمنثور ج:۱،صفحہ:۱) ابراہیم نے فرمایا عبداللہ ابن مسعود فاتحۃ الکتاب مصحف میں نہ لکھتے اور فرماتے اگر میں اسے لکھتا تو بالکل شروع میں لکھتا۔ ان روایتوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاتحۃ الکتاب اپنے مصحف میں نہ لکھتے۔ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ انہیں قرآنیت فاتحہ میں کوئی شک رہا ہو نہ ہی کسی قابل ذکر شخصیت کا قول ہے۔ معوذتین کے بارے میں تو بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ حضرت ابن مسعود کو ان کی قرآنیت سے انکار تھا لیکن سورہ فاتحہ کے بارے میں وہ بھی یہی مانتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلاشبہ قرآنیت فاتحہ کے قائل تھے مثلاً ابن قتیبہ مشکل الآثار میں رقمطراز ہیں۔

"واما اسقاطه الفاتحة من مصحفه فليس بظنه انها ليست من القرآن معاذ الله ولكنه ذهب الى أن القرن انما كتب وجمع بين اللوحين مخافة الشك والنسيان والزيادة والنقصان ورأى ان ذالك مامون فی سورة الحمد لقصرها ووجوب تعلمها على كل احد" (الاتقان ج:۱ صفحہ ۸۲) یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنے مصحف میں سورہ فاتحہ نہ لکھنا اس گمان کی بنیاد پر نہیں کہ معاذ اللہ وہ قرآن نہیں بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن کی کتابت تدوین کی غرض یہ ہے کہ شک ونسیان اور کمی وبیشی کا اندیشہ جاتا رہے اور سورہ فاتحہ کے بارے میں یہ اندیشہ نہیں کیونکہ یہ مختصر ہے اور ہر شخص پر اس کا سیکھنا واجب ہے (اس لئے اس کی قرآنیت میں کسی شبہ کی گنجائش، یا اس کے نسیان کا امکان نہیں، لہٰذا اس کے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں)۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے قرآنیت فاتحہ میں کسی شک وشبہ کی گنجائش کیونکر ہوسکتی جب کہ انہوں نے پوری زندگی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نماز میں اس کی قرأت سنی۔ خود بھی قرأت کی۔ خلفاء وصحابہ سے بھی سنی، پھر قرأت صحیحہ متواترہ جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے اس میں بھی سورہ فاتحہ موجود ہے۔ لہٰذا یہ امر بالکل قطعی ویقینی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک سورہ فاتحہ جزء قرآن ہے اس پر مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ (از تدوین قرآن صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۲)

مندرجہ بالا تفصیل سے آفتاب نیمروز سے زیادہ روشن ہوگیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف دربارۂ سورہ فاتحہ اس کی قرآنیت میں انکار یا شک وارتیاب کی نسبت باطل وغلط ہے اور اگر ایسی کوئی روایت مستند کتاب میں موجود ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کو اپنے مصحف میں لکھنے سے انکار تھا کہ اس کی شہرت وضرورت قرأت کی وجہ سے آپ اس کو لکھنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔

دعائے اختتام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِی الْاُمِّی وَ آلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اَللّٰھُمَّ یَا رَبِّ بِجَاہِ نَبِیِّکَ الْمُصْطَفٰی وَرَسُوْلِکَ الْمُرْتَضٰی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَھِّرْ قُلُوْبَنَا مِنْ کُلِّ وَصْفٍ یُبَاعِدُنَا عَنْ مُشَاھَدَ تِکَ وَ مَحَبَّتِکَ وَاَمِتْنَا عَلَی السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ وَالشَّوْقَ اِلٰی لِقَائِکَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِمُؤَلِّفِہٖ وَنَاظِرِہٖ وَلِنَاصِرِہٖ وَنَاشِرِہٖ وَکَاتِبِہٖ وَقَارِئِہٖ وَارْحَمْھُمْ وَاجْعَلْھُمْ مِنَ الْمَحْشُوْرِیْنَ فِی زُمْرَۃِ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِفَضْلِکَ یَا رَحْمٰنُ یَا رَحِیْمُ۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلِوَالِدَیْنَا وَلِاَسَاتِذَتِنَا وَ لِمَشَائِخِنَا وَلِجَمِیْعِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ الْاَحْیَاءِ مِنْھُمْ وَالْاَمْوَاتِ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ، وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

۷۸۶/۹۲

مجلس اشاعت

تفسیر سورہ فاتحہ کی اشاعت میں دامے درمے قدمے اعانت کرنے والے مخلصین

ہم ذیل میں اپنے ان کرم فرماؤں کی فہرست پیش کررہے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی کتابت اور طباعت و اشاعت میں تعاون فرمایا۔ حضرات قارئین کرام سے ان حضرات کے لئے دعاؤں کی اپیل کرتے ہیں اور خود دعاء گو ہیں کہ مولائے کریم اپنے محبوبین کے صدقے ان حضرات کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے۔ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ رکھے، ان کی تجارت اور کاروبار میں ترقی عطا فرمائے، ان کی اولادوں کو نیک وصالح بنائے، ان کی ہر جائز تمنائیں پوری فرمائے، مذہب حق اہل سنت و جماعت پر قائم رکھے، ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے اور مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔

دعا گو

محمد معین الدین اشرفی مصباحی

نمبر شمار	اسمائے گرامی معاونین
۱	جناب ماسٹر محمد جمال خاں صاحب سکریٹری ومتولی مسجد ٹاٹ شاہ
۲	،،محمد ندیم خاں ابن جناب حاجی دبیر خانصاحب ساکیت وگیان فیض آباد
۳	،،حاجی محمد صالح صاحب الماری والے دیوکالی فیض آباد
۴	،،ڈاکٹر قوسین خان صاحب ہند کلینک مسودھا فیض آباد
۵	،،محمد کاشف خانصاحب/ زین العابدین صاحب پرانی سبزی منڈی فیض آباد
۶	،،محمد عمران خانصاحب محلہ پرانی سبزی منڈی فیض آباد
۷	،،حاجی محمد کلیم خانصاحب گھوسیانہ سابق مدرس دارالعلوم بہار شاہ

نمبر شمار	اسمائے گرامی معاونین
۸	جناب محمد اعواض خاں صاحب نیاواں فیض آباد
۹	،،محمد کلام صاحب بچھڑا سلطانپور فیض آباد
۱۰	،،محمد احمد برکاتی صاحب چوک فیض آباد
۱۱	،،حافظ محمد نسیم صاحب امام مسجد دیوکالی فیض آباد
۱۲	،،حافظ عبدالقیوم صاحب امام مسجد دائی حوری فیض آباد
۱۳	جناب محمد افضال صاحب قریشی نیاواں، فیض آباد
۱۴	،،محمد عاصم خاں صاحب ابوسرائے
۱۵	،،محمد صابر صاحب سابق متولی مسجد ٹاٹ شاہ فیض آباد
۱۶	،،غلام غوث اشرفی صاحب مدناپور کلکتہ
۱۷	،،محمد کاشف صاحب دبئ
۱۸	،،محمد آفتاب صاحب قریشی دبئ
۱۹	،،محمد عبید صاحب محلہ حسنو کٹرہ فیض آباد
۲۰	،،حاجی مصباح الدین صاحب شہاب بوٹ ہاؤس فیض آباد
۲۱	،،حاجی محمد سلیم صاحب دلہن ایمپوریم بزازہ فیض آباد/ جناب محمد سعید صاحب سبز یمنڈی
۲۲	،،محمد شہنشاہ اشرفی سبھاش نگر فیض آباد
۲۳	،،مولانا محمد سلمان عطاری و برادران رسی ٹولہ فیض آباد
۲۴	،،حاجی محمد گلزار خاں صاحب پرانی سبز یمنڈی فیض آباد
۲۵	،،ڈاکٹر عمران خاں مدناپور کلکتہ
۲۶	،،ثمیر ن بی بی مرحومہ کلکتہ
۲۷	،،شیخ فقیر الدین مدناپور کلکتہ

نمبر شمار	اسمائے گرامی معاونین
۲۸	جناب محمد عارف صاحب مدنا پور کلکتہ
۲۹	جناب محمد کلیم صاحب راٹھ حویلی فیض آباد
۳۰	،،حافظ محمد اشرف عرف اشرفی بابا بھاگلپور
۳۱	جناب حاجی محمد معین الدین صاحب انصاری بچھڑا سلطانپور، فیض آباد
۳۲	،،محمد عرفان صاحب بالک رام کالونی فیض آباد
۳۳	،،ڈاکٹر محمد قمر ماہری حبیبی منیجر دارالعلوم بہار شاہ
۳۴	،،خالد مرزا صاحب پرانی سبزی منڈی فیض آباد
۳۵	،،عبید خانصاحب محلہ قندھاری بازار، فیض آباد
۳۶	،،حاجی محمد ثمیر صاحب جیوتی پریس والے نیاواں، فیض آباد
۳۷	،،زاہد خاں صاحب گونڈہ/ پٹھان ٹولیہ
۳۸	،،محمد شمشاد صاحب اخبار والے پرانی سبزی منڈی فیض آباد
۳۹	،،محمد ضیاء اشرف صاحب مکتبہ نعیمیہ دہلی
۴۰	،،حافظ ریاست علی صاحب کشمیری محلہ فیض آباد

تفصیلی فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۔	**شرف انتساب**	۶	۸	**کلمات تقریظ**	۳۶
۲۔	**کلمات تقدیم**	۷	۹	(1) سراج الفقہاء حضرت علامہ مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب قبلہ رضوی شیخ الحدیث وصدر شعبہ افتاء جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۳۶
۳۔	**کلمات دعا**	۲۷	۱۰	(2) حضرت علامہ مولانا مفتی محمد قاسم صاحب اشرفی مصباحی شیخ الحدیث وصدر شعبہ افتاء مدرسہ غوثیہ رضویہ دھامنگر شریف اڑیسہ	۳۸
۴۔	(1) علامہ عبدالشکور صاحب قبلہ سابق شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۲۷	۱۱	(3) حضرت علامہ مولانا مفتی محمد مجاہد حسین صاحب قبلہ رضوی الہ آباد	۴۰
	(2) صدر العلماء حضرت علامہ مولانا محمد احمد مصباحی ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۲۸		**کلمات تحسین**	۴۸
۵۔	**کلمات تبریک**	۲۹	۱۲	(1) حضرت علامہ ومولانا مفتی محمد بدر عالم صاحب مصباحی پرنسپل جامعہ اشرفیہ مبارکپور	۴۸
۶۔	(1) قائد ملت حضرت علامہ مولانا سید شاہ محمود اشرف اشرفی الجیلانی سجادہ نشین درگاہ کچھوچھہ شریف	۲۹	۱۳	(2) حضرت علامہ ومولانا محمد قمر عالم صاحب مصباحی اشرفی شیخ الحدیث دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی	۴۹
۷۔	(2) شیخ طریقت حضرت علامہ مولانا سید جلال الدین اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھہ شریف، بانی مخدوم اشرف مشن۔	۳۲	۱۴	(3) حضرت علامہ ومولانا وصی احمد صاحب قبلہ قادری نائب سربراہ اعلیٰ دار العلوم بہار شاہ وسابق شیخ الحدیث دار العلوم ہذا فیض آباد	۵۰

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۵	تعارف تفسیر صاحب تفسیر	۵۱
۱۶	اظہار مسرت	۶۴
۱۷	منظوم ترجمانی سورہ سبع مثانی مولانا محمد اظہار اشرفی	۶۵
۱۸	خطبہ کتاب	۶۶
۱۹	قرآن حکیم علوم و معارف اور اسرار معانی کا ناپیدا کنار سمندر	۶۷
۲۰	سورۃ الفاتحہ	۸۵
۲۱	تراجم سورہ فاتحہ	۸۶
۲۲	ترجمہ سورہ فاتحہ بمطابق اقوال مفسرین	۸۸
۲۳	اسمائے سورۃ الفاتحہ و وجوہ تسمیہ	۸۹
۲۴	فضائل سورۃ الفاتحہ	۹۶
۲۵	علوم سورۃ الفاتحہ	۱۰۲
۲۶	**مباحث تعوذ** **باب اول**	۱۱۲
۲۷	مسئلہ اول: محل تعوذ میں علما کا اختلاف	۱۱۲
۲۸	مسئلہ دوم: وجوب تعوذ کے دلائل	۱۱۴
۲۹	مسئلہ سوم: قبل قراءت تعوذ مستحب ہے	۱۱۴
۳۰	مسئلہ چہارم: تعوذ کا بیان امام شافعی کی کتاب الام سے	۱۱۴
۳۱	مسئلہ پنجم: الفاظ تعوذ میں اختلاف	۱۱۵
۳۲	مسئلہ ششم: نماز میں تعوذ کی وجہ نماز ہے یا قراءت	۱۱۶
۳۳	کیا مقتدی پر بھی تعوذ واجب ہے	۱۱۶
۳۴	مسئلہ ہفتم: ترتیل کے ساتھ قراءت کی وجہ	۱۱۶
۳۵	مسئلہ ہشتم: تجوید بھی مسنون ہے	۱۱۷
۳۶	مسئلہ نہم: ضاد اور ظا کے درمیان امام شافعی کے یہاں مشابہت ہے	۱۱۷
۳۷	مسئلہ دہم: لام مغلظ لغت فصیحہ سے ہے یا نہیں	۱۱۹
۳۸	مسئلہ یازدہم: اکثر علما کا قول ہے کہ قراءت مشہورہ نقل متواتر ہے	۱۲۰
۳۹	مسئلہ دوازدہم: کتاب الام میں ہے کہ تعوذ ہر رکعت میں واجب ہے	۱۲۰
۴۰	**باب دوم**	۱۲۱
۴۱	مباحث عقلیہ (تعوذ کے ارکان خمسہ)	۱۲۱
۴۲	**رکن اول:** استعاذہ کا بیان	۱۲۱

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۴۳	**مسئلہ اول:** اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم کی تفسیر	۱۲۱
۴۴	**مسئلہ دوم:** ماہیت استعاذہ	۱۲۲
۴۵	تحصیل علم میں استعاذہ کی حاجت کے دلائل	۱۲۴
۴۶	بندہ، اعمال ظاہری کی ادائیگی میں محتاج ہے (دلائل)	۱۲۵
۴۷	**مسئلہ سوم:** مذہب جبریہ پر استعاذہ کا بطلان	۱۲۶
۴۸	اہلسنت کی طرف سے قدریہ کے رد کے طرق	۱۲۸
۴۹	کلام اہل سنت قدریہ کے نظریہ کے ابطال میں	۱۲۹
۵۰	**رکن دوم:** المستعاذ بہ یعنی جس سے پناہ مانگی جائے	۱۳۰
۵۱	**رکن سوم:** المستعیذ، پناہ مانگنے والا	۱۳۱
۵۲	احادیث استعاذہ	۱۳۴
۵۳	**رکن چہارم:** مستعاذ منہ (شیطان)	۱۳۸
۵۴	**مسئلہ اول:** جن و شیطان کے وجود میں اختلاف واقوال	۱۳۸
۵۵	مراتب ملائکہ (فرشتوں کے درجات)	۱۳۹
۵۶	جن و شیاطین کے وجود کے منکرین (دلائل)	۱۳۹
۵۷	منکرین کا جواب	۱۴۰
۵۸	جن کو جوہر مجرد ماننے والے گروہ	۱۴۱
۵۹	**مسئلہ دوم:** جن کے وجود پر آیات واحادیث	۱۴۲
۶۰	خبر اول وخبر دوم	۱۴۴ ۱۴۵
۶۱	حدیث لیلۃ الجن	۱۴۵
۶۲	خبر ہفتم: جن کے اچک لینے کا واقعہ	۱۴۶
۶۳	خبر ہشتم: بہجۃ الاسرار سے جن کے اچکنے والا واقعہ	۱۴۷
۵۴	خبر نہم: اموال صدقات کی نگرانی کرنا حضرت ابوہریرہ کا اور جن کا چوری کرنا	۱۴۸
۶۵	خبر دہم: شیطان سے حضور کی گفتگو	۱۴۸
۶۶	خبر یازدہم: صحائف اشرفی سے جن کے وجود کا واقعہ	۱۴۹
۶۷	روضۃ الاخیار، امام غزالی سے جن کا واقعہ	۱۵۱
۶۸	**مسئلہ سوم:** جن کے مادہ تخلیق کا بیان	۱۵۳

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۶۹	**مسئلہ چھارم:** جن کی وجہ تسمیہ کا بیان	۱۵۴
۷۰	**مسئلہ پنجم:** گروہ مکلفین کا بیان	۱۵۴
۷۱	**مسئلہ ششم:** جن کے تصرفات کا بیان	۱۵۴
۷۲	جنوں کے بارے میں معتزلہ کا موقف	۱۵۵
۷۳	معتزلہ کا رد/ جواب	۱۵۵
۷۴	شیطان کا حضرت آدم اور دوسرے بزرگوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا	۱۵۵
۷۵	**مسئلہ ہفتم:** جنوں کے خورد ونوش کا بیان	۱۵۷
۷۶	**مسئلہ ہشتم:** کیفیت وسوسہ کا بیان	۱۵۷
۷۷	**مسئلہ نہم:** حقیقت وسوسہ کا بیان	۱۵۹
۷۸	**مسئلہ دہم:** فرقہ ثنویہ کے عقیدہ کا بیان کہ عالم میں دو الٰہ ہیں	۱۶۰
۷۹	**مسئلہ یازدہم:** شیطان کو مافوق الفطرت قوت ثابت ہے یا نہیں	۱۶۰
۸۰	**مسئلہ دوازدہم:** جنوں کو امور غیبیہ پر اطلاع ہوسکتی ہے یا نہیں	۱۶۱
۸۱	**رکن پنجم:** ان مطالب کے بیان میں جن کی وجہ سے استعاذہ کیا جاتا ہے	۱۶۱
۸۲	**باب سوم:** کلمہ تعوذ اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم میں لطائف ونکات	۱۶۳
۸۳	**نکتہ (۱):** قول اعوذ باللہ میں خلق سے خالق کی طرف عروج ہوتا ہے	۱۶۳
۸۴	**نکتہ (۲):** اعوذ باللہ کہنے میں نفس کی عاجزی کا اظہار ہے	۱۶۳
۸۵	**نکتہ (۳):** شیطان سے فرار کا راستہ استعاذہ ہے	۱۶۴
۸۶	**نکتہ (۴):** قرأت قرآن کے وقت استعاذہ ضروری ہونے کی وجہ	۱۶۴
۸۷	**نکتہ (۵):** اعوذ باللہ کہنے سے شیطان سے فرار اور بسم اللہ کہنے سے قرب رحمن حاصل ہوتا ہے	۱۶۴
۸۸	**نکتہ (۶):** اعوذ باللہ سے قلب و زبان کی طہارت ہوتی ہے	۱۶۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۸۹	**نکتہ(۷):** بندہ اپنے باطنی دشمن شیطان سے بچنا چاہے تو اسے اعوذ باللہ کا وظیفہ کرنا چاہئے	۱۶۵
۹۰	**نکتہ(۸):** مومن کا قلب صاف و شفاف آئینہ ہے اور تمام مقامات سے افضل ہے	۱۶۶
۹۱	حدیث:"مازال عبدی یتقرب الی بالنوافل، القبر روضة من ریاض الجنة"	۱۶۷
۹۲	**نکتہ (۹):** شیطان سے ہمیشہ دشمنی رکھو پس اس کے لئے اعوذ باللہ کا وظیفہ کرو	۱۶۹
۹۳	**نکتہ (۱۰):** شیطان کے مکر و فریب اور گمراہی سے بچنے کے لئے اعوذ باللہ کہو	۱۶۹
۹۴	**نکتہ (۱۱):** کلمہ اعوذ باللہ میں اسمائے الٰہیہ میں سے صرف ایک اسم پاک اللہ کیوں مذکور ہوا	۱۶۹
۹۵	**نکتہ (۱۲):** بندہ کا اعوذ باللہ کہنا دلیل ہے کہ وہ شیطان کی مجاورت سے راضی نہیں	۱۷۰
۹۶	**نکتہ(۱۳):** شیطان کی صفت رجیم کیوں لائی گئی۔	۱۷۰
۹۷	**نکتہ(۱۴):** اعوذ باللہ کے بجائے اعوذ بالملکۃ کیوں نہیں ارشاد ہوا	۱۷۱
۹۸	**نکتہ(۱۵):** جب مسلمان صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ستر شیطان اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے	۱۷۱
۹۹	**نکتہ (۱۶):** شیطان شطن سے ماخوذ ہے جو دور ہونے کے معنی میں آتا ہے	۱۷۲
۱۰۰	**نکتہ(۱۷):** حضرت امام جعفر صادق کا ارشاد کہ تلاوت کے وقت تعوذ کیوں ضروری ہے	۱۷۲
۱۰۱	**نکتہ(۱۸):** تعوذ میں شیطان کی صفت رجیم آئی ہے تو تسمیہ میں اللہ کی صفت رحمن و رحیم آئی ہے	۱۷۲
۱۰۲	**نکتہ(۱۹):** تعوذ میں شیطان کو رجیم کہنا دلیل ہے کہ گستاخ انبیاء کو مردود کہنا جائز ہے	۱۷۳
۱۰۳	**مباحث تسمیہ**	۱۷۴
۱۰۴	**باب اول:** تسمیہ کے مسائل مقدمہ کا بیان	۱۷۴

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۰۵	**مسئلہ اول:** بسم اللہ کی ''با'' اور اس کے متعلق کے بیان میں	۱۷۴	۱۱۶	**مسئلہ دوم:** بسم اللہ کے الف کو حذف کر دیا جاتا ہے جب کہ اقرأ بسم ربک میں حذف نہیں کیا جاتا وجہ	۱۸۲
۱۰۶	**مسئلہ دوم:** بسم اللہ کی با کا عامل فعل ہے یا اسم ہے مقدم و مؤخر دونوں ہوسکتا ہے۔	۱۷۵	۱۱۷	**مسئلہ سوم:** اللہ میں بھی دو لام اور الذی میں بھی دو لام ہیں لیکن دونوں کے خط میں فرق کیوں ہے	۱۸۳
۱۰۷	عبارت بیضاوی کا خلاصہ	۱۷۶	۱۱۸	**مسئلہ چہارم:** اسم جلالت لفظ اللہ کو لکھنے اور پڑھنے دونوں میں تفخیم کا لحاظ رہنا چاہئے	۱۸۳
۱۰۸	**مسئلہ سوم:** بسم اللہ کی قرأت	۱۷۷	۱۱۹	**مسئلہ پنجم:** لفظ الا لہ اور لفظ اللہ دونوں کے حروف میں فرق کی وجہ	۱۸۴
۱۰۹	**مسئلہ چہارم:** بسم اللہ و الحمد للہ میں ''ل'' کو پُر پڑھنے کا حکم	۱۷۷	۱۲۰	**باب سوم:** مباحث اسم کا بیان	۱۸۵
۱۱۰	**مسئلہ پنجم:** اسم جلالت اللہ مشدد ہے	۱۷۸	۱۲۱	مباحث اسم کی دو قسمیں ہیں (نوعیں)۔	۱۸۵
۱۱۱	اسم جلالت لفظ ''اللہ'' میں دو لام ہونے کا نکتہ	۱۷۸	۱۲۲	**نوع اول:** چند قسم کے مسائل کا بیان	۱۸۵
۱۱۲	**مسئلہ ششم:** الرحمن الرحیم میں راء کو مشدد پڑھنے کی وجہ	۱۷۹	۱۲۳	**مسئلہ اول:** لغت اسم کا بیان	۱۸۵
۱۱۳	**مسئلہ ہفتم:** الرحمن الرحیم میں امالہ جائز نہیں نحویوں کا قول	۱۷۹	۱۲۴	**مسئلہ دوم:** اسم کی تحقیق بیضاوی کی روشنی میں (بصری و نحوی کا اختلاف)	۱۸۵
۱۱۴	**باب دوم:** خط بسم اللہ کا بیان	۱۸۰	۱۲۵	عقلی بحث: **مسئلہ اول:** اسم و مسمی کے بیان میں اسم مسمی کا عین ہے۔	۱۸۶
۱۱۵	**مسئلہ اول:** بسم اللہ کی ''با'' کو طویل لکھنے کی اور دوسرے حرفوں کی بجائے با اختیار کرنے کی وجہ	۱۸۰	۱۲۶	**مسئلہ دوم:** اسم مسمی کا غیر ہے (دلائل)	۱۸۷

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۸۱	**مسئلہ سوم:** مسمّی کی طرح تسمیہ بھی اسم کا غیر ہے	۱۸۹	۱۹۰	**مقدمہ خامسہ:** اشیاء کی معرفت کی قسموں کا بیان	۱۹۳
۱۸۲	**مسئلہ چہارم:** الفاظ کی دو قسمیں ہیں مستقلہ وغیر مستقلہ الفاظ مستقلہ میں اسماء کو افعال پر مقدم کرنے کی وجہیں	۱۸۹	۱۹۱	**مسئلہ ہشتم:** اللہ تعالیٰ کی ذات مخصوصہ کے اعتبار سے کوئی خاص اسم ہے یا نہیں	۱۹۴
۱۸۳	**مسئلہ پنجم:** اسم کی دو قسمیں اسم ماہیت واسم مشتق	۱۹۰	۱۹۲	**مسئلہ نہم:** اللہ تعالیٰ کی ذات مخصوصہ کا اسم اسم اعظم اور اس کا ذکر ذکر اعظم ہے	۱۹۴
۱۸۴	**مسئلہ ششم:** مسمیات ذوات پر جو اسماء واقع ہوتے ہیں وہ نو طرح کے ہوتے ہیں	۱۹۰	۱۹۳	**مسئلہ دہم:** اسم اعظم کا بیان اور اس میں اقوال اعلیٰ حضرت وغیرہ	۱۹۵
۱۸۵	**مسئلہ ہفتم:** کیا اللہ تعالیٰ کے لئے، اس کی ذات مخصوصہ کے اعتبار سے کوئی اسم ہے یا نہیں	۱۹۰	۱۹۴	**مسئلہ یازدہم:** مسمّی پر اسم کی دلالت کا بیان	۱۹۹
۱۸۶	**مقدمہ اولیٰ:** اللہ تعالیٰ مخلوق کا غیر ہے	۱۹۱	۱۹۵	**باب چہارم:** صفات حقیقیہ پر دلالت کرنے والے اسماء مبارکہ	۲۰۰
۱۸۷	**مقدمہ ثانیہ:** اللہ تعالیٰ جسم وجوہر نہیں ہے	۱۹۲	۱۹۶	**قسم اول:** وہ اسماء مبارکہ جو وجود پر دلالت کرتے ہیں	۲۰۰
۱۸۸	**مقدمہ ثالثہ:** اللہ تعالیٰ کی ذات مخصوصہ کی معرفت نہیں ہوسکتی	۱۹۲	۱۹۷	**مسئلہ اول:** الشئ کے اسم سے تسمیہ جائز ہے۔ (دلائل)	۲۰۰
۱۸۹	**مقدمہ رابعہ:** اس کی ذات کا تعقل ممکن ہے یا نہیں	۱۹۳	۱۹۸	اللہ پر شئ کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ (دلائل)	۲۰۱

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۹۹	**مسئلہ دوم:** اللہ تعالیٰ پر لفظ ''موجود'' کا اطلاق	۲۰۳
۲۰۰	**مسئلہ سوم:** اللہ تعالیٰ پر لفظ ذات کا اطلاق	۲۰۴
۲۰۱	**مسئلہ چہارم:** اللہ تعالیٰ پر لفظ نفس کا اطلاق (بارہ احادیث)	۲۰۶
۲۰۲	**مسئلہ پنجم:** اللہ تعالیٰ پر لفظ ''شخص'' کا اطلاق	۲۰۹
۲۰۳	**مسئلہ ششم:** لفظ نور کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر نور کے عدم اطلاق پر دلائل	۲۱۰
۲۰۴	**مسئلہ ہفتم:** ذات باری پر لفظ صورت کا اطلاق	۲۱۵
۲۰۵	**مسئلہ ہشتم:** ذات باری تعالیٰ پر جوہر کے اطلاق میں فلاسفہ و متکلمین کا اختلاف	۲۱۶
۲۰۶	**مسئلہ نہم:** ذات باری تعالیٰ پر جسم کا اطلاق ممتنع ہے	۲۱۷
۲۰۷	**مسئلہ دہم:** رب تعالیٰ پر لفظ حق کا اطلاق	۲۱۷
۲۰۸	**قسم دوم:** ان اسماء کے بیان میں جو وجود کی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں	۲۱۸
۲۰۹	چند مقدمہ عقلیہ کی تمہید: مقدمہ اولیٰ	۲۱۸
۲۱۰	مقدمہ ثانیہ، مقدمہ ثالثہ	۲۱۸
۲۱۱	**قسم سوم:** صفات حقیقیہ کی قسموں کا بیان	۲۲۰
۲۱۲	فلاسفہ و معتزلہ رب تعالیٰ کی صفات کے منکر ہیں (دلائل)	۲۲۰
۲۱۳	صفات باری تعالیٰ کے قائلین کے دلائل	۲۲۲
۲۱۴	**باب پنجم**	۲۲۳
۲۱۵	صفات اضافیہ پر دلالت کرنے والے اسماء	۲۲۳
۲۱۶	تکوین یعنی فعل، خلق و تخلیق صفات حقیقیہ سے ہیں یا اضافیہ سے	۲۲۳
۲۱۷	اہل سنت و جماعت کے نزدیک تین اقوال ہیں	۲۲۳
۲۱۸	الموجد، المورث، الصانع وغیرہ دس اسماء متقارب المعنی اور اس میں فرق	۲۲۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۲۱۹	نافع ، ضار، محیی ممیت اور قابض ومنتقم وغیرہ اسمائے مبارکہ کے درمیان فرق	۲۲۵
۲۲۰	نکتہ اولی، نکتہ ثانیہ، اسماء متقابلہ و اسماء مترادفہ میں	۲۲۶
۲۲۱	**باب ششم:** صفات سلبیہ کے اعتبار سے اسماء الٰہیہ کا بیان	۲۲۷
۲۲۲	وہ سلوب جن کا تعلق صفت قدرت وغیرہا سے ہے اس کی چند قسموں کا بیان	۲۲۷
۲۲۳	**باب ہفتم:** ان اسماء کا بیان جو صفات حقیقیہ پر اضافیہ کے ساتھ دال ہیں	۲۳۰
۲۲۴	فصل اول: صفت قدرت سے متعلق اسماء	۲۳۱
۲۲۵	فصل دوم: صفت علم سے متعلق اسماء	۲۳۲
۲۲۶	فصل سوم: صفت کلام سے متعلق اسماء	۲۳۳
۲۲۷	فصل چہارم: صفت ارادہ اور اس کے ہم معنی الفاظ کے اسماء	۲۳۳
۲۲۸	فصل پنجم: صفت سمع وبصر سے متعلق اسماء مبارکہ	۲۳۴
۲۲۹	فصل ششم: ذکر ان اسماء کا جو ذات، صفات حقیقیہ، اضافیہ اور سلبیہ پر دلالت کرنے والے ہیں	۲۳۵
۲۳۰	فصل ہفتم: ذکر صفات اضافیہ کا سلبیہ کے ساتھ	۲۳۵
۲۳۱	فصل ہشتم: ذکر ان اسماء کا جن میں عقلاء کے درمیان ااسمائے ذات و اسمائے صفات ہونے میں اختلاف ہے	۲۳۵
۲۳۲	فصل نہم: ذکر ان اسماء کا جو اسمائے مضمرہ کہلاتے ہیں	۲۳۸
۲۳۳	اسمائے مضمرہ انا، انت، ھو کے درمیان فرق اور احکام	۲۳۸
۲۳۴	فصل دہم: ذکر ''ھو'' کی برکات اور اس کے اسرار ورموز	۲۴۰
۲۳۵	اس ذکر کی جلالت شان	۲۴۳
۲۳۶	**مقدمہ اولیٰ:** علم کی دو قسمیں تصور وتصدیق	۲۴۴
۲۳۷	**مقدمہ ثانیہ:** تصور کی دو قسمیں ہیں۔	۲۴۵
۲۳۸	ذکر ''یا ھو'' کا ایک اور فائدہ	۲۴۸
۲۳۹	**باب ھشتم:** اسمائے الٰہیہ کے بقیہ مباحث	۲۴۸
۲۴۰	**مسئلہ (۱):** اسماء الٰہیہ توقیفیہ ہیں یا غیر توقیفیہ دلائل فریق اول و فریق دوم	۲۴۸

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۲۴۱	**مسئلہ (۲):** قرآن میں مذکور الفاظ صفات پر دلالت کرتے ہیں لیکن اس کا اطلاق صحیح نہیں	۲۴۹	۲۵۱	**مسئلہ دوم:** اسم جلالت لفظ ''اللہ'' کی تحقیق بیضاوی کی روشنی میں	۲۶۶
۲۴۲	**مسئلہ (۳):** کتب تذکیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے چار ہزار اسماء ہیں	۲۵۰	۲۵۲	لفظ اللہ کے بارے میں چار اقوال ہیں	۲۶۶
۲۴۳	**مسئلہ (۴):** طلسمات اور عزیمتوں کی کتابوں میں مذکور نقوش وتعویذ کی حیثیت	۲۵۱	۲۵۳	**مسئلہ سوم:** باعتبار لغت ''لفظ اللہ'' کے مشتق ہونے میں اختلاف	۲۷۱
۲۴۴	**مسئلہ (۵):** خالق ومخلوق کے اسماء کے درمیان عجیب وغریب مناسبات	۲۵۲	۲۵۴	**مسئلہ چہارم:** خلیل نحوی نے کہا مخلوق کا اجماع ہے کہ ''لفظ اللہ'' اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے	۲۷۱
۲۴۵	**مسئلہ (۶):** اسمائے الٰہیہ اور اس کے فضائل وبرکات	۲۵۳	۲۵۵	**مسئلہ پنجم:** اسم جلالت ''لفظ اللہ'' کے خواص فوائد ولطائف کا بیان	۲۷۲
۲۴۶	**مسئلہ (۷):** اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۲۵۵	۲۵۶	**باب دھم:** الرحمن الرحیم سے متعلق بحثیں	۲۷۶
۲۴۷	**باب نھم:** اسم جلالت لفظ ''اللہ'' اللہ تعالیٰ کا اسم علم ہے (دلائل)	۲۵۹	۲۵۷	اشیاء چار طرح کی ہوتی ہیں	۲۷۶
۲۴۸	تفسیر اول: **مسئلہ اول** اسم مشتق ہونے کی صورت میں	۲۵۹	۲۵۸	**مقام اول** اللہ کے سوا کسی کی رحمت نہیں	۲۷۸
۲۴۹	تفسیر دوم، تفسیر سوم، تفسیر چہارم، تفسیر پنجم	۲۶۳	۲۵۹	**مقام دوم:** غیر اللہ کی طرف سے بھی رحمت ہوتی ہے مگر اللہ کی رحمت اتم واکمل ہے	۲۷۹
۲۵۰	تفسیر ششم، تفسیر ہفتم وحکایت تفسیر ہشتم۔	۲۶۴	۲۶۰	**باب یازدھم:** فضائل و نکات بسم اللہ الرحمن الرحیم	۲۸۰

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۲۶۱	اول، دوم، سوم، حضرت موسیٰ علیہ السلام رابعہ بصریہ اور بعض عارفین کا واقعہ	۲۸۰
۲۶۲	چہارم بسم اللہ کا معنی ابدأ بسم اللہ ہے	۲۸۱
۲۶۳	فرعون نے دعویٰ الوہیت سے پہلے اپنے محل کے دروازہ پر بسم اللہ لکھوایا تھا	۲۸۱
۲۶۴	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت صدیق اکبر کو انگوٹھی میں ''لا الہ الا اللہ'' منقش کرانے دینا	۲۸۳
۲۶۵	حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو بسم اللہ پڑھنے کی کیا برکت ملی	۲۸۳
۲۶۶	آیت ''انه من سلیمان وانه بسم الله الرحمن الرحیم'' میں بسم اللہ سے پہلے انہ من سلیمان ذکر کرنے کی وجہیں	۲۸۴
۲۶۷	بسم اللہ میں با، س، م، کس سے ماخوذ ہے اور اس کی برکتیں کیا ہیں	۲۸۴
۲۶۸	اسم جلالت لفظ ''اللہ'' کے ذکر کے برکات	۲۸۶
۲۶۹	بسم اللہ الرحمن الرحیم میں تین اسماء الٰہیہ اللہ رحمن، رحیم ذکر کرنے کی حکمتیں	۲۸۶
۲۷۰	بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھے ہوئے کاغذ کو زمین سے تعظیم کے لئے اٹھانے والا صدیقین میں شمار ہوگا	۲۸۷
۲۷۱	حضرت بشر حافی کا واقعہ	۲۸۸
۲۷۲	فاروق اعظم کی عطا کردہ ٹوپی سے جس میں بسم اللہ لکھا تھا قیصر روم کے سر کا درد جاتا رہا	۲۸۹
۲۷۳	مکتب میں بچہ کے بسم اللہ پڑھنے سے اس کے والد کی قبر سے عذاب اٹھا لیا گیا	۲۹۰
۲۷۴	جنب وحائضہ کو قرأت قرآن منع ہے لیکن بسم اللہ نہیں وجہ کیا ہے	۲۹۰
۲۷۵	بسم اللہ کے انیس حروف ہیں وجہ وحکمت	۲۹۰
۲۷۶	سورہ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں	۲۹۱
۲۷۷	حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا با، س، م، سے کیا مراد ہے	۲۹۱
۲۷۸	حدیث: معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چار نہریں دیکھنا اور جبرئیل کا فرمانا کہ آپ کی امت میں جو بسم اللہ پڑھے گا ان نہروں سے سیراب ہوگا	۲۹۱
۲۷۹	بسم اللہ کو الحمد للہ سے ملا کر پڑھنے کی برکت	۲۹۳
۲۸۰	**تسمیہ کی جزئیت و عدم جزئیت کا مسئلہ**	۲۹۴
۲۸۱	قراء مکہ، کوفہ اور حجاز کے اکثر فقہا کا قول ہے کہ تسمیہ قرآن سے ہے اور وہ فاتحہ کا جز ہے	۲۹۶
۲۸۲	جزئیت فاتحہ وعدم جزئیت کے دلائل	۲۹۶

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۲۸۳	تسمیہ جزو فاتحہ نہیں ہے (دلائل)	۳۰۰
۲۸۴	تسمیہ جز سورہ ہونے کی صورت میں مستقل آیت ہے یا بعد والی آیت میں ضم ہے	۳۰۴
۲۸۵	تسمیہ کے متفرعات یعنی جنبی حائضہ و نفساء کے لئے بسم اللہ پڑھنے کا حکم	۳۰۵
۲۸۶	تسمیہ میں تین اسمائے الٰہیہ کے ذکر کے وجوہ مسائل تسمیہ کا بیان	۳۰۶ ۳۰۸
۲۸۷	**سورۃ الفاتحہ میں کلام**	۳۰۹
۲۸۸	**باب اول:** اسمائے سورہ فاتحہ کے بیان میں **باب دوم**، سورہ فاتحہ کے نزول وفضائل کے بیان میں	۳۰۹
۲۸۹	**مسئلہ اول:** اس سورہ کے نزول کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں	۳۰۹
۲۹۰	**مسئلہ دوم:** اس سورہ مبارکہ کے فضائل کا بیان	۳۱۰
۲۹۱	**مسئلہ سوم:** اس سورہ مبارکہ میں سات حروف ثا، جیم، خا، زا، شین، ظا اور فا استعمال نہ ہونے کی وجہ	۳۱۱
۲۹۲	**باب سوم:** سورہ فاتحہ کے اسرار عقلیہ کے بیان میں	۳۱۲

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۲۹۳	**مسئلہ اول:** وجود الٰہ اور اس کے مستحق حمد ہونے کی دلیل کیا ہے؟ جواب	۳۱۲
۲۹۴	رب العالمین کی بجائے خالق العالمین کیوں ارشاد نہیں ہوا	۳۱۳
۲۹۵	سورہ فاتحہ کے علاوہ چار سورتوں کا آغاز الحمد للہ سے ہوا ہے (نکتے)	۳۱۳
۲۹۶	**مسئلہ دوم:** ارشاد "رب العالمین" دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ زبان ومکان اور جہت سے پاک ہے	۳۱۵
۲۹۷	**مسئلہ سوم:** یہ ارشاد محل میں حلول سے تنزیہہ پر بھی دال ہے	۳۱۵
۲۹۸	**مسئلہ چہارم:** الحمد للہ رب العالمین سے اللہ کا فاعل مختار ہونا ثابت ہے	۳۱۶
۲۹۹	**مسئلہ پنجم:** ارشاد رب العالمین اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ حکمت بالغہ اور علوم غیر متناہیہ پر دال ہے	۳۱۶
۳۰۰	جواب سوال دوم	۳۱۶
۳۰۱	**باب چہارم:** مسائل فقہیہ سورہ فاتحہ	۳۱۷
۳۰۲	**مسئلہ (۱):** نماز میں سورہ فاتحہ کی قرأت واجب ہے (دلائل)	۳۱۸

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۳۰۳	**مسئلہ (۲):** فخر رازی کی عبارت کہ سورہ فاتحہ امام شافعی کے نزدیک واجب ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب نہیں ہے۔ تبصرہ	۳۱۸
۳۰۴	امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی نماز میں سورہ فاتحہ کی قرأت واجب ہے	۳۱۹
۳۰۵	نماز میں سورہ فاتحہ واجب ہونے کی دلیلیں	۳۲۰
۳۰۶	احناف کے دلائل اور شوافع کا جواب	۳۲۱
۳۰۷	مسئلہ قرأت خلف الامام	۳۲۳
۳۰۸	امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے کی دلیلیں اور تفصیلات	۳۲۳
۳۰۹	**مسئلہ (۳):** نماز میں فرضیت قرأت کی مقدار	۳۳۰
۳۱۰	سورہ فاتحہ وقرأت کے کچھ مسائل کا بیان	۳۳۰
۳۱۱	**باب پنجم** **تفسیر سورہ فاتحہ کے بیان میں**	۳۳۴
۳۱۲	مقدمہ، تعارف سورہ، آیت، فاتحہ	۳۳۴
۳۱۳	مکی ومدنی	۳۳۴
۳۱۴	سورہ کی اضافت فاتحہ کی طرف اضافۃ العام الی الخاص کے قبیل سے ہے	۳۳۶
۳۱۵	اور فاتحہ کی اضافت کتاب کی طرف اضافت لامیہ یا بیانیہ ہے	۳۳۷
۳۱۶	مکی ومدنی کی تین اصطلاحیں ہیں	۳۳۷
۳۱۷	تفسیر قولہ تعالیٰ: الحمد للہ	۳۳۹
۳۱۸	**فائدہ (۱):** حمد ومدح اور شکر کی تعریف	۳۳۹
۳۱۹	ثنا جمیل اختیاری اور نعمت کی تشریح	۳۴۰
۳۲۰	حمد ومدح اور شکر کے درمیان نسبت	۳۴۱
۳۲۱	**فائدہ (۲):** الحمد للہ جملہ اسمیہ مذکور ہوا، احمد للہ جملہ فعلیہ نہ مذکور ہوا	۳۴۳
۳۲۲	**فائدہ (۳):** الحمد للہ میں لام کے بارے میں چند اقوال ہیں	۳۴۴
۳۲۴	**فائدہ (۴):** الحمد للہ میں آٹھ حروف ہیں	۳۴۴
۳۲۵	**فائدہ (۵):** الحمد میں الف لام کی کون سی قسم مراد ہے	۳۴۵
۳۲۶	الف لام عہد ذہنی وخارجی کا نہیں ہوسکتا	۳۴۵
۳۲۷	الحمد للہ میں رب کے حی وقادر ہونے کی دلیل	۳۴۵
۳۲۸	**فائدہ (۶):** الحمد للہ کی اعرابی حیثیت	۳۴۵
۳۲۹	**فائدہ (۷/۸):** عقلاً بھی اللہ تعالیٰ محمود ہے/ انسان شکر الٰہی بجالانے سے عاجز ہے	۳۴۶ ۳۴۷

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۳۳۰	**فائدہ(۹)**: بندہ کا الحمد للہ کہنا اتنا عظیم ہے اس کی قیمت کی انتہا نہیں	۳۴۹	۳۴۰	**فائدہ(۱۶)**: اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر عقلاً واجب ہے یا شرعاً بھی ثابت ہے	۳۵۶
۳۳۱	**فائدہ(۱۰)**: بندہ کا الحمد للہ کہنا صرف کہنے والے کی نعمت کا شکر نہیں بلکہ جہاں کی ہر نعمت کو شامل ہے	۳۵۰	۳۴۱	**فائدہ(۱۷)**: حقیقت حمد صرف زبان سے الحمد للہ کہہ لینا نہیں ہے۔	۳۵۷
۳۳۲	**فائدہ(۱۱)**: تسبیح تحمید پر مقدم ہوتی ہے لیکن یہاں مقدم کیوں نہیں	۳۵۱	۳۴۲	ایجاب حمد و اشتغال حمد کے منکرین کے دلائل	۳۵۷
۳۳۳	**فائدہ(۱۲)**: کلمہ الحمد للہ ماضی و مستقبل دونوں کی زمانے کی نعمتوں سے متعلق ہے	۳۵۲	۳۴۳	**تفسیر قولہ تعالیٰ**: رب العالمین	۳۵۸
۳۳۴	**فائدہ(۱۳)**: کلمہ الحمد للہ کا ورد بے محل نہیں ہونا چاہئے سری سقطی کا واقعہ	۳۵۳	۳۴۴	رب کا معنی اور غیر اللہ کی طرف اضافت کا حکم	۳۵۸
۳۳۵	**فائدہ(۱۴)**: حضرت آدم علیہ السلام کے قالب میں جب روح پڑی آپ نے سب سے پہلے الحمد اللہ کہا	۳۵۳	۳۴۵	رب العلمین کی تفسیر بیضاوی کی روشنی میں	۳۵۹
۳۳۶	جنتیوں کا آخری کلمہ الحمد للہ رب العالمین ہوگا	۳۵۴	۳۴۶	فائدہ نمبر ۱۔ عالم کا مفہوم	۳۶۳
۳۳۷	**فائدہ(۱۵)**: ارشاد الحمد للہ سے فرقہ جبریہ و فرقہ قدریہ نے اپنے اپنے نظریہ پر استدلال	۳۵۴	۳۴۷	فائدہ نمبر ۲۔ مربی دو طرح کے ہیں	۳۶۴
۳۳۸	دلائل جبریہ	۳۵۴	۳۴۸	رب تعالیٰ کی تربیت اور غیر کی تربیت میں کئی طرح سے فرق ہے	۳۶۵
۳۳۹	دلائل معتزلہ	۳۵۶	۳۴۹	فائدہ نمبر ۴۔ تربیت الٰہی کے طرق و کیفیات	۳۶۷

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۳۵۰	مثال اول۔صلب پدر سے رحم مادر میں منتقل ہونے والا قطرہ منی اور جنین کی تربیت	۳۶۷	۳۶۳	حضرت ذوالنون مصری کا واقعہ	۳۷۷
۳۵۱	مثال دوم۔ کھیت میں ڈالی گئی بیج کی تربیت	۳۶۷	۳۶۴	حیوۃ الحیوان کے حوالہ سے حضرت فاروق اعظم کے دور کا واقعہ	۳۷۷
۳۵۲	فائدہ نمبر ۵۔ انسان کے علاوہ غیر محسوس مخلوق کی تربیت اور ہماری حفاظتی تربیت	۳۶۹	۳۶۵	کوا اور اس کے بچہ کی تربیت کا نرالا انداز	۳۷۹
۳۵۳	فائدہ نمبر ۶۔ ارشاد رب العالمین سے جبریہ وقدریہ کا اپنے نظریہ پر استدلال	۳۷۰	۳۶۷	حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ	۳۸۰
۳۵۴	فائدہ نمبر ۷، ۸، ۹، ۱۰ (عالم کی تحقیق روح البیان کی روشنی میں	۳۷۰	۳۶۸	فائدہ نمبر ۲۔صفات رحمن ورحیم کی برکت	۳۸۱
۳۵۵	تفسیر قولہ تعالیٰ۔الرحمن الرحیم	۳۷۲	۳۶۹	فائدہ نمبر ۳۔۴۔ایک جوان کی زبان سے بوقت موت کلمہ شہادت جاری نہ ہونے کا واقعہ	۳۸۲
۳۵۶	لفظ رحمن ورحیم کی نحوی وصرفی تشریح	۳۷۲	۳۷۰	فائدہ نمبر ۵۔میدان احد، پھر میدان قیامت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا حال	۳۸۳
۳۵۷	رحمت کا لغوی معنی اور مراد	۳۷۲	۳۷۱	**تفسیر قولہ تعالیٰ: مالک یوم الدین**	۳۸۳
۳۵۸	رحمت سے انعام مراد لینا، مجاز مرسل اور استعارہ تمثیلیہ کے طور پر ہے	۳۷۳	۳۷۲	**فائدہ نمبر ۱:** روز جزاء کا وقوع اور اس کے واقعات	۳۸۳
۳۵۹	رحمن ورحیم کے معنی میں فرق	۳۷۳	۳۷۳	حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے اخلاق کریمانہ کا ایمان افروز واقعہ	۳۸۴
۳۶۰	رحمن کو رحیم پر مقدم کرنے کے وجوہ	۳۷۴	۳۷۴	**فائدہ نمبر ۲:** لفظ "مالک" میں چار قرأتیں ہوسکتی ہیں	۳۸۵
۳۶۱	لفظ رحمن کی نحوی تحقیق	۳۷۶	۳۷۵	"مالک" پڑھنے والوں کے دلائل	۳۸۵
۳۶۲	**فائدہ (۱):** رحمن و رحیم کی تعریف خواجہ ابراہیم بن ادہم کا واقعہ	۳۷۷	۳۷۶	مالک وملک پڑھنے پر متفرع احکام	۳۸۷

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۳۷۷	نوشیرواں عادل کی حکایت کہ اس نے انار کے باغ سے انار کھانے کے بعد اپنی نیت خراب کرلی	۳۹۲
۳۷۸	مالک یوم الدین پڑھنے کی ترجیحی صورتیں	۳۹۲
۳۷۹	فائدہ نمبر ۳: مالک وملک دونوں صورتوں میں قومی شبہ اور جواب	۳۹۵
۳۸۰	فائدہ نمبر ۴۔ اس سورہ مبارکہ میں پانچ اسماء الٰہیہ ذکر کئے جانے کی وجہیں	۳۹۶
۳۸۱	پانچ اسماء مبارکہ میں سے دو کا ذکر تسمیہ میں ہونے کے بعد پھر سے سورہ فاتحہ میں کیوں ارشاد ہوا	۳۹۶
۳۸۲	فائدہ نمبر ۵۔ مالک یوم الدین سے قدریہ وجبریہ نے اپنے اپنے نظریہ پر استدلال کیا ہے۔	۳۹۶
۳۸۳	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** ایاک نعبد۔	۳۹۸
۳۸۴	غیب سے خطاب کی طرف التفات کی ایک وجہ	۳۹۸
۳۸۵	کلام غیبت وخطاب دونوں استعمال کرنے کی ایک وجہ	۳۹۸
۳۸۶	التفات کی تعریف اور چھ صورتیں	۳۹۹ ۴۰۰
۳۸۷	**فائدہ اول:** اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت مخصوص ہونے کی وجہیں	۴۰۰
۳۸۸	**فائدہ دوم:** ارشاد ایاک نعبد کی دلالت لامعبود الا اللہ پر ہوتی ہے	۴۰۳
۳۸۹	کفار ومشرکین نے خدا سے وحدہ لاشریک کے ساتھ جو شرکاء ٹھہرائے، ان کے اقسام	۴۰۳
۳۹۰	**فائدہ سوم:** ایاک کو نعبد پر مقدم کرنے کی وجہیں	۴۰۵
۳۹۱	ایاک کی طرح للہ کو الحمد پر مقدم کیوں نہیں فرمایا	۴۰۸
۳۹۲	**فائدہ چہارم:** اعتراض نعبد میں نون جمع ہے یا نون تعظیم نون جمع ہونے کے وجوہ	۴۰۸
۳۹۳	**فائدہ پنجم:** عبادت کے فوائد	۴۱۰
۳۹۴	عبادت کے درجات	۴۱۳
۳۹۴	مقام عبادت وعبودیت	۴۱۳
۳۹۴	**فائدہ ششم:** معرفت عبودیت ومعرفت ربوبیت	۴۱۶
۳۹۵	**فائدہ ہفتم:** غیبت سے خطاب کی طرف انتقال کی وجہیں	۴۱۶
۳۹۶	**فائدہ ہشتم:** عبادت وتعظیم میں فرق	۴۱۷
۳۹۷	**تفسیر قولہ تعالیٰ:** وایاک نستعین	۴۲۴
۳۹۸	معصیت سے دوری اور طاعت کی بجا آوری بغیر توفیق الٰہی کے ممکن نہیں	۴۲۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۳۹۹	فائدہ اولیٰ۔ عمل پر استعانت عمل شروع کرنے سے پہلے بہتر ہے پانچ وجہیں	۴۲۶
۴۰۰	استعانت کا معنی ومعونت کی قسموں کا بیان	۴۲۸
۴۰۱	ضمیر ''ایاک'' دومرتبہ ارشاد ہونے کی وجہ	۴۲۹
۴۰۲	غیر اللہ سے استعانت کا مسئلہ	۴۲۹
۴۰۳	**تفسیر قولہ تعالیٰ : اھدنا الصراط المستقیم**	۴۳۹
۴۰۴	**فائدہ اول:** کسی مومن کا طلب ہدایت کی دعاء تحصیل حاصل ہے۔ اعتراض	۴۴۰
۴۰۵	حضرت ابراہیم بن ادہم کا پیدل حج کو جاتے وقت ایک سوار اعرابی سے مکالمہ	۴۴۳
۴۰۶	**فائدہ دوم:** اھدنا میں ضمیر جمع استعمال کرنے کی وجہ	۴۴۴
۴۰۷	ایک اعرابی کے مسجد میں پیشاب کرنے پر حضور کا کریمانہ برتاؤ	۴۴۵
۴۰۸	**فائدہ سوم:** صراط مستقیم فرمانا اہل ہندسہ کے خط مستقیم کے اعتبار سے بھی بہتر ہے	۴۴۷
۴۰۹	اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر بیضاوی کی روشنی میں	۴۴۷
۴۱۰	ہدایت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے ہدایت کے اقسام	۴۴۹
۴۱۱	ہدایت کے چار مراتب	۴۵۱
۴۱۲	واقعہ علقمہ	۴۵۴
۴۱۳	''صراط'' کی تحقیق	۴۵۵
۴۱۴	صراط مستقیم سے مراد	۴۵۶
۴۱۵	**تفسیر قولہ تعالیٰ: صراط الذین انعمت علیھم**	۴۵۶
۴۱۶	انعمت علیھم سے مراد کے بارے میں تین اقوال ہیں	۴۵۷
۴۱۷	نعمت کا مفہوم اور نعمت سے کونسی نعمت مراد ہے	۴۵۸
۴۱۸	فائدہ اول: نعمت کی تعریف	۴۶۰
۴۱۹	تعریف نعمت پر تفریعات	۴۶۱
۴۲۰	کافروں پر اللہ کی نعمت ہے یا نہیں اس میں علماء کا اختلاف ہے	۴۶۲
۴۲۱	فائدہ دوم: آیت صراط الذین انعمت علیھم سے خلیفہ اول صدیق اکبر کی خلافت پر استدلال	۴۶۴
۴۲۲	فائدہ سوم: آیت انعمت علیھم سے نظریہ معتزلہ کی تردید	۴۶۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۴۲۳	**تفسیر قولہ تعالیٰ**: غیر المغضوب علیھم ولا الضالین	۴۶۶
۴۲۴	آیت غیر المغضوب علیھم کا ماقبل سے تعلق	۴۶۶
۴۲۵	صفت مقیدہ، کاشفہ، اور مادحہ کی تعریف	۴۶۶
۲۲۶	اعتراض، غیر المغضوب کو الذین انعمت سے صفت ماننے پر معرفت ونکارت سے اعتراض	۴۶۷
۴۲۷	جواب	۴۶۷
۴۲۸	غیر المغضوب کو ابن کثیر نے نصب پڑھا ہے تین وجہوں سے	۴۶۹
۴۲۹	معنی غضب	۴۷۰
۴۳۰	معنی ضلال	۴۷۰
۴۳۱	المغضوب علیھم والضالین سے کون لوگ مراد ہیں	۴۷۱
۴۳۲	معرفت کی دو قسمیں ہیں معرفت لذاتہ معرفت للعمل بہ	۴۷۲
۴۳۳	مخل فی العمل، مخل فی الاعتقاد	۴۷۲
۴۳۴	قاضی بیضاوی کے نزدیک مغضوب علیھم اور ضالین سے کون مراد ہیں	۴۷۳
۴۳۵	**فائدہ دوم**: آیت غیر المغضوب علیھم میں انبیا وملائکہ کے معصوم ہونے پر دلیل	۴۷۴
۴۳۶	**فائدہ سوم**: انعمت علیھم میں انعام کی نسبت رب کی طرف ہے جب کہ غضب وضلال کی نسبت غیر کی طرف ہے	۴۷۴
۴۳۷	**فائدہ چہارم**: آیت سے معتزلہ نے اپنے نظریہ پر استدلال کیا ہے	۴۷۵
۴۳۸	**فائدہ پنجم**: سورہ فاتحہ کا حمد و ثناء سے آغاز ہے جب کہ اختتام اعراض کرنے کی مذمت پر ہے	۴۷۵
۴۳۹	**فائدہ ششم**: مکلفین کے تین فرقے	۴۷۵
۴۴۰	**فائدہ ہفتم**: آیت غیر المغضوب علیھم میں ایک دوسرا سوال	۴۷۶
۴۴۱	**فائدہ ہشتم**: انعمت علیھم کے بعد غیر المغضوب علیھم کیوں ذکر ہوا	۴۷۷
۴۴۲	**فائدہ نہم**: مقبولین کا ایک گروہ اور مردودین کے دو گروہ کا کیوں ذکر ہوا	۴۷۷

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۴۴۳	**فائدہ دہم:** غیر المغضوب علیھم کی تفسیر آج کے حالات کے تناظر میں	۴۷۷	۴۵۲	فصل ثالث: مبدأ، معاد کی معرفت میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے سورہ فاتحہ ان باتوں پر مشتمل ہے	۴۸۷
۴۴۴	**قسم ثانی:** سورہ فاتحہ کی مجموعی تفسیر	۴۸۰	۴۵۳	فصل رابع: حدیث قدسی قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین	۴۹۰
۴۴۵	فصل اول: اس سورہ سے مستنبط اسرار عقلیہ کا بیان	۴۸۰	۴۵۴	فائدہ اول: قسمت الصلوٰۃ الخ دلیل ہے کہ شرائع کا مدار، مصالح خلق کی رعایت پر ہے	۴۹۱
۴۴۶	یہ دنیا مادی دنیا ہے اور عالم آخرت، روحانی دنیا ہے	۴۸۰	۴۵۵	فائدہ دوم: قسمت الصلوٰۃ کو صلوٰۃ سے موسوم کیا ہے اس سے چند احکام مستفاد ہوتے ہیں	۴۹۱
۴۴۷	سورہ بقرہ کی آخری آیتیں معرفت مبدأ و معاد پر مشتمل ہیں۔ تشریح	۴۸۱	۴۵۶	احکام	۴۹۱
۴۴۸	فصل ثانی: مداخل شیطان کے بیان میں	۴۸۴	۴۵۷	حدیث مذکور میں ارشاد یہ جملہ ذکرنی عبدی میں چند احکام ہیں	۴۹۴
۴۴۹	مداخل شیطان تین ہیں۔ شہوت، غضب، ھوی سات اخلاق رذیلہ کے دفعیہ کے لئے سات آیات والی بابرکت سورہ نازل ہوئی	۴۸۵	۴۵۸	حدیث ''ذکرنی عبدی'' میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اسم جلالت ''اللہ'' اس کی ذات کا علم ہے	۴۹۵
۴۵۰	اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اپنے ھوی یعنی خواہش نفس کی مخالفت کرو	۴۸۶	۴۵۹	شبہ۔ بندہ تسمیہ میں الرحمن الرحیم کہتا ہے تو عظمتی عبدی کی بشارت نہیں ہوتی لیکن یہی لفظ الحمد للہ میں کہتا ہے تو بشارت ہوتی ہے	۴۹۶
۴۵۱	نکتہ تین اسماء مبارکہ مذکورہ در تسمیہ و فاتحہ	۴۸۶	۴۶۰	جواب شبہ	۴۹۶

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۴۶۱	ھذ العبدی ولعبدی ماسأل کی تقریر	۴۹۸
۴۶۲	فائدہ رابعہ۔خبر مذکور کے فوائد	۴۹۹
۴۶۳	سورہ فاتحہ کی سات آیتیں، نماز کے سات ارکان محسوسہ کے عدد کے موافق ہیں	۴۹۹
۴۶۴	قعدہ اخیرہ میں التحیات پڑھنے کی وجہ	۵۰۱
۴۶۵	نکتہ: ساتوں آیات، ساتوں ارکان نماز کے لئے روح کی طرح ہیں اور پھر ساتوں ارکان، خلقت انسانی کے سات مراتب کے لئے روح کی طرح ہیں	۵۰۱
۴۶۶	فصل خامس۔نماز عارفین کی معراج ہے	۵۰۱
۴۶۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معراج ہوئی دو حصے پر مشتمل تھی ایک مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک	۵۰۱
۴۶۸	دوم مسجد اقصیٰ سے ملکوت اعلیٰ تک پھر دوم میں دو طرح کی معراج ہے	۵۰۲
۴۶۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج سے واپسی پر بارگاہ رب العزت میں عرض کیا واپس جارہا ہوں میری امت کے لئے تحفہ کیا ہے فرمایا نماز	۵۰۳
۴۷۰	نماز، معراج جسمانی اور معراج روحانی کا مجموعہ ہے	۵۰۳
۴۷۱	نماز میں معراج روحانی کا حصول کیسے ہوتا ہے	۵۰۳
۴۷۲	نماز میں معراج جسمانی کیسے حاصل ہوتی ہے	۵۰۶
۴۷۳	نماز میں جب "السلام علیک ایھا النبی" کہے تو وہ سمجھے کہ وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر سلام پیش کر رہا ہے	۵۰۷
۴۷۴	نماز ختم کرتے وقت "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" سے کس کو خطاب کیا جاتا ہے	۵۰۸
۴۷۵	فصل سادس: عظمت وکبریائی کے بیان میں	۵۰۸
۴۷۶	مکان وزمان کی تعریف	۵۰۸
۴۷۷	اللہ تعالیٰ نے مکان کو کرسی کے ساتھ اور زمان کو عرش کے ساتھ متعلق کر دیا ہے	۵۰۹
۴۷۸	تطہیر کے مراتب۔مرتبہ اولیٰ ذنوب وخطایا کی گندگیوں سے توبہ کے ذریعہ طہارت	۵۱۰
۴۷۹	تکبیر تحریمہ میں "اللہ اکبر" کے مراد میں دوسری وتیسری وجہ	۵۱۱
۴۸۰	نماز میں تکبیر تحریمہ کے بعد، ثناء، تعوذ و تسمیہ اور قرأت فاتحہ وسورہ کے برکات	۵۱۲
۴۸۱	رکوع کی تسبیح میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں۔وجہ	۵۱۳
۴۸۲	اعتراض: رکوع سے قومہ کے انتقال کے وقت اللہ اکبر کی بجائے سمع اللہ لمن حمدہ کیوں کہتے ہیں	۵۱۳

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۴۸۳	جواب	۵۱۳
۴۸۴	نماز میں دو سجدے کیوں ہیں	۵۱۴
۴۸۵	جواب اس کی چند حکمتیں ہیں	۵۱۴
۴۸۶	فصل سابع: الحمد للہ کے لطائف کا بیان اس میں پانچ اسمائے حسنی کے فوائد	۵۱۵
۴۸۷	نکتہ اول: یہ کلمہ فاتحہ الشکر اور جنتیوں کے کلام کا خاتمہ ہے	۵۱۵
۴۸۸	عقل کی پیدائش کے متعلق حضرت مولا علی کی روایت	۵۱۶
۴۸۹	محدثات کے آغاز کا اول کلام بھی الحمد للہ تھا اور محدثات کے خاتمہ کا اول کلام بھی الحمد للہ ہوگا	۵۱۶
۴۹۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دو نام مبارک احمد و محمد کلمہ حمد سے ماخوذ ہے دونوں کا مفہوم	۵۱۶
۴۹۱	نکتہ دوم وسوم: تمام مخلوق میں سب سے زیادہ نعمت و رحمت اللہ کی حضور پر ہے کہ حضور احمد ہیں	۵۱۷
۴۹۲	نکتہ چہارم: اللہ تعالیٰ کے دو اسماء رحمن و رحیم رحمت سے ماخوذ ہیں	۵۱۷
۴۹۳	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اسماء محمد و احمد ایسے ہیں جن میں رحمت کا معنی ملحوظ ہے	۵۱۸
۴۹۴	نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم میں پانچ الفاظ اللہ غفور رحیم پر دلالت کرتے ہیں	۵۱۸
۴۹۵	سورہ فاتحہ میں پانچ اسماء حسنی کے فوائد	۵۱۸
۴۹۶	**فائدہ** (۱): سورہ فاتحہ میں دس اشیاء ہیں پانچ صفات ربوبیت سے متعلق اور پانچ صفات عبادت سے متعلق ہیں	۵۱۸
۴۹۷	**فائدہ** (۲): انسان پانچ اشیاء سے مرکب ہے اور اللہ کے پانچ اسماء حسنی ہیں جن کے پانچ اشیاء پر تجلی ہے	۵۱۹
۴۹۸	**فائدہ** (۳) بنی الاسلام علی خمس کی طرح اس سورہ میں اللہ کے اسماء بھی پانچ ہیں	۵۲۰
۴۹۹	**فائدہ** (۴)۔ قبلہ کی پانچ قسمیں ہیں اور اس سورہ میں اللہ کے اسماء بھی پانچ ہیں	۵۲۱
۵۰۰	**فائدہ** (۵) حواس پانچ ہیں اور اس سورہ میں اللہ کے اسماء بھی پانچ ہیں	۵۲۱
۵۰۱	**فائدہ** (۶) سورہ فاتحہ کا اول پانچ اسماء پر مشتمل ہے۔	۵۲۱
۵۰۲	سورہ فاتحہ میں مذکور پانچ اسماء کو ذکر الٰہی کے پانچ مراتب پر مرتب کرنا ممکن ہے	۵۲۲

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۵۰۳	فصل ہشتم: سورہ فاتحہ میں پانچ اسماء کے ذکر کے اسباب	۵۲۳
۵۰۴	احوال خلق کے مراتب پانچ ہیں	۵۲۳
۵۰۵	فصل نہم: اس سورہ میں دو کلمے اسم جلالت اللہ کی طرف مضاف ہیں اور دو کلمے غیر کی طرف مضاف ہیں	۵۲۵
۵۰۶	فصل دہم: احکام سورہ فاتحہ	۵۲۵
۵۰۷	نماز خوف کا طریقہ	۵۲۸
۵۰۸	**آمین کا بیان**	۵۲۹
۵۰۹	آمین کا معنی اور اس کا حکم	۵۲۹
۵۱۰	آمین بالمد والقصر دونوں جائز ہے	۵۲۹
۵۱۱	آمین قرآن حکیم کا جز نہیں ہے	۵۳۰
۵۱۲	اقوال ائمہ درباره آمین	۵۳۰
۵۱۳	دلائل ائمہ اربعہ	۵۳۱
۵۱۴	اہم اختلاف	۵۳۳
۵۱۵	آمین بالسر کی حدیثیں	۵۳۳
۵۱۶	آمین کہنے کے سبب ذنب وگناہ کی مغفرت چار مقدمات پر مرتب ہے	۵۳۴
۵۱۷	آمین بالجھر کی حدیثیں	۵۳۶
۵۱۸	آمین بالسر کی روایتوں کو قرآن حکیم اور عقل وقیاس سے تقویت حاصل ہے	۵۳۶
۵۱۹	آمین بالجہر والی احادیث مؤول ومنسوخ ہیں	۵۳۶
۵۲۰	آمین دعا ہے اور دعا آہستہ مسنون ہے	۵۳۶
۵۲۱	نماز میں تعوذ وتسمیہ اور ثناء تسبیح وغیرہ جو باتیں از قبل سنن ومستحبات ہیں سب آہستہ کہی جاتی ہیں لہٰذا آمین بھی آہستہ کہی جائے گی	۵۳۶
۵۲۲	قطع نظر مرویات سے زور سے آمین کہنے میں غیر مقلدین کے نزدیک سخت اضطراب ہوگا	۵۳۶
۵۲۳	حضرت وائل بن حجر کی روایت سے ثابت ہے کہ آمین بالجہر مسنوخ ہے	۵۳۷
۵۲۴	فضائل آمین کی احادیث	۵۳۸
۵۲۵	مسائل آمین	۵۳۹
۵۲۶	**خاتمہ** در بیان عملیات وازالہ شبہات	۵۴۰
۵۲۷	باب اول: سورہ فاتحہ کے عملیات کے بیان میں	۵۴۰
۵۲۸	عمل اول: چالیس حج کے برابر ثواب	۵۴۰
۵۲۹	عمل دوم: بیشمار فوائد و برکات اور قضا حاجات کیلئے	۵۴۱
۵۳۰	عمل سوم:	۵۴۱
۵۳۱	عمل چہارم، عمل پنجم، عمل ششم	۵۴۲
۵۳۲	باب دوم سورہ فاتحہ کے قرآن نہ ہونے کا شبہ اور اس کا ازالہ	۵۴۵
۵۳۳	دعائے اختتام	۵۴۸
۵۳۴	مجلس اشاعت	۵۴۹

يؤتي الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا

شرح مسلم الثبوت

معروف

أشرف النعوت

شرح

مسلم الثبوت

تالیف

محمد معین الدین اشرفی مصباحی بھاگلپوری

خادم درس وافتاء دار العلوم بہار شاہ فیض آباد

سابق مفتی جامع اشرف درگاہ کچھوچھہ شریف

ناشر

غوث العالم پبلیکیشن

دس بیبیوں کی کہانی

اور

سیدہ کی کہانی

۱ حضرت حوا رضی اللہ عنہا	۲ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا
۳ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا	۴ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا
۵ حضرت مریم رضی اللہ عنہا	۶ حضرت سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا
۷ حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا	۸ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا
۹ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	۱۰ حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ عنہا

مرتب: مفتی محمد معین الدین اشرفی (خلیفہ صرکار کلاں)

ناشر: الاشرف اکیڈمی شاخ مالیگاؤں

اعلیٰحضرت اشرفی میاں

اربابِ علم و معرفت کی نظر میں

مولانا معین الدین اشرفی

خادم دارالافتاء جامع اشرف، کچھوچھہ شریف

جمعیۃ الاشرف جامع اشرف درگاہ کچھوچھہ شریف، امبیڈکر نگر، یوپی